قرآنک انسائیکلوپیڈیا

اُردو ترجمہ

جلد پنجم

مؤلف
پروفیسر اشفاق احمد خان

(۱) مَا فَرَّطْنَا فِی الْکِتٰبِ مِنْ شَیْءٍ (سورۃ الانعام : ۳۸)

''ہم نے (اپنی اس) کتاب میں کوئی چیز چھوڑ نہیں رکھی۔'' (۳۸ : ۶)

(۲) وَلَا رَطْبٍ وَّلَا یَابِسٍ اِلَّا فِیْ کِتَابٍ مُّبِیْنٍ ۝ (سورۃ الانعام :۵۹)

''اور نہ کوئی تر اور خشک چیز مگر (یہ کہ یہ سب) روشن کتاب میں (موجود) ہیں۔'' (۵۹ : ۶)

(۳) وَنَزَّلْنَا عَلَیْکَ الْکِتٰبَ تِبْیَانًا لِّکُلِّ شَیْئٍ (سورۃ النحل :۸۹)

(اے محبوبِ مکرم!) ''ہم نے آپ پر ہر بات کو کھول دینے والی کتاب اتاری ہے۔'' (۱۶:۸۹)

(۴) وَکُلُّ صَغِیْرٍ وَّ کَبِیْرٍ مُّسْتَطَرٌ ۝ (سورۃ القمر : ۵۳)

''اور ہر چھوٹی اور بڑی بات (اس میں) لکھی ہوئی ہے۔'' (۵۳ : ۵۴)

قرآنک انسائیکلوپیڈیا (اُردو ترجمہ)

(جلد پنجم)

مؤلف : پروفیسر اشفاق احمد خان

سابق صدر شعبہ عربی۔ گورنمنٹ کالج بوسن روڈ ملتان

مترجم : پروفیسر اشفاق احمد خان (مؤلف انسائیکلوپیڈیا ہذا)

ثاقب پرنٹرز اینڈ پبلشرز

5۔ شالیمار کالونی' عقب ٹویوٹا شوروم۔ بوسن روڈ ملتان

موبائل : 0308-9217883

0301-7422684

طبع اوّل : دسمبر 2013ء

ملنے کے پتے :

اندرون ملک :

(۱) پروفیسر اشفاق احمد خان۔ ۵ شالیمار کالونی' عقب ٹویوٹا شوروم۔ بوسن روڈ ملتان
موبائل : 0308-9217883
0301-7422684 (محمد جمیل۔ مارکیٹنگ منیجر)

(۲) ملتان کتاب گھر۔ بالمقابل گورنمنٹ کالج' بوسن روڈ ملتان
فون: 6750226 -061

(۳) مکتبہ قاسمیہ۔ کچہری روڈ' نزد چوک گھنٹہ گھر۔ ملتان
موبائل : 0300-7300097

بیرون ملک : پروفیسر ڈاکٹر حافظ محمد سلیم
drhafizsaleem@yahoo.com.uk.
Landline Tel: 0044-1628-823632

قیمت : ایک ہزار روپے (Rs. 1000/-)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اللھم صل علی سیدنا محمد عدد من یسبحک و یھللک و یکبرک و یعظمک من یوم خلقت الدنیا الی یوم القیامۃ فی کل یوم الف مرۃ و اللھم صل علی سیدنا محمد عدد انفاسھم و الفاظھم

مرا پیمبر عظیم تر ہے

مرا پیمبر عظیم تر ہے — مرا پیمبر عظیم تر ہے
کمال خلّاق ذات اُس کی — جمالِ ہستی حیات اُس کی
بشر نہیں عظمتِ بشر ہے — مرا پیمبر عظیم تر ہے
وہ شرحِ احکامِ حق تعالیٰ — وہ خود ہی قانون خود حوالہ
وہ خود ہی قرآں وہ خود ہی قاری — وہ آپ مہتاب آپ ہالہ
وہ عکس بھی اور آئینہ بھی — وہ نقطہ بھی، خط بھی، دائرہ بھی
وہ خود نظارہ ہے خود نظر ہے — مرا پیمبر عظیم تر ہے
شعور لایا کتاب لایا — وہ حشر تک کا نصاب لایا
دیا بھی کامل نظام اُس نے — وہ آپ ہی انقلاب لایا
وہ علم کی اور عمل کی حد بھی — ازل بھی اُس کا ہے اور ابد بھی
وہ ہر زمانے کا راہبر ہے — مرا پیمبر عظیم تر ہے
وہ آدم و نوح سے زیادہ — بلند ہمت بلند ارادہ
وہ زہدِ عیسیٰ سے کوسوں آگے — جو سب کی منزل وہ اُس کا جادہ
ہر اک پیمبر نہاں ہے اُس میں — ہجومِ پیغمبراں ہے اُس میں

وہ جس طرف ہے خدا اُدھر ہے
مرا پیمبر عظیم تر ہے

بس ایک مشکیزہ اک چٹائی
ذرا سے جَو ایک چار پائی

بدن پہ کپڑے واجبی سے
نہ خوش لباسی نہ خوش قبائی

یہی ہے کل کائنات جس کی
گنی نہ جائیں صفات جس کی

وہی تو سلطانِ بحر و بر ہے
مرا پیمبر عظیم تر ہے

جو اپنا دامن لہو سے بھر لے
مصیبتیں اپنی جان پہ لے

جو تیغ زن سے لڑے نہتّا
جو غالب آ کر بھی صلح کر لے

اسیر دشمن کی چاہ میں بھی
مخالفوں کی نگاہ میں بھی

امیں ہے صادق ہے معتبر بھی
مرا پیمبر عظیم تر ہے

جسے شہِ شش جہات دیکھوں
اُسے غریبوں کے ساتھ دیکھوں

عنانِ کون و مکاں جو تھامے
کدال پر بھی وہ ہاتھ دیکھوں

لگے جو مزدور شاہ ایسا
نہ زر نہ دَھن سر براہ ایسا

فلک نشیں کا زمیں پہ گھر ہے
مرا پیمبر عظیم تر ہے

وہ خلوتوں میں بھی صف بہ صف بھی
وہ اِس طرف بھی وہ اُس طرف بھی

محاذ و منبر ٹھکانے اُس کے
وہ سر بہ سجدہ بھی سر بکف بھی

کہیں وہ موتی کہیں ستارہ
وہ جامعیّت کا استعارہ

وہ صبحِ تہذیب کا گجر ہے
مرا پیمبر عظیم تر ہے

کلام: مظفر وارثی پیش کردہ: (ثنا خوانِ مصطفیٰ ﷺ) نواب شہر ملتان۔ موبائل: 0301-7438219

بِسمِ اللہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیمِ O

محتویات (CONTENTS)

نقصانات ۔نمازِ عشاء کے بعد باتیں کرنے کا شرعی حکم اور احادیثِ مبارکہ ۔سماج سے متعلق حفظانِ صحت ۔متوازن غذا اور تغذیہ ۔بچہ جننے کے دنوں میں تازہ کھجور بہترین غذائی پھل ہے ۔کھجور کے متعدد استعمالات ۔بچہ اور ماں کا دودھ ۔شیرِ مادر کی اہمیت ۔ماں کے لئے دودھ پلانے کے فوائد ۔دو سال کی مدتِ رضاعت میں قرآنی حکمت و منطق ۔اللہ تعالیٰ کا زیتون کی قسم اٹھانے میں ایک سائنسی پیغام ۔انجیر کی تخصیص ۔ طُورِ سِينِينَ میں کوہِ سبز کا تصوّر غیر آلودہ' پاک وصاف ہوا ۔عائلی صحت ۔عمر رسیدہ لوگوں کے حقوق کی نگہداشت ۔انسان کو اپنے آئینہ میں رب تعالیٰ کی قدرت کی کرشمہ سازیوں کے مشاہدہ کی دعوت ۔عمر رسیدگی اور دماغی وجسمانی صلاحیتوں کا فقدان ۔عمر رسیدہ افراد کی تعظیم و تکریم (i) اِجلالِ الٰہی کا حصّہ ہے ۔(ii) عظمتِ رسالت کا نفاذ ہے ۔(iii) علامتِ ایمان ہے ۔(iv) باعثِ برکت ہے ۔عمر رسیدہ افراد کو سہولیاتِ زندگی کی فراہمی میں ترجیح کا حق ۔برکت اکابر سے ہے ۔استطاعت سے زیادہ بوجھ سے استثناء کا حق ۔ معذور افراد کے حقوق: خصوصی توجہ کا حق ۔قانونِ معاشرت کے نفاذ میں استثناء کا حق ۔جہاد اور دفاعی ذمہ داریوں سے استثناء کا حق ۔حفظانِ صحت کے مطابق صاف' ستھرا گھر ایک بنیادی ضرورت ہے ۔ جنسی بے راہروی' غضب الٰہی اور متعدد بیماریوں کا سبب ۔ہم جنس پرستی (Homo-sexuality) ۔ مشت زنی (Masturbation) ۔زنا کاری کسی بھی معاشرہ کے نظام میں کینسر کی حیثیت کی حامل ۔منشیات اور مخدّرات ۔الکوحل کے اثرات (i) نظامِ انہضام پر (ii) دورانِ خون پر (iii) نفسیات پر ۔الکوحل کی تجارت ۔ہر مخمور کر دینے والی چیز حرام ہے ۔بڑی مقدار میں مخمور کر دینے والی چیز تھوڑی مقدار میں بھی حرام ہے ۔الکوحل رشراب کو تحفہ میں نہیں دیا جا سکتا ۔شراب کی محفلوں سے گریز ۔الکوحل بذاتِ خود ایک بیماری ہے' دوا کا کام نہیں دے سکتی ۔ضرورت کی استثنائی صورت ۔نشہ آور ادویات (Drugs) ۔مضر اشیاء کا استعمال حرام ہے ۔الکوحل اور قمار بازی (جوئے) کے مضر اثرات پر مستند شہادتیں ۔ خنزیر اور مُردار کی ممانعت کے پس پردہ حفظانِ صحت کی وجوہات ۔<u>ہائی جین کے مذہبی پہلو</u>: <u>وضو</u> ۔۔صحتمند زندگی کا بہترین ضمانت نامہ ۔وضو اور جسم کی ساکت وجامد غیر فعّال برق ۔وضو کا اثر دورانِ خون کے نظام پر ۔وضو کا نظامِ مامونیت ۔ <u>نمازِ پنجگانہ</u> اور صحت ۔نماز با جماعت ۔قیام کا مختلف جسمانی نظاموں پر اثر ۔رکوع کا مختلف جسمانی نظاموں پر اثر ۔سجدے کا جسمانی نظاموں پر اثر ۔جلسہ کا نظام ہائے جسمانی پر اثر ۔عملِ تنفّس اور قوتِ انہاک ۔اوقاتِ نماز کا فلسفہ ۔<u>روزہ</u>: متعدد بیماریوں کا بہترین علاج ۔روزے کا روحانی پہلو ۔روزے کا اثر (i) نظامِ انہضام پر (ii) نظامِ دورانِ خون پر (iii) خلیوں پر (iv) نظامِ اعصاب پر ۔خون کا بننا اور روزے کی پُر حکمت باریک بینیاں ۔روزے سے متعلق غیر مسلمین کی آراء ۔نیند ۔صحت بخش ازدواجی تعلقات ۔۔کامیاب زندگی کا راز ۔صحت مند وظیفہ زوجیت اور ذہنی تناؤ ۔

(۷۴) منافقین ۔۔۔ ۔۔۔ ۔۔۔ ۔۔۔ ۔۔۔ ۔۔۔ ۔۔۔ ۲۱۱۹

تعریف ۔منافقین کی سزا اُن کی اخلاقی پستی کے جواب میں ہے ۔منافقین اور پیغمبر علیہ السلام کی

نصرت واعانت الٰہی ۔مرتبہ رسالت کا ادب صرف معنوی حیثیت ہی سے نہیں، لفظی حیثیت سے بھی لازمی ہے۔منافقین اور علم رسول ﷺ ۔علوم نبوّت ۔غیب کی اقسام :غیبِ اضافی ؛غیبِ مطلق۔ اللہ کے رسول ﷺ کا علم اور شیطانِ لعین کا علم از روئے سورۃالاعراف ۔امام الانبیاء ﷺ کا علم اور اللہ تبارک وتعالیٰ کا علم ۔رسول اللہ ﷺ کے ساتھ منافقین کا رویّہ ۔ثعلبہ بن حاطب کا واقعہ۔منافقین اور تصفیہ مقدمات ۔تبوک کی مہم اور منافقین ۔منافقین کی جہاد سے پہلوتہی ۔بعض مخلص، وفادار مسلمانوں کا کردار۔مسجد ضرار اور ٹولہ منافقین ۔مسجدِ قُبا اور مسجدِ ضرار (موازنہ)۔ منافقین کا عمومی کردار۔منافقین اور فساد فی الارض۔منافقین کی نام نہاد ''ذہانت'' از روئے سورۃ البقرۃ۔استہزا اور تمسخر کی نفسیات ۔اللہ تعالیٰ کا استہزاء منافقوں کو ذلت ورسوائی کی سزا دینا ہے۔ سزائے فعل کا ذکر اُسی فعل سے کرنا اسلوبِ قرآن ہے ۔بعض منصوبوں کا کچھ دیر تک قائم رہنا اُن کے حق ہونے کی دلیل نہیں ۔طُغیان، یَعمَہون اور اِشتراء کا مفہوم ۔ایک گروہِ منافقین کی مثال۔ دوسرے گروہِ منافقین کی مثال ۔لفظ لَوْ (حرفِ شرط) کے استعمال کی مقصدیت۔ قدیر کا معنیٰ۔ مسئلہ اِمکانِ کذب ۔قادر اور قدیر میں فرق۔

(۷۵) عبادت --- --- --- --- --- --- --- --- --- --- --- --- --- ۲۱۵۲

انسان کی نیابتِ الٰہی اور عبادت ۔حیاتِ انسانی کا مقصد از روئے قرآنِ حکیم ۔جن، انسان، حیوان اور فرشتے ۔ایک خطرناک مغالطہ روا ہمہ۔عبادات کی ناگزیریت ۔بگاڑ کا سبب ۔اصلاح کیسے ممکن ہے؟ مسجد سے شغف۔ نبی اکرم ﷺ کا طرزِ عمل ۔ستون کے بغیر چھت ۔جنبش اور عبادات ۔تحرک میں اضافہ کے لئے عملِ تزکیہ کو تیز کرنے کی ضرورت ہے ۔فکرِ معاش کے ساتھ فکرِ آخرت ہی میں انسان اور حیوان میں فرق ہے ۔عبادت کی ہیئتِ ترکیبی (شکل) اور روح ۔عبادت کی ظاہری شکل وصورت اور روح کی بابت قرآن وسنت کے حوالہ جات ۔یہود ونصاریٰ کا دعوائے جنت اور قرآن مجمع النجوم ۔موت عدمِ محض یا فقط سلبِ حیات کا نام نہیں ۔اعتقادات وعبادات کی اہمیت اور ٹھوس اعمال وافعال کی تائید ۔اسلام میں وحدت ویگانگت کا اصول ۔نجاتِ اُخروی کا معیار از روئے قرآنِ حکیم۔ لیل ونہار کے دورانیے میں کوئی لمحہ بھی تو ایسا نہیں جس میں پورے روئے زمین پر کہیں نہ کہیں نماز نہ پڑھی جاتی ہو۔

(۷۶) ابلیس --- --- --- --- --- --- --- --- --- --- --- --- --- ۲۱۷۰

ابلیس کا اصل نام ۔ابلیس اور شیطان کے لفظی معانی ۔ابلیس کا آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے سے انکار۔ سجدۂ آدم کی اصل حقیقت ۔ابلیس کو الٰہی مہلت ۔شیطان انسان کا مسلمہ اور اقبالی دشمن ہے۔اللہ جل جلالہٗ شیطان کی چالوں کو ہمیشہ ناکام بنا دیتا ہے (بحوالہ آیات ۵۲، ۵۳ سورۃ الحج)۔ الغرانیق العلیٰ کے ردّ میں فرمودات الٰہی ۔شیطان کا بس اللہ کے وفادار مخلص بندوں پر نہیں چلتا۔شیطان کو صرف برائی کی راہ دکھانے کا اختیار ہے ۔شیطان کی اللہ سے ڈرنے کی حقیقت ۔شیطان کی

چالوں اور مکروفریب سے کیسے بچا جائے؟ خوفِ خدا بندوں کے خوف سے کہیں زیادہ بلند و بالا ہونا چاہئے۔

(۷۷) ابنِ اُمِّ مکتوم (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) ۔۔۔ ۔۔۔ ۔۔۔ ۔۔۔ ۔۔۔ ۔۔۔ ۔۔۔ ۲۱۸۲

ابنِ اُمِّ مکتوم کا اصل نام اور تعلق قبیلہ۔ سیّدہ خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کے ساتھ اُن کا رشتہ۔ سورہ عبَس میں عتاب کی اصل حقیقت۔ عتابِ الٰہی اور منصبِ رسالت کی رفعت و عظمت۔

(۷۸) ابراہیم علیہ السلام اور آپ کے صاحبزادے ۔۔۔ ۔۔۔ ۔۔۔ ۔۔۔ ۲۱۸۵

ابراہیم علیہ السلام کا زمانہ۔ ابراہیم علیہ السلام کا نسب نامہ۔ آزر کی تحقیق۔ آزر کو ابراہیم علیہ السلام کا باپ کہنے کی توجیہ۔ قیامت کے دن آزر کو باپ کہنے کی توجیہ۔ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے تمام آباءِ کرام کے مؤمن ہونے پر دلیل۔ رسول اللہ ﷺ کے تمام آباءِ کرام کا اپنے اپنے زمانہ میں سب سے افضل اور بہتر ہونا۔ ابراہیم علیہ السلام کا اپنے چچا آزر سے مناظرہ۔ مستشرقینِ یورپ کی ہرزہ سرائی۔ سورۃ القصص کی آیت ۴۶ کا مفہوم۔ ابراہیم علیہ السلام کا ذکر قرآنِ حکیم میں۔ ابراہیم علیہ السلام کی عمر مبارک۔ آپ کی بعثت۔ قوم کو دعوتِ اسلام اور اس سے مناظرہ۔ سورۃ الانعام کی آیات ۷۶ تا ۷۸ کی تفسیر میں قولِ فیصل۔ حدیثِ بخاری۔ بادشاہ کو دعوتِ اسلام اور اس سے مناظرہ۔ آگ کا آپ علیہ السلام پر سرد ہونا۔ اور کلدانیین کی طرف آپ کی ہجرت۔ ہجرتِ فلسطین۔ ہجرتِ مصر اور سیّدہ ہاجرہ رضی اللہ عنہا۔ ابراہیم علیہ السلام اور ایک اہم مقام۔ لفظ ''فِتنہ'' سے مراد۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام۔ لفظ ''اسمٰعیل'' کی توضیح۔ وادِ غیر ذی زرع اور سیّدہ ہاجرہ و اسمٰعیل علیہما السلام۔ ذبحِ عظیم۔ ذبیح اللہ اسمٰعیل علیہ السلام ہیں یا اسحاق علیہ السلام؟ تعمیرِ کعبہ۔ ابراہیم علیہ السلام اور لوگوں میں بہ حکمِ الٰہی حج کا اعلان۔ مقامِ ابراہیم۔ اسمٰعیل علیہ السلام کا ذکر قرآنِ حکیم میں۔ اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد۔ اسمٰعیل علیہ السلام کی وفات۔

حضرت اسحاق علیہ السلام۔ سیّدہ سارہ رضی اللہ عنہا کے بطنِ پاک سے۔ سلام اور ملائکہ۔ اسحاق علیہ السلام کی اولاد۔ ابراہیم علیہ السلام اور حق الیقین کی طلب۔ علم الیقین، عین الیقین، حق الیقین (ذیلی نوٹ)۔ بنی قطورہ (اصحابِ مدین اور اصحاب الایکۃ)۔

(۷۹) بُت شکنی ۔۔۔ ۔۔۔ ۔۔۔ ۔۔۔ ۔۔۔ ۔۔۔ ۔۔۔ ۔۔۔ ۲۲۲۳

بت شکنی کا عمل انبیاءِ علیہم السلام کے اُسوہ حسنہ سے۔ باطل دیوتاؤں (طاغوت) کی مذمت میں قرآنِ حکیم۔ خالقِ حقیقی اور معبودانِ باطل کے مابین فرق از روئے قرآن۔ بتوں کی پرستش اور اُن کی تعظیم و توقیر میں کوئی فرق نہیں۔ بتوں کی نجاست اور جھوٹ سے دُور رہنا۔ اسلام بُت رکھنے سے روکتا ہے۔ مجسمے بنانے کی ممانعت میں حکمت۔ نا تمام یا مسخ شدہ مجسمے۔ حرمتِ تصویر کے منصوص

اسباب۔تصویر کے جواز اور عدمِ جواز کی صورتیں۔مسخ شدہ تصویر کی اجازت۔رنگوں سے بنی ہوئی تصاویر اور یک مادّی جسامت والی تصاویر۔فوٹو گرافی۔فوٹو گرافی کا نفسِ مضمون۔تصویروں اور مصوروں سے متعلق اصول وضوابط کا خلاصہ۔شادی بیاہ جیسی خوشی کے موقعوں پر کی وڈیو فلمیں۔فلموں، ٹیلیویژن اور سٹیج ڈراموں کا دیکھنا۔

(۸۰) عدّت --- --- --- --- --- --- --- --- --- ۲۲۳۱

عدّت کیا ہے؟ شریعت میں مطلّقہ کے لئے ایامِ عدّت (۱) حائضہ کے لئے (۲) غیر حائضہ کے لئے (۳) حاملہ کے لئے (۴) لونڈیوں کے لئے۔ عدّت کے عائد کرنے کے پس پردہ حکمتیں۔

(۸۱) ادریس علیہ السلام --- --- --- --- --- --- --- --- ۲۲۳۳

ادریس علیہ السلام کا ذکر قرآن حکیم میں۔آپ علیہ السلام کا نام ونسب اور زمانہ۔بعد میں آنے والے نبیوں کے متعلق بشارت۔ادریس علیہ السلام کی خلافتِ ارضی۔

(۸۲) سانحہِ اِفک --- --- --- --- --- --- --- --- ۲۲۳۶

حق وصداقت کی پامالی کا نام اِفک۔ اِفک کی ہدف سیّدہ عائشہ صدّیقہ رضی اللہ عنہا۔نزولِ وحی میں تاخیر کی حکمتیں۔سیّدہ کی براءت اور نبی علیہ السلام کا علم۔کسی نبی کی زوجہ نے کبھی بدکاری نہیں کی۔سیّدہ عائشہ صدّیقہ رضی اللہ عنہا کی براءت پر اہلِ سنت کے دلائل۔ سیّدہ کی براءت پر شیعہ علماء کے دلائل۔نوح اور لوط علیہما السلام کی بیویوں کی جانب سے خیانت کا مفہوم۔آیتِ تطہیر۔ازواجِ نبی علیہ الصّلوٰۃ والسلام کی منقبت قرآنِ حکیم میں۔اسلامی نظامِ اخلاق کے اعلیٰ معیار کا مظاہرہ۔اُمّ المؤمنین سیّدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی فضیلت میں احادیث۔

(۸۳) اجتہاد --- --- --- --- --- --- --- --- --- ۲۲۴۸

اجتہاد کا لغوی واصطلاحی معنیٰ۔اجتہاد اور جہاد۔اجتہاد کا قانونی پہلو۔اجتہاد کی اہمیت وافادیت اور ضرورت۔اِکمال اور اِتمام (بحوالہ آیت ۳ سورۃ المائدۃ)۔مذہب اور دین۔اجتہاد سنتِ رسول ﷺ ہے۔مجتہد کی شرائط۔اجتہاد کا پہلا طریق عمل متن کی تاویل ہے: بیان کا وضوح: بیانِ تقریر۔بیانِ تفسیر۔بیانِ تغییر۔بیانِ تبدیل۔احکام کے استحکام کے چار مختلف ابتدائی طریقے: عبارۃ النص۔اشارۃ النص۔دلالۃ النص۔اقتضاء النص۔چاروں طریقوں کے مابین تضاد اور اُن سے احکام کا ماخوذ ہونا: عبارۃ النص اور اشارۃ النص کے مابین تضاد۔اشارۃ النص اور دلالۃ النص کے مابین تضاد۔عبارۃ النص اور اقتضاء النص کے مابین تضاد۔تقلید اور اجتہاد کا دائرۂ عمل۔عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے اجتہاد کی عمدہ ترین مثال۔اجتہاد کا مقصد۔فی زمانہ مجتہد کون ہے؟

(۸۴) ایلاء --- --- --- --- --- --- --- --- --- --- --- --- ۲۲۶۱

ایلاء کا لغوی و اصطلاحی معنی۔ چار ماہ کی مہلت دینے میں حکمت۔ ضروری نوٹ۔

(۸۵) الیاس علیہ السلام --- --- --- --- --- --- --- --- ۲۲۶۴

نام ونسب۔ قرآنِ عزیز اور الیاس علیہ السلام۔ الیاس علیہ السلام کی قوم اور بَعل (بُت)۔ سورۃ الانعام کی آیات ۸۴، ۸۵، ۸۶ میں تفسیری نکتہ۔ موعظت۔

(۸۶) زنا بالمحارم اور دوسرے ممنوعہ نکاح --- --- --- --- --- --- ۲۲۶۷

محارم سے بدکاری کرنے کا بیان۔ ممنوعہ نکاحوں کی قرآنی فہرست۔ اقسامِ حرمت: حرمتِ نسب، حرمتِ رضاعت، حرمتِ مصاہرت۔ ممانعت کی وجوہ۔ رضاعت کی تعریف۔ مشرکہ عورتوں سے نکاح۔ کتابیہ (یہود و نصاریٰ) عورتوں سے نکاح۔ مسلمان عورت کو غیر مسلم مرد سے نکاح کی ممانعت۔ زانیہ عورت کے ساتھ نکاح۔ متعہ (عارضی نکاح)۔ جماع کرنے کی ممنوع جگہیں۔ حائضہ عورت سے جماع کرنے کی ممانعت۔ ایامِ حیض میں جماع سے ممانعت کی بابت چند ماہرین کی آراء۔

(۸۷) میراث --- --- --- --- --- --- --- --- --- --- --- ۲۲۸۰

علم المیراث کا تعارف۔ علم المیراث کی اہمیت۔ اسلامی قانونِ میراث کے اصول۔ اسلامی نظامِ میراث کی بابت چند مستشرقین کی آراء۔ علمِ میراث کے ماخذ۔ کلالۃ کی تعریف۔ احکامِ میراث سے متعلق احادیث۔ مرد کا حصہ دگنا کیوں؟ اسلام کے قانونِ وراثت کی چند اہم خصوصیات۔ اسلام میں ترکہ کی تقسیم ناگزیر ہے۔ یتیم پوتے کی وراثت۔ جواز کی واحد دلیل اور اس کی غلطی۔ مسئلہ کا صحیح حل۔ تقسیمِ میراث کے سلسلے میں چند اہم اصول۔ اولاد کے ساتھ مساویانہ سلوک۔ تقسیمِ میراث میں حدود اللہ کی پابندی۔ ورثاء کی ترتیب: (۱) ذوی الفروض (۲) عصبات (۳) ذوی الارحام۔ بیوی کی وراثت کی تقسیم۔ خاوند کی وراثت کی تقسیم۔ ترکہ میّت سے متعلق حقوق: تجہیز و تکفین۔ قرض کی ادائیگی۔ تنفیذِ وصیّت۔

ایک تہائی سے زائد وصیت کا نفاذ۔ وراثت پانے کے اسباب: (۱) رشتہ نسب (۲) رشتہِ نکاح۔ وراثت کی شرائط: (۱) مُورث کا فوت ہونا (۲) وارث کا زندہ ہونا (۳) کسی مانع کا نہ ہونا روارث کی حیثیت کا علم ہونا۔ وراثت کے موانع: (۱) مورث کا قتل (۲) اختلافِ دین۔ مرتد کی میراث۔ اشتباہِ وارث اور مورث۔

(۸۸) بیمہ --- --- --- --- --- --- --- --- --- --- --- ۲۲۹۸

بیمہ کی تعریف۔ بیمہ از روئے قرآن مجید۔ بیمہ پالیسی کی مخالفت اور عدمِ جواز کی دلیل۔

کے قرضے۔ غیر ملکی قرضے۔ سود پر مبنی موجودہ تمویلی نظام۔ سود اور امنِ عالم۔ کیا سود سے پاک اقتصادی نظام قابلِ عمل ہے؟ اقتصادی تعاون اور ترقی کی مرکزی تنظیم (OECD) کے سود سے پاک بینکاری سے متعلق تاثرات۔ اسلامی بینکنگ اور بین الاقوامی تعلقات۔ اشاریہ سازی (Indexation) اور سود۔ اشاریہ سازی کے حق اور اس کی مخالفت میں دلائل۔

(۹۱) توسّل --- --- --- --- --- --- --- --- --- --- ۲۳۶۱

توسّل (وسیلہ) کی تعریف۔ توسّل کے بغیر اللہ تعالیٰ سے براہِ راست التماس کیوں نہ کیا جائے؟ مخالفینِ توسّل کے دلائل اور اُن کے جوابات۔ قرآن حکیم سے توسّل کی تائید میں دلائل: نبی ﷺ کی ذاتِ اقدس سے توسّل۔ آپ ﷺ کی ولادتِ باسعادت سے قبل توسّل۔ وفات شریف کے بعد آپ ﷺ سے توسّل۔ حدیثِ توسّل بالعباس کی بحث۔ نبی علیہ السلام کے توسّل سے آپ کی اُمّت سے عذاب کا ٹل جانا۔ آپ ﷺ کے توسّل سے صحابہ کرام کی معافی۔ آپ ﷺ کے حینِ حیات میں اور بعد از وفات نوازشاتِ الٰہی۔ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے تبرکات سے توسّل۔ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے قرب میں دفن ہونے کی آرزو۔ نبی علیہ السلام کے لباس سے کفن بنانا۔ لعابِ نبوی سے حصولِ تبرک۔ پسینہ رسول سے حصولِ تبرّک۔ صالحین اور اولیائے کرام سے توسّل۔ حضرت اُویس قرنی رضی اللہ عنہ کے توسّل کا نبوی حکم۔ صالحین کے توسّل سے لوگوں کی ضروریات کی تسکین۔ کمزوروں اور خستہ حال لوگوں کی بدولت رزق کا ملنا۔ مقامِ ابراہیم سے توسّل۔ اولیائے کرام کے روضوں کے قریب مساجد کی تعمیر۔ قبور پر عمارات کی تعمیر۔ توسّل سے مستفید ہونے کا کون زیادہ حق دار ہے؟ حدیث لَا تُشدُّ الرِّحال مختلف سفروں کا جواز (۱) ہجرت کی خاطر سفر (۲) تباہ شدہ امِم ماضیہ سے سبق حاصل کرنے کی خاطر سفر (۳) کسبِ معاش کی خاطر سفر (۴) اپنے پیاروں کو ڈھونڈ نکالنے کے لئے سفر (۵) بیماری سے شِفایابی کے لئے سفر (۶) عالمِ دین کی زیارت کے لئے سفر (۷) تبلیغِ دین اور پیغامِ حق پہنچانے کی خاطر سفر (۸) تجارت کی خاطر سفر (۹) تحصیلِ علم کی خاطر سفر۔ اولیائے کرام سے توسّل۔ اولیائے کرام کے مقبروں کے پاس نماز پڑھنا۔

(۹۲) بین الاقوامی تعلقات اور خارجہ پالیسی --- --- ۲۳۹۸

اسلام دینِ امن و آشتی۔ خارجہ تعلقات کے بارے میں سنتِ نبوی کی درجہ بندی۔ (الف) مسلم ممالک (ب) غیر مسلم ممالک (ج) غیر مسلم ممالک جن کے ساتھ کوئی معاہدہ نہیں۔ سنتِ نبوی کی روشنی میں بین الاقوامی تعلقات: (۱) مسلم قبائل (۲) غیر مسلم معاہد قبائل (۳) غیر مسلم قبائل جن کے ساتھ کوئی معاہدہ نہیں۔ نبی اکرم ﷺ کی سیاسی مصلحت اندیشی۔ شاہانِ عالم کو دعوتِ اسلام: مکتوبِ گرامی بنام (۱) نجاشی شاہِ حبشہ (۲) قیصرِ روم۔ ابوسفیان اور قیصر کے مابین مکالمہ۔ (۳) مقوقس شاہِ مصر (۴) حارث بن ابی

شمر الغسانی (۵) خسرو پرویز شہنشاہِ ایران۔ نجران کے عیسائیوں کے ساتھ نبی علیہ السلام کا معاہدہ امن۔ بین الاقوامی قانون کی اساس۔ دیسی زندگی (Domestic Life) میں مسلمانوں کے غیر مسلمین کے ساتھ تعلقات۔ اسلامی ریاست کے غیر مسلم باشندے۔ غیر مسلمین سے دوستی کا مفہوم۔ غیر مسلمین سے استمداد (مدد مانگنا)۔

(۹۳) عبادات کی ناگزیریت --- --- --- --- --- --- --- --- ۲۴۲۷

دَورِ جدید تحریکوں کا دَور۔ عبادات میں نماز کا مقام۔ بگاڑ کا سبب۔ اصلاح کیسے ممکن ہے؟ مسجد سے شغف۔ چند احادیث برائے ترغیبِ عبادت۔ نماز با جماعت میٹنگ سے بہتر ہے۔ نبی اکرم ﷺ کا طرزِ عمل۔ ستون کے بغیر چھت۔ مقاصد کا ارتقاء اور عظمت۔ جنبش اور عبادات۔

(۹۴) اسلام --- --- --- --- --- --- --- --- --- --- --- --- ۲۴۳۵

مختلف کتبِ لغت میں لفظ ''اسلام'' کی تعریف۔ غیر مسلم قلمکاروں کی طرف سے لفظ ''اسلام'' کا تعارف۔ رسولوں کو بھیجنے کا الٰہی مقصد۔ فساد اور فتنہ۔ اسلام کی امن پسند فطرت از روئے قرآن مجید۔ امن و آشتی بہ مقابلہ جنگ و قتال۔ اسلامی ''جہاد'' اور دنیا کی باقی تمام جنگوں کے مابین فرق۔ ''جہاد'' برائے تحفظِ ذات'۔ اسلام دینِ اعتدال اور اُس کی اُمت ''اُمت وسط''۔ حیاتِ انسانی کا تقدس۔ قتلِ ناحق کے بارہ میں چند احادیثِ نبوی۔ نبی اکرم ﷺ کا خُلق عظیم۔ کچھ مستشرقین کا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی امن پسندی کو خراجِ عقیدت۔ محسنِ انسانیت کا پیغامِ محبت و امن آج سوالیہ نشان کیوں؟ مسلمان کا غیر مسلم سے رویّہ کیسا ہونا چاہیے؟ اسلام اور پیغمبر علیہ السلام کے خلاف اہلِ مغرب کا شرمناک پرچار۔ امنِ عالم کے متولیوں سے ایک حیات آفریں سوال۔ اسلام اور دیگر مذاہب عالم۔ مذاہب کی یکسانیت اور ہم جنسیت کا تصوّر۔ امام الانبیاء حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی رسالت کی افضلیت۔ اِکمال اور اِتمام (بحوالہ سورۃ المائدۃ' آیت ۳)۔ مسلمانوں اور عیسائیوں میں فرق۔ لِتُنذِرَ أُمَّ الْقُرىٰ وَمَنْ حَوْلَهَا (الانعام: ۹۲) کا مطلب۔ اُمّتِ رسول ﷺ اور دیگر انبیاء علیہم السلام کی اُمتیں۔ سابقہ انبیاء علیہم السلام کی زبانی نبی آخر الزماں ﷺ کی آمد کی پیشین گوئیاں۔ اِن پیشین گوئیوں میں یہود و نصاریٰ کی جانب سے تحریف۔ (Gospel) کا معنی۔ ورقہ بن نوفل اور پیغمبر آخر الزماں ﷺ۔ ورقہ بن نوفل کے حوالہ سے یہود و نصاریٰ کو اُلجھن کا سامنا۔ دینِ اسلام کی دنیاوی برکتیں: مادّی خوشحالی اور رسالت کا مشن۔ شکر کی حقیقت۔ اسلام میں دنیاوی زندگی کی فلاح و بہبود کی ضمانت۔ مذہب کی بجا آوری اور خوشحالی کے مابین تعلق۔ سورۃ الانبیاء کی آیت ۱۰۵ میں زمین کی

اعترافات (منجانب مؤلف انسائیکلوپیڈیا)

سب سے پہلے راقم الحروف اپنے والدین مرحومین کا نہاں خانہِ دل سے ممنونِ احسان ہے جنہوں نے مجھ ناچیز کو قرآنِ پاک کی نعمتِ غیر مترقبہ سے مالا مال کیا۔ بندے کا رُواں رُواں اور ہر ہر سانس اُن کی مغفرت اور جنّات الفردوس میں مقامِ ارفع واعلیٰ کے لئے ربّ ذوالجلال کے حضور فریاد کناں رہتا ہے۔

اپنے روحانی استادِ مکرّم جناب گل محمد صاحب مرحوم اور بالخصوص مولانا منظور احمد خان پٹیالوی رحمۃ اللہ علیہ کی مغفرت اور ترقی درجات کے لئے بھی دعا گو ہوں جنہوں نے قرآن مجید صحیح مخارج حفظ کرانے کے ساتھ ساتھ بندۂ پُر خطا میں حُبُّ اللہ و حُبُّ الرّسول کی لَو سلگائی اور وقتاً فوقتاً اُس لَو کو تیز سے تیز تر کرتے رہے۔

استادِ محترم جناب احمد نواز خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی بھی مغفرت اور بلندیٔ درجات کے لئے ربُّ العالمین کے حضور دست بہ دعا رہتا ہوں جنہوں نے اپنی بے لوث اور بے غرض محنت سے بندے میں حصولِ علم کی لگن اور تڑپ پیدا کی جس کی بدولت میں اپنے خالقِ رحیم و کریم کا اَبدی پیغام انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں اُس کے بندوں تک پہنچانے کے قابل ہوا ہوں۔

یوں تو راقم الحروف کو تعلیمی دُنیا میں ایک سے ایک بڑھ کر قابل ترین اساتذہ ملتے رہے لیکن اُن میں سے کچھ ایسے ہیں جن کے طرزِ حیات نے اُس کے دل و دماغ پر اَن مٹ، مثبت نقوش چھوڑے ہیں۔ اس طول طویل تفصیل میں سرِ فہرست میرے سکول کے عربی ٹیچر جناب عبدالمجید مرحوم، کالج کے عربی پروفیسر جناب منظور احمد مرحوم اور یونیورسٹی لائف میں جناب ڈاکٹر پروفیسر صوفی ضیاء الحق صاحب مرحوم ومغفور ہیں۔ اللہ ربُّ العزت میرے سب اساتذہ کرام اور والدین کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے! آمین بجاہ خاتم النّبیین ﷺ

انتہائی ناقدر شناسی ہوگی اگر اس موقع پر اپنے سابق رفیقِ کار اور تلمیذ پروفیسر شیخ محمد منیر زید مجدہ، کا شکریہ ادا نہ کروں جنہوں نے کمال فیّاضی سے اپنی لائبریری میں سے بڑی نادر کتب میرے ہاں استفادہ کے لئے چھوڑیں اور عزیزم خالد محمود (پی ایچ ڈی سٹوڈنٹ) کا بھی جن کی علمی روشنی نے اس صبر آزما سفر کو طے کرنے میں خاصا کردار ادا کیا۔ استادزادہ اُم جناب منصور خان خلف الرشید جناب احمد نواز خان مرحوم ومغفور کا بھی بہ صمیمِ قلب شکرگزار رہوں۔

جناب نوروز خان صاحب (ہیڈ لائبریرین، اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ اسلام آباد) کا بھی ممنونِ احسان ہوں کہ انہوں نے ہر بار کمال فراخدلی سے میری علمی راہ نمائی فرمائی اور اپنی وسیع وعریض لائبریری سے استفادہ کرنے کا بھرپور موقع عطا کیا۔

آخر میں اپنے اُن سب کرم فرماؤں اور اَحباب (بالخصوص چوہدری محمد رمضان صاحب انجنیئر) کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے انسائیکلوپیڈیا کے انگریزی حصّے کو اردو میں لانے کا شوق دلایا اور اس ضمن قدمے، سخنے بندے کی حوصلہ افزائی کرتے رہے۔

خاکِ پائے صالحین

اشفاق

۲۴ ذیقعد ۱۴۳۴ھ / یکم اکتوبر 2013ء

کچھ مؤلف کے بارے میں

خالقِ کون و مکاں نے اِس رنگ رنگیلی کائنات کے دولھا حضرتِ انسان کو دیگر نعمتوں کے علاوہ سوجھ بوجھ، عقل و فہم، دانش و فراست اور بصیرت بھی عطا کیں اور اِس عطا میں اپنی ایک خاص حکمت کو برقرار رکھا یعنی کسی پر کم اور کسی پر زیادہ فیضانِ نظر ہوا۔

اکثریت ہم جیسے عام لوگوں کی ہے لیکن اللہ تبارک و تعالیٰ کے کچھ نیک بندے ایسے بھی ہیں جن پر اللہ کی عنایتِ خاص کی وجہ سے اُن کی ظاہری آنکھوں کے علاوہ اُن کی قلبی آنکھیں بھی کھلی ہوتی ہیں جن کی بدولت وہ روحانیت کے میدان میں دوسروں سے سبقت لے جاتے ہیں۔ ربِّ ذوالجلال والاکرام لوگوں کے قلوب واذہان کو بھی کم یا زیادہ قلبی بصیرت عطا فرماتا ہے جس سے اُن کے عرفانِ حق میں اضافہ ہوتا ہے، یہاں تک کہ ہر چھوٹی بڑی بُرائی سے نفرت اور ہر چھوٹی بڑی نیکی سے والہانہ محبت اُن کی نہاد میں رس بس جاتی ہے۔ یہ لوگ اپنی وجدانی سپرٹ(Intuitive Spirit) اور بہترین فراست کی بدولت اپنے اَبنائے جنس کی راہ نمائی کے لئے ہراول دستے کا کام کرتے ہیں۔ عام عقل و فہم رکھنے والے لوگوں کی ہمدردیاں اور دعائیں بھی اِن خداداد صلاحیتوں کے حامل ہستیوں کے شاملِ حال رہتی ہیں۔ میری مراد ''قرآنک انسائیکلوپیڈیا'' کے مؤلف جناب پروفیسر حافظ اشفاق احمد خان کی ذات سے ہے۔

گوشۂ خمولت (گم نامی) میں پُرسکون و پُر اطمینان، شاداں و فرحاں، سادگی پسند، خوش اَخلاق و خوش طبع، خوش گفتار، خوش شکل و خوش سیرت، منکسر المزاج، اعلیٰ خاندانی شرافت و نجابت کے حامل جناب پروفیسر اشفاق احمد خان (مؤلف انسائیکلوپیڈیا) سے میرے ذاتی مراسم تقریباً تیرہ سال قبل اُس وقت شروع ہوئے جب میں اُن سے استفادہ کے لئے گاہے گاہے اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کے ذکر کی مجلسوں، جمعہ کے خطابات اور نمازِ تراویح کے بعد درسِ قرآن کی رُوح پرور محافل میں حاضر ہوتا اور اپنی جھولی کو ایمان و ایقان کی طراوت و تازگی سے بھر کر اُٹھتا۔

پروفیسر موصوف 1939ء کے اوائل میں ملتان کے ایک معزز و نجیب بلوچ گھرانے میں پیدا ہوئے۔ خوش بختی یہ کہ ساڑھے آٹھ برس کی عمر میں اُنہوں نے قرآن مجید حفظ کر لیا تھا اور نو برس کی عمر میں اپنے ہونے والے سسر اور ماموں جناب حافظ محمد اسلم خان مرحوم جو ملتان کے جانے پہچانے، چوٹی کے وکلاء میں سے تھے، کی راہ نمائی میں پہلا مصلّٰی سنایا۔ اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ کے فضل و کرم سے اُس وقت سے لے کر تا حال (چوہتر، پچھتر

برس کی عمر تک) بلا ناغہ وہ محض رضائے الٰہی کی خاطر تراویح پڑھاتے چلے آ رہے ہیں اور عرصہ اُنیس سال سے سنائی گئی منزل کا ترجمہ اور تفسیر بھی کرتے چلے آ رہے ہیں۔ اِس تمام کارِ خیر میں کوئی مالی طمع یا مادّی منفعت نام کو نہیں ہوتے جو ایک ایسی صفت ہے جو آج کے مادّی دَور میں ڈھونڈے سے نہیں ملتی۔ اُن کے والدِ محترم اور نانا جانِ مکرّم ۔۔ رحمت اللہ خان ۔۔ جو ہم نام تھے' دونوں ملتان کے سربرآوردہ مشیرانِ قانون تھے۔

میٹرک سے لے کر ایم اے تک پروفیسر موصوف کا تعلیمی ریکارڈ قابلِ رشک رہا اور بورڈ ریونیورسٹی کے ہر امتحان میں وہ اعلیٰ فرسٹ ڈویژن نمایاں امتیاز کے ساتھ حاصل کرتے رہے۔ 1962ء میں یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور سے ایم اے عربی نمایاں امتیاز میں پاس کرنے کے بعد اُنہوں نے اڑھائی برس تک ولایت حسین اسلامیہ ڈگری کالج' ملتان میں بطور لیکچرار (عربی وعلومِ اسلامیہ) تدریسی خدمات انجام دیں اور مئی 1966ء میں پبلک سروس کمیشن کی طرف سے سرکاری ملازمت ملنے پر گورنمنٹ ڈگری کالج ڈیرہ اسمٰعیل خان (صوبہ سرحد) میں بطور لیکچرار ان عربک تعینات ہوئے۔ انہوں نے دوسرا ایم اے علومِ اسلامیہ میں پنجاب یونیورسٹی سے پرائیویٹ طور پر 1966ء میں فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔ گورنمنٹ کالج علی پور اور گورنمنٹ کالج مظفر گڑھ دونوں کالجوں میں ڈیڑھ ڈیڑھ سال بطور عربی لیکچرار خدمات انجام دیں۔ 1969ء میں اُن کا مظفر گڑھ سے گورنمنٹ ایمرسن کالج ملتان میں تبادلہ ہوا جہاں اُن کا عرصۂ قیام ساڑھے ستائیس برس کا ہے۔ اُسی کالج سے اُنہوں نے مئی 1997ء میں بطور ایسوسی ایٹ پروفیسر گریڈ 20 میں ڈیڑھ سال قبل از وقت(Pre-mature) ریٹائرمنٹ لی۔

لسانِ عربی پروفیسر موصوف کا شروع ہی سے انتہائی پسندیدہ اور دلچسپی کا مضمون رہا ہے۔ اپنے طالب علمی کے زمانہ ہی سے اُن کی دلی آرزو تھی کہ اَحکَمُ الحاکِمین کے آخری نسخۂ بے بہا ۔۔ قرآنِ مبین ۔۔ کے نوادرات وعجائبات کو طشت از بام کیا جائے اور بھولی بھٹکی انسانیت کو ایک نئی جہت سے مشعلِ راہ دکھائی جائے۔ ملازمت کے دوران کچھ گھریلو ذمہ داریوں اور دیگر مسائل نے اُن کی اِس آرزو کو شرمندۂ تعبیر ہونے کا موقع نہ دیا لیکن بندے میں جذبہ صادق اور پُرخلوص لگن ہو تو دستِ غیب خود مدد فرماتا ہے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد قدرت نے موقع دیا اور اُس وقت (1997ء) سے لے کر اب تک وہ اسی کام کی تکمیل میں لگے ہوئے ہیں۔ بحمدہٖ تعالیٰ حصّہ انگریزی کی چھ جلدیں چھپ کر منصۂ شہود پر آ چکی ہیں۔ موجودہ حصّہ اردو جو حصّہ انگریزی کا ترجمہ ہے' بھی اُسی کاوش کا ایک حصّہ ہے۔

جناب پروفیسر موصوف کی تحریر وتقریر دونوں میں جو خاص بات راقم الحروف نے معلوم کی' وہ یہ کہ ہر دو میدانوں میں وہ کوئی بات بغیر دلیلِ قطعی(Cogent Argument) کے نہیں کرتے۔ اُنہوں نے قرآن مجید کی حقانیت اور عظمتِ رسول ﷺ کو جس مدلل انداز میں منوایا ہے' وہ کسی عام آدمی کے بس کی بات نہیں۔ اپنے

موقف کے ثبوت میں قرآنِ مبین اور احادیثِ مبارکہ کے حوالہ جات اُنہیں نوکِ زباں اور مستحضر ہوتے ہیں۔ قارئینِ کرام زیرِ نظر انسائیکلو پیڈیا میں بھی اُن کا یہی رنگ ڈھنگ جا بجا دیکھیں گے۔

فاضل پروفیسر موصوف کو اپنا مخلصانہ خراجِ تحسین پیش کرنے میں میرا ریشِ قلم کانپتا ہے اور خوشی و شادمانی سے صفحہِ قرطاس جھوم جھوم اٹھتا ہے کیونکہ وہ درویش منش بندہِ خدا ''عشقِ رسول'' اور ''عشقِ قرآن'' کی مستی میں سرشار' دنیا کی ہوا و ہوس سے کوسوں دُور اور نام و نمود اور شہرت سے نفور و بیزار ہے۔ اپنے دل کی اتھاہ گہرائیوں سے راقم الحروف پروفیسر موصوف کی صحت' ایمان کی سلامتی' طول العمری' اُن کے خانہ اور اہلِ خانہ کی خیر و برکت کے لئے دعا گو ہے اور یہ کہ اللہ رب العزت اُن کی اِس کاوش کو اپنی بارگاہِ عالیہ میں شرف قبول بخشے اور اِسے اُن کے اور اُن کے والدین کے لئے سرمایہِ نجات بنائے !! آمین بہ طفیل سیّد المرسلین ﷺ۔

M Ramzan
محمد رمضان چوہدری (انجینئر)

۱۴ ذیقعد ۱۴۳۴ھ
۲۱ ستمبر 2013ء

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

تاثرات

''قرآنک انسائیکلو پیڈیا'' کے اردو ترجمہ سے متعلق اپنے تاثرات رقم کرتے ہوئے مجھے بے حد دلی مسرت ہو رہی ہے اور میں اپنے لئے سعادت سمجھتا ہوں کہ پروفیسر اشفاق احمد خان صاحب نے انوار القرآن سے دل و دماغ کو روشن کرنے کے اہتمام کا آغاز مجھ عاجز کی رہائش گاہ سے آج سے اکیس سال قبل کیا۔ سال ۱۴۱۴ھ تا ۱۴۳۰ھ (1993ء تا 2009ء) کے ہر رمضان المبارک میں تراویح کے بعد ترجمہ و تفسیر کی روح پرور مجالس منعقد ہوتی رہیں۔ اَلْحَمْدُ لله حضرت پروفیسر صاحب کی شب و روز کی مخلصانہ مساعی جن میں کمپیوٹر پر سولہ سے اٹھارہ گھنٹے روزانہ کام اور پرنٹنگ شامل ہے' یہ سب مراحل اُنہوں نے تن تنہا اکیلے طے کئے۔ بہ ظاہر عمر کے اِس حصّے میں یہ سب کچھ ناممکن سا نظر آتا ہے لیکن بہرحال رب تعالیٰ نے اپنے خاص فضل و کرم کے ساتھ اِن ناممکنات کو حدِّ امکان تک پہنچایا کیونکہ پروفیسر موصوف نے یہ سب کچھ ربّ العالمین کی رضا اور صاحبِ قرآن حضرت محمد رّسول اللہ ﷺ کی خوشنودی کے لئے کیا۔ میں حیران ہوتا ہوں کہ کس طرح اتنا بڑا پراجیکٹ اکیلے تن تنہا آدمی کے ہاتھوں تکمیل پذیر ہوا جبکہ ایسے کام کے لئے اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات کی باقاعدہ' منظم اور باحوصلہ جماعت کی ضرورت ہوتی ہے۔ قرآنک انسائیکلو پیڈیا (انگریزی) کی چھ ضخیم جلدیں جو چھ ہزار سے زائد صفحات پر مشتمل ہیں' خوبصورت اور معیاری طباعت' سرِ ورق (ٹائٹل) بہترین اور اعلیٰ امپورٹڈ کاغذ کے ساتھ چھپ کر منظرِ عام پر آ چکی ہیں۔ علمی حلقوں اور ریسرچ سکالرز میں اُن کی افادیت کا بھرپور اعتراف کیا گیا۔ ملک کی نامور یونیورسٹیوں نے اُنہیں اپنی لائبریریوں کی زینت بنایا۔ امریکہ' برطانیہ' کینیڈا اور دوسرے یورپی ممالک سے اس کی ڈیمانڈ آئی۔ قرآن فہمی کی تحریک میں انگریزی خواں طبقہ کے لئے اِس صدی کا یہ سب سے بڑا کارنامہ اور تحفہ جناب پروفیسر صاحب کے حصّہ میں آیا۔ ذٰلِکَ فَضۡلُ اللّٰہِ یُؤۡتِیۡہِ مَنۡ یَّشَآءُ

انسائیکلو پیڈیا کی پہلی جلد (بہ زبانِ انگریزی) کی اشاعت سے ہی یہ ضرورت محسوس ہونا شروع ہو گئی تھی کہ اردو خواں طبقہ کو بھی معارفِ قرآنی کے اس چشمۂ فیض سے سیراب ہونے کا موقع ملنا چاہئے۔ اس سلسلے میں مجھ جیسے بہت سے احباب نے پروفیسر صاحب سے درخواست کی تو اُنہوں نے خود ہی اس سرمایہ علمی کو چند اضافوں کے ساتھ اردو میں منتقل کرنے کا وعدہ کر لیا۔ ربُّ العالمین کی توفیق نے دستگیری کی اور چار ضخیم جلدوں میں اردو ترجمہ اشاعت پذیر ہوا جبکہ اُس کی پانچویں جلد معزز قارئین کے ہاتھوں میں ہے۔ اَلْحَمْدُ لله مجھے اردو ترجمہ کی دوسری جلد میں اپنے تاثرات لکھنے کا موقع ملا اور اَلْحَمْدُ لله ثُمَّ اَلْحَمْدُ لله اس کی تیسری' چوتھی اور پانچویں جلد میں بھی خراجِ

تحسین پیش کرنے کی سعادت میسر آئی ۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ اردو ترجمہ میں وہ تمام خصوصیات موجود ہیں جو انگریزی متن میں ہیں ۔ ترجمہ میں انسائیکلو پیڈیا کے متعدد علوم وفنون پر مبنی موضوعات کی علمی و تکنیکی اصطلاحات کو جس کمال خوبی سے اردو زبان میں ڈھالا گیا اس سے اس کے ترجمہ کا گمان تک نہیں گزرتا ۔ ادب، سیاست، عمرانیات، طبی علوم، ایمانیات و مذہبیات اور فلسفہ وغیرہ پر قرآن مجید واحادیثِ نبویہ کے حوالوں سے وقیع مقالات کی فکری گہرائی آشکار ہوئی جو صاحب موصوف کی اردو، انگریزی اور عربی تینوں زبانوں پر مکمل دسترس کی شاہد ہے ۔ زیرِ نظر جلد (پنجم) میں علم الماء (Hydrology)، صحت عامّہ (Hygiene)، بیمہ، سود، بین الاقوامی تعلقات اور اسلام کی خارجہ پالیسی جیسے جدید علوم قرآن وحدیث کے حوالوں اور اسلامی عقائد واعمال کی توضیح کے ساتھ جدید سائنسی نظریات کے تناظر میں نہایت ہی ایمان افروز اور لائق مطالعہ ہیں ۔ ساتھ ہی ساتھ رسالت کے منصب جلیلہ کی عظمت و رفعت کو موقع بہ موقع اُجاگر کیا گیا ہے اور دشمنانِ اسلام کے ناپاک پروپیگنڈے کا مُسکت اور منہ توڑ جواب دیا گیا ہے ۔ ایم فل اور پی ایچ ڈی کے متعدد طلبہ وطالبات اپنی ریسرچ کے دوران اِن نادر عنوانات سے استفادہ کر چکے ہیں ۔

میں دل کی اتھاہ گہرائیوں سے دعا گو ہوں کہ اللہ ربّ العزت اپنے حبیب پاک حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے طفیل صاحب موصوف کو بقیہ جلدوں کے ترجمہ کی بھی توفیق ارزانی فرمائے تاکہ اردو خواں طبقہ بھی اس عظیم علمی وروحانی چشمہِ فیض سے بہرہ مند ہو سکے ۔ آمین بجاہِ سیّد المرسلین وخاتم النّبیّین علیہ الصلوٰۃ والسلام ۔

محمد تسلیم قریشی

ڈاکٹر محمد تسلیم قریشی
میڈیکل سپرنٹنڈنٹ
ریلوے ہسپتال ۔ ملتان

23 ستمبر 2013

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ O

کچھ عرض مؤلف کے بارے میں

اللہ جلّ مجدہٗ نے نبی مکرّم رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عَلَّمَكَ مَالَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ کی نعمتِ عظمٰی سے نواز کر بھی رَبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا جیسی دعا سکھائی اور اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ کو نوعِ انسان کی تقدیر بدلنے کا مژدہ سنا کر حضرتِ انسان کو عظمت کی بلندیوں سے سرفراز کیا۔ اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا کی مصداق ہستی نے سندِ علم کے حامل افراد کو اپنی وراثت کا جانشین قرار دیا۔ ارشادِ نبوی ﷺ ہے : اَلْعُلَمَاءُ وَرَثَةُ الْاَنْبِیَاءِ یعنی علماء انبیاء کے وارث ہیں۔ وراثت وہ چیز ہوتی ہے جو نسل در نسل منتقل ہوتی رہتی ہے مگر رہبرِ انسانیت علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ہزار ہا نعمتوں میں جانشینی صرف دولتِ علم میں رکھی۔

وارثینِ علم کے اِسی کارواں کی ایک روحِ رواں ہستی خلوت در انجمن (ریٹائرڈ) پروفیسر حافظ اشفاق احمد خان صاحب بھی ہیں جو امیر خسرو کے لقب یافتہ پاکستان کے قدیم ترین شہر مدینۃ الاولیاء ملتان میں 1939ء میں پیدا ہوئے۔ مہد سے علم کی گھٹی لے کر تعلیمی ماحول میں پروان کا آغاز ہوا جو کئی امتیازی اعزازات کے ساتھ جاری و ساری ہے۔ میٹرک سے ایم اے تک موصوف نے اعلیٰ فرسٹ ڈویژن کی حد عبور کرتے ہوئے تحقیقی شعار کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا۔ 1962ء میں یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور سے بڑے امتیاز کے ساتھ ایم اے عربی کرنے کے بعد ولایت حسین اسلامیہ ڈگری کالج ملتان میں عملاً تدریسی شعبہ سے وابستہ ہوگئے۔ 1966ء میں پنجاب یونیورسٹی سے پرائیویٹ طور پر ایم اے علوم اسلامیہ فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا اور اُسی سال پبلک سروس کمیشن کی طرف سے باضابطہ طور پر گورنمنٹ ڈگری کالج ڈیرہ اسماعیل خان میں بطور عربی لیکچرار تعینات ہوئے۔

طلبِ علم کے شوق نے اس پیاسے صحرا کو نامور علمی شخصیات کی صحبت نے علمی چاشنی سے سیراب کیا یہاں تک کہ علمی میدان کے ساتھ روح کی غذا کی فکر بھی لاحق ہوئی۔ صوم وصلاۃ کی پابندی اگرچہ طبیعت کا جزوِ لاینفک تھی مگر مزید نکھار کے لئے عرب وعجم کے علمی وروحانی بحرِ بیکراں غزالیِ زماں، رازیِ دوراں حضرت علامہ احمد سعید کاظمی رحمۃ اللہ علیہ کے حلقہ ارادت میں 1975ء میں شامل ہونے کا شرف حاصل کیا۔

مختلف تعلیمی اداروں (ڈی آئی خان، علی پور، مظفر گڑھ، ملتان) میں تدریسی فرائض انجام دیتے ہوئے بالآخر 1997ء میں گورنمنٹ ایمرسن کالج ملتان سے بطور ایسوسی ایٹ پروفیسر قبل از وقت ریٹائرمنٹ لے لی جس کا مقصدِ وحید قرآن کے جواہر پاروں کو بندگانِ خدا تک تحریری شکل میں پہنچانا تھا۔ اس 35 سالہ سنہری دور میں تدریسی فرائض کے علاوہ مؤلف کے کئی تحقیقی مقالات و مضامین بھی منصۂ شہود پر آئے جن سے آپ کا تعلیمی جوہر آشکارا ہوا اور ملتان ما پایہ جنت است کو جہاں اہلِ تصوّف کے مسکن کا اعزاز حاصل ہے، وہاں بے شمار علمی ذی وقار لوگوں میں ایک

قابلِ قدر اضافہ ہوا۔ تحقیقی کاوشوں کا اجمالی ذکر درج ذیل ہے:

(۱) ''شاعری اور اسلام'' بہ مطالعہ خصوصی جناب حسان بن ثابت انصاری رضی اللہ عنہ (مطبوعہ ۱۹۸۳ء)
(۲) مسلمان بیوی (مطبوعہ ۱۹۹۲ء) (۳) آیاتِ عتاب (غیر مطبوعہ)
(۴) ردِّ قادیانیت (غیر مطبوعہ) (۵) رہنمائے حج و عمرہ (غیر مطبوعہ)

اس خاموش علمی سمندر کے قلم سے اَن گنت تحقیقی و معلوماتی مضامین و مقالہ جات گورنمنٹ ایمرسن کالج ملتان کے میگزین ''نخلستان'' میں حبّ اللہ وحبّ الرسول ﷺ کے عنوانات کے تحت چھپتے رہے۔

المصطفیٰ ایجوکیشنل سوسائٹی کے زیرِ اہتمام سالانہ میلادِ مصطفیٰ کانفرنس میں عظمتِ مصطفیٰ ﷺ، رفعت مصطفیٰ ﷺ کے عنوانات سے عشق و مستی میں ڈوبے ہوئے تحقیقی کلمات بارہا پیش کئے گئے جن کا لبِّ لباب یہی تھا کہ قرآنِ حکیم ایک بحرِ مواج ہے جس کے لعل و یواقیت کو پانے کے لئے ایسی غوطہ زنی کی ضرورت ہوتی ہے جس پر نگاہِ صدّیقی و قلبِ بلالی اور تفسیر عبداللہ بن عبّاس کی چھاپ لگی ہو جس کے بغیر بموجب فرمودہ الٰہی یُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا قرآن بہتوں کو گمراہ بھی کر دیتا ہے۔

سال 2006ء میں امام بخاری انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی سیالکوٹ شہر کے زیرِ اہتمام آل پاکستان مقابلہ مقالہ نگاری بہ عنوان ''پیغمبرِ امن حضرت محمد ﷺ'' میں پروفیسر موصوف کو مبلغ تیس ہزار روپے بہ شمول متعدّد قیمتی کتب کے دوسرے انعام سے نوازا گیا۔

سال 2007ء کے ماہ اگست میں آدھ آدھ گھنٹے کی تقاریر حسبِ ذیل عنوانات پر پاکستان ٹیلیویژن پر ریکارڈ کرائی گئیں جو ''النور'' چینل لندن سے مختلف دنوں میں نشر ہوئیں:

(۱) ۱۸ اگست ۲۰۰۷ء: توحید باری تعالیٰ کے آفاقی دلائل۔
(۲) ۱۹ اگست ۲۰۰۷ء: توحید باری تعالیٰ کے اَنفسی دلائل۔
(۳) ۱۹ اگست ۲۰۰۷ء: معراجِ نبوی ﷺ جدید سائنس کے آئینہ میں (حصّہ اوّل)
(۴) ۱۹ اگست ۲۰۰۷ء: معراجِ نبوی ﷺ جدید سائنس کے آئینہ میں (حصّہ دوم)
(۵) ۱۹ اگست ۲۰۰۷ء: معراجِ نبوی ﷺ جدید سائنس کے آئینہ میں (حصّہ سوم)
(۶) ۱۰ اگست: بشریتِ مصطفیٰ ﷺ
(۷) ۱۰ اگست: مضامین سورہ اَلضُّحیٰ (حصّہ اوّل)

(۸) ۱۰ اگست ۲۰۰۷ء : مضامین سورہ الضحیٰ (حصہ دوم)
(۹) ۱۱ اگست : نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام مختارِ کل
(۱۰، ۱۱) ۱۱ اگست : آنحضور ﷺ بطور بُرہانِ ربّانی (حصہ اوّل، حصہ دوم)
(۱۲) ۱۱ اگست : تعوذ
(۱۳) ۱۲ اگست : تسمیہ
(۱۴) ۱۲ اگست : مصطفائی معاشرے کا قیام اور عصرِ حاضر کا چیلنج
(۱۵، ۱۶) ۱۲ اگست : آنجناب ﷺ کا علمِ غیب (عطائی) (حصہ اوّل، حصہ دوم)
(۱۷ تا ۲۰) ۱۳ اگست : فضیلت افضل الرُّسُل ﷺ بہ زبانِ فرقانِ حمید (حصہ اوّل، دوم، سوم، چہارم)
(۲۱) ۱۴ اگست : آنجناب ﷺ بطور رحمۃ للعالمین۔
(۲۲) ۱۴ اگست : نبوّت کی ضرورت و اہمیت۔
(۲۳) ۱۴ اگست : والدین کے حقوق (اولاد کے فرائض)
(۲۴، ۲۵) ۱۵ اگست : میلادِ مصطفےٰ ﷺ (حصہ اوّل، حصہ دوم)
(۲۶) ۱۵ اگست : حقوقِ اولاد (والدین کے فرائض)
(۲۷، ۲۸، ۲۹) ۱۶ اگست : بارگاہِ نبوی کے آداب (حصہ اوّل، حصہ دوم، حصہ سوم)
(۳۰، ۳۱، ۳۲) ۱۷ اگست : قرآنِ حکیم اور سائنسی حقائق (حصہ اوّل، حصہ دوم، حصہ سوم)
(۳۳) ۱۷ اگست : سورۃ البقرۃ کی ابتدائی آیات کا ترجمہ وتفسیر (حصہ اوّل)
(۳۴) ۱۸ اگست : سورۃ البقرۃ کے رکوع اوّل کا ترجمہ وتفسیر (حصہ دوم)
(۳۵) ۱۸ اگست : عائلی زندگی (نکاح) کے اسلامی اغراض ومقاصد
(۳۶) ۱۸ اگست : قرآن اور صحافت (Journalism)
(۳۷) ۱۹ اگست : ایصالِ ثواب وفاتحہ از روئے قرآن وحدیث
(۳۸، ۳۹) ۱۹ اگست : توبہ، استغفار کی اہمیت (حصہ اوّل، حصہ دوم)
(۴۰) ۱۹ اگست : خاوند کے حقوق (بیوی کے فرائض)
(۴۱) ۲۰ اگست : بیوی کے حقوق (خاوند کے فرائض)
(۴۲) ۲۱ اگست : اسلام اور کلوننگ (Cloning)
(۴۳) ۲۱ اگست : نظریہ ارتقاء بمقابل نظریہ تخلیق (اسلام اور ڈارونزم)
(۴۴) ۲۲ اگست : رب تعالیٰ نے پورے قرآن مجید میں کہیں بھی رسول کو چھوڑ کر صرف اور صرف اپنی اطاعت کا حکم کیوں نہیں دیا؟
(۴۵) ۲۲ اگست : واقعہِ اِفک میں سیّدہ عائشہ صدّیقہ رضی اللہ عنہا کی فضیلت بزبانِ فرقانِ حمید۔
(۴۶) ۲۲ اگست : پیغمبرِ اسلام ﷺ اور منافقینِ مدینہ

زندگی کے خوبصورت لمحات قرآن مجید و فرقانِ حمید کی نسبت سے بھی خالی نہ رہے۔ کلام الٰہی کی حفظ جیسی نعمتِ غیر مترقبہ کے حصول سے لے کر تا امروز تراویح پڑھانے کا سلسلہ جاری ہے اور ساڑھے آٹھ برس کی عمر سے لے کر اب چوہتر سال کی عمر تک بحمدہٖ تعالیٰ کوئی ناغہ نہیں ہوا۔ لطف یہ کہ اس کارِ خیر میں کبھی بھی کوئی مالی منفعت یا جلبِ زر کا مقصد کارفرما نہیں رہا۔ رضائے الٰہی کا یہ جذبہ فقید المثال ہے اور اس مادیّت کے دَور میں ڈھونڈے سے نہیں ملتا۔ بالخصوص قرآنک ایجوکیشن اینڈ سوشل سروسز ویلفیئر ٹرسٹ (رجسٹرڈ) کے زیرِ اہتمام مسلسل 17 سال کی تراویح میں قرآن سنانے کی سعادت مع تفسیر حاصل کی۔ کئی طالب' دینِ حق کے متلاشی اور تشنگانِ علم اس چشمۂ فیض سے سیراب ہوتے رہے۔ علاوہ ازیں متعدد بار مختلف مقامات پر دروسِ قرآن کا روح پرور شغف بھی جاری رہا۔

دیارِ حرمین شریفین کی تڑپ کس مسلمان میں نہیں ہوتی! قدرت نے آپ کی لگن کو شرفِ باریابی بخشا اور بقولِ شاعر ؂

تیری معراج کہ تو لوح و قلم تک پہنچا　　میری معراج کہ میں تیرے قدم تک پہنچا

رب تعالیٰ کے فضل و کرم اور اُس کے محبوبِ اکرم ﷺ کی نگاہِ لطف و عنایت سے یہ معراج بار بار سرمایہِ حیات بنتی رہی۔ اللہ کرے یہ فیض دائم جاری رہے بجاہِ سیّد المرسلین ﷺ۔

راقم الحروف کا یہ مضمون نامکمل رہے گا اگر یہاں یہ ذکر نہ کیا جائے کہ پروفیسر موصوف کے تینوں صاحبزادگان حافظِ قرآن ہیں۔ حفظِ قرآن کی دولت سے نوازے جانے کے شکریہ میں پروفیسر موصوف نے اُنہیں دیارِ حبیب علیہ السلام میں حاضری کے شرف سے بھی مشرف کیا۔

اس مادیّت گزیدہ دَور میں عقبیٰ کو بہتر سے بہتر بنانے کا یہ جذبہ' یہ علمی کارنامے اور متنوع قسم کے مقالات و مضامین اِس حقیقت کا بیّن ثبوت ہیں کہ آپ کے من میں حق جویائی' ذوقِ قرآن اور عشقِ رسول ﷺ سے والہانہ شیفتگی اور تڑپ کوٹ کوٹ کر بھری ہے اور آپ کو اہلِ عشّاق کے دامن سے وابستگی پر فخر ہے۔

خاص الخاص اہم کارنامہ جو صدیوں علمی میخانوں میں آپ کی خوبصورت و خوب سیرت یاد کو جگمگاتا رہے گا' وہ سنگِ میل ''قرآنک انسائیکلوپیڈیا'' ہے جو قدرتِ کاملہ کی طرف سے آپ کے لئے بہت بڑی نعمتِ عظمٰی ہے۔ ایک ایسی ہستی جو عمر کے آخری حصّے اور عالمِ پیری میں الگ تھلگ گمنامی کی دنیا میں مست' علم کے زیور سے اپنی زندگی کو آراستہ کرتی رہی اور پندرہ سال کی مسلسل اور غیر منقطع محنتِ شاقہ سے تن تنہا Single-handedly اِس کٹھن مقصد کو پایہِ تکمیل تک پہنچایا۔ ایسے معرکے تو افراد کے مجموعوں سے تا دیر تشکیل پاتے ہیں۔ بلا مبالغہ یہ محیّر العقول کارنامہ اللہ کے فضل و کرم اور رحمتِ محتشم ﷺ کی نظرِ فیض رساں کے بغیر انجام نہیں پا سکتا۔

قارئینِ صدذی وقار! اب آپ خود اندازہ فرمالیں کہ ایک طرف ایک اکیلی جان جس کے پاس نہ جدید ذرائع اِبلاغ' نہ مواد کی ترسیل میں آسانی' نہ فنڈنگ کی سہولت' نہ ادارتی بورڈ' نہ مقالہ نگار رصاحبان' نہ تالیف کرنے والے' نہ

شائع کرنے والی بڑی کمپنیاں اور نہ کوئی سپانسر کرنے والا ادارہ' مزید یہ کہ عربی کا اتالیق ہونے کے باوجود زبانِ انگریزی کو ذریعۂ اظہار بنانا' ان مذکورہ مشکلات کے باوجود صرف ایک ہی ذات یعنی اپنے خالق و مالک پر توکل کرتے ہوئے اتنا بڑا تعلیمی معرکہ انجام دینا واقعی کوئی معجزہ ہی لگتا ہے اور پھر اس کی مارکیٹنگ اور ڈسٹری بیوشن کی اضافی ذمہ داری بھی ایک حیران کن امر ہے۔

اس سے پہلے کہ مؤلف کے ''قرآنک انسائیکلو پیڈیا'' کا مختصر سا تعارف ہو' ضروری ہے کہ انسائیکلو پیڈیا کی تاریخ سے مختصراً آگاہی حاصل ہو جائے تاکہ صاحب موصوف کی محنت کی قدر و منزلت کا اندازہ ہو سکے۔

سال (ca AD 77) میں Pliny the Elder کے قلم سے دنیا کا پہلا انسائیکلو پیڈیا Naturalis Historia لکھا گیا جو ایک جلد پر مشتمل تھا۔ لفظ Encyclopedia یونانی لفظ Enkyklios paideia سے ماخوذ ہے جس کا معنی جنرل ایجوکیشن ہے اور جس کا اردو ترجمہ ''دائرۃ المعارف'' کیا گیا۔ دورِ جدید میں سترھویں صدی عیسوی میں Encyclopedia Universal تحریر کیا گیا۔ دنیا کا سب سے بڑا انسائیکلو پیڈیا Spanish Language Enciclopedia Universal Illustrada Europeo-Americana ہے جو 16 جلدوں' 175000 صفحات اور 200 ملین الفاظ پر مشتمل ہے۔ یہ کئی سالوں پر محیط محنت کا ثمر تھا۔

عالمِ مغرب اِس وقت دنیا کی سیادت و قیادت پر براجمان ہے اور علم و سائنس و ٹیکنالوجی میں حیرت زدہ کارناموں کا بلا شرکتِ غیرے پر دھانِ منتری بنا ہوا ہے۔ یقیناً زندہ قومیں تعلیم و تحقیق کے بل بوتے پر زندہ رہتی ہیں نہ کہ سیم و زر پر۔ امتِ مسلمہ کی اس روش کو اغیار نے اپناتے ہوئے معرکۃ الآراء تحقیقی و تخریجی کام کئے مثلاً دنیا کی عربی زبان میں سب سے پہلی اور بڑی ڈکشنری ایک غیر مسلم لبنانی نے تالیف کی۔ المُعجم الفھرس لالفاظِ القرآن جرمن کے فلوجل المانی کی ناقابلِ یقین کاوش ہے۔ المُعجم الفھرس لالفاظِ الحدیث وِنسنٹ کا تحریر کردہ حدیث کی دنیا میں اَن مٹ کارنامہ ہے۔ اِنہی کوششوں کے اثناء میں عالمِ مغرب نے مذہبِ اسلام پر بھی تحقیق نگاہ دوڑائی اور 16 جلدوں میں نیدر لینڈ اسلامک سنٹر سے اسلامک انسائیکلو پیڈیا 1960ء میں شائع کرایا جو پاکستان میں اُس کی تصحیح کے بعد اُردو زبان میں 1970ء میں پہلی بار شائع ہوا۔ اسی طریق پر چلتے ہوئے 1980ء میں ''قرآنک انسائیکلو پیڈیا'' کے نام سے چھ جلدیں نیدر لینڈ اسلامک سنٹر نے چھاپی ہیں۔ یہ تحسینِ عمل لاکھ سہی مگر غیر مسلم اسلام دشمنی اور قرآن دشمنی نہ چھپا سکے اور کئی زہر آلود تحریریں یکجا کر دیں۔

اُمتِ مسلمہ کے دردمند و با صلاحیت اہلِ علم نے اپنے تحقیقی ذوق کے ساتھ ریشِ قلم کو جنبش دی اور پہلی مرتبہ 1985ء میں سعودی عرب نے الموسوعة العربية العالمية عربی زبان میں شائع کیا مگر قرآنک انسائیکلو پیڈیا کا قرض تادمِ تحریر باقی تھا کہ اللہ جلّ جلالہٗ نے اپنے ایک ایسے بندے کا انتخاب کیا جو بظاہر وسائل سے محروم مگر جذبوں میں جواں تھا۔ میری مراد مؤلف ''قرآنک انسائیکلو پیڈیا'' جناب پروفیسر حافظ اشفاق احمد خان صاحب ہیں

جن کے حصے میں یہ لازوال سعادت آئی۔ نہ صرف پاکستانی قوم بلکہ پوری اُمّتِ مسلمہ کو اُن پر فخر ہے کہ بزرگی کے عالم میں پوری مسلم قوم کی طرف سے قرض چکا دیا۔ اس پر ربِّ جلیل کی جتنی حمد وثنا کی جائے اور سجدۂ شکر ادا کیا جائے کم ہے۔ سرکارِ ہر جہاں ﷺ کا یہ فرمانِ عالی برحق ہے کہ باری تعالیٰ جس سے جو کام لینا چاہتا ہے وہ اُس شخص کے لئے آسان کر دیتا ہے۔

''قرآنک انسائیکلو پیڈیا چھ جلدوں میں 6100 صفحات اور 300 سے زائد تحقیقی مقالات پر مشتمل ہے جو انگریزی زبان میں آفسٹ غیر ملکی کاغذ اور دیدہ زیب طباعت سے مزیّن ہے جس میں ایک علمی بحرِ تلاطم ہے۔ علم کے متلاشیوں کے لئے ایک جانفزا تحقیقی سرمایہ ہے محققین کی عرق ریزیوں کو جلا بخشنے والا ہے اور انگریزی ادب کا منہ بولتا شاہکار ہے۔ مزید سونے پہ سہاگہ یہ کہ مؤلف نے احباب کے پُرزور مطالبے پر اسے اردو زبان میں ترجمہ کے ساتھ اور اس میں مزید معلومات کا اضافہ کر کے شائع کرنے کا بیڑا بھی اٹھا لیا ہے جس کی پانچ جلدیں چھپ کر آ چکی ہیں اور بقایا جلدیں ابھی ترجمہ ہونے کے عمل میں ہیں۔

بلا شک وشبہ ''قرآنک انسائیکلو پیڈیا'' دنیائے علوم کا لازوال خزانہ ہے۔ مؤلف کی آرٹس کی شخصیت ہونے کے باوصف سائنسی میدان میں مہارتِ تامّہ کا گمان لگتا ہے۔ کہنے کو تو یہ قرآن کا دائرۃ المعارف (انسائیکلو پیڈیا) ہے مگر سائنسی معلومات نے اُسے ایک علیحدہ تشخص دے دیا ہے اس لئے اس کا نام ''قرآنک سائنٹفک انسائیکلو پیڈیا'' (Qur'anic Scientific Encyclopaedia) ہونا چاہئے۔ اس بار آور ثمر کے بہت سے پہلو مطالعہ ہی سے منکشف ہوں گے اور انشاء اللہ یہ رفتہ رفتہ علمی حلقوں کی صدا بنتا جائے گا۔ اگر اس پورے انسائیکلو پیڈیا کو تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ کی تفسیر کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ بہر حال اس عظیم جُہدِ مسلسل کو جتنا خراجِ تحسین پیش کیا جائے کم ہے۔ اب قوم پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اس علمی ورثہ کی حوصلہ افزائی کا عملی مظاہرہ کرے اور اربابِ اختیار سے یہ مطالبہ ہے کہ بلا توقف پروفیسر صاحب کے لئے .Ph.D کی اعزازی ڈگری جاری کی جائے تاکہ ایک فرد جو اپنی ذات میں انجمن ہے کے جذبوں کو مزید جلا ملے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کون سی یونیورسٹی یہ سعادت اپنے دامن میں سمیٹتی ہے!

مت سہل اِسے جانو پھرتا ہے فلک برسوں تب خاک کے پردے سے انسان نکلتا ہے (میر تقی میر)

یہ ناچیز مؤلف کے تعارف کا حق ادا کرنے اور ''قرآنک انسائیکلو پیڈیا'' کے محاسن بیان کرنے سے قاصر ہے البتہ جناب یوسف علیہ السلام کی خریدار بڑھیا کی مثل اس تحریر کو اپنے لئے کسی اعزاز سے کم نہیں سمجھتا۔

احقر العباد

خالد محمود

پی ایچ ڈی ریسرچ سکالر۔ بہاء الدین زکریا یونیورسٹی۔ ملتان

یکم اکتوبر 2013ء

تعارف جلد پنجم

قدرت کا یہ اٹل اور لازوال فیصلہ ہے کہ لوگوں نے اپنے چمنِ حیات کو جن خاردار جھاڑیوں سے بھر دیا ہے' اُس کے کانٹوں کی چبھن تو وہ بھی محسوس کریں۔ اپنے گناہوں اور بدکرداریوں کی سزا وہ بھی تو چکھیں اور اس میں حکمت یہ ہے کہ شاید وہ لوگ اپنے اعمالِ بد کی تباہ کاریوں سے عبرت حاصل کریں اور موت سے قبل اپنی اصلاح کر لیں۔ چنانچہ فرمودہِ الٰہی ہوا :

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيقَهُمْ بَعْضَ الَّذِي عَمِلُوا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ O (اَلرُّوم : ۴۱)

"بَر اور بحر میں فساد پھیل گیا ہے بوجہ اُن کرتوتوں کے جو لوگوں نے کیے ہیں تاکہ اللہ اُنہیں اُن کے (بُرے) اعمال کی کچھ سزا اُنہیں چکھائے تاکہ وہ باز آجائیں۔" (۴۱ : ۳۰)

آج مادّی تہذیب کا طوفان جس تندی اور رفتار سے رواں دواں ہے' وہ اسی صورتِ حال کا آئینہ دار ہے جس کا ذکر ربِّ جلیل نے آیتِ بالا میں کر دیا ہے۔ ماضی کی تباہ شدہ اقوام کے ہولناک انجام کی طرف خودفراموش اور خدا فراموش انسان نے توجہ نہ کی کہ جب وہ لوگ ظلم وستم اور فسق و فجور کی تمام حدوں کو پھاند گئے تو مکافاتِ عمل کے بے لاگ قانون نے اُنہیں تہس نہس کر کے رکھ دیا لیکن اُن کا انجام آنے والی نسلوں کے لئے پھر بھی نشانِ عبرت نہ بن سکا۔ چنانچہ سورۃ الرّوم کی اگلی آیت ۳۱ میں فرمایا گیا کہ تم آئندہ آنے والی نسلوں کے لئے باعثِ عبرت نہ بنو بلکہ دینِ قیّم کو مضبوطی سے پکڑ لو اور اُس دن سے پہلے پہلے اپنی اصلاح اور تلافیِ مافات کر لو جسے کوئی ٹال نہیں سکتا۔ یہ وہ بابرکت دین ہے جو اُن کی دنیوی معیشت کی ترقی اور اُخروی فلاح کا ضامن ہے۔

سورۃُ الرّوم کی آخری آیت ۶۰ میں اگرچہ خطاب سرورِ کون ومکان ﷺ کو ہے لیکن اُس سے مراد آپ کی اُمت ہے کہ اے غلامانِ مصطفیٰ! مردانگی کا تقاضا یہ ہے کہ فتنوں کے طوفان آئیں' سر چھوڑ چھوڑ کر واپس لوٹ جائیں اور تم چٹان کی طرح سینہ تانے کھڑے رہو' شکوک وشبہات کی آندھیاں چلیں لیکن تمہاری شمعِ ایمان کو وہ بجھا نہ سکیں۔ ثابت قدمی اور مستقل مزاجی ازل سے اہلِ حق کا شیوہ رہا ہے۔ اُنہوں نے ظلم و جفا کے ہر تیر کو ہمیشہ صبر کی ڈھال پر روکا ہے۔ آج حق کے علمبردار تم ہو اور اُس کی لاج تمہارے ہاتھوں میں ہے۔ ہاتھ کٹ جائیں' سر قلم ہو جائیں۔ حق تعالیٰ کا نام بلند کرنے کے لئے خون کے دریا بہتے ہیں تو اُنہیں خوب بہنے دو' اگر کشتوں کے پشتے لگ رہے ہیں تو ذرا پرواہ نہ کرو۔ رنگ رنگیلی جوانیاں قربان ہو رہی ہیں تو اُنہیں بلا تامّل قربان ہونے دو۔ ہر ہجومِ بلا میں' ہر سیلِ حوادث میں' شک وشبہات کی ہر خونخوار موج کے سامنے ثابت قدم رہو اور صبر کا دامن مضبوطی سے پکڑے رہو۔ لیکن خبردار! دینِ محمدی کا پرچم سرنگوں نہ ہونے پائے۔ حضرت جعفر کی طرح ایک ہاتھ اگر کٹ گیا ہے تو جھٹ دوسرے ہاتھ میں جھنڈا تھام لو اور اگر دوسرا بازو بھی کٹ گیا ہے تو اپنے دانتوں سے پکڑ لو۔ تمہارا جسم اگر تیر وسناں کے چرکوں سے

چھلنی ہو گیا ہے تو کیا ہوا! اسلام کی عظمت و ناموس کو اگر تم نے اپنی جان دے کر بچا لیا تو تم سے زیادہ خوش نصیب اور سرخرو کون ہو گا؟

''سورۃ الرّوم کی آخری آیت ۶۰ کے آخر میں فرمایا : وَلَا يَسْتَخِفَّنَّكَ الَّذِينَ لَا يُوقِنُونَ یعنی وہ لوگ جو یقین نہیں رکھتے، تمہیں (راہِ حق سے) پھسلا نہ دیں۔ اس میں لَا يُوقِنُونَ کا لفظ بڑا توجہ طلب ہے یعنی اہلِ ایمان کے یقین کو برباد کرنے والے وہ لوگ ہیں جو خود بے یقینی کی دلدل میں پھنسے ہوئے ہیں۔ وہ لوگ جو دولتِ ایمان سے مالا مال ہیں اور جن کے دلوں میں نورِ یقین اجالا کر رہا ہے، وہ اگر ایسے لوگوں کی پیروی کرنا شروع کر دیں جو اس نعمت سے بے بہرہ ہیں، تو اس سے بڑا ظلم اور کیا ہو گا!''

''آج جن حالات سے ہم دو چار ہیں، ایسے سنگین حالات سے امتِ مصطفویہ علیٰ صاحبھا الف الف صلوٰۃ و سلام کو شاید ہی کبھی واسطہ پڑا ہو۔ اسلام کے دشمنوں کے پاس مہلک ترین اسلحہ کی جتنی فراوانی آج ہے، پہلے کبھی نہیں ہوئی ہو گی۔ ہر اسلامی ملک ان کے فتنوں کی آماجگاہ بنا ہوا ہے۔ ہر اسلامی حکومت ان کی سازشوں سے لرزہ براندام ہے لیکن ہمیں ان کے ایٹم بموں سے زیادہ خطرہ شکوک و شبہات کے ان لشکروں سے ہے جن سے وہ ہماری نظریاتی سرحدوں پر تابڑ توڑ حملے کر رہے ہیں اور ہمارے عقائد کے ہر مورچہ پر شب خون مار رہے ہیں۔ کاش ہمارے نوجوان اور ہمارے سیاسی اور فکری قائدین اس آیت کے مضمون پر سنجیدگی سے غور کریں اور شیاطینِ جنّ و اِنس میں سے جب بھی کوئی شیطان پھونک مار کر اُن کے یقین کے چراغ کو گل کرنا چاہے تو وہ بے ساختہ اِس آیت کا ورد کرنے لگیں۔ یہ ایسی سپر ہے جس پر آپ اپنے جان و ایمان کے ہر دشمن کا وار بڑے وثوق سے روک سکتے ہیں لیکن جرأت اور حوصلہ مندی شرط ہے۔''

ربِّ ذوالجلال والاکرام نے اُمّتِ مصطفویہ کے ساتھ اُن کی دستگیری اور نصرت کا جو وعدہ فرمایا ہے، وہ سچا ہے۔ یقیناً اُس کی مددامتِ مرحومہ کی پشت پناہی کرے گی۔ وہ بدنصیب جو وہم و گمان کے اندھیروں میں عرصہ دراز سے بھٹک رہے ہیں، وہ بدبخت جنہیں بے یقینی کے اژدہا ڈس رہے ہیں، خبردار! اُن کے جھانسے میں نہ آنا۔ وہ ڈوب رہے ہیں، وہ تمہیں بھی اپنے ساتھ ڈبونا چاہتے ہیں۔ دانشمند لوگ ایسی فحش غلطی کا ارتکاب نہیں کیا کرتے۔ کتنی روح پرور ہے یہ آیت، کتنا ایمان افروز ہے یہ پیغام! شاندار آغاز کی یہ کتنی دلفریب انتہا ہے!

قارئینِ کرام! انسائیکلوپیڈیا جو آپ کے ہاتھوں میں ہے، قِسما قسم کے مختلف موضوعات پر مشتمل ہے جس میں استاذ، طالب علم اور ایک عام شخص پہلی بار مختلف عنوانات کو جامع اور اکمل انداز میں قرآنِ حکیم کی روشنی میں زیرِ بحث پائیں گے جس کا مقصدِ وحید بیچاری، گم کردہ راہ انسانیت کو اُس الٰہی روشنی کی ابدی تابندگی کے قریب سے قریب تر لانا ہے جو نبی آخر الزماں ﷺ پر اُن کے خالق و مالک کی جانب سے نازل کی گئی تا کہ اُس کی مافوق الفطرت جدّت طرازی (Originality) اور صداقت کے قائل ہو کر اُن کے سر بے اختیار اپنے پالنہار کے حضور جھک جائیں!

وہم وگمان اور بے یقینی کے اتھاہ اندھیروں میں بھٹکنے والا ایک بد بخت طبقہ اُن مستشرقین کا بھی ہے جس کا ذکر زیرِ نظر جلد پنجم کے صفحات ۲۱۹۱ تا ۲۱۹۶ اور ۲۴۸۳ میں ہوا ہے اور وہ یہود بھی جنہوں نے اسمٰعیل علیہ السلام کی بجائے اسحاق علیہ السلام کو ذبیح اللہ ثابت کرنے میں ایڑی چوٹی کا زور لگایا جس کا رڈ اور جواب زیرِ نظر جلد پنجم کے صفحات ۲۲۱۵ تا ۲۲۱۷ میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

قارئینِ صد ذی احتشام! خاصہ کا خاصہ رہنا قانونِ قدرت ہے اور جدّ الانبیاء جناب خلیل اللہ ابراہیم علیہ السلام نے وادیِ مکّہ کو وَادٍ غَيۡرَ ذِي زَرۡعٍ یعنی بے آب وگیاہ اور بغیر کھیتی باڑی کی زمین فرمایا تھا۔ کفارِ مکّہ نے نبیِ اکرم ﷺ سے اس وادی کو چمن زار اور مرغزار بنانے کا مطالبہ کیا تھا (بحوالہ سورہ بنی اسرائیل: آیات ۹۰، ۹۱)۔ رب نے فرمایا کہ اگر ہم اُن کے کہنے پر اُسے چمن بنا دیں تو میرے خلیل کی زبان غلط ہو جائے گی، ہاں اپنے حبیب علیہ السلام کی جائے سکونت مدینہ منوّرہ کو چمن ضرور بنا دیں گے۔

عبادات میں جو مقام نماز کا ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں۔ آج ہم اس حقیقت سے بالکل بے بہرہ اور غافل ہیں کہ قرآنِ حکیم نے اَقِيۡمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوۡنُوۡا مِنَ الۡمُشۡرِكِيۡنَ (الرّوم: ۳۱) کے الفاظ میں نماز نہ پڑھنے کو شرک قرار دیا ہے۔ پھر قرآنِ حکیم نے تخلیقِ انسان کا جو مقصدِ محض عباداتِ الٰہی بتایا ہے، اُسے ہم نے مسجد تک محدود کر دیا ہے اور اپنی تمام خارجی زندگی کو عبادت سے علیحدہ قرار دے رکھا ہے۔ یہ ایک ایسی غلط فہمی ہے جس کا شکار ہم میں سے نہ صرف جہلاء بلکہ نام نہاد ''تعلیم یافتہ'' اور ''روشن خیال'' بھی ہیں، جس کے نتیجہ میں نماز ہم پر کوئی خاطر خواہ اثر نہیں کر پائی اور نمازیں پڑھنے کے باوجود ہم میں دنیا جہان کی مخربِ اخلاق بیماریاں پیدا ہو گئی ہیں۔ (تفصیل ملاحظہ ہو زیرِ نظر جلد کا صفحہ ۲۱۵۳)

یہی حال روزے کا ہے جس کی اصل روح یعنی تقویٰ کو ہم نے روزے میں نہیں سمویا، جس کی افادیت اور اعضائے جسمانی پر اس کے مثبت اثرات کو غیر مسلم دانشوروں نے بھی سراہا ہے۔

رسالت جیسے اعلیٰ وارفع منصب کو سمجھنا ہو تو (۱) سورہ عَبَسَ کی ابتدائی دس آیات کو زیرِ مطالعہ لایئے جس کی اوّل کی دو آیات کے عتاب میں حاضر کے صیغہ کی بجائے دونوں جگہ غائب کا صیغہ عَبَسَ وَتَوَلّٰی استعمال ہوا ہے تاکہ نبی علیہ السلام کے قلبِ عاطر کو تکلیف نہ ہو۔ (۲) اسی طرح سورۃ الطّلاق کی اوّل آیت میں خطاب نبی علیہ السلام سے ہے اور از روئے اصول وہاں صیغہ واحد کا استعمال ہونا تھا لیکن اس کی بجائے طَلَّقۡتُمُ کا جمع کا صیغہ منصبِ رسالت کی رفعت وعظمت کو اجاگر کرنے کے لئے استعمال ہوا۔ (۳) اسی طرح سورۃ التوبۃ کی آیت ۴۳ میں الفاظِ عتاب لانے سے پہلے عَفَا اللّٰهُ عَنۡكَ (اللہ نے آپ سے درگزر فرمایا) کے محبت بھرے اور فرحت بخش الفاظ سے خطاب فرمایا۔ یہ کلمات کسی گناہ کی معافی کا ذکر کرنے کے لئے نہیں بلکہ اظہارِ تعظیم وتکریم کے لئے ہیں (امام رازی)۔

آخر میں مجھے یہ بات تسلیم ہے کہ میں نہ تو علومِ اسلامیہ کا کوئی عالم ہوں اور نہ ہی اس انسائیکلو پیڈیا کے تحریر کرنے میں میرا علم و فضل میں پختہ کاری کا کوئی دعویٰ ہے۔ یہ کام قرآنِ حکیم کی اُن صداقتوں کا مجموعہ ہے جو کتابوں میں اِدھر اُدھر بکھرا ہوا تھا۔ میں نے صرف اتنا کیا ہے کہ اُنہیں یکجا کر دیا ہے۔ بڑی حزم و احتیاط کے ساتھ میں نے حوالہ جات/اقتباسات کو اُن کے ماخذ سمیت قوسین کے اندر دے دیا ہے۔ اگر اس ضمن مجھ سے کوئی کوتاہی ہوگئی ہو تو اسے میری خودنمائی، علمی تفاخر یا سرقہ پر محمول نہ کیا جائے بلکہ ''انسان خطا کا پُتلا ہے'' کے مصداق صرفِ نظر کر لیا جائے۔

مجھے اس بات کا بھی اعتراف ہے کہ میری یہ عاجزانہ کوشش حرفِ آخر نہیں لیکن اتنا ضرور ہے کہ یہ کوشش ایک سائنسی اور دینی انقلاب ضرور ہے۔ راقم الحروف نے تو فرمودہِ الٰہی تِبیَانًا لِّکُلِّ شَیْءٍ اور جَمِیعُ العلمِ فی القرآن لکن تَقَاصَرَ عَنْهُ أَفْهَامُ الرِّجَالِ

(سارے علوم قرآن مجید میں ہیں مگر لوگوں کی سمجھ کم ہے) کی صداقت میں اپنے ابنائے جنس کو ایک راہ دکھائی ہے جس کی منزلِ مقصود حدِّ نگاہ سے کوسوں دُور ہے۔ اہلِ علم و فضل بہ صد شوق آگے آئیں اور میرے چھوڑے ہوئے خلا کو پُر کریں کیونکہ میرے ملک کی زرخیز زمین نے بہت سے مشاہیرِ فن اور سلاطینِ علم پیدا کئے ہیں جن کے علم کی چکا چوند کر دینے والی آب و تاب کے آگے میری حیثیت ٹمٹماتے چراغ کی سی ہے۔

زبانِ عربی سے معمولی سدھ بدھ رکھنے کے باوجود میں ساحلِ مراد پر ہرگز نہ پہنچ پاتا اگر خلاقِ عالم کی دستگیری اور عنایت میرے شاملِ حال نہ ہوتی، جس کی وجہ یہ ہے کہ قرآنی علوم میں تحقیق کا کام کوئی خالہ جی کا گھر تو ہے نہیں بلکہ قرآن کے اَن گنت کثیر الموضوعاتی بحرِ مواج سے ایک ''قطرہ'' نکالنے کے لئے پُرلگن، والہ و شیدا اور باصلاحیت لوگوں کے پینل کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں اپنے آپ کو انتہائی خوش نصیب سمجھوں گا اگر یہ ناچیز کوشش اُس قطرے کا جزوِ قلیل بھی ہو جائے اور میں سمجھوں گا کہ میری محنت کا صلہ مجھے مل گیا اگر یہ کوشش اُن لوگوں کے دلوں میں صدائے بازگشت پیدا کرنے کے قابل ہو جاتی ہے جن کے لئے یہ تحریر کی گئی ہے۔

ہزار ہا سجدہ ہائے شکر کے ساتھ راقم الحروف اُس ذاتِ کردگار کے حضور فریاد کناں ہے کہ وہ اپنے فضلِ خاص سے اس ناچیز کوشش کو شرفِ قبول بخشے اور اسے میرے، میرے والدین اور اساتذہ کے لئے سببِ نجات بنائے! آمین

29 ستمبر 2013 — آئی۔اے۔خان

بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم O

(۷۱) مادّی تہذیب کا طوفان اور اُس کے سدِّ باب کی صورت

(Hurricane of Materialistic Culture : Ways & Means to Check it)

دَورِ جدید جسے عام طور پر ''نیو لائٹ'' کا دَور کہا جاتا ہے' راقم الحروف کے نزدیک دراصل یہ New Darkness (نیو تاریکی) کا دَور ہے کیونکہ وہ خود بینی' خود غرضی' نفس پرستی اور نفسانی خواہشات و تلذّذات اور خدافراموشی سے عبارت ہے جس میں باہمی ایثار' انسان دوستی اور اُنس و محبت نام کو نہیں ملتے۔ قرآنِ حکیم نے جس خداخوف سماج کا نقشہ سورۃ الحشر کی آیت نہم میں وَیُؤْثِرُوْنَ عَلٰی اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ'' (وہ دوسروں کو اپنے آپ پر ترجیح دیتے ہیں اگرچہ وہ خود فاقہ میں ہی ہوں) کے الفاظ میں باندھا ہے' محض ایک تصوراتی چیز بن کے رہ گیا ہے اور جس کا وجود صرف کتابِ مبین کے صفحات ہی میں دب کر رہ گیا ہے۔ جلبِ زر اور ہر جائز و ناجائز ذریعہ سے دولت کمانے کی ہوا و ہوس نے کائنات کے اس دولہا کو درندہ صفت بنا دیا ہے' اور هَلْ مِنْ مَّزِيْد کے لالچ نے نیند اور آرام سے اُسے محروم کر دیا ہے جس کے نتیجہ میں وہ رحمٰن و رحیم کا بندہ بننے کی بجائے اَسْفَلَ سَافِلِيْن کی عمیق گہرائیوں میں پہنچ کر شیطانی بندہ بن چکا ہے۔

نفس پرستی کے ان سورماؤں نے ''بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست'' کے مصداق پوری دنیا کو دین سے بیگانہ ایک ایسے جابرانہ نظام میں جکڑ رکھا ہے جس میں بنی نوعِ انسان کی اکثریت شب و روز کی محنتِ شاقّہ کے باوجود جہاں ایک طرف نانِ جویں تک کی محتاج ہے تو دوسری طرف وہ اپنی جان و مال اور عزت کے تحفظ کے لئے لرزیدہ و ترساں ہے۔ سیم و زر' قوّت و اقتدار اور جاہ و منصب کی محبت اُن کے اذہان و قلوب پر اس طرح مسلّط ہو چکی ہے کہ اللہ کی بھڑکائی ہوئی نارِ جہنم میں پہنچنے سے پہلے ہی وہ اِسی چندروزہ فانی دنیا میں اندر ہی اندر جل رہے ہیں۔ اپنے پلید اور ناپاک عزائم کی تکمیل کی خاطر بندگانِ خدا کے خلاف اُن کے اس سوچے سمجھے منصوبہ میں جس تناسب سے اضافہ ہو رہا ہے' اُس تناسب سے کہیں زیادہ اُن کے تفکرات اور الجھنیں اضافہ پذیر ہیں۔ بہتر سے بہتر خواب آور ادویات کے استعمال کے باوجود وہ میٹھی نیند سے محروم ہیں۔ بقول شیکسپیئر اُس کے ہیرو Macbeth نے شاہِ وقت Duncan کو اُس کے سوتے میں قتل کیا تھا' اس لئے Macbeth سے بھی اُس کی نیند کو قتل (حرام) کر دیا گیا' بالکل اُسی طرح ان شیطانی گماشتوں سے بھی اُن کی نیندوں کو حرام کر دیا گیا کیونکہ اُنہوں نے اپنے اَبنائے جنس کی نیندیں اُڑا دی ہیں۔

سیم و زر کے اِن پجاریوں کو یہ بات کیوں نہیں سوجھتی کہ جاہ و منصب اور قوّت و اقتدار کا اصل مقصد امن و آشتی اور ذہنی سکون و آرام ہوتا ہے۔ لیکن ان کا آرام و سکون تو پہلے ہی دولت کی دیوی لے اُڑی ہے تو کیوں نہ اس محرومی اور بد نصیبی کو عذابِ الٰہی کا روپ دھارنا چاہئے کہ قدرت کا قانونِ مکافات اٹل اور ناگزیر ہے۔ چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہوا :

فَلاَ تُعۡجِبۡكَ أَمۡوَالُهُمۡ وَلاَ أَوۡلاَدُهُمۡ إِنَّمَا يُرِيۡدُ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمۡ بِهَا فِي الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا وَتَزۡهَقَ أَنۡفُسُهُمۡ وَهُمۡ كٰفِرُوۡنَ O (التّوبة : ۵۵)

''سو اُن کے مال اور اُن کی اولاد آپ کو حیرت میں نہ ڈالیں' اللہ کو تو بس یہ منظور ہے کہ اِنہی (نعمتوں) کے ذریعے اُنہیں دنیا کی زندگی میں ہی عذاب دیتا رہے اور اُن کی جانیں ایسی حالت میں نکالے کہ وہ کافر ہوں۔'' (۹ : ۵۵)

یعنی کسی کو یہ خیال نہ گزرے کہ یہ جب غیر مقبولین ہیں تو اُنہیں مال اور اولاد کی نعمتیں کیسے نصیب ہو رہی ہیں۔ یہ سوال آج بھی کافر قوموں کی خوشحالی' کثرتِ آبادی اور اقبال مندی کو دیکھ کر بہ کثرت مسلمانوں کے دلوں میں پیدا ہوتا رہتا ہے حالانکہ دُنیوی نعمتوں کے لئے مقبولیت ذرا بھی شرط لازم نہیں۔ اس میں اہلِ ایمان کو تنبیہ ہے کہ دنیا داروں کے مال و زینت کو مستحسن نہ سمجھیں کہ کہیں اس پر نظر کرنے سے رضائے الٰہی سے محروم نہ ہو جائیں۔ لَا تُعۡجِبۡكَ میں نہی تحریمی ہے اور فقہاء نے اسی آیت سے بہ عبارۃ النص یہ مسئلہ نکالا کہ کافروں اور فاسقوں کی ظاہری نعمتوں کو دیکھ کر اُن کے حال کو اچھا سمجھنا اور ویسی ہی کیفیت کی تمنا کرنا حرام ہے کیونکہ جس سامان کو وہ راحت کے لئے جمع کرتے رہتے ہیں' اس میں اُنہیں راحت نہیں' محض جمع و حفاظت کی مشقتیں ہی ہیں اور پھر چونکہ اجر کے اعتقاد اور اللہ کے ساتھ تعلق سے محرومی ہے اس لئے ان مشقتوں میں آسانی کا بھی کوئی عنصر نام کو نہیں۔

''چند سال پہلے جرمنی یا غالباً جاپان کے حوالے سے ایک خبر چھپی تھی کہ ایک مشہور کمپنی جس میں دنیا کے 15 ممتاز سرمایہ دار حصہ دار تھے۔ ان 15 سرمایہ داروں میں سے 3 نے نفسیاتی الجھنوں کی وجہ سے خودکشی کر لی جبکہ کمپنی کے دیگر سرمایہ دار بھی سخت نفسیاتی الجھنوں کا شکار ہیں۔'' (ماہنامہ ''مؤمن'' لاہور' جون 2003)

''ایک طرف تو موجودہ نظام کو تخلیق کرنے والوں کی اپنی یہ حالت ہے تو دوسری طرف عام مخلوقِ خدا کو صحیح طور پر نہ تو دو وقت کی روٹی میسر ہے اور نہ ہی اُن کی جان و مال اور عزت و آبرو سلامت ہے۔ سوال یہ ہے کہ اتنی ساری مادّی ترقی اور ہر چیز کی کثرت' سائنسی تحقیقات' پولیس' فوج اور بہترین انتظامات کے باوجود انسان سکون' آرام اور اطمینان سے کیوں محروم ہے اور ہر نیا آنے والا دن انسان کی تباہی و بربادی کا پیغام کیوں لا رہا ہے؟ یہ ایسا سوال ہے جس پر غور و فکر کر کے مسئلے کا حل نکالنا وقت کی سب سے اہم اور بنیادی ضرورت ہے۔''

''المیہ یہ ہے کہ بین الاقوامی سطح پر جو نظام تشکیل دیا گیا ہے اور جسے اہلِ مغرب اپنی ٹیکنالوجی' بالادستی اور سیاسی و معاشی تفوق اور غلبے کی وجہ سے ساری دنیا پر مسلّط کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں' وہ ایسا نظام ہے جو انسانوں کی فطری ضروریات' اُن کے داخلی تقاضوں سے صریح متصادم اور بالکل حیوانی خواہشات پر مبنی ہے جس کے تحت انسان حیوانیت کی ترقی یافتہ صورت بن گیا ہے اور اُس کی ضرورتیں خالص مادّی نوعیت کی ہو کر رہ گئی ہیں۔

۲۰۳۵ (مادّی تہذیب کا طوفان ۔۔۔)

موجودہ دَور کے انسان میں نہ تو رُوح اور رُوحانیت نام کی کوئی قوّت موجود ہے جو اُس کے وجود میں جوہری اور فیصلہ کن حیثیت کی حامل ہو اور نہ ہی مرنے کے بعد اُس میں اُخروی زندگی کا احساس اور عقیدہ ہے جس میں فرد کو اپنی ساری زندگی کا حساب کتاب پیش کرنا ہے۔''

''انسان نفس اور عقل کے مجموعے کا نام ہے۔ چونکہ عقل انسان کو حیوان سے نمایاں و ممتاز کرتی ہے' اس لئے انسان عقل کے ذریعے اپنی زندگی کی راہنمائی کے لئے لائحہ عمل اور نظام متعین کرسکتا ہے جو اُس کا حق بھی ہے۔ جدید مادّی تہذیب کے نزدیک عقل کا کام یہ ہے کہ وہ ایک ایسا اجتماعی نظام تشکیل دے جس سے لوگوں کی نفسانی خواہشات کی زیادہ سے زیادہ تسکین ہو اور افراد کی لذت پرستی کی راہ میں کوئی رکاوٹ موجود نہ ہو۔ اس لذت پرستی کے لئے اقوامِ مغرب نے جمہوریت کی بنیاد پر سرمایہ دارانہ نظام تشکیل دیا جسے وہ پوری دنیا پر مسلّط کرنا چاہتے ہیں۔

''موجودہ انسانیت کے مصائب و مشکلات اور بڑھتے ہوئے مسائل اور اُلجھنوں کا بنیادی سبب انسانیت کے بارے میں یہی غلط نقطہ نگاہ ہے جو جدید مغربی دنیا اور جدید مادّی تہذیب نے اختیار کیا ہے۔ یہ مادّی نظریہ اور نقطہ نگاہ انسانیت کی فطرتِ سلیمہ سے بالکل متصادم ہے بلکہ یہ نقطہ نگاہ انسان کی فطرتِ سلیمہ کے مسخ ہونے اور اس کے شیطان کے ہتھے چڑھ جانے اور یرغمال بن جانے کا نتیجہ ہے جس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ جدید مادّی تہذیب نے انسانیت کو ایک ایسے دوراہے پر لاکر کھڑا کر دیا ہے جہاں انسانیت کی تباہی و بربادی لازمی نظر آتی ہے۔''

''جدید مادّی تہذیب کے علمبرداروں کا یہ نقطہ نگاہ کہ جو چیز عقل کی دسترس سے باہر ہو اور حواسِ خمسہ کے ذریعے اُن کا ادراک نہ ہو سکے' اُس کا انکار کر دیا جائے۔ یہ نقطہ نگاہ عقلِ سلیم اور دانش مندی کے خلاف ہے۔ جس طرح انسانی جسم کے دوسرے حصے اور اعضاء مادّہ کا حصّہ ہیں' اسی طرح عقل بھی مادّہ کی پیداوار ہے۔ مادّی اشیاء کے ذریعے غیر مادّی' آفاقی' ملکوتی اور نورانی اشیاء کا ادراک کس طرح ممکن ہوسکتا ہے؟ سائنسی تحقیقات کے مطابق کائنات کی ہزاروں چیزیں ایسی ہیں جن تک اب تک انسان کی رسائی نہیں ہوسکی ہے۔ ان چیزوں تک رسائی نہ ہونا کیا اُن کے موجود نہ ہونے کی دلیل بن سکتی ہے؟ ہرگز نہیں کیونکہ خود سائنس کا کہنا ہے کہ آسمان میں اربوں کہکشائیں ہیں اور ہر کہکشاں میں اربوں ستارے موجود ہیں اور ہر ستارہ ہماری زمین سے اتنا بڑا ہے کہ ہماری زمین اس کے مقابلے میں ایک ذرّہ کے برابر ہے۔ تو کیا کائنات کی اتنی عظیم الشان وسعت کو عقل کے ذریعے سمجھنا ممکن ہے؟

''جس طرح ہر انسانی عضو کا دائرہ کار اور صلاحیتیں محدود ہیں اور کسی عضو سے اپنے دائرہ اور صلاحیتوں سے زیادہ دوسری اشیاء کی امید رکھنا غلط ہے' اسی طرح عقل کی بھی اپنی صلاحیت اور اس کا اپنا دائرہ کار ہے اور اس سے زیادہ کی امید رکھنا غلط ہے۔ مثال کے طور پر آنکھ کا دائرہ اور صلاحیت دیکھنے کی ہے لیکن آنکھ سے یہ امید رکھنا کہ وہ دیکھنے کے ساتھ سننے کا کام بھی انجام دے' بالکل غلط ہوگا۔ بعینہٖ عقل کا دائرہ مادّی اشیاء کے تجزیے اور تحلیل تک محدود

ہے۔ البتہ جب عقل کو ایمان کا نور اور بصیرت حاصل ہوتی ہے تو اُس کی مادّی کثافتیں دُور ہو جاتی ہیں اور اُس میں ایسی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ مافوق الفطرت حقائق کا ادراک اور شعور حاصل کر لیتی ہے۔ اسے مذہب کی اصطلاح میں ''عقلِ سلیم'' کہا جاتا ہے۔ مادّی عقل جب تک ایمان کے تابع نہ ہو، عقلِ سلیم تک اُس کی رسائی ممکن نہیں اور اُس وقت تک مادّی کثافتیں اُسے مادے سے ماوراء مافوق الفطرت یا مابعد الطبیعاتی حقائق کا ادراک کرنے نہیں دیتیں۔ یہ وہ نکتہ ہے جسے سمجھنے میں جتنی دیر کی جائے گی، انسانیت کا مستقبل اُتنا ہی زیادہ تاریک تر ہوتا جائے گا۔''

''حقیقت یہ ہے کہ عقل پر اتنا زیادہ اعتماد، جدید انسان کی سائنسی خود اعتمادی اور غرور و تکبّر کا لازمی نتیجہ ہے جس کی نشان دہی کرتے ہوئے ایک مغربی ماہرِ نفسیات رائس ہولڈ نیبھو رلکھتا ہے:۔

''غرور کی چار بڑی صورتیں ہیں: ان میں سے ہر صورت انسان کے انفرادی یا اجتماعی دعویٰ سے تعلق رکھتی ہے۔ ایک عقل کا غرور ہے۔ انسان کو اپنے علم کی بے یقینی کا احساس ہے لیکن بدقسمتی سے وہ اپنی کمزوری اور جہالت کا اعتراف کرنا نہیں چاہتا۔ وہ اپنے حاصل شدہ فاضل اور لامحدود علم کو آخری اور یقینی علم کا نام دیتا ہے اور علم کی محدودیت اور کمی کو جان بوجھ کر چھپانے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ یہ بات بھلا دیتا ہے کہ جس چیز کو وہ حقیقت کے علم کا نام دیتا ہے، وہ اس کی نفسانی خواہشات اور خود غرضی کے اثرات میں ملوّث ہے۔''

("Philosophy of Religion"... Edwin A. Burt, p. 430)

اس سلسلہ میں ایڈون اے برٹ کا بیان کردہ نکتہ بھی نہایت اہم ہے۔ وہ لکھتا ہے:

''جب تک انسانی عقل کو خدائی راہنمائی حاصل نہیں ہوتی، اُس وقت تک وہ محدود رہتی ہے☆ اور اُس کا علم بھی محدود رہتا ہے۔ اس محدودیت کو ہر سنجیدہ فلسفی نے تسلیم کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانی علم کی محدودیت محض اتفاقی نہیں بلکہ یہ بنیادی اور لازمی حیثیت رکھتی ہے۔'' (ایضاً صفحہ ۴۵۰)

''محض عقل کی بناء پر جو نظام تشکیل دیا جاتا ہے، اُس کی وجہ سے معاشرے میں ہولناک فساد برپا ہوتا ہے۔ اس صورتِ حال سے نکلنے کا واحد حل یہ ہے کہ انسان محض اپنی عقل و دانش پر تکیہ اور اعتماد کرنا چھوڑ دے اور اس کی بجائے مکمل عاجزی اور تواضع سے اللہ کے حضور میں جھک کر اُس کے فضل پر بھروسہ کرے تاکہ وہ جو مقصد از خود حاصل

☆ اسی حقیقت کو سورۃ الحُجُرات کی آیت ہفتم میں یوں بیان کیا گیا ہے: وَاعْلَمُوٓا أَنَّ فِيكُمْ رَسُولَ اللّٰهِ لَوْ يُطِيعُكُمْ فِي كَثِيرٍ مِّنَ الْأَمْرِ لَعَنِتُّمْ (اور جانے رہو کہ تم میں رسول اللہ (موجود) ہیں، بہت سی باتیں ایسی ہیں کہ اگر اُن میں وہ تمہارا کہنا مان لیں تو تمہیں یقیناً تکلیف پہنچے) چونکہ رسول کا علم خداداد اور عطائی ہوتا ہے اس لئے وہ قطعی، حتمی اور ہر قسم کے شک و شبہ سے ماوراء ہوتا ہے یعنی علمِ نبی کو بھی خدائی راہ نمائی ملتی ہے تو وہ راست اور ہر قسم کی خطا سے مبرّا و منزّہ ہوتا ہے۔

نہیں کر سکتا' اُسے وہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے حاصل کر سکے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم اپنی کوتاہیوں اور فروگزاشتوں کا اعتراف کر کے رب کے حضور نادم و تائب ہوں اور بالخصوص غرور و تکبر اور اِن جیسی دیگر اَخلاقی بیماریوں سے محفوظ رہنے کی دعا کریں اور اُس کے رحم و کرم کا سہارا لیں۔'' (ایضاً صفحہ ۴۲۶)

''مغربی دانشوروں کے ان حوالہ جات سے مابعد الطبعیاتی حقائق کو سمجھنے کے سلسلے میں عقل کی بے بسی ☆ کا پتہ چلتا ہے اور یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ جدید مادّی تہذیب کے علمبرداروں کا یہ نقطہ نگاہ دراصل سائنسی برتری اور غرور و تکبر کا نتیجہ ہے۔لیکن جب انسانیت موت و حیات کے بحران میں مبتلا ہو جائے اور خود مغربی دنیا کے ہر خاندان کا ہر فرد مادّی تہذیب کی سلگائی ہوئی آگ میں جل رہا ہو اور اعصابی' نفسیاتی اور معاشرتی مسائل نے فرد کی داخلی زندگی کے سکون کو برباد کر دیا ہو اور تمام تر مادّی ترقی اور دولت کے باوجود ڈیپریشن اور خود اعتمادی کا بحران ختم نہ ہوتا ہو تو ظاہر ہے کہ ضد اور تکبّر سے معاملہ سلجھ نہیں سکتا اور نہ ہی حالات کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ایسی صورتِ حال میں دانشمندی کا تقاضا یہ ہے کہ اپنے نقطہ نگاہ پر از سرِ نو غور کر لیا جائے'' تا کہ کوئی بہتر صورت سامنے آ جائے۔

''حقیقت یہ ہے کہ انسان کی فطرتِ سلیمہ شروع ہی سے کسی ایسے حسن کی تلاش میں ہے جس کے مشاہدے کے بعد پھر کسی اور حُسن کے مشاہدے کی ضرورت باقی نہ رہے۔انسانی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانی تاریخ کا کوئی بھی دَور ایسا نہیں گزرا جس میں انسانی فطرت نے اپنی اس حقیقی ضرورت کی تکمیل کے لئے کوئی صورت اختیار نہ کی ہو اور مذہب کا یہ کہنا کہ انسان مادّی و جسمانی صورت سے زیادہ روح سے عبارت ہے اور روح کی اصل غذا حُسنِ اعلیٰ اور اُس کا باطنی مشاہدہ ہے جو اُس کے ذکر و فکر سے حاصل ہو سکتا ہے۔اس مشاہدے کے بعد افراد کے لئے مادّی دنیا کے بڑے سے بڑے مفاد اور بہتر سے بہتر مادّی حُسن سے دستبردار ہونا نہ صرف آسان ہے بلکہ خوشی و مسرّت کا باعث ہے۔''

''انسان کی تخلیق میں مادّی اور غیر مادّی لطیف اجزاء اس طرح شامل اور داخل کر دئے گئے ہیں کہ انسان ایک نورانی مخلوق نظر آتا ہے ☆☆۔انسان کی اِن لطیف' نورانی اجزاء کی خوراک توحید کا نظریہ' ایمان و عقیدے کی مضبوطی' پاکیزہ انسانی اوصاف جن میں ہمدردی' محبت' رواداری' اخلاص' ایثار اور قربانی وغیرہ جیسے اوصاف شامل ہیں اور ان کے ساتھ ساتھ خالقِ حقیقی سے مسلسل تعلق قائم رکھنا جس نے انسان کے مادّی وجود میں اپنے خاص اجزاء فِٹ کئے ہیں۔یہ انسانی فطرت کی مستقل ضرورت ہے جس سے انکار یا اُس کی تکمیل کے عدمِ اہتمام اور عدمِ انتظام کے نتیجے میں انسان کا پورا جسمانی نظام ہل کر رہ جاتا ہے اور داخلی و باطنی طور پر محسوس ہوتا ہے کہ اس سے کوئی ایسا جرم

☆ دراصل عقل کے لفظ میں بذاتِ خود محدودیت پائی جاتی ہے۔لفظِ عقل ''عِقال'' سے ہے جس کا معنیٰ وہ رسی ہے جسے اونٹ کی گردن اور ٹانگ میں سے گزار کر باندھا جاتا ہے اور اس طرح اُونٹ کو نہ بھاگنے پر پابند کیا جاتا ہے۔

☆☆ کیونکہ رب تعالیٰ جو بذاتِ خود نور ہے' نے اُس کی تخلیق اپنے دستِ پاک یعنی قدرتِ کاملہ سے کی (سورۃ صٓ: ۷۵) اور اُس میں اپنی روح ڈالی (سورہ صٓ : ۷۲)

صادر ہوا ہے جس کی بناء پر داخلی قوّتیں شدید کشمکش اور تصادم کا شکار ہیں اور کسی مرکزی قوّت سے ضرور تعلق ٹوٹ گیا ہے جس کی وجہ سے اس کی اپنی ذات خود اعتمادی سے محروم ہو چکی ہے۔ اس کی سزا ڈیپریشن' مایوسی' اضطراب' گھبراہٹ' چڑچڑاپن' دل کے امراض اور اعصابی کمزوریوں وغیرہ کی صورت میں ملتی ہے۔''

''انسانی جسم میں غیر مادّی یعنی لطیف قوّتوں کا اس قدر عمل دخل ہے کہ اُن کی تسکین کے بغیر انسان بیمار ہو جاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کا اصلی وجود غیر مادّی اور روحانی ہے۔ جب تک انسان کو اس روحانی وجود کے تقاضوں اور مطالبات کا شعور حاصل نہیں ہوتا اور تہذیب کی تشکیل اور اس کی اساس میں روحانی وجود کی ان ضرورتوں کا مناسب انتظام نہیں ہوتا' اُس وقت تک انسانیت مسلسل عذاب میں مبتلا رہے گی اور کوئی بھی قوّت اُسے اس عذاب سے بچا نہیں سکے گی۔ جیسا کہ اوپر بیان ہوا کہ بدقسمتی سے مادیّت کے غلبے اور شیطان کے اغواء کے نتیجے میں جدید تہذیب کے علمبرداروں نے اس نکتہ کو بالکل فراموش کر دیا ہے کہ کائنات میں ایک وحدانی نظام قائم ہے' جس سے کائنات کا یہ نظام وابستہ ہے۔ انسان کائنات کی اس وحدت کے نظام کا بنیادی حصّہ ہے۔ انسان کے اندر لطیف تاروں کے ذریعے جب ایک فرد خالقِ کائنات سے اپنا رابطہ اور رشتہ مستحکم کر لیتا ہے تو اُس کی شخصیت میں ایک نورانی کرنٹ پیدا ہو جاتا ہے جس سے فرد کے کردار اور سیرت میں بلندی اور پاکیزگی پیدا ہوتی ہے اور وہ اوصاف پیدا ہوتے ہیں جو افراد کو مادّی دنیا سے اوپر اُٹھاتے ہیں اور اس نورانی کرنٹ کے نتیجے میں افراد عہدوں اور مال و منال کی محبت' حسد' حرص و ہوس اور غیظ وغضب جیسے اوصافِ رذیلہ سے پاک ہو جاتے ہیں اور قناعت' سادگی' تھوڑے پر راضی رہنا' دوسروں کے لئے ایثار و قربانی کا مظاہرہ کرنا' عاجزی' انکساری اور اللہ کے بندوں سے محبت کے اوصاف ظاہر اور نمایاں ہونے لگتے ہیں۔ اس طرح سے ایک ایسا معاشرہ اور سوسائٹی وجود میں آجاتی ہے جس کے افراد ظلم و استحصال' لوٹ مار اور تشدد کی بجائے ایک دوسرے کے ساتھ محبت و رحمت کا سبب بن جاتے ہیں۔ اسلام کے مشروعاتی دَور میں ایسا مثالی اور فلاحی معاشرہ قائم ہو چکا ہے'' جس کا بیان سورۃ الانفال کی ذیل کی آیت میں بجا طور پر کیا گیا ہے:

> وَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ لَوْاَنْفَقْتَ مَافِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مَّا أَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ أَلَّفَ بَيْنَهُمْ اِنَّهٗ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝ (الانفال: ٦٣)
>
> ''اور اُس نے اُن کے دلوں میں اتفاق پیدا کر دیا۔ اگر آپ دنیا بھر کا مال خرچ کر ڈالتے تو بھی اُن کے دلوں میں اتحاد پیدا نہ کر سکتے' لیکن اللہ نے اُن میں اتحاد پیدا کر دیا۔ بے شک وہ بڑی ہی قدرت والا' بڑی ہی حکمت والا ہے۔'' (۸ : ٦٣)

''اس کے بعد بھی صدیوں تک مسلمان سیرت و کردار کے ایسے پاکیزہ نمونے پیش کرتے رہے ہیں۔ تاریخ میں پہلی بار ایسا ہو رہا ہے کہ اسلامی تہذیب کی طرف سے عالمی سطح پر حیوانیت کے زبردست مظاہروں اور مناظر کی بناء پر مسلم معاشرے میں بھی سیرت و کردار کی وہ پاکیزگی مفقود ہو چکی ہے اور حیوانی مناظر و اوصافِ قبیحہ تیزی سے بڑھ رہے ہیں۔'' (ماہنامہ ''مؤمن'' لاہور' جون 2003ء۔ مضمون نگار: محمد موسیٰ بھٹو)۔ قرآنی حوالہ جات منجانب مؤلف ہیں۔

(٧٢) علم الماء اور آبپاشی (Hydrology & Irrigation)

علم الماء (ہائیڈرالوجی) کا تعلق زمین کے آبیات (Waters) سے ہے۔ یہ علم ان آبیات کے وقوع، اُن کی گردشوں، زمان و مکان میں اُن کی تقسیم، اُن کی کیمیائی اور فطری خصوصیات، اُن کے اپنے ماحول (بہ شمول ذی حیات نامی وجود) کے ساتھ ردِّ عمل سے بحث کرتا ہے۔"

"علم الماء یعنی ہائیڈرالوجی دوسرے ارضی علوم کے ساتھ اس حد تک ضم شدہ ہے کہ وہ علومِ ارضی زمین کے آبیات کی تقسیم اور اُن کے طرزِ عمل کی وضاحت میں مددگار ہوتے ہیں۔ مثلاً علم البحر (Oceanography) کا تعلق زمین کے اُن 97 % آبیات سے ہے جو سمندر میں پائے جاتے ہیں۔ تاہم سطح سمندر سے بخارات بن کر فضا میں داخل ہونے والا پانی علم الماء میں اہم ہے کیونکہ وہ برِّ اعظموں اور جزیروں کے تازہ پانیوں کا منبع ہوتا ہے۔ پھر علمِ موسمیات (Meteorology) کا تعلق فضا کے ساتھ ہے لیکن زمین پر گرنے والی برف کی رطوبت کا مطالعہ، اُس کا فضا میں پلٹ جانا اور آندھیوں اور قلّتِ باراں کی حدود بھی علم الماء کی تحقیق و تجسس کا لازمی جزو ہیں۔" (Encyclopedia Americana, Vol. XIV, p. 659)

"علم الماء برِّ اعظموں کی زمین دوز سطح میں پائے جانے والے آبیات کے مطالعے کا نام ہے۔ علم الماء کے ماہرین کا کام پانی کا مطالعہ کرنا ہوتا ہے۔ وہ پانی میں موجود کیمیائی اجزاء، اُن کی خصوصیات اور اس چیز کا مطالعہ کرتے ہیں کہ پانی دریاؤں، نلوں اور زمین دوز جھیلوں میں کیسے بہتا ہے۔ ان چیزوں کے مطالعہ سے ماہرینِ علم الماء انجینئروں کو نہروں، بدررووں (گندابوں Sewers) اور ایسی سڑکوں کے تعمیر کرنے میں مدد دیتے ہیں جو سیلابوں یا موسلا دھار بارشوں کے دوران بہہ نہ جائیں۔ علم الماء کا ماہر گھریلو استعمال کے لئے پانی کے زمین دوز سرچشموں کے صحیح محلِ وقوع کے دریافت کرنے میں بھی قصبوں اور شہروں کی مدد کرتا ہے۔ ماہرینِ علم الماء نے سیلابوں سے متعلق بہت کچھ سیکھا ہے۔ اُنہوں نے سیلاب کو کنٹرول کرنے والے بہت سے پشتوں (Dams) کے ڈیزائن کرنے اور اُن کے تعمیر کرنے میں بھی مدد کی ہے۔ چند پیمائشیں کرنے اور ایک کلیہ (فارمولہ) کا استعمال کرنے سے وہ اس بات کا حساب لگا سکتے ہیں کہ ایک بند اور پشتے کے پیچھے کتنا پانی موجود ہے اور کناروں کے اوپر سے کتنا پانی باہر چھلک سکتا ہے۔ آبی چکر (Water-cycle) کے مطالعہ سے ماہرینِ علم الماء یہ جان سکتے ہیں کہ پانی کہاں سے آ رہا ہے اور وہ کہاں جا رہا ہے۔ وہ پانی کو محفوظ کر سکتے ہیں اور زمین کی فرسودگی کو روک بھی سکتے ہیں۔" (Funk & Wagnalls New Encyclopedia of Science, Vol. 10, p. 825)

بادل: "اُن آبی بخارات کے ذخیرہ کرنے کے علاوہ جو بعد ازاں زمین کی طرف چلے جاتے ہیں، بادل اُس حرارت کو محفوظ رکھنے میں مدد دیتے ہیں جو حرارتِ آفتاب سے گرم ہونے کے بعد سطحِ زمین سے برقناطیسی لہروں کی شکل میں بکھرتی ہیں۔ تاہم بھاری بھرکم بادلوں کی دبیز تہہ سورج سے حاصل شدہ اچھی خاصی حرارت اور روشنی کو روک دیتی ہے۔"

"سورج انواع و اقسام کی لمبائیوں کی اُن لہروں کو خارج کرتا ہے جو اشیاء کے ٹھوس حصّہ میں مختلف درجوں

میں گھس جاتی ہیں۔ ان لہروں میں سے اکثر کا اثر گرمائی ہوتا ہے اور کچھ کا اس سے بھی زیادہ۔ سورج سے برقناطیسی شکل میں نکلی ہوئی لہروں کی حرارت فضا اور بادلوں میں سے بہ آسانی گزر جاتی ہے اور زمین کے بالائی پرت (soil) یا سطح آب میں جذب ہو جاتی ہیں۔ پھر گرم شدہ زمین ریڈیائی لہروں کی حرارت کو خارج کرتی ہے۔ یہ ریڈیائی لہریں اس قدر طول طویل ہوتی ہیں کہ وہ بادلوں میں سے نہیں گزر سکتیں اور اس لئے وہ واپس زمین کو لوٹ آتی ہیں۔ جس دن سورج نکلا ہوا ہو تو آسمان میں بادل آئینہ کا کام کرتے ہیں۔ وہ اُس حرارت کو واپس موڑ دیتے ہیں جو بصورتِ دیگر سطحِ زمین سے بچ نکلتی ہے۔'' (Macropaedia Britannica, Vol. II, p. 152)

''بادلوں کی تین بنیادی قسمیں: (۱) تہہ بہ تہہ بادل (Stratiform Clouds)
(۲) ایک دوسرے کے اوپر چھائے ہوئے بادل (Cumuliform Clouds)۔
(۳) ریشے دار کیفی بادل (Fibre-shaped Clouds)۔'' (ایضاً صفحہ ۱۵۴)

''بارش کا کیمیائی عمل: سطحِ زمین کو ڈھالنے میں بارش بہت اہم کردار ادا کرتی ہے۔ اپنے مخصوص عمل میں اس کا عمل کچھ تو کیمیائی ہوتا ہے اور کچھ مشینی (آلاتی) ہوتا ہے۔''

''بارش کے کیمیائی عمل کو جانچنے میں ہمیں یہ معلوم ہونا چاہئے کہ بارش کا پانی اُس معنیٰ میں خالص پانی نہیں ہوتا جو ہم پیتے ہیں۔ فضا میں وہ فضائی گیسوں یعنی آکسیجن، نائٹروجن اور کاربن ڈائی آکسائڈ کو جذب کرتا ہے اور یہ گیسیں ان تناسبات کے ساتھ جذب ہوتی ہیں: نائٹروجن 64.47؛ آکسیجن 33.76؛ کاربن ڈائی آکسائڈ 1.77۔ یہ جذب شدہ گیسیں اُس تناسب میں نہیں پائی جاتیں جس تناسب سے وہ فضا میں پائی جاتی ہیں۔ کاربن ڈائی آکسائڈ فضا کی نسبت تیس سے چالیس گنا زیادہ تناسبات میں پائی جاتی ہے۔ اِن قدرتی فضائی گیسوں کے علاوہ بارش نائٹرک ایسڈ، سلفیورک ایسڈ اور نمکیات کی بھی ایک مخصوص مقدار اپنے اندر جذب کر لیتی ہے۔ بارش اپنے ساتھ خردنامیے (Micro-organisms) اور مٹی بھی لاتی ہے۔ جونہی بارش زمین کو چھوتی ہے تو اس کے کیمیائی اجزاء اضافہ پذیر ہو جاتے ہیں۔''

''چونکہ بارش میں آکسیجن شامل ہوتی ہے اس لئے وہ لوہے جیسی بہت سی دھاتوں کو زنگ آلود کر دیتی ہے اور اس میں موجود کاربانک ایسڈ چونے کے پتھر اور سنگِ مرمر وغیرہ کو تحلیل کر دیتا ہے۔ عمارتی پتھر تک پانی سے گل سڑ جاتا ہے اور وہ اتنا ڈھیلا اور نرم پڑ جاتا ہے کہ اُسے کدال سے کھودا جا سکتا ہے۔ بعض صورتوں میں جب چٹانیں بارش کے پانی کو جذب کر لیتی ہیں تو یہی چٹانیں پانی کے ساتھ مل کر مختلف تغیرات میں سے گزرتے ہوئے ایسا کیمیائی مرکب بنا لیتی ہیں جسے اصطلاح میں آب آمیز مرکّب (Hydration) کہا جاتا ہے۔''

''بارش کا مشینی (آلاتی) عمل: بارش کا ہر بھاری چھینٹا خاک آلود سڑکوں اور راستوں کو چمکاتا بھی ہے اور اُن کے اندر نشان بھی چھوڑ جاتا ہے اور پانی کے بہاؤ سے نالیاں بھی بنا دیتا ہے۔ جب بارش کا پانی چادر یا

جھالے کی صورت میں برستا ہے تو وہ زمین کے بالائی پرت کو دریا کے لے جانے کی طرح پُر اثر طور پر لے جاتا ہے۔ لیکن جہاں زمین کے بالائی پرت کی حفاظت کے لئے درخت اور سبزیات اکٹھے موجود ہوں تو برسات اس کے اکثر حصّے کو بہالے جانے میں ناکام رہتی ہے لیکن جہاں زمین کا بالائی پرت غیر محفوظ ہو تو برسات اُسے بڑی تیزی سے بہا کر لے جاتی ہے۔ اس طرح جنگلوں کا ختم ہونا بارش کے تباہ کن اثر کا نتیجہ ہوتا ہے۔ بعض صورتوں میں موسلا دھار بارش پہاڑ نما اور سیلاب نما مٹی کو جنم دیتی ہے۔'' (ایضاً 'جلد دوم' صفحات ۱۶۱' ۱۶۲)

''اپنی تمام شکلوں میں پانی ارضیاتی نمائندے کا کردار ادا کرتا ہے۔ وہ چٹانوں کو جزوی طور پر توڑ پھوڑ کر اُنہیں رفتہ رفتہ مٹا دیتا ہے' زمین کو خوش منظر بناتا ہے' عملِ فرسودگی کے تحلیل شدہ مواد اور انسانی آلودگیوں کو منتقل کرتا ہے اور مختلف علاقوں میں مواد کا ذخیرہ کرتا ہے۔ ایسے اعمال آبی چکر کا ضمنی نتیجہ (By-product) ہوتے ہیں اور انسان کے ماحول پر اثر انداز ہونے کی وجہ سے اُس سے خصوصی تعلق کے حامل ہوتے ہیں۔ ماہرینِ علم الماء اِن اور اِن جیسے دوسرے وقوعات' گردشوں اور زمین کے قدرتی آبیات میں انسان کی طرف سے کی گئی تبدیلیوں کا مطالعہ کرتے ہیں۔'' (Encyclopedia Americana, Vol. XIV, p. 659)

متعدد قرآنی آیات میں پانی کے اس چکر کی طرف ربِّ قدیر کی لامحدود معجزاتی قوّت کے اشارات ملتے ہیں۔ مثلاً:

(۱) وَهُوَ الَّذِىْ يُرْسِلُ الرِّيٰحَ بُشْرًا بَيْنَ يَدَىْ رَحْمَتِهٖ حَتّٰٓى اِذَآ اَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا سُقْنٰهُ لِبَلَدٍ مَّيِّتٍ فَاَنْزَلْنَا بِهِ الْمَآءَ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ كَذٰلِكَ نُخْرِجُ الْمَوْتٰى لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ O (الاعراف: ۵۷)

''اور وہ وہی تو ہے جو ہواؤں کو اپنی رحمت (بارش) سے قبل خوشخبری کے طور پر بھیجتا ہے۔ چنانچہ جب وہ (ہوائیں) بھاری بھرکم بادل کو اٹھالیتی ہیں تو ہم اُسے کسی خشک بستی کی طرف ہانک لے جاتے ہیں' پھر ہم اُس کے ذریعہ سے پانی نازل کرتے ہیں' پھر ہم اُس کے ذریعہ سے ہر طرح کے پھل نکالتے ہیں۔ اِسی طرح ہم مُردوں کو نکال کھڑا کریں گے تاکہ تم (اس سے) نصیحت حاصل کرو۔'' (۷ : ۵۷)

<u>آیت سے اخذ کردہ نکات</u>: (۱) اگرچہ کنوؤں' دریاؤں اور جھیلوں سے حاصل شدہ پانی زمینی پیداوار حاصل کرنے میں معاون ضرور ہوتا ہے لیکن بارش کا پانی اُس کے لئے شرطِ لازم ہے۔ یہ بات بالعموم مشاہدے میں آئی ہے کہ زمینی پانی سے چراگاہیں اور کھیت تازہ اور سرسبز رہتے ہیں اور خشک اور خزاں رسیدہ نہیں ہوتے لیکن اس کے باوجود وہ نہ تو پھلتے پھولتے ہیں اور نہ ہی خاطر خواہ پیداوار دیتے ہیں۔ حقیقت بہر حال یہی ہے کہ جھیلوں' نہروں اور دریاؤں میں پانی بارش ہی سے آتا ہے اور اگر بارشیں نہ ہوں تو ایک سال بعد دریا اور جھیلیں خشک ہو کے رہ جائیں۔

(۲) اچھی پیداوار حاصل کرنے کے لئے صرف بارش' بیج اور عمدہ بُوائی ہی کافی نہیں ہوتے کیونکہ یہ تو پیداوار حاصل کرنے کا محض ذریعہ ہیں۔ اصل میں تو پیدا کرنے والا اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ آدمی کو پیداوار کی بہتری کے لئے بھرپور کوشش کرنی چاہیے لیکن وہ نظر مسبّب الاسباب پر رکھے۔ یہ نکتہ فَاَنْزَلْنَا کے بعد فَاَخْرَجْنَا فرمانے سے حاصل ہوا۔

(۳) ہوا خود بادل نہیں بن جاتی بلکہ سمندر کا پانی بھاپ بن کر طبقہ زمہریر میں پہنچتا ہے۔ پھر ہواؤں کے ذریعے وہ دوسری جگہ منتقل ہوتا ہے۔ یہ نکتہ أَقَلَّتْ سَحَابًا سے حاصل ہوا۔

(۴) بھاپ میں وزن ہے کیونکہ بادل جمی ہوئی بھاپ ہی تو ہے جسے قرآن مجید نے بھاری بھرکم فرمایا۔ یہ نکتہ سَحَابًا ثِقَالًا سے حاصل ہوا۔

(۵) ہر چیز کی موت اور زندگی علیحدہ علیحدہ ہیں۔ جسم کی موت بے جان ہونا اور اُس کی زندگی جاندار ہونا ہے۔ روح کی موت بے ایمان ہونا اور اُس کی زندگی ایمان والا ہونا ہے۔ دل کی موت غفلت اور اُس کی زندگی بیداری ہے۔ زمین کی موت خشکی اور اُس کی زندگی روئیدگی اور سرسبز ہونا ہے۔

(۶) علم الماء (Hydrology) سے یوم آخرت پر ایمان قوی اور مضبوط ہوتا ہے اور اپنے محاسبے کا ڈر رہتا ہے۔ یہ نکتہ كَذٰلِكَ نُخْرِجُ الْمَوْتٰى (اسی طرح ہم مُردوں کو نکال کھڑا کریں گے) سے حاصل ہوا۔

(۷) قیاس برحق ہے یعنی دیکھی ہوئی چیز کے حالات دیکھ کر بن دیکھی چیز کے حالات معلوم کرنا بالکل درست ہے۔ بارش اور اُس کے نتیجے ہماری دیکھی ہوئی چیزیں ہیں لیکن قیامت اور وہاں کے حالات بن دیکھے ہیں۔ بارش کے ذریعے قیامت کا پتہ لگانے کا حکم دیا گیا۔ لہٰذا مجتہدین علماء کا شرعی قیاس بھی برحق ہے۔

<u>ضروری نوٹ</u> :اس آیت سے معلوم ہوا کہ بادل بھاری اور بوجھل ہوتے ہیں مگر ہوائی جہاز بادل میں سے گزر جاتے ہیں اور اُنہیں کوئی بوجھ محسوس نہیں ہوتا تو اس کا جواب یہ ہے کہ بوجھ ہونا اور چیز ہے اور اُس کا محسوس ہونا اور چیز ہے۔ بارش کے پانی کا وزن کریں تو اُس کا بوجھ صاف ثابت ہو جائے گا۔ پانی کے حوض میں بیٹھنے سے پانی کا وزن قطعاً محسوس نہ ہوگا لیکن اگر وہی پانی گھڑا بھر کر سر پر رکھ لیں تو بوجھ ضرور محسوس ہوگا۔ آج سائنس نے بتایا کہ ہوا میں بوجھ ہے۔ ہمارے سر پر ہزاروں من ہوا لدی ہوئی ہے جسے ہم اُٹھائے پھرتے ہیں مگر ہمیں بوجھ محسوس نہیں ہوتا کیونکہ ہم ہوا کے اندر رہتے ہیں۔ اگر ٹیوب اور ٹائر میں ہوا بھر کر وزن کریں تو یقیناً بوجھ معلوم ہوگا۔ یہی مثال ہوائی جہاز کے بادلوں میں سے گزرنے کی ہے۔

(۲) أَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَالَتْ أَوْدِيَةٌ بِقَدَرِهَا فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا رَّابِيًا (الرَّعد: ۱۷)
"اُسی نے آسمان سے پانی اتارا جس سے ندی نالے اپنی مقدار کے موافق چلنے لگے پھر وہ سیلاب جھاگ کو اوپر لے آیا۔" (۱۳ : ۱۷)

بارش کا پانی مختلف آبناؤں میں اُن کے حجم اور صلاحیت کے مطابق بہتا ہے۔ کچھ آبنائیں سست رَو' کچھ تیز رَو اور کچھ بڑے بڑے دریا بناتی ہوئی ایک وسیع قطعۂ زمین کو سیراب کرتی ہیں' بالخصوص پہاڑی علاقوں میں کچھ

صاف وشفاف جھلیں ہوتی ہیں جس کے پانی میں سے صاف ستھری کنکریوں کی تلہٹیاں (Beds) واضح طور پر دکھائی دیتی ہیں ۔ کچھ آبناؤں میں مزیدار مچھلی پیدا ہوتی ہے جبکہ کچھ آبناؤں میں مگرمچھوں اور ضرر رساں عفریتوں (Monsters) کی بھرمار ہوتی ہے ۔ پھر ندیوں، چشموں، جھیلوں، دریاؤں اور سمندروں میں بھی درجات ہوتے ہیں ۔ چونکہ سیلاب جھاگ اور میل کو بہا کر لے جاتے ہیں اور اس طرح پانی کو خالص کر دیتے ہیں، اسی طرح ربّ ذوالجلال والاکرام کی رحمت ہمارے روحانی میل کچیل کو بہا کر لے جاتی ہے اور روح کے پانی کو خالص اور پاک کر دیتی ہے ۔ ہو سکتا ہے کہ جھاگ سطح آب پر بہت زیادہ ظاہر ہو لیکن وہ تادیر نہیں رہ سکتا ۔ اسی طرح جھاگ والا غیر خالص اور مختلف غیر حقیقی نظریات کا علم بھی ہو سکتا ہے لیکن علمِ الٰہی کو ابدیت اور ہمیشگی حاصل ہے ۔'' (عبداللہ یوسف علی، نوٹ : ۱۸۳۱)

(۳) وَأَرۡسَلۡنَاالرِّيٰحَ لَوَاقِحَ فَأَنۡزَلۡنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَأَسۡقَيۡنٰكُمُوۡهُ (اَلۡحِجۡر : ۲۲)

''اور ہم ہی پانی سے لدی ہوئی ہواؤں کو بھیجتے ہیں پھر ہم ہی آسمان سے پانی برساتے ہیں
پھر وہی پانی ہم تمہیں پلاتے ہیں ۔'' (۲۲ : ۱۵)

اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ بارش بننے کا پہلا مرحلہ ''ہوا'' ہے ۔ بیسویں صدی کے آغاز تک بارش اور ہوا کے درمیان صرف یہ تعلق معلوم ہو سکا تھا کہ ہوا بادلوں کو دھکیلتی ہے تاہم ہوا کے ''بارآوری کے کردار'' کا جدید موسمیاتی تحقیق سے پتہ چلا ہے جو بارش برسانے کا ذریعہ بنتا ہے ۔ (''قرآن رہنمائے سائنس'' ۔ ہارون یحیٰی ص ۱۳۱)

اوپر کی آیت میں فَأَنۡزَلۡنَا اور فَأَسۡقَيۡنٰكُمُوۡهُ میں حرف جارّہ ''ف'' کی موزونیت پر غور کرنے سے ہواؤں کا بارش کے ساتھ تعلق ظاہر ہوتا ہے ۔ لَوَاقِح جو لاقِح کی جمع ہے، لَقَحَ سے ہے بمعنی بارآور کرنا جو نر درخت کے زرگل (Pollen) کو مادہ درخت کے بیج کے خلا (Ovary) میں داخل کرنے سے ہوتا ہے ۔ ہوا اس عمل کو کئی پھولوں کے لئے کرتی ہے ۔ یہاں ایک نمایاں استعارہ کے ذریعے ہواؤں کی بارآور کرنے کی خصوصیت کو بادلوں کی طرف منتقل کیا گیا ہے جو بارش کے ذریعے ہر قسم کے پھل، غلّہ اور سبزیات کو اُگاتے ہیں ۔ بہ حیثیت بخارات کے بادلوں کو ہواؤں کی کارستانی بتایا گیا ہے جو فضائی رووں کو قائم رکھتی ہیں جس کے نتیجے میں بارش کا نزول ہوتا ہے ۔'' (ایضاً، نوٹ : ۱۹۶۰)

''ہر قسم کی حیات کا انحصار پانی پر ہے اور زمینی حیات کا انحصار بارش کے پانی پر ہے ۔'' (Historians' History of the World", Vol. 1, p. 44)

(۴) وَأَنۡزَلۡنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً بِقَدَرٍ فَأَسۡكَنّٰهُ فِي الۡاَرۡضِ وَاِنَّا عَلٰى ذَهَابٍ بِهٖ لَقٰدِرُوۡنَ ۝ (المؤمنون : ۱۸)

''اور ہم نے اندازہ کے ساتھ آسمان سے پانی برسایا، پھر ہم نے اُسے زمین میں ٹھہرایا اور ہم اس کے معدوم کرنے پر بھی قادر ہیں ۔''

''بارش بالعموم مقدارِ معیّن ومناسب میں اور وقتِ مناسب پر ہوتی ہے ۔ وہ کچھ تو زمین کے بالائی پرت میں

جذب ہو جاتی ہے اور بلندی پر واقع تمام مقامات میں کافی عرصے تک باقی رہتی ہے۔ وہ زمین کے بالائی پرت کی کئی تہوں میں جذب ہو کر داخل ہوتی ہے اور طبعی جغرافیہ☆ کی تعمیر کی تشکیل کرتی ہے۔ زمین کے بالائی حصّوں کی قوتِ حفاظت ہندوستان جیسے اُن علاقوں میں بھی دریاؤں کی دائمی روانی کو قائم رکھتی ہے جہاں برسات موسمی اور سال کے کچھ مہینوں تک محدود ہوتی ہے۔ ایک اور صورت جس میں بارش مقدارِ معیّن کے مطابق نازل ہوتی ہے' برف اور اولوں کی ہے اور ان کا بھی ہوا اور زمین کے بالائی پرت کے بے جا صَرف سے گریز میں ایک مقام ہے۔ اگر بلند و بالا پہاڑی مقامات میں برف اور گلیشیئر نہ ہوتے تو کچھ دریا طغیانی کے ساتھ نہ بہہ سکتے۔ اگر نکاسیِ آب اور اس طرح آبیات کا صاف ہونا نہ ہوتا تو سیلابوں اور سیم زدہ زمینوں کا سامنا ہوتا جیسا کہ اُن مقامات پر ہوتا ہے جہاں فطرت کے عمومی عوامل میں عارضی طور پر رکاوٹ ہو جاتی ہے۔ یہ صورتِ حال بارش کے مقدارِ معیّن میں نہ ہونے سے پیدا ہوتی ہے۔ اِن غیر عادی اور غیر طبعی حالات کا بھی ایک مقام ہے اور انسان کو اللہ تعالیٰ کے غیر مختتم اور عظیم پیمانے پر انعامات و نوازشات کا شکر گزار ہونا چاہیے۔'' (ایضاً' نوٹ: ۲۸۷۸)۔

مَـآءً بِـقَـدَ رٍ یعنی اندازے کے مطابق بارش اتارنے کا مطلب یہ ہے کہ نہ اتنا زیادہ کہ تمام اہلِ زمین سیلاب اور طوفان کی زد میں آ جائیں اور نہ اتنا کم کہ وہ زمین کی پیداوار اور دیگر ضروریات کے لئے ناکافی ہو۔

''ہم تمہاری ضروریات کے مطابق بارش برساتے ہیں۔ اس سے تمہاری کھیتیاں سیراب ہوتی ہیں' تمہارے پینے کے لئے تالابوں میں پانی جمع ہو جاتا ہے لیکن جو تمہاری وقتی ضروریات سے بچ جاتا ہے وہ ضائع نہیں ہوتا بلکہ ہم اُسے اپنے مخفی ذخیروں میں جمع کر لیتے ہیں اور تم ہر وقت اُن سے مستفید ہوتے رہتے ہو۔ یہ کنویں' یہ ٹیوب ویل' یہ دریا' یہ چشمے جن سے تم اپنی ضروریات پوری کرتے ہو' اُن میں ہمارے انہی مخفی آبی ذخیروں ہی سے تو پانی آ رہا ہے۔ میدانوں اور صحراؤں کو تو رہنے دو' ذرا پہاڑوں کی بلند چوٹیوں پر جا کر دیکھو' ہم نے کس طرح پانی کی بہم رسانی کا وہاں مکمل انتظام کر رکھا ہے۔ وہاں تم کنواں کھود کر یا ٹیوب ویل لگا کر زمین کے شکم سے پانی نہیں نکال سکتے اور کوئی نہر جاری نہیں کر سکتے۔ اگر خالقِ کائنات علیم و قدیر نہ ہوتا تو وہاں پانی مفقود ہوتا اور پانی کی عدم موجودگی کی وجہ سے وہاں انسانی' حیوانی اور نباتاتی زندگی کا نام و نشان تک نہ ہوتا۔ یہ ہماری حکمت اور علم کا کتنا بڑا کرشمہ ہے کہ پانی جو ہمیشہ نشیب و پستی کی طرف بہتا ہے' ہزاروں فٹ کی بلندی پر ہماری واٹر سپلائی سکیم کے تحت نصب کئے ہوئے فواروں سے کس زور شور اور کثرت سے اُبل رہا ہے کہ وہاں کی ضروریات پوری ہونے کے بعد وہ دریاؤں کی شکل اختیار کر کے میدانی علاقوں میں بہتا ہوا آ نکلتا ہے اور جہاں جہاں سے دریا گزرتے ہیں' لاکھوں ایکڑ رقبہ سیراب ہوتا جاتا ہے۔'' (''ضیاء القرآن''۔۔ جسٹس کرم شاہ الازہری' جلد سوم' صفحہ ۲۴۹)

(۵) أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللّٰهَ يُزْجِي سَحَابًا ثُمَّ يُؤَلِّفُ بَيْنَهُ ثُمَّ يَجْعَلُهُ رُكَامًا فَتَرَى الْوَدْقَ يَخْرُجُ مِنْ خِلَالِهِ وَيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ جِبَالٍ فِيهَا مِنْ بَرَدٍ فَيُصِيبُ بِهِ مَنْ يَّشَآءُ وَيَصْرِفُهُ عَنْ مَّنْ يَّشَآءُ يَكَادُ سَنَا بَرْقِهِ يَذْهَبُ بِالْأَبْصَارِ (النور: ۴۳)

''(اے مخاطب!) کیا تجھے یہ علم نہیں کہ اللہ ایک ایک بادل کو چلاتا رہتا ہے' پھر اُسے باہم ملا دیتا ہے پھر

☆ طبعی جغرافیہ کے تعارف کے لئے دیکھئے جلد چہارم کے صفحات ۱۶۱۳' ۱۶۱۴۔

اُسے تہہ بہ تہہ کر دیتا ہے' پھر تو بارش کو دیکھتا ہے کہ وہ اس کے بیچ میں سے نکل کر آتی ہے۔ اور اسی بادل سے یعنی اس کے بڑے بڑے حصوں میں سے وہ اولے برساتا ہے' پھر اُنہیں جس پر چاہتا ہے گراتا ہے اور جس سے وہ چاہتا ہے' ہٹا دیتا ہے۔ قریب ہے کہ اس کی بجلی کی چمک آنکھوں کی بینائی کو لے جائے۔'' (۲۴:۴۳)

''مشہور یہ ہے کہ جب بخارات اوپر چلے جاتے ہیں اور حرارت سے تحلیل نہیں ہوتے تو وہ سخت ٹھنڈک والی ہوا کے طبقہ میں پہنچ جاتے ہیں جہاں پر درجہ حرارت منفی 50 درجہ سینٹی گریڈ سے بھی زیادہ ہوتا ہے۔ وہاں پر وہ بخارات منجمد ہو کر بادل کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ پھر اگر وہاں زیادہ ٹھنڈک نہ ہو تو وہ بادل قطرہ قطرہ ہو کر گرنے لگتے ہیں اور یوں بارش ہوتی ہے اور اگر ٹھنڈک اجزائے بخاریہ کے جمع ہونے سے پہلے پہنچ جائے تو پھر برفباری ہو جاتی ہے اور اگر اجزائے بخاریہ کے جمع ہونے کے بعد ٹھنڈک پہنچے تو پھر ژالہ باری ہوتی ہے۔'' (تبیان القرآن ---علامہ غلام رسول سعیدی' ج ہشتم' ص ۱۶۱)

ایک مناسب وقت پر مناسب موسم میں بادل کو پیدا کرنا' ایک مناسب بلندی پر لے جانا' ہوا میں مناسب حال تغیرات پیدا کرنا' بادل کے منتشر ٹکڑوں کو اوپر نیچے جمع کر کے اُنہیں گھنگھور گھٹا کی شکل میں تبدیل کر دینا' پھر ایک مناسب مقدار میں مناسب مدت تک بارش کرتے رہنا' یہ سب کام اُسی صانع مطلق و حکیم برحق کے ہیں۔

''مذکورہ بالا آیت ۴۳ کا موضوع بارش اور اولے (Precipitation) اور گلیشیئر وں یعنی برف زاروں کی اندرونی حرکیات و اثریات کا علم (Glaciology) ہیں جو علم الماء (ہائیڈرالوجی) کے نظام کا ایک اور لازمہ ہیں کیونکہ برف زار برف کو پگھلا کر بڑے بڑے دریاؤں کی طرف پانی کو بھیجنے کا کردار ادا کرتے ہیں۔''

''محبینِ فطرت' فنکار یا بادلوں کا مشاہدہ کرنے والے بادلوں کے اس قرآنی بیان کو دادِ تحسین دیے بغیر نہیں رہ سکیں گے۔۔ پتلے پتلے بادل انوکھی وضع کی مختلف صورتوں میں تیرتے ہوئے' آپس میں جُڑتے ہوئے' اپنے مرکزی حصے اور جسمانی وجود کو ساتھ لئے ہوئے' اور پھر بھاری بھرکم بادلوں کی شکل اختیار کئے ہوئے' ایک دوسرے کے اوپر انبار اور ڈھیر لگے ہوئے جو گاڑھے اور ٹھوس ہو کر کس شان سے بارش برساتے ہیں۔ پھر بالائی مقامات پر بھاری' سیاہ بادل جن سے اولے برستے ہیں' کیسے نمایاں' ممتاز اور ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہوتے ہیں! وہ حقیقت میں پہاڑوں کے تودے لگتے ہیں۔ اور جب اولے نیچے گرتے ہیں تو مضافاتی جگہ کیسی ٹھنڈی پڑ جاتی ہے! کچھ مقامات پر تو وہ پڑتے ہیں اور کچھ مقامات پر باوجود اُن کے باہم جڑے ہوئے ہونے کے' نہیں پڑتے۔ اور گرجتے بادلوں سے برقِ آسمانی سے آنکھوں کو چکاچوند کر دینے والی روشنی کیسی ہوتی ہے! اس کتابِ فطرت میں کیا ہم قوت والے' مہربان و رحیم خدا کا (غیر مرئی) ہاتھ نہیں دیکھتے؟'' (عبداللہ یوسف علی' نوٹ :۳۰۱۹)

(۲) وَأَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً طَهُورًاO لِّنُحْيِيَ بِهِ بَلْدَةً مَّيْتًا وَّنُسْقِيَهُ مِمَّا خَلَقْنَا أَنْعَامًا وَّ أَنَاسِيَّ كَثِيرًاO وَلَقَدْ صَرَّفْنَاهُ بَيْنَهُمْ لِيَذَّكَّرُوا (اَلفُرقان : ۴۸ تا ۵۰)

''اور آسمان سے ہم نے پاک کرنے والا پانی اتارا تاکہ ہم اُس سے مُردہ شہر کو زندہ کریں اور وہ پانی اپنے پیدا کیئے ہوئے بہت سے چوپایوں اور انسانوں کو پلائیں۔ اور ہم بارش کو لوگوں کے درمیان بانٹتے رہتے ہیں تا کہ وہ غور وفکر کریں۔'' (۴۸ تا ۵۰ : ۲۵)

رب تعالیٰ نے مختلف علاقوں میں پانی کی بہم رسانی کے لئے بارش کا جو انتظام کیا ہوا ہے' یہ انتظام ہی اللہ کے واحد رب العالمین ہونے کی دلیل ہے۔ تمام جہانوں کے پالنہار ہونے کے ناطے سے اُس نے تمام جہانوں کو رزق پہنچانا ہے۔ اس لئے وہ صرف ایک علاقے میں بارش نازل نہیں کرتا بلکہ وقفہ وقفہ سے تمام علاقوں میں بارش نازل فرماتا ہے۔ پھر اس میں یہ حکمت بھی کارفرما ہے کہ جن علاقوں کی زمین میں جس جنس کی پیداوار کی صلاحیت ہوتی ہے اور اُسے جتنی بارش کی ضرورت ہوتی ہے' وہاں پر اُتنی ہی بارش نازل فرماتا ہے۔ پھر بارش کے ذکر میں حشر ونشر پر بھی دلیل ہے کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہر سال جب بارشیں ہوتی ہیں تو اسی زمین سے برساتی مینڈک اور دوسرے برساتی حشرات الارض پیدا ہو جاتے ہیں۔ بارشیں ختم ہونے کے کچھ عرصہ بعد وہ اسی زمین میں مرکھپ جاتے ہیں اور دوسرے سال برسات کے موسم میں پھر پیدا ہو جاتے ہیں اور موت کے بعد حیات' اور حیات کے بعد موت کا یہ سلسلہ یونہی چلتا رہتا ہے اور جس طرح اللہ تعالیٰ ان برساتی جانوروں کو ہر موسم میں موت کے بعد زندہ کرتا ہے' اُسی طرح وہ انسانوں کو بھی موت کے بعد زندہ فرمائے گا۔

''ہوائیں خوشی وشادمانی کی پیامبر اور بارش کا پیش خیمہ ہوتی ہیں جو رحمتِ الٰہی کی ایک شکل ہے۔ پھر آیت میں بیان کردہ بارش کی علامتیت ایک نئے نقطہ نگاہ کو پیش کرتی ہے۔ حرارت (جس کا تعلق روشنی کے ساتھ ہے) سمندروں سے نمی کو چوسنے اور اُسے ہواؤں کے ذریعے ایک وسیع سطح زمین پر تقسیم کرنے کے علاوہ فضا میں برقی لہریں قائم کرتی ہے۔ مادّی دنیا میں ہمیں حرارت کا زندگی پر مفید عمل کرنے کے متعلق معلوم ہے۔ مون سون ہوائیں اور بادل بارش کے عمدہ نمائندے ہیں۔''

''صاف ہوا میں بارش کا پانی ہوا اور بلندی میں مقطّر کیا ہوا نہ صرف خالص پانی ہوتا ہے بلکہ وہ وسیع پیمانے پر صاف کرنے والا اور صحت کاری کا نمائندہ بھی ہے۔ تمام آبی چکر۔۔ سمندر' بادل' بارش' اولے یا برف اور دریا۔۔ عواملِ فطرت کی قابلِ توجہ توضیحات ہیں جن سے اللہ تعالیٰ کی رزّاقیت ہمیں دکھائی دیتی ہے۔ سمندروں کی نمکیات اُس تمام گندگی اور میل کو صاف کر دیتی ہیں جو اس میں مل چکی ہوتی ہیں۔ بارش' پالا' برف زار (گلیشیئر)' دریا' جھیلیں وغیرہ کی شکل میں آبی عمل قشرِ ارض کی تعمیر و ترتیب کا ذمہّ دار ہے اور طبعی جغرافیہ کا بڑا عامل ہے۔ پانی کے عمل سے ایک سوکھے سڑے صحرا کو جلد ہی زندگی مل جاتی ہے۔ پینے کا تمام پانی خواہ وہ دریاؤں' نہروں' جھیلوں' آبی ذخیروں' چشموں' کنوؤں یا کسی قسم کے واٹر ورکس سے حاصل کیا گیا ہو' انجام کار بارش ہی کا رہینِ منت ہے۔ زندگی کا پانی کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ پروٹو پلازم (خلیے کا ذی حیات حصّہ) جو بذاتِ خود زندگی کی مادّی بنیاد ہے' کا بیشتر حصّہ پانی ہی ہے۔'' (عبداللہ یوسف علی' نوٹس: ۳۱۰۴ تا ۳۱۰۶)

(۷) وَهُوَ الَّذِیْ مَرَجَ الْبَحْرَیْنِ هٰذَا عَذْبٌ'' فُرَاتٌ'' وَّ هٰذَا مِلْحٌ'' اُجَاجٌ'' وَجَعَلَ بَیْنَهُمَا بَرْزَخًا وَّحِجْرًا مَّحْجُوْرًا٥ (اَلفرقان : ۵۳)

''وہ وہی اللہ ہے جس نے دو دریاؤں کو ملایا' ایک شیریں تسکین بخش ہے اور ایک کھاری' تلخ ہے اور دونوں کے درمیان ایک حجاب اور ایک مانع قوی رکھ دیا۔'' (۵۳ : ۲۵)

''سمندروں کی اِس خصوصیت کو کہ وہ ایک دوسرے سے آملنے کے باوجود آپس میں گڈمڈ نہیں ہوتے' ماہرینِ بحری جغرافیہ (Oceanographers) نے حال ہی میں دریافت کیا ہے۔ یہ ایک طبیعی قوت ''سطحی تناؤ'' (Surface Tension) کا نتیجہ ہے کہ ہمسایہ سمندروں کے پانی آپس میں گڈمڈ نہیں ہوتے۔ اِن پانیوں کی کثافتوں (Density) کے مختلف ہونے کی بناء پر سطحی تناؤ اُنہیں آپس میں خلط ملط ہونے سے باز رکھتا ہے جیسے اُن کے مابین ایک پتلی دیوار حائل ہوگئی ہو۔ اس کا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ جب اہلِ دُنیا علم طبیعیات (فزکس) ''سطحی تناؤ'' یا ''علمِ بحری جغرافیہ'' سے نابلد تھے' اُنہیں اس حقیقت سے اللہ تعالٰی نے اپنی آخری کتاب کے ذریعے باخبر کر دیا۔'' (''قرآن رہنمائے سائنس'' ص ۱۳۴)

''ماہرینِ فن کا بیان ہے کہ سطحِ زمین کے نیچے پانی کے دو مستقل نظام جاری ہیں۔ ایک سلسلہ آبِ شور کا ہے جو سمندروں سے ظاہر ہوتا ہے۔ دوسرا سلسلہ آبِ شیریں کا ہے جو عموماً کنوؤں' دریاؤں اور جھیلوں سے نکلتا رہتا ہے۔ کائناتِ انسانی کے لئے دونوں اپنی اپنی جگہ نہایت ضروری ہیں۔ ہندوستان میں دو دریاؤں کے درمیان جدائی کا مشاہدہ کئی مقامات پر ہوسکتا ہے مثلاً اراکان (علاقہ برما) اور چاٹگام کے درمیان اور ضلع باریسال'' (ماجدی)۔ اسی طرح بحیرہ روم کا پانی جبرالٹر کے مقام پر بحر اوقیانوس میں داخل ہوتا ہے لیکن اُن کے درجہ حرارت' کھارے پن اور کثافت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی کیونکہ حدِّ فاصل اُنہیں جدا رکھتی ہے۔ باوجود اس کے کہ اُن کی لہریں زبردست طاقت کی حامل ہوتی ہیں لیکن وہ درمیان میں حائل پردے کو نہیں توڑ سکتیں جیسا کہ درجِ بالا آیات میں بیان ہوا۔ [''قرآن ۔۔ رہنمائے سائنس'' (اردو ترجمہ) ۔۔۔ ہارون یحیٰی' ص ۱۳۵]

(۸) اَللّٰهُ الَّذِیۡ یُرۡسِلُ الرِّیٰحَ فَتُثِیۡرُ سَحَابًا فَیَبۡسُطُهٗ کَیۡفَ یَشَآءُ وَیَجۡعَلُهٗ کِسَفًا فَتَرَی الۡوَدۡقَ یَخۡرُجُ مِنۡ خِلٰلِهٖ فَاِذَاۤ اَصَابَ بِهٖ مَنۡ یَّشَآءُ مِنۡ عِبَادِهٖۤ اِذَا هُمۡ یَسۡتَبۡشِرُوۡنَ ○ وَاِنۡ کَانُوۡا مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ یُّنَزَّلَ عَلَیۡهِمۡ مِّنۡ قَبۡلِهٖ لَمُبۡلِسِیۡنَ ○ (الرُّوم: ۴۸' ۴۹)

''اللہ ہی تو ہے جو ہوائیں بھیجتا ہے تو وہ بادلوں کو اُٹھائے پھرتی ہیں' پھر اللہ اُسے جس طرح چاہتا ہے آسمان میں پھیلا دیتا ہے اور اُسے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے پھر (اے مخاطب!) تو بارش کو دیکھتا ہے کہ اس کے اندر سے ٹپکنے لگتی ہے' پھر اسے اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے' پہنچاتا ہے تو بس وہ خوشیاں منانے لگتے ہیں اگرچہ وہ اس سے پہلے کہ اُن پر بارش ہوتی' مایوس ہو چکے تھے۔'' (۴۸' ۴۹ : ۳۰)

یہاں ہواؤں کی تمثیلیہ کو ایک اور پہلو سے بیان کیا گیا ہے جو مادّی بھی ہے اور روحانی بھی ہے۔ مادّی دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ وہ بادلوں سے کھیل رہی ہوتی ہیں' وہ زمینی پانی سے نمی کو کیسے چوستی ہیں' ضرورت کے مطابق اسے کیسے سیاہ بادلوں میں اُٹھائے پھرتی ہیں اور حسبِ ضرورت بارش برسا کر وہ کیسے بادلوں کو تتر بتر کر دیتی ہیں۔ سو اللہ تعالٰی کی رحمت کا یہ عجیب و غریب کرشمہ جب اُس کی منشا کے مطابق انسانوں کے دلوں تک پہنچتا ہے اگرچہ کم مقدار

میں ہی کیوں نہ ہو تو وہ خوشیاں منانے لگتے ہیں اگرچہ اس سے پہلے وہ مایوس ہو چکے تھے۔''

جو لوگ کاشتکاروں اور زراعت پیشہ قوم خواہ وہ کسی ملک و قوم کے بھی ہوں' کی نفسیات سے واقف ہیں دوسری آیتِ مذکورہ ۴۹ کی دل کھول کر داد دیں گے کہ ابھی تو لوگ مایوس ہو رہے تھے اور ابھی خوش ہو گئے!

(۹) وَاللّٰہُ الَّذِیٓ أَرۡسَلَ الرِّیٰحَ فَتُثِیۡرُ سَحَابًا فَسُقۡنٰهُ اِلٰی بَلَدٍ مَّیِّتٍ فَأَحۡیَیۡنَا بِهِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِهَا کَذٰلِکَ النُّشُوۡرُO (فاطر : ۹)

''اور اللہ وہی ہے جو ہواؤں کو بھیجتا ہے تو وہ بادلوں کو اٹھاتی ہیں' پھر ہم اُسے خشک خطۂ زمین کی طرف ہانک لے جاتے ہیں' پھر ہم اس کے ذریعہ سے زمین کو اُس کی خشکی کے بعد سرسبز کر دیتے ہیں' اِسی طرح جی اُٹھنا ہو گا۔'' (۹ : ۳۵)

سوکھی ہوئی زمین کا از سرِ نو جی اٹھنا بجائے خود حق تعالیٰ کی قدرت و ربوبیت کا ایک سبق ہے۔ پھر اس خشک زمین کو مرغزار بنا دینے کو مرنے کے بعد دوبارہ جی اٹھنے سے تشبیہ دینا کیسی عقل لگتی اور حسبِ حال تشبیہ ہے!

(۱۰) وَجَعَلۡنَا فِیۡهَا جَنّٰتٍ مِّنۡ نَّخِیۡلٍ وَّأَعۡنَابٍ وَّفَجَّرۡنَا فِیۡهَا مِنَ الۡعُیُوۡنِO (یٰسٓ : ۳۴)

''اور ہم نے اُس (زمین) میں کھجوروں اور انگوروں کے باغ لگائے اور اس (زمین) میں چشمے جاری کر دئے۔'' (۳۴ : ۳۶)

کھجور اور انگور کے ناموں کی تصریح تو مذاقِ عرب (مخاطبینِ اوّل) کی رعایت سے ہے۔ کھجور تو کہنا چاہئے کہ عرب کے حق میں مایۂ حیات ہے اور انگور کے شاداب باغوں سے بھی اہلِ عرب واقف تھے۔ گزشتہ آیت ۳۳ میں غلّے اور اناج کا ذکر تھا' اس آیت ۳۴ میں پھلوں کا ذکر ہے۔ غلّہ' اناج اور پھل سبھی حیاتِ انسانی کے لئے لازم ہیں اور اِن سب کی آبیاری اور افزائش بارش ہی سے ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ کے بہترین صنّاع اور رزّاق ہونے کی ناقابلِ تردید شہادت ہے۔ (عبداللہ یوسف علی' نوٹ: ۳۶۷۸)

(۱۱) وَمَا أَنۡزَلَ اللّٰہُ مِنَ السَّمَآءِ مِنۡ رِّزۡقٍ فَأَحۡیَیۡنَا بِهِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِهَا وَتَصۡرِیۡفِ الرِّیٰحِ اٰیٰتٌ لِّقَوۡمٍ یَّعۡقِلُوۡنَO (الجاثیۃ : ۵)

''اور اُس رزق میں جو اللہ نے آسمان سے اتارا' پھر زمین کو اس کے خشک ہونے کے بعد تر و تازہ کیا اور ہواؤں کے ادل بدل میں عقل رکھنے والوں کے لئے نشانیاں ہیں۔'' (۵ : ۴۵)

رزق سے یہاں مراد سببِ رزق یعنی بارش ہے۔ معاشیات' حیاتیات' نباتیات' ارضیات اور فضائیات کے سارے علوم مع اپنی شاخوں اور متعلقات کے اس کے تحت میں آ گئے۔

(۱۲) وَنَزَّلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً مُّبٰرَكًا فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ جَنّٰتٍ وَّحَبَّ الْحَصِيْدِ O وَالنَّخْلَ بٰسِقٰتٍ لَّهَا طَلْعٌ نَّضِيْدٌ O رِّزْقًا لِّلْعِبَادِ وَاَحْيَيْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا كَذٰلِكَ الْخُرُوْجُ O (ق : ۹ تا ۱۱)

''اور ہم نے آسمان سے برکت والا پانی برسایا' پھر ہم نے اُس سے باغ اور کھیتی کا غلّہ اور لمبی لمبی کھجور کے درخت جن کے گچھے خوب گندھے ہوئے رہتے ہیں' بندوں کو رزق دینے کے لئے اُگائے اور ہم نے اُس کے ذریعہ سے مردہ زمین کو زندہ کیا' اسی طرح (زمین سے حشر میں) نکلنا ہوگا۔'' (سورہ ۵۰)

نبی ﷺ نے فرمایا کہ کھجور کا درخت مسلمان کی مثل ہے۔ اس کی توجیہ یہ ہے کہ کھجور کے درخت کی ہر چیز کام میں آجاتی ہے: اُس کا تنا گاڈر کی چھت بنانے میں کام آتا ہے' اس کے پتوں کی چٹائیاں اور ہاتھ کے پنکھے بنائے جاتے ہیں' اس کا پھل گدرا بھی کھایا جاتا ہے' تروتازہ بھی' خوب پکنے کے بعد بھی اور جب سوکھ جائے تو چھوہارا بن جاتا ہے۔ اسی طرح مسلمان ثواب کی نیت سے جو بھی کام کرے' اس پر اجر ملتا ہے حتیٰ کہ اُس کے سونے' جاگنے اور کھانے پینے پر بھی اجر ملتا ہے۔ (تبیان القرآن -- علامہ غلام رسول سعیدی' جلد ۱۱' صفحہ ۳۱۷)

(۱۳) اَفَرَءَيْتُمُ الْمَآءَ الَّذِيْ تَشْرَبُوْنَ O ءَاَنْتُمْ اَنْزَلْتُمُوْهُ مِنَ الْمُزْنِ اَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُوْنَ O لَوْ نَشَآءُ جَعَلْنٰهُ اُجَاجًا فَلَوْلَا تَشْكُرُوْنَ O (الواقعة : ۶۸ تا ۷۰)

''اچھا پھر یہ بتاؤ کہ جس پانی کو تم پیتے ہو' اُسے بادل سے تم برساتے ہو یا اُس کے برسانے والے ہم ہیں؟ اگر ہم چاہیں تو اُسے کڑوا کر ڈالیں تو تم شکر کیوں نہیں کرتے؟ (۶۸ تا ۷۰ : ۵۶)

اس سے پہلی آیات میں غذا کی نعمت کا ذکر کیا تھا اور اب پانی کی نعمت کا ذکر فرمایا جارہا ہے کیونکہ انسان کی عادت ہے کہ پہلے کوئی چیز کھاتا ہے' اُس کے بعد کسی مشروب کو پیتا ہے۔

''آیات میں اس بات کا حوالہ ہے کہ اللہ تعالیٰ قادرِ مطلق ہونے کے حوالہ سے تازہ میٹھے پانی کو کھاری اور کڑوا بنا سکتا ہے اور اُس کی اِس قدرتِ کاملہ کو ہمیں جتلانے کا ایک اور طریقہ یہ ہے کہ اُس نے انسان کو اپنے مقابل ہونے کا چیلنج کیا ہے کہ اگر تمہیں ہمارے مقابل کوئی طاقت حاصل ہے تو بادلوں سے ذرا بارش اتار کے دکھاؤ۔ تاہم دورِ جدید میں ٹیکنالوجی نے انسان کے لئے مصنوعی طور پر بارش اُتارنے کو یقینی طور پر ممکن بنا دیا ہے تو کیا اس لحاظ سے کوئی شخص قرآن کے اس چیلنج کو قبول کرسکتا ہے کہ انسان میں بھی بارش' اولے وغیرہ پیدا کرنے کی صلاحیت ہے؟

''اس کا جواب نفی میں ہے کیونکہ اس میدان میں انسانی حدود و قیود کا بہرحال خیال رکھا جانا ایک لازمی امر ہے۔ فرانسیسی محکمہ موسمیات کے دفتر کے ایک ماہر ایم۔ اے M.A. Facy نے Precipitations کے عنوان کے تحت لکھا:

''اُس بادل سے بارش کا اتارنا قطعاً ممکن نہ ہوگا جس میں برساتی بادل کی خصوصیات موجود نہ ہوں یا اُس بادل سے جو پختگی کے موزوں مرحلہ تک نہیں پہنچا۔'' (Universalis Encyclopedia)

''اس لئے انسان تکنیکی ذرائع سے کبھی بھی بارش یا اولے برسانے پر قادر نہیں ہو سکتا جب تک اس کے لئے قدرتی حالات موجود نہ ہوں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو خشک سالی کبھی بھی اس طرح واقع نہ ہوتی جیسی وہ اب واقع ہوتی ہے۔ لہٰذا بارش اور خوشگوار موسم کو کنٹرول کرنا اب تک محض ایک خواب ہی ہیں۔''

''انسان خودسر ہو کر اُس مستحکم چکر کو نہیں توڑ سکتا جس نے فطرت میں آبی گردش کو قائم رکھا ہوا ہے۔ علم الماء کے جدید نظریات کے مطابق اس آبی گردش کی ذیل میں خطوط نگاری کی گئی ہے:

''سورج کی شعاعوں سے حاصل شدہ حرارے (Calories) سمندر اور سطحِ زمین کے اُن حصّوں کے بخارات میں تحلیل ہونے کا سبب بنتے ہیں جو پانی سے ڈھکے ہوئے ہوں۔ یہ آبی بخار فضا میں بلند ہوتے ہیں اور منجمد ہو کر بادل بن جاتے ہیں۔ پھر ان بادلوں کو ہوائیں مختلف فاصلوں تک لے جاتی ہیں۔ پھر بادل یا تو بارش برسائے بغیر بکھر جاتے ہیں یا دوسرے بادلوں کے ساتھ مل جاتے ہیں جس سے انجماد اور کثافت اور بھی بڑھ جاتی ہے' یا پھر وہ ٹکڑوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں اور اپنے ارتقاء کے کچھ مرحلوں میں بارش برساتے ہیں۔ جب بارش سمندر میں پہنچتی ہے (سطحِ زمین کا ستر فیصد حصّہ سمندروں سے ڈھانپا ہوا ہے) تو چکر جلد ہی دوبارہ شروع ہو جاتا ہے۔ جب بارش برستی ہے تو زمینی سبزہ اُسے جذب کر لیتا ہے جس سے سبزیات وغیرہ خوب اگتی ہیں۔ پھر یہی سبزہ پانی چھوڑتا ہے جس کا کچھ حصّہ فضا میں پہنچ جاتا ہے۔ بقایا پانی خواہ وہ کم مقدار میں ہو یا زیادہ مقدار میں' زمین کے بالائی پرت میں نفوذ کرتا ہے جہاں سے وہ مختلف راہوں سے ہوتا ہوا سمندر میں پہنچ جاتا ہے یا وہ چشموں وغیرہ کے ذریعے سطحِ زمین تک واپس آجاتا ہے۔'' ("The Bible, the Qur'an and Science"... Dr. Maurice Bucaille, pp. 176-178)

''جیوہائیڈرالوجی (زمین دوز پانی کا مطالعہ): تازہ پانی جو حیاتِ ارضی کا لازمہ ہے' زیادہ تر بارش اور اولوں (برف) سے حاصل کیا جاتا ہے جو زمین پر برستے ہیں۔ یہ بارش اور اولے (برف) زمین میں اس کے نفوذ کی صلاحیت کے مطابق جذب ہو جاتے ہیں۔ سطح کا وہ پانی جو جذب نہیں ہوتا' یا تو ہموار سطح پر' یا نشیبی مقامات میں اکٹھا ہو جاتا ہے یا زمین پر بہہ جاتا ہے جبکہ زمین کے بالائی پرت سے جذب شدہ نمی وہیں رہ جاتی ہے یہاں تک کہ وہ فضا میں عملِ تبخیر یا عملِ افشا (Transpiration) کے ذریعے فضا کو واپس آجاتا ہے یا کششِ ثقل سے زمین کی تہہ میں نیچے چلا جاتا ہے جس سے زمینی پانی دوبارہ چارج ہوتا ہے۔'' (Encyclopedia Americana, Vol. XIV, p. 659)

''(الف) دریائی پانی: جس کی بابت قرآن یوں فرماتا ہے:

(۱) وَهُوَ الَّذِىْ مَدَّ الْاَرْضَ وَجَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِىَ وَاَنْهٰرًا (الرّعد: ۳)

''وہ اللہ وہی تو ہے جس نے زمین کو پھیلایا اور اُس میں پہاڑ اور دریا رکھ دئے۔'' (۱۳ : ۳)

(۲) وَاَلْقٰى فِى الْاَرْضِ رَوَاسِىَ اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ وَاَنْهٰرًا (النّحل: ۱۵)

''اور اُس نے زمین میں پہاڑ رکھ دئے ہیں تاکہ وہ تمہیں لے کر ڈگمگانے نہ لگے اور دریا بھی رکھ دئے۔''

(۳) أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللهَ أَنزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَلَكَهُ يَنَابِيعَ فِي الْأَرْضِ ثُمَّ يُخْرِجُ بِهِ زَرْعًا مُّخْتَلِفًا أَلْوَانُهُ ثُمَّ يَهِيجُ فَتَرَاهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَجْعَلُهُ حُطَامًا (اَلزُّمر : ۲۱)
''(اے مخاطب!) کیا تو نے اس پر نظر نہیں کی کہ اللہ نے آسمان سے پانی اتارا' پھر اُسے زمین کے سوتوں میں داخل کر دیا' پھر وہ اس کے ذریعہ سے کھیتیاں پیدا کرتا ہے جس کی مختلف قسمیں ہیں پھر وہ کھیتی خشک ہو جاتی ہے' سو تو اُسے زرد دیکھتا ہے پھر وہ اُسے چورا چورا کر دیتا ہے۔'' (۳۹:۲۱)

''اس آغاز اور اس انجام پر انسان غور کرے تو ایک کھلا ہوا نمونہ حیاتِ انسانی کے آغاز و انجام کا مل جاتا ہے۔ زندگی کے کیسے کیسے دَور گزرتے ہیں لیکن سب کا انجام و حاصل فنا اور آخر فنا! یہ مراد بھی ہو سکتی ہے کہ ان میں ایک ایک تغیر کتنی حکمتوں کا نتیجہ ہوتا ہے اور پھر آخری تغیر کتنی زبردست اور کاریگری پر دلیل ہے۔'' (ماجدی)

(۴) قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِنْ أَصْبَحَ مَآؤُكُمْ غَوْرًا فَمَنْ يَأْتِيكُمْ بِمَآءٍ مَّعِينٍ ○ (المُلك : ۳۰)
''فرما دیجئے کہ اگر تمہارا پانی نیچے کو غائب ہو جائے تو کون ہے جو تمہارے پاس بہتا ہوا پانی لے آئے۔''

ذرا اُس منظر کو چشمِ تصور میں تو لایئے کہ اگر ہمیں کسی سہانی صبح کو یہ معلوم ہو کہ پانی کی بہم رسانی کے تمام ذرائع اور چشمے ناپید ہو چکے ہیں اور زمین کی اتھاہ گہرائیوں میں چلے گئے ہیں؟ اس صورت میں کوئی چیز بھی تو ہماری زندگی کو نہیں بچا سکتی کیونکہ ہم پانی کے بغیر جی نہیں سکتے جیسا کہ غَوْرًا کے لفظ میں پانی کی یہ خصوصیت بیان کر دی گئی کہ وہ ہمیشہ نشیب میں جاتا ہے اور اوپر کو نہیں جاتا۔ غرض پانی کے وجود کے بغیر کسی بھی قسم کی حیات کا تصوّر تک ناممکن ہے۔

(۵) أَخْرَجَ مِنْهَا مَآءَهَا وَمَرْعَاهَا (اَلنّٰزِعٰت : ۳۱)
''اُس نے اُس (زمین) سے اُس کا پانی اور اُس کا چارہ نکالا'' (۷۹ : ۳۱)

''پانی کے زمین دوز چشمے' کنویں اور شمالی علاقوں میں برف زار (گلیشیئر) زمین کے مختلف بالائی اور نشیبی سطحوں کی وجہ سے ہیں۔ وہ نمی کو بقدرِ ضرورت مناسب طور پر اِدھر اُدھر پھیلاتے ہیں جس سے انسان کے لئے اناج' پھل اور سبزیاں اور جانوروں کے لئے چراگاہیں پیدا ہوتی ہیں۔ آسمان اور زمین کے درمیان یہ کیسا حیران کن گردشی نظام ہے!'' (عبداللہ یوسف علی' نوٹ : ۵۹۳۸)

درجِ بالا آیت (۳۱) میں اس بات کا بیان ہے کہ زمین کو بیضوی شکل مل جانے کے بعد اس میں پانی پیدا کیا گیا پھر اُس میں چراگاہیں پیدا کی گئیں۔ جدید ارضی طبیعیات (Geophysical) کے نظریات اسی معیّن ترتیب کے ساتھ متفق ہیں۔ زمین کو بیضوی یا کروی شکل میں پیدا کرنے کے بعد کرۂ آبی کی تخلیق ہوئی اور سمندر پیدا کئے گئے اور اس کے بعد نباتاتی زندگی کا آغاز ہوا۔ اگر مندرجہ بالا آیت کو اس مکمل ہم آہنگی کی روشنی میں دیکھا جائے تو اس کی مکمل معجزاتی معقولیت کی ستائش کئے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔'' ("The Holy Quran and the Facts of Science"... Dr. Haluk Nurbaki, p. 215)

''(ب) چشموں کا پانی: قرآن فرماتا ہے:

(۱) وَاِذِاسۡتَسۡقٰی مُوۡسٰی لِقَوۡمِہٖ فَقُلۡنَا اضۡرِبۡ بِّعَصَاكَ الۡحَجَرَ فَانۡفَجَرَتۡ مِنۡهُ اثۡنَتَا عَشۡرَةَ عَيۡنًا قَدۡ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشۡرَبَهُمۡ (البقرة: ۶۰)

''اور (وہ وقت یاد کرو) جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کے لئے پانی کی دعا مانگی' سو ہم نے کہا: (اے موسیٰ!) اپنا عصا (فلاں) پتھر پر مارو تو اس میں سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے (اور) ہر گروہ نے اپنا اپنا گھاٹ معلوم کرلیا۔'' (۲ : ۶۰)

مشہور ماہر اثریات سر فلنڈرز پٹری (Petri) تین آدمیوں کے قافلہ کے ساتھ 1904-05 میں جزیرہ نمائے سینا کی تحقیقی مہم پر روانہ ہوئے۔ اُن کے مشاہدات کا خلاصہ ایک دوسرے ماہر اثریات سر چارلس مارسٹن کی زبانی سنئے:

''یہ وسیع بیابانی علاقہ سیاہ اور سرخ رنگ کی پہاڑیوں سے لبریز ہے جس میں کہیں سبزہ زار بھی ہیں اور گہری گہری وادیاں اور شگاف' جا بجا نخلستانوں کے ساتھ فاصلے جو نقشہ پر قریب قریب معلوم ہوتے ہیں' ان ناہمواریوں کے باعث عملاً بڑے لمبے ہیں۔ پینے کے پانی کے کافی ذخیرہ کی فراہمی کی مشکلات جو اسرائیلیوں کو اپنی صحرانوردی کے زمانہ میں پیش آئی تھیں' آج بھی اُن کا تجربہ ہو رہا ہے۔'' (ماجدی)

''اُس پہاڑی چشمہ سے بارہ دھارے یا بارہ ٹوٹیاں بنی اسرائیل کے بارہ قبیلوں کی تعداد کے مطابق الگ الگ جاری ہوگئیں۔ بعض نادان مسیحیوں نے اس تعداد پر اعتراض کر دیا کہ یہ تو بائبل میں موجود نہیں' قرآن نے کہاں سے گھڑ کر کہہ دیا؟ قدرت نے سوال کا جواب بھی مسیحیوں کی زبان سے دلوا دیا۔ جارج سیل جو انگریزی زبان میں قرآن کریم کا قدیم ترین مترجم ہے' آیت کے حاشیہ پر لکھتا ہے:

''ایک مسیحی سیاح جو وہاں ہو آیا ہے' بہ تصریح بیان کرتا ہے کہ چٹان سے پانی بارہ مقامات سے نکلتا تھا۔''

اور ایک دوسرا مسیحی سیاح اپنے مشاہدے کو یوں بیان کرتا ہے:

''چٹان میں اس وقت ۲۴ سوراخ موجود ہیں' جو بہ آسانی شمار کئے جا سکتے ہیں۔ بارہ ایک طرف ہیں اور بارہ اُن کے مقابل جانب۔''

پادری ڈین سٹینلے (Dean Stanley) نے جو اُنیسویں صدی میں مسیحیت کے ایک ممتاز رکن ہوئے ہیں' صدی کے وسط میں بائبل کے مقاماتِ مقدسہ کی جغرافیائی تحقیق کے لئے بہ نفسِ نفیس فلسطین اور اُس کے ملحقات کا سفر کیا اور اپنے مشاہدات و تحقیقات پر ایک مستقل تصنیف Sinai and Palestine کے نام سے شائع کی۔ اُس میں اس چٹان کا ذکر کر کے وہ لکھتے ہیں:

''یہ چٹان دس اور پندرہ فٹ کے درمیان بلند ہے۔ آگے کی طرف ذرا خمیدہ ہے اور راس سقفہ کے قریب

لیجا کی وسیع وادی میں واقع ہے۔ شگاف اور دراڑ جابجا پڑے ہوئے ہیں۔ کچھ مٹے ہوئے ہیں' کچھ بڑے ہیں اور کچھ چھوٹے۔ گنتی میں اگر سب کو لیا جائے تو بیس ہوتے ہیں۔ اگر بعض کو چھوڑا جائے تو دس۔ سب سے پہلے قرآن ہی نے حتمی طور پر بنی اسرائیل کے بارہ قبائل کے لئے بارہ چشموں کی تعداد بیان کی ہے۔ یہ اشارہ انہی شگافوں کی طرف ہے۔'' (Sinai and Palestine صفحات ۳۶' ۳۷)

''عرب کے اُمی کی لائی ہوئی کتاب کے اعجاز کے قربان جایئے۔ صدیاں گزر جانے پر اُس کے بیان کی جزئیات تک کی تصدیق منکرین و معاندین کی زبان سے ہو رہی ہے۔'' (تفسیر ماجدی اردو' ص ۲۵' نوٹ: ۲۰۴)

(۲) ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَآءُ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ (البقرۃ : ۷۴)

''تمہارے دل اِس کے بعد بھی سخت ہی رہے چنانچہ وہ مثل پتھر کے ہیں بلکہ سختی میں اُن سے بھی بڑھ کر۔ اور پتھر تو کوئی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اُس سے دریا پھوٹ نکلتے ہیں اور اُن میں کوئی ایسا بھی ہوتا ہے کہ پھٹ جاتا ہے اور اُس میں سے پانی نکلتا ہے۔ اور اُن میں کوئی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اللہ کی ہیبت سے نیچے آ گرتا ہے۔''

اس آیت میں تین قسم کی چٹانیں بیان ہوئی ہیں: پہلی قسم کی چٹان سے پانی سوج در موج نکلتا ہے جس سے دریا بنتے ہیں۔ اس قسم کا ذکر سورۃ البقرۃ کی آیت ۶۰ میں ہوا جب موسیٰ علیہ السلام کے پتھر کو ضرب لگانے سے بارہ چشمے پھوٹ بہے تھے۔ دوسری قسم وہ ہے جس سے چشمے نکلتے ہیں اور آخری قسم اُن چٹانوں کی ہے جو زمین کے بالائی پرت میں خوب مضبوطی سے جمے ہوئے ہیں۔

(۳) وَجَعَلْنَا فِيْهَا جَنّٰتٍ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ وَّفَجَّرْنَا فِيْهَا مِنَ الْعُيُوْنِ ۝ (یٰسٓ : ۳۴)

''اور ہم نے اُس (زمین میں) کھجوروں اور انگوروں کے باغ لگائے اور اس (زمین) میں چشمے جاری کر دئے۔'' (۳۶ : ۳۴)

(۴) اُرْكُضْ بِرِجْلِكَ هٰذَا مُغْتَسَلٌۢ بَارِدٌ وَّشَرَابٌ (صٓ : ۴۲)

''(ہم نے ایّوب کو حکم دیا) اپنا پاؤں زمین پر مارو' یہ نہانے اور پینے کا ٹھنڈا پانی ہے۔'' (۴۲ : ۳۸)

اسی طرح مکہ مکرمہ کی مسجد الحرام میں واقع زمزم کے چشمہ کو بھی آبِ چشمہ کی مثال کے طور پر لیا جا سکتا ہے۔

(ج) <u>کنووں کا پانی</u> : جس کے متعلق صالح علیہ السلام نے اپنی (نافرمان) قوم سے فرمایا:

(۱) هٰذِهٖ نَاقَةٌ لَّهَا شِرْبٌ وَّلَكُمْ شِرْبُ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ۝ (الشعراء : ۱۵۵)

''یہ ایک اونٹنی ہے' پانی پینے کے لئے ایک باری اس کی ہے اور ایک مقرر دن میں ایک باری تمہاری ۔'' (۲۶ : ۱۵۵)

(۲) وَنَبِّئْهُمْ أَنَّ الْمَاءَ قِسْمَةٌ بَيْنَهُمْ كُلُّ شِرْبٍ مُّحْتَضَرٌ O (ألقمر : ۲۸)
''(ہم نے صالح کو حکم دیا کہ) اُنہیں خبر دے دینا کہ پانی اُن کے درمیان بانٹ دیا گیا ہے' ہر ایک باری پر باری والا حاضر ہوا کرے ۔'' (۵۴ : ۲۸)

پن بجلی (Hydro Electricity): دریائی پانی ہمارے لئے خدائے بزرگ و برتر کا عظیم عطیہ ہیں اور اگر گھریلو اور تجارتی استعمال کے لئے بجلی حرارت زا قوت (Thermal Power) کی بجائے آبی قوت سے حاصل کی جائے تو ہماری حکومت معاشرے میں اقتصادی اِحیاء کو بہ آسانی لا سکتی ہے۔ علاوہ ازیں یہ چیز مالی خسارے کو بھی کم کرے گی ۔حرارت زائی قوّت تیل اور پٹرول کے بین الاقوامی بہت اونچے نرخوں کے باعث بہت مہنگی پڑتی ہے جسے عام آدمی برداشت نہیں کر سکتا ۔قرآن مجید نے اس عطیہ کو سماج کے مشترکہ مفاد کے استعمال کے لئے پہلے ہی واضح کر دیا ہے ۔یہ اور بات ہے کہ ہم کسی سیاسی اور مالی مصلحتوں کے باعث اُنہیں استعمال میں نہ لائیں ۔چنانچہ قرآن نے فرمایا :

(۱) وَسَخَّرَ لَكُمُ الْأَنْهَارَ O (ابراھیم : ۳۲)
''اور تمہارے (نفع کے) لئے اُس نے دریاؤں کو مسخر کر دیا۔'' (۱۴ : ۳۲)

یعنی تم دریاؤں کے پانی کو اپنی ہر انفرادی و اجتماعی تمدنی ضرورت کے کام میں لاؤ' کشتیاں چلاؤ' آبپاشی کرو' اُن سے نہریں کاٹو' پن چکیاں چلاؤ' بجلی پیدا کرو وغیرہ ۔قدرت نے تمہیں فائدہ پہنچانے میں بخل سے کام نہیں لیا۔

(۲) وَأَلْقَىٰ فِي الْأَرْضِ رَوَاسِيَ أَن تَمِيدَ بِكُمْ وَأَنْهَارًا وَسُبُلًا لَّعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ O (النّحل : ۱۵)
''اور اُس نے زمین میں پہاڑ رکھ دیے تاکہ وہ تمہیں لے کر ڈگمگانے نہ لگے اور دریا اور راستے بنا دیے تاکہ تم راہ پاتے رہو۔'' (۱۶ : ۱۵)

تاہم یہ بات ذہن نشین ہونی چاہیے کہ ہماری تمام ذہنی صلاحیتوں' جسمانی قوتوں اور مہارتوں کے پیچھے قادرِ مطلق کی قوّت کار فرما ہے اور اِن تمام صلاحیتوں کا سرچشمہ صرف وہی ذات ہے ۔اُس کے نائب اور خلیفہ ہونے کے حوالہ سے ہم فطرت کی ان قوّتوں کو اپنے بہترین استعمال و مفاد میں لا سکتے ہیں ۔مثلاً ہم بارش کو اپنی خوراک پیدا کرنے کے لئے اور دریاؤں کو بطور شاہراہ استعمال کر سکتے ہیں' بحری جہاز بنا سکتے ہیں اور ٹریفک اور آبپاشی کے لئے نہریں کاٹ سکتے ہیں ۔یہاں تک کہ اجرامِ فلکی بھی اللہ کے حکم سے ہماری ضروریات پر پورا اتر سکتے ہیں ۔

آبپاشی اور قرآن حکیم : آبپاشی اور زراعت کی کامیابی کے لئے پانی ہمیشہ فیصلہ کن عامل رہا ہے ۔اس لئے لوگوں نے آبی ذرائع کو زراعتی مقاصد میں بروئے کار لانے کے لئے دقّت طلب کوششیں کی ہیں ۔جزیرۂ عرب میں زمین کی ماہیت کی وجہ سے اس کی مانگ اور بھی شدید ہوگئی ۔قرآن مجید یہاں پھر مؤمنوں کو ایک اور محرک مہیا کرتا ہے ۔

سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۶۶ میں انسانی زندگی کے اس حیات آفریں پہلو کی طرف یوں توجہ دلائی گئی ہے:۔

أَيَوَدُّ أَحَدُكُمْ أَنْ تَكُونَ لَهُ جَنَّةٌ مِنْ نَخِيلٍ وَأَعْنَابٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ لَهُ فِيهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرَاتِ وَأَصَابَهُ الْكِبَرُ وَلَهُ ذُرِّيَّةٌ ضُعَفَاءُ فَأَصَابَهَا إِعْصَارٌ فِيهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ

"کیا تم میں سے کوئی یہ پسند کرتا ہے کہ کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ ہو جس کے نیچے نہریں پڑی بہہ رہی ہوں اور اس کے لئے اُس (باغ) میں (اور بھی) ہر قسم کے میوے ہوں اور اُسے بڑھاپا آچکا ہو اور اُس کے بچے کمزور وناتواں ہوں۔ اُس (باغ) پر ایک آتشیں بگولا آئے تو وہ (باغ) جل جائے۔"

آیت میں تصریح کے ساتھ اُنہی میووں کا نام لیا گیا جو اہلِ عرب کے لئے خاص اہمیت اور خصوصی معنویت رکھتے تھے۔ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ میں اس بات کا اظہار ہے کہ وہ باغ خوب سرسبز و شاداب بھی تھا۔ اور مِنْ كُلِّ الثَّمَرَاتِ میں باغ کے مالک کی مرفہ الحالی اور شانِ غنا کا اظہار ہے۔

قرآن مجید حضرتِ انسان کو اُن اقوامِ ماضیہ کی یاد دلاتا ہے جن کے نظام ہائے آبپاشی خوب منظم و مستحکم تھے لیکن اُنہیں اُن کے گناہوں اور ظلم وعدوان کے سبب صفحۂ ہستی سے حرفِ غلط کی طرح مٹا دیا گیا۔ مثلاً فرمایا:

(۱) أَلَمْ يَرَوْا كَمْ أَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِنْ قَرْنٍ مَكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ مَا لَمْ نُمَكِّنْ لَكُمْ وَأَرْسَلْنَا السَّمَاءَ عَلَيْهِمْ مِدْرَارًا وَجَعَلْنَا الْأَنْهَارَ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهِمْ فَأَهْلَكْنَاهُمْ بِذُنُوبِهِمْ وَأَنْشَأْنَا مِنْ بَعْدِهِمْ قَرْنًا آخَرِينَ ○ (الانعام : ٦)

"کیا اُنہوں نے دیکھا نہیں کہ ہم اُن سے قبل کتنی جماعتوں کو ہلاک کر چکے ہیں جنہیں ہم نے روئے زمین میں وہ قوت دے رکھی تھی جو تمہیں نہیں دی ہے اور ہم نے اُن پر خوب کثرت سے بارش برسائی اور ہم نے اُن کے نیچے نہریں بہائیں۔ پھر ہم نے اُنہیں اُن کے گناہوں کے باعث ہلاک کر ڈالا اور ہم نے اُن کے بعد دوسری جماعتوں کو پیدا کر دیا۔" (٦ : ٦)

اس نص نے اس حقیقت کو واضح کر دیا کہ کوئی قوم اگر سرکشی کے مرض میں مبتلا ہے تو اُس کی ظاہری خوشحالی اور مادّی فارغ البالی اُسے ہلاکت کے انجام سے نہیں روک سکتی اور غضبِ الٰہی کے مقابل اُن کی مرفہ الحالی اُن کے ذرّہ بھر بھی کام نہیں آتی (سورۃ الدُّخان: آیات ۲۵ تا ۲۹)۔ یہ ضروری نہیں کہ وسیلۂ نجات کے امکان کے بغیر تمام سرکشوں کو ہلاک کر دیا جائے۔ قرآن مجید نے یونس علیہ السلام الملقب بہ "ذوالنُّون" کی قوم کا قصہ بیان کیا جو توبہ اور تلافیٔ مافات کی بدولت ہلاکت سے بچ گئے (سورہ یونس: ۹۸)۔"

(۲) فَأَعْرَضُوا فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ سَيْلَ الْعَرِمِ وَبَدَّلْنَاهُمْ بِجَنَّتَيْهِمْ جَنَّتَيْنِ ذَوَاتَيْ أُكُلٍ خَمْطٍ وَأَثْلٍ وَشَيْءٍ مِنْ سِدْرٍ قَلِيلٍ ○ ذَٰلِكَ جَزَيْنَاهُمْ بِمَا كَفَرُوا وَهَلْ نُجَازِي إِلَّا الْكَفُورَ ○ (۳۴ : ۱۶، ۱۷)

"سو اُنہوں نے سرتابی کی، تو ہم نے اُن پر بند کا سیلاب چھوڑ دیا اور ہم نے اُن کے دو رویہ باغوں کے عوض دو باغ اور دئے جو بدمزہ پھل اور جھاؤ اور قدرے قلیل بیری والے تھے۔ اُنہیں ہم نے یہ سزا اُن کی

ناسپاسی کے سبب دی اور ہم ایسی سزا بڑے ناسپاسوں ہی کو دیا کرتے ہیں۔'' (۱۶'۱۷ : ۳۴)

علامہ اشرف علی تھانوی نے فرمایا کہ فَأَعْرَضُوْا فَأَرْسَلْنَا۔۔الخ اور ذٰلِكَ جَزَيْنٰهُمْ بِمَا كَفَرُوْا۔۔ الخ دونوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اطاعت کو دنیاوی نعمت کے حصول اور معصیت (گناہ) کو اُس کے زوال میں دخل ہے۔

موسیٰ علیہ السلام کے ہم عصر فرعونِ مصر کو اپنے آبپاشی اور نہروں کے نظام پر بڑا گھمنڈ تھا' تو اُسے اِسی گھمنڈ کے زعم میں اُس کے اپنے ہی پانیوں میں غرق کر دیا گیا۔ اُس نے اپنی قوم سے یہی کہا تھا:

يَاقَوْمِ أَلَيْسَ لِيْ مُلْكُ مِصْرَ وَهٰذِهِ الْاَنْهَارُ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِيْ أَفَلَا تُبْصِرُوْنَ O۔۔۔فَلَمَّا آسَفُوْنَا انْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَأَغْرَقْنٰهُمْ أَجْمَعِيْنَ O فَجَعَلْنٰهُمْ سَلَفًا وَّمَثَلًا لِّلْاٰخِرِيْنَ O (الزُّخرف: ۵۶'۵۵'۵۱)
''اے میری قوم! کیا مصر کی سلطنت میری نہیں اور یہ نہریں میرے تخت میں بہہ رہی ہیں' کیا تم (سب) یہ نہیں دیکھتے ہو؟۔۔۔ پھر جب اُن لوگوں نے ہمیں غصہ دلایا تو ہم نے اُن سے بدلہ لے لیا اور ہم نے اُن سب کو غرقاب کر دیا تو ہم نے اُنہیں پیش رَو اور پچھلوں کے لئے کہاوت بنا دیا۔'' (۵۶'۵۵'۵۱ : ۴۳)

یعنی قومِ فرعون کے بعد جو اُمتیں آئیں' اُن کے لئے اُن کے حالات میں پند و موعظت اور عبرت ہے اور اُن کا تذکرہ ضرب المثل کے طور پر کیا جاتا ہے۔

جنتوں کی خوبصورت تصویر جو اپنی سدا رواں نہروں کے باعث ہمیشہ سرسبز و شاداب ہیں' بھی آب پاشی کے نظام میں تحقیق و تدقیق کی محرک بنی اور جس تحقیق میں ابتدائی زمانہ کے مسلمانوں نے خوب سرگرمی سے حصہ لیا:

(۱) وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ أَكْبَرُ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ O (التوبۃ : ۷۲)
''اللہ نے ایمان والوں اور ایمان والیوں سے باغوں کا وعدہ کر رکھا ہے کہ اُن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی' وہ اُن میں ہمیشہ رہیں گے اور (وعدہ کر رکھا ہے) ہیشگی کے باغوں میں پاکیزہ مکانوں کا اور اللہ کی رضامندی سب (نعمتوں) سے بڑھ کر ہے' بڑی کامیابی تو یہی ہے۔'' (۷۲ : ۹)

رضائے الٰہی ساری نعمتوں سے بڑھ کر ہے اور وہ تعمیلِ احکام سے ہر ایک کو حاصل ہو سکتی ہے۔ صوفیائے عارفین نے لکھا ہے کہ جنت میں دیدارِ الٰہی گو ایک عظیم الشان نعمت ہے لیکن یہ لذت تو صرف عاشقوں اور دیدار کرنے والوں کے نقطۂ خیال سے ہے۔ عاشق کے لئے بے شک دیدارِ محبوب سے بڑھ کر لذیذ نعمت اور کیا ہو سکتی ہے لیکن محبوب کی رضا تو اس سے بھی بڑھ کر لطیف و لذیذ ہے اور یہ رضا صرف تعمیلِ احکام اور ادائے فرائض میں ہے۔

(۲) جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ لَهُمْ فِيْهَا مَا يَشَآءُوْنَ (النَّحل: ۳۱)

''ہمیشہ رہنے کے باغ ہیں جن میں وہ داخل ہوں گے' اُن (باغوں) کے نیچے ندیاں بہہ رہی ہوں گی' جو کچھ وہ چاہیں گے' اُنہیں ہر چیز مل جائے گی۔'' (۳۱ : ۱٦)

(۳) مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِیْ وُعِدَالْمُتَّقُوْنَ فِیْهَا اَنْهَار" مِّنْ مَّآءٍ غَیْرِ آسِنٍ وَاَنْهَار" مِّنْ لَّبَنٍ لَّمْ یَتَغَیَّرْ طَعْمُه' وَ اَنْهَار" مِّنْ خَمْرٍ لَّذَّةٍ لِّلشّٰرِبِیْنَ وَ اَنْهَار" مِّنْ عَسَلٍ مُّصَفًّی وَ لَهُمْ فِیْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ وَمَغْفِرَة" مِّنْ رَّبِّهِمْ (مُحَمّد : ۱۵)

''جس جنت کا مؤمنوں سے وعدہ کیا گیا ہے' اُس کی کیفیت یہ ہے کہ اُس میں متغیر نہ ہونے والے پانی کی نہریں ہوں گی' اور ذائقہ نہ بدلنے والے دودھ کی نہریں ہوں گی' اور پینے والوں کے لئے خوش ذائقہ شراب کی نہریں ہوں گی اور صاف شہد کی نہریں ہوں گی اور وہاں اُن کے لئے ہر قسم کے پھل ہوں گے اور اُن کے پروردگار کی طرف سے بخشش ہوگی۔'' (۱۵ : ۴۷)

''یہ اور اس قسم کی دوسری آیاتِ قرآنی نے دُنیائے اسلام میں فنِ باغبانی اور نظامِ آبپاشی کو حقیقی طور پر پروان چڑھایا اور باغبانی اور آب پاشی کی سائنس میں زیادہ سے زیادہ تحقیق کرنے میں لوگوں کی حوصلہ افزائی کی۔ اِن آیات نے مویشی بانی (Animal Husbandry) کو بھی تحریک وتحریص دی جس کا زراعت کے شعبے سے قریبی اور ناقابلِ جدا تعلق ہے۔''

(۴) فِیْ سِدْرٍ مَّخْضُوْدٍO وَّطَلْحٍ مَّنْضُوْدٍO وَّظِلٍّ مَّمْدُوْدٍO وَّمَآءٍ مَّسْكُوْبٍO وَّفَاكِهَةٍ كَثِیْرَةٍO لَّا مَقْطُوْعَةٍ وَّلَا مَمْنُوْعَةٍO وَّفُرُشٍ مَّرْفُوْعَةٍO اِنَّآ اَنْشَاْنٰهُنَّ اِنْشَآءًO فَجَعَلْنٰهُنَّ اَبْكَارًاO عُرُبًا اَتْرَابًاO لِّاَصْحٰبِ الْیَمِیْنِO (الواقعة : ۲۸ تا ۳۸)

''(وہ وہاں ہوں گے جہاں) بے خار بیریاں ہوں گی' تہ بہ تہ کیلے ہوں گے' لمبا سایہ ہوگا' رواں پانی ہوگا' کثرت سے میوے ہوں گے جو نہ ختم ہوں گے اور نہ اُن کی روک ٹوک ہوگی اور اونچے فرش ہوں گے۔ ہم نے وہاں کی عورتوں کو خاص طور پر بنایا ہے یعنی ہم نے اُنہیں ایسا بنا دیا ہے کہ وہ کنواری رہیں گی اور محبوبہ اور ہم عمر (انہیں) داہنے والوں کے لئے۔'' (۲۸ تا ۳۸ : ۵٦)

''بے خار بیریاں'' مسرت وشادمانی اور اعلیٰ مقامی کی علامت ہیں۔'' (عبداللہ یوسف علی' نوٹ: ۵۲۳۷)

''اہلِ جنت کی خوش عیشی کی تکمیل کے لئے دوسری لذتوں کے ساتھ لذتِ مواصلت کا ذکر بھی ضروری تھا۔ یہاں آیات ۳۵ تا ۳۸ میں یہ بتایا کہ جنت کی عورتوں کی (اور اس میں حوریں بھی اور اس دنیا کی جنتی بیویاں بھی داخل ہیں) بناوٹ ایک خاص قسم کی ہوگی۔ اُن کا شباب' حُسن و جمال' دلکشی اور اہلِ جنت کے ساتھ اُن کی ہم عمری یہ سب چیزیں مستقل' پائدار اور دائمی ہوں گی اور اس دنیا کی نعمتوں کی طرح فناپذیر نہ ہوں گی۔'' (ماجدی' ص ۱۰٦۹)

اُن کے بارے میں حضرت اُمِّ سلمہ رضی اللہ عنہا کے سوال کرنے پر ختمی مرتبت آقا ﷺ نے فرمایا: اے اُمِّ سلمہ! ان سے مراد دُنیا ہی کی بیویاں ہیں ۔ اگر چہ وفات کے وقت وہ بوڑھی تھیں' اُن کے بال سفید تھے' اُن کی بینائی کمزور تھی' آنکھیں میلی کچیلی رہتی تھیں لیکن جب وہ جنت میں داخل ہوں گی تو ساری ہم عمر ہوں گی ۔ (ضیاء القرآن)

عُرُب'' کا واحد عَرُوب'' ہے۔ علامہ قرطبی کہتے ہیں کہ یہ وہ عورت ہے جو ناز و انداز اور خوش گفتاری سے اپنی محبت کا اظہار اپنے خاوند سے کرے ۔ یہ عورت کی ایسی صفت ہے جس میں اس کی نسوانیت کی ساری خوبیاں سمٹ آتی ہیں ۔ حسین و جمیل بھی ہو' ناز و اَدا والی بھی ہو' خوش گفتار بھی ہو' ہنس مکھ بھی اور اپنے خاوند کو دل سے چاہنے والی بھی ہو اور اپنی چاہت کو چھپانے والی نہ ہو بلکہ اس کا اظہار کرنے والی ہو۔'' (ضیاء القرآن' ج ۵' ص ۹۲)

مندرجہ ذیل آیات بھی ''آب پاشی'' سے متعلق ہیں :

(۱) مَثَلُ الَّذِينَ يُنفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ أَنبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِي كُلِّ سُنبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ (البقرة : ۲۶۱)

''جو لوگ اپنے مال کو اللہ کی راہ میں خرچ کرتے رہتے ہیں' اُن کے مال کی مثال ایسی ہے جیسے کہ ایک دانہ ہے کہ اُس سے سات بالیاں اُگیں' ہر ہر بالی کے اندر سو دانے ہوں ۔'' (۲ : ۲۶۱)

''یہاں جو نیکی کی راہ میں خرچ کرنے کی کھیتی سے لطیف تشبیہ دی گئی ہے' اس سے اہلِ لطائف نے دو نکتے پیدا کیے ہیں: (i) اپنے مصارفِ خیر کی حفاظت و نگہداشت بھی اہلِ زراعت ہی کی طرح کرتے رہنا چاہیے ۔ ریا' نمائش' عُجب' تکبر' ایذا اور احسان رکھنے سے انہیں برباد نہیں کر دینا چاہیے ۔ (ii) جس طرح تخم ریزی' آبپاشی وغیرہ کے اختلاف سے پیداوار' محنت' قیمت اور نفع میں مختلف ہوتی رہتی ہے' اسی طرح اجر گو مقدار میں برابر ہو' تاہم حُسنِ قبول و قربِ درجات وغیرہ کی کیفیات میں نیت و اخلاص کے اعتبار سے کمی بیشی ہوتی رہے گی ۔'' (ماجدی)

(۲) وَمَثَلُ الَّذِينَ يُنفِقُونَ أَمْوَالَهُمُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ وَتَثْبِيتًا مِّنْ أَنفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍ بِرَبْوَةٍ أَصَابَهَا وَابِلٌ فَآتَتْ أُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ فَإِن لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ (البقرة:۲۶۵)

''اور اُن لوگوں کی مثال جو اپنے مال رضائے الٰہی کی طلب میں اور اپنے نفس میں پختگی (پیدا کرنے کی غرض سے) خرچ کرتے رہتے ہیں' ایک باغ کی طرح ہے جو کسی ٹیلے پر ہو اور اُس پر زور کا مینہ پڑا ہو' پھر وہ دگنا پھل لایا ہو اور اگر زور کا مینہ نہ بھی پڑے تو ہلکی پھوار (ہی کافی ہے) ۔'' (۲:۲۶۵)

''اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی ترغیب دیتے ہوئے قرآن مجید نے ایک تشبیہ کے ذریعے ایک بہت ہی نازک اور مفید زرعی نکتہ بیان کیا ہے جس کے تحت زمین سے زیادہ سے زیادہ پیداوار حاصل کی جا سکتی ہے۔ نکتہ یہ ہے کہ بلند سطح پر واقع زمینیں میدانی علاقوں میں واقع زمینوں کی نسبت زیادہ زرخیز ہوتی ہیں' لہٰذا اُن کی پیداوار نسبتاً بہت زیادہ ہوتی ہے اور اُن کی کوالٹی بھی بہت بہتر ہوتی ہے۔ قرآن مجید کے

لفظ رَبْوَة کا یہ مطلب نہیں کہ سطح اتنی بلند ہو کہ اُسے پانی بھی نہ ملے بلکہ مطلب یہ ہے کہ زمین ڈھلوان یا اُتران کی طرف نہ ہو جہاں نالیاں گرتی ہوں کہ جس سے پوری زمین بری طرح آلودہ اور سیم زدہ ہو جائے۔ رَبْوَة کا مطلب اعلیٰ درجہ کی ایسی ہموار زمین ہے جو دریا کے سیلابوں اور شہر کے گندے پانیوں سے محفوظ رہے جس کے درخت خوشنما اور پھل لذیذ و بکثرت ہوں۔ نمی کی زیادتی کی بناء پر دوسری زمینوں سے حاصل شدہ پیداوار غیر معیاری اور غیر صحتمند ہوتی ہے۔'' (تفسیر نعیمی، جلد ۳، صفحہ ۶۰)

آبپاشی اور احادیث مبارکہ : خالی زمین بالعموم اور قابلِ کاشت زمین بالخصوص نوعِ انسانی پر عظیم الٰہی عطیہ ہیں۔ قابلِ کاشت زمین کو یونہی بیکار نہیں پڑا رہنا چاہئے بلکہ اُسے کاشت کیا جانا چاہئے تاکہ سماج کو زمینی پیداوار سے زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچے۔ زرعی پیداوار بڑھانے کے لئے اسلام نے آبپاشی کو بہت زیادہ اہمیت دی ہے۔ اسلامی نقطہ نظر سے جس شخص کے میدان آبی راہ میں ہیں، اُسے اپنی زمین کی آب پاشی کرنے کا پورا حق حاصل ہے لیکن جونہی اُس کی ضرورت پوری ہو جائے تو اُسے پانی کو ساتھ کے قطعاتِ ارضی کی طرف چھوڑ دینا چاہئے۔ اسلام میں کنواں تعمیر کرنا بھی کارِ خیر ہے۔ ایک حدیثِ مبارکہ جس کے راوی ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہیں، میں نبی ﷺ نے فرمایا :

''پانی کی زیادہ مقدار کو نہ روکا جائے جس سے پیداوار میں رکاوٹ آجائے۔''

حضرت ابو اُمامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب نبی علیہ السلام کی نگاہ ہل اور دوسرے زرعی آلات پر پڑتی تو آپ فرماتے کہ یہ جس گھر میں بھی داخل ہوتے ہیں تو اپنے ساتھ خوشحالی اور عظمت لاتے ہیں۔''

ایک اور موقع پر نبی ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص روما کے کنویں کو تعمیر کرے گا تو اُس کے لئے جنت ہے۔ چنانچہ عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ نے اُسے تعمیر کرا دیا۔

یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ صدیوں پہلے اُس جہالت کے اور غیر مہذب ماحول میں اسلام نے متوازن پیداوار کی ضرورت کو یقیناً محسوس کر لیا تھا اور یہ توازن زرعی اور صنعتی ترقی کے مابین ہے۔ اسلام میں زمین کو جو عاملِ پیدائش ہے، اس طرح استعمال میں لانا چاہئے کہ متوازن پیداوار کا مقصد بالآخر حاصل ہو جائے۔ ''اسلام کا نقطہ نظر یہ ہے کہ اگر لوگ دوسرے پیشوں کو نظر انداز کرتے ہوئے کسی ایک خاص پیشہ سے منسلک ہو کر رہ جائیں جس سے مجموعی طور پر سماج کو نقصان پہنچے تو ریاستِ اسلامی کو مداخلت کرنے اور اس نہج سے ہٹانے کا پورا اختیار حاصل ہے۔ لہٰذا جہاں لوگ زرعی زمینیں حاصل کرنے پر اڑ جائیں اور دوسرے پیشوں، صنعتوں اور سرمایہ کاری کو نظر انداز کرتے ہوئے صرف کاشتکاری ہی کو اپنا لیں تو ریاستِ اسلامی ایسے قوانین وضوابط وضع کر سکتی ہے جن سے یہ یقین ہو جائے کہ لوگ اپنی دولت کو متوازن طور پر پھیلائیں گے اور ایسے پیشوں اور صنعتوں سے منسلک ہوں گے جو انجام کار سماج کی فلاح و بہبود میں ہوں گے۔''

(۷۳) ہائی جین (صحت عامہ Hygiene)

Hygiene کا لفظ Hygeia سے نکلا ہے اور یونان میں اُن کی صحت کی دیوی کے نام کی مناسبت سے حفظانِ صحت کے علم کو Hygiene کہتے ہیں۔ اگر کوئی شخص بیمار ہو جائے تو اردگرد کے ماحول میں رہنے والے افراد کو بیمار پڑنے کا خطرہ ہوتا ہے کیونکہ بعض امراض چھوت والی ہوتی ہیں اور دوسرے افراد تک پھیل جاتی ہیں اور یہ سلسلہ بعض اوقات وسیع علاقہ تک پھیل جاتا ہے۔ اس طرح انسانی جانوں کے تلف ہونے کا بھی خطرہ ہوتا ہے۔ ان بیماریوں سے خود کو بچانے کے لئے ہم صحت و صفائی کے جن اصولوں پر عمل کرتے ہیں، وہ صحتِ عامہ یا ہائیجین کے اصول کہلاتے ہیں۔

صحت کس چیز کا نام ہے؟ صحت سے متعلق حقیقت پر مبنی تعریف ریاستہائے متحدہ امریکہ کی صحتی مسائل سے متعلق مشترکہ کمیٹی نے یہ دی ہے:

''صحت اُس حالت کا نام ہے جس میں ایک فرد اپنے ذہنی، جذباتی اور جسمانی تمام وسائل کو خوشگوار زندگی گزارنے میں بروئے کار لاتا ہے۔'' (The Encyclopedia of Religion, Vol. V, p. 364)

ہائی جین کا علم علاج کا علم نہیں ہے بلکہ یہ حفاظتی اقدامات کا علم ہے جس پر عمل کر کے ہم بیماری کو دور رکھ سکتے ہیں اور علاج کی نوبت ہی نہیں آتی۔ حفظانِ صحت یا ہائیجین کے حوالہ سے صحت کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

(۱) جسمانی صحت (Physical Hygiene)
(2) ذہنی صحت (Mental Hygiene)

(۱) جسمانی صحت: ''اس سے مراد یہ ہے کہ سر سے پاؤں تک تمام اعضاء اپنے افعال درست طور پر انجام دیں، اُن میں کوئی خرابی نہ ہو اور نیند اور بھوک نارمل ہو۔ جسم کسی قسم کی تھکاوٹ وغیرہ محسوس نہ کرے تو ایسا شخص جسمانی طور پر صحت مند کہلائے گا۔ درج ذیل تدابیر اختیار کرنے سے جسمانی صحت حاصل کی جا سکتی ہے:

(۱) لباس، جسم، ماکولات و مشروبات غرض استعمال کی ہر چیز کو صاف ستھرا رکھا جائے۔
(۲) جائے سکونت (رہائش) کی آب و ہوا ہر قسم کی آلودگی سے پاک ہو۔
(۳) جراثیم سے پاک وصاف پانی استعمال کیا جائے۔
(۴) معتدل درجہ حرارت میں رہا جائے تاکہ پسینے کا مناسب اخراج ہو، نہ بہت زیادہ اور نہ بہت کم۔
(۵) گھر میں جراثیم کش ادویات کا باقاعدہ استعمال کیا جائے۔
(۶) گھر کے اردگرد زیادہ سے زیادہ درخت یا سبزہ لگایا جائے۔
(۷) صنعتی علاقے میں رہائش اختیار نہ کی جائے کہ وہ صحت کے لئے مضر ہے۔
(۸) جسم کو چاق و چوبند اور توانا رکھنے کے لئے روزانہ ہلکی پھلکی ورزش کی جائے۔ اس کے لئے پنجگانہ

وقت کی نماز بہترین نسخہ ہے جس میں تمام اعصاب و اعضائے جسمانی کے موزوں تحرک سے جسم تندرست رہتا ہے۔ قرآن مجید نے اسی نکتہ کے مدِّنظر یہ شوق دلایا: وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ (المؤمنون:۹) یعنی وہ لوگ (اللہ کے نیک بندے) اپنی نمازوں کی پابندی کرتے ہیں۔

(۹) وبا کی صورت میں حفاظتی ٹیکے ضرور لگوائے جائیں۔

(۱۰) مرغن غذا کی بجائے سادہ غذا استعمال کی جائے۔

(۱۱) کھانا ہمیشہ وقت پر کھایا جائے۔ بے وقت کا کھانا نقصان دیتا ہے۔

(۱۲) خود کو بیماریوں کی چھوت سے بچا کر رکھا جائے۔

(۱۳) نظامِ ہاضمہ کا خاص خیال رکھا جائے۔ قبض کی شکایت نہ ہونے پائے کیونکہ فضلات کا اخراج بہت ضروری ہے۔

(۱۴) نشہ آور اشیاء اور تمباکو نوشی سے پرہیز کیا جائے کیونکہ یہ دولت کو دھوئیں اور خبط میں ضائع کرنے کے سوا کچھ نہیں۔ زندگی کے رنج و الم اور غموں سے فرار کے لئے نشہ کا سہارا لینا کوئی معقول اور خدا لگتی بات نہیں بلکہ یہ خالق و مالک کو ناراض کرنے والی بات ہے۔ غم غلط کرنے کے لئے رب تعالیٰ کا سہارا لینا بہترین نسخہ ہے۔

(۱۵) طبی نقطہ نگاہ کی رُو سے دل آزاری اور بے مقصد سوالات اور گفتگو سے گریز کیا جائے۔ قرآنِ حکیم فرماتا ہے:

(i) يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَسْئَلُوْا عَنْ اَشْيَآءَ اِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ (المائدۃ: ۱۰۱)
''مؤمنو! ایسی باتیں مت پوچھو کہ اگر وہ تم پر ظاہر کر دی جائیں تو تمہیں ناگوار گزریں۔'' (۵:۱۰۱)

''ممانعت ایسے سوالات کی ہو رہی ہے جو سرتاسر فضول اور لایعنی ہوں مثلاً لوگوں کی جزئیاتِ زندگی کے متعلق سوال کرتے رہنا۔ سوال دو قسم کے ہوتے ہیں: ایک تو یہ کہ کوئی معاشی یا معادی ضرورت واقعی پیش آ جائے یا اُس کے پیش آ جانے کا احتمال قوی ہو اور صاحبِ شریعت علیہ السلام سے بہ ادب و احترام اُس کی بابت پوچھ لیا جائے۔ دوسرے یہ کہ غرض و مقصد کچھ بھی صحیح نہ ہو اور دُور دُور کے احتمالات پیدا کر کے سوال محض سوال کرنے کی نیت سے کیا جائے۔ اپنے دل سے گھڑ کر رسول ﷺ کا امتحان لینے کے لئے سوالات اُن کے سامنے پیش کئے جائیں۔ یہاں اسی قسم کی سوال بازی کو ممنوع قرار دیا جا رہا ہے۔'' (ماجدی' صفحہ ۲۷۲' نوٹ: ۳۱۳)

(ii) وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ؕ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا O (بنی اسرائیل: ۳۶)
''اور (اے مخاطب!) اُس چیز کے پیچھے مت ہولیا کر جس کی بابت تجھے علم (صحیح) نہ ہو' بے شک کان' آنکھ اور دل' ان (سب) کی پوچھ گچھ ہر ایک سے ہوگی۔'' (۱۷ : ۳۶)

یعنی بلا تحقیق ہر سنی سنائی بات کے پیچھے مت ہولیا کرو۔ دیگر گراں بہا پند و نصائح کے ساتھ ساتھ غلامانِ مصطفیٰ علیہ وعلیٰ آلہ اطیب التحیۃ واجمل الثناء کو یہ تعلیم بھی دی جا رہی ہے کہ وہ وہم و گمان اور ظن و تخمین کے پیرو کار نہ بنیں بلکہ علم و

یقین کا روشن چراغ ہاتھ میں لے کر زندگی کے نشیب و فراز کو طے کرتے ہوئے منزل کی طرف بڑھتے چلیں۔ عقائد کی دنیا ہو یا عمل کا میدان۔ اخلاق کا گلستان ہو یا معاملات کی پُر خار وادی، جہاں بھی زمامِ کار یقین کے ہاتھ سے نکل کر ظن و تخمین کے ہاتھ میں آئی، سمجھو کہ اب گردابِ ہلاکت میں ڈوبا۔

آیت کے آخر میں بتایا جا رہا ہے کہ ملت کا ہر فرد اپنے تمام افعال کے لئے رب تعالیٰ کے حضور میں جوابدہ ہے۔ اُس کے دیکھنے اور سننے کی قوتیں، اُس کی عقل و فہم کی صلاحیتیں ہر ایک کے بارے میں اُس سے پوچھا جائے گا کہ اُس نے اُنہیں کیسے اور کہاں استعمال کیا ہے۔ احساسِ ذمہ داری کی یہ تعلیم ہر ہر فرد کو اس سے بہتر اور کہاں ملے گی؟ اس پر آج عمل ہونے لگے تو شخصی اور قومی، انفرادی اور اجتماعی دونوں قسم کے کتنے جھگڑے قصے دنیا سے آج ہی مٹ جائیں! وہ اُمّت جسے اُس کے خالق نے واشگاف الفاظ میں احساسِ ذمہ داری کا درس دیا، افسس کہ وہی قوم آج اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں انتہائی غیر ذمہ دارانہ رویّہ اختیار کئے ہوئے ہے۔

<u>ظن پر عمل کرنے کی ممانعت کا محمل</u> :ظن پر عمل کرنا اُس وقت منع ہے جب ظن، علم اور یقین کے خلاف ہو جیسے مشرکینِ عرب آباء و اجداد کی اپنے ظن سے تقلید کرتے تھے اور اپنے ظن سے بتوں کی عبادت کرتے تھے، اُنہیں مصائب میں پکارتے تھے اور اُن کے حق میں شفاعت کا عقیدہ رکھتے تھے حالانکہ یہ کام تمام انبیائے کرام اور رسولوں اور وحیِ الٰہی کے خلاف تھے جو علم اور یقین پر مبنی امور ہیں۔ اس وضاحت سے معلوم ہوا کہ ظن پر عمل کرنا مطلقاً منع نہیں ہے بلکہ اُس وقت منع ہے جب ظن پر عمل کرنا کسی دلیلِ قطعی کے خلاف ہو۔ آخر بازار سے خریدا ہوا گوشت ظن پر ہی خریدا جاتا ہے کہ یہ صحیح العقیدہ مسلمان کا ذبیحہ ہے اور صحیح طریقہ سے ذبح کیا گیا ہے۔

(۱۶) زندگی کے بارے میں رجائیت اور پُر امید رہنے (Optimism) کا رویّہ اپنایا جائے اور یہی مثبت سوچ ہے جس کی بابت قرآنِ حکیم نے فرمایا:

(i) لَا تَايْئَسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللهِ اِنَّهٗ لَا يَايْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ O (یوسف:۸۷)

''اللہ کی رحمت سے نا اُمید نہ ہو کہ اللہ کی رحمت سے نا امید تو کافر لوگ ہی ہوتے ہیں۔'' (۱۲:۸۷)

(ii) قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللهِ اِنَّ اللهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ O (الزُّمَر : ۵۳)

(اے نبیِ مکرّم! میری طرف سے) فرما دیجئے کہ اے میرے بندو! جو اپنے اوپر زیادتیاں کر چکے ہو، اللہ کی رحمت سے مایوس مت ہو، بے شک اللہ سب گناہ معاف فرما دے گا، وہ تو ہے ہی بڑا بخشنے والا اور بڑا رحم فرمانے والا۔'' (۳۹ : ۵۳)

سبحان اللہ! کیا شان ہے اُس وسعتِ کرم و شفقت کی جس کی کوئی انتہا نہیں کہ جن لوگوں نے اللہ کے محبوبین و مقرّبین کے خون سے اپنے ناپاک ہاتھ رنگین کئے، اُنہی کو توبہ اور مغفرت کی دعوت دی جا رہی ہے اور ''اے میرے نافرمان بندو!'' کے انتہائی پیارے اور اپنائیت کے لقب سے پکارا جا رہا ہے۔

(۱۷) اپنے اَبنائے جنس سے بامقصد تعلقات قائم کرنا' ثقافتی اور تفریح وخوش باشی کے لئے وقت نکالنا بھی حفظانِ صحت کے لئے ضروری ہے۔اس ضمن میں قرآنِ حکیم نے فرمایا:

(i) وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا (البقرۃ : ۸۳)
''اور لوگوں سے بھلی بات کہتے رہنا۔'' (۸۳ : ۲)

(ii) وَأَحْسِنْ كَمَا أَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ وَلَاتَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْاَرْض (اَلْقَصص : ۷۷)
''اور جس طرح اللہ نے تیرے ساتھ حسنِ سلوک کیا ہے' تو بھی (بندوں کے ساتھ) حسنِ سلوک سے پیش آ اور روئے زمین پر فساد مت پھیلا۔'' (۷۷ : ۲۸)

(۱۸) اگر کوئی پیچیدہ یا لاینحل مسئلہ درپیش آ گیا ہے تو صائب الرائے احباب سے مشورہ کرلیا جائے کہ قرآن کا یہی حکم ہے (بحوالہ سورہ آل عمران :۱۵۹ ؛ سورۃ الشوریٰ : ۳۸)

(۱۹) نیند کے اوقات کا بھی خاص خیال رکھا جائے۔احکاماتِ اسلامی کے مطابق نمازِ عشاء کی ادائی کے بعد جلد سو جانا چاہئے تا کہ صبح جلد بیدار ہو جائیں۔'' (''دانیال ہومیو پیتھک گائیڈ اینڈ نوٹس'' ص ص ۶' ۷)

نفسیاتی تحقیق سے یہ بات ثابت ہے کہ بے خوابی یا کم خوابی انسانوں اور حیوانوں کو بھوک کی نسبت جلد ہلاک کرڈالتی ہے۔تمام سائنسدان نیند کے سارے جسمانی نظام پر خوش آئند' تسکین بخش جادوئی اثر کی بات کرتے ہیں۔انسانی رگوں اور اعصاب کے لئے نیند انتہائی مکمل آرام کا باعث ہے۔علمِ حیاتیات کا ماہر بھی جب نیند کی بات کرتا ہے تو یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا: ''نیند کیا ہی پُر اَسرار' میٹھی اور محبوب چیز ہے! یہ کتنی عجیب بات ہے کہ ہم باقاعدگی سے اور بڑی خوشی سے اپنے آپ کو نیند کے سپرد کر دیتے ہیں۔شیکسپیئر نے کس خوبصورتی کے ساتھ نیند سے متعلق اپنے ہیروMacbeth کے منہ میں یہ الفاظ ڈالے ہیں:

''معصوم اور بے خطا نیند
نیند جو دن بھر کے پریشان کن تفکرات کو ٹانک دیتی ہے۔
نیند جو ہر دن کی حیات کے اختتام کا پیغام ہے' پُر آزار جفاکشی کو مٹانے کا ذریعہ ہے۔
وہ زخم خوردہ ذہنوں کا مرہم ہے' فطرتِ عظیمہ کے مسلسل آگے بڑھنے کا ثانوی راستہ ہے۔
زندگی کی ضیافت اور تلذّذ کو عظیم پروان چڑھانے والی ہے۔'' (MACBETH .. Act 2, Sc. 2)

<u>نمازِ عشاء کے بعد باتیں کرنے کا شرعی حکم اور اس کے متعلق احادیثِ مبارکہ</u> : سورۃ المؤمنون میں کفار کی بدخصلتی کی بابت ارشاد ہوا :

قَدْ كَانَتْ آيٰتِيْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَكُنْتُمْ عَلٰى أَعْقَابِكُمْ تَنْكِصُوْنَ ○ مُسْتَكْبِرِيْنَ بِهٖ سٰمِرًا تَهْجُرُوْنَ ○ (المؤمنون : ۶۶' ۶۷)
''میری آیتیں تم پر تلاوت کی جاتی تھیں تو تم اُلٹے پاؤں بھاگ جاتے تھے تکبر کرتے ہوئے' اس قرآن کو افسانہ کہہ کر بیہودہ بکتے ہوئے۔'' (۶۶' ۶۷ : ۲۳)

سَامِرًا کالفظ سَمَر سے بنا ہے جس کا معنی ہے رات کو باتیں کرنا' قصّے کہانیاں سنانا اور مُسامِر کا معنیٰ قصہ کہانی سنانے والا' افسانہ گو' داستان سرا ہے۔

تَھْجُرُوْن کالفظ ھجر سے بنا ہے بمعنیٰ ڈینگ مارنا' بیہودہ باتیں کرنا۔ کفار رات کو قرآن مجید اور نبی اکرم ﷺ کے متعلق بری اور بے ہودہ باتیں کرتے تھے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ وہ اپنی راتیں اطاعت وعبادت کی بجائے معصیت اور بیہودہ گوئی میں گزارتے تھے۔ سَمَر یعنی رات کو باتیں کرنے سے متعلق کچھ احادیث درجِ ذیل ہیں :

(۱) حضرت ابو برزہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نمازِ عشاء سے پہلے سونے اور نمازِ عشاء کے بعد باتیں کرنے کو مکروہ قرار دیتے تھے۔ (صحیح بخاری' رقم الحدیث: ۵۶۸ ؛ صحیح مسلم' رقم الحدیث: ۶۴۳؛ سنن النسائی رقم الحدیث: ۱۱۰۹ ؛ ابن ماجہ رقم الحدیث: ۵۱۸)

(۲) ''بنو سلمہ کے ایک شخص بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا کہ عشاء کے بعد باتیں کرنے سے اجتناب کرو اور جب رات کو گدھے بولیں تو أَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْم پڑھا کرو۔'' (تبیان القرآن' ج ۷' ص ۸۸۶)

نمازِ عشاء کے بعد باتیں کرنے کی ممانعت میں حکمت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دن کام کاج اور روزی کمانے کے لئے بنایا ہے اور رات آرام کرنے اور سونے کے لئے بنائی ہے۔ رات کو دیر تک جاگتے رہنا اور باتیں کرنا اللہ تعالیٰ کی اس حکمت اور صنعت کے خلاف ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہوا:

وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ اللَّيْلَ لِبَاسًا وَّالنَّوْمَ سُبَاتًا وَّجَعَلَ النَّهَارَ نُشُوْرًا O (اَلفرقان: ۴۷)

''اور وہی ہے جس نے رات کو تمہارے لئے لباس اور نیند کو راحت اور دن کو اٹھ کھڑے ہونے کا وقت بنا دیا۔''

رات کو دیر تک باتیں کرنا اس صورت میں ممنوع و مکروہ ہے جب قصہ کہانی اور کھیل تماشے کی یا دنیاوی باتیں کی جائیں لیکن اگر فقہ اور دین کی باتیں کی جائیں یا ذکر اذکار' تسبیح پڑھنے یا نوافل پڑھنے' شبینہ پڑھنے یا وعظ اور دینی تقاریر سننے اور سنانے میں رات کو دیر تک جاگا جائے تو وہ مذموم نہیں ہے بلکہ محمود ہے۔ حدیث میں ہے :

''حضرت اَنس رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ ایک رات ہم نمازِ عشاء کے لئے نبی ﷺ کا انتظار کرتے رہے حتیٰ کہ آدھی رات کے قریب وقت ہو گیا۔ پھر آپ آئے اور آپ نے ہمیں نماز پڑھائی' پھر ہمیں خطبہ دیا اور فرمایا: سنو! لوگوں نے نمازِ عشاء پڑھی اور سو گئے لیکن تمہارا شمار نماز میں ہوتا رہا جب تک تم انتظار کرتے رہے۔ حسن بصری نے کہا: لوگوں کا اُس وقت تک نیکی میں شمار ہوتا رہتا ہے جب تک وہ نیکی کے انتظار میں رہتے ہیں۔'' (صحیح بخاری' رقم الحدیث: ۶۰۰؛ صحیح مسلم' رقم الحدیث: ۶۴۰؛ مسند احمد' رقم الحدیث: ۱۵۰۱۲' بحوالہ تبیان القرآن' ج ۷' ص ۸۸۷)

(2) ذہنی صحت (Mental Hygiene): مجموعی طور پر صحتمند رہنے کے لئے جسمانی صحت کے ساتھ

ساتھ ذہنی صحت بھی بہت ضروری ہے۔ ذہنی صحت کا تعلق انسان کی سوچ اور اُس کے کردار سے ہے۔ ذہن کی پراگندگی، منفی سوچ، گناہ کی رغبت، نیکی سے دُوری، غم، فکر، غصہ یہ سب ذہنی بیماری کی علامات ہیں۔

منفی احساسات کا مسلسل قائم رہنا، ذہنی تناؤ یا غصہ وغیرہ انسانی جسم کے مختلف نظاموں کو غیر متوازن کر دیتا ہے۔ اس کی مثال ایسے ہی ہے جیسے چلتی مشین میں لوہے کی کوئی ایسی چیز پھینک دی جائے جس سے مشین میں فوراً بگاڑ پیدا ہو جائے۔ غلط سوچ اور ذہن کی پراگندگی انسان کو برائی کی طرف مائل کرتی ہے اور انسان جیسے جیسے برائی کرتا ہے، نیکی سے دور ہوتا چلا جاتا ہے اور یوں برائی کے راستے پر چل کر وہ بہت سے ضدی امراض میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ لہٰذا ذہنی صحت کے لئے ضروری ہے کہ ہم خوش رہیں، غموں سے دور رہیں، بے مقصد اور بلا وجہ کی سوچوں سے بچیں۔ گناہ کی زندگی گزارنے سے پرہیز کریں، نیکی کی راہ پر چلیں کیونکہ یہی فلاح کی راہ ہے اور اسی سے ذہنی اور جسمانی صحت حاصل ہوتی ہے۔ عبادت کا تعلق روحانیت سے ہے اور روحانیت انسانی ذہن پر اثر انداز ہوتی ہے اور یوں ایک مثبت سوچ رکھنے والا صحت مند ذہن تشکیل پاتا ہے۔'' (دانیال ہومیو پیتھک گائیڈ اینڈ نوٹس، ص ۵)

(الف) <u>سماج سے متعلق حفظانِ صحت</u>: عالمی ادارہ صحت (WHO) کے مطابق کسی معاشرہ کی طب یا حفظانِ صحت ایک ایسے نظام کا نام ہے جس کے تحت ہیلتھ ٹیم کی جانب سے لوگوں کی صحت کی طرف جامع توجہ دی جاتی ہے تاکہ سماج کے افراد کی صحت برقرار رہے۔

اگر تعلیم کسی سماج کے سرستون کا ایک پہلو ہے تو اُس کا دوسرا پہلو صحتِ عامّہ ہے۔ نبی ﷺ نے فرمایا:
(۱) ''طاقتور مسلمان اللہ کے نزدیک کمزور کی نسبت بہتر اور زیادہ پسندیدہ ہے۔'' (ابن ماجہ، ج ۱)
(۲) ''پاکیزگی اور صفائی نصف ایمان ہے۔'' (صحیح مسلم)
(۳) ''اللہ تعالیٰ بذاتِ خود پاک اور خالص ہے، لہٰذا وہ صرف پاک، طیّب چیز ہی کو پسند فرماتا ہے۔''

لہٰذا یہ نتیجہ نکالنا چنداں مشکل نہیں کہ انفرادی اور اجتماعی طور پر دونوں طرح مسلمان مناسب طبّی سہولیات فراہم کرنے کے ذمہ دار ہیں تاکہ سماج کو ناکارہ کر دینے والی بیماریوں سے بچایا جاسکے اور عوام الناس کی صحت اور حسنِ کارکردگی کو بہتر بنایا جاسکے۔ اس میں جراثیم سے پاک ماحول کی فراہمی بھی شامل ہے جو ساکت و بے لہر اور متعفن پانی کے نکال باہر کرنے سے حاصل ہوتی ہے اور جس سے صاف اور محفوظ پانی کی فراہمی ہوتی ہے۔ اس میں گندنکاسی، پسماندہ اور کچی آبادیوں کی اصلاح اور بہتر رہائشی سہولیات بھی شامل ہیں۔

سماج کو ہسپتال اور شفا خانے بھی مہیا ہونے چاہئیں۔ گھر میں علاج معالجہ اور متحرک و منقولہ (Mobile) صحتی یونٹ بھی اکثر اوقات لازمی ضرورت بن جاتے ہیں۔ اس لئے سماج کے لئے صحت سے متعلق تعلیم بھی ایک اہم فرض ہے۔ بہت سے مخیّر ادارے متحرک یونٹوں کی فراہمی سے صحت کو قائم رکھتے ہیں جو تعلیمی اداروں اور مضافاتی علاقوں میں جا کر لوگوں کو کچھ عام قسم کے امراض کی تہدیدی علامات بتاتے ہیں اور ان امراض کے لئے بالکل فری

ٹیسٹ دیتے ہیں۔ ٹیکا لگانے کے پروگراموں کا کرنا بھی سماج کی ذمہ داری ہے۔ بہت سی ایسی بیماریوں کے ٹیکے اب دستیاب ہیں جن بیماریوں کی وجہ سے بہت سی اموات واقع ہوئیں اور انسان کام کرنے سے ناکارہ ہو گئے۔ بہت سے ممالک میں سکول جانے والے بچوں کے لئے اور اُن لوگوں کے لئے ٹیکوں کی ضرورت ہوتی ہے جنہیں اُن ممالک کو سفر کرنا ہوتا ہے جہاں کچھ بیماریاں صرف اُسی ملک سے مخصوص ہیں۔" ("The New Book of Popular Science" Vol. V, p. 366)

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ حفظانِ صحت کے اصولوں اور معیاری پاکیزگی اور صفائی کی پابندی کی محرک قوت اللہ کی آخری کتاب قرآن مجید ہے جس نے متعدد مقامات پر حفظانِ صحت کی طرف ہماری توجہ دلائی ہے۔ مثلاً فرمایا:

(۱) اِنَّ اللهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ O (البقرة : ۲۲۲)

"بے شک اللہ توبہ کرنے والوں اور پاک صاف رہنے والوں سے محبت رکھتا ہے۔" (۲ : ۲۲۲)

(۲) يَاأَيُّهَاالَّذِيْنَ آمَنُوْا أَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّا أَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَلَسْتُمْ بِآخِذِيْهِ اِلَّا أَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ (البقرة: ۲۶۷)

"مومنو! جو تم نے کمایا ہے اس میں سے عمدہ چیزیں خرچ کیا کرو اور اس میں سے (بھی) جو ہم نے تمہارے لئے زمین سے نکالی ہیں اور خراب چیز کا قصد بھی نہ کرو کہ اس میں سے خرچ کرو گے حالانکہ تم خود بھی اس کے لینے والے نہیں بجز اس صورت کے کہ چشم پوشی ہی کر جاؤ۔" (۲ : ۲۶۷)

وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ۔۔۔ الخ کا مطلب یہ ہوا کہ "To rob Peter and to pay Paul" یعنی ایک کو لوٹ کر دوسرے کو بخشنے کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں۔

(۳) وَاللهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ O (اَلتَّوبة :۱۰۸)

"اور اللہ تعالیٰ خوب پاک ہونے والوں کو پسند کرتا ہے۔" (۹ : ۱۰۸)

اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا:

اَلنَّظَافَةُ مِنَ الْاِيْمَانِ (صفائی اور پاکیزگی جزوِ ایمان ہے)۔

<u>متوازن غذا اور تغذیہ</u>: غذا میں بہت سے اجزاء شامل ہوتے ہیں جن میں پروٹین، کاربوہائیڈریٹس، چکنائی، نمکیات، پانی اور حیاتین (وٹامنز) شامل ہیں۔ متوازن غذا سے مراد وہ غذا ہے جس میں تمام اجزاء مناسب تناسب سے موجود ہوں اور کسی ایک جزو کی زیادتی نہ ہو۔ ان اجزاء کے تناسب میں جسمانی ضرورت کے تحت تبدیلی کی جاسکتی ہے جیسے موسمِ گرما میں جسمِ انسانی کو پانی کی ضرورت زیادہ ہوتی ہے تو غذا میں حرارت دینے والے اجزاء کم کر دینے چاہئیں اور ایسی اشیاء جن میں پانی کا تناسب زیادہ ہو شامل کرنا چاہئے۔ موسمِ سرما میں جسم کو حرارت کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے تو اس کی وجہ سے غذا کے اندر حرارت دینے والے اجزاء گوشت انڈا وغیرہ کا تناسب بڑھا دینا چاہئے۔

محنت مشقت کا کام کرنے والوں کی خوراک میں توانائی فراہم کرنے والی اشیاء جیسے کاربوہائیڈریٹس کی مقدار زیادہ ہونی چاہئے۔ذہنی کام کرنے والوں کی غذا میں دماغ کو طاقت دینے والے اجزاء شامل ہونے چاہئیں۔بچوں کے جسم کی اپنی ضروریات ہوتی ہیں۔اُن کا جسم تیزی سے بڑھ رہا ہوتا ہے لہٰذا اُنہیں ایسی غذا ملنی چاہئے جس میں پروٹین اور نشاستہ کی مقدار زیادہ ہو۔بوڑھے افراد کے نظام بڑھاپے کی وجہ سے سست ہو جاتے ہیں۔اُنہیں مقدار میں کم لیکن طاقتور غذا کی ضرورت ہوتی ہے۔مَردوں کی نسبت عورتوں کو کم خوراک کی ضرورت ہوتی ہے لیکن خصوصی حالات میں بعض حمل کے دوران عورتوں کو خاص خوراک کی ضرورت ہوتی ہے۔

متوازن غذا سے مراد صرف یہی نہیں کہ اس میں تمام غذائی اجزاء موجود ہوں بلکہ متوازن غذا کی حقیقی تعریف یہ ہے کہ ایسی غذا جو بدن کی تمام ضروریات پوری کرے اور اُس میں اجزاء کا تناسب اُس کی جسمانی ضروریات اور موسم وغیرہ کی مناسبت سے ہو۔غذا کی غذائیت کا انحصار اس کے پکانے کے طریقوں پر بھی ہوتا ہے۔اگر سبزیوں کو زیادہ پکایا جائے تو اُن کی غذائیت ختم ہو جاتی ہے۔تلی ہوئی اشیاء زیادہ ثقیل ہو جاتی ہیں اور جلد ہضم نہیں ہوتیں۔قرآن مجید نے حفظانِ صحت کے ان تمام تقاضوں کو جامع طور پر اس آیت میں اکٹھا کر دیا ہے:

وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا إِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ O (الاعراف : ۳۱)

''کھاؤ پیو لیکن اسراف سے کام نہ لو' بے شک وہ مُسرفوں کو پسند نہیں کرتا۔''(۷ : ۳۱)

یعنی کھانے پینے میں حدود سے تجاوز نہ کرو' نہ کیفیت کے لحاظ سے اور نہ کمیّت کے لحاظ سے اور اسی میں متوازن غذا کا پہلو نکلتا ہے۔بھوک ہڑتال اور نفس کش ریاضتوں کی ممانعت بھی اسی میں داخل ہے۔حقیقت تو یہ ہے کہ تمام طب کا خلاصہ آیت کے اسی حصّہ میں آ گیا ہے۔

''تغذیہ غذائیت کے علم اور صحت کے ساتھ اس کے تعلق کا نام ہے۔غذائیں حیوانی بھی ہوتی ہیں اور سبزیاتی بھی۔کیمیائی طور پر اُن میں پروٹین' چکنائیاں' کاربوہائیڈریٹس' وٹامن اور معدنیات شامل ہوتے ہیں۔وہ یا تو جسمانی تعمیر کا کام کرتی ہیں جیسے دودھ' گوشت' مچھلی' مرغی' انڈے اور دالیں وغیرہ' یا وہ قوت بخش ہوتی ہیں جیسے خوردنی اناج' پھل اور دودھ وغیرہ۔''(The Encyclopedia of Religion, Vol. V, p. 365)

<u>بچہ جننے کے دنوں میں تازہ کھجور بہترین غذائی پھل ہے</u> : جنابِ عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کے وقت اللہ ربّ العزت نے آپ کی والدہ محترمہ جنابہ مریم سلام اللہ علیہا کو یہ حکم دیا :

وَهُزِّيْ إِلَيْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ تُسٰقِطْ عَلَيْكِ رُطَبًا جَنِيًّا O فَكُلِيْ وَاشْرَبِيْ وَقَرِّيْ عَيْنًا (مریم:۲۵'۲۶)

''اور اس کھجور کے تنے کو اپنی طرف ہلاؤ' اس سے تم پر تر و تازہ خرمے گریں گے اور کھاؤ پیو اور آنکھیں ٹھنڈی کرو۔''(۱۹ : ۲۵'۲۶)

''یونانی اطباء نے تازہ خرموں کو زچہ خانے کے لئے بہترین غذا تسلیم کیا ہے۔علامہ ابن العربی نے کہا کہ

پہلے اُن کے پاس خود بخود بے موسمی پھل آتے تھے اور اب اُنہیں درخت کے ہلانے کا حکم دیا جا رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلے اُن کا دل اللہ کی یاد میں مستغرق تھا تو اللہ تعالیٰ نے اُن کے اعضاء کو کام کرنے اور تھکنے سے فارغ رکھا اور جب اُن کا دل اپنے بچہ کی حفاظت' اُس کی پرورش اور اُس کی دیکھ بھال کی طرف متوجہ ہو گیا تو اُنہیں بھی عام لوگوں کی طرح کسب اور اسباب کے حصول کی طرف متوجہ کر دیا۔ بہر حال اس آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ معاش کو حاصل کرنے کے لئے کسب کرنا اور اسباب کا حصول ضروری ہے۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ سیّدہ مریم کے ہلائے بغیر وہ کھجوریں گر جاتیں لیکن رب تعالیٰ کی سنت جاریہ یہ ہے کہ بندہ خود اپنے لئے رزق کی تلاش میں جدّ وجُہد کرے۔'' (''تبیان القرآن'---علامہ غلام رسول سعیدی' جلد ۷' صفحہ ۲۶۸)

''کھجور کے متعدد استعمالات ہیں۔ اسے کھانے کے طور پر بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ بائبل کے نظمی حصّہ میں کھجور کی خصوصیات کو تمثیلی انداز میں جا بجا بیان کیا گیا ہے۔'' (The Jewish Encyclopaedia, Vol. IX, p. 505)

<u>بچے کو چھاتی سے دودھ پلانا</u> :اس ضمن میں قرآنی فرمودات واضح ہیں :

(i) وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ أَرَادَ أَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ لَاتُكَلَّفُ نَفْسٌ" اِلَّاوُسْعَهَا لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌ" بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُوْدٌ" لَّهٗ بِوَلَدِهٖ وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ فَاِنْ أَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَاوَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا وَاِنْ أَرَدْتُّمْ أَنْ تَسْتَرْضِعُوْا أَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِذَا سَلَّمْتُمْ مَّآ آتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْا أَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ"O (البقرۃ : ۲۳۳)

''اور مائیں اپنے بچوں کو پورے دو سال دودھ پلائیں' (یہ مدّت) اُس کے لئے ہے جو رضاعت کی تکمیل کرنا چاہے۔ اور جس کا بچہ ہے دستور کے موافق اُس کے ذمّہ اُن (ماؤں) کا کھانا اور کپڑا ہے۔ کسی شخص کو اُس کی طاقت سے زیادہ مکلّف نہیں کیا جائے گا' نہ ماں کو اُس کے بچے کی وجہ سے اور نہ باپ کو اُس کے بچے کی وجہ سے ضرر دیا جائے اور وارث پر بھی اسی طرح لازم ہے۔ اگر ماں اور باپ باہمی مشورے سے دودھ چھڑا دینا چاہیں تو دونوں پر کوئی گناہ نہیں اور اگر تم اپنے بچوں کو کسی اور دایہ کا دودھ پلوانا چاہو تب بھی تم پر کوئی گناہ نہیں بشرطیکہ تم (اُنہیں) دستور کے مطابق اجرت ادا کر دو اور اللہ سے ڈرتے رہو اور یقین رکھو کہ اللہ تمہارے کاموں کو دیکھنے والا ہے۔'' (۲ : ۲۳۳)

رضاعت کا اصل حق ماں کا ہے اس لئے کہ ماں سے بہتر کوئی مُرضعہ (دودھ پلانے والی) نہیں ہو سکتی۔ پرانے طبیبوں اور نئے ڈاکٹروں اور ڈاکٹرنیوں سب کو اس پر اتفاق کرنا پڑا ہے۔ طلاق کی صورت میں بعض اوقات بچے کے باپ سے انتقام لینے کے لئے اُنہیں مائیں دودھ نہیں پلاتیں' اس لئے ماؤں کو یہ نصیحت کی گئی کہ وہ اپنے بچوں کو دودھ پلائیں خواہ اُن کا نکاح باقی ہو یا طلاق ہو چکی ہو اور یہ کہ باہمی رضامندی سے وہ اُنہیں پورے دو سال تک دودھ پلائیں اور جو پورے نصاب کی تکمیل نہ کرنا چاہے تو اُس کے لئے کم مدت کی بھی اجازت ہے۔ بچوں کے باپ پر یہ لازم کیا کہ وہ اپنی طاقت اور وسعت کے مطابق دودھ پلانے والیوں کو کھانے اور کپڑوں کا خرچ مہیا کریں اور

یہ کہ بچوں کی وجہ سے ماں باپ میں سے کوئی فریق دوسرے پر زیادتی نہ کرے مثلاً ماں بچوں کو پالنے اور پرورش کرنے کی وجہ سے باپ کو ضرر پہنچائے اور کھانے اور لباس کا دستور سے زیادہ خرچ طلب کرے' یا ماں بچوں کو دودھ پلانا چاہتی ہے اور باپ زبردستی بچوں کو ماں سے چھین لے یا اُسے دودھ پلانے پر مجبور کرے یا اُس کے خرچ میں قدرِ معروف سے کمی کرے۔ اس تفسیر کی بناء پر اس آیت میں وہ مطلقہ عورتیں مراد ہیں جن کی اُن کے خاوندوں سے اولاد ہو اور اجنبی دائیوں کی بہ نسبت دودھ پلانے کی وہ زیادہ حقدار ہیں۔

اس آیت سے یہ نکات بھی معلوم ہوئے (۱) دودھ پلانے کی مکمل مدت دو سال ہے کیونکہ اس مدت میں بچہ کو اپنی نشو ونما کے لئے دودھ کی حاجت ہوتی ہے۔ (۲) دودھ پلانے کی کم از کم مدت کی کوئی حد نہیں ہے اور ماں باپ باہمی مشورہ سے جتنے عرصہ تک چاہیں دودھ پلائیں اور اُس کے بعد دودھ چھڑا دیں۔ (۳) دودھ پلانے والی کے کھانے اور کپڑے کا خرچ باپ کے ذمہ ہے اور دایہ کی اجرت بھی باپ کے ذمہ ہے۔ اگر باپ فوت ہو گیا ہو تو اُس کے ترکہ میں سے خرچ کرنا واجب ہے اور اگر اُس کا مال نہ ہو تو پھر ماں پر واجب ہے۔ قرآن مجید نے باپ کے بعد وارث پر بچہ کے خرچ کو واجب کیا ہے۔ (۴) بعض دفعہ ماں سے چھڑا کر کسی اور سے رضاعت کرانے کی ضرورت یا مصلحت بھی پیش آجاتی ہے تو ایسی صورت میں کسی دایہ سے رضاعت کرانے میں کوئی مضائقہ نہیں اور یہ بالکل جائز ہے بشرطیکہ اجرت حسب قرارداد ادا کر دی جائے۔ اجرت نہ دینے کی صورت میں گناہ ہوگا۔ معاملات چھوٹے ہوں یا بڑے' قرآن مجید نے سارے دائرہ زندگی میں قدم قدم پر تقوائے الٰہی کو شمع راہ رکھا ہے۔ انسان کو بدمعاملگی' بددیانتی پر لانے والی چیز صرف یہی غفلت ہے۔ اللہ تعالیٰ کے حاضر و ناضر ہونے کا' اُس کی ہمہ بینی' ہمہ خبری کا استحضار اگر ہر وقت رہے تو کوئی لغزش ہونے ہی نہ پائے۔ قرآن مجید بار بار اسی جذبہ کو بیدار کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ مسلمان اپنی خانگی زندگی کی کسی منزل میں بھی اس طرف سے غافل نہ ہونے پائے۔

(ii) وَحَمْلُهٗ وَفِصَالُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا (الاحقاف : ۱۵)

''اور حمل اور دودھ چھڑانے کی مدت تیس ماہ میں ہو پاتی ہے۔'' (۱۵ : ۴۶)

(علی العموم اور اکثر) کم سے کم مُدّتِ حمل چھ ماہ ہے اور مدتِ رضاعت زیادہ سے زیادہ دو سال ہے۔ یہ ملا کر کل تیس ماہ ہوئے۔ چونکہ دو سال کے بعد بچے کو یکا یک دودھ سے غذا کی طرف لانا مشکل ہے اس لئے بعد کے چھ ماہ میں دودھ کے ساتھ اُسے بتدریج دوسری غذا کا عادی بنایا گیا اور تیس ماہ کے بعد کلی طور پر اُس کا دودھ چھڑا دیا جائے گا۔

شیرِ مادر کی اہمیت

(۱) ایک معیاری غذا: ماں کے دودھ میں فاسفورس' پروٹین' چکنائیوں' شوگر اور حیاتین (وٹامنز) جیسے تغذیہ کے ضروری اجزاء بہت ہی موزوں توازن اور عمدہ تناسب کے ساتھ شامل ہوتے ہیں۔ لہٰذا تمام حالات میں شیر خوار کے لئے ماں کا دودھ مثالی اور معیاری ہوتا ہے۔

(۲) شیرِ مادر غذائی ضروریات کی مکمل طور پر تکمیل کرتا ہے: شروع کے چھ ماہ میں شیرِ مادر میں حیاتین (وٹامنز) کے تمام اجزاء موجود ہوتے ہیں۔ پیدائش کے پانچ ماہ بعد تک بچے کو کسی اور غذا کی ضرورت نہیں ہوتی۔

(۳) شیرِ مادر تمام بیماریوں کے خلاف تحفظاتی حصار ہے: شیر مادر خردحیویہ عناصر (Anti-microbial Factors) کے خلاف حصار کا کام دیتا ہے اور کسی بیماری کو قریب نہیں پھٹکنے دیتا۔

(۴) شیرِ مادر ماں اور بچے کے درمیان احساسِ تحفظ کو بڑھاتا ہے اور اُن کے باہمی رشتے کو مضبوط کرتا ہے۔

بچپن کے ذہنی انتشار، پراگندگی اور بے نظمی پر کی گئی تحقیق سے ظاہر ہوتا ہے کہ بچے کی ذہنی صحت کو توانا رکھنے کے لئے اُسے دو سال تک ماں کا دودھ پینا چاہئے۔ عالمی سطح پر کئے گئے مطالعہ نے یہ ظاہر کیا کہ انڈونیشیا اور فلپائن میں کسی بچے کو کوئی ذہنی مسئلہ درپیش نہیں ہے اور تحقیقاتی کمیٹی نے یہ معلوم کیا کہ یہ حیران کن حقیقت بچے کو اس احساسِ تحفظ، ملاطفت و ملائمت اور اُنس و محبت دینے میں ہے جو اِن ملکوں میں بچے کو دو سالہ مدتِ رضاعت میں ملتی ہے۔

(۵) شیرِ مادر زود ہضم ہوتا ہے: بچے کو چھاتی سے ملنے والا ماں کا دودھ بہ آسانی ہضم ہو جاتا ہے اور اُسے عام عرصۂ پیدائش کے بچوں اور قبل از وقت پیدا ہونے والے بچوں کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ دودھ مکمل طور پر 45 منٹ میں ہضم ہو جاتا ہے۔ 45 منٹ گزرنے کے بعد ماں کے پستانوں میں دودھ کے رِسنے کا عمل بعید رسائی کے عکس (Telepathic Reflex) کے ذریعے بڑھنا شروع ہوتا ہے اور بچہ عام طور پر بھوک کی وجہ سے رونا شروع کر دیتا ہے۔ یہ تمام وقوعات ایک حیاتیاتی کمپیوٹر کے نظام کی تشکیل کرتے ہیں۔

(۶) رضاعت ماں کے رِحم (بچہ دانی) کے سکڑنے میں مدد دیتا ہے اور شیر خوار بچے کے مسوڑھوں اور دانتوں کے بڑھنے میں بھی مددگار ثابت ہوتا ہے۔

(۷) شیرِ مادر بچے کا وزن مناسب وزن سے زیادہ نہیں بڑھنے دیتا۔

(۸) شیرِ مادر سوئے تغذیہ (Malnutrition) یعنی ناقص یا ناکافی غذا سے پیدا ہونے والی خرابی نہیں ہونے دیتا اور شیر خوارگی کی اموات کو کم کرتا ہے۔

(۹) رضاعت بچوں کی ناپیداواری (Infertility) کے عرصے کو طول دیتی ہے۔

(۱۰) ماں کا دودھ محفوظ، صاف، حفظانِ صحت کے اصولوں کے مطابق، بے قیمت اور سستا اور شیر خوار بچے کے لئے صحیح درجہ حرارت پر دستیاب ہوتا ہے۔

دوسال کی مدتِ رضاعت میں قرآنی حکمت و منطق : رضاعت کی بنیادی منطق دو باتوں پر منحصر ہے۔ (۱) خون کے پیدا ہونے کی وجہ سے جگر پر خاصا بوجھ پڑ جاتا ہے اور اس لئے دودھ کی ضرورت ہوتی ہے۔ جہاں تک خون کی پیداوار کا تعلق ہے تو جگر کو اپنی اصل حالت پر آنے کے لئے پورے دو سال لگتے ہیں اور اسی لئے مدتِ رضاعت دو سال کی ہونی چاہئے۔ (۲) بنیادی حیاتیاتی مواد کا عرصہ بھی دو سال کا ہے۔ علم طب اس بات کو یقیناً تسلیم کرتا ہے کہ بچے کی نشوونما کے پہلے دو سال انتہائی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ اسی حقیقت کو جو معجزہ سے کم نہیں' سورۃ البقرۃ کی محولہ بالا آیت ۲۳۳ میں بیان کیا گیا ہے۔ لہٰذا مدتِ رضاعت دو سال ہی ہونی چاہئے۔

ماں کے لئے دودھ پلانے کے فوائد : بچے اور ماں دونوں کی صحت کے لئے بھی ماں کا اپنے بچے کو دودھ پلانا انتہائی ضروری ہے۔ بدقسمتی سے کچھ مادیت گزیدہ معالجین اور بچے کی خوراک بنانے والے اداروں کی ملی بھگت کے پراپیگنڈہ نے کچھ عرصہ سے شیرِ مادر کے خلاف نفرت پیدا کر دی ہے اور ماں کے دودھ کو نشانہِ تضحیک بنا دیا ہے۔ تاہم حالیہ سالوں میں علمِ طب شیرِ مادر کی اہمیت کو تسلیم کرنے پر مجبور ہو گیا ہے اور عالمی ادارہ صحت نے اس کے خلاف تمام تمسخر آمیز پراپیگنڈے پر قدغن لگا دی ہے۔ ماں کے لئے (چھاتی سے) دودھ پلانے کے کچھ نمایاں فائدے یہ ہیں:

(۱) **پستانی غدودوں کا صحتمندانہ فعل** : تمام عالم سے اکٹھی کی ہوئی صحتی شماریات سے ظاہر ہوا ہے کہ جو عورتیں ایک یا دو سال تک بچوں کو دودھ چسواتی ہیں' اُن میں بہت ہی کم عورتوں میں چھاتی کا سرطان واقع ہوتا ہے۔ جبکہ اُن ماؤں کو جو چھاتی کا دودھ نہیں پلاتیں' اس مرض کا بہت زیادہ خطرہ ہوتا ہے۔

(۲) چھاتی سے دودھ پلانے والی ماں کا جگر پوری مستعدی سے کام کرتا ہے۔ یہ معلوم ہوا ہے کہ ایسی مائیں جسمانی طور پر تھک جانے کے باوجود بدمزاج نہیں ہوتیں جس کی وجہ دودھ پلانے کے دوران غدودوں کے رسنے کا خوش آہنگ عمل ہے۔ اس خوش آہنگ توازن کی وجہ سے ایسی ماں کی بچہ دانی اور اعضائے تولید کو بھی کچھ وقت کے لئے آرام مل جاتا ہے۔ اگرچہ یہ عرصہ مدتِ رضاعت کے عرصہ کے برابر کا نہیں لیکن ماں کے جنسی اعضاء کے حوالے سے دو تا چھ ماہ کا یہ آرام بہت قابلِ قدر ہے۔ اس اثناء میں بچہ دانی (رحم) اور اعضائے تولید میں واقع شدہ معمولی بے نظمی کا بھی علاج ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اِن فوائد کے باعث دو سال کا یہ عرصہِ رضاعت عورت کے لئے مثالی اور معیاری وقفہ ہے۔

مُرضعہ (دودھ پلانے والی ماں) صحتمند ہوتی ہے اور شیر خوار بچے کو زندگی بھر کی صحت مل جاتی ہے۔ قرآن مجید کے عطا کردہ یہ فوائد معجزاتی فوائد ہیں۔

یہاں یہ کہہ دینا کافی ہے کہ شیرِ مادر بچے اور ماں کے لئے' خاندان اور سماج کے لئے کتنی ہی اہمیت کا حامل ہے جس کے پیشِ نظر شیرخوار بچوں کو مصنوعی دودھ کی عادت چھڑا دینی چاہئے اور اُن کی غذا کا قدرتی طریقہ اختیار کرنا چاہئے یعنی ہر ماں اپنے بچے کو خود اپنا دودھ پلائے۔ عام رائج شدہ مصنوعی طریقہ ہر سال ہزاروں ماؤں کی صحت اور ہزاروں بچوں کی زندگیوں پر سخت گراں پڑتا ہے۔" ("Sexual Life of Woman"...Kisch, p. 195)

چند متعلقہ اصطلاحات قرآنِ حکیم کی روشنی میں

(ا) عام موسمی حالات (Climate): اس کے اجزائے ترکیبی تازہ ہوا' ہوا کا چلنا' بارش' متلازم نمی' سورج کی روشنی' ابرآلود دُھند اور درجہ حرارت کا ادل بدل ہوتا ہیں۔ قرآن مجید میں اس کی مثال سورۃ التّین کی یہ آیات ہیں :

وَالتِّینِ وَالزَّیْتُونِ O وَطُورِ سِینِینَ O وَهٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِینِ O لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ أَحْسَنِ تَقْوِیمٍ O (اَلتِّین : ۱ تا ۴)

''قسم ہے انجیر اور زیتون کی اور طورِ سیناء کی اور اس امن والے شہر (مکّہ) کی کہ ہم نے انسان کو (بہ اعتبارِ شکل وعقل) بہترین اعتدال پر پیدا کیا ہے۔'' (۱ تا ۴ : ۹۵)

''انسان جسے بہترین اعتدال پر پیدا کیا گیا' انجیر اور زیتون کے مابین کوئی مشابہت ہونی چاہیے۔ انجیر کے بیجوں اور زیتون کے تولیدی خلیہ (بیضہ) کے حوالہ سے کرم منی (Spermatozoa) کو یہاں نظر انداز کرنا ناممکن ہے۔ جو چیز زیادہ حیران کن ہے وہ یہ کہ انجیر کے بیجوں کے حجم کا زیتون کے ساتھ تناسب بالکل ویسا ہی ہے جیسا کہ مادہ منویہ کے خلیے کا تولیدی خلیہ کے ساتھ تناسب ہے۔''

''اب میں یہاں اُن دو نمایاں پیغامات کی طرف آتا ہوں جو اِس سورۃ میں اشرف المخلوقات یعنی انسان سے متعلق ہیں۔ پہلا پیغام موسمی حالات اور صحتی ضروریات سے متعلق ہے جو انسان کو پروان چڑھاتے ہیں۔ جیسا کہ بہت سے شارحین نے لکھا ہے کہ پہلی تین آیات میں انجیر' زیتون اور طُورِ سِینِین کا تصوّر اچھے موسمی حالات کی نمائندگی کرتا ہے۔ طُورِ سِینِین جس کا ترجمہ اکثر کوہِ سینا میں کیا جاتا ہے' جزیرہ نمائے سینا کا وہ پہاڑ ہے جہاں موسیٰ علیہ السلام کو قانونِ شریعت ملا تھا اور جہاں سبزے کی بہت زیادہ پیداوار ہوتی ہے۔ پس اگر کسی علاقے کے موسمی حالات انجیروں اور زیتون کی پیداوار اور کوہ سیناء کے موسمی حالات کے موافق ہوں تو وہ علاقہ انسانی صحت کے حوالے سے بہترین موسمی حالات کی نمائندگی کرے گا۔''

''یہ ابتدائی آیات اشرف المخلوقات یعنی انسان کو صحت کا نسخہ عطا کرتی ہیں۔ آج انسانی صحت سے متعلق تین اہم اور ناگزیر تقاضے معلوم ہوئے ہیں جن میں سے پہلا صاف ہوا کی ضرورت ہے۔ طُور سینین میں کوہِ سبز کا تصوّر غیر آلودہ' پاک وصاف ہوا کی ایک معیاری اور مجزاتی تعریف ہے۔ اس کے پہلو بہ پہلو غیر آلودہ' پاک وصاف ہوا کی تقطیر (نتھار) اور پتوں کے گچھوں کے ذریعے تازہ آکسیجن کی فراہمی زندگی کے روحانی پہلو کی نمائندگی کرتے ہیں۔''

''زیتون کی قسم اٹھانے میں بھی سائنسی پیغام ہے اور اس میں انسان کے خوش آئند قد وقامت کا راز پنہاں ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ زیتون انسان کی خوراک کے ساتھ مخصوص ہے۔ اپنے اثرات کے لحاظ سے خلیے کی جھلی کی بناوٹ سے لے کر دماغ کے عصبی خلیوں اور جنسی خلیوں تک یہ ایک بے مثال حیاتیاتی خزانہ ہے۔ علاوہ ازیں وٹامن

E جو عضلۂ قلب کے ریشۂ لحمی (Myocordial Tissue) کی مختلف سرگرمیوں اور جنسی خلیوں کی بناوٹ میں اہم کردار ادا کرتا ہے' کی نمائندگی حیاتیاتی ساخت میں زیتون میں ہوتی ہے۔ زیتون کی یہ غیر معمولی ساخت ایک بار پھر اُس حیاتیاتی برتری پر زور دیتی ہے جو اللہ نے اَحسنِ تقویم کے راز میں انسان کو عطا کی ہے۔ زیتون جانور کا چارہ نہیں بلکہ وہ زندگی کا ارفع واعلیٰ نسخہ ہے جسے ناقابلِ فہم کیمیائی عوامل سے گزار کر تیار کیا گیا ہے۔''

''جہاں تک انجیر کا تعلق ہے تو نباتاتی رَس سے اپنی پیدائش کے لحاظ سے دوسرے پھلوں پر اُسے خاص مقام حاصل ہے۔ یہ رَس نامیاتی کیمیا (Biochemical) کا خزانہ ہے جس میں پروٹین' فاسفورس اور شکر (Ribose) کا اجتماع ہوتا ہے۔''

''انجیر کی تخصیص انسانی ساخت کے حیاتیاتی لوازم کو ظاہر کرنے کے ساتھ ساتھ اس حقیقت کو بھی ظاہر کرتی ہے کہ انجیر کے ساتھ غذائی مرکب کا ہونا خوراک کا ابتدائی ذریعہ ہے۔ پاک وصاف ہوا سے لے کر انجیر وزیتون کی خصوصیات تک زندگی کا یہ سہ جہتی راز اللہ تعالیٰ نے انسان کو بطورِ نعمت عطا کیا ہے جس کی تخلیق احسنِ تقویم پر ہوئی ہے اور جو اللہ کے نام کو بار بار دہراتا ہے۔'' ("The Holy Koran and the Facts of Science".. Dr. Haluk Nurbaki, pp. 359-361)

(۱۱) عائلی صحت : عائلی صحت کا راز اس بات میں ہے کہ آدمی اپنے اہلِ خانہ کے ساتھ پیار ومحبت اور باہمی مساوات کی بنیاد پر رہے اور اُن کی کوتاہیوں کو نظر انداز کرتا رہے۔ جیسا کہ سورۃ النساء کی آیت ۱۹ میں حکم ہوا کہ عَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ (اپنی بیویوں سے اچھی بود وباش رکھو)۔ نیز فرمایا :

وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ O (اَلرُّوم : ۲۱)

''اور اُس کی نشانیوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اُس نے تمہارے لئے تمہاری ہی جنس کی بیویاں بنائیں تا کہ تم اُن سے سکون حاصل کرو اور اُس نے تمہارے (یعنی میاں بیوی کے) درمیان محبت وہمدردی پیدا کردی۔ بے شک اس میں اُن لوگوں کے لئے نشانیاں ہیں جو غور وفکر سے کام لیتے ہیں۔'' (۲۱ : ۳۰)

یہ آیت اسلام کے مجلسی وخانگی نظامِ زندگی کے لئے سنگِ بنیاد ہے جس میں تین باتیں بطور اصل کے بیان ہوئیں: (۱) مردوں کو بتایا گیا ہے کہ تمہاری بیویاں تمہاری ہی ہم جنس مخلوق ہیں' ترکیبِ حیات میں تمہاری ہی مثل' تمہاری ہی جیسی خواہشیں' جذبات واحساسات رکھنے والی مخلوق ہے جو بے روح نہیں۔ (۲) اُن کی غایتِ آفرینش یہی ہے کہ وہ تمہارے لئے سرمایہ راحت وتسکین اور باعثِ سکونِ خاطر ہوں۔ تمہارا دل اُن سے لگے اور جی اُن سے بہلے۔ (۳) تمہارے اُن کے تعلقات کی بنیاد ہی باہمی محبت' اخلاص وہمدردی پر ہونی چاہئے۔

یہ بات ذہن نشین رہے کہ اسلام میں عورت مرد کی کنیز نہیں جیسا کہ بعض دوسرے مذاہب میں ہے۔

(III) <u>عمر رسیدہ لوگوں کی صحت کی نگہداشت</u> : ہر مہذّب معاشرہ میں عمر رسیدہ لوگوں کو نمایاں مقام حاصل ہوتا ہے'' بالخصوص مغرب میں جہاں اکثر و بیشتر حالات میں بڑے بوڑھے اپنے گھروں کی بجائے پیرانہ سالی کے گھروں میں علاج معالجہ کے لئے بھیجے جاتے ہیں۔ اُن میں سے کئی اِنہی نگہداشتی گھروں میں مرجاتے ہیں۔''

''کسی بھی مہذّب معاشرہ میں ایسی صورتِ حال بوڑھوں کے لئے نا قابلِ برداشت ہوتی ہے۔ اسلام ہمیں بوڑھوں کی تعظیم کرنا سکھاتا ہے خواہ وہ والدین ہوں' رشتہ دار ہوں یا ہمارے لئے اجنبی ہوں۔ مندرجہ ذیل قرآنی آیت میں ہمیں یہ بتایا گیا ہے کہ عمر رسیدہ لوگ مذکورہ خاصیت کے ساتھ اپنے اختتام کو پہنچتے ہیں:

وَمَنْ نُّعَمِّرْهُ نُنَكِّسْهُ فِي الْخَلْقِ أَفَلَا يَعْقِلُونَ O (یٰسٓ : ۶۸)

''اور ہم جس کی عمر (بہت) زیادہ کر دیتے ہیں تو اُسے (اُس کی) خلقت میں اُلٹا کر دیتے ہیں تو کیا وہ لوگ (اتنا) نہیں سمجھتے؟ (۶۸ : ۳۶)

خَـلْـق سے مراد انسان کے جسمانی قوٰی اور رنگ وروغن اور حسن و جمال وغیرہ ہیں۔ اور قوٰی کے الٹا دینے سے مراد ہے اُن کا انقلابِ کامل سے ناقص اور اعلیٰ و اشرف سے اَرذل اور اَسفل کی طرف۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بہت سے بوڑھے افراد اپنی جسمانی گرم خیزی کھو بیٹھتے ہیں اور اکثر بوڑھے ترقی یافتہ جذباتی احساسات کا شکار ہو جاتے ہیں' اُن میں اکثر اپنی حیاتیاتی توانائی کھو بیٹھتے ہیں اور اُن میں سے کچھ اپنی دماغی صلاحیت سے محروم ہو جاتے ہیں۔

جہاں تک جسمانی گرم خیزی کا تعلق ہے' ایک عمر رسیدہ شخص اُتنا کام نہیں کر سکتا جتنا ایک نوجوان کرتا ہے۔ قرآنِ حکیم ہمیں پیغمبر زکریا علیہ السلام کے متعلق بتاتا ہے جنہوں نے اپنی عمر رسیدگی کی وجہ سے جسمانی قوّت میں کمی کو تسلیم کیا تھا:

قَالَ رَبِّ اِنِّیْ وَهَنَ الْعَظْمُ مِنِّیْ وَاشْتَعَلَ الرَّأْسُ شَيْبًا وَّلَمْ اَكُنْ بِدُعَآئِكَ رَبِّ شَقِيًّا O (مریم : ۴)

''زکریا علیہ السلام نے دعا کی: اے میرے پالنہار! میری ہڈیاں کمزور ہو گئی ہیں اور سر میں بالوں کی سفیدی پھیل رہی ہے اور اے میرے پالنہار! تجھے پکار کر میں (کبھی) نامراد نہیں رہا ہوں۔'' (۴ : ۱۹)

ہمیں پیغمبر شعیب علیہ السلام کے بارے میں بھی بتایا گیا ہے جو عمر رسیدگی کی وجہ سے محنت مشقت کا کام نہیں کر سکتے تھے اور اُن کی صاحبزادیاں جانوروں کو چَراتی تھیں اور اُنہیں پانی پلانے کے لئے چشمے تک لے جاتی تھیں جیسا کہ سورۃ القصص کی آیت ۲۳ میں بیان ہوا۔

جہاں تک جذباتی احساسات کا تعلق ہے' قرآنِ حکیم ہمیں پیغمبر یعقوب علیہ السلام کے اپنے دو گم شدہ لڑکوں یعنی یوسف اور بنیامین سے متعلق جذباتی احساسات کو بتاتا ہے۔ یعقوب علیہ السلام کی محبت' آپ کے جذبات اور بیٹوں کے لئے آپ کی ہمدردی اس قدر بلند و ارفع تھے کہ آپ اس قدر فراوانی سے روتے رہے کہ اُن کی بینائی جاتی رہی۔ اس قصّے کے نقطۂ عروج کا خلاصہ قرآن میں اس طرح کھینچا گیا ہے:۔

قَالَ يَا أَسَفٰى عَلٰى يُوسُفَ وَابْيَضَّتْ عَيْنَاهُ مِنَ الْحُزْنِ فَهُوَ كَظِيمٌ ○ (یوسف : ۸۴)
''(یعقوب علیہ السلام نے) کہا: ہائے افسوس یوسف کی جدائی پر اور اُن کی دونوں آنکھیں غم کے باعث سفید ہو گئیں اس حال میں کہ وہ اپنے غم کو ضبط کئے ہوئے تھے۔'' (۸۴ : ۱۲)

بہ ظاہر جناب یعقوب علیہ السلام جیسے جلیل المرتبت پیغمبر کا اپنے فرزند کی محبت میں اتنا وارفتہ ہو جانا اور اس کے ہجر و فراق میں رو رو کر آنکھیں سفید کر دینا آپ کے شایانِ شان معلوم نہیں ہوتا۔ علامہ آلوسی فرماتے ہیں کہ اہلِ معرفت نے اس خلش کو یہ کہہ کر دُور کیا ہے کہ حُسنِ یوسف کو آپ کے لئے جمالِ الٰہی کا آئینہ بنا دیا گیا تھا اور آپ اس طلعتِ زیبا کے آئینہ میں تجلیاتِ الٰہی کا مشاہدہ فرمایا کرتے تھے۔ جب حضرت یوسف آپ کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئے تو انوارِ خداوندی کی لذّتِ دید سے محروم ہو جانے کے باعث آپ بے چین اور بے قرار رہنے لگے۔

اپنے مسلسل اور غیر منقطع غم و اندوہ کے سلسلہ میں یعقوب علیہ السلام نے اتنا فرمایا :
إِنَّمَا أَشْكُوا بَثِّي وَحُزْنِي إِلَى اللَّهِ وَأَعْلَمُ مِنَ اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ○ (یوسف : ۸۶)
''میں تو اپنی مصیبت اور اپنے دکھوں کا شکوہ اللہ کی بارگاہ میں کر رہا ہوں اور میں اللہ کی طرف سے وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔'' (۸۶ : ۱۲)

دماغی صلاحیتوں کے فقدان کے متعلق قرآنِ حکیم ہمیں بتاتا ہے کہ عمر رسیدہ شخص اپنی بہت سی دماغی صلاحیتوں سے محروم ہو جاتا ہے :
وَاللَّهُ خَلَقَكُمْ ثُمَّ يَتَوَفَّاكُمْ وَمِنكُم مَّن يُرَدُّ إِلَى أَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْ لَا يَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمٍ شَيْئًا إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ قَدِيرٌ ○ (النحل : ۷۰)
''اور اللہ نے تمہیں پیدا کیا' پھر وہ تمہیں موت دے گا اور تم میں سے کوئی ایسا بھی ہے جسے ناکارہ عمر کی طرف لوٹا دیا جاتا ہے کہ وہ جان لینے کے بعد کچھ بھی تو نہیں جانتا۔ بے شک اللہ تعالیٰ سب کچھ جاننے والا' ہر چیز پر قادر ہے۔'' (۷۰ : ۱۶)

حضرتِ انسان کو خطاب ہو رہا ہے کہ اگر تجھے مظاہرِ فطرت میں غور کرنے کی فرصت نہیں تو کم از کم اپنے آئینہ میں اُس کی قدرت کی کرشمہ سازیوں کا مشاہدہ کر۔ پیدائش کے وقت تیرا کیا حال تھا' تیری جسمانی اور دماغی قوّتوں میں کس طرح آہستہ آہستہ ترقی ہوتی گئی یہاں تک کہ تو نے شباب کی منزل میں قدم رکھا۔ پھر آہستہ آہستہ تیری قوّتوں میں زوال شروع ہوا یہاں تک کہ تو پیرِ فرتوت بن گیا' خوش مزاجی کی جگہ متانت اور سنجیدگی نے جگہ لے لی' عقل و خرد نے ساتھ چھوڑ دیا' قوّت و طاقت کی جولانیاں قصّہ پارینہ بن کے رہ گئیں' آنکھوں کے چراغ دُھندلا گئے' کانوں کی سماعت میں فرق آ گیا' ایک ایک کر کے سارے دوست اور سفرِ زیست کے ساتھی رخصت ہو گئے۔ چلنے پھرنے کی طاقت بھی جاتی رہی اور کروٹ بدلنے کے لئے بھی کسی سہارے کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ جس ذات نے تمہیں بچپن کی ناتوانی سے جوانی کی شیر افگن قوّتوں تک پہنچایا اور وہاں سے اتار کر بڑھاپے کے بستر پر لٹا دیا' کیا وہ ہر چیز پر قادر نہیں؟

اِن آیات کی رُو سے اسلامی معاشرے میں عمر رسیدہ افراد خصوصی مقام کے حامل ہیں اور اس کی بنیاد اسلام کی عطا کردہ وہ آفاقی تعلیمات ہیں جن میں عمر رسیدہ افراد کو باعثِ برکت و رحمت اور قابلِ عزت و تکریم قرار دیا گیا ہے۔ تاجدارِ انبیاء ﷺ نے بزرگوں کی عزت و تکریم کی تلقین فرمائی اور بزرگوں کا یہ حق قرار دیا کہ کم عمر اپنے سے بڑی عمر کے لوگوں کا احترام کریں اور اُن کے مرتبے کا خیال رکھیں۔ چنانچہ ارشادِ نبوی ہے:

لَيْسَ مِنَّا مَنْ لَّمْ يَرْحَمْ صَغِيْرَنَا وَلَمْ يُوَقِّرْ كَبِيْرَنَا (سنن الترمذی: کتاب البرّ و الصّلة؛ باب ما جاء فی رحمة الصبیان ۴:۳۲۲، رقم: ۱۹۲۰)

اسلامی معاشرے میں عمر رسیدہ افراد کو درجِ ذیل حقوق حاصل ہوتے ہیں:

(۱) عمر رسیدہ افراد کی تعظیم و تکریم اِجلالِ الٰہی کا حصّہ ہے: حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

إِنَّ مِنْ إِجْلَالِ اللهِ إِكْرَامُ ذِي الشَّيْبَةِ الْمُسْلِمِ وَحَامِلِ الْقُرْآنِ غَيْرَ الْغَالِيْ فِيْهِ وَالْجَافِيْ عَنْهُ وَ إِكْرَامُ ذِي السُّلْطَانِ الْمُقْسِطِ (سنن ابی داؤد: کتاب الادب: باب فی تنزیل الناس؛ المسند لبزار ۸:۷۴، رقم: ۳۰۷۰؛ المصنف لابن ابی شیبة ۶:۴۲۱، رقم: ۳۲۵۶۱؛ السنن الکبریٰ لبیہقی ۸: ۱۶۳؛ المعجم الاوسط لطبرانی ۷:۲۱، ۲۲، رقم: ۶۷۳۶)

"بوڑھے مسلمان کی تعظیم کرنا اللہ تعالیٰ کی تعظیم کا حصّہ ہے، اسی طرح قرآن مجید کے عالم کی جو اس میں تجاوز نہ کرتا ہو اور اُس بادشاہ کی تعظیم جو انصاف کرتا ہو۔"

(۲) عمر رسیدہ افراد کی تعظیم و تکریم عظمتِ رسالت کا نفاذ ہے: حضرت اَنس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ امام الانبیاء ﷺ نے فرمایا:

إِنَّ مِنْ إِجْلَالِيْ تَوْقِيْرُ الْمَشَائِخِ مِنْ أُمَّتِيْ (لسان المیزان لعسقلانی ۶: ۳۰۳؛ کنز العمال لھندی ۳:۱۷۲، رقم: ۶۰۱۳)

"میری اُمت کے معمر افراد کی عزت و تکریم کرنا بالیقین میری تعظیم و توقیر کرنا ہے۔"

(۳) عمر رسیدہ افراد کی تکریم علامتِ ایمان ہے: عمر رسیدہ افراد کی بزرگی کے باعث اُنہیں خاص مقام و مرتبہ عطا کیا گیا۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

لَيْسَ مِنَّا مَنْ لَّمْ يَرْحَمْ صَغِيْرَنَا وَلَمْ يَعْرِفْ شَرَفَ كَبِيْرَنَا (سنن الترمذی: کتاب البرّ والصّلة باب ما جاء فی رحمة الصبیان ۴:۳۲۲، رقم: ۱۹۲۰)؛ الترغیب و الترھیب لمنذری ۱:۶۴، ۶۵، رقم: ۱۷۱)

"وہ ہم میں سے نہیں جو ہمارے چھوٹوں پر رحم نہ کرے اور ہمارے بڑوں کی عزت نہ پہچانے۔"

(۴) عمر رسیدہ افراد کی تکریم ہی صحت مند روایت کی اساس ہے: حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ امام الانبیاء ﷺ نے فرمایا:

مَا أُكْرَمَ شَاب" شَيْخًا لِسِنِّهٖ إِلَّا قَيَّضَ اللّٰهُ لَه' مَنْ يُّكْرِمُه' عِنْدَ سِنِّهٖ (الجامع الصحيح لترمذی : كتاب البر و الصلة' باب ما جاء فی اجلال الكبير ۳۷۲:۴' رقم : ۲۰۲۲؛ شعب الايمان لبيهقی ۴۶۱:۷' رقم:۱۰۹۹۳ : المعجم الاوسط لطبرانی ۹۴:۶' رقم : ۵۹۰۳ : كنز العمال لهندی ۱۷۲:۳' رقم : ۶۰۱۴ ؛ الفردوس بماثور الخطاب لديلمی ۴ : ۶۱' رقم : ۶۱۹۱)

''جو جوان کسی بوڑھے کی عمر رسیدگی کے باعث اُس کی عزت کرتا ہے' اللہ تعالیٰ اُس جوان کے لئے کسی کو مقرر فرما دیتا ہے جو اُس کے بڑھاپے میں اُس کی عزت کرے۔''

(۵) معمر افراد کا وجود باعثِ برکت ہے : حضرت ابو اُمامہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

اَلْبَرَكَةُ فِيْ أَكَابِرِنَا فَمَنْ لَّمْ يَرْحَمْ صَغِيْرَنَا وَ يجلَّ كَبِيْرَنَا فَلَيْسَ مِنَّا (المعجم الكبير لطبرانی ۲۲۸:۸' رقم : ۷۸۹۵ : كنز العمال لهندی ۳ : ۱۶۵' رقم: ۵۹۸۲ ؛ كشف الخفاء و مزيل الالباس لعجلونی ۳۳۷:۱' رقم :

''ہمارے بڑوں کی وجہ ہی سے ہم میں خیر و برکت ہے۔ پس وہ ہم میں سے نہیں جو ہمارے چھوٹوں پر رحم نہیں کرتا اور ہمارے بڑوں کی شان میں گستاخی کرتا ہے۔''

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسالتمآب ﷺ نے فرمایا :

مَهْلاً عَنِ اللّٰهِ مَهْلاً فَإِنَّه' لَوْلَا شُيُوْخ" رُكَّع" وَشباب" خُشَّع" وَأَطْفَال" رُضَّع" وَبَهَائِمُ رُتَّع" لَصُبَّ عَلَيْكُمُ الْعَذَابُ صَبًّا (المسند ابی يعلی ۲۸۷:۱۱' رقم: ۶۴۰۲' ۶۶۳۳ ؛ السنن الكبریٰ لبيهقی ۳ : ۳۴۵ ؛ المعجم الاوسط لطبرانی ۱۳۴:۷' رقم:۷۰۸۵ ؛ تاريخ بغداد لخطيب بغدادی ۶ : ۶۴ ؛ مجمع الزوائد : لهيثمی ۲۲۷:۱۰ ؛ كنز العمال لهندی ۱۶۷:۳' رقم : ۵۹۸۸)

''اللہ تعالیٰ کی طرف سے مہلت پر مہلت دی جاتی ہے۔ پس اگر جھکنے والے بوڑھے' عاجز و منکسر نوجوان' شیر خوار بچے' خورونوش کی فراوانی کے ساتھ رہنے والے جانور نہ ہوں تو تم پر مصائب کے پہاڑ ٹوٹ پڑیں۔''

(۶) سہولیاتِ زندگی کی فراہمی میں ترجیح کا حق : اسلام عمر رسیدہ افراد کو زندگی کی سہولیات کی فراہمی میں ترجیح کا حق بھی فراہم کرتا ہے۔ یہ حق قرآنِ حکیم کی درج ذیل آیت سے ثابت ہوتا ہے :

وَلَمَّا وَرَدَ مَآءَ مَدْيَنَ وَجَدَ عَلَيْهِ أُمَّةً مِّنَ النَّاسِ يَسْقُوْنَ وَوَجَدَ مِنْ دُوْنِهِمُ امْرَأَتَيْنِ تَذُوْدٰنِ قَالَ مَا

خَطُبُكُمَاقَالَتَا لَا نَسْقِيُ حَتّٰى يُصُدِرَالرِّعَآءُ وَأَبُوُنَا شَيُخٌ "كَبِيُرٌ"O فَسَقٰى لَهُمَا ثُمَّ تَوَلّٰى إِلَى الظِّلِّ فَقَالَ رَبِّ إِنِّيُ لِمَا أَنُزَلُتَ إِلَيَّ مِنُ خَيُرٍ فَقِيُرٌ"O (القَصَص :۲۳، ۲۴)

''اور جب موسیٰ (علیہ السلام) مدین کے چشمہ پر پہنچے تو اُس پر آدمیوں کا ایک مجمع پانی پلاتے دیکھا اور اُن لوگوں سے ایک طرف دو عورتیں دیکھیں کہ وہ (اپنے جانور) روکے کھڑی ہیں۔ پوچھا: تمہارا کیا مقصود ہے؟ دونوں بولیں: ہم پانی نہیں پلاتیں جب تک (یہ) چرواہے اپنے جانوروں کو ہٹا کر نہیں لے جاتے اور ہمارے والد بہت بوڑھے ہیں۔ پس (موسیٰ نے) اُن کے لئے پانی پلا دیا' پھر ہٹ کر سایہ میں آ گئے اور عرض کی: اے میرے پالنہار! تو جو نعمت بھی مجھے دے دے' میں اُس کا حاجتمند ہوں۔'' (۲۸ : ۲۳'۲۴)

جناب موسیٰ علیہ السلام کا یہ واقعہ عمر رسیدہ افراد کو ترجیح کرنے کی اساس فراہم کرتا ہے۔ اسی طرح حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کی بابت سورہ یوسف کی آیت ۷۸ میں فرمایا گیا ہے:

قَالُوُا يَا أَيُّهَاالُعَزِيُزُ إِنَّ لَه' أَبًا شَيُخًا كَبِيُرًا فَخُذُ أَحَدَنَا مَكَانَه' إِنَّا نَرَاكَ مِنَ الُمُحُسِنِيُنَO

''وہ بولے: اے عزیز مصر! اس کے والد بڑے معمر بزرگ ہیں' آپ اس کی جگہ ہم میں سے کسی کو رکھ لیں' بے شک ہم آپ کو بہت نیک مزاج پاتے ہیں۔'' (۱۲ : ۷۸)

یہ آیت واضح کرتی ہے کہ برادرانِ یوسف نے اپنے بھائی بنیامین کی رہائی کے لئے اپنے معمر والد حضرت یعقوب علیہ السلام کا واسطہ دیتے ہوئے خصوصی رعایت کی درخواست کی۔

(۷) <u>برکت اکابر سے ہے</u>: حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث مبارکہ میں ہے:

أَلُبَرَكَةُ مَعَ أَكَابِرِكُمُ (صحيح ابن حبان ۲ : ۳۱۹' رقم: ۵۵۹؛ المستدرك لحاكم ۱:۱۳۱' رقم: ۲۱۰؛ المعجم الاوسط لطبراني ۹:۱۶' رقم: ۸۹۹۱؛ شعب الايمان لبيهقي ۷:۴۶۳' رقم: ۱۱۰۰۴؛ موارد الظمآن: لهيثمي ۴۷۳' رقم: ۱۹۱۲؛ مجمع الزوائد لهيثمي ۸:۱۵؛ كنز العمال لهندي ۳:۱۷۲' رقم: ۶۰۱۵)

''تمہارے بزرگوں کے ساتھ ہی تم میں خیر و برکت ہے۔''

حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

ابُغُوُنِيُ ضُعَفَاءَ كُمُ فَإِنَّمَا تُرُزَقُوُنَ وَتُنُصَرُوُنَ بِضُعَفَاءِ كُمُ (الجامع الصحيح لترمذي: كتاب الجهاد؛ السنن لابي داؤد: كتاب الجهاد' باب في الانتصار؛ السنن لنسائي: كتاب الجهاد؛ السنن الكبرىٰ للنسائي ۳:۳۰' رقم: ۴۳۸۸؛ المسند لاحمد بن حنبل ۵ : ۱۹۸؛ الصحيح لابن حبان ۱۱:۸۵' رقم: ۴۷۶۷؛ السنن الكبرىٰ لبيهقي ۳:۳۴۵؛ موارد الظمآن لهيثمي ۳۹۰' رقم: ۱۶۲۰؛ كنز العمال لهندي ۳:۱۷۳۔

''مجھے اپنے ضعیف لوگوں میں تلاش کرو کیونکہ ضعیف لوگوں کے سبب تمہیں رزق دیا جاتا ہے اور تمہاری مدد کی جاتی ہے۔''

حضرت ابو سعید خُدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسالتمآب ﷺ نے ارشاد فرمایا:

اِسْتَوْصُوْا بِالْكُهُوْلِ خَيْرًا وَارْحَمُوا الشَّبَابَ (كنز العمال لهندی ۳: ۱۷۹، رقم: ۶۰۵۰)

''اُدھیڑ عمر کے لوگوں سے بھلائی حاصل کرو اور نوجوانوں پر رحم کرو۔''

(۸) استطاعت سے زیادہ بوجھ سے استثناء کا حق: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسالتمآب ﷺ نے فرمایا:

إِذَا صَلّٰى اَحَدُكُمْ لِلنَّاسِ فَلْيُخَفِّفْ فَإِنَّ مِنْهُمُ الضَّعِيْفُ وَالسَّقِيْمُ وَالْكَبِيْرُ وَإِذَا صَلّٰى أَحَدُكُمْ لِنَفْسِهٖ فَلْيُطَوِّلْ مَاشَاءَ (صحيح البخاری: كتاب الاذان، باب اذا صلّى لنفسه؛ صحيح مسلم، كتاب الصلاة، باب فى تخفيف الصلاة؛ مؤطا امام مالك ۱: ۱۳۴؛ ۳۰۱؛ مسند احمد بن حنبل ۲: ۴۸۶)

''جب تم میں سے کوئی شخص لوگوں کو نماز پڑھائے تو ہلکی پڑھائے کیونکہ اُن میں کمزور، بیمار اور بوڑھے بھی ہوتے ہیں اور جب تم میں سے کوئی تنہا نماز پڑھے تو جتنا چاہے، لمبا کردے۔''

حضرت اَنس بن مالک رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

إِنَّ اللّٰهَ لَيَسْتَحْيِ مِنْ ذِی الشَّيْبَةِ الْمُسْلِمِ إِذَا كَانَ مُسَدِّدًا لَزُوْمًا لِلسُّنَّةِ أَنْ يَّسْأَلَ اللّٰهَ فَلَا يُعْطِيَهٗ (المعجم الاوسط لطبرانی ۵: ۲۷۰، رقم: ۵۲۸۶؛ مجمع الزوائد ۱۰: ۱۴۹)

''بے شک اللہ تعالیٰ ایسے بوڑھے مسلمان کو عطا نہ کرنے سے حیا کرتا ہے جو استقامت کے ساتھ سنت پر عمل پیرا ہو اور اللہ سے سوال کرے۔''

اس تمام تفصیل سے واضح ہو جاتا ہے کہ اسلام معاشرے کے عمر رسیدہ افراد کو کس قدر اہمیت دیتا ہے اور اُن کے ساتھ حسنِ سلوک اور نرمی برتنے کی کتنی ہی پُر زور تاکید کرتا ہے۔ خصوصاً بوڑھے والدین کے ساتھ نہایت شفقت کے ساتھ پیش آنے کا حکم دیتا ہے۔ یہ بات بالخصوص قابلِ ذکر ہے کہ رب تعالیٰ نے جہاں کہیں بھی والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کا حکم دیا ہے، اپنی عبادت کے حکم کے ساتھ دیا ہے جیسے فرمایا:

وَقَضٰى رَبُّكَ أَلَّا تَعْبُدُوْا إِلَّا إِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا إِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ أَحَدُهُمَا أَوْ كِلَاهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَا أُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًاO وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِیْ صَغِيْرًاO (بنی اسرائيل: ۲۳، ۲۴)

''اور آپ کے رب نے حکم فرما دیا ہے کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت مت کرو اور والدین کے ساتھ حسنِ سلوک

کیا کرو۔ اگر تمہارے سامنے دونوں میں سے کوئی ایک یا دونوں بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو اُنہیں ''اُف'' تک نہ کہنا اور اُنہیں مت جھڑکنا اور اُن دونوں کے ساتھ بڑے ہی ادب سے بات کیا کرو۔ اور ان دونوں کے لئے نرم دلی سے عجز و انکساری کے بازو جھکائے رکھو اور (اللہ کے حضور) عرض کرتے رہو: اے میرے پالنہار! ان دونوں پر رحم فرما جیسا کہ اُنہوں نے بچپن میں مجھے (رحمت و شفقت سے) پالا تھا۔'' (۲۳، ۲۴: ۱۷)

اگر انسان استطاعت کے باوجود اپنے والدین اور قرابت داروں کی خدمت گزاری میں کوتاہی کرے تو یہ ہرگز قابلِ برداشت نہیں لیکن ایسا بھی تو ہوسکتا ہے کہ اولاد خود افلاس و تنگدستی میں گرفتار ہو اور خود نانِ شبینہ کی محتاج ہو تو اس مجبوری کے عالم میں وہ کس طرح والدین کی خدمت کرے گی۔ ایسے آدمی کو فرمایا کہ محبت بھرے نرم نرم لہجہ میں باتیں کرنے پر تو کوئی لاگت نہیں آتی۔ تو اگر اور کچھ نہیں کرسکتے تو اپنی میٹھی میٹھی باتوں سے تو اُن کا دل لبھاتے رہو اور دل میں یہ عزم رکھو کہ جب مولا کریم نے مجھ پر رزق کا دروازہ کشادہ کیا تو میں اپنے والدین کی خدمت بجالانے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کروں گا۔ چنانچہ فرمایا :

وَاِمَّا تُعْرِضَنَّ عَنْهُمُ ابْتِغَآءَ رَحْمَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ تَرْجُوْهَا فَقُلْ لَّهُمْ قَوْلًا مَّيْسُوْرًا ۝ (بنی اسرائیل: ۲۸)

''اور اگر (بوجہ تنگدستی) تجھے اُن سے منہ پھیرنا پڑے اور تم اپنے رب کی رحمت (یعنی خوشحالی) کے متلاشی ہو جس کی تمہیں توقع ہے تو (اس اثنا میں) اُن سے بات کرو تو بڑی نرمی سے کرو۔'' (۲۸ : ۱۷)

''سو معلوم ہوا کہ دنیا و آخرت کی فلاح بزرگوں خصوصاً بوڑھے والدین کی عزت و تکریم اور خدمت میں ہے۔ اگر انسان معمر افراد کی توقیر نہیں کرتا تو آغاز میں دی گئی احادیثِ مبارکہ کے مصداق حضور نبی کریم ﷺ کی اُمت سے خارج ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اپنے عقبیٰ کی بہتری کے لئے ہمیں ہر لحظہ معمر افراد کی خدمت کرنی چاہئے اور اُن کے حقوق ادا کرنے چاہئیں۔'' (''اسلام میں عمر رسیدہ اور معذور افراد کے حقوق'' ۔۔ پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری، صفحات ۱۱ تا ۲۱)

(IV) معذور افراد کے حقوق : ''معذور افراد انسانی معاشرے کا وہ حصّہ ہیں جو عام افراد کی نسبت زیادہ توجہ کے مستحق ہیں۔ کوئی بھی مہذّب معاشرہ معذوروں کو نظر انداز کرنے یا اُنہیں معاشرے میں قابلِ احترام مقام سے محروم رکھنے کا تصوّر بھی نہیں کرسکتا۔ اسلام تکریمِ انسانیت کا علمبردار دین ہے۔ چونکہ معذور افراد معاشرے میں اپنی شناخت اور وقار کے لئے خصوصی توجہ کے مستحق ہوتے ہیں، اس لئے اسلام نے اس بارے میں خصوصی تعلیمات عطا کی ہیں۔ یہاں یہ امر واضح رہے کہ وہ تمام حقوق جو عام افرادِ معاشرہ کو میسر ہیں، معذور افراد بھی معاشرے کا حصّہ ہوتے ہوئے ان حقوق کے مستحق ہیں۔ اسلام نے معذوروں کو جو حقوق عطا فرمائے ہیں، اُن کی تفصیل یہ ہے:

(i) خصوصی توجہ کا حق : اسلام نے زندگی کے معاملات میں ہر فرد کو بلاتمیز رنگ و نسل یا سماجی مرتبہ کے مساوی حیثیت عطا کی ہے۔ یہ عام معاشرتی رویّہ ہے کہ معذور افراد کو زندگی کے عام معاملات اور میل جول میں نظر

انداز کرنے کی روش اختیار کی جاتی ہے۔ قرآنِ حکیم نے اس روش کی سختی سے مذمت کرتے ہوئے نفسِ انسانیت کو عزت و وقار کا مستحق قرار دیا ہے۔ ایک مرتبہ حضور نبی اکرم ﷺ رؤسائے مشرکین کو تبلیغ فرما رہے تھے کہ اتنے میں نابینا صحابی حضرت عبداللہ ابن اُمِّ مکتوم رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ دوسروں سے مصروفِ گفتگو ہونے کی وجہ سے آپ ﷺ حضرت عبداللہ ابن اُمِّ مکتوم رضی اللہ عنہ کی طرف توجہ نہ دے سکے تو اس پر درج ذیل آیات نازل ہوئیں: (واقعہ کی تفصیل ملاحظہ ہو آئندہ صفحات میں ''ابن اُم مکتوم رضی اللہ عنہ'' کے عنوان کے تحت)

عَبَسَ وَتَوَلّٰی ۝ اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰی ۝ وَمَا یُدْرِیْكَ لَعَلَّهٗ یَزَّكّٰی ۝ اَوْ یَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰی ۝☆

''چیں بہ جبیں ہوئے اور منہ پھیر لیا (اس وجہ سے کہ) اُن کے پاس ایک نابینا آیا اور آپ کو کیا خبر شاید وہ (آپ کی توجہ سے) پاک تر ہو جاتا یا وہ (آپ کی) نصیحت کو قبول کرتا تو نصیحت اُسے (اور) فائدہ دیتی۔''

(۸۰ : ۱ تا ۴)

اِن آیاتِ مبارکہ میں آپ ﷺ کے توسط سے اُمت کو یہ تعلیم دی گئی کہ:

(۱) معذور افراد دیگر افرادِ معاشرہ کی نسبت زیادہ توجہ کے مستحق ہیں۔ دوسرے افراد کو اُن پر ترجیح دیتے ہوئے اُنہیں نظر انداز نہ کیا جائے۔

(۲) عزت و وقار کے مرتبے کا تعین سماجی یا معاشرتی حیثیت کو دیکھ کر نہ کیا جائے بلکہ اس کے لئے ذاتی کردار، تقویٰ، اصلاح طلبی اور نیکی کے جذبے کو معیار بنایا جائے۔''

(ii) ''قانونِ معاشرت کے نفاذ میں استثناء کا حق: اسلام نے دیگر شعبہ ہائے زندگی کی طرح معاشرتی زندگی کے لئے بھی قانون اور نظام عطا کیا ہے۔ روزمرہ کے رہن سہن اور رشتہ داروں، دوست احباب کے گھروں میں آنے جانے کے لئے واضح ضابطے عطا کئے گئے ہیں۔ تاہم یہ امر قابلِ غور ہے کہ قرآنِ حکیم میں معذوروں کو ان ضوابط سے مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے اور فرمایا گیا:

لَیْسَ عَلَی الْاَعْمٰی حَرَجٌ وَّلَا عَلَی الْاَعْرَجِ حَرَجٌ وَّلَا عَلَی الْمَرِیْضِ حَرَجٌ وَّلَا عَلٰی اَنْفُسِكُمْ اَنْ تَاْكُلُوْا مِنْ بُیُوْتِكُمْ اَوْ بُیُوْتِ اٰبَآئِكُمْ اَوْ بُیُوْتِ اُمَّهٰتِكُمْ اَوْ بُیُوْتِ اِخْوَانِكُمْ اَوْ بُیُوْتِ اَخَوٰتِكُمْ اَوْ بُیُوْتِ اَعْمَامِكُمْ اَوْ بُیُوْتِ عَمّٰتِكُمْ اَوْ بُیُوْتِ اَخْوَالِكُمْ اَوْ بُیُوْتِ خٰلٰتِكُمْ اَوْ مَا مَلَكْتُمْ مَّفَاتِحَهٗ اَوْ صَدِیْقِكُمْ لَیْسَ عَلَیْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَاْكُلُوْا جَمِیْعًا اَوْ اَشْتَاتًا فَاِذَا دَخَلْتُمْ بُیُوْتًا فَسَلِّمُوْا عَلٰی اَنْفُسِكُمْ تَحِیَّةً مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُبٰرَكَةً طَیِّبَةً (النور : ۶۱)

''نہ اندھے پر، نہ لنگڑے پر، نہ بیمار پر اور نہ تم پر کوئی حرج ہے اس بات میں کہ تم کھاؤ اپنے گھروں سے یا اپنے باپ دادا کے گھروں سے یا اپنی ماؤں کے گھروں سے یا اپنے بھائیوں کے گھروں سے یا اپنی بہنوں کے گھروں سے یا اپنے چچاؤں کے گھروں سے یا اپنی پھوپھیوں کے گھروں سے یا اپنے ماموؤں کے گھروں سے یا اپنی خالاؤں کے گھروں سے یا جن گھروں کی کُنجیوں کے تم مالک ہو یا اپنے دوست کے گھر سے، اگر تم سب مل کر یا الگ الگ ہو کر کھاؤ تو تم پر کوئی حرج نہیں، پھر جب تم گھروں میں داخل ہو تو اپنوں

☆ اس عتاب میں بھی لطف و کرم اور پیار کے جلوے دمک رہے ہیں۔ عتاب کرتے ہوئے عَبَسْتَ وَتَوَلَّیْتَ خطاب کے صیغے استعمال نہیں کئے بلکہ غیاب کے پردے میں عتاب کیا گیا ہے کیونکہ روبرو عتاب قلبِ عاطر پر گراں گزرتا۔

کوسلامتی کی وہ دُعا دو جواللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر ہے جو بڑی بابرکت اور پاکیزہ ہے۔'' (۲۴:۶۱)

(iii) جہاد اور دفاعی ذمہ داریوں سے استثناء کا حق : قرآنِ حکیم نے اسلامی ریاست کے فروغ اور غلبہءِ دین کی جدّ وجُہد کے لئے جہاد میں حصّہ لینے کو ایمان واستقامت کی جانچ کے معیار کے طور پر بیان کیا اور اس بنیادی ذمہ داری سے راہِ فرار اختیار کرنے کو عــذابِ الیــم کا سبب قرار دیا۔ تاہم معذور افراد کو اس کلیدی اور بنیادی ذمہ داری سے مستثنٰی قرار دیا گیا اور فرمایا گیا:

لَیۡسَ عَلَی الۡاَعۡمٰی حَرَجٌ وَّلَا عَلَی الۡاَعۡرَجِ حَرَجٌ وَّلَا عَلَی الۡمَرِیۡضِ حَرَجٌ وَمَنۡ یُّطِعِ اللّٰہَ وَرَسُوۡلَہٗ یُدۡخِلۡہُ جَنّٰتٍ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِہَا الۡاَنۡہٰرُ وَمَنۡ یَّتَوَلَّ یُعَذِّبۡہُ عَذَابًا اَلِیۡمًاO(الفتح:۱۷)

''نہ اندھے پر کوئی گناہ ہے، نہ لنگڑے پر کوئی گناہ اور نہ بیمار پر کوئی گناہ ہے (کہ وہ جہاد میں شریک نہ ہو سکے) اور جو کوئی اللہ اور اُس کے رسول کی اطاعت کرے گا، تو اللہ اُسے ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں اور جو کوئی رُوگردانی کرے گا، (اللہ) اُسے دردناک عذاب دے گا۔''
(یعنی جہاد پر جانا اور جہاد سے رُکنا سب اللہ کے حکم کے تحت ہونا چاہئے) (۴۸ : ۱۷)

''گویا قانونِ اسلام نے معذوروں کے ناقابلِ برداشت ذمہ داریوں سے مستثنٰی قرار دئے جانے کو اُن کا بنیادی حق قرار دیا۔ اسلام کی تعلیمات سے یہ امر واضح ہے کہ :

(۱) اسلام معذور افراد کو معاشرے کا قابلِ احترام اور باوقار حصّہ بنانے کی تلقین کرتا ہے۔
(۲) اسلام اس امر کی تعلیم دیتا ہے کہ معذور افراد کو خصوصی توجہ دی جائے اور اُنہیں یہ احساس قطعاً نہ ہونے دیا جائے کہ اُنہیں زندگی کے کسی بھی شعبے میں نظرانداز کیا جارہا ہے۔
(۳) معاشرتی اور قومی زندگی میں اُن پر کسی بھی ایسی ذمہ داری کا بوجھ نہ ڈالا جائے جو اُن کے لئے ناقابلِ برداشت ہو۔
(۴) اسلام کے عطاکردہ جملہ حقوق کی عطائیگی میں معذوروں کو ترجیحی مقام دیا جائے تاکہ معاشرے میں اُن کے استحصال یا محرومی کی ہر راہ مسدود ہو جائے۔'' (''اسلام میں عمر رسیدہ اور معذور افراد کے حقوق''۔۔ پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری، صفحات ۲۵ تا ۲۸)

(۷) حفظانِ صحت کے مطابق صاف، ستھرا گھر ایک بنیادی ضرورت ہے: قرآن فرماتا ہے:

وَاللّٰہُ جَعَلَ لَکُمۡ مِّنۡۢ بُیُوۡتِکُمۡ سَکَنًا وَّجَعَلَ لَکُمۡ مِّنۡ جُلُوۡدِ الۡاَنۡعَامِ بُیُوۡتًا تَسۡتَخِفُّوۡنَہَا یَوۡمَ ظَعۡنِکُمۡ وَیَوۡمَ اِقَامَتِکُمۡ وَمِنۡ اَصۡوَافِہَا وَاَوۡبَارِہَا وَاَشۡعَارِہَاۤ اَثَاثًا وَّمَتَاعًا اِلٰی حِیۡنٍO(النحل:۸۰)

''اور اللہ ہی نے تمہارے گھر تمہارے لئے وجہِ سکون بنائے اور تمہارے لئے جانوروں کی کھال کے گھر بنائے جنہیں تم اپنے سفر کے دن اور اپنے قیام کے دن ہلکا پاتے ہو اور اُن کی اون، اُن کی روؤں اور اُن کے بالوں سے تمہارے گھر کا سامان اور ایک مدت تک چلنے والی فائدے کی چیزیں بنائیں۔''

یہ اینٹ، پتھر، مٹی، چونے اور لکڑی کے گھر، بیشتر انسانی آبادی کے مسکن، انسان کے لئے راحتِ قلب اور سکونِ خاطر کا کتنا بڑا ذریعہ اور سبب ہیں، اس کی قدر کوئی اُس غریب سے پوچھے جو بیچارہ بے گھر ہو اور اپنا چھوٹا بڑا کوئی بھی مکان نہ رکھتا ہو! یہ قرآن مجید ہی کا کام تھا جس نے مکان اور جائے سکونت کو وجہِ سکون و مایہ تسکین کہہ دیا۔

جنسی بے راہروی غضبِ الٰہی اور متعدد بیماریوں کا سبب بنتی ہے

(1) ہم جنس پرستی (Homosexuality): ناجائز جنسی تعلقات اور اُن کی طرف لے جانے والی تمام راہوں کی نہ صرف ممانعت کی گئی بلکہ قرآن مجید ''ہم جنس پرستی'' جیسی جنسی بے راہروی پر بھی پابندیاں لگاتا ہے جو قانونِ الٰہی کے فطری تقاضا کے خلاف کھلی بغاوت، سنگین جرم اور بیویوں کے حقوق کو غصب کرنا ہے۔ نسوانی ہم جنس پرستی (''مساحقت'') پر بھی ہوبہو اسی کا اطلاق ہوتا ہے، انگریزی زبان میں جس کا نام Lesbianism ہے۔

معاشرہ میں اس غیر فطری، گھناؤنے مشغلہ کا پھیلاؤ معاشرہ کی فطری زندگی کو تہ و بالا کر کے رکھ دیتا ہے اور اس مشغلہ کے عادی لوگ اپنی سفلی خواہشات کے غلام بن کے رہ جاتے ہیں۔ وہ انسان کے مقبول و پسندیدہ طریقِ عمل، پاکیزہ طرزِ زندگی اور لائقِ احترام ضابطہِ اخلاق سے پُر آزار حد تک محروم ہو جاتے ہیں۔ قرآن مجید میں بیان کردہ لوط علیہ السلام کی قوم کی تباہ کن اور بدانجامی سے ہم جنس پرستوں کی آنکھیں کھل جانی چاہئیں۔ اپنی بیویوں سے پاک وصاف، فطری اور قانونی تعلق رکھنے کی بجائے وہ لوگ ناگزیر حد تک اس گھناؤنی برائی کا شکار تھے۔ پیغمبر لوط علیہ السلام نے اُنہیں مہیب نتائج کی تنبیہ کی اگر اُنہوں نے اس تنبیہ پر توجہ نہ کی۔ آپ نے اُنہیں فرمایا:

أَتَأْتُونَ الذُّكْرَانَ مِنَ الْعَالَمِينَ O وَتَذَرُونَ مَا خَلَقَ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ أَزْوَاجِكُمْ بَلْ أَنْتُمْ قَوْمٌ عٰدُونَ O (الشّعراء: ۱۶۵، ۱۶۶)

''تمام دنیا جہان والوں میں سے تم (یہ حرکت کرتے ہو کہ) مردوں سے فعل کرتے ہو حالانکہ تمہارے پروردگار نے تمہارے لئے بیویاں پیدا کی ہیں، اُنہیں چھوڑے رہتے ہو۔ بات یہ ہے کہ تم حد سے گزر جانے والے ہی لوگ ہو۔'' (۲۶ : ۱۶۶، ۱۶۵)

اِن بدکردار، کج رَو لوگوں کا لوط علیہ السلام کے مہمان (فرشتوں) کے ساتھ گستاخانہ رویّہ، اُن کی بدذوقی اور شہوت پرستی پر مبنی تھا اور یہ فرستادے اللہ کی طرف سے ان لوگوں کو سزا دینے کے لئے انسانی شکل میں بھیجے گئے تھے۔ قرآن مجید کے الفاظ میں:

قَالُوْا يَا لُوْطُ إِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ لَنْ يَّصِلُوْا إِلَيْكَ فَأَسْرِ بِأَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ اللَّيْلِ وَلَا يَلْتَفِتْ مِنْكُمْ أَحَدٌ إِلَّا امْرَأَتَكَ إِنَّهُ مُصِيبُهَا مَا أَصَابَهُمْ إِنَّ مَوْعِدَهُمُ الصُّبْحُ أَلَيْسَ الصُّبْحُ بِقَرِيبٍ O فَلَمَّا جَآءَ أَمْرُنَا جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَأَمْطَرْنَا عَلَيْهَا حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيلٍ مَّنْضُوْدٍ O مُسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ وَمَا هِيَ مِنَ الظَّالِمِينَ بِبَعِيْدٍ O (هُود: ۸۱ تا ۸۳)

''وہ (فرستادے) بولے: اے لوط! ہم تو آپ کے پروردگار کے فرستادے ہیں' اُن کی رسائی آپ تک بھی نہ ہو سکے گی' آپ رات ہی کے کسی حصّہ میں اپنے گھر والوں کو لے کے نکل جایئے اور تم میں سے کوئی بھی پیچھے پھر کر نہ دیکھے گا مگر ہاں آپ کی بیوی دیکھے گی' اُسے بھی وہی آفت آئے گی جو اُن (سب) پر نازل ہوگی' اُن پر (عذاب) کے وعدہ کا وقت صبح کا ہے اور صبح میں اب دیر ہی کیا ہے؟ سو جب ہمارا حکم آ پہنچا تو ہم نے اس زمین کے بلند کو اس کا پست بنا دیا اور ہم نے اُس پر کھنگر کے تہ بہ تہ پتھر برسادئے' آپ کے پروردگار کے پاس خاص نشان کئے ہوئے اور وہ (مقام) ان ظالموں سے کچھ دُور بھی نہیں۔'' (۸۱ تا ۸۳: ۱۱)

یعنی ''اہلِ مکہ سے وہ مقام کچھ دُور بھی نہیں۔ قوم لوط کا مسکن دریائے یردن کی وادی میں تھا جہاں اب بحرِ مُردار واقع ہے اور قومِ لوط کے بڑے شہر سدوم اور عمورہ بحرِ مردار کے ساحل پر واقع تھے۔ قریشِ مکہ اپنے سفرِ شام میں برابر اسی راہ سے آتے جاتے تھے۔ ان آبادیوں کی آسمانی ہلاکت کا زمانہِ وقوع جدید تحقیق کے مطابق ۲۰۶۱ ق م ہے۔'' (تفسیر ماجدی اردو' صفحہ ۴۷۶' نوٹ: ۱۲۳)

''یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اہلِ سدوم وعمورہ وغیرہ کے ساتھ واقع ہونے والے واقعہ کا یہ انوکھا بیان سرزمینِ اُردن پر کھڑے ہونے والے جدید زمانہ کے سیّاحوں کو حقیقت کا احساس دلاتا ہے جو اس دہشت ناک تباہی کی توجیہ نکالنے میں کوشاں رہتے ہیں۔'' ("The Bible is True"...Sir Charles Marston, p. 130)

ہم جنس پرستی کی سزا کے متعلق پیغمبر علیہ السلام نے فرمایا:

مَنْ وَجَدْتُمُوْهُ يَعْمَلُ عَمَلَ قَوْمِ لُوْطٍ فَاقْتُلُوا الْفَاعِلَ وَالْمَفْعُوْلَ (ابوداؤد' ابنِ ماجہ' ترمذی' نسائی' دارقطنی)

''جس کو تم قومِ لوط کا عمل کرتے پاؤ تو فاعل اور مفعول دونوں کو قتل کر دو۔''

سیّدنا ابوبکر صدّیق رضی اللہ عنہ کے زمانہِ خلافت میں حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے خلیفہِ وقت جناب صدّیق سے ہم جنس پرست کی سزا کے متعلق لکھ بھیجا۔ جناب صدّیقِ اکبر رضی اللہ عنہ نے مسئلہ پر مشاورت کے لئے صحابہ کرام کو طلب کیا تو حضرت علی کرّم اللہ وجھہ' نے فرمایا کہ ایسے آدمی کی سزا یہ ہے کہ مجرم کو قتل کرنے کے بعد اُس کی لاش جلا دی جائے۔ تمام موجود صحابہ نے آپ کی رائے کی تائید کی۔ چنانچہ حضرت خالد کو یہی جواب لکھ بھیجا گیا اور اُنہوں نے اس کے مطابق عمل کیا۔'' (ضیاء القرآن۔۔جسٹس کرم شاہ الازہری' جلد دوم' صفحہ ۵۴)

بظاہر یہ سزائیں (معاذ اللہ) ظالمانہ معلوم ہوتی ہیں لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ ان سزاؤں نے اسلامی معاشرے کی پاکیزگی کو برقرار رکھنے میں خاصا کردار ادا کیا ہے جو اسلام کی انتہائی پسندیدہ' با مقصد کوشش ہے۔

(2) مُشت زنی (Masturbation): جنسی دباؤ کی مغلوب الجذبات انگیخت کو کم کرنے کے لئے انسان مشت

زنی پر مجبور ہو جاتا ہے۔ بہت سے علمائے دین کے نزدیک مندرجہ ذیل آیاتِ قرآنی کی رُو سے مشت زنی حرام فعل ہے۔

وَالَّذِیْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ O اِلَّا عَلٰى أَزْوَاجِهِمْ أَوْمَامَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَإِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ O فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ O (المؤمنون : ۵ تا ۷)

''اور جو اپنی شرم گاہوں کی نگہداشت رکھنے والے ہیں' ہاں البتہ اپنی بیویوں اور باندیوں سے نہیں کہ (اس صورت میں) اُن پر کوئی الزام نہیں۔ ہاں جو کوئی اس کے علاوہ کا طلبگار ہو تو ایسے ہی لوگ حد سے نکل جانے والے ہیں۔'' (۲۳ : ۵تا۷)

زنا کاری اور شہوت رانی کی جتنی بھی غیر فطری صورتیں (اور مشت زنی بھی انہی میں شامل ہے) ہیں سب آیت نمبر ۷ کے تحت میں آتی ہیں یعنی مُشت زن بھی حد سے نکل جانے والا ہوتا ہے۔

''امام احمد بن حنبل مادہ منویہ کو دوسرے فضلوں کی طرح جسم سے خارج ہونے والے غلیظ مادّہ کی طرح سمجھتے ہیں اور اُنہوں نے اس کے اخراج کی اجازت دی ہے جس طرح کہ خون نکالنے (فصد کھولنے) کی اجازت ہے۔ علامہ ابنِ حزم کی بھی یہی رائے ہے۔ تاہم حنبلی فقہاء نے مشت زنی کی دو شرائط کے تحت اجازت دی ہے: اوّل تو یہ کہ زنا اور حرام کاری کا خطرہ ہو اور دوم یہ کہ نکاح کرنے کے وسائل موجود نہ ہوں۔''

''ہمارے نزدیک امام احمد بن حنبل کی رائے اس صورت میں زیادہ قابلِ قبول ہے جہاں جنسی انگیخت کے باعث حرام کاری میں پڑنے کا خطرہ ہو' مثلاً ایک نوجوان بیرونِ ملک ملازمت کرنے یا پڑھنے گیا ہے جہاں جنسی انگیخت کی ہر طرح کی جاذبیتیں اور کششیں دعوتِ گناہ دے رہی ہوں تو ایسی صورت میں غضبِ الٰہی سے بچنے اور اپنے کردار کو پاکیزہ رکھنے اور جنسی دباؤ کو کم کرنے کے لئے مشت زنی کر لینا جائز ہے' بشرطیکہ وہ حدود سے نہ بڑھے اور اسے اپنی عادت نہ بنا لے۔''

''لیکن اس سے بہتر صورت پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اُن مسلمان نوجوانوں کو نصیحت ہے جو نکاح کرنے کی استطاعت نہیں رکھتے کہ وہ اکثر اور متواتر روزے رکھا کریں کیونکہ روزہ قوتِ ارادی کو پروان چڑھاتا ہے' ضبطِ نفس سکھاتا ہے اور خدا خوفی کو مضبوط کرتا ہے۔ اس سلسلہ میں آپ ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

''اے طبقہ نوجوانان! تم میں سے جو نکاح کرنے کی طاقت رکھتے ہیں نکاح کر لیں کیونکہ یہ چیز تمہیں غیر عورت کو دیکھنے سے باز رکھے گی اور تمہاری پاکیزگی کردار کو محفوظ رکھے گی۔ لیکن جو لوگ نکاح کرنے کی استطاعت نہیں رکھتے' وہ روزے رکھا کریں کیونکہ روزہ جنسی انگیخت کو ٹھنڈا کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔''

(''الحلال والحرام فی الاسلام'' یوسف القرضاوی انگریزی ترجمہ صفحات ۱۷۰'۱۷۱)

(3) زنا کاری ۔۔ کسی بھی معاشرہ کے نظام میں کینسر کی حیثیت رکھتی ہے: اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں کہ تمام الہامی مذاہب نے زنا کاری اور حرام کاری کی سختی سے ممانعت کی ہے اور اس معاشرتی جرم

کے خلاف جنگ کی ہے۔ تمام الہامی ادیان میں سے آخری دین اسلام تو زنا کاری کو روکنے میں بہت ہی سخت ہے کیونکہ یہ فعل بجائے خود بھی قبیح ہے اور جہاں وہ افراد کی روحانی پاکیزگی اور اخلاقی طہارت کے بھی منافی ہے تو صالح تمدن و معاشرہ کی اجتماعی صالحیت کے بھی خلاف ہے۔ روحانیت اور عبودیت کے چہرہ پر بھی ایک داغ اور جسمانی، معاشرتی اور معاشی مضرتوں اور خطروں کے اعتبار و لحاظ سے بھی قابلِ نفرت ہے۔ اسی لئے حکمِ پروردگارِ عالم ہوا :

وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَسَآءَ سَبِيْلًا O (بنی اسرائیل : ۳۲)

''اور زنا کے پاس بھی مت جاؤ، یقیناً وہ بڑی بے حیائی ہے اور بری راہ ہے۔'' (۱۷ : ۳۲)

الفاظِ قرآنی پر غور ہو۔ لَا تَزْنُوْا ارشاد نہیں ہو رہا بلکہ لَاتَقْرَبُوا الزِّنٰى ارشاد ہو رہا ہے یعنی زنا کے پاس بھی نہ پھٹکو اور اس کے مبادی اور دواعی مقدمات تک سے بچو۔ گویا اس حکمِ امتناعی کے تحت میں بے حیائی و بے حجابی کے سارے قولی، فعلی، تقریری، تحریری، تصویری، لباسی مظاہرے آ گئے۔ یہ شریعت اسلامی ہی ہے جس نے ہر غیر نکاحی، غیر ازدواجی تعلق کو ہر حال اور ہر صورت میں حرام قرار دیا ہے ورنہ اکثر قدیم و جدید جاہلی تہذیبوں اور قانونوں میں زنا بجائے خود تو کوئی جرم ہی نہیں جب تک جبر کی آمیزش یا حقوقِ شوہری میں دست اندازی وغیرہ اس میں شامل نہ ہو بلکہ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ بابل، مصر، ایران، ہند قدیم وغیرہ کے متعدد جاہلی مذہبوں نے تو خاص خاص حالات میں زنا کاری کو ایک عبادت یا عملِ مقدس مان رکھا ہے۔'' (تفسیر ماجدی اردو، ص ۵۸۴، نوٹ : ۴۷)

''ایک اور خرابی جس میں ساری قومیں بری طرح مبتلا تھیں اور اب بھی ہیں وہ بدکاری تھی۔ اس کی قباحت و وقاحت کو دو مختصر فقروں میں بیان فرمایا اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً یعنی وہ بڑی بے حیائی کا فعل ہے۔ وَسَآءَ سَبِيْلًا اور بری راہ ہے۔ اس فعل کا فاحش ہونا کسی صاحب عقلِ سلیم پر مخفی نہیں۔ زنا کے دُور رس بُرے نتائج پر اگر آپ نظر ڈالیں تو سَآءَ سَبِيْلًا کا مفہوم بھی واضح ہو جائے گا۔ اس سے انساب میں اختلاط ہوتا ہے۔ مال کسی کا ہوتا ہے اور وارث کوئی اور بنتا ہے۔ موذی بیماریاں بڑی کثرت سے پھیلتی ہیں۔ عورت کی عظمت کا چاند گہنا جاتا ہے۔ وہ ماں کے تقدس اور بیٹی کی عظمت سے محروم ہو کر ایک بازاری جنس بن جاتی ہے۔ پھر اس فعلِ شنیع کے ارتکاب سے اُس کی سیرت اور اس کی صحت بُری طرح متاثر ہوتی ہے اور حرامی اولاد شفقتِ پدری سے محروم ہوتی ہے۔ سارے معاشرہ میں کبھی بھی عزت کی نظر سے نہیں دیکھی جاتی۔ اس کی وجہ سے فتنہ و فساد کی چنگاریاں بھڑک اٹھتی ہیں اور خاندانوں کے خاندان اس میں بھسم ہو کر رہ جاتے ہیں۔ ان تمام چیزوں کو اگر غور سے دیکھا جائے تو سَآءَ سَبِيْلًا کی حقیقت کھل کر سامنے آ جاتی ہے۔ چند لمحوں کی لذت طلبی کے لئے اتنی گراں قیمت ادا کرنا کون پسند کرتا ہے؟ سَآءَ سَبِيْلًا کے متعلق اگر اب بھی کسی کو شک ہو تو وہ امریکی فوجیوں کے اُن لاکھوں حرامی بچّوں کی حالتِ زار کو دیکھے جو کوریا اور ویتنام وغیرہ ممالک کی گلیوں میں دھکے کھا رہے ہیں اور کوئی اُن کا پرسانِ حال نہیں۔ انہی قباحتوں اور روح فرسا نتائج کی وجہ سے ہی قرآن کریم نے فرمایا کہ اس فعلِ شنیع کا ارتکاب تو بجائے خود، اس کے قریب تک مت جاؤ یعنی تمام وہ امور جو اس فعل کے ارتکاب پر اکساتے ہیں، اُن سے باز رہنے کا تاکیدی حکم دیا۔ بھڑکیلے، تنگ اور چست لباس، بے پردگی، مرد و زن کا اختلاط جس میں مخلوط تعلیم پیش پیش ہے، سب سے منع کر دیا ہے کیونکہ یہ تمام چیزیں جذبات کو اتنا مشتعل کر دیتی ہیں کہ کوئی لاکھ بچنا چاہے بچ نہیں سکتا اس لئے فرمایا کہ اس فعلِ شنیع کے قریب بھی مت جانا۔

تمباکونوشی: اس کا ذکر نہ تو قرآن مجید میں ہے اور نہ ہی احادیثِ مبارکہ میں' کیونکہ تمباکو نزولِ قرآن سے بعد کی پیداوار ہے یا یہ کہ تمباکو نزولِ قرآن کے وقت ملکِ عرب میں آیا نہیں تھا۔ تاہم قرآن وحدیث کی روشنی میں ائمہ مجتہدین کے اجتہاد کی رُو سے تمباکونوشی فضول خرچی اور پیسے کا ضیاع ہے اور اس لئے حرام ہے۔ ایک تو بنی اسرائیل کی آیت ۲۷ کی رُو سے کہ فضول خرچ لوگ شیطان کے بھائی بند ہیں اور دوم یہ کہ پیاز جو کہ حلال اور جائز ہے' کو کھا کر مسجد میں آنے سے منع کیا گیا کہ اس کی بُو سے فرشتے گھن کھاتے ہیں' تو تمباکو جیسی مکروہ چیز جس کی بُو پیاز سے کہیں زیادہ قابلِ نفریں ہوتی ہے' کا استعمال کیسے جائز ہوگا؟

''تمباکو کا شمار نقصان دہ اور زہریلی اشیاء میں ہوتا ہے اور اس میں کسی قسم کی غذائیت نہیں ہوتی۔ تمباکو کا ایک اہم جزء نکوٹین ہے جو انتہائی نقصان دہ زہر ہے۔ نکوٹین کے ایک قطرے سے ایک صحتمند خرگوش ہلاک ہوسکتا ہے۔ نکوٹین سب سے زیادہ اعصاب پر اثر انداز ہوتی ہے۔ تمباکو کھایا بھی جاتا ہے اور پیا بھی جاتا ہے۔ تمباکونوشی کے بہت زیادہ نقصانات ہیں مثلاً:

(۱) تمباکونوشی سے بینائی کمزور ہو جاتی ہے۔
(۲) تمباکونوشی سے نارمل بھوک متاثر ہو کر کم ہو جاتی ہے۔
(۳) تمباکونوشی کے تسلسل سے معدہ کی تیزابیت بڑھ جاتی ہے۔
(۴) تمباکونوشی سے امراضِ قلب اور ہارٹ اٹیک وغیرہ ہوسکتے ہیں۔
(۵) تمباکونوشی سے پھیپھڑوں کا سرطان (کینسر) ہو جاتا ہے۔
(۶) تمباکونوشی سے اختلاجِ قلب اور سانس پھولنے کا عارضہ لاحق ہو جاتا ہے۔
(۷) خون کے اندر تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں اور خون پتلا ہو جاتا ہے۔'' (''دانیال ہومیو پیتھک گائیڈ اینڈ نوٹس'' صفحہ ۳۲)

منشیات (Addictions) اور مخدّرات (Narcotics): ان سب کی اصل الکوحل ہے جو ایک زہریلا مشروب ہے۔ اس کے زہر کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کے 1% محلول میں مچھلی زندہ نہیں رہ سکتی۔ الکوحل پینے کے فوراً بعد وہ جسم میں پھیل جاتی ہے اور سانس سے اس کی بو آنے لگتی ہے۔

شراب کی بہت سی اقسام ہیں: بیئر' وہسکی' برانڈی' سپرٹ وغیرہ۔ یہ سب ایک ہی فیملی کے افراد ہیں۔ ان میں صرف الکوحل کے تناسب کا فرق ہے اور کسی بھی شراب کا بنیادی جزء الکوحل ہی ہوتی ہے۔ خالص الکوحل بھی نشہ کے لئے استعمال ہوتی ہے۔ خواص کے اعتبار سے مقوی اور زود ہضم ہوتی ہے اور اسے ہضم کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ براہِ راست جذب ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ لیکن اس ایک فائدہ کے مقابلہ میں نقصانات کی فہرست بہت طویل ہے۔ قرآن فرماتا ہے:۔

يَسْئَلُونَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيهِمَا اِثْمٌ كَبِيرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَاِثْمُهُمَا اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا (البقرة: ۲۱۹)

(اے نبی مکرّم!) لوگ آپ سے شراب اور جوئے کی بابت دریافت کرتے ہیں۔ آپ فرما دیجئے کہ ان دونوں میں بڑا گناہ ہے اور لوگوں کے فائدے بھی ہیں اور اُن کا گناہ اُن کے فائدوں سے کہیں بڑھا ہوا ہے۔'' (۲ : ۲۱۹)

خَـمْـر کے تحت میں ہر وہ نشیلا مشروب داخل ہے جو عقل کو مختل کر دے (تاج العروس و مفردات القرآن) اور شریعتِ اسلامی نے بھی اسی لغوی مفہوم کو قبول کیا ہے۔ مَیْسِـــــر بھی ایسے وسیع معنی میں ہے اور جوئے کی تمام اقسام (نرد اور شطرنج وغیرہ) کو شامل ہے۔

اِثْـم کا لفظ ہر ایسے فعل کے لئے آتا ہے جو نیکی کی راہ سے رکاوٹ پیدا کرنے والا ہو (مفردات)۔ اِثْـم کا اطلاق کسی عمل پر خود اُسے حرام قرار دینے کے لئے کافی ہے چہ جائیکہ جب اس پر تاکید بھی کبیـر کے ساتھ موجود ہو۔ اِثْـم ''کبیـر'' ہی سے فقہاء نے نکالا ہے اور ایک حدیثِ مبارکہ بھی اس کی تائید کرتی ہے کہ شراب کی مقدارِ قلیل بھی حرام ہے۔ معاشرہ میں آج تک جتنے فسادات شراب نوشی سے پیدا ہو چکے ہیں' اظہر من الشّمس ہیں۔ گالیاں یہ بکوائے' بے حیائی یہ پھیلائے' حرامکاری کی طرف یہ لائے۔ بلوے' دنگے یہ کرائے' چوری ٹھگی پر یہ آمادہ کرے' قتل کی نوبت یہ لائے' ہر عبادت سے' طہارت سے' پاکیزہ عمل سے یہ روک دے اور اسراف تو اس کے لئے کوئی بات ہی نہیں۔

قمار بازی کی لائی ہوئی مصیبتیں کیا کچھ کم ہیں؟ فرنگستان کے سب سے بڑے قمار خانے مونٹے کارلو (Monte Carlu) میں ہر سال کتنی بے شمار دولت تلف ہوتی رہتی ہے! دیوالی اور جمگھٹ کی راتوں کو ہندوستان کے اندر کیا کچھ نہیں ہوتا! اور پھر جوئے کی جدید ترین شکلوں' بیمہ کمپنیوں کے جوئے' گھوڑ دوڑ کے جوئے' لاٹریوں کے جوئے' سٹے وغیرہ کو کوئی کہاں تک شمار کرے؟ مَنَافِعُ لِلنَّاس یعنی حق تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی کائنات میں سب سے مضر ہی مضر اور ہر طرح نفع و مصلحت سے خالی کوئی شے موجود ہی نہیں' یہاں تک کہ شراب نوشی اور قمار بازی جیسے گندے مشغلے بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں۔ مثلاً شراب سے بعض بیماریوں کا علاج ہو سکتا ہے' بعض شرابیں خوشبو رکھتی ہیں' شراب سے فوری لذت و سرور حاصل ہوتا ہے' بعض قوّتوں میں عارضی طور پر تحریک پیدا ہو جاتی ہے وغیرہ وغیرہ اور اس طرح جوئے میں جو جیتتا ہے' اُسے بلا مشقت و تعب تھوڑی سی دیر میں آمدنی ہو جاتی ہے۔ مفسرین نے آیت کے اس جزو کے تحت میں شراب کے بہت سے مصالح و منافع اپنی اپنی بصیرت و دائرہ علم کے لائق گنائے ہیں اور یہیں سے ایک اور مسئلہ نکل آیا کہ کسی حرام اور ناجائز شے کے جزوی منافع و مصالح بیان کرنا اُس کی حرمت کے منافی اور اس کی حرمت سے انکار کے مرادف ہرگز نہیں۔ آج جو سپرٹ ملی ہوئی انگریزی دوائیں کثرت سے چل پڑی ہیں' یہ عموماً تیزاب کے قسم کی ہوتی ہیں اور فقہاء نے اُنہیں زہر کے حکم میں رکھا ہے۔ وَاِثْمُهُـمَـا أَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا ''اور اُن کا گناہ اُن کے فائدوں سے کہیں بڑھا ہوا ہے'' کی رُو سے عقلِ سلیم کے لحاظ سے یہ دونوں چیزیں قابلِ ترک اور واجب الاحتراز ہیں۔ یہ اسلام ہی کا اعجاز ہے کہ اُس نے اپنے پیروؤں کو جہاں تک ان اخلاقی نجاستوں کا تعلق ہے' پاکیزگی اور ستھرائی کے اُس مقام پر پہنچا دیا جہاں تک باوجود علم و فضل' فہم و دانش کے بلند بانگ دعووں کے آج تک

نہ کوئی ٹمپرنس ایسوسی ایشن (اعتدال و احتیاط کی تبلیغ کرنے والی انجمن) پہنچا سکی ہے اور نہ قانونِ امتناع جاری کرنے والی کوئی حکومت(Prohibitionist)! سر ولیم میور اپنے نہیں' بیگانے ہیں' معتقد نہیں بلکہ منتقد ہیں' باوجود اس کے وہ لکھتے ہیں:

''اسلام فخر کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ ترکِ مے کشی کرانے میں جیسا وہ کامیاب ہوا ہے' کوئی اور مذہب نہیں ہوا ہے۔'' ("Life of Muhammad"... Sir William Muir, p. 521)

اُنیسویں صدی کے ربع آخر میں لندن میں چرچ کانگریس کے ایک اجلاس کے موقع پر ایک ممتاز پادری اسحٰق ٹیلر نے کہا تھا:

''دنیا میں انسدادِ مے نوشی کی سب سے بڑی انجمن خود اسلام ہے۔ برخلاف اس کے ہماری یورپین تجارت کے قدم جہاں جہاں پہنچتے جاتے ہیں' مے نوشی و بدکاری اور لوگوں کی اخلاقی پستی بڑھتی ہی جاتی ہے۔''

غالباً 1939ء میں ہندوستان میں متعدد صوبہ دار حکومتوں نے اپنے علاقوں میں شراب سے متعلق قانونِ امتناع نافذ کیا لیکن آخر میں وہ قانون واپس لیتے ہی بنی! محکمہ آبکاری کی لکھوکھا روپیہ کی آمدنی سے دستبردار ہو جانا کوئی آسان بات ہے! رہی قمار بازی' سو اس باب میں قانونِ اسلام سے باغی و منحرف ہو کر یورپ اپنے ہاتھوں جو حال کر رہا ہے' وہ عالم آشکار ہے۔ خودکشی اور اقدامِ خودکشی کے کتنے واقعات' مے نوشی اور قمار بازی ہی کا نتیجہ ہوتے ہیں! پھر مالی ابتری کا اندازہ اس سے کیجئے کہ یورپ کی پہلی جنگِ عظیم سے قبل اکیلے ملکِ انگلستان سے متعلق تخمینہ ہے کہ کم از کم دس کروڑ پونڈ سالانہ کی رقم اپنے مالکوں کے قبضہ سے نکل کر جواریوں کے ہاتھ میں پہنچتی رہتی ہے.(E ncyclopedia of Religion and Ethics, Vol. 6, p. 164) یہ تخمینہ یورپ کے صرف ایک ملک اور ایک چھوٹے سے رقبہ سے متعلق تھا اور وہ بھی پہلی جنگِ عظیم سے قبل کا! یورپ کے کل ملکوں (اور اس فہرست میں دنیائے اسلام کا مشہور ترین قمار خانہ مانٹی کارلو بھی شامل ہے) اور امریکہ کی ساری ولایتوں کی مجموعی تباہ کاریوں کے جدید ترین تخمینہ کے لئے تو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ حساب کے کن ہندسوں تک میزان پہنچے! رہیں قانونِ وقت کی ناکام کوششیں تو اسی انسائیکلوپیڈیا کے اسی مقالہ میں ہے: ''اس میں کمی پیدا کرنے کی اپنی والی سبھی کوششیں قانون کر رہا ہے بجز اُسے قطعی ممنوع کرنے کی ناممکن کوشش کے۔'' (صفحہ ۱۶۵) یہ حوصلہ اسلام ہی کا تھا کہ اُس نے ''عقلائے فرنگ'' کی اس ''ناممکن'' کوشش کو اپنے حدود میں ممکن ہی نہیں واقع کر کے دکھا دیا۔'' (ماجدی' ص ۸۷)

(A) نظام انہضام پر الکوحل کے اثرات : الکوحل کے مضر اثرات منہ ہی سے شروع ہو جاتے ہیں۔ ہمارے منہ وں میں بالعموم ایک خاص قسم کا فلورا ہوتا ہے جو خطرناک بیکٹیریا کے زندہ رہنے کو انتہائی مشکل بنا دیتا ہے۔ چونکہ الکوحل اس فلورا کے زائل ہونے کا سبب بنتا ہے' اس لئے اس کا نتیجہ مسوڑھوں کی جراثیم زدگی اور دیرینہ سوجن (Chronic Inflammation) میں نکلتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ الکوحل کے عادی لوگوں کے دانت جلد ہی گل جاتے ہیں۔''

''منہ کے بعد گلا اور معدے کی نالی (Esophagus) ہیں۔ یہ دونوں اعضاء ایک دوسرے کا تسلسل ہیں۔

وہ بڑے ہی مشکل کام سرانجام دیتے ہیں اور ان کی اندرونی سطح میں بہت ہی حساس قسم کا استر Mucous Membrane کے نام سے ہوتا ہے۔ الکوحل اس استر کے اندر کے حصّہ میں خراش پیدا کر کے اُسے کمزور کر دیتا ہے جس کا نتیجہ سرطان (کینسر) کے حملہ میں ہوتا ہے۔''

''الکوحل اُن دُہنیات (Lipids) کو تحلیل کر کے غائب کر دیتا ہے جو ہائیڈروکلورک ایسڈ کے خلاف حفاظتی حصار کا کام دیتے ہیں اور معدہ کو خود ہی اپنے آپ کو ہضم کرنے سے روکتے ہیں۔ الکوحل کے انتہائی مضر اثرات اثنا عشری آنت (Duodenum) پر پڑتے ہیں جو معدے کے نیچے چھوٹی آنت کا پہلا حصّہ ہوتا ہے اور جو انہضامی حصّے کا نازک عضو ہوتا ہے۔ الکوحل مجری صفرا (Bile) (یعنی وہ نالی جو صفرا کو جگر سے پتّے اور اثنا عشری آنت تک پہنچاتی ہے) کی ریزش کو تباہ کر ڈالتی ہے۔ الکوحل کے عادی تمام لوگوں کی اثنا عشری آنت اور پتّا (مرارہ) مریض ہوتے ہیں۔ چونکہ خلل اندازی آنتوں پر بھی اثر انداز ہوتی ہے اس لئے تمام نظام اور نظامِ انہضام کا کمپیوٹرائزڈ جمالیاتی تناسب مکمل طور پر تباہ ہو کے رہ جاتا ہے۔''

''الکوحل کا انتہائی سنگین اثر جگر پر پڑتا ہے۔ جگر ایک حساس تجربہ گاہ (لیبارٹری) ہے جس کے نزدیک الکوحل کا ہر انفرادی ذرّہ ایک زہر ہے۔ یہ منفی اثرات دو طرح کے ہوتے ہیں: اوّل تو یہ کہ جگر کے خلیے دوسرے فرائض سے غفلت برتتے ہوئے الکوحل کے اثرات کو ختم کرنے میں لگ جاتے ہیں اور دوم یہ کہ جگر کے کیمیائی طریقہائے عمل جو بہت ہی حساس ہوتے ہیں، الکوحل کی بلا روک ٹوک مداخلت کی وجہ سے ٹوٹ پھوٹ جاتے ہیں جس کے نتیجہ میں جگر کو اُسی طریقِ عمل کو کئی بار دہرانا پڑتا ہے اور اس انتہائی کوشش میں وہ تھک جاتا ہے۔ چونکہ خون بنانے کے عمل میں ضروری مواد کا پیدا کرنا جگر کا کام نہیں، اس لئے تمام عادی نشہ باز قلّتِ خون کے مریض ہوتے ہیں اگرچہ اُن کی شکل و شباہت تنومند ہو کیونکہ چہرے کے خون کی نالیاں پھیل جاتی ہیں اور گودے کی ہڈی تباہ ہو جاتی ہے۔''

(B) <u>دورانِ خون پر الکوحل کے اثرات</u>: جگر جو خون میں موجود چکنے غذائی اجزاء کو کام میں لانے کے عمل میں رہنما کردار ادا کرتا ہے، کے کمزور پڑ جانے سے خون کی نالیاں سخت ہو جاتی ہیں اور خونی دباؤ (B.P.) بڑھ جاتا ہے۔ اس بیماری کا نام Hypertension ہے۔ دوسری طرف الکوحل کا تیز بھڑکتا ہوا اثر خون کی روانی کے نظام میں مزاحم ہوتا ہے جس سے دل صحیح کام کرنے سے تھک جاتا ہے۔ علاوہ ازیں الکوحل چکنے مادّوں کو دل میں اکٹھا کرنے کا سبب بنتا ہے اور اعصابی نظام پر برے اثرات کی وجہ سے دل کے منصبی کام میں رکاوٹ ڈالتا ہے۔''

''گردے جنہیں دورانِ خون کا نقطۂ اختتام سمجھا جاتا ہے، کو بھی الکوحل سے بری طرح نقصان پہنچتا ہے۔''

''جسمِ انسانی کے انتہائی اہم نظام یعنی لمفی نظام (خلط مائی کے گزرنے کی رگوں کا جال) کو اور اس کے خون کی نالیوں کو الکوحل کے ہاتھوں زبردست نقصان پہنچتا ہے۔ اس نظام کی ساخت میں دُہنی (چکنے) مرکبات کو نمایاں مقام حاصل ہے۔ ان دُہنیات پر الکوحل کا نقصان دہ اثر اس حیران کن حفاظتی نظام کو تباہ کر ڈالتا ہے۔''

(C) اعصابی نظام پر الکوحل کے اثرات : الکوحل ذہنیاتی نظام کے برقی نظامِ ابلاغ میں خلل ڈالتا ہے جس کے نتیجے میں وہ اعصابی نظام کو دن بہ دن نقصان پہنچاتا رہتا ہے اور جس سے لگاتار بیماریوں کا سلسلہ بڑھتا رہتا ہے۔عام معلوم شدہ بیماریوں کے علاوہ الکوحل نظامِ اعصاب کے مختلف مراکز کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچاتا ہے۔نسیان کا مرض(Amnesia) اور ہاتھوں کا رعشہ اس نقصان کے پیش خیمہ (پیشرو) ہیں۔''

''چکنائی کو تحلیل کرنے والی خصوصیات کے ساتھ الکوحل تولیدی خلیوں میں بھی گھس جاتا ہے اور ناقابلِ بیان نقصان پہنچاتا ہے۔آئندہ نسلوں میں معذور یادداشت اور اعصابی ناقص خوراک (سوءتغذیہ) Muscular (Dystrophy (ایک مرض جس میں عضلات بتدریج سوکھنے لگتے ہیں) جانی پہچانی مثالیں ہیں۔بہت سی مطالعاتی تحقیقات اور مشاہدات اس حقیقت کی پردہ کشا ہیں کہ ذہنی ابتری کے مریضوں کے والدین الکوحل کے عادی تھے۔

(D) الکوحل کے نفسیاتی اثرات : اس بات کے کہنے کی ضرورت نہیں کہ سماجی نظام اور اس کے استحکام پر الکوحل کے کتنے ضرررساں اثرات پڑتے ہیں۔اس کے چند قابلِ ذکر منفی اثرات درجِ ذیل ہیں :

(۱) الکوحل کی وجہ سے طلاقوں کا نہ رکنے والا سلسلہ عائلی نظام کو تہ و بالا کر دیتا ہے' سماج سے الگ تھلگ اور بے لگاؤ بچوں کو جنم دیتا ہے اور اس طرح تمام معاشرہ کے ڈھانچہ کو ہلا کے رکھ دیتا ہے۔

(۲) الکوحل سے پیدا ہونے والی سستی اور کسلمندی مزدوروں کی نفری کو کم کرنے کے ساتھ ساتھ افرادِ معاشرہ کی فطری صلاحیتوں کو کھوکھلا کر دیتی ہے۔

(۳) افرادِ معاشرہ کے مابین عام پھیلی ہوئی بے رخی اور بے اعتنائی الکوحل کا قدرتی انجام ہے جس کے نتیجہ میں سماجی اتحاد' معاشرتی مسائل کے مقابل مدافعتی قوّت اور قومی متعلقات بالکل ختم ہو کے رہ جاتے ہیں۔

(۴) افرادِ معاشرہ کے مابین ختم نہ ہونے والے جھگڑے اور لڑائیاں اُس حساسیت کا نتیجہ ہوتے ہیں جو الکوحل کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔

درجِ بالا چاروں مسائل نے مغربی ماہرینِ عمرانیات کو اس حد تک پریشان کیا ہوا ہے کہ انہوں نے اپنی متعلقہ حکومتوں کو اپنے خدشات سے آگاہ کر دیا ہے کہ اگر الکوحل کا استعمال عام ہو گیا تو قومی شعور مفقود ہو کے رہ جائے گا۔

قرآن مجید نے اس مسئلہ کا خاتمہ کر دیا ہے جس سے کوئی معاشرہ اور کوئی مصلح نہیں نمٹ سکا اور اس طرح قرآن حکیم نے ہمارے معاشرہ کو اس لعنت سے ہر زمانہ میں بچایا ہے جو سماج کی جڑوں کو برابر کاٹتی رہتی ہے۔

''جب شراب کی حرمت کا حکم نازل ہوا تو گرم جوش مسلم پیروکاران اپنے گھروں میں گئے اور شراب کے تمام مٹکوں اور برتنوں کو خالی کر دیا اور بہت سے لوگوں نے تو اُن برتنوں کو توڑ دیا۔ وہ تاجر مسلمان جو ملکِ شام سے شراب کو بغرضِ تجارت مدینہ منوّرہ لائے تھے' اس حکمِ حرمت کے بعد شراب میں لگائے ہوئے اپنے سرمائے کو ضائع کرنے پر مجبور ہو گئے۔ اُن یتیموں سے بھی نرم رویّہ اختیار نہیں کیا گیا جن کے سرمائے کو اُن کے سرپرستوں نے شراب کی تجارت میں لگا رکھا تھا۔ یہ حرمت و ممانعت اس قدر سخت اور تاکیدی تھی کہ اس نظریہ کو جڑ سے کاٹ دیا گیا کہ شراب میں کوئی طبی قدر اور فائدہ بھی ہے۔'' ("Mohammad".. Margoliouth, p. 283)

اس ضمن میں ایک محقق نے خوب کہا ہے:

''الکوحل کے استعمال نے نوعِ انسان کو جس قدر عظیم آفت سے دوچار کیا ہے' کسی اور نے نہیں کیا۔ اگر تمام دنیا کے ہسپتالوں میں موجود اُن مریضوں کی شماریات کو اکٹھا کیا جائے جو الکوحل کی وجہ سے ذہنی ابتری' مخبوط الحواسی (ہذیان)' اعصابی خلل' انہضامی نالی کے امراض کا شکار ہوئے ہیں اور ان کے علاوہ خودکشی' قتل' دیوالیہ پن' جائدادوں کی فروخت اور الکوحل کے استعمال کی وجہ سے اجڑے گھر وغیرہ' غرض ایسے حالات کی تعداد اتنی حیرت انگیز ہے کہ اس کے مقابل مے نوشی کے خلاف تبلیغ اور پند و وعظ ناکافی معلوم ہوگا۔'' ("Al-Halaal wal Haraam fil Islam".. Yusuf Al-Qaradawi, p. 70)

''ہر مخمور کر دینے والی چیز حرام ہے: پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ''خَمر'' کے بارہ میں بیان کردہ تعریف میں اس قدر پھیلاؤ ہے کہ ہر وہ چیز جو عقل و دماغ کو ماؤف کر دے' حرام ہے خواہ اسے کوئی نام دیا جائے۔ مثلاً بیئر اور اس قسم کی تمام منشیات حرام ہیں۔ نبی مکرم ﷺ سے ایک مرتبہ کچھ اُن مشروبات کے بارے میں دریافت کیا گیا جو شہد' اناج اور جو سے خمیر اٹھائے جانے کے عمل سے تیار کئے جاتے ہیں یہاں تک کہ اُن میں الکوحل کی خاصیت پیدا ہو جاتی ہے تو آپ ﷺ نے مختصر اور جامع جواب دیا:

''ہر مخمور کر دینے والی چیز خَمر ہے اور ہر خَمر حرام ہے۔''

''بڑی مقدار میں مخمور کر دینے والی چیز تھوڑی مقدار میں بھی حرام ہے: خواہ چیز مقدار میں بڑی ہو یا کم' منشیات کی ممانعت میں اسلام کا موقف غیر مصالحانہ ہے۔ اگر اس راہ میں کسی آدمی کو ایک قدم اٹھانے کی اجازت دی جائے تو اس کے دوسرے قدم خود بخود اٹھتے چلے جائیں گے اور وہ چلتے چلتے دوڑنا شروع کر دے گا اور کسی بھی مرحلے میں نہیں رکے گا۔ اسی لئے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا:

''جس چیز کی بڑی مقدار نشہ آور ہو' اُس کی کم مقدار بھی حرام ہے۔'' (صحیح بخاری' صحیح مسلم)

''الکوحل کی تجارت: مقدار میں کم ہو یا زیادہ' نبی مکرم ﷺ الکوحل کے استعمال کی صرف ممانعت

ہی پر رک نہیں گئے بلکہ آپ نے اس کی غیر مسلمین سے بھی ہر قسم کی تجارت کی ممانعت فرما دی۔ مسلمان کو الکوحل اور اس کے متعلقات کی درآمد و برآمد کی اجازت نہیں' نہ ہی اس کا کارخانہ لگانے کی اور نہ ہی اُس جگہ کام کرنے کی اجازت ہے جہاں شراب فروخت ہوتی ہو۔ الکوحل کے ضمن میں نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے دس قسم کے لوگوں پر لعنت فرمائی:

''اللہ تعالیٰ نے فی الواقع خَمر پر لعنت فرمائی ہے' اس کے بنانے والے پر لعنت فرمائی ہے' جس کے لئے وہ بنائی گئی' اس کے پینے والے پر' اس کے پیش کرنے والے پر' اس کے اٹھانے والے پر' اُس پر جس کی خاطر اُسے اٹھایا جاتا ہے' اس کے فروخت کرنے والے پر' اُس پر جو اُس کی فروخت سے کماتا ہے' اُس کے خریدار پر اور اُس پر لعنت فرمائی ہے جس کی خاطر اُسے خرید کیا گیا۔'' (ترمذی' ابنِ ماجہ)

''چونکہ اسلامی طریقہ حرام کی طرف لے جانے والی تمام راہوں کو بند کر دیتا ہے' لہٰذا مسلمان کے لئے اُس شخص کے ہاتھ انگور فروخت کرنا بھی حرام ہے جس کے متعلق اُسے معلوم ہے کہ وہ اُن انگوروں سے ''خَمر'' یعنی شراب بنائے گا۔ ایک حدیثِ مبارکہ کا یہ مضمون ہے:

''اگر کوئی شخص فصل کاٹنے کے موسم میں انگوروں کا ذخیرہ کرتا ہے اس نیت سے کہ وہ انہیں کسی یہودی یا عیسائی یا کسی ایسے شخص کے ہاتھ فروخت کرے گا (اگرچہ وہ مسلمان ہی کیوں نہ ہو) جو خَمر بناتا ہے تو وہ اپنی کھلی آنکھوں کے ساتھ نارِ جہنم میں لپک جانے والا ہوگا۔'' (صحیح مسلم)

''<u>الکوحل رشراب کو تحفۃً نہیں دیا جاسکتا</u>: جس طرح مسلمان کے لئے الکوحل کی فروخت یا اس کی رقم لینا حرام ہے' اسی طرح اُسے کسی کو تحفہ میں دینا بھی حرام ہے خواہ لینے والا عیسائی یا یہودی دوست ہی کیوں نہ ہو۔ الکوحل اور اس سے بنی ہوئی اشیاء ایک مسلمان کی جانب سے تحفہ میں نہیں لی دی جاسکتیں کیونکہ مسلمان ایک پاک و صاف شخصیت ہے اور وہ پاک و صاف چیز ہی دیتا اور لیتا ہے۔

''روایت ہے کہ ایک شخص بارگاہِ نبوی میں شراب کا ایک خم بطورِ تحفہ لے کر حاضر ہوا۔ نبی علیہ السلام نے اُسے بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی ممانعت کر دی ہے۔ اس شخص نے پوچھا کہ کیا میں اسے فروخت نہ کر دوں؟ نبی علیہ السلام نے فرمایا کہ جس ذات نے اس کے پینے سے ممانعت کی ہے' اُس نے اس کے فروخت کرنے سے بھی روکا ہے۔ آدمی نے پھر پوچھا: کیا میں اسے کسی یہودی کو تحفۃً نہ دے دوں؟ آپ نے فرمایا کہ جس ذات نے اس کی ممانعت کی ہے' اُس نے اسے یہودی کو بھی بطور تحفہ دینے سے روکا ہے۔ آدمی نے پھر دریافت کیا کہ پھر میں اس کا کیا کروں؟ نبی علیہ السلام نے جواب دیا: اسے زمین پر انڈیل دو۔'' (مسند الحمیدی بحوالہ یوسف القرضاوی' ص ۴۷)

''<u>شراب کی محفلوں سے گریز</u>: اسی طرح مسلمان کو شراب کی محفلوں اور اُن اجتماعات میں شریک ہونے سے رکنے کا حکم دیا گیا ہے جہاں مے نوشی کی چھائی ہو۔ عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ انہوں نے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کو یہ فرماتے ہوئے سنا:

"جس شخص کا اللہ اور یوم آخرت پر ایمان ہو' اُسے اس نشست میں نہیں بیٹھنا چاہئے جہاں خَمر پیش کی جاتی ہو۔" (مسند احمد' ترمذی)

"ایک مسلمان کا یہ فرض ہے کہ وہ اُس بدی کو جڑ سے اکھیڑ دے جس کا وہ مشاہدہ کرے۔ اگر وہ ایسا نہیں کر سکتا تو اسے ایسی جگہ سے دُور ہو جانا چاہئے جہاں بدی کے کام ہوتے ہوں۔"

بیان کیا جاتا ہے کہ خلیفہ راشد حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ نہ صرف مے نوشوں کو بلکہ اُن کے ہم نشینوں کو بھی کوڑے لگواتے تھے اگرچہ وہ ہم نشین مے نوشی میں شریک نہیں ہوتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ کو شراب کی ایک محفل کی اطلاع دی گئی تو آپ نے اُن سب کو کوڑے لگائے جانے کا حکم دیا۔ آپ کو بتایا گیا کہ ایک روزے دار بھی اُن میں موجود ہے۔ آپ نے فرمایا: پہلے اُس سے کوڑے لگانا شروع کرو۔ کیا تم نے فرمودۂ الٰہی نہیں سنا:

وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ أَنْ إِذَا سَمِعْتُمْ آيٰتِ اللّٰهِ يُكْفَرُ بِهَا وَيُسْتَهْزَأُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖ إِنَّكُمْ إِذًا مِّثْلُهُمْ (النّسآء : ۱۴۰)

"اور اللہ تمہارے اوپر یہ (فرمان) کتاب میں ہی نازل کر چکا ہے کہ جب تم اللہ کی نشانیوں کے ساتھ کفر اور تمسخر ہوتا ہوا سنو تو اُن لوگوں کے ساتھ مت بیٹھو یہاں تک کہ وہ کسی اور بات میں مشغول ہو لیں کہ اس حالت میں یقیناً تم بھی اُنہی جیسے ہو جاؤ گے۔" (۴ : ۱۴۰)

"یہ مثلیت اور یکسانی نفسِ معصیت (گناہ) میں ہوگی ورنہ منکرین کا استہزاء ظاہر ہے کہ کفرِ اعتقادی سے پیدا ہوتا ہے اور اُن کے جلسوں' محفلوں میں مسلمانوں کی شرکت محض فسق ہی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ یہی مضمون سورۃ الانعام کی آیت ۶۷ میں بھی آیا ہے جو مکی سورۃ ہے جبکہ سورۃ النساء مدنی سورۃ ہے۔ یہ کفر اور تمسخر کرنے والے مکہ میں مشرکین تھے اور مدینہ منورہ میں یہود اور منافقین۔ آیت کا حکم عام ہے۔ بے دینی کا ہر مشغلہ' کفر و انکار کا مظاہرہ اس کے تحت میں آجاتا ہے۔ مسیحی یا ہندوانہ تعلیمی' تہذیبی' معاشرتی و سیاسی ماحول کے جو گہرے اثرات طبعی طور پر مسلمانوں پر پڑ رہے ہیں' وہ سب اس وعید کے تحت آجاتے ہیں۔ اپنے شعائر و اصولِ دین پر مضحکہ سنتے رہنا خواہ وہ سکولوں اور کالجوں میں ہو یا بازاروں اور میلوں میں یا تھیٹروں اور سینماؤں میں' یوں بھی بہر صورت بڑی بے غیرتی کی بات ہے۔ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖ فقہاء نے لکھا ہے کہ فاسقوں کی مجلس میں شرکت جس وقت وہ فسق میں مشغول نہ ہوں' جائز ہے مگر کراہت کے ساتھ۔" (تفسیر ماجدی اردو' صفحہ ۲۲۲' نوٹ: ۷۸۳)

"<u>الکوحل بذاتِ خود ایک بیماری ہے' دوا کا کام نہیں دے سکتی</u>": قرآن مجید اور احادیثِ مبارکہ کے درج بالا حوالہ جات سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اسلام الکوحل (شراب) کے خلاف جنگ کرنے اور مسلمان کو اس سے دور رکھنے میں خاصا مستعد ہے۔ اسلام نے مسلمان اور شراب کے درمیان کچھ رکاوٹیں کھڑی کر دی ہیں تاکہ مسلمان کے لئے کوئی تنگ یا فراخ رخنہ کھلا نہ رہے کہ جس سے وہ شراب کو استعمال کر سکے یا اُسے چھو سکے۔

۲۰۹۵ (صحتِ عامّہ---Hygiene)

کچھ لوگوں کی طرف سے الکوحل کو بطور دوا کے استعمال کرنے سے متعلق ایک سوال کیا جاتا ہے جس کا جواب دینا باقی ہے۔ جب ایک آدمی نے آپ ﷺ کو بتایا تھا کہ وہ شراب کو بطور دوا استعمال کرتا ہے تو آپ نے اس کا جواب یہ دیا تھا کہ شراب دوا نہیں بلکہ ایک بیماری ہے۔ (صحیح مسلم، مسند احمد، ابوداؤد، ترمذی)

آپ نے یہ بھی فرمایا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے بیماری کے ساتھ اس کا علاج بھی اتارا ہے اور ہر بیماری کا علاج موجود ہے۔ پس دوا لو لیکن کوئی حرام چیز بطور دوا کے نہ لو۔ (ابوداؤد)

نشہ آور چیزوں کی بابت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے اس چیز میں شفا نہیں رکھی جسے اُس نے تمہارے لئے ممنوع کر دیا ہے۔ لہٰذا اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں کہ اسلام الکوحل اور دوسری ممنوع چیزوں کو بطورِ دوا استعمال کرنے سے روکتا ہے۔ جیسا کہ ابن القیم نے بیان کیا کہ ممانعت کا مطلب اس چیز سے گریز کرنا اور ہر طرح اُس سے دُور رہنا ہے جبکہ اسے بطورِ دوا لینا اسے پسندیدہ بنا دیتا ہے اور اسے قریب کرنے کا تقاضا کرتا ہے جو شارع کے مقصد کے خلاف ہے۔ ابن القیم کہتے ہیں:

''اگر الکوحل کی بطور دوا اجازت دی جاتی تو یہ اجازت لوگوں کو اسے تفریح طبع اور لذت کوشی کے لئے پینے کا عذر مہیا کر دیتی بالخصوص جبکہ لوگوں کو یہ خیال ہو کہ اس کا استعمال اُن کی صحت کے لئے مفید ہے، اُن کی شکایتوں کو ہلکا کرتی ہے اور بیماریوں کا علاج کرتی ہے۔'' (''زاد المعاد''، جلد ۳، ص ص ۱۱۵، ۱۱۶ بحوالہ یوسف القرضاوی)

''یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ لی گئی دوا کے ساتھ مریض کا رویّہ شفا کے جلد ملنے یا بہ دیر ملنے پر خاصا اثر رکھتا ہے۔ ابن القیم جنہیں انسانی نفسیات پر خاصی مہارت تھی، اس نکتے کو مندرجہ ذیل انداز میں واضح کرتے ہیں:

''دوا کے مؤثر ہونے کی ایک شرط یہ ہے کہ مریض کو اس کے مؤثر ہونے کا یقین ہو اور یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اس میں شفا کی نعمت رکھ دی ہے۔ اب ایک مسلمان مریض کا یہ یقین کہ الکوحل جیسی چیز حرام ہے، اُسے فائدہ مند یا نعمت والی چیز ماننے سے روکتی ہے۔ اس طرح اُس کا اس پر کسی قسم کا یقین نہ ہوگا اور نہ ہی وہ اُسے موافق رائے سے لے گا۔ مسلمان کا عقیدہ جس قدر مضبوط ہوگا، اُسی قدر اُسے اس سے نفرت اور بے یقینی ہوگی۔ اس کے باوجود اگر وہ گریزاں اور بددل ہو کر اُس نفرت والی چیز کو لیتا ہے تو وہ اُس کے لئے علاج نہیں بلکہ بیماری بن جائے گی۔'' (ایضاً)

''ضرورت کی استثنائی صورت: ایسی صورتوں میں شریعت اسلامی کا حکم ناطق مختلف ہے۔ مثلاً ایک آدمی کی زندگی خطرے میں ہے اور الکوحل ملی دوا کے سوا کوئی نعم البدل نہیں، ایک مسلمان معالج کو جو اپنے میدان میں ماہر بھی ہے اور مذہبی احکام کے تحفظ میں گرم جوش بھی ہے، الکوحل ملی دوا کا نسخہ تجویز کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ چونکہ شریعت کا مقصد ہمیشہ انسانی فلاح و بہبود ہے، لہٰذا وہ ایسی صورت میں ایسی دوا لینے کی اجازت دیتی ہے۔ تاہم

اس بات کا خیال رہے کہ یہ رعایت دوا کی اس خصوصیت تک محدود ہے جس کا لینا ضروری ہے۔قرآن فرماتا ہے:

فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَإِنَّ رَبَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ O (الانعام: ۱۴۵)

''لیکن جو کوئی مجبور ہو جائے اور طالبِ لذت نہ ہو اور نہ وہ حد سے تجاوز کرے تو آپ کا رب بڑی مغفرت والا' بڑی ہی رحمت والا ہے۔'' (۶ : ۱۴۵)

''<u>نشہ آور ادویات (DRUGS)</u>: ''خمر وہ ہے جو دماغ کو لپیٹ میں لے لے۔'' منبرِ رسول ﷺ سے کہے ہوئے یہ الفاظ جناب عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے ہیں جن میں ہمیں خمر کی ممنوعہ قسم کا ایک فیصلہ کن معیار بتایا گیا ہے۔تو اب اس کے بعد کسی قسم کی شبہ اور تردّد کی ضرورت نہیں رہتی کہ ہر وہ چیز جو دماغ کے ماؤف ہو جانے اور لپیٹنے کا اثر رکھتی ہو جس سے خیالات' قوّتِ مشاہدہ اور فہمیدگی کی صلاحیتوں میں بگاڑ آتا ہو' اُسے اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول ﷺ نے تا قیامت ممنوع اور حرام قرار دیا ہے۔''

''بھنگ (Marijuna)' کوکین (Cocaine)' افیون (Opium) اور اس قسم کی دوسری منشیات کا شمار یقیناً خمر کے ممنوعہ زمرے میں آتا ہے۔یہ مسلّمہ حقیقت ہے کہ ایسی چیزوں کا استعمال حسّی قوّتِ مشاہدہ پر پڑتا ہے جس کے نتیجہ میں قریب کی چیز دُور اور دُور کی چیز قریب دکھائی دیتی ہے۔اُن کا استعمال اشتباہ (فریب نظری) (Illusion) اور واہمہ (Hallucination) پیدا کرتا ہے تاآنکہ حقیقی چیز غائب ہوتی نظر آتی ہے اور خیالی چیز حقیقی نظر آنے لگتی ہے۔ان ادویات (Drugs) کا استعمال بالعموم معقولیت اور فیصلہ سازی کی صلاحیت کو بگاڑ دیتا ہے۔ایسی ادویات احساسات کی اندرونی حقیقت اور زندگی اور مذہب کے خارجی حقائق سے فرار اختیار کرنے کے ذریعہ کے طور پر استعمال کی جاتی ہیں اور اُنہیں خیالی صورت گری اور تصوّراتی دائرہ میں پہنچا دیتی ہیں۔اس نفسیاتی حقیقت کے علاوہ کچھ مادّی (فطری) حقائق بھی ہیں یعنی جسمانی کاہلی' اعصاب کی بے کیفی اور اُکتاہٹ اور مجموعی صحت کی انحطاط پذیری۔اخلاقی نتائج' اخلاقی بے حسی' قوّتِ ارادی کی کمزوری اور ذمّہ داریوں سے غفلت جیسی قباحتیں جانی پہچانی ہیں۔ان باتوں کے نتیجہ میں اِن ادویات کا عادی معاشرے کا فردِ مریض بن کے رہ جاتا ہے۔علاوہ ازیں ان ادویات کے استعمال کا نتیجہ خاندان کی تباہی یا جرائم کی زندگی میں بھی نکل سکتا ہے اور چونکہ یہ ادویات خاصی خطیر رقم کی ہوتی ہیں لہٰذا اُن کا عادی شخص ان کی خرید کے لئے اپنے کنبہ کو اُن کی ضروریاتِ حیات سے محروم رکھ سکتا ہے اور اُن کی رقم کی ادائی کے لئے ناجائز ذرائع استعمال کر سکتا ہے۔''

''مسلمان فقہاء کا اپنے زمانہ میں پائی جانے والی ایسی نشہ آور ادویات کی ممانعت پر باہم اتفاق رہا ہے۔شیخ الاسلام ابن تیمیہ کہتے ہیں:

''یہ ٹھوس نباتات (حشیش) حرام ہے خواہ وہ نشہ آور ہو یا نہ ہو۔معصیت پیشہ لوگ اس کے کش بھی لیتے ہیں کیونکہ اس میں اُنہیں سرور اور لذّت ملتی ہے اور جس کا اثر مے نوشی کی طرح کا ہوتا ہے۔جبکہ شراب شرابی کو چست اور جھگڑالو بنا دیتی ہے' حشیش اکتاہٹ اور سستی پیدا کرتی ہے۔ علاوہ ازیں حشیش کے

کش لینا دماغ اور مزاج میں خلل انداز ہوتا ہے' وہ جنسی خواہش کو ابھارتا ہے اور بے حیائی کی حد تک ہرجائی پن کی طرف لے جاتا ہے اور یہ برائیاں شراب نوشی کی برائیوں سے کہیں بڑھ کر ہیں ۔لوگوں میں اس کا استعمال تاتاریوں کی آمد کے بعد پھیلا ہے ۔حشیش کے کش لینے کی ''حد'' کی سزا خواہ حشیش کم مقدار میں ہو یا زیادہ مقدار میں' بالکل وہی ہے جو شراب نوشی کی ہے یعنی اَسی یا چالیس دِرّے ۔''

ابن تیمیہ نے حشیش کے کش لینے کی ''حد'' کی سزا کے نفاذ کو درج ذیل انداز میں بیان کیا ہے :۔

''شریعتِ اسلامی کا یہ اصول ہے کہ مے نوشی اور ناجائز جنسی تعلقات کی طرح کوئی بھی ممنوعہ چیز جسے لوگ تو چاہتے ہوں لیکن شریعت میں اس کی ممانعت ہو' اس کے ارتکاب سے ''حد'' ☆ کی سزا کا نفاذ ہوتا ہے جبکہ کسی ایسی ممنوعہ چیز کی خلاف ورزی پر جسے پسند نہیں کیا جاتا (جیسے مردہ جانور کا گوشت کھانا) ''تعزیر'' کا اطلاق ہوتا ہے ۔اب چونکہ حشیش لوگوں کی پسندیدہ چیز ہے' اس لئے اس کے عادی کے لئے اس کا چھوڑنا مشکل ہوتا ہے ۔اسی طرح قرآنی آیات اور سنتِ مبارکہ کا حشیش پر اطلاق مے نوشی کے اطلاق کی طرح ہے ۔'' (فتاویٰ ابن تیمیہ' جلد ۴' ص ۲۶۲ بحوالہ ''الحلال والحرام'' یوسف القرضاوی ص ص ۷۷' ۷۸)

''مضر اشیاء کا استعمال حرام ہے: شریعتِ اسلامی کا عمومی اصول یہ ہے کہ مسلمان کے لئے اُس چیز کا کھانا پینا حرام ہے جو اُس کی جلد یا بتدریج موت کا سبب بنے جیسے زہر یا وہ اشیاء جو صحت یا اُس کے جسم کے لئے مضر ہوں ۔اگر ایسی چیزوں کی کم مقدار کسی مرض کا سبب بنتی ہے تو ایسی چیزوں کی زیادہ مقدار کا کھانا پینا بھی حرام ہے ۔ کیونکہ مسلمان اپنی ذات کا کلی طور پر خود مالک نہیں ہے' وہ اپنے مذہب' اپنی ملت (اُمّتِ مسلمہ) کا اثاثہ بھی ہے ۔ اُس کی زندگی' صحت اور اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے اُس پر عطا کردہ نعمتیں اُس کے پاس ایک امانت ہیں جنہیں کم کرنے یا ضائع کرنے کی اُسے اجازت نہیں دی گئی ۔رب تعالیٰ فرماتا ہے:

(۱) وَلَا تُلْقُوْا بِأَيْدِيْكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ وَأَحْسِنُوْا (البقرة : ۱۹۵)

''اور اپنے کو اپنے ہاتھوں ہلاکت میں مت ڈالو اور اچھے کام کرتے رہو ۔'' (۲ : ۱۹۵)

(۲) وَلَا تَقْتُلُوْا أَنْفُسَكُمْ إِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا○ (النّسآء : ۲۹)

''اور اپنی جانوں کو قتل مت کرو' بے شک اللہ تمہارے حق میں بڑا مہربان ہے ۔'' (۴ : ۲۹)

اور پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا :

لَا ضَرَرَ وَلَا ضِرَار (''نہ ہی اپنے آپ کو اور نہ ہی دوسروں کو کوئی تکلیف دو'')

اس اصول کے اطلاق کے طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ تمباکو کا استعمال صحت کے لئے مضر ہے ۔یہ حرام ہے بالخصوص اُس شخص کے لئے جس کے معالج نے اُسے تمباکو نوشی سے ممانعت کر دی ہو ۔اگر یہ

☆ ''حد'' اور ''تعزیر'' کی تعریفات کے لئے ملاحظہ ہو' اسی انسائیکلوپیڈیا کی جلد دوم کے صفحہ ۵۹۳ کا ذیلی نوٹ ۔

صحت کے لئے مضر نہ بھی ہو تو بہر حال رقم کا ضیاع تو ہے جسے نہ تو کسی دینی مقصد اور نہ ہی کسی دنیاوی مقصد کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ معاملہ اُس وقت اور زیادہ سنجیدہ ہو جاتا ہے جب اپنی اور اپنے کنبے کے لئے رقم کی ضرورت ہوتی ہے۔'' (یوسف القرضاوی' صفحات ۷۸'۷۹)

الکوحل اور قمار بازی (جوئے) کے مضر اثرات پر مستند شہادتیں

(۱) ''الکوحل کے استعمال اور جرائم کے مابین رشتہ جانا پہچانا ہے۔ بیئر' گوریلا' گلاوِنڈیز اور سشارٹ کی شماریات بتاتی ہیں کہ پچیس سے پچاسی فیصد جرائم پیشہ افراد نشہ خور ہوتے ہیں۔'' (The Jewish Encyclopaedia, Vol. 1, p. 333)

(۲) ''حد سے زیادہ نشہ خوری اور اخلاقی وریاستی قوانین شکنی کے مابین گہرے تعلق کی کافی شہادتیں موجود ہیں۔ یہ ذہن اور اخلاق کی اعلیٰ وارفع صلاحیتوں کے مفلوج ہونے کا براہِ راست نتیجہ ہے جس میں سفلی خواہشات کو گُل کھلانے کی کھلی چھٹی مل جاتی ہے۔'' (Hastings' Encyclopaedia of Religion and Ethics, Vol. 1, p. 301)

(۳) ''الکوحل کا تعلق زہریلے کیمیائی عمل سے ہے۔ عملی تغذیہ میں اس کی نظریاتی غذائی قدر کا کوئی فائدہ نہیں اور نہ ہی یہ جسم و دماغ میں چستی' توانائی پیدا کرنے والا ہے۔ متوازن خوراکوں میں یہ تسکین بخش ہے لیکن اس کا حد سے زیادہ استعمال زہریلے اثرات کا حامل ہے۔ عضویاتی طور پر اس کا استعمال غیر صحتمند' اقتصادی طور پر اس کا استعمال تباہ کن' معاشرتی طور پر اختلال انگیز اور مادّی طور پر اس کا استعمال زہریلا ہے۔'' ("Alcohol:Its Use and Misuse"... Dastur, pp. 108, 109)

(۴) ''الکوحل کا انتہائی مفید شعبہِ عمل صنعتی میدان میں بطورِ محلل (Solvent) کے ہے۔ اس کے علاوہ خارجی استعمال میں بھی اس کے کچھ فوائد ہیں۔'' (ایضاً' صفحہ ۱۰۹)

(۵) ''قمار بازی دوسری تجاوزات (زیادتیوں) کی طرف لے جاتی ہے۔ آسانی سے حاصل شدہ رقم میں معمولی سا فائدہ ہوتا ہے۔ جیتنے والے کی کیفیتِ مزاج (Mood) خوشی کی ہوتی ہے جبکہ ہارنے والا اپنی پریشانی سے نکلنے کے ذرائع ڈھونڈتا پھرتا ہے اور اس طرح وہ اپنے رنج والم کو مٹانے کے لئے مے نوشی اور عورتوں کا سہارا لیتا ہے۔'' (گمنام)

(۶) ''بھاری شرطیں لگانے کے نتیجہ میں خودکشی گیارھویں صدی کے انگلستان کے غیر معمولی زمانہ میں عام تھی اور بے پناہ فضول خرچی نوجوانوں تک محدود نہ تھی کیونکہ پرانے جوئے باز پکے جواری تھے اور وقت کے انجام

سے بے پرواتھے۔سنجیدہ ومتین سیاستدان نوعمرلڑکوں کی طرح جوئے بازی میں بڑی بُری طرح اور بھاری طور پر ہار جاتے تھے اور یہ عیّار و مکار بیماری عورتوں تک پھیل گئی تھی۔۔۔۔زنانہ جوئے بازوں میں سب سے بڑا المیہ یہ تھا کہ اُن میں سے بیشتر اپنی عصمت و آبرو کو بیچے بغیر قرضوں کو نہیں چکا سکتی تھیں۔'' (Hammerton's Encyclopaedia of Modern Knowledge, Vol. V, p. 2386 : New York)

(۷) ''وسیع پیمانے پر قمار بازی کے تباہ کن نتائج اس قدر واضح ہیں کہ اُن پر بات کرنا طول کلامی کا موجب ہوگا۔یورپی معلمینِ اخلاق کے نزدیک بھی جوئے بازی اُس ڈکیتی سے کم نہیں جو باہمی اتفاق سے کی جاتی ہے۔'' (Hastings' Encyclopaedia of Religion and Ethics, Vol. VI, p. 166)

(۸) ''داؤ پر لگانے والی رقم کی بے ربطگیوں کے پہلو بہ پہلو اخبارات نے اُن لوگوں پر اس کے المناک نتائج کو ریکارڈ کیا ہے جو جوئے بازی کی کشش اور جاذبیت کا شکار ہو جاتے ہیں۔96-1895 تا 07-1906 کے تیرہ سالہ عرصہ میں انگلستان میں اس سبب سے ۱۵۶ خودکشیاں یا خودکشیوں کی کوششیں ہوئیں' ۱۹۷ مقدمات چوری یا غبن کے اور ۴۴۲ مقدمات دیوالیہ پن کے درج ہوئے۔'' (ایضاً' صفحہ ۱۶۸)

(۹) ''جنسی عمل بالعموم قمار بازی سے جُڑا ہوتا ہے جس طرح کہ کوئی چیز اونچی سطح کے اعصابی اشتعال انگیزی کی طرف مائل کرے۔'' (ایک جرمن تحریر نگار)

اسلام کے پکے اور عادی دشمن آکسفورڈ کے D.S. Margoliouth کو مجبوراً یہ ماننا پڑا کہ ملکِ عرب میں قمار بازی کی مکمل منسوخی اور اس کا اختتام پیغمبر علیہ السلام کی انتہائی محترم اور باشرف اصلاح تھی۔(انسائیکلوپیڈیا بری ٹینیکا' جلد ۱۷' صفحہ ۴۰۷)

اور Rev. Canon Isaac Taylor لکھتے ہیں :

''سب سے بڑھ کر یہ کہ پورے عالم میں اسلام ہی انتہائی طاقتور اور منشیات سے پرہیز کی ایک انجمن ہے جبکہ یورپی تجارت کی توسیع کا مطلب مے نوشی' بدی اور لوگوں کی تذلیل کو وسعت دینا ہے۔''

<u>خنزیر اور مردار کی ممانعت کے پس پردہ حفظانِ صحت کی وجوہات</u>: قرآن مجید نے ایک سے زائد مرتبہ یہ حکم فرمایا ہے :

إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيرِ وَمَآ أُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ (البقرۃ: ۱۷۳)

''اُس نے تم پر تو بس مُردار اور خون اور سوٗر کا گوشت اور جو (جانور) غیراللہ کے نام پر ذبح کیا گیا ہو' حرام کیا ہے۔'' (۲:۱۷۳)

قادرِ مطلق خلاقِ عالم اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے اعمال وافعال میں مختارِ کل ہستی ہے اور اپنے احکامات کے پس پردہ وجوہات کے لئے وہ کسی کے آگے جوابدہ نہیں ہے اور یہ احکامات نوعِ انسانی کے مفاد میں ہیں۔ اُن کی وسیع افادیت پر مسلمان کا پختہ اور غیر متزلزل ایمان ہے۔ لیکن ہر حکمِ الٰہی کے پس پردہ کچھ معقول اور مُسکت (خاموش کر دینے والے) سائنسی، طبّی اور منطقی دلائل ہوتے ہیں جن کا معلوم ہونا ایک متشکک اور نہ ماننے والے ذہن میں بھی ایمان واعتقاد کی چنگاری سلگانے کے لئے کافی ہے۔ وہ وجوہ حسبِ ذیل ہیں:۔

''بے جان اور مُردہ جانور یا پرندے کا گوشت کھانے کی ممانعت ہوئی ہے۔ اس ممانعت میں حلال مُردہ جانور اور پرندے بھی شامل ہیں۔ اگر کوئی جانور اپنی طبعی موت مرجائے تو اس کی موت کی وجہ جاننا مشکل ہے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ کسی زہر یا زہریلے اثرات یا کالے پھوڑے (Anthrax) جیسی چھوت کی بیماری کی وجہ سے مرا ہو۔ ایسے جانور کا گوشت کھانا صحت کے لئے مفید نہ ہوگا۔ جانور کا کالا پھوڑا ایک متعدی بیماری ہے اور کالے پھوڑے سے مرا ہوا جانور خطرناک ہوتا ہے جو انسان میں جان لیوا جراثیم زدگی کا سبب بنتا ہے۔''

''ممانعت کے خون سے مراد گردش کرنے والا اور بہتا ہوا خون ہے جو ذبح کے دوران شہ رگ کٹنے سے باہر نکلتا ہے جسے قرآن مجید نے سورۃ الانعام کی آیت ۱۴۵ میں دَم مَسۡفُوح (بہتا ہوا خون) کہا ہے۔ یہ گردشی اور بہتا ہوا خون سمّیاتی (زہریلے)' تحوّلی (Metabolic) پیداوار (یعنی زندہ نامیوں کے اندر ہونے والے تمام کیمیائی عمل جس سے توانائی پیدا ہوتی ہے) اور مرض پیدا کرنے والے سمّیاتی وائرس کو شامل ہوتا ہے۔ اگر یہ اشیاء کھانے میں ہوں تو صحت کے لئے مضر ہوتی ہیں۔ علاوہ ازیں یہ یقین کرنا معقول معلوم ہوتا ہے کہ بہتے ہوئے خون کو اس کے مضر اجزاء سمیت کھانے سے دُور کردینا گوشت کو زیادہ صحت بخش اور مفیدِ صحت بنا دیتا ہے۔ اعضاء کے اندر رہ جانے والے خون کی اسلام میں ممانعت نہیں ہے۔''

<u>خنزیر کا گوشت</u> : ملاحظہ ہوں اسی انسائیکلو پیڈیا (حصہ اردو) کی جلد چہارم کے صفحات ۱۵۳۹، ۱۵۴۰۔

(ب) <u>ہائی جین کے مذہبی پہلو</u>

(الف) <u>وضو۔۔۔صحتمند زندگی کا بہترین ضمانت نامہ</u> : نماز کے لئے وضو کا ہونا بنیادی شرط ہے جیسا کہ سورۃ المائدۃ کی اس آیت میں اس کا حکم ہوا :

يَٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوٓا إِذَا قُمۡتُمۡ إِلَى الصَّلَوٰةِ فَاغۡسِلُوا وُجُوهَكُمۡ وَأَيۡدِيَكُمۡ إِلَى الۡمَرَافِقِ وَامۡسَحُوا بِرُءُوسِكُمۡ وَأَرۡجُلَكُمۡ إِلَى الۡكَعۡبَيۡنِ وَإِن كُنتُمۡ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوا (المائدۃ : ٦)

''مؤمنو! جب تم نماز کو اٹھو تو اپنے چہروں اور اپنے ہاتھوں کو کہنیوں سمیت دھولیا کرو اور اپنے سروں پر مسح کرلیا کرو اور اپنے پیروں کو ٹخنوں سمیت دھولیا کرو اور اگر تم حالتِ جنابت میں ہو تو (سارا جسم) خوب پاک وصاف کرلیا کرو۔'' (٥ : ٦)

''(i) وضو کا حفظانِ صحت سے متعلق پہلو (Sanitary Aspect of Ablution): دراصل وضو ایک طبّی کرشمہ ہے۔ ایک غیر مذہبی شخص کہہ سکتا ہے کہ میں اپنا چہرہ اور ہاتھ روزانہ دھوتا ہوں۔ لیکن اس عادت کے پیچھے نہ تو کوئی الٰہی رضامندی یا اجازت (Divine Sanction) ہے اور نہ ہی وضو کے ساتھ اس کی کوئی مماثلت ہے۔ اس بات کو نہیں بھولنا چاہیے کہ طبّی تجویز پر مبنی صفائی عبادت کی سخت تنظیم کی طرح دائمی اور فائدہ مند نہیں ہوسکتی۔''

''(ii) وضو کا جمالیاتی پہلو: آج آدمی کو خوبصورت بنانے پر لاکھوں روپے خرچ کیے جا رہے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ اس ضمن میں کئی گنا اخراجات بھی وضو کے مقصد کو حاصل نہیں کر سکتے اور وضو کا نعم البدل نہیں ہو سکتے۔ وضو کے مستقل عادی شخص کی صحت اور شکل و شباہت خوش منظر ہوتے ہیں۔ ہمارا روزمرّہ کا مشاہدہ بتاتا ہے کہ باقاعدہ وضو سے شاداب و تابناک شکل و شباہت بنتی ہے اور وضو کا یہ پہلو ہمارے جسموں کی ساکت و جامد غیر فعّال برقیات سے متعلق ہے جیسا کہ نیچے دیا جا رہا ہے۔''

''(iii) وضو اور ہمارے جسموں کی ساکت و جامد غیر فعّال برق: ہمارے جسموں کو بالعموم ساکت و جامد برق کا توازن حاصل ہے اور ایک صحتمند جسم کے فعلیات کا اس برقی توازن کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔''

''فضائی کیفیات، لباس کا معیار، اور غیر معیاری خوراک آج کے دَور کا سنجیدہ مسئلہ ہیں جو سب کے سب اس برقی توازن پر نقصان دہ اثر ڈالتے ہیں۔ لاعلاج اور تکلیف دہ امراض، حسّاسیت اور چہرے کی جھریاں اس کے نمایاں نتائج ہیں۔ کار سے اترتے ہوئے یا پلاسٹک کی کرسی پر بیٹھے ہوئے ہم میں سے کچھ لوگ اس برق سے آگاہ ہو سکتے ہیں۔ کچھ صورتوں میں Acupuncture (یعنی جلد یا رگوں میں سوئیاں چبھونے کے ذریعے امراض کا علاج) یا جسمانی ورزشیں اور مالشیں ساکت و جامد برق کے عدمِ توازن کو درست کر دیتے ہیں لیکن اس عدمِ توازن سے بچنے کا بہترین نسخہ روزانہ کئی بار وضو کرنا ہے جس سے نفسی دباؤ سے پیدا ہونے والی اور بڑھاپے کی کئی بیماریوں سے بھی بچا جا سکتا ہے۔''

''ساکت و جامد برقی عدمِ توازن کا بدترین اثر زیرِ جلدی چھوٹے چھوٹے اعصاب دراعصاب پر پڑتا ہے جس سے وہ بالآخر کام کرنا چھوڑ دیتے ہیں جس کے نتیجہ میں وقت سے پہلے چہرے پر جھریاں نمودار ہونا شروع ہو جاتی ہیں اور اس کا اثر پورے جسم پر بھی ہونا ممکن ہے۔ باقاعدہ وضو شکل و شباہت کو تاباں اور رخساروں کو گلابی بنا دیتا ہے۔''

''(IV) وضو کا دورانِ خون کے نظام پر اثر: دورانِ خون کا ہمارا نظام دو حیاتیاتی اصولوں پر مبنی ہے۔ اُن میں سے پہلا اصول دل کا جسم کے ہر حصّے کو اور بالآخر خلیوں کو خون پہنچانا ہے۔ دوسرا اصول حیاتیاتی طور پر استعمال شدہ خون کے اجتماع کو واپس دل تک پہنچانا ہے۔ یہ دوسرا عمل بالخصوص جسم کے لئے بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اگر ایک مرتبہ یہ الٹی گردش خلل پذیر ہو جائے تو انبساطِ قلب☆ کا خونی دباؤ (Diastolic blood pressure) بڑھ جاتا ہے اور وقت سے پہلے بڑھاپے کا آنا تو کیا، قبل از وقت موت کا حملہ بھی ہو سکتا ہے۔

☆ دل کے دو بار سکڑنے کے درمیان کا وقفہ جبکہ دل سکون حاصل کرتا ہے اور خون اُس کے دونوں خانوں میں بھرتا ہے۔

''وضو پانی کے ساتھ کیا جاتا ہے اور اگر پانی میسر نہ ہو یا اُس کا استعمال مضر ہو تو خشک اور پاک وصاف مٹی یا ریت تیمّم میں استعمال کی جا سکتی ہے۔ خشک و صاف مٹی اور ریت پاک و صاف کرنے والے کارندے ہیں اور ہم پرندوں اور جانوروں کو انہیں استعمال کرتا ہوا دیکھتے ہیں۔''

''اس تمام بحث کے بعد ہم کچھ آگے بڑھتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ سورۃ المائدۃ کی مذکورہ آیت ۶ کا آخری حصّہ وَلٰكِنۡ يُّرِيۡدُ لِيُطَهِّرَكُمۡ وَلِيُتِمَّ نِعۡمَتَهٗ عَلَيۡكُمۡ لَعَلَّكُمۡ تَشۡكُرُوۡنَ (وہ تو یہ چاہتا ہے کہ تمہیں خوب پاک وصاف رکھے اور تم پر اپنی نعمت پوری کرے تا کہ تم شکر ادا کرو) کس حد تک نا قابلِ بیان آسائش اور روحانی مسرت کو اپنے اندر لئے ہوئے ہے۔ ہم اس الٰہی نعمت (یعنی دورانِ خون کی نعمت) کے مستحق تبھی ہوں گے اور اپنی مکمل جسمانی، ذہنی اور روحانی صحت سے تبھی مستفید ہوں گے اگر ہم دن میں پانچ مرتبہ وضو کرنے کا اپنے آپ کو عادی بنا لیں اور اس طرح اللہ تعالیٰ کی ہم پر کی گئی نعمت کا ہم شکر ادا کر سکیں گے۔''

''(V) وضو کا نظام مامونیت (Immune System) پر اثر (لمفی نظام): جسم میں خون کے سرخ خلیوں کی گردش کے علاوہ خون کے سفید خلیوں کی گردش بھی ہوتی ہے جسے Leucocytes کہتے ہیں۔ اس نظام کی نالیاں اُن نالیوں سے دس گنا پتلی ہوتی ہیں جو خون کے سرخ خلیوں کو چلاتی ہیں۔ چھوٹی چھوٹی خراشوں یا زخموں میں اس کا بے رنگا سیّال مادہ ڈھلان سے آہستہ آہستہ ٹپکتا ہوا دیکھا جا سکتا ہے۔ اب یہ لمفی گردش جسم کے تمام اعضاء کو نظامِ مامونیت کی حفاظت میں رکھتی ہے۔ لمفی گردش میں جسم پر حملہ آور ہونے والے جرثومے جنگ کرنے والے خلیوں Leucocytes کے ذریعے مار دئے جاتے ہیں۔''

''حرارت اور برودت (ٹھنڈک) اس لمفی نظام پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ عام سردی میں کسی چھوت کی بیماری کا لگ جانا اس وجہ سے ہوتا ہے کہ یہ نالیاں اپنے سکڑاؤ کی وجہ سے اس قابل نہیں ہوتیں کہ وہ Leucocytes کو متاثرہ حصّے کی طرف خاصی تعداد میں بھیجیں۔ اب اس نظام اور اس کی پتلی نالیوں کی صحیح کارکردگی جو بالعموم نظامِ دورانِ خون کی طرح ہے' کا براہِ راست تعلق وضو کے ہیجان خیز اثر سے ہے۔ نظامِ مامونیت کو جو تمام بیماریوں کے خلاف مدافعانہ حصار ہے' وضو کے ذریعے تقویّت ملتی ہے اور سورۃ المائدۃ کی آیت ششم کے آخری حصّے میں بیان کردہ نعمتِ الٰہی کی تکمیل ہو جاتی ہے۔''

''کوئی شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ اس لمفی نظام کی تقویت محض اتفاقی ہے اور اس کی ذیلی تاثیر (Side effect) کے پیچھے کوئی منصوبہ بندی نہیں ہے۔ مندرجہ ذیل وجوہ کی وجہ سے یہ نظریہ غلط ہے: (۱) لمفی نظام کو صحیح طور پر چلانے کے لئے جسم میں کسی ایک عضو کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہئے اور اس بات کو وضو کے ذریعے ہی یقینی بنایا جا سکتا ہے۔ (۲) لمفی نظام کی ہیجان خیزی کے لئے اہم مرکز وہ حصّہ ہے جو ناک اور گلے کی غدود (Tonsils) کے پیچھے ہے اور ان جگہوں کے بالخصوص دھونے کا حکم وضو کرنے میں آیا ہے۔ (۳) گردن کی دونوں اطراف کی ہیجان خیزی کا لمفی نظام پر بڑا اثر ہے جو صرف وضو ہی سے ہوتا ہے۔''

''درج بالا وجوہ کے مدّنظر کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ وضو کا لمفی نظام سے براہِ راست تعلق نہیں ہے۔ ایک مثال اس بات کو ثابت کرنے کے لئے کافی ہوگی کہ وضو کا کرنا جسم کی حفاظت میں کیسے روح پھونک دیتا ہے اور کس طرح نعمتِ الٰہی کا اِتمام ہوتا ہے۔''

''جسم کے انتہائی سخت جان جنگجو خلیے (یعنی Lymphocytes) جسم کے دُور دراز ترین حصّوں کو منتقل کئے جاتے ہیں اور ایک مکمل حیاتیاتی تربیت سے گزرنے کے بعد جسم کے ہر عضو میں روزانہ دس مرتبہ پہرہ داری کرتے ہیں۔ اگر اُن کا کسی جرثومہ (Bacterium) یا سرطان کے کسی خلیہ سے آمنا سامنا ہوتا ہے تو وہ اُسے فوراً ختم کر دیتے ہیں۔ کیا یہ حقیقت اوّل درجے کی نعمتِ الٰہی نہیں؟''

''اگر کسی وقت گردشی انتشار واقع ہو جائے اور ہم اپنے عادی وضو کے ذریعے اس سے بچ نکلنے کے قابل ہوں تو کیا یہ حقیقت سورۃ المائدہ کی آیت ششم کے آخری حصّے میں بیان کردہ نعمتِ الٰہی کی تکمیل نہیں ہے؟''

(ب) نمازِ پنجگانہ اور صحت: ''اسلام میں نماز میکانزم سے آزادی کی طرف خودی کا فرار ہے۔''
(ڈاکٹر محمد اقبال بحوالہ تفسیر ماجدی انگریزی' صفحہ ۸۹۔ اے' نوٹ: ۴۵۷)

آج ہر کہ و مہ باعثِ کوفت اور اعصاب شکن مسائل کے نہ رکنے والے تسلسل کی گرفت میں ہے اور نہیں معلوم کہ اُن سے نجات کی راہ کیا ہے۔ رحمان و رحیم خالق نے اِس کا حل اِن مشفق الفاظ میں عطا کیا ہے:

(۱) حَافِظُوا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قَانِتِيْنَ O (البقرۃ: ۲۳۸)
''نمازوں کی پابندی رکھو اور (خصوصاً) درمیانی نماز کی اور اللہ کے سامنے عاجزوں (کی طرح) کھڑے رہا کرو۔'' (۲۳۸ : ۲)

مفسرینِ قرآن نے واضح کیا ہے کہ درمیانی نماز سے مراد عصر کی نماز ہے۔ لیکن شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر کئی صوفیائے کرام نے اس سے مراد صَلوٰۃُ القَلب (دل کی نماز) لی ہے جو جسمانی کی بجائے روحانی ہوتی ہے۔ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس کے متعلق یوں فرمایا ہے:
''بنی آدم کا دل یقیناً اللہ کی دو انگلیوں کے درمیان ہے اور وہ جب بھی چاہے' اسے بدل دیتا ہے۔''

شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک دو انگلیوں سے مراد اللہ تعالیٰ کے دو اوصاف یعنی تباہ کرنے کی قوّت اور عطائے نعمت کی قوّت ہیں۔ اُس نعمت کے حصول اور قادرِ مطلق کے غضب سے بچنے کے لئے قوّتِ قلب کا قائم رکھنا اور اس کی حفاظت کرنا لازم ہے۔'' (Encyc. of Islamic Spirituality, Vol. 1, p. 111)

(۲) أَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ O (اَلرَّعد: ۲۸)

''خوب سن لو کہ اللہ کے ذکر سے دلوں کو اطمینان ہو ہی جاتا ہے۔'' (۲۸ : ۱۳)

ذکرِ الٰہی میں خاصیت ہی یہ ہے کہ یہ انسان کے دل کو غیر اللہ کی طرف متوجہ ہونے کے اُلجھاؤ سے بچاتا ہے اور شرک سے جو انتشارِ ذہنی پیدا ہوتا ہے' توحید کا یقین اس کے لئے سپر ہو جاتا ہے۔ البتہ اس اطمینان کے بھی مختلف درجے ہوتے ہیں۔ جس درجہ کا ذکرِ الٰہی ہوتا ہے' اُسی نسبت سے اطمینانِ قلب بھی حاصل ہوتا ہے۔ ذکرِ الٰہی کے آثار میں سے ایک اثر خوف وخشیت کا ہے جیسا کہ سورۃ الانفال کی آیت دوم میں فرمایا: اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ کہ ''جب مؤمنوں کے سامنے اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو اُن کے دل سہم جاتے ہیں۔''

(۳) وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا وَمِنْ آنَآءِ الَّيْلِ فَسَبِّحْ وَ أَطْرَافَ النَّهَارِ لَعَلَّكَ تَرْضٰى ○ (طٰهٰ : ۱۳۰)

''اور اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتے رہیے آفتاب کے طلوع سے قبل اور اس کے غروب سے قبل اور اوقاتِ شب میں بھی تسبیح کیجئے اور دن کے بھی اول وآخر میں تاکہ آپ خوش رہیں۔'' ☆ (۲۰:۱۳۰)

(۴) اُتْلُ مَا اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنَ الْكِتٰبِ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَصْنَعُوْنَ ○ (العنکبوت : ۴۵)

''(اے نبی معظم!) جو کتاب آپ پر وحی کی گئی ہے' اُس کی تلاوت کیا کیجئے اور نماز کی پابندی رکھئے' بے شک نماز بے حیائی اور ناشائستہ کاموں سے روکتی رہتی ہے اور اللہ کی یاد بہت بڑی چیز ہے اور اللہ تمہارے سب کاموں کو جانتا ہے۔'' (۴۵ : ۲۹)

اللہ کے یہی عالمِ کُل ہونے کا خیال ہی ہر مجاہدہ کو آسان بنا دینے اور قلب میں خوفِ خدا پیدا کر دینے کو کافی ہے۔ ذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ ذکرِ الٰہی ہی کی افضل ترین ومکمل ترین صورت نماز ہے۔ لَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَر کے یہ معنیٰ ہو سکتے ہیں: (۱) بڑائی تو بس اُسی کے ذکر کی ہے نہ کہ کسی اور کے ذکر کی (تفسیر کبیر) (۲) اللہ جو تمہیں یاد کرے گا' اُس کا مرتبہ اُس یاد سے بھی بڑھا ہوا ہے جو تم اُس کی کرتے رہتے ہو۔ (تفسیر قرطبی' معالم التنزیل)

''نماز کو محض جسمانی ورزش سمجھنا ایسے ہی مضحکہ خیز ہے جیسے یہ کہنا کہ کائنات میں سانس لینے کی ہوا (آکسیجن) کے سوا اور کچھ نہیں۔ قارئینِ کرام کو یہ بھی خیال نہیں کرنا چاہئے کہ نماز کے فوائد انہی چند صفحات تک محدود ہیں۔

مندرجہ بالا آیات میں شامل پیغام کا خلاصہ حسب ذیل ہے :

☆ یہاں پانچوں نمازوں کا ثبوت موجود ہے یعنی: (۱) طلوعِ آفتاب سے قبل کی نمازِ فجر (۲) غروبِ آفتاب سے قبل کی نمازیں (نمازِ ظہر اور نمازِ عصر) (۳) اوقاتِ شب کی نمازیں یعنی مغرب اور عشاء کی نمازیں۔ أَطْرَافَ النَّهَار سے نمازِ فجر ومغرب کی مکرر تاکید ہوگئی۔ اس طرح یہ کل پانچ نمازیں ہوئیں۔

(۱) نماز پڑھنے سے نمازی کو راحت و آرام ملتا ہے اور غم واندوہ سے تسکین ملتی ہے۔
(۲) نمازی برائیوں' بے راہروی اور بداخلاقی سے بچ جاتا ہے۔

مُلحدانہ اور مادّہ پرستانہ فلسفوں کے زیرِ اثر ہمارے زمانہ کے تقریباً تمام لوگ مشینی زندگی کی گراریوں میں پھنس کے رہ گئے ہیں اور اُن میں سے بیشتر لوگ ذہنی سکون سے محروم ہیں جس کے نتیجہ میں بے کیفی اور اضطراب اُن میں عام پایا جاتا ہے۔ ان بدنصیب لوگوں کے بارے میں ذیل کے مشاہدات سامنے آئے ہیں:۔

''(۱) نفسی دباؤ(Psychosomatic) کی بیماریاں اُنہیں اپنی گرفت میں لے لیتی ہیں۔ تفکّرات کی وجہ سے دُرافرازی نظام(Endocrine System) پر ہونے والے مضر اثرات معدہ کے اُلسر (ناسور)' قلب اور شریانوں کے امراض اور متعدد انہضامی بے نظمیوں کو جنم دیتے ہیں۔ ذہنی تناؤ اور اذیت کا کردار ہمارے زمانے کے المیہ یعنی سرطان میں واضح ہے۔ اشرف المخلوقات کی اکثریت محض ذہنی بوکھلاہٹ کی وجہ سے مادّی امراض کے رحم و کرم پر رہ رہی ہے۔''

''(۲) ذہنی اختلال ر بوکھلاہٹ نے نوعِ انسان کے پانچویں حصّے کو منشیات و مخدّرات کا عادی کر دیا ہے۔''

''(۳) ترقی یافتہ ممالک کا حال تو یہ ہے کہ وہاں ہر شخص اپنی جیب میں ''سن شائن گولیاں'' لئے پھرتا ہے جو سکون بخش زہروں سے کم ضرر رساں سمجھی جاتی ہیں۔''

''(۴) مغرب میں تالیف شدہ شماریاتی معلومہ مواد(Statistical Data) سے ظاہر ہوتا ہے کہ نوجوان نسل کا تیس فیصد حصّہ ذہنی عدمِ استحکام کے دہانے پر ہے۔''

''سب سے زیادہ دل شکن بات اُن مشرقی معاشروں کی ہے جو ظلم و تشدد کی زندگی گزار رہے ہیں اور اُن پسماندہ ممالک کی ہے جو قحط سالی کا شکار ہو گئے ہیں۔ قرآن ایسی ہی صورتِ حال کی بابت فرماتا ہے: اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ (۱۰۳:۱) کہ انسان یقیناً گھاٹے میں ہے۔''

''اس تمام تر دِقّت طلب صورتِ حال کے پیشِ نظر دونوں حکمِ ناطق: اُولٰٓئِكَ عَلٰی هُدًی مِّنْ رَّبِّهِمْ (یہی لوگ اپنے پروردگار کی طرف سے ہدایت پر ہیں) اور نماز میں نجات کی دعوت اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ قرآن مجید کے حیران کن معجزہ کی اس اعلان کے ساتھ تشکیل کر رہے ہیں: ''اے بنی نوعِ انسان! تم سراسر خسارے میں ہو اور بے چارے' خستہ حال ہو۔ اگر تم مصائب و آلام سے نجات چاہتے ہو اور اگر تم حقیقی خوشی اور روحانی رفعت کے متلاشی ہو تو یادِ الٰہی (نماز) کی طرف چلے آؤ۔''

''اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ ہم پر نماز کس قسم کی نجات نچھاور کرتی ہے۔ ہم اپنے خالق و مالک کے حضور کھڑے ہوتے ہیں اور اس سے یہ وعدہ کر رہے ہوتے ہیں کہ ہم دنیا کے تمام مشغلوں اور رنج و آلام کو پیچھے چھوڑ آئے ہیں اور کم از کم دس پندرہ منٹ تک تفکراتِ دنیوی سے دُور ہو جاتے ہیں۔ پھر ہم اُس کی حمد و ثنا اور عظمت و جلالت بیان کرنے کے بعد سورۃ الفاتحہ کی تلاوت کی طرف آتے ہیں جو ایک معجزاتی مرہم ہے اور جو ہماری داخلی دنیا کی تمام پریشانیوں کو بھاپ بن کر اُڑا دیتی ہے اور اس کی جگہ رجائیت و اُمید کی ایک نئی دنیا پیدا کر دیتی ہے۔ اسی لئے فاتِحہ کو سورۃ الشّفا بھی کہا گیا ہے۔ آدمی کتنے ہی پیچیدہ اور سنگین حالات کا شکار ہو' یہ سورت اُسے صراطِ مستقیم کو لے جاتی ہے اور اُسے اس عقیدے سے تسکین ملتی ہے کہ اُس کا خالق جس کے حضور وہ حاضر ہے' بہترین مددگار اور تمام تفکرات اور رنج و آلام سے نجات دینے والا ہے' لہٰذا وہ زندگی کے کٹھن لمحات میں اُسے تنہا و بے یار و مددگار نہیں چھوڑے گا۔ اُسے قنوطیت اور محرومی کی تکلیف دہ ٹیسوں سے نجات مل جاتی ہے اور اس طرح یہ سورت انسانی نفسیات کو ایک معجزاتی حقیقت و صداقت عطا کرتی ہے۔ تسکین و راحت بخش اِن لفاظِ ربّانی نے وہ کام کر دکھایا جو الکوحل اور منشیات نہ کر سکے بلکہ الکوحل تو اپنے پردے میں نا قابلِ بیان بیماریاں لانے کے ساتھ ساتھ رنج والم میں اضافے کا سبب بنتا ہے۔ سورۃ الفاتِحہ کی تلاوت کا عادی شخص جو اپنے خالق کے حضور روزانہ چالیس مرتبہ جھکتا ہے' کیسے کسی جسمانی بیماری کا شکار ہو سکتا ہے!''

''سورۃ الفاتحہ خلّاقِ عالَم کی رحم و کرم کے اوصاف کا احاطہ کرتی ہے اور اُس کے شکر گزار' وفادار بندے اُس کی جانب سے خاص قسم کی محبت' مہربانی اور گناہوں کی مغفرت پاتے ہیں۔ سیّارے اپنے محوروں کے گرد گردشی عمل کے ذریعے اُس کے حضور نذرانۂ شکر ادا کرتے ہیں۔ شکر کی یہ کیفیت ایٹموں اور چھوٹے چھوٹے ذرّات کی بھی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ جو کوئی یادِ الٰہی اور اُس کی حمد و ثنا سے دُور رہتا ہے' تباہی اور بربادی اُس کا مقدّر بن کے رہ جاتے ہیں۔ لہٰذا سورۃ الفاتِحہ کا دعویٰ سچا ہے کہ جب تک قوّت اور گرم خیزی منبعِ اصلی سے حاصل نہ کئے جائیں تو زندگی کی شادمانی اور مسرت کا تصوّر تک نہیں کیا جا سکتا۔''

''<u>نماز باجماعت</u> کی ادائی ہمارے ہر شعبۂ حیات میں باقاعدہ نظم و ضبط لاتی ہے جو اخلاقی کوتاہیوں اور اس قسم کی دوسری قباحتوں سے بچنے کے لئے ضروری ہے اور وضو کی عادت ہمیشہ مادّی اور روحانی قوّت و فرحت کا سبب بنتی ہے۔''

''نماز خدائی مُہر ہے جو انسان کی داخلی دنیا اور روح پر لگی ہوئی ہے اور ہم اس کا پہلا فوری اثر ذہنی سکون کی شکل میں پاتے ہیں۔ اگر ہم کچھ لوگوں میں اس کا اثر نہیں پاتے تو اس کی وجہ یہی ہوتی ہے کہ اُن کی نماز خلوص سے خالی محض دکھاوا اور ریاکاری ہوتی ہے۔ اب مادیت گزیدہ لوگ بھی اس بات کو تسلیم کرنے لگے ہیں کہ جوڑوں اور پٹھوں کی تسکین کے لئے نماز کے علاوہ کوئی اور نسخہ نہیں ہو سکتا۔ بدقسمتی سے وہ پردے کو ادھر سرکا نہیں سکتے کہ وہ اس نجات نامے کو دیکھیں جو آج سے چودہ صدیاں پہلے ہماری روحانی دنیا پر الٰہی نعمت نچھاور کی گئی اور اس طرح وہ ایمان و یقین کا حصول کریں۔ کیونکہ ایمان الٰہی راہنمائی کا معاملہ ہے اور اس کا مرکز ذہن میں نہیں بلکہ دل میں ہوتا ہے۔''

ڈاکٹر اے رشید سیال نے پُر اثر طور پر اور وضاحت کے ساتھ نماز کے ہر رکن کی حیثیت اور صحت پر اُس کے اثر کی نقشہ کشی ہے جس کا خلاصہ حسب ذیل ہے:۔

''اس بات کا خیال رکھنا انتہائی اہم ہے کہ نماز کے دوران کی تمام حرکات وسکنات متوازن اور معتدل ہونی چاہئیں اور ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف تبدیلی آہستہ اور فطری ہونی چاہئے جسے اصطلاحِ شریعت میں ''تعدیلِ ارکان'' کہا جاتا ہے۔نماز کی برکتوں اور نعمتوں سے بھرپور حظ اندوز ہونے کے لئے ہر رکن کو مناسب اور یکسانیت کا وقفہ دیا جانا چاہئے۔''

(۱) قیام میں آدمی نیت کرنے کے بعد اپنے ہاتھوں کو کھلی ہتھیلیوں کے ساتھ کانوں تک اٹھاتے ہوئے اللہ اکبر کہتا ہے اور اس طرح اللہ تبارک وتعالٰی کی عظمت وجلالت کا اعلان کرتا ہے۔پھر اٹھائے ہوئے ہاتھ واپس لائے جاتے ہیں۔نمازی سیدھا کھڑا ہوا ہے' اس کے جسم کا وزن بالکل ٹھیک طور سے دونوں ٹانگوں پر ہے اور اس کی نگاہ سجدہ گاہ پر ہے۔یہ پہلی کیفیت ہے جس کا نام ''قیام'' ہے۔

''سیدھا کھڑا ہونے کے اس انداز میں پیٹ کو دبوچ کر اور پیٹ کے عضلاتی نظام کو مضبوطی سے کس کر اندر کی طرف لے جایئے۔اگر آپ اس ورزش کو کرتے رہیں تو آپ توندل نہیں رہیں گے یعنی آپ کا پیٹ آگے کو بڑھا ہوا نہیں رہے گا۔اگر چہ مذہبی لحاظ سے یہ فرض نہیں ہے لیکن بہ حیثیت ڈاکٹر کے میں نے اسے بہت مفید پایا ہے۔''

''جب آپ قرآنِ حکیم کی مقدس آیات کی اس تابندگی کو ذہن میں رکھتے ہوئے تلاوت کرتے ہیں کہ یہ الفاظ قادرِ مطلق کی جانب سے امام الملائکہ جناب جبریل علیہ السلام کے ذریعے پیغمبر ﷺ پر نازل کئے گئے تو تفکر کا یہ اثر جسم کے مختلف نظاموں پر پڑتا ہے۔یہی خیال آرام وسکون' طمانیتِ ذہنی اور شانتی کا احساس دلاتا ہے اور دماغ سے نکلنے والے عصبی مرسلوں (Endorphins) کا سبب بنتا ہے۔آپ ران' پنڈلی اور پچھلے اعصاب کے سکیڑنے اور پھیلانے کی مشق مترنم طریق سے کر سکتے ہیں۔رات کے آخری حصے میں نمازِ تہجد اور رمضان المبارک میں تراویح جیسی لمبی نمازوں کے مختلف نظاموں پر صحتمند لبھانے والے اثرات واقعی گہرے ہوتے ہیں۔''

''قیام کا مختلف جسمانی نظاموں پر اثر: چونکہ جسمانی وزن دو ٹانگوں پر بلا مزاحمت تقسیم ہو جاتا ہے' اس لئے جسم اور ذہن راحت محسوس کرتے ہیں۔

''پشتنی ہڈی سیدھی ہو جاتی ہے۔

''عملِ تنفس قدرتی اور قوت بخش ہو جاتا ہے۔

''استغراق (فکرمندی) کی تنظیم اور ذہن کی عمیق توجہ آسان ہو جاتے ہیں کیونکہ نگاہ سجدہ گاہ پر مرکوز ہوتی ہے۔

(۲) قیام کے بعد دوسرا رکن ''رکوع'' ہے جس میں جھکنا ہوتا ہے اور ہتھیلیاں مضبوطی کے ساتھ گھٹنوں پر رکھ کر انگلیاں کھلی چھوڑ دی جاتی ہیں۔ رکوع میں ٹانگیں سیدھی کھڑی ہوتی ہیں۔ کمر سے جسم کو زاویہ قائمہ پر جھکانا ہوتا ہے۔ کمر ایسی سیدھی ہونی چاہئے کہ اُس پر کوئی پیالہ یا صراحی آسانی سے ٹھہر سکے۔ رکوع کی اس حالت میں راکع کو تین سے پانچ مرتبہ سُبحانَ رَبِّیَ العَظِیم کہنا ہے۔

''مختلف جسمانی نظاموں پر رکوع کا اثر : رکوع کے دوران خون جسم کے نصف بالائی حصّے کی طرف دھکیلا جاتا ہے۔ یہ پیٹ میں ریاح کے سبب سے پیدا ہونے والے نفّاخ (Flatulence) کے لئے اور توند (Pot belly) سے فاضل چربی کو نکالنے میں ایک مؤثر انداز ہے۔ ریڑھ کی ہڈی مضبوط و توانا، ملائم و لوچ دار، سیدھی، اطاعت پذیر، قابلِ اصلاح، پھرتیلی اور چاق و چوبند، گٹھی ہوئی، رواں دواں، ثابت قدم اور اَن تھک ہو جاتی ہے۔ مدت سے لاحق قبض کے لئے رکوع ایک مؤثر کیفیت ہے۔ رُکوع پنڈلی اور ران کے اعصاب، ریڑھ کی ہڈی اور پیٹ کے عضلاتی نظام کو بھی توانائی بخشتا ہے۔''

''(۳) رکوع کے بعد تیسری کیفیت ''قومہ'' کی ہے جو قیام سے ملتی جلتی ہے لیکن قومہ میں بازو جسم کے ساتھ سیدھے لگے رہتے ہیں۔ اگرچہ یہ وقفہ تھوڑا سا ہوتا ہے لیکن کمر کے اعصاب کو صحیح طور پر رکھنے اور اُن کی تقویت کو بڑھانے میں یہ انتہائی مؤثر کیفیت ہے۔ پیٹ کے اعصاب کو کس کر پیٹ کو اندر کی طرف دھانسنے میں خاصا طبّی فائدہ ہے۔ تازہ خون جسے جسم کے بالائی نصف حصّے کی طرف دھکیلا گیا تھا، اب قومہ میں معمول پر واپس آ جاتا ہے۔ مناسب توازن ملنے سے جسم کو ایک بار پھر راحت حاصل ہو جاتی ہے۔''

''(۴) چوتھی کیفیت یعنی سجدہ کو تمام زمانوں میں اعلیٰ تر اور افضل تر سمجھا گیا ہے اور سپردگیِ نفس، خود حوالگی، مکمل تابعداری اور نیازمندی کی بہترین شکل ہے۔ ☆ سجدہ میں جھکنا اور بالآخر پیشانی کا زمین پر اس طرح رکھنا ہے کہ جسم کے زیادہ سے زیادہ حصّے یعنی پیشانی، ناک، دونوں ہاتھ (جن کی انگلیاں کھلی ہوئی ہوں)، دونوں گھٹنے اور دونوں پاؤں جن کی انگلیاں زمین کو چھو لیں ☆☆۔

''سجدے کا جسمانی نظاموں پر اثر : سجدہ دماغ اور جسم کے بالائی حصّوں بہ شمول آنکھوں، کان، ناک اور پھیپھڑوں تک مکمل روانیِ خون میں مدد دیتا ہے۔ بدمزاج لوگوں کے لئے سجدہ بالخصوص تجویز کیا جاتا ہے کیونکہ یہ کیفیت نفسیاتی اذیت، ذہنی تناؤ اور بے خوابی کی ہنگامہ آرائی کو ختم کرتی ہے۔''

☆ سورۃ القدر کی آخری آیت وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ کی رُو سے سجدہ ہی میں قربِ الٰہی حاصل ہوتا ہے۔

☆☆ حدیثِ مبارکہ کی رُو سے سجدہ کے سات فرائض ہیں جس میں ختمی مرتبت آقا ﷺ نے فرمایا کہ مجھے میرے رب نے سات ہڈیوں پر سجدہ کرنے کا حکم دیا ہے: (۱) ناک کی ہڈی (۲) دونوں ہاتھوں کی ہڈیاں (۳) دونوں گھٹنوں کی ہڈیاں اور (۴) دونوں پاؤں کی ہڈیاں۔ جب تک یہ ساتوں ہڈیاں قبلہ رخ نہ ہوں، سجدہ صحیح نہ ہوگا۔

''(۵) سجدہ کے بعد پانچویں کیفیت جلسہ کی ہے جس میں نمازی کو بائیں ٹانگ پر سیدھا بیٹھنا ہوتا ہے۔دائیں ٹانگ کا بوجھ انگلیوں پر ہوتا ہے۔جلسہ میں سر اور تمام پشت ایک سیدھ میں ہونے چاہئیں۔''

''جلسہ کا نظام ہائے جسمانی پر اثر : یہ اَن تھک کیفیت ہے۔وہ تازہ خون جسے جسم کے بالائی نصف حصّے کی طرف دھکیلا گیا تھا' ایک بار پھر معمول پر آجاتا ہے اور جسم کو ایک بار پھر راحت مل جاتی ہے۔ریڑھ سمیت اعصابِ جسمانی کی راحت رسانی کی یہ بہترین کیفیت ہے۔یہ کیفیت بدہضمی اور قبض کو ختم کرتی ہے' رانوں کی رگوں اور اعصاب میں دورانِ خون کو جوش دلاتی ہے۔معدہ کی تیزابیت اور معدہ کی دوسری بیماریوں کے لئے جلسہ مفید ہے۔جلسہ ذہن کو روحانی مقاصد تک مرتکز رکھنے میں بھی مدد دیتا ہے۔''

''(۶) جونہی نمازی نماز کی چوتھی کیفیت یعنی سجدہ کی طرف دوسری بار پلٹتا ہے تو چند سیکنڈوں میں اس مثالی کیفیت کا تکرار عملِ تنفس (سانس لینے کا عمل)' دورانِ خون اور اعصابی نظام پر مفید اثرات چھوڑتا ہے۔''

''(۷) نماز کی ساتویں اور آخری کیفیت کا نام ''قعدہ'' ہے جو قیام کی حالت کے بالکل الٹ ہے۔یہ کیفیت آلتی پالتی مار کر بیٹھنے کی ہے جو صرف چند سیکنڈوں کی ہوتی ہے۔''

''نماز میں اٹھنا' بیٹھنا ریڑھ کی ہڈی' رانوں' گھٹنوں اور ران کے اعصاب پر وزن ڈالتا ہے اور باقاعدہ اور روزمرہ کی تکرار سے اُن کی قوّت میں اضافہ کرتا ہے۔اس کیفیت میں نماز ادا کرنے والا شخص اپنی زندگی میں کہیں شاذ و نادر ہی کمر کے درد اور وجع المفاصل (جوڑوں کے درد) جیسی انحطاط پذیر اَمراض کا شکار ہوتا ہے۔''

''آنکھ دماغ کے دروازے کا پردہ ہے اور نفسیاتی مشاہدات میں سے ہے۔آنکھ کا ایک مقررہ نقطے پر مرکوز رکھنا انسان کی داخلی دنیا کے مشاہدے کو کھولتا ہے' ذہنی ناآسودگی کو ہلکا کرتا ہے اور الٰہی ادراک کے مشاہدے کے کھولنے کے علاوہ سکون و شانتی' راحت و آرام کا احساس دلاتا ہے۔ان حرکات کی ادائی میں چہرہ کسی بھی دوسری طرف نہیں مڑنا چاہئے۔نمازی کو عاجزی کے ساتھ زیرِ لب (Whisper) اپنے اللہ سے فریاد و مناجات اور اُس کی تسبیح و ثنا اس طرح کرنی چاہئے کہ صرف اُس کے کان سنیں اور اُسے کسی اور آواز یا باتوں کی طرف توجہ نہیں دینی چاہئے۔اُس کی توجہ اُن مقدس الفاظ کے معانی پر مرکوز ہونی چاہئے جو امام ادا کر رہا ہے اور اُس وقت بھی جب وہ تنہا انفرادی نماز پڑھ رہا ہو۔مقرر شدہ اعضاء کی حرکات کے علاوہ دوسرے اعضاء کی حرکت کی اجازت نہیں اور اُن کی حرکت کی اجازت ناگزیر حالت میں ہے۔نماز کا یہ تحفہ ایک روحانی قوّت ہے جسے مثبت اور قطعی طور پر عزیز رکھا جانا چاہئے۔''

''اجتماعی نماز : نمازی کی سماجی حیثیت سے قطع نظر اجتماعی نماز کے فیض رساں نتائج بڑی اہمیت کے حامل ہیں بالخصوص جبکہ تمام لوگ حقیقی طور پر باہم مساوی درجے پر کھڑے ہوتے ہیں۔''

''پنجگانہ نماز یقیناً اطمینان دلانے والا عمل ہے۔اجتماع میں والہانہ وابستگی کے اقرار نامہ' پیار و محبت' باہمی افہام و ادراک کا تصوّر ہے۔اس کا نتیجہ ایک مجتمع توافق اور ہم آہنگی میں نکلتا ہے۔یہ اجتماع نمازیوں کے باہمی بھائی چارے کے بندھن کو مضبوط کرتا ہے اور انہیں باہمی اتحاد اور افہام و تفہیم کی رسائی حاصل ہو جاتی ہے۔یہ اجتماع امیر و غریب' عام آدمی اور افضل و برتر' مفلس و کنگال اور ہیجان خیز سیاست باز کے درمیان مساواتی خصوصیت ہے جس میں تمام لوگ کسی ذات اور رنگ و نسل کے امتیاز کے بغیر ایک ہی صف میں ایک دوسرے کے شانہ بہ شانہ کھڑے ہوتے ہیں۔سب کے سب اُس وحدہ' لاشریک کے ساتھ وابستگی کی ایک لڑی میں جڑے ہوتے ہیں جس کے حضور اُنہوں نے رحمت کی بھیک مانگنی ہے' عرض معروض کرنا ہے اور سجدہ ریز ہونا ہے۔''

''عملِ تنفس (سانس لینے کا عمل) اور قوّتِ انہاک : اگر نماز وابستگی کے صحیح جذبے سے ادا کی جائے تو یہ اخلاقی طور پر مالا مال کرتی ہے ورنہ تو یہ بے حسی کی حالت میں گنگناہٹ و سرسراہٹ اور قول و گفتار کے سوا کچھ نہیں۔قادرِ مطلق کے ساتھ صحیح اور سچا ارتباط صرف نماز ہی کے ذریعے ممکن ہے بشرطیکہ نمازی سچے دل سے اس کے آگے فریاد و التجا کرے اور اپنے سراپا کو اس کے حکم کے حضور جھکا دے۔نماز کی ادائی کے پورے وقت میں سانس لینے کا شعوری کنٹرول رکھنے سے آپ کی توجہ ادھر اُدھر نہیں بھٹکے گی بلکہ تفکر اور مراقبے کی لذت کے حصول میں یہ آپ کا مُمد اور مددگار رہوگا۔''

''نماز کے اوقات کا فلسفہ : نماز کے مقررہ اوقات میں ایک نظم و ضبط ہے:''جلدی سو جانا اور صبح جلدی اٹھ جانا آدمی کو چاق و چوبند' صحتمند اور توانا' تونگر و دولتمند' پُر آسائش' خوش نصیب اور امید افزا رکھتا ہے۔''

''دن کی درمیانی نمازیں بالعموم کھانا کھانے کے بعد ادا کی جاتی ہیں۔اگر نمازیں صحیح نظم و ضبط کے ساتھ ادا کی جائیں تو آپ غیر ارادی طور پر کم کھانا کھائیں گے کیونکہ زیادہ مقدار میں کھانا کھانے سے نماز کا صحیح نظم و ضبط کے ساتھ ادا کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔زیادہ کھانا کھانے سے پیٹ کے اعصاب کا بندھن اور سکڑنا ناقابلِ انتظام ہو جاتا ہے۔یہی صورت شام/رات کے کھانے کی ہے۔کم خوری کے بعد نماز کا ادا کرنا آپ کی توند کو بڑھنے نہیں دے گی۔''

("Divine Philosophy & Modern Day Science" ... A. Rashid Seyal, pp. 89-92)

(ج) روزہ۔۔متعدد بیماریوں کا بہترین علاج: قرآن فرماتا ہے :

وَأَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ O (البقرة : ۱۸۴)

''(سچ پوچھو تو) اگر تم روزہ رکھو تو وہ (اس کی تمام تکالیف کے باوجود) تمہارے حق میں بہتر ہے اگر تم علم رکھتے ہو۔'' (۲ : ۱۸۴)

اب تک تو روزے کو نظام انہضام کے آرام کے سوا کچھ نہ سمجھا جاتا رہا۔طبّی علوم کی ترقی کے ساتھ ساتھ یہ

بتدریج معلوم ہونا شروع ہوا کہ روزہ ایک طبی عجوبہ ہے اور اسی لئے درج بالا آیت اِنۡ كُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ کے الفاظ پر ختم ہوتی ہے یعنی اگر تم سچی بات کو دل کی آنکھ سے دیکھو تو روزہ رکھنا تمہارے لئے بہتر ہے۔

''روزے کا روحانی پہلو : ماہِ رمضان المبارک میں روزہ کے اوقات کے دوران جائز اور حلال کھانے پینے سے بھی اجتناب ہوتا ہے جس سے انسانی زندگی اور ازدواجی تعلق قائم ہے اور جس سے نوعِ انسانی کے تسلسل کی افزائش ہے۔ روزہ ایک علامتی عہد و پیمان ہے جس میں عبادت گزار داخل ہوتا ہے اور جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر رضائے الٰہی کی اطاعت گزاری کے فرض کے دوران اُسے اپنی جان خطرے میں ڈالنا پڑ جائے یا اپنی اولاد کے مفادات کو قربان کرنا پڑ جائے تو وہ ایسا کرنے میں ہرگز تامل نہیں کرے گا۔'' ("Islamic Economics"
... M. A. Mannan, p. 82)

اب ہمیں سائنسی طور پر جائزہ لینا ہے کہ روزے کا ہماری صحت پر کیا اثر پڑتا ہے :

(۱) روزے کا نظامِ انہضام پر اثر: نظام انہضام اعضاء کے پُر ہجوم خاندان پر مشتمل ہے۔ منہ میں لعاب دہن کے غدود، مسوڑھے، زبان، گلا، غذائی نالی (جس کے ذریعے غذا منہ سے لے کر آخر تک عملِ ہضم سے گزرتی ہے)، معدہ، اثنا عشری آنت یعنی معدے کے نیچے چھوٹی آنت کا پہلا حصہ (Duodenum)، جگر، لبلبہ (Pancreas) (معدے کے قریب ایک غدود جو اثنا عشری آنت کو ہاضم خامرے پہنچاتا ہے اور خون میں انسولین داخل کرتا ہے)، آنتوں کے مختلف حصّے یہ تمام کے تمام اس نظام ہضم کے اجزاء ہیں۔ اس نظام کا نمایاں پہلو یہ ہے کہ یہ تمام مربوط اعضاء ایک کمپیوٹرائزڈ نظام کے ذریعے خود بخود کنٹرول کیے جاتے ہیں۔ جونہی آدمی کوئی چیز کھانے لگتا ہے یا کھانے کا ارادہ کرتا ہے تو یہ تمام نظام حرکت میں آجاتا ہے اور ہر عضو اپنے دائرہ عمل کے مطابق کام کرنا شروع کر دیتا ہے۔ یہ نظام مسلسل استعمال میں رہنے کی تاب نہیں بھی لاتا کیونکہ (۱) یہ بلا کسی توقف کے چوبیس گھنٹے مائل بہ عمل رہتا ہے۔ (۲) اعصابی دباؤ اور سوءِ تغذیہ (ناقص غذا) بھی اس کی تاب نہ لانے کی وجہ ہو سکتے ہیں۔''

''روزہ اس کُل نظام کے ایک مہینہ آرام کا زمانہ ہے۔ فی الحقیقت روزے کا معجزاتی اثر جگر پر پڑتا ہے۔ ہاضمے کے کردار کے علاوہ جگر کے پندرہ دیگر کردار ہیں۔ محافظ اور دربان کی طرح عمر بھر کام کرتے کرتے یہ تھک جاتا ہے اور اس وجہ سے انہضام کے مقاصد کے لئے صفراوی ریزش (Bile) (ایک سبزی مائل بھوری الکلی رطوبت یا خلط جو جگر سے خارج ہوتی اور ہضم میں مدد کرتی ہے اور پتے میں جمع رہتی ہے) اپنے دوسرے منصبی کاموں میں مداخلت کے مسائل کو جنم دیتی ہے۔''

''اس کے برعکس روزے کے دوران جگر کو گیارہ بارہ گھنٹے کا آرام مل جاتا ہے۔ جونہی کھانے کا چھوٹا سا ریزہ جو چنے کا دسواں حصّہ ہی کیوں نہ ہو، معدے میں پہنچتا ہے تو نظامِ ہضم کا کمپیوٹر حرکت میں آجاتا ہے اور جگر فوراً اپنا کام شروع کر دیتا ہے۔ سائنسی نقطہ نظر سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ جگر کا یہ عرصہ آرام سال میں ایک مہینہ ہونا چاہیے۔''

''روزے سے جگر کو ایک اور فائدہ خون کی کیمیا کو شامل ہے۔جگر کا انتہائی مشکل کام غیر ہضم شدہ اور ہضم شدہ کھانے کے مابین توازن کو قائم رکھنا ہوتا ہے۔جگر کو یا تو ہر لقمہ کو ذخیرہ کرنا ہوتا ہے یا خون کے راستے اُس کے ہضم ہونے کی نگرانی کرنا ہوتا ہے۔اس کے برعکس روزے میں جگر کو خوراکی ذخیرے کے فرائض سے بہت حد تک آرام مل جاتا ہے اور اس آرام کے زمانہ میں وہ اپنی توانائیوں کو اُن لحمیات (Globulins) کی پیداوار میں صَرف کرسکتا ہے جو نظامِ مامونیت (Immune System) کو مزید تقویت دیتے ہیں۔گلے اور معدے کی نالی (Esophagus) پر روزے کا یہ آرام دہ اثر' جو دونوں ہی بہت حساس عضو ہیں' ایک قابلِ قدر نعمتِ الٰہی ہے۔''

''روزہ آنتوں کو ریزش کے حوالہ سے بھی اور اعصابی حرکت کے حوالہ سے بھی آرام بہم پہنچاتا ہے۔آنتوں کے نیچے خلیوں کی تہ (Endothelium) جو رگوں' شریانوں اور لمفی نالیوں کے اندر اَستر کے طور پر ہوتی ہے اور جو چکنائی جمنے سے بننے والا لیفی ابھار ہوتا ہے' ہمارے نظامِ مامونیت کا بنیادی جزو ہے۔روزے کے دوران ان لیفی اُبھاروں کی تجدید ہو جاتی ہے اور اس طرح ہم اُن تمام بیماریوں سے مامون و محفوظ ہو جاتے ہیں جو ہاضمے کی راہ پر حملہ آور ہوتے ہیں۔''

''(۲) <u>روزے کا نظامِ دورانِ خون پر اثر</u> :روزے میں دن کے اوقات میں خون کا حجم کم ہو جاتا ہے اور یہ چیز دل کو قابلِ قدر آرام مہیا کرتی ہے۔ بین الخلیاتی ریزش کی کمی ریشہِ لحمی کے دباؤ (Tissue Pressure) میں کمی پر منتج ہوتی ہے جو دل کے لئے بہت اہم چیز ہے۔روزے کے دوران انبساطِ قلب کا دباؤ (Diastolic Pressure)☆ ہمیشہ کم ہوتا ہے جس میں دل کو آرام مل جاتا ہے۔لہٰذا سال میں ایک مہینے کا روزہ بالخصوص انبساطِ قلب کے دباؤ کو کم کرتا ہے۔''

''روزے کا دورانِ خون پر اہم اثر خون کی نالیوں پر ہوتا ہے۔خون کی نالیوں کی فرسودگی کی وجہ خوراک کی باقیات کا ناکافی طور پر حل ہونا ہے۔اس کے برعکس روزوں میں اور بالخصوص روزہ کے افطار کے وقت غذائیت سے بھرپور خون میں موجود تمام اجزاء کو کام میں لایا جاتا ہے اور کوئی باقیات نہیں رہتیں۔اس لئے چکنائیاں اور اس طرح کی باقیات شریانی دیواروں میں ذخیرہ نہیں ہو پاتیں جس سے اختناق (بچاؤ) واقع ہو۔اس لئے روزہ (صلابتِ شرائین) یعنی شریانوں کی اندرونی سطح کے سخت ہو جانے (Arteriosclerosis) کے خلاف بہترین حفظِ ماتقدم کا ہتھیار ہے جو ہمارے زمانے کا اہم صحتی مسئلہ ہے۔''

''گردے دورانِ خون کے نظام کا جزو سمجھے جاتے ہیں۔روزے کے دوران اُنہیں بھی آرام مل جاتا ہے۔اس طرح روزہ رکھنے سے ایک اور اہم عضو کو آرام مل جاتا ہے۔''

''(۳) <u>روزے کا خلیوں پر اثر: خلیوں پر روزے کا بہت اہم اثر داخلی اور بین الخلیاتی ریزشوں کے</u>

☆Diastole دل کے دوبار سکڑنے کے درمیان کا وقفہ جبکہ دل سکون حاصل کرتا ہے اور خون اس کے دونوں خانوں میں بھرتا ہے۔

توازن کے عملِ تنظیم کو قائم رکھنا ہے۔ چونکہ روزوں میں بین الخلیاتی ریزشیں کم سے کم ہو جاتی ہیں، اس لئے خلیاتی منصب کار کو آرام مل جانا نمایاں چیز ہے۔ پھر برحلمی خلیے (Epithelial Cells) جو جسم میں مسلسل ریزش کے ذمہ دار ہیں، کو بھی ایک مناسب وقفہ آرام مل جاتا ہے اور روزوں کے دوران اچھی صحت کا سبب بنتے ہیں۔ علم خلویات (Cytology) کی رُو سے غدہ نخامی (Pituitary Gland) ☆، غدّہ درقیہ (Thyroid Gland) اور لبلبہ ☆☆ کو بڑے شوق سے رمضان کے مہینے کا انتظار ہوتا ہے تاکہ اس مہینے میں صحت کی برکتوں سے فیض یاب ہو سکیں۔

"(۴) روزے کا نظامِ اعصاب پر اثر: روزوں کے دوران نظام اعصاب کو مکمل آرام مل جاتا ہے۔ نمازوں اور دیگر عبادات و اَذکارِ الٰہی کی ادائی ہمارے ذہنی تناؤ اور کبیدہ خاطری (رنجیدگی) کو دُور کر دیتی ہے۔ اللہ کے حضور خود سپردگی میں تو ہمارے تمام غم نابود ہو جاتے ہیں۔ اس طرح روزوں کے دوران فشار اور دباؤ جو آج کے دَور کا معرکۃ الآراء مسئلہ ہے، تقریباً زائل ہو جاتے ہیں۔"

"روزوں کے دوران جنسی خواہشات سے پرہیز بھی نظامِ اعصاب سے بہت سے منفی اثرات کو دُور کرتا ہے۔"

"دماغی دورانِ خون میں جس کی روزے اور وضو کے مشترکہ اثر سے ایک شاندار ہم آہنگی میں بحالی ہوتی ہے، صحتمند نظامِ اعصاب کی واضح علامت مل جاتی ہے۔ داخلی غدودوں کو جو تمام نظامِ اعصاب پر اثر انداز ہوتی ہیں، مل جانے والا آرام اس نظام پر روزوں کا ایک اور فائدہ ہے۔"

"تحت الشعور جس کا رمضان المبارک کے دوران عبادات کے ذریعے تزکیہ ہوتا ہے کو مزید تسکین ملتی ہے۔ وہ نظامِ اعصاب سے تمام دباؤ اور تناؤ کو دُور کر دیتا ہے۔"

"(۵) خون کا بننا اور روزے کی پُرحکمت باریک بینیاں: خون ہڈیوں کے گودے میں بنتا ہے۔ جسم میں جونہی خون کی ضرورت پڑتی ہے، تو ایک بے اختیارانہ لاشعوری حرکت ہڈی کے گودے میں تحرک پیدا کرتی ہے۔ ہڈی کا گودا بالخصوص سوکھے پتلے، نحیف آدمیوں اور شہری لوگوں میں کاہل اور مٹھا ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے زرد چہرے روز بہ روز بڑھتے جا رہے ہیں۔"

"روزے کے دوران جب خون میں قوّت بخش غذائیت کم تر سطح پر گر جاتی ہے تو ہڈی کے گودے میں تحرک پیدا ہوتا ہے جس کے نتیجہ میں نحیف اور کمزور لوگوں میں روزہ رکھنے سے خون کی پیداوار بہ آسانی ہو جاتی ہے۔ چونکہ روزہ رکھنے کے دوران جگر کو آرام مل جاتا ہے، اس لئے خون کی پیداوار کے لئے وہ اس مواد کو بڑی آسانی سے اور بڑی مقدار میں تیار کر سکتا ہے جس کی ہڈی کے گودے کو ضرورت ہوتی ہے۔

☆ ایک چھوٹا سا بے قناتی غدہ جو دماغ کی جڑ میں واقع ہے اور کئی طرح کے ہارمون پیدا کرتا ہے جو جسمانی افزائش کے لئے ضروری ہیں۔ ☆☆ لبلبہ کی تشریح صفحہ ۲۱۱۱ پر ملاحظہ ہو۔

''روزے کی اِن چند رُخی حیاتیاتی نکتہ رسیوں کے نتیجہ میں سوکھے پتلے آدمیوں کا وزن روزہ رکھنے سے بڑھ جاتا ہے۔ اس کے برعکس لحیم وشحیم لوگوں کا وزن مجموعی صحت پر فائدہ مند اثرات کی بدولت کم ہو جاتا ہے۔''

''اب ہمیں سورۃ البقرۃ کی آیت مذکورہ ۱۸۴ کے آخری حصّے وَأَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ○ کی افادیت اور اس میں کارفرما الٰہی معجزانہ حکمت کا بخوبی علم ہو گیا۔''

''رمضان المبارک میں روزے کا سماجی پہلو یہ ہے کہ تمام فضا مذہبی جوش وخروش اور خالق سے وابستگی میں گہرے طور پر ڈوبی ہوتی ہے۔ رات کو ''تراویح'' کی اضافی نماز میں جس میں قرآن مجید کی تلاوت کی جاتی ہے' مسلمان کو اسی ماہِ مبارک میں قرآن مجید کے نزول کے آغاز کی یاد دلائی جاتی ہے۔ اس مہینہ میں رضائے الٰہی کی خاطر مفلوک الحال اور مستحق لوگوں پر صدقات وخیرات بھی دل کھول کر نچھاور کئے جاتے ہیں۔ لہٰذا ایسے نیک اور خیرِ خلق کاموں کے ذریعے اُمّتِ مسلمہ میں حبِّ الٰہی اور بھی زیادہ آشکار ہوتی ہے۔ ان تمام باتوں کے نتیجہ میں رحمتِ الٰہی اور اس کا کرم ایک غیر منقطع تسلسل کے ساتھ نازل ہوتے ہیں جس کی بابت امام الانبیاء ﷺ نے فرمایا:

إِذَا جَاءَ رَمَضَانُ فُتِحَتْ أَبْوَابُ الْجَنَّةِ وَغُلِّقَتْ أَبْوَابُ النَّارِ وَصُفِّدَتِ الشَّيَاطِينُ

(صحيح بخاري: كتاب الصوم ؛ صحيح مسلم : اول كتاب الصيام)

''رمضان المبارک کی آمد پر جنت کے دروازے کھول دئے جاتے ہیں' جہنم کے دروازے بند کر دئے جاتے ہیں اور شیطانوں کو پابہ جولاں کر دیا جاتا ہے۔'' (صحیح بخاری' صحیح مسلم)

''روزے کے معاشرتی ربط کے سیاق میں افطار پارٹیوں کا ذکر کرنا ضروری ہے جو ایک عظیم عوضانہ ہے۔ ان پارٹیوں کے ذریعے مسلمان ایک دوسرے کے قریب تر آجاتے ہیں' آپس میں معاشرتی رابطہ قائم کرتے ہیں جو سماجی اتحاد اور یک جہتی کا دوسرا نام ہے۔ اس سلسلے میں ایک حدیثِ مبارکہ اس طرح ہے:

''اگر کوئی آدمی کسی دوسرے مسلمان روزے دار کو افطار پر بلاتا ہے تو اللہ تبارک وتعالیٰ اس کے بدلہ میں اُس کے گناہ معاف فرما دیتا ہے اور اُسے نارِ جہنم سے آزادی دے دیتا ہے۔ جو شخص افطار کے کھانے کا اہتمام کرتا ہے' اُسے اللہ کی طرف سے اس سے بڑھ کر عوضانہ ملے گا جتنا اُس نے مہمان کی خاطر کیا۔''

اس پر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے پوچھا: ''اے اللہ کے رسول! ہم سب کیسے ایک روزہ دار کے افطار کا سامان فراہم کر سکتے ہیں اور کس طرح اُسے کھلا سکتے ہیں؟'' تو آپ نے فرمایا:

''روزہ دار کا روزہ کھجور رکسی قدر دودھ یا کم از کم پانی کے ایک گھونٹ سے افطار کرا دینا ہی کافی ہے۔''

''دنیاوی نقطہ نظر سے روزہ قوّتِ صبر' حلم وبردباری اور مستقل مزاجی کو مضبوط کرتا ہے۔ وہ حیوانی جذبات

کو دبا تا ہے اور اچھے' مثبت جذبات سے مالا مال کرتا ہے۔ اِنہی سفلی جذبات کی جو تمام برائیوں کی جڑ ہیں' روزے کے ذریعے تحدید کی جا سکتی ہے اور اُنہیں قابو میں لایا جا سکتا ہے۔ روزہ مسلمانوں کو زندگی کی مشکلات اور صعوبتوں کا مقابلہ کرنا سکھاتا ہے جس سے اُن کی قوّتِ مدافعت بڑھ جاتی ہے۔"

''روحانی اور مادّی فوائد' تزکیہ اور عملِ تنظیم کے علاوہ روزہ روزے دار کی اخلاقی حس کو رفعت و بلندی عطا کرتا ہے۔ اُسے اُن پابندیوں کا خیال رکھنا ہوتا ہے جو اُسے مادّی اور معاشرتی نوعیت کی بہت سی برائیوں سے بچاتی ہیں۔''

"پس ربِّ ذوالجلال والاکرام کی نظر میں روزہ اس قدر مستحسن اور قابلِ تعریف ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:
لَخَلُوفُ فَمِ الصَّائِمِ أَطْيَبُ عِنْدَاللهِ مِنْ رِيحِ الْمِسْكِ (صحيح بخاری: كتاب الصوم' باب فضل الصوم ؛ صحيح مسلم: كتاب الصيام' باب : فضل الصيام)
"روزے دار کے منہ کی بو اللہ کے ہاں کستوری کی خوشبو سے بھی زیادہ پاکیزہ ہے۔''

روزے سے متعلق غیر مسلمین کی آراء

(۱) ''اسلام کا ایک ثمر تو یہ ہے کہ روزے میں بے لچک' دیرپا اور پائیدار صبر صرف رضائے الٰہی اور اُس کی اطاعت و فرماں برداری کی خاطر ہوتا ہے۔ اب ہر چیز سے بڑھ کر روزے کی تنظیم ہی ایسی تنظیم ہے جو مسلمان کے کردار میں اس بے لچک' دیرپا صبر کے پیدا کرنے کی ذمہ دار ہے۔''(William Paton)

(۲) "یہ سچ ہے کہ اسلامی روزے کا امتیازی وصف نمایاں افضلیت کا ہے۔ یہود و نصاریٰ دونوں نے روزہ محض کفارہ یا گناہوں پر ندامت کے طور پر یا اس سے بھی تنگ تر اور خالصتاً رسم و رواج کے طور پر رکھا'' (تفسیر ماجدی)۔ ''قدیم زمانے میں روزے کو افسردگی اور سوگ منانے کی علامت سمجھا جاتا تھا' یا جب کوئی خطرہ ہوتا تھا یا جب کوئی کاہن وحیِ الٰہی کے لئے اپنے آپ کو تیار کر رہا ہوتا تھا۔'' (The Jewish Encyclopaedia, Vol. V, p. 347)۔ یہ اسلام ہی ہے جس نے نظریہ کو وسعت دی اور روزے کی غرض و غایت کو رفعت عطا کی۔ اسلام میں روزہ ایک خاص وقت کے لئے جائز اور حلال جسمانی اور جنسی بھوک سے اختیاری اور خوش و خرم لاتعلقی ہے اور جسم اور روح دونوں کی نیازمندانہ مشق ہے۔''اسلام کے باضابطہ روزے کو اُن لوگوں نے بھی معقول اور مفید طریقہ کہا ہے جو روزے کی دیگر تمام صورتوں کو فضول اور غلط تصوّراتی چیز سمجھتے ہیں۔ روزہ شدید تحریص اور اُکساہٹ کے وقت بالعموم روح کو ضبطِ نفس کے قائم رکھنے پر تیار کرتا ہے۔''(Encyclopaedia Britannica, Vol. IX, p. 108)

(۳)''روزہ جس موسم میں بھی آئے' اس کی سخت گیری نے عدمِ تناؤ اور عدمِ کھنچاؤ کو قائم رکھا ہے اور مشرق کے تپتے ہوئے خشک' چٹیل میدانوں میں دھوپ کتنی ہی جلانے والی اور ہوا کتنی ہی جلسا دینے والی کیوں نہ ہو' محمد ﷺ کا

پیرو کارگرمی کے طویل دن میں ایک قطرۂ آب بھی اپنے ہونٹوں سے نیچے نہیں ٹپکنے دے گا۔ یہ آزمائش اگرچہ مختلف خطوں اور مختلف آب و ہواؤں میں غیر مساوی طور پر سخت اور شدید ہے' لیکن یہ بلا شک وشبہ ایمان وعقیدہ اور ضبطِ نفس کی خوشگوار مشق ہے۔'' ("Life of Muhammad"... Sir William Muir, p. 193)

(۴) کارلائل کا حوالہ دیتے ہوئے تھامس آرنلڈ نے صحیح لکھا ہے :

''پیغمبر (علیہ السلام) کا دین کوئی آسان دین نہیں جس میں شدید روزے' بھرپور' سخت' پیچیدہ کلّیات (فارمولے)' یومیہ پنجگانہ نماز اور مے نوشی سے پرہیز' تو یہ مذہب آسان مذہب ہونے کی وجہ سے کامیاب نہیں ہوا۔''
("The Preaching of Islam" ... T. W. Arnold,, p. 418)

نیند (SLEEP)

''نیند قدرت کی عظیم ترین ایجاد اور زندگی کے لئے انمول عطیہ الٰہی ہے۔ جن آیاتِ قرآنی میں رات کا ذکر آیا ہے وہاں '' آرام'' کا لفظ بھی ضرور آیا ہے۔ تمام جانداروں بہ شمول انسان' حیوانات' چرند و پرند سب کو نیند کی ضرورت ہوتی ہے۔ نیند ہمارے جسم کے لاکھوں خلیوں کی ٹوٹ پھوٹ کی مرمت کا موقع فراہم کرتی ہے۔ نیند تھکے جسم و جان کے لئے ایک سہارا ہے۔ دن بھر کی کھوئی ہوئی توانائی واپس آجاتی ہے۔ جسمانی ٹمپریچر کو ریگولیٹ کرنے کا میکانزم جاگنے کے لمحات کے مقابلے میں دورانِ نیند 0.5 تا 1.0 ڈگری فارن ہائٹ کم رہتا ہے۔ دل کی دھڑکن کی شرح دس تا تیس بار تک فی منٹ ہو جاتی ہے۔ بلڈ پریشر تقریباً 20 ایم ایم کم ہو جاتا ہے۔ پیشاب کے حجم میں کمی آ جاتی ہے لیکن اس میں ٹھوس مادّوں کا ارتکاز (Concentration of Solids) بڑھ جاتا ہے۔ تشکیلی عضلات کی طبعی سختی میں نرمی آ جاتی ہے۔ آنکھوں کی معمول کی گردش کا رُخ اوپر کی جانب ہو جاتا ہے اور ان کی پتلیاں سکڑ جاتی ہیں۔'' ('' قرآن کے جدید سائنسی انکشافات''۔۔۔ پروفیسر ڈاکٹر فضل کریم' ص ص ۱۹۸' ۱۹۹)

مندرجہ ذیل آیاتِ قرآنی میں نیند کی اہمیت کو اجاگر کیا گیا ہے:۔

(۱) هُوَالَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الَّیْلَ لِتَسْكُنُوْا فِیْهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّسْمَعُوْنَ o (یُونُس:۶۷)

''اللہ تعالیٰ کی ذات تو وہ (بلند وبرتر) ذات ہے جس نے رات کو تمہارے لئے سامانِ راحت بنایا اور دن کو (کاروبار کے لئے) روشن کیا' ہوش وگوش رکھنے والوں کے لئے ان میں نشانیاں ہیں۔''(۱۰:۶۷)

(۲) هُوَالَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الَّیْلَ لِبَاسًا وَّالنَّوْمَ سُبَاتًا وَّجَعَلَ النَّهَارَ نُشُوْرًاo (الفرقان:۴۷)

''وہ وہی تو ہے جس نے رات کو تمہارے لئے لباس (پردہ) بنایا اور نیند کو موجبِ راحت اور دن کو وقتِ برخاست (اُٹھ کھڑا ہونے کا وقت) بنایا۔'' (۴۷ : ۲۵)

(۳) قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِنْ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَيْكُمُ الَّيْلَ سَرْمَدًا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَأْتِيْكُمْ بِضِيَآءٍ أَفَلَا تَسْمَعُوْنَ o قُلْ أَرَأَيْتُمْ اِنْ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَيْكُمُ النَّهَارَ سَرْمَدًا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَأْتِيْكُمْ بِلَيْلٍ تَسْكُنُوْنَ فِيْهِ أَفَلَا تُبْصِرُوْنَ o وَمِنْ رَّحْمَتِهٖ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ o (القصص:۷۱تا۷۳)

''(اے رسول!) فرما دیجئے کہ دیکھو تو اگر اللہ تعالیٰ تم پر ہمیشہ کے لئے روزِ قیامت تک طویل تر شب تار طاری کر دے تو اللہ کے سوا وہ کون معبود ہے جو تمہیں روشنی مہیا کر دے؟ کیا تم (حقائقِ حیات کی تفسیر) سنتے نہیں ہو؟ فرما دیجئے دیکھو تو اگر اللہ تعالیٰ تم پر ہمیشہ کے لئے روزِ قیامت تک رہنے والا دن برپا کر دے تو اللہ کے سوا وہ کون معبود ہے جو تمہارے لئے ''رات'' لانے پر قدرت رکھتا ہو تاکہ تم اُس میں سکون و آرام پاؤ کیا تم (چشمِ بصیرت سے) دیکھتے نہیں ہو؟ اور اُس کی رحمت کے کتنے نمایاں آثار ہیں کہ اُس مدبّر لیل و نہار نے تمہارے لئے رات اور دن بنائے تاکہ تم رات میں آرام پاؤ اور دن میں اپنے اللہ تعالیٰ کا فضل تلاش کرو (تدبیرِ معیشت کرو) تاکہ تم شکرانِ نعمت کرو۔'' (۷۱ تا ۷۳ : ۲۸)

نیند کی قدر و قیمت اُس شخص سے پوچھئے جو بے خوابی کے مرض (Insomnia) کا شکار ہے۔ بے خوابی ایسا مرض ہے جو اپنے دامن میں ناگفتہ بہ مصیبتوں اور بیماریوں کا طوفان لاتی ہے۔

''صحت بخش ازدواجی تعلقات ۔۔کامیاب زندگی کا راز: انسانی جسم اور دماغ کبھی جدا نہ ہونے والے رشتے میں منسلک ہیں۔ یہ رشتہ منفی بھی ہو سکتا ہے اور مثبت بھی۔ وظیفہ زوجیت کے دوران یہ تعلق نمایاں کردار ادا کرتا ہے اور اس عمل کے دوران انسانی جسم میں ایسے کیمیائی مرکبات بنتے ہیں کہ وہ قوّتِ مدافعت کی صلاحیتوں کو بڑھاتے ہیں۔ بہ الفاظِ دیگر اس عمل سے انسان بہت سی بیماریوں سے چھٹکارا حاصل کر سکتا ہے۔ منفی احساسات کا مسلسل قائم رہنا' ذہنی تناؤ یا غصہ وغیرہ انسانی جسم کے مختلف نظاموں کو غیر متوازن کر دیتا ہے۔ اس کی مثال ایسے ہی ہے جیسے چلتی مشین میں لوہے کی کوئی ایسی چیز پھینک دی جائے جو مشین کو فوری طور پر بگاڑ کر رکھ دے۔ تحقیقی مشاہدات کے بعد ماہرین ان نتائج تک پہنچے ہیں کہ اگر کوئی شخص انتہائی ذہنی تناؤ کا شکار رہتا ہے تو اُس کے بیمار ہونے کے امکانات ایک نارمل آدمی سے چار گنا بڑھ جاتے ہیں۔ نیز یہ بھی مشاہدہ کیا گیا ہے کہ ایسی خواتین میں چھاتی کے کینسر کے امکانات دوگنے ہو جاتے ہیں جن کے خاوند اُن سے دُور رہتے ہوں یا وہ بیوہ ہو گئی ہوں۔''

قرآن مجید نے رشتہ ازدواجیت اور اُس کے نتیجے میں ہونے والی اولاد (نواسوں' پوتوں) وغیرہ کو نعمتِ الٰہی کہا ہے:

وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجًا وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنْ أَزْوَاجِكُمْ بَنِيْنَ وَحَفَدَةً وَّرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ أَفَبِالْبَاطِلِ يُؤْمِنُوْنَ وَبِنِعْمَتِ اللّٰهِ هُمْ يَكْفُرُوْنَ o (النّحل: ۷۲)

''اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے تم ہی میں سے تمہاری بیویاں بنائیں اور تمہاری بیویوں میں سے تمہارے لئے بیٹے اور پوتے پیدا کئے اور تمہیں نفیس چیزیں عطا کیں' تو کیا پھر بھی یہ لوگ باطل پر ایمان رکھیں گے اور اللہ کی نعمتوں کی ناشکری کرتے رہیں گے!'' (۱۶:۷۲) (یعنی اس نعمتِ الٰہی کی قدر دانی نہیں کریں گے؟)

''صحت مند وظیفہ زوجیت ذہنی دباؤ اور تناؤ کو کافی حد تک کم کرتا ہے کیونکہ اس عمل سے انسانی جسم مکمل آرام کی حالت میں آجاتا ہے۔ ذہنی حالت بہت بہتر ہو جاتی ہے اور قوّتِ مدافعت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ خاوند اور بیوی کا اپنے سونے کے کمرے میں ہنسی خوشی آنے' مسرور ہونے اور ایک دوسرے کی قربت سے فیض یاب ہونے سے انسانی جسم میں ایک کیمیائی عمل شروع ہو جاتا ہے جس کے نتیجے میں نہ صرف قوّتِ مدافعت کا نظام بہتر ہوتا ہے بلکہ بہت سے دوسرے عناصر انسانی صحت پر مثبت طور پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اِن حقائق سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ زوجین کا ملاپ' ایک دوسرے سے محبت و پیار کا اظہار' دونوں کو صحت مند رکھنے میں نمایاں کردار ادا کرتا ہے۔ وہ مرد جو نوجوانی کے دوران وظیفہِ زوجیت باقاعدگی سے سرانجام دیتے ہیں' اُن کی جنسی قوّت بڑھاپے میں بھی کافی حد تک قائم رہتی ہے اور جو ایسا نہیں کرتے وہ جلد ہی جنسی قوّت سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ وظیفہِ زوجیت یک طرفہ نہیں ہوتا بلکہ یہ ایک دوسرے کو ہشاش بشاش رکھنے کا بہترین ذریعہ ہے۔ وظیفہ زوجیت ایک مسکن عمل ہے کیونکہ صحت بخش وظیفہ زوجیت کے بعد دونوں شریکِ حیات بہترین نیند سے لطف اندوز ہوتے ہیں اور جب بیدار ہوتے ہیں تو کسی قسم کی کمزوری یا سستی کا نام ونشان تک نہیں ہوتا لیکن اس کے برعکس جب مرد یا عورت دونوں میں سے ایک بھی وظیفہِ زوجیت کے لئے ذہنی یا جسمانی طور پر تیار نہ ہو تو زندگی جہنم بن جاتی ہے۔ چونکہ اس عمل میں دیگر اعمالِ حیات کی طرح زیادہ تر ذمّہ داری مرد پر ہی عائد ہوتی ہے اس لئے مرد کا مکمل صحت مند ہونا بہت ضروری ہے۔ اگر مرد کسی وجہ سے یہ عمل سرانجام دینے سے قاصر رہے تو اُس کا اپنا تو جو حال ہوتا ہے' وہ ہوتا ہی ہے لیکن اصل مصیبت عورت کے لئے ہوتی ہے جو ذہنی وجسمانی طور پر آمادہ ہونے کے باوجود سیرابی کی کیفیت سے مالا مال نہیں ہوتی اور نتیجتاً مختلف اُمراض اُس کا مقدر بن جاتے ہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ ان کے اثرات سے مرد بھی محفوظ نہیں رہتا اور بالآخر ناکام ازدواجی زندگی دونوں کا مقدر بن جاتی ہے۔''

''یوتھ انرجیٹک سوسائٹی (YES) کی ایک رپورٹ کے مطابق پاکستان کی عدالتوں میں عورتوں کی طرف سے دائر کئے جانے والے طلاق کے مقدمات میں 80% سے زائد کے پیچھے جو محرک کارفرما ہے' وہ مَردوں کا نامکمل مرد ہونا ہے۔ مشرقی اور اسلامی ماحول کے اثرات کی وجہ سے خواتین براہِ راست مرد کی اس کمزوری کو وجہ نہیں بناتیں اور مختلف بہانے کر کے طلاق کا مطالبہ کر دیتی ہیں جن میں ساس بہو کی لڑائی' علیحدہ مکان اور نان نفقہ کے حقوق وغیرہ شامل ہیں۔ لیکن این جی او کے نمائندگان نے خاتون وکلاء کی وساطت سے ایسی خواتین سے نام ظاہر نہ کرنے کی شرط پر حقیقی وجہ بتانے کا مطالبہ کیا تو اُنہوں نے بتایا کہ اُن کے مرد شادی کے قابل ہی نہیں ہیں۔ ساری زندگی کنوارا رہنے سے بہتر ہے کہ ابھی سے اپنے شرعی اور قانونی حق کو استعمال کر کے علیحدگی اختیار کر لی جائے۔ قابلِ غور بات یہ ہے کہ ایسی باہمت خواتین کی تعداد بھی ہمارے معاشرے میں آٹے میں نمک سے بڑھ کر نہیں۔ ان میں سے بہت بڑی تعداد ایسی ہے جو اپنے حالات کے ساتھ سمجھوتہ کر کے صبر وشکر کا دامن تھام لیتی ہیں اور صحت مند ہونے کے باوجود اپنے اوپر ''بانجھ'' ہونے کا لیبل برداشت کر کے بھی زندگی کی گاڑی کو دھکیلتی رہتی ہیں جبکہ کچھ ناعاقبت اندیش مگر مجبور ایسی بھی ہیں جو اپنی فطری ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے کسی غیر اخلاقی سرگرمی میں ملوّث ہو جانا اپنا حق سمجھتی ہیں۔ ان تمام مسائل وآلام سے نمٹنے کے لئے ضروری ہے کہ مرد حضرات اپنی مردانہ صحت کا مکمل خیال رکھیں۔ شادی سے پہلے بھی اپنے آپ کو غیر اخلاقی کاموں سے دُور رکھیں اور شادی کے بعد بھی ایسی کسی صورت حال سے دوچار ہونے کے بعد جہالت کا مظاہرہ نہ کریں اور اپنے علاج کی طرف توجہ دیں۔ یاد رہے کہ علاج اُس شرمندگی سے بہت بہتر ہے جو بیوی کے چھوڑ جانے سے آپ کو ہو سکتی ہے۔'' (''صدائے صحت'' راولپنڈی ص ص ۴'۵)

(۷۴) منافقین (The Hypocrites)

لغت کے لحاظ سے منافق وہ ہے جو اُن خصوصیات کا دعویٰ کرے جن سے وہ متصف نہ ہو۔ بہ الفاظِ دیگر اُس کے قول وفعل میں باہمی موافقت اور ہم آہنگی نہیں ہوتی۔ اُس کا قول عمل کی سچائی سے عاری ہوتا ہے۔ تو یوں کہنا چاہئے کہ منافقت کسی لمبائی کا نصف یا وسطی نقطہ (Halfway House) ہے یعنی حق و باطل کے مابین عدمِ فیصلہ کی کیفیت ہے۔

منافقت کی یہ فطرت اسلام میں قابلِ نفرت، گھناؤنی اور کریہہ ہے اور منافقین کے لئے خدائی غضب و عذاب مشرکین کی نسبت زیادہ شدید اور زیادہ المناک ہے کیونکہ ولیم میور کے الفاظ میں ''اُنہوں نے انتہائی بُرے طور سے اور دوغلے پن سے جی حضوری کو ظاہر کیا ہوا ہے اور اس طرح وہ کھلے دشمن سے زیادہ خطرناک ہیں۔'' اُن کی سزا اُن کی اخلاقی گہرائیوں کی پستی کے جواب میں ہے جس کا ذکر سورۃ النِّساء اور سورۃ التَّوبۃ میں یوں کیا گیا ہے:۔

(۱) اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ وَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِيْرًاO (النِّساء : ۱۴۵)

''منافق یقیناً دوزخ کے نچلے طبقہ میں ہوں گے اور (اے مخاطب!) تو اُن کا کوئی مددگار نہ پائے گا۔'' (۴:۱۴۵)

(۲) وَعَدَاللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْكُفَّارَ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا هِيَ حَسْبُهُمْ وَلَعَنَهُمُ اللّٰهُ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيْمٌO (التَّوبۃ : ۶۸)

''اللہ نے منافق مَردوں اور منافق عورتوں اور کافروں (سب) سے دوزخ کا عہد کر رکھا ہے، اُس میں وہ ہمیشہ پڑے رہیں گے، وہی اُن کے لئے کافی ہے، اللہ اُن پر لعنت کرے گا اور اُن کے لئے دائمی عذاب ہے۔'' (۶۸ : ۹)

لیکن غفورورحیم اللہ کی جانب سے اُسی سورۃ النِّساء میں استثنائی صورت بھی بیان ہوئی ہے :

اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا وَاعْتَصَمُوْا بِاللّٰهِ وَاَخْلَصُوْا دِيْنَهُمْ لِلّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَسَوْفَ يُؤْتِ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًاO (النِّساء : ۱۴۶)

''البتہ جو لوگ (منافقت سے) توبہ کرلیں اور اپنی اصلاح کرلیں اور اللہ کا سہارا پکڑے رہیں اور اپنے دین کو اللہ کے لئے خالص کرلیں تو یہ لوگ مؤمنوں کے ساتھ ہوں گے اور اللہ مؤمنوں کو اجرِ عظیم دے گا۔''

''اور جب یہ تائبین اور نومسلمین، مؤمنین کے ساتھ ہوئے تو ظاہر ہے کہ اجرِ عظیم اُن کے حصّہ میں بھی آکر رہے گا۔ اس میں اُن خاندانی اور پشتینی مسلمانوں کے لئے سبق ہے جو آج کے ہر کفر وفسق سے تائب نومسلم یا نو صالح کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ یہ اسلامی اور ایمانی برادری میں نئے شامل ہونے والے بھائی ہیں جو اور زیادہ عزت و اکرام کے مستحق ہوتے ہیں۔'' (تفسیر ماجدی اردو، صفحہ ۲۲۴، نوٹ ۷۹۴)

مدنی زندگی کے دوران نبی اکرم ﷺ کو منافقین کے ٹولے سے ٹکرانا پڑا جس کا سردار (رئیس المنافقین)

عبداللہ بن اُبی تھا۔ اس ٹولے کو کفارِ مکہ نے اُٹھایا تھا جو نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تیرہ سالہ مکی زندگی کے دوران آپ ﷺ اور آپ کے صحابہ کے خلاف اپنے ناپاک منصوبوں میں بری طرح ناکام ہوئے تھے۔ ان تیرہ سالوں کے باتدبیر منصوبوں میں مکمل ناکامی کا تجربہ کرنے کے بعد انہوں نے مدینہ میں کچھ ''مسلمان'' منافقوں کا گروہ پیدا کرنے کی سازش کی جو بیرونی طور پر اپنے آپ کو (سچا) مسلمان ظاہر کرتے تھے لیکن اندرونی طور پر وہ دوہُرا کھیل کھیلتے تھے اور اس طرح وہ اسلام کے لئے مارِ آستین بن گئے تھے۔ ''ایک طرف تو وہ اپنے کفر و نفاق کو چھپاتے تھے تاکہ مسلمان ان سے کھلے کافروں جیسا سلوک نہ کریں تو دوسری طرف موقع ملنے پر وہ اسلام کے خلاف بے دھڑک اپنی نفرت ظاہر کرنے سے ہرگز نہیں ہچکچاتے تھے۔'' کسی بھی موقع پر انہوں نے اسلام کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچانے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ سن 3 ہجری میں جنگِ اُحد کے نازک موقع پر جب مسلمانوں کو افرادی قوّت کی بہت سخت ضرورت تھی تو رئیس المنافقین عبداللہ بن اُبی اپنے تین سو ساتھیوں کو میدانِ جنگ سے اس بہانے سے واپس لے گیا کہ شہرِ مدینہ کی چاردیواری میں رہ کر کفار کا مقابلہ کرنے کا اُس کے مشورے پر عمل نہیں کیا گیا اور اس طرح اُس کی اس مکاری سے مجاہدینِ اسلام کو شدید دھچکا لگا۔

ہمہ داں و ہمہ بیں اللہ قادرِ مطلق نے ان چھپے دشمنوں کے ناپاک ارادوں کو بے نقاب کرتے ہوئے ہمیشہ اپنے پیغمبر علیہ السلام کی نصرت و اعانت فرمائی۔ قرآن مجید کے مختلف مقامات پر اللہ تعالیٰ نے ان کی منافقت کو طشت از بام کیا ہے۔ مثلاً فرمایا:

(۱) وَيَقُولُونَ طَاعَةٌ فَإِذَا بَرَزُوا مِنْ عِندِكَ بَيَّتَ طَائِفَةٌ مِّنْهُمْ غَيْرَ الَّذِي تَقُولُ وَاللَّهُ يَكْتُبُ مَا يُبَيِّتُونَ فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ (النّساء : ۸۱)

''اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ طاعت (قبول ہے) لیکن آپ کے پاس سے باہر جاتے ہیں تو اُن میں سے ایک جماعت شب کے وقت اس کے برخلاف مشورہ کرتی ہے جو کچھ کہ وہ کہہ چکے تھے اور اللہ اُن کے رات والے مشوروں کو لکھتا جاتا ہے' تو آپ اُن کی طرف سے بے التفات رہئے اور اللہ پر بھروسہ کیجئے۔''

(۲) يَسْتَخْفُونَ مِنَ النَّاسِ وَلَا يَسْتَخْفُونَ مِنَ اللَّهِ وَهُوَ مَعَهُمْ إِذْ يُبَيِّتُونَ مَا لَا يَرْضَىٰ مِنَ الْقَوْلِ وَكَانَ اللَّهُ بِمَا يَعْمَلُونَ مُحِيطًا ۝ (النّساء : ۱۰۸)

''یہ لوگ آدمیوں سے شرماتے ہیں اور اللہ سے نہیں شرماتے حالانکہ وہ اُن کے ساتھ اُس وقت بھی رہتا ہے جب وہ رات میں اس بات کا مشورہ کرتے ہیں جو اُسے پسند نہیں اور وہ جو کچھ بھی کرتے ہیں' اللہ اُس کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔'' (۴ : ۱۰۸)

(۳) وَإِذَا جَاءُوكَ حَيَّوْكَ بِمَا لَمْ يُحَيِّكَ بِهِ اللَّهُ وَيَقُولُونَ فِي أَنفُسِهِمْ لَوْلَا يُعَذِّبُنَا اللَّهُ بِمَا نَقُولُ حَسْبُهُمْ جَهَنَّمُ يَصْلَوْنَهَا فَبِئْسَ الْمَصِيرُ ۝ (المجادلہ : ۸)

''(اے نبیِ معظم!) جب وہ (منافقین) آپ کے پاس آتے ہیں تو آپ کو ایسے لفظ سے سلام کرتے ہیں جس سے اللہ نے آپ کو سلام نہیں کیا اور اپنے دل ہی دل میں کہتے ہیں کہ اللہ ہمیں ہمارے اس کہنے پر (فوراً) سزا کیوں نہیں دے دیتا؟ اُن کے لئے جہنم کافی ہے کہ اُس میں وہ داخل ہوں گے' سو وہ بُرا ٹھکانہ ہے۔'' (۸ : ۵۸)

یہود اور منافقینِ مدینہ کی بدنفسی اس حد تک پہنچ گئی تھی کہ جب مجلسِ نبوی میں آتے اور عام ملکی تہذیب کے لحاظ سے شرما شرمی سلام کرنا ہی پڑتا تو اس میں بھی ایک پہلو اپنے خبث اور بے تمیزی کا ڈھونڈھ لیتے یعنی زبان سے بجائے اَلسَّلامُ عَلَیْکُم کے اَلسَّامُ عَلَیْکُم تلفظ کرتے جس کے معنی ہیں کہ تم پر موت آئے۔

یُحَیِّکَ بِہِ اللہُ میں جو لطافت اور رسول مکرم ﷺ کے ساتھ اللہ تبارک وتعالیٰ کو جو التفاتِ واقعی ہے اُس کا مزا ہما شما کیا جانیں! سچ کہا کسی نے۔

آنکھ والا تیرے جلوے کا تماشا دیکھے　　دیدۂ کور کو کیا نظر آئے کیا دیکھے!

الفاظ کو توڑنے موڑنے، کج رُو ذہنیت، بغض وعناد اور پیغمبرِ حق ﷺ کے ساتھ گستاخانہ رویّہ میں اُن کی پیدائشی فطرت کو سورۃ البقرۃ کی ذیل کی آیت ۱۰۴ میں بھی بے نقاب کیا گیا ہے اور مسلمانوں کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ پیغمبر علیہ السلام کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کرنے کے لئے ان منافقوں کے نقشِ قدم پر نہ چلیں:

یٰٓاَیُّھَاالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَاتَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَقُوْلُوا انْظُرْ نَاوَاسْمَعُوْا وَلِلْکٰفِرِیْنَ عَذَاب" اَلِیْم" O

''مومنو! رَاعِنَا مت کہا کرو اور اُنظُرْ نَا کہا کرو اور توجہ سے سنا کرو اور کافروں کے لئے دردناک عذاب ہے۔'' (۲ : ۱۰۴)

''رَاعِنَا ذومعنی لفظ ہے جس کا ایک معنی تو یہ ہے کہ ہماری رعایت فرمایئے لیکن رَاعِنَا کے ''ع'' کو ذرا کھینچ کر پڑھنے سے اس کے معنی میں ایک گستاخانہ مفہوم پیدا ہو جاتا ہے۔ مسلمان اس شرارت سے غافل، بے خبر، خالی الذہن خود بھی یہ الفاظ بولنے لگتے اور حضور کریم ﷺ کے کسی ارشادِ گرامی کو اچھی طرح سمجھ نہ پاتے تو عرض کرتے رَاعِنَا اے حبیب اللہ! ہم پوری طرح سمجھ نہیں سکے، ہماری رعایت فرماتے ہوئے دوبارہ سمجھا دیجئے۔ یہاں اُنہی کو یہ ممانعت ہو رہی ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کو اپنے محبوب علیہ السلام کی عزت وتعظیم کا یہاں تک پاس ہے کہ ایسے لفظ کا استعمال بھی ممنوع فرما دیا جس میں گستاخی کا شائبہ تک بھی ہو۔ چنانچہ فرمایا کہ رَاعِنَا کی جگہ اُنظُرْنَا کہا کرو (یعنی ہماری طرف نگاہِ لطف فرمایئے) کیونکہ یہ لفظ ہر طرح کے احتمالاتِ فاسدہ سے پاک ہے۔ وَاسْمَعُوْا کا حکم دے کر یہ تنبیہ فرما دی کہ جب میرا رسول تمہیں کچھ سنا رہا ہو تو ہمہ تن گوش ہو کر سنا کرو تا کہ اُنظُرْنَا کہنے کی نوبت ہی نہ آئے کیونکہ یہ بھی تو شانِ نبوّت کے مناسب نہیں کہ ایک ایک بات تم بار بار پوچھتے رہو۔ نبی مکرم ﷺ کا ادب واحترام اس بات میں ہے کہ آپ کے ارشاداتِ عالیہ کو ہمہ تن گوش ہو کر سنو، نہ کہ اس بات میں کہ آپ کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کرتے رہو یا اُنظُرْنَا کہتے رہو۔

حال کے بعض گمراہ فرقوں نے رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ اقدس سے بالکل قطع نظر کر کے ایمان واسلام کے لئے محض قرآن کی اتباع کو کافی سمجھ لیا ہے۔ اُن کی گمراہی آیت کے لفظ وَاسْمَعُوْا سے ظاہر ہے۔

آیت سے صاف ظاہر ہے کہ مرتبہ رسالت کا ادب صرف معنوی حیثیت ہی سے نہیں، لفظی حیثیت سے بھی

ضروری ہے۔فقہاء نے لکھا ہے کہ جن الفاظ سے اہانت کا احتمال بھی نکلتا ہو' اُن سے احتیاط لازم ہے۔ بلکہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں تو ایسے الفاظ پر حد واجب ہو جاتی ہے۔ظاہر ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین بے ادبی اور گستاخی کے ارادہ تک سے بالکل بَری تھے تو جو ممانعت کی گئی' وہ یہود کی نیت پر حکم کر کے کی گئی۔

علامہ شوکانی ''فتح القدیر'' کی جلد اوّل (ص ۱۲۴) میں رَاعِنَا کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

''رَاعِنَا اور ایسے تمام الفاظ جن سے توہینِ رسالت کا احتمال ہو' اُن کا استعمال قطعی طور پر ممنوع قرار دیا گیا۔'' اس لئے اہلِ ایمان کو براہِ راست مخاطب کر کے یہ حکم دیا گیا کہ وہ ایسے ذو معنیٰ الفاظ سے قطعاً پرہیز کریں تاکہ شانِ رسالتمآب ﷺ میں کسی قسم کی پنہاں اور پوشیدہ گستاخی کا احتمال بھی ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے۔''

آیت کے آخری حصّہ سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے حق میں ادنیٰ سی گستاخی بھی کفر ہے اور کفر کا مقدّر دردناک عذاب ہے۔بعض صاحبانِ نظر نے اِس آیت کے اسلوبِ بیان سے یہ نتیجہ بھی اخذ کیا ہے کہ حق تعالیٰ کو یہودیوں کے اس فتنہ پرور گروہ کا یہ گستاخانہ اندازِ تخاطب اتنا ناگوار گزرا کہ اُس نے ایسے بدطینت یہودیوں سے خطاب کرنا بھی پسند نہیں فرمایا حالانکہ قرآنِ حکیم میں یہود و نصاریٰ سے جابجا براہِ راست خطاب کیا گیا ہے۔

ہر نازک موقع پر منافقین مسلمانوں میں افتراق' ڈر اور خوف پیدا کر کے مسلمانوں کی اذیت کا سامان پیدا کرتے رہتے تھے۔لہٰذا الٰہی حکمت اور مصلحت نے اس بات کو گوارا نہ کیا کہ مسلمانوں اور منافقوں کے دونوں گروہ بلا امتیاز آپس میں گڈمڈ رہیں اور اسی لئے اُن کو جدا جدا رکھنا ضروری تھا۔ان گروہوں کی باہمی علیحدگی کا انتظام چند طرح سے کیا گیا: (۱) نیک اور صالح لوگوں کی آزمائش اُنہیں لگاتار مصائب میں مبتلا کرنے سے اور بدلوگوں کو دنیاوی لذات کی عیش کوشی میں کھلی چھٹی دینے سے (۲) اسلام کو فتح یاب کرنے اور کفر کو شکست دینے سے (۳) اپنے پیغمبر ﷺ کو اس بات کا علم دینے سے کہ کون سچا مسلمان ہے اور کون نہیں۔منافقون نے یہی کہا تھا کہ اگر محمد ﷺ اللہ کے سچے رسول ہیں' تو اُنہیں ہمیں بتانا چاہئے کہ ہم میں سے کون ایمان والا ہے اور کون نہیں۔اس سلسلہ میں امام بیضاوی علیہ الرحمۃ نے درج ذیل حدیث کا حوالہ دیا ہے:

اِنَّہٗ عَلَیْہِ السَّلَامُ قَالَ : عُرِضَتْ عَلَیَّ اُمَّتِیْ وَاُعْلِمْتُ مَنْ یُّؤْمِنُ بِیْ وَمَنْ یَّکْفُرُ فَقَالَ الْمُنٰفِقُوْنَ: اِنَّہٗ یَزْعَمُ اَنَّہٗ یَعْرِفُ مَنْ یُّؤْمِنُ وَمَنْ یَّکْفُرُ وَنَحْنُ مَعَہٗ وَلَا یَعْرِفُنَا فَنَزَلَتْ (تفسیر بیضاوی)

''نبی علیہ السلام نے فرمایا: میری امت مجھ پر پیش کی گئی اور میں نے جان لیا کہ کون مجھ پر ایمان لایا ہے اور کون مجھ پر ایمان نہیں لایا۔اِس پر منافقین کہنے لگے: آپ کا دعویٰ ہے کہ کون آپ پر ایمان لایا ہے اور کون آپ پر ایمان نہیں لایا۔ہم تو آپ کے ہم نشیں ہیں اور آپ کو ہماری حقیقت کا پتہ تک نہیں۔تو اس موقع پر سورہ آلِ عمران کی آیت ۱۷۹ نازل ہوئی۔'' (جو حسبِ ذیل ہے):

مَا کَانَ اللّٰہُ لِیَذَرَ الْمُؤْمِنِیْنَ عَلٰی مَا اَنْتُمْ عَلَیْہِ حَتّٰی یَمِیْزَ الْخَبِیْثَ مِنَ الطَّیِّبِ وَمَا کَانَ اللّٰہُ

لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِىْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَآءُ (آلِ عمران : ۱۷۹)
''جس حال پر ایمان والے ہیں' اللہ انہیں اُس حال پر چھوڑے رکھنے کا نہیں جب تک کہ وہ ناپاک کو پاک سے الگ نہ کر لے اور نہ اللہ تمہیں غیب پر مطلع کرنے والا ہے' البتہ اللہ جسے چاہتا ہے' اپنے رسولوں میں سے انتخاب کر لیتا ہے۔'' (۳ : ۱۷۹)

درج بالا آیت سے دو نکات حاصل ہوئے: اوّل تو یہ کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کو بخوبی علم تھا کہ منافق کون کون لوگ ہیں اور دوم یہ کہ کسی بات کا اظہار نہ کرنا اُس بات کی لاعلمی کو مستلزم نہیں۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین محبوبِ کبریاء علیہ الصلوٰۃ والسلام کی لامحدود وسعتِ علمی پر ہمیشہ شاداں وفرحاں رہتے جبکہ یہ بات منافقوں کے لئے ناقابلِ تسلیم تھی اور آپ کی خداداد وسعتِ علمی سے چڑتے ہوئے اور خشک مزاج ہوتے ہوئے انہوں نے ہمیشہ اسے اپنے رسوا کن شر کا ہدف (نشانہ) بنایا۔

تفسیر خازن اور معالم التنزیل نے درج بالا حدیث کو شرح وبسط کے ساتھ اس طرح بیان کیا ہے:
فَبَلَغَ ذٰلِكَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ فَقَامَ عَلَى الْمِنْبَرِ فَحَمِدَاللّٰهَ تَعَالٰى وَأَثْنٰى عَلَيْهِ ثُمَّ قَالَ: مَابَالُ أَقْوَامٍ طَعَنُوْا فِىْ عِلْمِىْ لَا تَسْئَلُوْنِىْ عَنْ شَىْءٍ فِيْمَا بَيْنِىْ وَبَيْنَ السَّاعَةِ إِلَّا نَبَّأْتُكُمْ بِهٖ فَقَامَ عَبْدُاللّٰهِ بْنُ حُذَافَةَ فَقَالَ: مَنْ أَبِىْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ؟ فَقَالَ: حُذَافَةُ فَقَامَ عُمَرُ فَقَالَ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ رَضِيْنَا بِاللّٰهِ رَبًّا وَبِالْإِسْلَامِ دِيْنًا وَّبِالْقُرْآنِ إِمَامًا وَّبِكَ نَبِيًّا فَاعْفُ عَنَّا عَفَااللّٰهُ عَنْكَ فَقَالَ النَّبِىُّ ﷺ: فَهَلْ أَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ؟ فَهَلْ أَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ؟ ثُمَّ نَزَلَ عَنِ الْمِنْبَرِ فَأَنْزَلَ اللّٰهُ هٰذِهِ الْاٰيَةَ (ضیاء القرآن' ج۱' ص۳۰۰)
''منافقوں کی اس طعنہ زنی کا علم اللہ کے رسول ﷺ کو ہوا تو آپ منبر پر جلوہ افروز ہوئے' اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کے بعد فرمایا: اُس قوم کا کیا حال ہوگا جو میرے علم پر اعتراض کرتے ہیں۔ اِس وقت سے لے کر قیامت تک ہونے والی کوئی بات مجھ سے پوچھو تو میں یہاں کھڑے کھڑے تمہیں اس کا جواب دوں گا۔ عبداللہ بن حذافہ اٹھے (جن کے نسب پر طعن کیا جاتا تھا) اور کہا: اے اللہ کے رسول! میرا باپ کون ہے؟ آپ نے فرمایا: تمہارا باپ حذافہ ہے۔ عمر رضی اللہ عنہ نے معذرت طلب کی اور معافی کے خواستگار ہوئے۔ حضور علیہ السلام نے دو مرتبہ فرمایا: کیا میرے علم پر اعتراض کرنے سے باز آؤ گے یا نہیں؟ پھر آپ منبر سے اترے۔ اُس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔''

''**علوم نبوّت**: اللہ کے سچے رسول کو اللہ کی ذات' اُس کی صفات' اُس کے احکام اور اُس کی طرف وحی کی گئی کتاب کے مخفی معانی کا بخوبی علم ہوتا ہے۔ اُسے اپنی اُمت کے ایمان ویقین والوں کا' اُن میں سے منافقین کا اور اُن کی نیکیوں اور بدیوں کا بھی علم ہوتا ہے۔ مرئی اور غیر مرئی (نظر آنے والی اور نظر نہ آنے والی) چیزوں پر اُس کی برابر نظر ہوتی ہے۔ جوہرِ نبوّت پر روشنی ڈالتے ہوئے امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''انسانی عقل سے ماوراء ایک مرحلہ ہر چیز کو جاننے کا بھی ہے جہاں قوّتِ مشاہدہ کی ایک اور آنکھ کھلتی ہے۔

جس کے ذریعے اللہ کا رسول مستقبل میں ہونے والے واقعات اور اُن حقیقتوں کو دیکھنے کے قابل ہوتا ہے جن کی رسائی عقل وفہم کے ذریعے نہیں ہو پاتی۔'' (اَلْمُنقِذ مِن الضَّلال 'صفحہ ۵۴)

شاہ عبدالعزیز محدّث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے غیر مرئی (نہ دیکھی جانے والی) کی دو قسمیں بتائی ہیں: غیبِ اضافی اور غیبِ مطلق۔ غیبِ اضافی کچھ کو حاصل ہوتا ہے اور کچھ کو نہیں۔ مثلاً رنگ اور ہیئت نابینا شخص کے لئے غیر مرئی ہیں لیکن دوسروں کے لئے نہیں۔ جنت' جہنم اور جنات لوگوں کے لئے غیر مرئی ہیں لیکن فرشتوں کے لئے نہیں۔ بھوک' پیاس' غصہ اور شہوانی خواہشات فرشتوں کے لئے غیر مرئی ہیں لیکن انسانوں کے لئے نہیں۔ ان سب کا تعلق غیبِ اضافی سے ہے۔

غیب کی دوسری قسم یعنی غیبِ مطلق وہ ہے جسے تمام مخلوقات سے چھپا کر رکھا گیا ہے۔ حکیمِ مطلق اللہ اس غیر مرئی کا علم صرف اپنے رسولوں اور نبیوں کو دیتا ہے۔

شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی اس وضاحت سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ غیبِ اضافی کا علم ایک عام آدمی اور فرشتوں کو بھی حاصل ہوتا ہے لیکن غیبِ مطلق کی خصوصیت صرف رسولوں کے لئے مختص ہے جو غیبِ اضافی سے کلی طور پر مختلف ہے اور جسے غیر نبی سے چھپا کر رکھا گیا ہے۔ سورۃ الجن کی مندرجہ ذیل آیات میں غیبِ مطلق کی قسم کا ذکر ہے:

عَالِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ أَحَدًاO إِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ (الجنّ : ۲۶'۲۷)

''وہی غیب کا جاننے والا ہے' سووہ اپنے غیب پر کسی کو مطلع نہیں کرتا بجز اُس رسول کے جسے اُس نے پسند فرما لیا ہو۔'' (۲۶'۲۷ : ۷۲)

اس سے معلوم ہو گیا کہ کوئی انسان خواہ کتنا ہی ذہین وفطین کیوں نہ ہو' اُس کے علم وعرفان کا پایہ کتنا ہی بلند کیوں نہ ہو اور اُس کے درجات کتنے ہی اعلیٰ وارفع کیوں نہ ہوں' وہ نہ اپنے حواس سے' نہ قوّتِ شعور سے' نہ فراست سے' نہ قیاس اور عقل سے غیب کو جان سکتا ہے بجز اس کے کہ خداوندِ عالم جو عالم الغیب ہے' وہ خود کسی کو اس نعمت سے سرفراز فرما دے۔ یہ بھی بتا دیا کہ علمِ غیب کے دروازے ہر اَیرے غیرے کے لئے کھلے نہیں بلکہ وہ صرف اُن رسولوں کو اس نعمت سے نوازتا ہے جنہیں وہ چن لیتا ہے۔ یہ ہے وہ صاف اور سیدھا مطلب جو اِن آیات سے کسی تکلف کے بغیر سمجھ میں آتا ہے۔

علامہ زمخشری معتزلی ہیں۔ اپنے عقیدۂ اعتزال کے مطابق اس آیت سے اُنہوں نے اولیائے کرام کی کرامات کی نفی کی ہے لیکن انبیاء علیہم السلام کے لئے علمِ غیب کا انکار اُنہوں نے بھی نہیں کیا۔

اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے شیطان کو دیئے گئے علم کا ذکر سورۃ الاعراف کی آیت ۲۷ میں ہے۔ لہٰذا یہ ضروری ہوا کہ اللہ کے رسول کا علم شیطان سے کہیں زیادہ ہو ورنہ شیطان کو فوقیت حاصل ہو گی اور وہ علم میں پیغمبر سے بڑھ جائے گا اور یہ بات دو وجہ سے لایعنی اور غیر معقول ہو گی: (۱) اللہ نے اعلان فرمایا: كَتَبَ اللّٰهُ لَأَغْلِبَنَّ أَنَا وَرُسُلِيْ إِنَّ اللّٰهَ

قَوِیٌّ ”عَزِیۡز“ (المجادلة:۲۱) (اللہ نے یہ بات لکھ دی ہے کہ میں اور میرے پیغمبر غالب آ کر رہیں گے، بے شک اللہ بڑی قوت والا، بڑے غلبے والا ہے ۲۱:۵۸)۔(۲) اگر شیطان کے علم کو رسولوں کے علم سے برتر اور فائق مانا جائے تو دوسرے لوگوں کے گمراہ کرنے کی طرح اُسے العیاذ باللہ رسولوں کو بھی گمراہ کرنے کی قوت حاصل ہو گی جبکہ اُس نے روزِ ازل کو اللہ کے حضور اس بات کو تسلیم کیا تھا کہ اُس کا بس اُس کے مخلص بندوں پر نہیں چل سکے گا (سورہ ص:۸۲،۸۳)۔

چنانچہ نتیجہ یہ نکلا کہ جہاں اللہ تعالیٰ نے اپنے پکے دشمن شیطان کو تمام عالم کا علم عطا فرمایا ہے، اُس نے شیطان سے کہیں زیادہ اپنے رسولوں کو علم عطا کیا ہے اور یہ بات کتنی ہی تعجب انگیز معلوم ہوتی ہے کہ کچھ لوگ شیطان کو تمام جہان کا عالم مانتے ہیں لیکن رسول کے پسِ دیوار تک کے علم کو ماننے کے لئے تیار نہیں۔

اصولی طور پر یہ بات ذہن نشین رہے کہ امام الانبیاء ﷺ کا علم ”(۱) اللہ تبارک و تعالیٰ کے علم کی طرح قدیم نہیں بلکہ حادث ہے یعنی پہلے نہیں تھا، بعد میں اللہ تعالیٰ کے عطا کرنے سے حاصل ہوا۔(۲) اللہ تعالیٰ کے علم کی طرح ذاتی نہیں بلکہ عطائی ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے سکھانے سے حاصل ہوا۔(۳) اللہ تعالیٰ کے علم کی طرح لامحدود نہیں بلکہ محدود اور متناہی ہے اور اللہ تعالیٰ کے علمِ محیط کے ساتھ آپ ﷺ کے علم کی نسبت اتنی بھی نہیں جتنی پانی کے ایک قطرے کو دنیا بھر کے سمندروں سے ہے۔“

”ہاں اتنا فرق ضرور ہے کہ آقائے نامدار ﷺ کا یہ حادث، عطائی اور محدود علم اتنا محدود نہیں جتنا بعض حضرات نے سمجھ رکھا ہے۔ اُس کی وسعتوں کو یا دینے والا جانتا ہے یا لینے والا۔ یا سکھانے والے کو معلوم ہے یا سیکھنے والے کو۔ ہم شما کس گنتی میں ہیں! جبریلِ امین بھی وہاں دَم مارنے کی مجال نہیں رکھتا۔ علم و معرفت کی وہ وسعتیں اور بے کرانیاں جن پر بیان کا ہر جامہ تنگ ہے، اُن کی حد برآری ہم کرنے لگیں تو ٹھوکریں نہیں کھائیں گے تو اور کیا ہو گا۔“

”اُس تلمیذِ رحمٰن نے اپنی زبانِ حق ترجمان سے ہمیں خود جو کچھ بتایا ہے، ہم اُسے حق تسلیم کرتے ہیں اور اُسی پر ہمارا ایمان ہے۔ اُسی کی زبانِ پاک سے نکلا ہوا یہ قولِ طیب ہم نے سنا ہے :

قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰہِ ﷺ : رَأَیۡتُ رَبِّیۡ عَزَّوَجَلَّ فِیۡ أَحۡسَنِ صُوۡرَۃٍ قَالَ : فِیۡمَ یَخۡتَصِمُ الۡمَلَأُ الۡأَعۡلٰی قُلۡتُ: أَنۡتَ أَعۡلَمُ قَالَ: فَوَضَعَ کَفَّہٗ بَیۡنَ کَتِفِیَّ فَوَجَدۡتُ بُرۡدَہٗ بَیۡنَ ثَدَیَّ فَعَلِمۡتُ مَافِی السَّمٰوٰتِ وَالۡأَرۡضِ (ضیاء القرآن، جلد سوم، صفحہ ۴۵۸)

”رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: آج میں نے اپنے بزرگ و برتر پروردگار کی بڑی حسین اور پیاری صورت میں زیارت کی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کی ہتھیلی میرے دونوں کندھوں کے درمیان رکھی جس کی ٹھنڈک میں نے اپنے سینے میں محسوس کی۔ پھر میں نے آسمانوں اور زمین کی چیزوں کو جان لیا۔“

اس حدیثِ پاک کی شرح کرتے ہوئے شیخ عبدالحق محدّث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ مشکوٰۃ کی شرح اشعۃ اللمعات

میں فرماتے ہیں کہ اس ارشادِ نبوی کا مقصد یہ ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ کو تمام علومِ جزوی اور کلی حاصل ہو گئے اور آپ نے اُن کا احاطہ کر لیا ہے۔

علامہ علی القاری علیہ الرحمۃ نے بھی اپنی کتاب ''المرقاۃ شرح المشکوٰۃ'' میں اسی سے ملتی جلتی بات لکھی ہے۔

سورۃ المنافقون کی آیات اوّل تا سوم میں منافقین کے متعلق یہ کہا گیا ہے :

اِذَا جَآءَكَ الْمُنَافِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنَافِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ O اِتَّخَذُوْٓا اَيْمَانَهُمْ جُنَّةً فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اِنَّهُمْ سَآءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ O ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا فَطُبِعَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ O (المنافقون : ۱ تا ۳)

''(اے نبی مکرّم!) جب آپ کے پاس منافق آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ بے شک اللہ کے رسول ہیں تو اللہ کو تو یہ معلوم ہی ہے کہ آپ اُس کے رسول ہیں لیکن اللہ (اس کی بھی) گواہی دیتا ہے کہ منافق جھوٹے ہیں۔ ان لوگوں نے اپنی قسموں کو سپر بنا رکھا ہے' پھر یہ لوگ (دوسروں کو بھی) اللہ کی راہ سے روکتے ہیں' کیا ہی بُرے اُن کے کرتوت رہے ہیں! یہ اس سبب سے ہے کہ یہ لوگ ایمان لے آئے پھر کافر ہو گئے' سو اُن کے دلوں پر مہر کر دی گئی تو یہ (اب) نہیں سمجھتے۔'' (۱ تا ۶۳:۳)

جب منافقین کہتے ہیں کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں تو اُن کا یہ قول بذاتِ خود اللہ کی صداقت ہے لیکن اُن کے دلوں میں جھوٹ اور کِذب کے سوا کچھ نہیں چھپا ہوا۔ اُن کے دوغلے پن نے اُن کے فہم کی صلاحیت کو دُھندلا دیا ہے۔

اسی سورہ کی اگلی آیت چہارم میں اُن کے بارے میں مزید یہ کہا گیا ہے:

وَاِذَا رَاَيْتَهُمْ تُعْجِبُكَ اَجْسَامُهُمْ وَاِنْ يَّقُوْلُوْا تَسْمَعْ لِقَوْلِهِمْ كَاَنَّهُمْ خُشُبٌ مُّسَنَّدَةٌ يَحْسَبُوْنَ كُلَّ صَيْحَةٍ عَلَيْهِمْ هُمُ الْعَدُوُّ فَاحْذَرْهُمْ قَاتَلَهُمُ اللّٰهُ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ O (المنافقون : ۴)

''اور جب آپ اُنہیں دیکھیں تو اُن کے قد و قامت آپ کو خوشنما معلوم ہوں اور اگر وہ بات کرنے لگیں تو آپ اُن کی باتیں سننے لگیں گویا وہ سہارے سے لگائی ہوئی لکڑیاں ہیں' ہر غُل پکار کو وہ اپنے ہی اوپر سمجھنے لگتے ہیں' یہی لوگ (پکے) دشمن ہیں پس آپ اُن سے ہوشیار رہیے' اللہ اُنہیں غارت کرے وہ کہاں پھرے چلے جاتے ہیں۔''

عبداللہ بن اُبی' جدّ بن قیس اور معقب بن قُشیر شکل و صورت کے اعتبار سے بڑے خوبصورت تھے' نگاہیں اُن کے چہروں پر جم کر رہ جاتی تھیں۔ اس کے ساتھ وہ پرلے درجے کے باتونی اور چرب زبان تھے۔ اُن کی گفتگو سن کر انسان عش عش کر اٹھتا تھا۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے کہ اُن کے جسم بڑے دلکش معلوم ہوتے ہیں' اُن کی گفتگو سنی جائے تو اس میں بڑی جاذبیت اور اثر ہوتا ہے۔ لیکن اگر اُن کی حقیقت پر نظر ڈالی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ جمالی خربوزے ہیں' باہر سے خوبصورت' اندر سے پھیکے۔ انسانی کمالات تو کجا' اُن میں انسانی خوبیوں کا نام و نشان تک بھی نہیں۔ قرآن کریم نے

اُنہیں خُشُب" مُسَنَّدَة" سے تشبیہ دے کر اُن کی لغویت کو عیاں کر دیا۔ خُشُب" کا معنیٰ لکڑی۔ مُسَنَّدَة" کا معنیٰ جسے دیوار کے ساتھ کھڑا کر دیا گیا ہو۔ جب تک لکڑی کارآمد ہوتی ہے اِس سے شہتیر، کڑی یا کواڑ وغیرہ بنائے جاتے ہیں۔ صرف بے کار لکڑی کو دیوار کے ساتھ کھڑا کر دیا جاتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ وہ آگ جلانے کے کام آسکتی ہے۔ آج بھی منافقوں، زندیقوں اور بے دینوں کے مجمع میں کیسے کیسے خوش پوش اور کیسے کیسے خوش ظاہر نظر آتے ہیں اور آج بھی منافقوں، زندیقوں اور بے دینوں کے مجمع میں کیسے کیسے خوش تقریر، خوش تحریر خطیب و ادیب نظر آتے ہیں۔

ان منافقوں کی کج فطرت کے نزدیک رسول اللہ ﷺ کے وسیلہ کے بغیر صرف اللہ کو خوش کر دینا ہی کافی ہے کیونکہ اُن کے نزدیک رب تعالیٰ کی رضا اور اُس کا قرب حاصل کرنے کے لئے محمد ﷺ کو وسیلہ بنانا صریحاً شرک ہے۔ اس حقیقت کا اظہار سورۃ النساء اور سورۃ المُنافقون میں ان الفاظ میں کیا گیا ہے:۔

(۱) وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا إِلَىٰ مَا أَنزَلَ اللَّهُ وَإِلَى الرَّسُولِ رَأَيْتَ الْمُنَافِقِينَ يَصُدُّونَ عَنكَ صُدُودًا O (اَلنساء: ۶۱)

"اور جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ اُس حکم کی طرف آؤ جسے اللہ نے نازل کیا ہے اور رسول کی طرف آؤ تو (اے نبیِ مکرّم!) آپ دیکھیں گے کہ منافقین آپ کی طرف سے بڑی پہلو تہی کر رہے ہیں۔" (۴:۶۱)

(۲) وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا يَسْتَغْفِرْ لَكُمْ رَسُولُ اللَّهِ لَوَّوْا رُءُوسَهُمْ وَرَأَيْتَهُمْ يَصُدُّونَ وَهُم مُّسْتَكْبِرُونَ O (المنافقون: ۵)

"اور جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ آؤ رسول اللہ تمہارے لئے استغفار کر دیں تو وہ اپنا سر پھیر لیتے ہیں اور (اے نبیِ مکرّم!) آپ اُنہیں دیکھیں گے کہ تکبّر کرتے ہوئے بے رخی کر رہے ہیں۔" (۵ : ۶۳)

علامہ قرطبی علیہ الرحمۃ نے یہاں ایک بڑی بصیرت افروز بات لکھی ہے کہ جب رئیس المنافقین عبداللہ بن اُبی کے قبیلہ والوں نے اُسے سمجھایا کہ اب بھی حاضرِ خدمت ہو کر معافی مانگ لو۔ نبیِ مکرّم ﷺ تیری بخشش کے لئے دعا فرمائیں گے تو تیری بدبختی، نیک بختی سے بدل جائے گی تو اُس نے ازراہِ نخوت و تکبّر نفی میں سر ہلایا اور کہنے لگا:

أَمَرْتُمُونِي أَنْ أُؤْمِنَ فَقَدْ آمَنْتُ وَأَنْ أُعْطِي زَكٰوةَ مَالِي فَقَدْ أَعْطَيْتُ فَمَا بَقِيَ إِلَّا أَنْ أَسْجُدَ لِمُحَمَّدٍ (صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَآلِهٖ وَسَلَّم)

"تم نے مجھے ایمان لانے کا حکم دیا تو میں ایمان لے آیا، تم نے مجھے اپنے مال کی زکوٰۃ دینے کا کہا تو میں نے زکوٰۃ بھی ادا کر دی۔ اب ایک ہی بات باقی ہے کہ میں محمد (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کو سجدہ کروں، یہ مجھ سے نہیں ہوگا۔"

"اس روایت میں غور کیجئے گا کہ منافق کا ذہن کس طرح غلط راہ پر چلتا ہے اور اُس کی سوچ میں کس قدر بگاڑ پیدا ہوتا ہے، بارگاہِ نبوّت میں حاضری اور محبوبِ کبریاء علیہ الصلوٰۃ والسلام سے اپنی بخشش کی دعا کرانے میں اُسے صریح شرک نظر آتا ہے۔ وہ اپنے اعمال، نماز، روزہ، زکوٰۃ وغیرہ پر ہی نازاں رہتا ہے اور یہ ضرورت محسوس نہیں کرتا کہ اللہ تعالیٰ کے حبیب کے درِ کرم پر حاضر ہو کر اُس کی رحمتوں سے اپنے دامن کو لبریز کرے۔" (ضیاء القرآن، ج ۵، ص ۲۵۳)

دربارِ نبی سے روکنے والے آج کے اُن نام نہاد ''مسلمانوں'' کے لئے بھی اس میں لمحۂ فکریہ ہے کہ کیا اُن کا یہ عمل رسول اللہ ﷺ کے ہم عصر منافقین جیسا تو نہیں ہے جن کی بابت قرآن میں سخت وعید آئی ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے ساتھ منافقین کا رویّہ: امام الانبیاء ﷺ کی ذاتِ مقدّسہ منافقینِ مدینہ کی زہر آلود مہم کا ہدف تھی لیکن نصرتِ خداوندی ہمیشہ آپ ﷺ کے ساتھ رہی۔ اس حقیقت کا اظہار قرآن مجید نے یوں کیا ہے:

يُرِيْدُوْنَ لِيُطْفِئُوْا نُوْرَاللهِ بِأَفْوَاهِهِمْ وَاللهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ O (الصّفّ:۸)

''یہ (نادان) اللہ کے نور کو اپنے پھونکوں سے بجھا دینے چاہتے ہیں لیکن اللہ اپنے نور کو کمال تک پہنچا کر رہے گا خواہ اُسے کافر سخت ناپسند کریں۔'' (۸ : ۶۱)

اسلام چھپ چھپ کر وقت گزارنے کے لئے یا باطل سے مصالحت کر کے زندہ رہنے کے لئے نہیں آیا۔ یہ اللہ تعالیٰ کے شیروں کا اور شمعِ حق کے پروانوں کا دین ہے۔ سارا کفر و شرک اگر اپنی قوّتوں کو یکجا کر بھی لے تب بھی وہ اُنہیں ہراساں اور پسپا نہیں کر سکتا۔ اس کے مجاہد باطل کے پرستاروں کو تیروسناں سے ہمیشہ مغلوب کرتے رہیں گے اور اُس کے علماء دلائل و براہین سے شرک کے علمبرداروں کو ہمیشہ شکست دیتے رہیں گے اور اسلامی معاشرہ اپنے پاکیزہ تمدن، اپنی نورانی تہذیب، اپنے منصفانہ نظامِ معیشت اور اخلاقِ حسنہ کے باعث اسلام کی برتری اور فتح مندی کا پرچم لہراتا رہے گا (ان شاء اللہ تعالیٰ)۔

سورۃ التـــوبۃ بالخصوص نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ منافقین کے رویّہ پر روشنی ڈالتی ہے۔ اس سلسلہ میں اِس سورہ کی کچھ آیات درجِ ذیل ہیں :

(۱) وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّلْمِزُكَ فِي الصَّدَقَاتِ فَإِنْ أُعْطُوْا مِنْهَا رَضُوْا وَإِنْ لَّمْ يُعْطَوْا مِنْهَا إِذَا هُمْ يَسْخَطُوْنَ O (التّوبة : ۵۸)

''اور اُن میں ایسے بھی ہیں جو آپ پر صدقات کے بارہ میں طعن کرتے ہیں لیکن اگر اُنہیں اُن میں سے مل جاتا ہے تو راضی ہو جاتے ہیں اور اگر انہیں اُن میں سے نہیں ملتا تو ناراض ہو جاتے ہیں۔'' (۹:۵۸)

بارگاہِ رسالت میں جب زکوٰۃ و عشر کا مال آتا اور حضور علیہ السلام اپنے ربِّ قدیر کے حکم کے مطابق اُسے خرچ کرتے تو منافقین کا رویّہ جو دولت کے لالچ میں از خود رفتہ ہو چکے تھے، عجیب تھا۔ اگر اُنہیں کچھ مل جاتا تو خوش ہو جاتے اور اگر نہ ملتا تو پھر آقا علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذاتِ اقدس واطہر پر زبانِ طعن دراز کرنے لگتے۔

نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذاتِ مقدّسہ معصوم اور ہر قسم کی خطا سے مبرّا ہے اور آپ کے خالق و مالک کا غیر مرئی ہاتھ آپ کی نصرت و اعانت کے لئے ہر وقت مستعد ہے جو آپ سے کبھی بھی کوئی غلط یا نامبارک کام نہیں ہونے دیتا پھر آپ کے کسی فعل و عمل پر زبانِ طعن دراز کرنے کا کیا مطلب! اور یہ طعن اور زبان درازی حکیمِ مطلق اللہ کے خلاف ہو گی!

(۲) وَمِنْهُمُ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ النَّبِيَّ وَيَقُوْلُوْنَ هُوَ اُذُنٌ "قُلْ اُذُنُ خَيْرٍ لَّكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَيُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ وَرَحْمَةٌ" لِّلَّذِيْنَ آمَنُوْا مِنْكُمْ وَالَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ رَسُوْلَ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ" اَلِيْمٌ " (التوبة: ۶۱)

''اور اُن میں سے کچھ ایسے ہیں جو (اپنی بدزبانی سے) نبی (علیہ السلام) کو اذیت دیتے ہیں اور کہتے ہیں یہ کانوں کا کچا ہے۔ آپ فرمادیجئے کہ وہ تمہارے حق میں خیر ہی کے باب میں کان دے کرسنتے ہیں، اللہ پر ایمان رکھتے ہیں، مؤمنوں (کی بات) پر یقین رکھتے ہیں اور اُن کے لئے سراپا رحمت ہیں جو تم میں سے ایمان لائے اور جو لوگ اللہ کے رسول کو دکھ پہنچاتے ہیں، اُن کے لئے دردناک عذاب ہے۔'' (۹ : ۶۱)

ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ جو شخص ہر ایک کی بات سنے بھی اور اُسے مان بھی لے اُسے رَجُـــل ''اُذُن'' کہا جاتا ہے (تفسیر قرطبی)۔ منافقین کا یہ شیوہ تھا کہ اپنی نجی محفلوں میں اسلام اور پیغمبرِ اسلام ﷺ کی جنابِ پاک میں جو جی میں آتا، بک دیتے۔ اگر کوئی اُنہیں کہتا کہ اگر تمہاری باتوں کا علم حضور علیہ السلام کو ہو گیا تو تمہاری بڑی رسوائی ہوگی تو وہ نابکار کہتے کہ اس کی فکر نہ کرو، وہ کانوں کے بڑے کچے ہیں۔ اگر کسی نے ہماری کوئی بات اُن سے کہہ بھی دی تو ہم جا کر حلفیہ بیان دے دیں گے کہ ہم نے یہ بات ہرگز نہیں کہی تو وہ فوراً ہماری بات مان جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میرے محبوب کا تمہاری بات سن لینا اور تم سے اُن کا منہ موڑ لینا ہی تمہارے لئے اچھا ہے۔ ورنہ اگر حقیقت آشکار کر دی جاتی تو تمہارا نفاق ظاہر ہو جاتا اور تم رُوسیاہوں کو منہ چھپانے کے لئے جگہ نہ ملتی۔ وہ تو محض ازراہِ شفقت و پردہ پوشی تم سے اِعراض کرتے ہیں۔ یہ مت سمجھو کہ وہ تمہاری بات کو سچ سمجھتے ہیں اور تمہارا جھوٹ اُن سے پوشیدہ رہتا ہے۔ وہ تو صرف اللہ تعالیٰ کی بات کا یقین رکھتے ہیں اور مخلص اہلِ ایمان کی باتوں پر اعتماد کرتے ہیں۔

(۳) يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ مَاقَالُوْا وَلَقَدْ قَالُوْا كَلِمَةَ الْكُفْرِ وَكَفَرُوْا بَعْدَ اِسْلَامِهِمْ وَهَمُّوْا بِمَالَمْ يَنَالُوْا وَمَا نَقَمُوْا اِلَّا اَنْ اَغْنٰهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ مِنْ فَضْلِهٖ (التوبة: ۷۴)

''وہ اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں کہ اُنہوں نے یہ نہیں کہا حالانکہ اُنہوں نے یقیناً کفر کی بات کہی تھی اور اُنہوں نے اسلام لانے کے بعد کفر اختیار کیا اور اُنہوں نے ایسی چیز کا ارادہ بھی کیا جسے وہ نہ پا سکے اور اُنہوں نے صرف اس بات کا بدلہ دیا کہ اللہ اور اُس کے رسول نے اُنہیں اپنے فضل سے مالدار کر دیا تھا۔'' (۹:۷۴)

ان منافقوں کی کمینہ فطرتی پر یہ ایک طنزِ لطیف ہے۔ منافقینِ مدینہ عموماً غریب تھے۔ اسلام ہی کی بدولت اُنہیں مالِ غنیمت میں سے کچھ ملنے لگا تھا۔ یہ احسان فراموش قرضوں کے بوجھ تلے دبے جا رہے تھے، کھانے تک کو میسر نہ تھا۔ میرا رسول اُن میں تشریف فرما ہوا تو اُن کی برکت سے اِن کے کاروبار میں برکت ہوئی، کھیتوں میں اناج پیدا ہونے لگا۔ اب جب اُن کی مالی حالت اچھی ہوگئی تو بجائے اس کے کہ اللہ اور اُس کے رسول نے اُنہیں جن نوازشا[ت سے نوازا تھا] اُس کا شکریہ ادا کرتے، اُلٹا مخالفت پر آمادہ ہیں۔ ایسے طنزیہ محاورے ہر زبان میں ہیں۔ اردو میں اس کے سوا اور کیا قصور ہے کہ میں نے اُسے مصیبت سے نجات دلائی یا جی ہاں مجھ سے یہ خطا ضرور شخص کے کام آ گیا تھا۔

اس قسم کے طنز لطیف کی مثال متنبّی کا یہ کلام بھی ہے جس میں وہ کہتا ہے :

مَا نَقَمُوْا مِنْ بَنِيْ أُمَيَّةَ اِلَّا أَنَّهُمْ يَحْلُمُوْنَ اِذَا غَضِبُوْا
وَلَا عَيْبَ فِيْهِمْ أَنَّ سُيُوْفَهُمْ بِهِنَّ فُلُوْلٌ" مِّنْ قِرَاعِ الْكَتَائِبِ

"یہ لوگ بنی امیہ سے اس لئے ناراض ہوئے کہ وہ لوگ غصّہ کے وقت بُردباری سے کام لیتے ہیں۔
اُن میں کوئی عیب نہیں ہاں صرف یہ عیب ہے کہ اُن کی تلواروں کی دھاریں دشمنوں کی سرکوبی دشمنوں کی سرکوبی کرتے کرتے کند ہوگئی ہیں۔

آیت ۷۴ میں الوہیت اور رسالت میں یگانگت کی مثال ہے اس طرح کہ اَغْنٰا بھی واحد ہے اور فَضْلِهٖ میں ضمیر غائب بھی واحد ہے اور ان دونوں لفظوں کے درمیان اللہ اور اُس کے رسول کا ذکر ہے۔

(۴) وَمِنْهُمْ مَّنْ عٰهَدَ اللّٰهَ لَئِنْ آتٰنَا مِنْ فَضْلِهٖ لَنَصَّدَّقَنَّ وَلَنَكُوْنَنَّ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ O فَلَمَّا آتَاهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ بَخِلُوْا بِهٖ وَتَوَلَّوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ O (التوبة : ۷۵، ۷۶)
"اور اُن میں سے کچھ ایسے ہیں جنہوں نے اللہ کے ساتھ وعدہ کیا تھا کہ اگر اللہ نے اپنے فضل میں سے دیا تو ہم دل کھول کر خیرات کریں گے اور نیکو کاروں میں سے ہو جائیں گے۔ پھر جب اللہ نے اُنہیں اپنے فضل سے عطا فرما دیا تو اس کے ساتھ کنجوسی کرنے لگے اور رُوگردانی کر لی اور وہ (ابھی تک) منہ پھیرے ہوئے ہیں۔" (۹ : ۷۵، ۷۶)

ثعلبہ بن حاطب بارگاہِ رسالت میں حاضر ہو کر عرض کناں ہوا کہ یا رسول اللہ! دعا فرمایئے کہ اللہ تعالیٰ مجھے مالدار کر دے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا: اے ثعلبہ! کیا تمہیں یہ بات پسند نہیں کہ تم میری طرح رہو۔ اگر میں چاہتا تو یہ پہاڑ سونے کے بن جاتے اور میرے ساتھ چلتے۔ اُس نے پھر وہی عرض کی کہ حضور دعا فرما دیں کہ میں مالدار ہو جاؤں اور اللہ کی قسم! جس نے آپ کو نبی برحق مبعوث فرمایا' اگر مجھے دولت ملی تو میں ہر حقدار کا حق ادا کروں گا۔ آپ ﷺ نے پھر فرمایا اے ثعلبہ! تھوڑا مال جس کا تم شکر ادا کر سکو' اُس زیادہ مال سے بہتر ہے جس کا تم شکر ادا کرنے سے قاصر رہو۔ لیکن اُس نے پھر اپنی عرض دہرائی تو رحمۃ للعالمین کے دست ہائے مبارک دعا کے لئے اٹھ گئے کہ اے اللہ! اُسے مال عطا فرما۔ اب اِدھر لبِ مصطفیٰ علیہ السلام دعا کے لئے کھلے تو اُدھر رزق کے دروازے کھل گئے۔ اُس نے چند بکریاں خریدیں اور اُن میں اتنی برکت ہوئی کہ مدینہ میں کوئی حویلی ایسی نہ تھی جہاں وہ سما سکتیں۔ باہر دور جنگل میں ڈیرہ بنایا۔ پہلے تو یہ حالت تھی کہ صبح و شام مسجد میں بسر ہوتی اور اِسی وجہ سے اُسے حَمَامَةُ الْمَسْجِد (مسجد کی فاختہ) کہا جاتا تھا۔ اب پہلے دن کو غیر حاضری ہوئی' پھر رات کو بھی غیر حاضری ہونے لگی۔ ہفتہ میں صرف جمعہ کی نماز مسجدِ نبوی میں نصیب ہوتی لیکن ریوڑ کی غیر متوقع افزائش کے باعث مصروفیات اتنی بڑھیں کہ جمعہ تو کیا عید کے دن بھی حاضری نصیب نہ ہوتی۔ اِسی اثنا میں زکوٰۃ کا حکم نازل ہوا۔ حضور علیہ السلام نے ایک خط دے کر اپنے دو عامل اُس کے پاس زکوٰۃ کی وصولی کے لئے روانہ فرمائے۔ اُس نے کہا کہ یہ تو بہت زیادتی ہے۔ تم ذرا آگے سے ہو آؤ میں اتنے میں سوچ رکھوں گا۔

گا۔ وہ دونوں اُس کے ہاں سے سلیمی کے پاس گئے۔ اُس نے ثعلبہ کی بات سن لی تھی۔ اُس نے بہترین جانور زکوٰۃ کے لئے بخوشی پیش کر دئے۔ جب واپسی پر ان عاملوں کا اس کے پاس سے گزر ہوا تو کہنے لگا ذرا وہ خط دکھاؤ، دیکھوں اس میں کیا لکھا ہے۔ پڑھنے کے بعد کہنے لگا یہ تو جزیہ ہے۔ تم جاؤ میں ذرا سوچ لوں۔ جب وہ عامل بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوئے تو اس سے پیشتر کہ وہ کچھ عرض کریں حضور علیہ السلام نے فرمایا: وَیحَ یَا ثَعلَبَۃ (ثعلبہ ہلاک ہوگیا) اور سلیمی کے لئے آپ نے دعا فرمائی۔ چنانچہ ثعلبہ کے بارے میں آیاتِ بالا ۷۵، ۷۶، ۷۷ نازل ہوئیں۔ اُس کے رشتہ داروں نے اُسے بتایا کہ تیرے متعلق یہ آیات نازل ہوئی ہیں تو وہ زکوٰۃ لے کر حاضر ہوا۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے تیرا صدقہ قبول کرنے سے مجھے منع فرما دیا ہے۔ اس پر وہ رونے لگا اور سر پر خاک ڈالنے لگا۔ پھر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں بھی وہ زکوٰۃ لے کر حاضر ہوا تو آپ نے فرمایا کہ تیری زکوٰۃ اللہ کے رسول ﷺ نے قبول نہیں فرمائی تو میں کیسے قبول کر سکتا ہوں؟ پھر عہدِ فاروقی میں زکوٰۃ لے کر حاضر ہوا تو اُنہوں نے اُسی جواب کے ساتھ رد فرما دی۔ چنانچہ اسی حالت میں وہ عہدِ عثمانی میں مرگیا۔'' (ضیاء القرآن، ج ۲، ص ص ۲۳۵، ۲۳۶)

(۵) هُمُ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ لَا تُنْفِقُوْا عَلٰى مَنْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ حَتّٰى يَنْفَضُّوْا وَلِلّٰهِ خَزَآئِنُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَفْقَهُوْنَ ○ يَقُوْلُوْنَ لَئِنْ رَّجَعْنَآ اِلَى الْمَدِيْنَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ مِنْهَا الْاَذَلَّ وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ○ (المنٰفقون: ۷، ۸)

''یہی لوگ تو کہتے ہیں کہ جو لوگ رسول اللہ کے پاس جمع ہیں، اُن پر کچھ خرچ نہ کرو یہاں تک کہ وہ (آپ ہی) منتشر ہو جائیں گے حالانکہ آسمانوں اور زمین کے خزانے اللہ ہی کے ہیں البتہ منافقین نہیں سمجھتے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر ہم اب مدینہ کو لوٹ کر جائیں گے تو عزت والے وہاں سے ذلیلوں کو نکال باہر کریں گے حالانکہ عزت تو بس اللہ ہی کی ہے، اور اُس کے پیغمبر کی اور ایمان والوں کی ہے البتہ منافقین اس کا علم نہیں رکھتے۔'' (۶۳: ۷، ۸)

روایات میں آتا ہے کہ غزوہ بنی مصطلق کے موقع پر انصار و مہاجرین کے درمیان رنجش ہوگئی تھی۔ منافقین کو موقع مل گیا۔ انصار کے ہمدرد و خیر خواہ بن کر اُن سے بولے کہ تم ہی نے تو رشتہ مواخات قائم کر کے اُن کے حوصلے بڑھا دئے اور اُن کے دماغ خراب کر دئے ہیں۔ تم آج خرچ دینا بند کر دو تو ابھی یہ مجمع منتشر ہو جاتا ہے۔ مَنْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ سے مراد مہاجرین ہیں۔ قرآن فرما رہا ہے کہ اُن کی کمال حماقت و نادانی تو دیکھو کہ وہ یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ مہاجرین کے رزق کا مدار انصارِ مدینہ کے چندہ اور عطیہ پر ہے! رَجَعْنَآ اِلَى الْمَدِيْنَةِ (اگر ہم مدینہ کو لوٹ کر جائیں گے) یہ گفتگو مدینہ سے باہر غزوہ بنی مصطلق کے موقع پر ہو رہی تھی۔

''دنیا میں عِزّۃ یعنی علو اور غلبہ کے بڑے اور اصلی مظہر دو ہیں: ایک مال اور دوسرے جاہ۔ قرآنِ حکیم نے اہلِ ایمان کو یہ حقیقت بتائی ہے کہ یہ دونوں مقصد مرکزِ حقیقی ہی سے تعلق جوڑے رکھنے سے حاصل ہو سکتے ہیں نہ کہ اُس سے کٹ جانے سے۔ پہلی حقیقت کا اظہار آیتِ بالا ہفتم میں اور دوسری حقیقت کا اظہار اس سے اگلی آیت ہشتم میں ہو رہا ہے۔ (ماجدی اُردو، ص ۱۱۱۱، نوٹ: ۱۲)

(٦) وَ يَقُوْلُوْنَ آمَنَّا بِاللّٰهِ وَ بِالرَّسُوْلِ وَ أَطَعْنَا ثُمَّ يَتَوَلّٰى فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ مِّنْ بَعْدِ ذٰلِكَ وَمَا أُولٰٓئِكَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ O وَاِذَا دُعُوْآ اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ مُّعْرِضُوْنَ O وَ اِنْ يَّكُنْ لَّهُمُ الْحَقُّ يَأْتُوْآ اِلَيْهِ مُذْعِنِيْنَ O أَفِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ أَمِ ارْتَابُوْآ أَمْ يَخَافُوْنَ أَنْ يَّحِيْفَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَرَسُوْلُهٗ بَلْ أُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ O (اَلنور : ۴۷ تا ۵۰)

''اور یہ لوگ کہتے (تو) ہیں کہ ہم اللہ اور رسول پر ایمان لے آئے اور اُن کا حکم مانا' پھر ان میں کا ایک گروہ اس کے بعد سرتابی کرتا ہے اور یہ لوگ (ہرگز) ایمان والے نہیں۔ اور جب انہیں اللہ اور اُس کے رسول کی طرف بلایا جاتا ہے کہ (رسول) اُن کے درمیان فیصلہ کر دیں تو اُن میں کا ایک گروہ پہلو تہی کرتا ہے اور اگر اُن کا حق (نکلتا) ہوتا ہے تو (رسول) کی طرف سرِ تسلیم خم آ جاتے ہیں۔ آیا اُن کے دلوں میں مرض ہے یا یہ شک میں پڑے ہوئے ہیں یا اُنہیں یہ اندیشہ ہے کہ اللہ اور اُس کا رسول اُن پر ظلم نہ کرنے لگیں۔ (نہیں) بلکہ یہ لوگ تو خود ہی ظالم ہیں۔'' (۴۷ تا ۵۰ : ۲۴)

''کسی مقدمہ کے تصفیہ کے لئے منافقین صرف اُس قاضی کے پاس جاتے جو اُن کے حق میں فیصلہ دے۔ اگر اُن کا حق کسی اور کے ذمہ نکلتا ہوتا ہے اور یہ خود مظلوم ہوتے ہیں تو بے تکلف بارگاہِ نبوی میں چلے آتے ہیں اس اطمینان پر کہ وہاں تو حق رسی ہی ہوگی۔ لیکن اگر وہ برسرِ ظلم ہوتے تو ان مقدمات کو حضورِ نبوی میں لانے سے پہلو تہی کرتے کہ وہاں تو قلعی کھل کر رہے گی۔ اس صورت میں وہ ایسی عدالت میں جاتے جو فیصلہ کے پلڑے کو اُن کے حق میں جھکائے۔ خود غرضی اور عصبیت کی یہ شکل صرف منافقینِ مدینہ تک ہی محدود نہ تھی بلکہ یہ ہر دور میں مشترک رہی ہے اور اس کی بہر حال حوصلہ شکنی ہونی چاہئے۔'' (عبداللہ یوسف علی' نوٹ : ۳۰۲۵)

(۷) وَأَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ أَيْمَانِهِمْ لَئِنْ أَمَرْتَهُمْ لَيَخْرُجُنَّ قُلْ لَّا تُقْسِمُوْا طَاعَةٌ مَّعْرُوْفَةٌ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ O (اَلنور : ۵۳)

''اور یہ لوگ بڑے شدّ ومدّ سے اللہ کی قسم کھاتے رہتے ہیں کہ اگر آپ ہمیں حکم دیں تو ہم نکل پڑیں (گھر بار سب چھوڑ چھاڑ کر) آپ فرمائیے کہ قسمیں نہ کھاؤ' (تمہاری) فرمانبرداری خوب معلوم ہے' اللہ تمہارے اعمال کی پوری خبر رکھتا ہے۔'' (۵۳ : ۲۴)

(۸) وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُ اِلَيْكَ حَتّٰى اِذَا خَرَجُوْا مِنْ عِنْدِكَ قَالُوْا لِلَّذِيْنَ أُوْتُوا الْعِلْمَ مَاذَا قَالَ اٰنِفًا أُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَاتَّبَعُوْآ أَهْوَآءَهُمْ O (محمد : ۱۶)

''اور اُن میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جو آپ کی طرف کان لگاتے ہیں' یہاں تک کہ جب آپ کے پاس سے وہ باہر جاتے ہیں تو جو صاحبِ علم ہیں اُن سے پوچھتے ہیں کہ ابھی انہوں نے کیا کہا تھا؟ یہی لوگ ہیں کہ اللہ نے اُن کے دلوں پر مہر کر دی ہے اور وہ اپنی نفسانی خواہشوں پر چل رہے ہیں۔'' (۴۷:۱۶)

یعنی اُن کے چہرہ بشرہ سے بہ ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی گفتگو کو غور و توجہ سے سن رہے ہیں حالانکہ واقعہ یہ

نہیں۔مجلسِ رسول میں بیٹھنے کے بعد بھی یہ منافقین ایسے کورے رہتے ہیں کہ جب باہر نکلتے ہیں تو اہلِ علم و ایمان سے پوچھتے ہیں کہ یہ ابھی کیا ارشاد ہوا تھا۔آیت سے معلوم ہوا کہ جب تک بیٹھنے والے کے دل میں قصدِ استفادہ نہ ہو، بڑے سے بڑے مرشد کی صحبت و ہم نشینی بھی بے اثر رہتی ہے۔

تبوک کی مہم اور منافقین :''سال ۹ ہجری ر۶۳۰ عیسوی میں یہ مہم ملکِ روم کی عظیم سلطنت جو اُس دور کی سپر پاور تھی' کے خلاف ہوئی جس میں مسلمان مجاہدین کو شدید اور انتہا کی صعوبتوں اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اور اسی وجہ سے اسے سورۃ التوبۃ کی آیت ۱۱۷ میں ساعۃ العُسرۃ (تنگی کا وقت) کہا گیا ہے۔شدید گرمی کے علاوہ سامانِ خوراک اور پانی اس قدر نایاب تھے کہ دو آدمیوں کو ایک ہی کھجور پر گزارہ کرنا پڑا اور کئی صحابہ کرام اونٹوں کی کوہانوں میں موجود پانی سے اپنی پیاس بجھانے پر مجبور ہو گئے۔تمام صحابہ اس ہنگامی فوج میں شامل ہونے کے لئے حاضر ہوئے لیکن صحرائی عرب اپنی وفاداری میں ہمیشہ نا استوار اور ڈھلمل ہوتے ہیں اور مدینہ منورہ کے باسیوں نے حکم کی تعمیل میں بہت مستعدی اور پھرتی دکھائی۔سفر کی صعوبتوں کی پیش بینی' طویل اور مسلسل خشک سالی اور انتہائی شدید گرمی غرض ان سب مشکلات کے پیشِ نظر بھی صحابہ کرام اپنے گھروں کے آرام و پناہ کو چھوڑنے پر تیار ہو گئے۔

اُس جھلسا دینے والی اور جلن پیدا کرنے والی گرمی میں طویل سفر کی صعوبتوں کی پیش بینی میں اور عظیم رومی سلطنت کی تربیت یافتہ افواج سے مقابلہ کرنے کے منظر سے مدینہ منورہ کے کچھ منافقین نے پیغمبر علیہ السلام سے رخصت لینے کا منصوبہ بنایا کہ اُنہیں مسلمان فوج میں شامل ہونے سے مستثنیٰ کر دیا جائے۔اُن میں سے کچھ تو بہانے بناتے آئے اور کچھ دعوتِ نبوی کو نظرانداز کرتے ہوئے آئے بھی نہیں بلکہ گھروں میں بیٹھ رہے۔اللہ کا یہ محبوب اور پیارا پیغمبر چونکہ نرم دل اور مہربان واقع ہوا تھا' لہٰذا آپ ﷺ کھلے دل سے اُن کے بہانوں کو سنتے گئے اور اُنہیں مستثنیٰ کرتے گئے جو عسکری (فوجی) نقطہ نگاہ سے بڑی کشادہ دلی کی بات ہے۔

سورۃ التّوبۃ میں منافقین کا جہاد سے بلا عذر بچ جانے کی اجازت لینے کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے :

إِنَّمَا يَسْتَأْذِنُكَ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَارْتَابَتْ قُلُوبُهُمْ فَهُمْ فِي رَيْبِهِمْ يَتَرَدَّدُونَ ○ (التّوبۃ : ۴۵)

''(اے نبی محترم!) آپ سے تو اجازت وہی لوگ مانگتے ہیں جو اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان ہی نہیں رکھتے اور اُن کے دل شک میں پڑے ہوئے ہیں اور وہ اپنے شک میں پڑے ہوئے حیران ہیں۔'' (۹:۴۵)

اُن کی سست کرداری اور سست روی کا نقشہ ذیل کی آیات میں کھینچا گیا ہے :

وَلَوْ أَرَادُوا الْخُرُوجَ لَأَعَدُّوا لَهُ عُدَّةً وَّلٰكِن كَرِهَ اللّٰهُ انْبِعَاثَهُمْ فَثَبَّطَهُمْ وَقِيلَ اقْعُدُوا مَعَ الْقٰعِدِينَ ○ لَوْ خَرَجُوا فِيكُم مَّا زَادُوكُمْ إِلَّا خَبَالًا وَّ لَاَوْضَعُوا خِلٰلَكُمْ يَبْغُونَكُمُ الْفِتْنَةَ وَفِيكُمْ سَمّٰعُونَ لَهُمْ وَاللّٰهُ عَلِيمٌ بِالظّٰلِمِينَ ○ لَقَدِ ابْتَغَوُا الْفِتْنَةَ مِن قَبْلُ وَ قَلَّبُوا لَكَ الْاُمُورَ حَتّٰى جَآءَ الْحَقُّ وَ ظَهَرَ أَمْرُ اللّٰهِ وَهُمْ كٰرِهُونَ ○ (التّوبۃ : ۴۶ تا ۴۸)

''اور اگر ان لوگوں نے چلنے کا ارادہ کیا ہوتا تو اُس کا کچھ سامان تو کرتے لیکن اللہ نے اُن کے جانے کو پسند ہی نہیں کیا' اس لئے اُنہیں جمار ہنے دیا اور کہہ دیا گیا کہ بیٹھے رہنے والوں کے ساتھ بیٹھے رہو۔ اگر یہ لوگ تم میں شامل ہو کر چلتے تو تمہارے درمیان فساد ہی بڑھاتے یعنی تمہارے درمیان فتنہ پردازی کی فکر میں دَوڑے دَوڑے پھرتے اور تمہارے درمیان اُن کے جاسوس (اب بھی) موجود ہیں اور اللہ ظالموں سے خوب واقف ہے۔ یہ تو پہلے بھی فتنہ پردازی کی فکر میں لگ چکے ہیں اور آپ کے لئے کارروائیوں کی الٹ پھیر کرتے رہے یہاں تک کہ سچا وعدہ آ گیا اور اللہ کا حکم غالب ہو کر رہا اور اُنہیں ناگوار گزرتا رہا۔''

یہ منافقین بعد میں یہ عذر کرنے لگے کہ ہمارا چلنے کا ارادہ تو پختہ تھا لیکن عین وقت پر فلاں فلاں ضرورتیں اور مجبوریاں آڑے آ گئیں۔ جرح اُن کے اس بیان پر ہو رہی ہے اور ارشاد ہوتا ہے کہ کیا انہوں نے سفر کی تیاریاں کچھ کی بھی تھیں؟ سارے افعال کا حق تعالیٰ کا اپنی جانب منسوب کرنا اسی معلوم و معروف قرآنی محاورہ و اسلوبِ بیان کے مطابق ہے جو آیتِ بالا ۴۶ میں بیان ہوا کہ بندہ کے ہر فعلِ تکوینی کی نسبت مسبب الاسباب کی جانب کر دینی درست ہے۔ اس سے اشارۃً یہ بھی نکل آیا کہ اخلاص وارادت کے لئے توفیقِ الٰہی شرط ہے۔

اِبۡتَغَوُا الۡفِتۡنَةَ مِنۡ قَبۡلُ میں اشارہ ہے جنگِ اُحد کی طرف اور قَلَّبُوۡا لَكَ الۡاُمُوۡرَ میں اشارہ مثلاً یہ کہ آپ کے شریک ہوئے اور پھر ہٹ گئے تاکہ مسلمان پراگندہ خاطر اور دل شکستہ ہو جائیں۔ یہ منافقین کوئی خطرہ مول لینے کو یا کسی قسم کی قربانی دینے کو تیار نہیں۔ اُن کی تمام تر سرگرمیاں فتنہ پردازی میں مرکوز ہیں۔ ایسی صورتِ حال سے نمٹنے کے لئے ایک قائد اور راہنما میں بڑی ذہانت و فراست کی ضرورت ہوتی ہے اور ایسے بہترین قائد کو الٰہی راہ نمائی کی ضرورت ہوتی ہے جو موجودہ صورت میں پوری طرح جلوہ گر نظر آتی ہے۔

اِن سے اگلی آیات ۴۹' ۵۰ میں مسلمانوں کو ان پکے دشمنوں کی جو مارِ آستین سے کم نہیں' مکارانہ چالوں سے ہوشیار رہنے کی ہدایت کی گئی ہے اور فرمایا گیا ہے:

وَمِنۡهُمۡ مَّنۡ يَّقُوۡلُ ائۡذَنۡ لِّىۡ وَلَا تَفۡتِنِّىۡ‌ؕ اَلَا فِى الۡفِتۡنَةِ سَقَطُوۡا‌ ؕ وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيۡطَةٌ ۢ بِالۡكٰفِرِيۡنَ ○ اِنۡ تُصِبۡكَ حَسَنَةٌ تَسُؤۡهُمۡ‌ ۚ وَاِنۡ تُصِبۡكَ مُصِيۡبَةٌ يَّقُوۡلُوۡا قَدۡ اَخَذۡنَاۤ اَمۡرَنَا مِنۡ قَبۡلُ وَيَتَوَلَّوْا وَّهُمۡ فَرِحُوۡنَ ○ (التوبة : ۴۹' ۵۰)

''اور اُن میں سے کوئی ایسا بھی ہے جو کہتا ہے کہ مجھے رخصت دے دیجئے اور مجھے فتنہ میں نہ ڈالئے' خوب سن لو کہ خرابی میں وہ پڑ ہی چکے ہیں اور دوزخ کافروں کو یقیناً گھیرے ہوئے ہے۔ اگر آپ کو کوئی اچھی حالت پیش آتی ہے تو یہ اُنہیں بُری لگتی ہے اور اگر آپ پر کوئی حادثہ آ پڑتا ہے تو وہ کہنے لگتے ہیں کہ ہم نے تو (اسی لئے) پہلے ہی سے اپنا (امرِ احتیاط) اختیار کر لیا تھا اور وہ خوش خوش منہ موڑے چلے جاتے ہیں۔''

ان منافقین کی سمجھ میں بھی یہ بات نہ آئی کہ اس نازک موقع پر اُن کا جہاد سے پہلو تہی کرنا ایک جرمِ عظیم ہے

جس کا وہ ارتکاب کر رہے ہیں۔ بعض مفسرین نے یہ بھی لکھا ہے کہ یہ بات کہنے والا جد بن قیس منافق تھا۔ اس نے آ کر عرض کی کہ حضور! روم کی عورتیں اپنے حُسن و جمال میں بہت مشہور ہیں اور میں عورتوں کے بارے میں بہت کمزور واقع ہوا ہوں۔ ایسا نہ ہو کہ اُنہیں دیکھ کر میری نیّت فاسد ہو جائے اور میں فتنہ کا شکار ہو جاؤں (اس لئے بہتر ہے کہ آپ مجھے یہیں چھوڑ جائیں)۔ اس کا جواب ربّ ذوالجلال والاکرام نے یہ دیا ہے کہ خوب سن لو کہ ہمارے نبی ﷺ کی دعوتِ جہاد کو ٹھکرا کے وہ خرابی اور فتنہ میں پہلے ہی پڑ چکے ہیں۔

ان فتنہ پرداز منافقوں کی توقعات کے برعکس جب پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام تبوک کی تکلیف دہ مہم سے فاتحانہ واپس ہوئے تو وہ ابن الوقت منافقین جو پیغمبر علیہ السلام کی تبوک کو روانگی سے قبل استثنائی رخصت لینے کے لئے حاضر نہ ہوئے تھے، اب مجاہدینِ اسلام میں شامل نہ ہونے کے بہانے تراشتے آئے جیسا کہ سورۃ التّوبۃ کی اِن آیات میں بیان کیا گیا ہے :۔

يَعۡتَذِرُوۡنَ اِلَيۡكُمۡ اِذَا رَجَعۡتُمۡ اِلَيۡهِمۡ قُلۡ لَّا تَعۡتَذِرُوۡا لَنۡ نُّؤۡمِنَ لَكُمۡ قَدۡ نَبَّاَنَا اللّٰهُ مِنۡ اَخۡبَارِكُمۡ وَ سَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمۡ وَرَسُوۡلُهٗ ثُمَّ تُرَدُّوۡنَ اِلٰى عٰلِمِ الۡغَيۡبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمۡ بِمَا كُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ سَيَحۡلِفُوۡنَ بِاللّٰهِ لَكُمۡ اِذَا انْقَلَبۡتُمۡ اِلَيۡهِمۡ لِتُعۡرِضُوۡا عَنۡهُمۡ ؕ فَاَعۡرِضُوۡا عَنۡهُمۡ ؕ اِنَّهُمۡ رِجۡسٌ وَّمَاۡوٰٮهُمۡ جَهَنَّمُ ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوۡا يَكۡسِبُوۡنَ O يَحۡلِفُوۡنَ لَكُمۡ لِتَرۡضَوۡا عَنۡهُمۡ ۚ فَاِنۡ تَرۡضَوۡا عَنۡهُمۡ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَرۡضٰى عَنِ الۡقَوۡمِ الۡفٰسِقِيۡنَ O اَلۡاَعۡرَابُ اَشَدُّ كُفۡرًا وَّنِفَاقًا وَّاَجۡدَرُ اَلَّا يَعۡلَمُوۡا حُدُوۡدَ مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوۡلِهٖ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيۡمٌ حَكِيۡمٌ O (التّوبۃ : ۹۴ تا ۹۷)

''وہ تمہارے (سب کے) سامنے عذر پیش کریں گے جب تم اُن کے پاس واپس جاؤ گے۔ آپ فرما دیجئے کہ بہانے نہ بناؤ، ہم ہرگز تمہاری بات نہ مانیں گے، بے شک ہمیں اللہ تمہاری خبریں دے چکا ہے اور اللہ اور اُس کا رسول عنقریب تمہارا عمل دیکھ لیں گے پھر تم پوشیدہ اور ظاہر کے جاننے والے کے پاس لوٹائے جاؤ گے تو وہ تمہیں جتلا دے گا کہ تم کیا کچھ کرتے رہے تھے۔ جب تم اُن کے پاس واپس جاؤ گے تو عنقریب یہ لوگ تمہارے سامنے اللہ کی قسم کھا جائیں گے تاکہ تم اُن سے چشم پوشی کئے رہو، سو تم اُنہیں اُن کی حالت پر چھوڑے رہو، بے شک وہ گندے ہیں اور اُن کا ٹھکانہ اُس کے بدلہ میں دوزخ ہے جو کچھ وہ کرتے رہے۔ وہ تمہارے سامنے اس لئے قسمیں کھائیں گے کہ تم اُن سے راضی ہو جاؤ، سو اگر تم اُن سے راضی ہو (بھی) جاؤ تو اللہ (تو) نافرمانوں سے راضی نہیں ہوتا۔ دیہاتی منافقین کفر و نفاق میں بہت ہی سخت ہیں اور ایسے ہی ہیں کہ اُن احکام کا علم نہ رکھیں جو اللہ نے اپنے رسول پر نازل کئے ہیں اور اللہ بڑے علم والا ہے۔'' (۹ : ۹۴ تا ۹۷)

آخری آیت بالا کے ضمن میں عارفوں نے کہا ہے کہ صحبتِ صالحین سے دُور ہونے سے طریقِ خیر کے ساتھ مناسبت میں کمی ہو جاتی ہے اور اسی لئے اہلِ طریق صحبتِ صالحین کا بڑا اہتمام رکھتے ہیں۔ حُدُوۡدَ مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ سے مراد یہاں احکام الٰہی ہیں۔

نـــوٹ : کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے تبوک کی مہم میں کچھ منافقوں کی عذر خواہی کو قبول کرتے ہوئے اُنہیں مہم میں شامل ہونے سے مستثنٰی قرار دے لیا تھا۔ اس پر اللہ تبارک وتعالیٰ نے پیغمبر علیہ السلام کو سرزنش کی اور اس بات پر عتاب کیا کہ آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔ لیکن وہ لوگ ایسا کہنے میں اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ اس عتاب میں بھی بے پناہ الفت ومحبت کے جلوے دمک رہے ہیں یعنی اے پیارے پیغمبر! تو نے اُنہیں پیچھے رہنے کی اجازت ہی کیوں دی اور اُنہیں ننگا کیوں نہ ہونے دیا۔ اتنا فرمانے سے پہلے عَـفَـا اللّٰهُ عَـنْكَ (اللہ نے آپ سے درگزر فرمایا ہے) کے الفاظ ارشاد فرمائے۔ یہاں یہ کلمات کسی گناہ کی معافی کا ذکر کرنے کے لئے نہیں بلکہ اظہارِ تعظیم و تکریم کے لئے ہیں۔ اہلِ عرب کا دستور تھا کہ جب کسی کی عزت وتوقیر کا اظہار مقصود ہوتا تو اُس کے ساتھ گفتگو کا آغاز ایسے ہی کلمات سے کیا کرتے۔ امام فخر الدین رازی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں: اِنَّ ذٰلِكَ يَـدُلُّ عَـلٰـى مُبَالَغَةِ اللّٰهِ فِیْ تَعْظِیْمِهٖ وَتَوْقِیْرِهٖ یعنی ان کلمات سے اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب کی تعظیم وتوقیر میں بڑے مبالغہ کا اظہار فرمایا ہے۔

اور عبداللہ یوسف علی لکھتے ہیں :

''نبی ﷺ تبوک کی مہم میں برأت (استثنا) دیتے رہے اور یہ عمل عسکری (فوجی) نقطہ نگاہ سے غیر متعصبانہ معلوم ہوتا ہے۔ برأت دینے کے اس عمل میں دو پہلو کارفرما تھے : ایک مہربانی اور شفقت کا اور دوسرا حکمتِ عملی (پالیسی) کا۔ مہربانی کا عمل اس لئے کہ اُس ہنگامی صورت میں آپ نہیں چاہتے تھے کہ کسی کا عذر جائز ہوتے ہوئے بھی اُسے برأت سے انکار کر دیا جائے۔ اور پالیسی اس لئے کہ اگر کوئی شخص اپنی خوشدلی اور بہ طوعِ رغبت مہم میں شامل نہیں ہوتا تو وہ مجاہدین کے لئے مدد کی بجائے اُن پر بوجھ نہ بن جائے۔ یہ پالیسی بجا اور درست تھی کیونکہ دراصل تیس ہزار یا اس سے اوپر کی جمعیت آپ کے ساتھ تھی لیکن یہ اجتماع پیچھے رہ جانے والوں کے لئے کوئی جواز مہیا نہ کرتا تھا اس لئے اس صورتِ حال میں، پیچھے رہ جانے والے منافقین کی بجا طور پر مذمت کی گئی ہے۔'' (نوٹ: ۱۳۰۸)

''بعض مخلص، وفادار مسلمانوں کا کردار : انصار میں سے سات آدمی بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوئے اور عرض کناں ہوئے کہ آپ اُنہیں سواری مہیا کریں کیونکہ وہ اتنی شدید گرمی میں اتنا طول طویل سفر پیدل طے نہیں کر سکتے۔ پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام نے معذرت کا اظہار فرمایا تو وہ گریہ وزاری کرتے اور روتے ہوئے چل دئے۔ اُن کی مایوسی اُن کے جذبہ جہاد کے شوق کے تناسب میں تھی۔ اُن کی اس حالت کو قرآن نے اس طرح بیان کیا ہے :

لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَآءِ وَلَا عَلَى الْمَرْضٰى وَلَا عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ مَا يُنْفِقُوْنَ حَرَجٌ اِذَا نَصَحُوْا لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ مَا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ مِنْ سَبِيْلٍ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ O وَلَا عَلَى الَّذِيْنَ اِذَا مَآ اَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ لَآ اَجِدُ مَآ اَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ تَوَلَّوْا وَّاَعْيُنُهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا اَلَّا يَجِدُوْا مَا يُنْفِقُوْنَ O (التوبۃ : ۹۱، ۹۲)

''ناطاقتوں اور بیماروں پر کوئی گناہ نہیں ہے اور نہ ہی اُن پر جو خرچ کرنے کو کچھ نہیں پاتے جبکہ اللہ اور اُس کے رسول کے ساتھ وہ خلوص رکھیں، نیکوکاروں پر کوئی الزام نہیں اور اللہ بڑی مغفرت والا، بڑی رحمت والا ہے

اور نہ اُن پر کوئی الزام ہے جب وہ آپ کے پاس آئے کہ آپ اُنہیں سواری دے دیں اور آپ نے کہا کہ میرے پاس تو کچھ نہیں ہے جس پر میں تمہیں سوار کروں تو وہ اس حال میں واپس ہوئے کہ اُن کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے اس غم میں کہ اُنہیں کچھ میسر نہیں جو وہ خرچ کریں۔'' (۹۱'۹۲ : ۹)

وَمِنَ الْأَعْرَابِ مَنْ يُّؤْمِنُ بِاللهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ قُرُبٰتٍ عِنْدَاللهِ وَصَلَوٰتِ الرَّسُوْلِ أَلَآ اِنَّهَا قُرْبَةٌ لَّهُمْ سَيُدْخِلُهُمُ اللهُ فِيْ رَحْمَتِهٖ اِنَّ اللهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ O (التّوبة : ۹۹)
''اور دیہاتیوں میں کچھ ایسے بھی ہیں جو اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں اور جو کچھ وہ خرچ کرتے ہیں اُسے اللہ کے ہاں قرب کا ذریعہ اور رسول ﷺ کی دعائیں (لینے) کا ذریعہ بناتے ہیں' سو بے شک یہ (خرچ کرنا) اُن کے حق میں قرب ہی کا ذریعہ ہے' اللہ اُنہیں اپنی رحمت میں داخل کرے گا' بے شک اللہ بڑی ہی مغفرت والا' بڑی ہی رحمت والا ہے۔'' (۹۹ : ۹)

مؤمنین ومخلصین دیہاتیوں کا اصل اور آخری مقصود رضائے الٰہی ہے اور اس قرب کا ذریعہ رسول اللہ ﷺ کی دعائیں ہیں۔ اُنہیں اطمینان دلایا جا رہا ہے کہ اُن کا یہ خرچ کرنا بے کار نہ جائے گا۔ واقعی اس سے قربِ الٰہی اور مقبولیت حاصل ہو کر رہے گی۔ سَيُدْخِلُهُمْ میں مزید تاکید وتحقیق ہے۔

مسجدِ ضرار اور منافقین کا ذلیل ترین ٹولہ: ایک عیسائی راہب اور اسلام کے پکے دشمن ابو عامر نامی کی انگیخت پر جو جنگِ اُحد میں مسلمانوں کے خلاف لڑا بھی تھا' منافقین کے ایک ذلیل ترین ٹولے نے مسجدِ قُبا کے قرب میں (جو مدینہ شہر سے جنوب مشرق کی جانب تین میل کے فاصلے پر ہے جہاں نبی علیہ السلام نے مکہ مکرمہ سے ہجرت کے موقع پر شہر مدینہ میں داخل ہونے سے پہلے چار دن قیام فرمایا تھا اور یہیں آپ نے مسجدِ قُبا کی بنیاد ڈالی تھی) اپنی ہی ایک مسجد بنا لی تھی اور نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام سے اُنہوں نے درخواست کی تھی کہ آپ اس میں نماز پڑھا کر اُسے تقدّس بخشیں۔ چونکہ یہ مسجد صرف صورۃً مسجد تھی۔ حقیقتاً تو عداوتِ اسلام کے لئے ایک کمین گاہ تھی (سورۃ التوبۃ: ۱۰۷)' اس لئے اللہ تعالیٰ نے پیغمبر علیہ السلام کو اُن کی درخواست قبول کرنے سے منع فرما دیا اور حکم دیا:

لَا تَقُمْ فِيْهِ أَبَدًا لَمَسْجِدٌ أُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ أَوَّلِ يَوْمٍ أَحَقُّ أَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ أَنْ يَّتَطَهَّرُوْا وَاللهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ O (التّوبة : ۱۰۸)
''آپ اس میں کبھی بھی کھڑے نہ ہوں (البتہ جس) مسجد کی بنیاد روزِ اوّل سے تقویٰ پر پڑی ہے (یعنی مسجدِ قُبا) وہ واقعی اس لائق ہے کہ آپ اُس میں کھڑے ہوں۔ اُس میں ایسے آدمی ہیں جو خوب پاک رہنے کو پسند کرتے ہیں اور اللہ خوب پاک رہنے والوں کو پسند کرتا ہے۔'' (۱۰۸ : ۹)

اس عمارت کا نام بھی مسجد ہی تھا لیکن چونکہ حقیقت میں وہ سجدہ گاہ کی روح سے خالی تھی' اس لئے اس کی توقیر و احترام تو کیا سمجھا جاتا' اُلٹا گرا دئے جانے اور جلا دئے جانے کے قابل سمجھی گئی۔ چنانچہ احادیث میں بہ تصریح آتا ہے کہ

آپ ﷺ نے صحابہ کرام کو بھیج کر اُسے منہدم کرا دیا اور اُس میں آگ لگوا دی۔

مسجدِ قُبا بہ مقابل مسجدِ ضرار (موازنہ): شہر مدینہ میں داخل ہونے سے پہلے مسجد قبا کی بنیاد نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے دستِ مبارک سے رکھی تھی جبکہ مسجدِ ضرار کی بنیاد اسلام کے خلاف ناپاک منصوبے بنانے‘ سازشیں کرنے اور مسلمانوں میں تفرقہ ڈالنے کے لئے منافقین کی ایک ذلیل ترین گروہ نے ڈالی تھی۔ اِسی وجہ سے اُس مسجد کو رب تعالیٰ نے سورۃ التوبۃ کی آیت ۱۰۷ میں ’’مسجدِ ضِرار‘‘ (فتنہ وشرارت کی مسجد) کا نام دیا۔ اِن دونوں مسجدوں کا موازنہ اِن آیات میں کیا گیا ہے:

لَمَسْجِد’’ أُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ أَوَّلِ يَوْمٍ أَحَقُّ أَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ------ أَفَمَنْ أَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰى تَقْوٰى مِنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٍ خَيْرٌ’’ أَمْ مَّنْ أَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰى شَفَا جُرُفٍ هَارٍ فَانْهَارَ بِهٖ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ O لَا يَزَالُ بُنْيَانُهُمُ الَّذِىْ بَنَوْا رِيْبَةً فِيْ قُلُوْبِهِمْ إِلَّا أَنْ تَقَطَّعَ قُلُوْبُهُمْ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ’’ حَكِيْمٌ’’ O (اَلتّوبۃ: ۱۰۸ تا ۱۱۰)

’’جس مسجد کی بنیاد روزِ اوّل سے تقویٰ پر پڑی ہے (یعنی مسجد قُبا) وہ واقعی اس لائق ہے کہ آپ اُس میں کھڑے ہوں---سو آیا وہ شخص جس نے اپنی عمارت اللہ کے تقویٰ اور رضا مندی پر رکھی‘ وہ بہتر ہے یا وہ جس نے اپنی عمارت کی بنیاد کسی گھاٹی کے کنارے پر رکھی جو گرنے ہی کو ہے‘ پھر وہ (عمارت) اُسے لے کر آتشِ دوزخ میں گر پڑی اور اللہ ظالم لوگوں کو راہ (راست) نہیں دکھاتا۔ اُن کی یہ عمارت جو اُنہوں نے بنائی ہے‘ ہمیشہ اُن کے دلوں میں کھٹکتی رہے گی سوائے اس کے کہ اُن کے دل ہی فنا ہو جائیں اور اللہ بڑے ہی علم والا‘ بڑی ہی حکمت والا ہے۔‘‘ (۱۰۸ تا ۱۱۰ : ۹)

حاصل کلام یہ ہے کہ دو عمارتیں ہیں: ایک کی بنیاد تقویٰ اور رضائے الٰہی پر ہے اور دوسری کی کفر ومعصیت پر۔ پہلی معزز ہے اور باقی رکھنے کے قابل اور دوسری ذلیل ہے اور گرا دیئے جانے کے قابل (تفسیر کبیر)۔ فَانْهَارَ بِهٖ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ مفسرین کے ایک گروہ نے کہا ہے کہ یہ بعینہٖ حقیقت کا بیان ہے یعنی وہ مسجد ضرار فی الواقع دوزخ میں گرا دی گئی لیکن بہتوں نے یہ بھی کہا ہے کہ یہ بیان صرف مثال وتشبیہ کے طور پر ہے کہ ہر ایسے کام کا جس کی بنیاد اخلاص پر نہیں بلکہ کفر ونفاق پر ہو‘ خاتمہ جہنم و ہلاکت ہی پر ہوتا ہے۔

’’منافقین کا عمومی کردار: اگر منافقت کا کوئی عنصر کسی معاشرے میں موجود ہو تو وہ اس معاشرے کی کمزوری کا سبب ہوتی ہے اور اس کے وجود‘ صحت اور یک جہتی کے لئے دائمی خطرہ ہوتی ہے۔

اللہ رحیم وکریم نے چاہا کہ اُس کے ماننے والے (مؤمنین) منافقین کے پورے سماج سے ہوشیار رہیں کہ کہیں ایسا نہ ہو وہ اپنے مارِ آستین دشمنوں کی خفیہ سازشوں کے جال میں پھنس جائیں۔ اس سلسلہ میں سورۃ البقرۃ کی آیات ۸ تا ۲۰ بالخصوص اہم ہیں جن میں مسلمانوں کے اندر رہنے والے اس روگ کے کافی اشارات موجود ہیں:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ آمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَO يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ آمَنُوْا وَ مَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ أَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَO فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ" فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا وَلَهُمْ عَذَابٌ" أَلِيْمٌ" بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَO وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ قَالُوْا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَO أَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَO وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ آمِنُوْا كَمَآ آمَنَ النَّاسُ قَالُوْا أَنُؤْمِنُ كَمَا آمَنَ السُّفَهَآءُ أَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَآءُ وَلٰكِنْ لَّا يَعْلَمُوْنَO وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ آمَنُوْا قَالُوْا آمَنَّا وَ اِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ قَالُوْا اِنَّا مَعَكُمْ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَO اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَ يَمُدُّهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَO أُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ وَ مَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَO مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا فَلَمَّآ أَضَآءَتْ مَا حَوْلَهٗ ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ وَ تَرَكَهُمْ فِيْ ظُلُمٰتٍ لَّا يُبْصِرُوْنَO صُمٌّ" بُكْمٌ" عُمْيٌ" فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَO أَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ فِيْهِ ظُلُمٰتٌ" وَّ رَعْدٌ" وَّ بَرْقٌ" يَجْعَلُوْنَ أَصَابِعَهُمْ فِيْ آذَانِهِمْ مِّنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ وَاللّٰهُ مُحِيْطٌ" بِالْكٰفِرِيْنَO يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ أَبْصَارَهُمْ كُلَّمَآ أَضَآءَ لَهُمْ مَّشَوْا فِيْهِ وَاِذَآ أَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوْا وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَأَبْصَارِهِمْ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ"O (البقرة:۸۔۲۰)

"اور کچھ لوگ ایسے (بھی) ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں حالانکہ وہ (بالکل ہی) ایمان والے نہیں۔ اللہ کو اور ایمان والوں کو دھوکا دینا چاہتے ہیں حالانکہ (فی الواقع) وہ سوائے اپنی ذات کے کسی کو دھوکہ نہیں دیتے اور اس کا احساس بھی نہیں رکھتے۔ اُن کے دلوں میں بیماری ہے' سو اللہ نے اُن کی بیماری اور بڑھا دی اور اُن کے لئے دردناک عذاب ہے اس لئے کہ وہ جھوٹ کہتے تھے۔ اور جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ زمین پر فساد مت پھیلاؤ تو کہتے ہیں کہ ارے! ہم تو اصلاح کر رہے ہیں۔ سُن رکھو کہ حقیقتاً یہی لوگ فسادی ہیں اور وہ اس کا احساس بھی نہیں رکھتے۔ اور جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ ایمان لے آؤ جیسا کہ لوگ ایمان لائے ہیں تو کہتے ہیں کہ کیا ہم (ایسا) ایمان لے آئیں جیسا کہ بیوقوف ایمان لائے ہیں؟ سُن رکھو بیوقوف خود یہی لوگ ہیں اور اس کا بھی علم نہیں رکھتے۔ اور جب وہ ایمان والوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم بھی تو ایمان لا چکے ہیں اور جب اپنے شیطانوں کے پاس اکیلے ہوتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم تو تمہارے ساتھ ہیں' ہم تو محض بنا رہے تھے۔ اللہ اُنہیں بنا رہا ہے اور وہ اُنہیں ڈھیل دے رہا ہے (تو) وہ اپنی سرکشی میں سرگرداں ہو رہے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی خرید لی' سو نہ اُن کی تجارت ہی فائدہ مند ہوئی اور نہ ہی وہ راہ یاب ہوئے۔ اُن کی (عجیب) مثال تو اُن کی سی (عجیب) مثال ہے جنہوں نے آگ جلائی پھر جب آگ نے اپنے اردگرد کو روشن کر دیا تو اللہ نے اُن کی روشنی سلب کر لی اور اُنہیں اندھیروں میں چھوڑ دیا کہ کچھ دیکھتے بھالتے نہیں۔ (وہ) بہرے ہیں' گونگے ہیں' اندھے ہیں تو اب وہ واپس نہ ہوں گے۔ یا پھر جیسے آسمان سے زور کا مینہ برس رہا ہو۔ اس میں اندھیرے' گرج اور بجلی ہے' وہ کڑک کے سبب موت کے اندیشہ سے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونسے ہوئے ہیں حالانکہ اللہ کافروں کو گھیرے ہوئے ہے۔ قریب ہے کہ بجلی اُن کی بینائی ہی اُچک لے جائے' وہ جب اُن پر چمکتی ہے تو اُس کی روشنی میں چل لیتے ہیں اور جہاں اُن پر اندھیرا ہوا (تو بس) کھڑے رہ جاتے ہیں۔ اور اگر اللہ چاہتا تو اُن کے کان اور اُن کی بینائی سلب کر لیتا' بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔" (۸ تا ۲۰:۲)

آیاتِ بالا (۸ تا ۲۰) کی توضیح : منافقین کی یہ وہ واحد جماعت تھی جنہوں نے اسلام کو ظاہر طور سے قبول کیا تھا اور اچھے مسلمان ہونے کا جھوٹا دعویٰ کیا تھا لیکن اندرونی طور پر وہ کافر تھے کیونکہ اُن کا اللہ اور یومِ حساب پر ایمان تو تھا لیکن رسول اللہ ﷺ پر ایمان نہیں تھا۔ اُن کے خیال میں رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانا ضروری نہیں تھا کیونکہ وہ آپ ﷺ کے پکے دشمن تھے۔ اُن کے نزدیک مسلمان ہونے کے لئے اللہ اور روزِ حساب پر ایمان لانا ہی کافی تھا۔ قرآنِ مجید نے اُن کے اس دعویٰ کو مَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ (وہ ایمان والے نہیں) کہہ کر رد کر دیا ہے بہ ایں معنیٰ کہ پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کی برگزیدہ ہستی پر ایمان لائے بغیر وہ کس اللہ اور کس دن پر ایمان لانے کے دعویدار ہیں؟ کیونکہ اللہ اور روزِ حساب کی معرفت صرف امام الانبیاء ﷺ کی وساطت ہی سے ممکن ہے۔ رسالت پر ایمان کے بغیر ایمان کا تمام تر دعویٰ منافقت کے سوا کچھ نہیں۔ اس لئے فرمادیا کہ اُن کا دعویٰ پوچ' جھوٹا اور ناقص ہے اور ہمارے نزدیک ہرگز قابلِ قبول نہیں ہے۔

''وہ اللہ اور ایمان والوں کو دھوکا دینا چاہتے ہیں'' کفر کو چھپانے اور ایمان کا جھوٹا دعویٰ کرنے سے اُن کی دروغ گوئی دونوں جہانوں میں خود اُن سے ٹکرا کر پلٹے گی۔ منافقین نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام اور اُن کے صحابہ کرام کو یہ سمجھ کر دھوکا دینا چاہتے تھے کہ اُنہیں ان کی منافقت کا علم نہیں ہے۔ اُن کے اس رویّہ کی تردید میں قرآن مجید بانگ دہل اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ پیغمبر ﷺ سے دھوکہ دہی کی کوئی بھی کوشش اللہ سے دھوکہ دہی کے مترادف ہے (سورۃ النساء: ۸۰ وسورۃ الانفال: ۱۷)۔ اس سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ پیغمبر علیہ السلام سے معمولی سی بے ادبی اور بدتمیزی اللہ سے بدتمیزی کرنے کے مترادف ہے۔ ان آیات سے ایک عمومی اصول یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دھوکہ دہی اور چالبازی کے پیچھے منافقت اور غیر معقول عمل چھپا ہوتا ہے۔ جو لوگ اپنی ظاہرداری اور تصنّع فصیح البیانی' خوش تقریری اور چالاکی سے دوغلی چال چلتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ وہ دوسروں کو بیوقوف بنا رہے ہیں' اصل میں منافق ہیں لیکن عقل سے عاری ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ باطل دعویٰ' تصنّع اور منافقت دیرپا نہیں ہوتے اور بالآخر بے نقاب ہو کے رہتے ہیں۔ اس اصول کی روشنی میں ہمیں اپنے کردار کا اور اپنے ابنائے جنس سے اپنے رویّے کا بھی ایمانداری سے تجزیہ کرنا چاہئے اور نبی علیہ السلام کے اس ارشاد کو بھی ذہن میں رکھنا چاہئے جس میں آپ نے فرمایا:

أَلْمَكْرُ وَالْخَدِيْعَةُ وَالْخِيَانَةُ فِي النَّارِ (المستدرک للحاکم)

''دھوکہ بازی' فریب کاری اور عہد شکنی جہنم میں لے جانے والے ہیں۔''

وہ خوش بخت لوگ جو بارگاہِ نبوی میں اپنی اندرونی بیماریوں کے علاج کے لئے بڑے شوق اور انہماک سے حاضر ہوتے' اُنہیں ایسی برگزیدیت اور روح کی تابناکی اور رخشندگی عطا کئے گئے کہ وہ دوسرے بیمار لوگوں کے لئے مسیحا کا کام کر سکتے تھے اور شِفایابی کا یہ عمل نبی علیہ السلام کی جانب سے تھا جن کا بنیادی اور اوّل ترین فرض لوگوں کا تزکیہ اور اُنہیں تمام بیماریوں اور بدیوں سے پاک وصاف کر دینا تھا لیکن منافقین رحمۃ للعالمین کے در سے نوازشاتِ الٰہی کو سمیٹنے میں اپنی کسرِ شان سمجھتے تھے لہٰذا اُن کے لئے حسد' عداوت اور منافقت کے امراض سے شِفایاب ہونے کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ اِنہی لوگوں کے بارے میں قرآن فرماتا ہے : فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ " فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا (اُن کے دلوں

میں بیماری ہے' سواللہ نے اُن کی بیماری اور بڑھادی)

''اگر سزا مقدار میں بڑی ہو تو اُسے قرآن نے ''عذاب عظیم '' کہا ہے اور اگر وہ اپنے معیار اور ماہیت میں پُر آزار ہو تو اُسے ''عذاب اَلِیم '' کہا ہے۔ اب سمجھنے کی بات یہ ہے کہ آیت ۷ بالا میں ''عذاب عظیم '' کی تنبیہ اسلام کے کھلے دشمنوں یعنی کافروں کے لئے ہے جبکہ آیت ۱۰ میں ''عذابِ اَلِیم '' کو منافقوں کے لئے مخصوص کیا گیا ہے جو اسلام کے چھپے دشمن اور اس کے لئے مارِ آستین ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ منافقت اور مکر و فریب کفر سے زیادہ تباہ کن اور پُر آزار ہوتا ہے۔'' (''منافقت اور اس کی علامات'' ۔۔۔ پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری' صفحہ ۲۶)

منافقین کے مکروہ کردار کا ایک اور پہلو سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۱ میں بیان ہوا ہے یعنی منافقین اتنے کوتاہ عقل تھے کہ اُنہوں نے معاملے کی صداقت و حقیقت کو ہی اُلٹ دیا اور اپنے شر کو ''خیر'' کا اور فتنہ و فساد کو ''اصلاح'' کا نام دے دیا۔ اُنہوں نے امن و آشتی کے مبلّغ ہونے کا دعویٰ کیا جبکہ اُنہیں حق و باطل میں صحیح تمیز کی ہوا بھی نہیں لگی۔ اپنے اندھے تکبر و نخوت میں وہ خیر کی حوصلہ شکنی کرتے ہیں اور شر کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔

''فساد فی الارض '' (آیت ۱۱) کی اصطلاح جامع ہے اور ظلم و عدوان' تشدد' لاقانونیت' عدم انصاف' استحصال' حقوق کے غصب و اِتلاف' تجاوز عن الحد' بدچلنی' اخلاقی بگاڑ' خباثت' منافقت' عداوت' تباہی و بربادی' سازشی سرگرمیوں اور اشیاء کی منفی رسائی کی تمام شکلوں کو شامل ہے۔ ''صلاح و فلاح'' معاشرے کی تنظیم کا نام ہے جس میں اُس کے تمام افراد سے انصاف کا سلوک کیا جاتا ہے۔ ایسے معاشرے میں قانون کی حکمرانی ہوتی ہے اور وہاں نہ تو کوئی جبر و اِستکراہ ہوتا ہے اور نہ ہی امیر و غریب' گورے اور کالے کے درمیان کوئی فرق ہوتا ہے۔ یہاں قرآن مجید بالوضاحت اس بات کا اعلان کر رہا ہے کہ منافقین کا فعل و عمل اور اُن کی الٹ پلٹ سوچ ہمیشہ منفی اور تباہ کن رہی ہے جو مسلم سماج کی بنیادیں کھوکھلی کرنے کا سبب بنتی ہے۔ جب اُنہیں کہا جاتا ہے کہ روئے زمین پر فساد مت پھیلاؤ تو وہ اس کے جواب میں اپنے آپ کے ''مصلح'' ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ اللہ رحیم و کریم اپنے مؤمنین کو آگاہ کر رہا ہے کہ اُن سے ہوشیار رہیں اور ''اصلاح کاری'' کے اُن کے نعروں سے گم کردہ راہ نہ ہوں۔

اس طرح قرآن مجید نے خلوص و اخلاص کا ایک معیار مقرر کر دیا ہے جس پر ہر تحریک اور اصلاح و تجدید تعلقات کے ہر نعرے کو پرکھا جا سکتا ہے۔ یہاں قرآن مجید ہم مسلمانوں سے یہ بھی توقع رکھتا ہے کہ کسی چیز کو پرکھنے اور آزمانے میں ہم اپنے خودساختہ اور خانہ ساز معیاروں کا سہارا نہ لیں بلکہ سچی اور بے خطا راہ نمائی کے لئے اپنے خالق و مالک اور اُس کے رسول ﷺ کی طرف رجوع کیا کریں۔

''اور جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ ایمان لے آؤ جیسا کہ لوگ ایمان لائے ہیں تو کہتے ہیں کہ کیا ہم (ایسا) ایمان لے آئیں جیسا کہ بیوقوف ایمان لائے ہیں؟'' (آیت ۱۳)۔ اُن کے اس جملے میں منافقین کے کردار کا ایک اور گوشہ

سامنے آ گیا ہے۔ وہ اپنے آپ کو عدیدِ ذہانت (Intelligence Quotient : I.Q.) کا واحد اور بلاشرکت غیرے اجارہ دار سمجھتے ہیں۔ وہ لوگ جو اسلام کی خاطر قربانیاں دے رہے ہیں اور جنہوں نے رسالت کی غلامی کا طوق اپنے زیبِ گلو کر لیا ہے' منافقین کے نزدیک (العیاذ باللہ) سب بے وقوف اور عقل سے عاری ہیں۔ یہ منافقین تو اپنے مخصوص مفادات کو رضائے الٰہی کی قربان گاہ پر قربان کرنے اور اپنی رشتہ داریوں میں خلل اندازی ہونے کے لئے ذرّہ بھر بھی تیار نہ تھے۔ قرآن مجید نے اُن کی نام نہاد ''ذہانت'' کو بے وقوفی اور کوتاہ نظری کا نام دیا ہے۔ اُنہیں اس بات کی آگاہی حاصل نہیں کہ اسلام کی خاطر قربانیوں کی زندگی لاتعداد اور ناقابلِ تصوّر فائدوں کی حامل ہے جسے چشمِ ظاہر بیں مشاہدہ نہیں کر پاتی اور آخرت کا فائدہ تمام فائدوں سے بڑھ کر اور زیادہ وزن دار ہے۔ ☆

''قرآن حکیم نے منافقت کی اس علامت کو مستقل مادّی ذہنیت کے طور پر اُجاگر کیا ہے۔ ہم میں سے کتنے ہی لوگ ایسی لامذہبی ذہنیت سے کلی طور پر دُور ہیں۔ اگر ہم میں سے کوئی خوش بخت آدمی حق کی خاطر کوئی چیز قربان کے لئے تیار ہوتا ہے تو اُسے اپنے وقت' روزی اور آسائشاتِ حیات کے ضیاع کے طنز آمیز طعنوں کا ہدف بنایا جاتا ہے۔ اگر یہ بات صحیح ہے اور یقیناً صحیح ہے تو ذرا تصوّر کیجئے کہ منافقت کا کتنا گہرا عنصر ہمارے داخلی وجود میں رچ بس گیا ہے! جب تک ہمارے مخصوص مفادات کو دھچکا نہیں لگتا' اُس وقت تک ہم دین دار اور مذہبی بنے رہتے ہیں ورنہ ہم اسے لاحاصل اور کوتاہ عقلی سمجھتے ہیں بالخصوص اُس وقت جب مذہب ہم سے کسی قسم کی قربانی مانگتا ہے۔ یہی بات منافقت کی جڑ ہے جو اِحیائے دین کی راہ میں رکاوٹ بنی ہوئی ہے۔'' (''منافقت اور اُس کی علامات''۔ پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری' صفحہ ۳۲)

''اور جب وہ ایمان والوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم بھی تو ایمان لا چکے ہیں'' (آیت ۱۴) ـ ـ ـ یہاں منافقوں کے عدمِ خلوص اور اُن کے حقیقی دوغلے پن کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ ''شیاطین'' سے مراد منافقوں کے وڈیرے' قائدین اور اُن کے اپنے بہروپیے ہیں۔

یہاں منافقوں کے دو اقوال کا بیان ہو رہا ہے: اوّل تو اُن کے ایمان کا اظہار جسے وہ مسلمانوں سے بیان کرتے تھے اور دوسرا اُن کا کفریہ قول جس کا اظہار وہ اپنے سرداروں کے آگے کرتے تھے اور یہاں اس حقیقت کا کھلا اشارہ موجود ہے کہ اُن کا کفریہ قول اُن کی تنہائیوں اور خلوت خانوں میں ہوتا تھا اور یہ چیز اُن کے نفسِ باطن کی مظہر تھی۔ اس کے برعکس اُن کے ایمان کی توثیق کھلے طور پر تھی اور مخفی نہیں تھی۔ دوسرے لفظوں میں وہ قول و فعل میں تضادات کا دُہرا کھیل کھیل رہے تھے۔ ع باغباں بھی خوش رہے راضی رہے صیاد بھی

☆ منافقین نے شر کو ''خیر'' اور فتنہ و فساد کو ''اصلاح'' کا نام دے کر معاملے کی صداقت و حقیقت کو ہی اُلٹ کے رکھ دیا۔ چونکہ بدی اور اخلاقی بگاڑ کا تعلق خواہ وہ کسی شکل میں ہوں' مشاہدے اور حساسیت سے ہوتا ہے جس کا منافقین کو احساس تک نہیں' لہٰذا قرآن نے یہاں لَا یَشْعُرُوْنَ کی ترکیب استعمال کی ہے۔ اور چونکہ بے وقوفی اور غیر معقولیت جہالت کا نتیجہ ہوا کرتے ہیں جو علم کا متضاد (الٹ) لفظ ہے' اس لئے اس نسبت سے یہاں لَا یَعْلَمُوْنَ استعمال ہوا ہے۔ ''شعور'' اور ''علم'' کو بڑی عاقلانہ حکمت کے ساتھ منافقین کی عدم حساسیت اور جہالت کے پیشِ نظر استعمال کیا گیا ہے۔

منافقین کی جانب سے یہاں اسمِ فاعل مُسْتَهْزِءُوْنَ (ہم مذاق کرنے والے ہیں) کے استعمال اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے فعلِ مضارع یَسْتَهْزِئُ (وہ مذاق کرتا ہے) کے استعمال میں نہایت ممتاز بلیغانہ رخطیبانہ اہمیت ہے۔عربی نحو (گرامر) کا اصول ہے کہ اسمِ فاعل وقتی اور عارضی ہوتا ہے جبکہ فعل مضارع میں دائمیت (ہمیشگی) ہوتی ہے۔

نحو کی اس لطافت کی روشنی میں زیرِ نظر آیاتِ قرآنی سے جو مفہوم مستفاد ہوتا ہے وہ یہ کہ مسلمانوں کے ساتھ منافقوں کا استہزاء (ٹھٹھا اور مذاق) عارضی ہے اور منافقوں کے مرنے کے ساتھ وہ مذاق بھی فنا ہو جائے گا لیکن فعلِ مضارع میں أللهُ یَسْتَهْزِئُ بِهِمْ کے الفاظ دائمی اور مستقل مفہوم کی شناخت ہیں کہ اُن پر قہر اور غضبِ الٰہی لامتناہی حد تک ہمیشہ اور دائم رہے گا۔(''مُخْتَصَرُ المَعانی''۔۔علامہ تفتازانی' صفحہ ۱۵۸)

استہزا اور تمسخر کی نفسیات: مسلمانوں سے ٹھٹھا اور تخول کرنا بذاتِ خود منافقت ہے جس میں طعنہ زنی اور حقائق کا مسخ کرنا (بگاڑنا) بھی شامل ہیں۔علامہ زمخشری نے استہزا کا معنیٰ ذلت اور رسوائی کیا ہے (تفسیر''الکشاف عن غوامض التنزیل'') کیونکہ استہزا کا مصدر ''ھزا'' ہے جس کا معنیٰ کسی شخص پر ذلت و حقارت کا وارد کرنا ہے۔لہٰذا استہزاء کی اصل غرض دوسرے کی تحقیر ہے۔ہنسنا محض ایک ذریعہ ہے جس سے تحقیر کی جاتی ہے۔ یہاں منافقین کی مخصوص ذہنیت اور عادت کا ذکر کیا جا رہا ہے کہ اُن کے پیشِ نظر مسلمانوں کی تذلیل و تحقیر تھی اور وہ ہر وقت اسی فکر میں لگے رہتے تھے۔ استہزاء اُن کی اسی سوچ کا مظہر تھا۔

''اللہ کا استہزاء منافقوں کو ذلت و رسوائی کی سزا دینا ہے: أللهُ یَسْتَهْزِئُ بِهِمْ کے دو معنیٰ ہیں اور یہاں فی الحقیقت دونوں ہی مراد ہیں۔اس آیت میں استہزاء کا لفظ دو مرتبہ استعمال ہوا ہے: پہلے مَنافقین کے فعل کے طور پر اور دوسرا باری تعالیٰ کے فعل کے طور پر۔اس حکمت کو سمجھنے کے لئے ایک اصول ذہن نشین کر لیجئے کہ جب بھی کسی فعل کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرنا درکار ہوتا ہے تو ظاہراً وہی فعل بولا جاتا ہے جو انسانوں کے لئے بھی استعمال ہوا ہے مگر دونوں استعمالات میں فرق یہ ہوتا ہے کہ چونکہ انسان ہر فعل میں ذرائع اور وسائط کا محتاج ہے یعنی اُس کا ہر فعل کسی نہ کسی ذریعے اور واسطے کی صورت میں اپنی غرض و غایت اور اصل مقصود کو پہنچتا ہے جو اس فعل کا نتیجہ ہوتا ہے لیکن باری تعالیٰ اپنے فعل میں کسی ذریعے کا محتاج نہیں ہے اس لئے جب کوئی لفظ انسانی فعل کے بیان کے لئے بولا جائے گا تو اس میں ذریعہ اور مقصود دونوں شامل ہوں گے مگر وہی لفظ باری تعالیٰ کے فعل کے بیان کے لئے اگر بولا جائے گا تو اس سے مراد فعل کی صرف غرض یعنی نتیجہ مقصود ہوگا' ذریعہ نہ ہوگا۔مثلاً انسان دیکھتا ہے تو دیکھنے میں وہ آنکھ اور روشنی کا محتاج ہے اس لئے اُس کے فعل میں یہ ذرائع بھی شامل ہوں گے۔مگر جب یہ کہا جائے کہ اللہ دیکھتا ہے تو یہاں آنکھ' روشنی جیسے ذرائع نہیں بلکہ صرف جو غرض دیکھنے سے حاصل ہوتی ہے وہی مراد ہوگی۔اسی طرح انسان سننے میں کان اور ہوا کا محتاج ہے مگر اللہ تعالیٰ کے سننے میں یہ ذریعہ مفقود ہوگا اور اصل مقصود جو سننے سے حاصل ہوتا ہے' مراد ہوگا۔ایسے ہی انسان کا رحم یا غضب دل کی کیفیات کا نہیں بلکہ صرف نتیجے کا نام ہے۔جیسا کہ پہلے بیان ہوا کہ استہزاء میں اصل غرض دوسرے کی ذلت و رسوائی ہے اور ہنسنا محض ذریعہ تھا' وہ مفقود ہو گیا کیونکہ اللہ اس سے پاک ہے۔ چنانچہ أللهُ یَسْتَهْزِئُ بِهِمْ کا معنیٰ

یہ ہوگا کہ ''اللہ تعالیٰ ان منافقین کو ذلیل و رسوا کرے گا' اُن کے اُس استہزاء کے بدلے میں جو وہ اہلِ ایمان سے کرتے ہیں۔''

''سزائے فعل کا ذکر اُسی فعل سے کرنا اسلوبِ قرآن ہے'': قرآن مجید کا یہ اسلوب ہے کہ بعض اوقات کسی فعل پر دی جانے والی سزا کا ذکر بھی اُسی فعل کے انداز میں کر دیا جاتا ہے۔ امام ابن جریر کہتے ہیں کہ جب ایک ہی فقرہ جواب کے طور پر ہو تو اس سے مراد فی الواقع وہ فعل نہیں ہوتا بلکہ اُس فعل کی سزا ہوتی ہے۔ مثلاً یہ آیات:

(۱) فَمَنِ اعۡتَدٰی عَلَیۡکُمۡ فَاعۡتَدُوۡا عَلَیۡهِ بِمِثۡلِ مَا اعۡتَدٰی عَلَیۡکُمۡ (البقرۃ: ۱۹۴)
''پس اگر تم پر کوئی زیادتی کرے تم بھی اس پر زیادتی کرو۔'' (۱۹۴ : ۲)

حالانکہ زیادتی کرنا کوئی مستحسن فعل نہیں ہے تو آیت کے دوسرے حصے (تم بھی زیادتی کرو) سے مراد اس فعل یعنی زیادتی کی سزا ہے۔

(۲) وَجَزٰٓؤُا سَیِّئَةٍ سَیِّئَةٌ مِّثۡلُهَا (الشوریٰ: ۴۰)
''اور برائی کا بدلہ اُسی برائی کی مثل ہوتا ہے۔'' (۴۰ : ۴۲)

حالانکہ سزا تو عدل و انصاف کا عین تقاضا ہوتی ہے' بُری نہیں ہوتی۔

(۳) وَلَا تَکُوۡنُوۡا کَالَّذِیۡنَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنۡسٰهُمۡ اَنۡفُسَهُمۡ (الحشر: ۱۹)
''اور اُن لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو اللہ کو بھلا بیٹھے تو اللہ نے اُن کی جانوں کو ہی اُن سے بھلا دیا۔'' (59:19)

حالانکہ اللہ کی ذات بھولنے بھلانے سے پاک ہے لیکن اُن خطا کار لوگوں کے بھلانے پر جو سزا دی گئی ہے' اُسے بھلانے سے تعبیر کیا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ استہزاء سے پاک ہے لیکن منافقین کے استہزاء پر جو سزا دی گئی' اُسے بھی استہزاء سے تعبیر کیا گیا ہے۔ امام راغب نے ''مفردات الفاظ القرآن'' میں اور ابن منظور افریقی نے ''لسان العرب'' میں اسی معنی کی تائید کی ہے۔ علامہ قرطبی کے بیان سے بھی اسی معنی کی تائید ہوتی ہے۔ محاورہ عرب کا استعمال بھی اسی معنی کی تصدیق کرتا ہے اس لئے کفار و مشرکین اس آیت کے نازل ہونے پر کوئی اعتراض نہ کر سکے۔

''بعض منصوبوں کا کچھ دیر تک قائم رہنا اُن کے حق ہونے کی دلیل نہیں'': مَدَّ یَمُدُّ کے اصل معنی کھینچنا اور پھیلانا کے ہیں۔ اس میں اِمۡهَال یعنی مہلت اور ڈھیل کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ جب کوئی شخص اللہ کے خلاف بغاوت اور سرکشی اختیار کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اُسے ڈھیل اور مہلت دیتا ہے کہ چاہے وہ کسی وقت بھی تائب ہو کر اپنی اصلاح کر لے یا پھر اپنی گمراہی اور سرکشی کی انتہا کو پہنچ جائے تا کہ اس کی رسی دراز کئے رکھنے کے بعد اُس کی گرفت ہو تو اُتنی ہی شدید ہو جتنی شدید اُس کی سرکشی اور بغاوت تھی۔ اس آیت سے لوگوں کے اپنے اعمال اور گمراہی و سرکشی کی راہ اختیار کرنے کی نسبت اللہ کی طرف سے عطا کردہ آزادی اور اختیار بھی ثابت ہوتا ہے۔ نہ اللہ تعالیٰ کسی کو غلط راہ پر پڑنے کے لئے مجبور کرتا ہے اور نہ غلط کاری کے بعد مہلت دئے بغیر کسی کی گرفت کرتا ہے۔ چنانچہ منافقین کو بھی عہدِ رسالت میں

ڈھیل دی گئی حتّٰی کہ غزوہ تبوک کے بعد حضور نبی اکرم ﷺ کی عمر مبارک کے آخری ایام میں اُنہیں سزا دی گئی۔''

''یہاں تعلیم و تربیت کا یہ پہلو مضمر ہے کہ اگر اس دنیا میں کسی شریر و سرکش کو اپنی منفی اور تخریبی کارروائیاں جاری رکھنے کا کچھ موقع ملا رہے اور اُس کے منصوبے کچھ عرصے تک قائم رہیں تو اس سے یہ مطلب نہ اخذ کیا جائے کہ وہ حق ہے کیونکہ باطل ہوتا تو نیست و نابود ہو جاتا اور نہ یہ مراد لی جائے کہ وہ ہمیشہ قائم رہے گا۔ یہ سب انسانی عقل کی بھول ہے۔ حقیقت میں یہ مہلت نہ اُس کی حقانیت کی علامت ہے اور نہ اُس کے ہمیشہ باقی رہنے کی دلیل۔ اس میں اس کی کوئی کامیابی نہیں اور اسے اس مہلت پر خوش نہیں ہونا چاہئے بلکہ یہ باری تعالیٰ کی طرف سے ڈھیل ہے تاکہ وہ اپنی گمراہی کے نقطۂ عروج پر پہنچ جائے تو اس تصوّر کو یَمُدُّهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ [اُنہیں ڈھیل دیتا ہے (تاکہ وہ خود اپنے انجام تک جا پہنچیں) سو وہ خود اپنی سرکشی میں بھٹک رہے ہیں] کے الفاظ میں واضح کیا گیا ہے۔

''طُغْیان کا مفہوم: یہ لفظ طغی سے مشتق ہے جس کے معانی نافرمانی میں حد سے گزر جانے کے آتے ہیں (لسان العرب لابن منظور افریقی ۱۵:۷) اسی لئے اس کا ترجمہ ''سرکشی'' اور ''بغاوت'' کیا جاتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو رب تعالیٰ نے حکم دیا: اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى یعنی ''فرعون کے پاس جاؤ (وہ نافرمانی اور سرکشی میں) حد سے بڑھ گیا ہے۔'' (سورہ طٰہٰ ۲۴:)۔

''یَعْمَھُوْن کا مفہوم: عَمَہٌ کے معنی ہیں اَلتَّرَدُّدُ فِي الْاَمْرِ مِنَ التَّحَيُّرِ (مفردات القرآن لامام راغب اصفہانی) یعنی ''تحیر کی وجہ سے کسی معاملے میں متردّد ہونا''۔

''علامہ زمخشری لکھتے ہیں کہ یہ لفظ عمی کی مانند ہے مگر فرق یہ ہے کہ عمی اندھاپن' ظاہری نابینائی اور عقل و فکر یا رائے کی نابینائی دونوں پر استعمال ہوتا ہے لیکن عَمَہ صرف عقل و فکر کی یعنی باطنی نابینائی پر استعمال ہوتا ہے (الکشاف عن حقائق غوامض التنزیل ۱:۱۰۷)۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کے باعث ایسے لوگ باطنی روشنی اور صحیح فکری رہنمائی سے محروم ہو جاتے ہیں اور ہمیشہ اپنی گمراہی و سرکشی میں بھٹکتے رہتے ہیں تاوقتیکہ اپنی سرکشی اور بغاوت سے تائب ہو جائیں یا بدبختی میں اس انتہا کو پہنچ جائیں کہ پھر اُن پر عذابِ الٰہی کی گرفت اتنی سخت ہو کہ وہ دوسروں کے لئے عبرت بن جائے۔''

''اِشْتِراء کا مفہوم: شراء کے معنی عموماً خریدنے اور بیع (بیچنے) کے آتے ہیں مگر کسی چیز کے عوض چیز لی جا رہی ہو تو بیع و شریٰ دونوں ایک دوسرے کے مترادف (ہم معنی) بن جاتے ہیں (لسان العرب لابن منظور افریقی ۱۴:۴۲۷) ہدایت کے بدلے گمراہی خریدنے کا ایک مفہوم یہ ہے کہ کفار و منافقین نے گمراہی کو ہدایت پر ترجیح دی یعنی اُنہوں نے ایمان کی بجائے کفر کو پسند کیا۔ اس لحاظ سے یہاں اِشْتَرَوْا بمعنی اِسْتَحَبُّوْا استعمال ہوا ہے۔ علامہ قرطبی نے اسی معنی کی تائید کی ہے (الجامع لاحکام القرآن ۱:۲۲۵)۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ تو اپنی سابقہ کفر کی حالت کی بناء پر

پہلے ہی دولتِ ایمان اور متاعِ ہدایت سے محروم تھے۔ وہ ہدایت دے کر گمراہی خریدنے کے قابل تو تب ہوتے اگر اُن کے پاس پہلے متاعِ ہدایت موجود ہوتی۔ انھیں تو اب ہدایت کی راہ بتائی جا رہی تھی۔ اب اُن کے سامنے دو راستے تھے: ایک ہدایت کا اور دوسرا گمراہی کا۔ چنانچہ اُنھوں نے ہدایت کے مقابلے میں گمراہی کو ترجیح دی اور ایمان کے مقابلے میں کفر کو پسند کیا۔ ان کے اس فیصلے کو باری تعالیٰ نے اِشۡتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالۡهُدٰی کے الفاظ سے تعبیر فرمایا ہے۔ اِشۡتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالۡهُدٰی کا دوسرا معنی یہ ہے کہ اُنھوں نے اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ اس فطری ہدایت کو جو اُس نے ہر انسان کی تخلیق کے ساتھ ہی اُسے ودیعت کر دی ہے دے کر اُس کے بدلے کفر اور گمراہی حاصل کر لی۔''

چونکہ انسان اشرف المخلوقات ہونے کی بناء پر أَلَسۡتُ بِرَبِّكُمۡ قَالُوۡا بَلٰی (سورہ الاعراف: ۱۷۲)''کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ وہ (سب) بول اٹھے ہاں کیوں نہیں؟'' کے ابدی وعدہ کا شرف بھی حاصل کر چکا ہے لہٰذا اُسے فطری ہدایت کا وہ بلند درجہ نصیب ہوا ہے جو کسی اور ارضی مخلوق کو میسر نہیں آ سکا۔ اس لئے اُن کے پاس نسلِ بنی آدم ہونے کے باعث فطری ہدایت کی قیمتی متاع تو موجود تھی جس کا تقاضا یہ تھا کہ اب وہ ہدایتِ ربانی پر بھی ایمان لے آتے لیکن اُنھوں نے فطری ہدایت کی یہ بیش بہا متاع دے کر اس کے بدلے گمراہی کا سودا کیا۔ فطری ہدایت کو کسی گمراہی سے بدل لینے کے اس فعل کو قرآنِ حکیم نے اِشۡتِرَاء یعنی اِسۡتِبۡدَالُ الضَّلٰلَةِ بِالۡهُدٰی (ہدایت کے بدلے گمراہی کو اپنایا) (فتح القدیر شوکانی ۱ : ۱۵۷) قرار دیا ہے۔ علامہ زمخشری نے اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہ اُنھوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی کس طرح خریدی' حالانکہ وہ تو پہلے بھی ہدایت پر نہ تھے' لکھا ہے :

لِأَنَّ الدِّيۡنَ الۡقَيِّمَ هُوَ فِطۡرَةُ اللّٰهِ الَّتِيۡ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيۡهَا فَكُلُّ مَنۡ ضَلَّ فَهُوَ مُسۡتَبۡدِلٌ خِلَافَ الۡفِطۡرَةِ

''کیونکہ دینِ حق ہی اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ فطرت ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو تخلیق کیا ہے۔ پس ہر گمراہ شخص فی الحقیقت فطرت کی ہدایت کو ضلالت و گمراہی سے بدلنے والا ہے۔''

''اس تصور کی بناء پر گمراہی کو ہدایت کے بدلے خریدنے کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ جمہور مفسرین نے اسی معنی کو اپنایا ہے۔'' (''منافقت اور اُس کی علامات'' ۔۔ پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری' صفحات ۴۲ تا ۵۰)

علامہ زمخشری کی بیان کردہ عبارتِ بالا کا مفہوم یہ ہوا کہ ''ہر انسان اس دنیا میں مکمل پاکیزگی اور معصومیت کے ساتھ آتا ہے اور اُسے اس کائنات میں اپنی حیثیت اور رب تعالیٰ کی اچھائی' اُس کی حکمت اور قوتِ مقتدرہ کی سوجھ بوجھ حاصل ہوتی ہے اور یہ کہ وہ خارجی ترغیبات اور اُکساہٹوں کے ورغلانے سے گمراہ نہیں ہوتا۔'' یہ اُس کی صحیح فطرت ہے جس طرح بھیڑ کے بچے کی فطرت شریف ہونا اور گھوڑے کی فطرت تیز رفتاری ہے۔ لیکن وہ رسوم و رواج' توہمات' خود غرضانہ خواہشات اور غلط تعلیم کے جال میں گرفتار ہو جاتا ہے اور یہ چیز اُسے جھگڑالو' جھوٹا' غیر پاکیزہ' کمینہ خصلت' غلط چیزوں اور ممنوعات کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑنے والا' اپنے ابنائے جنس کی محبت اور ایک خدائے واحد کی خالصتاً عبادت سے منہ موڑنے والا بنا دیتی ہے۔ روحانی معلمین کے سامنے مسئلہ اس کجروی کا علاج کرنا اور انسانی فطرت کو رضائے الٰہی کے تحت بحال کرنا ہے۔'' (عبداللہ یوسف علی' نوٹ: ۳۵۴۱)

''<u>منافقت سراسر گھاٹے کا سودا ہے</u> : منافقوں نے منافقت کا وطیرہ اس لئے اپنایا تھا کہ وہ دونوں طرف سے مفادات حاصل کر سکیں گے۔ وہ کفر سے اپنا دیرینہ تعلق قائم رکھنے کی بناء پر اُدھر سے حاصل ہونے والے مفادات کو بھی ملحوظ رکھنا چاہتے تھے اور مسلمانوں سے ایمان کا تعلق ظاہر کر کے اِدھر سے دنیوی منافع' اموالِ غنیمت اور دیگر مفادات کے حق دار بھی بننا چاہتے تھے۔ لیکن اُن کی توقعات پوری نہ ہو سکیں۔ چونکہ اُن کی منافقت اللہ اور اُس کے رسول ﷺ سے مخفی نہ تھی اس لئے وہ ہر ایک کے سامنے بے نقاب ہو گئے۔ یوں دنیا میں بھی ذلت اور رسوائی اُن کے حصے میں آئی اور آخرت میں اذیت ناک عذاب کے مستحق قرار دئے گئے۔ اُن کی یہ تجارت کسی بھی لحاظ سے نفع بخش ثابت نہ ہوئی۔ یہ سودا بجائے منفعت کے خود اُنہی کے حق میں مضرت اور نقصان کا باعث ہو گیا۔ جو راس المال فطری ہدایت کی صورت میں اُن کے پاس موجود تھا' وہ بھی گمراہی کے بدلے ضائع کر بیٹھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہدایت کے باعث جو فائدہ اُنہیں آخرت کی زندگی میں پہنچتا' وہ اس سے بھی محروم ہو گئے اور دین کی زندگی میں بھی مزعومہ مفادات پورے نہ ہو سکے۔ قرآنِ حکیم نے یہ دونوں امور اس طرح بیان کئے ہیں: فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ کہ اُن کی تجارت نے نہ اُنہیں دنیا کا نفع پہنچایا اور وَ مَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ اور نہ ہدایت یعنی آخرت کا نفع نصیب ہو سکا۔ اس آیتِ کریمہ نے منافقت کو صریح نقصان اور گھاٹے کا سودا قرار دیا ہے اور تنبیہ کی ہے کہ کردار کا دوہرا پن کبھی بھی مطلوبہ مقصد حاصل نہیں کر سکتا۔ اس کا نتیجہ بہر صورت ذلت و رسوائی ہے خواہ جلد ہو یا بہ دیر۔ یہاں وَ مَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ کا معنیٰ یہ بھی ہے کہ جنہوں نے حصولِ منفعت کی خاطر ہدایت کے بدلے گمراہی خریدی وہ فی الحقیقت تجارت کی صحیح راہ نہیں جانتے۔ اگر اُنہیں سوجھ بوجھ اور نفع و نقصان کی تمیز ہوتی تو کبھی نقصان کا سودا نہ کرتے۔''

''<u>ایک گروہِ منافقین کی مثال</u> : مجموعی طور پر منافق دو قسم کے تھے: ایک وہ جو دل سے کفر پر قائم تھے اور صرف زبان کی حد تک دعویٔ ایمان کرتے تھے۔ انہوں نے اپنے تعصب اور عناد کی بنا پر اسلام کو سرے سے قبول ہی نہ کیا تھا' گویا یہ قطعی منکر تھے۔ دوسرے وہ جو ایمان تو قبول کرتے تھے لیکن اسلام کی راہ میں پیش آنے والی مشکلات سے گھبرا کر اور اپنے مزعومہ مفادات کو معرضِ خطر میں دیکھ کر پھر اسلام سے دستبردار ہو جاتے۔ اُن کا دل ایمان لانے کے لئے تیار ہوتا مگر ہمیشہ مفادات اور خطرات آڑے آ جاتے۔ گویا یہ تذبذب اور شک کی کیفیت میں مبتلا تھے۔ اس آیت ۱۷ میں پہلے گروہ کی تمثیل بیان کی گئی ہے اور دوسرے گروہ کی تمثیل آگے آیت نمبر ۱۹ میں آرہی ہے۔ اس تمثیل کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے کسی بندے نے حق کی آگ روشن کی جس کے نور سے سارا گردونواح منور ہو گیا۔ ہمارے خیال میں اس سے مراد جناب سرورِ کائنات ﷺ کی ذاتِ گرامی ہے۔ صحیح بخاری میں ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا:

مَثَلِيْ (وَ مَثَلُ النَّاسِ) كَمَثَلِ رَجُلٍ اِسْتَوْقَدَ نَارًا (صحيح بخاري: كتاب الانبياء' باب : قول الله تعالى وَوَهَبْنَا لِدَاوٗدَ سُلَيْمٰنَ نِعْمَ الْعَبْدُ ۲: ۱۲۶۰ رقم : ۳۲۴۴)

''میری اور لوگوں کی مثال اُس شخص کی مانند ہے جس نے آگ جلائی۔''

آپ ﷺ نے اسلام کے پیغام اور نورِ تبلیغ سے زندگی کے تمام ماحول کو روشن کر دیا' حق کو باطل سے' خیر کو شر سے اور نیکی کو بدی سے نمایاں کر دیا۔ وہ ماحولِ حیات جو شبِ تاریک کی مانند ظلمتوں اور گمراہیوں کا گہوارہ تھا' آپ ﷺ کے'

مہیا کردہ نورِ ہدایت سے چمک اٹھا اور ہر طرف پیغامِ حق کا اجالا ہو گیا۔ جو اہلِ نظر اور اربابِ دانش تھے' اُن پر ساری حقیقتیں آشکار ہو گئیں لیکن منافق جو ہوا و ہوس کی پرستش میں سب سے آگے جا چکے تھے' باوجود روشنی کے حقیقت کو نہ پا سکے۔ اُنہوں نے اس نورِ ہدایت کو ٹھکرا دیا اور تعصب و عناد کے پردے اٹھا کر حق و صداقت کا روشن چہرہ دیکھنے سے انکار کر دیا۔ جب اُنہوں نے از خود گمراہی کو ہدایت پر اور ظلمت کو روشنی پر ترجیح دی اور نورِ حق سے منہ پھیر کر کفر و ضلالت کی تاریکیوں کو پسند کیا تو اللہ تعالیٰ نے اُن کا نورِ بصارت سلب کر لیا یعنی اُنہیں حسبِ خواہش گمراہیوں اور ظلمتوں میں بھٹکتے رہنے کی توفیق دے دی۔ جنہوں نے اس نور سے اکتسابِ فیض کیا تھا' وہ منزلِ مراد پا گئے اور جو اس کے منکر ہوئے تھے وہ کفر کی ظلمات میں بھٹکتے رہے۔''

صُمٌّ'' جمع ہے اَصَمّ'' کی' بُکْم'' جمع ہے اَبْکَم کی اور عُمْیٌ'' اَعْمٰی کی جمع ہے (لسان العرب ۱۵:۹۵) اُن کے معانی بالترتیب گونگا' بہرا اور اندھا کے ہیں۔ اُن کی گمراہی اور قبولِ حق سے انکار کا یہ عالم ہے کہ اُن کے کان حق کی بات سننے سے قاصر ہیں۔ اُن کی زبانیں حق کہنے سے عاری ہیں اور اُن کی آنکھیں حق کو دیکھنے سے محروم ہیں۔ یہاں مولانا نعیم الدین مراد آبادی نے مذکورہ تمثیل کی وضاحت میں خوب نکتہ بیان کیا ہے :

''جنہوں نے اظہارِ ایمان کیا اور دل میں کفر رکھ کر اقرار کی روشنی کو ضائع کر دیا اور وہ بھی جو مؤمن ہونے کے بعد مرتد ہو گئے اور وہ بھی جنہیں فطرتِ سلیمہ عطا ہوئی اور دلائل کی روشنی نے حق واضح کر دیا مگر اُنہوں نے فائدہ نہ اٹھایا اور گمراہی اختیار کی اور جب حق سننے' ماننے' کہنے اور راہِ حق دیکھنے سے محروم ہوئے تو کان' زبان' آنکھ سب بے کار ہوئیں۔'' (خزائن العرفان ۔۔ نعیم الدین مراد آبادی: ۷۹۸)

''دوسرے گروہِ منافقین کی مثال : آیت ۱۹ میں منافقین کی دوسری قسم کی تمثیل بیان ہوئی ہے۔ یہاں بطورِ تمثیل کچھ الفاظ کا ذکر آیا ہے۔ اُن کے مرادی معنیٰ سمجھنے سے پہلے لغوی معنیٰ پر توجہ کر لیں۔''

''صَیِّب صَوب سے مشتق ہے۔ صواب فی نفسہ پسندیدہ امر کو کہتے ہیں۔ چنانچہ صَوب یا صَیِّب ایسی بارش کو کہا جاتا ہے جو فائدہ مند ہو۔ صَیِّب خود ایسے بادل کو بھی کہتے ہیں (لسان العرب ۱:۵۳۷)۔ اَلسَّماء ہر چیز کے اوپر کے حصے کو کہتے ہیں چنانچہ یہ لفظ محض بلندی پر بھی بولا جاتا ہے۔ سماء کے لفظ کا اطلاق زمین پر پڑنے سے پہلے بارش پر بھی ہوتا ہے اور سماء کے معنیٰ خود 'سحاب' یعنی بادل کے بھی ہیں (تاج العروس ۔۔ زبیدی ۱:۲۴۲)۔ الصَّواعِق صاعقہ کی جمع ہے اور صعق سے مشتق ہے۔ صاعقہ اُس ہولناک آواز کو کہا جاتا ہے جو گرج اور کڑک سے پیدا ہوتی ہے۔ اس سے بعض اوقات آگ' موت اور عذاب بھی مراد لئے جاتے ہیں۔''

''اس تمثیل میں آسمان سے برسنے والی بارش سے مراد وحیِ الٰہی کا نزول یا اسلام ہے جو عالمِ انسانیت کے لئے رحمت بن کر آیا۔ اندھیروں سے مراد وہ مصائب و مشکلات ہیں جنہوں نے ہر طرف سے اسلام کو گھیر رکھا تھا۔ گرج اور

کڑک سے مراد اسلام کی پے در پے فتوحات اور کامیابیاں ہیں جو باوجود مشکلات اور نامساعد حالات کے مطلع کو روشن کر رہی تھیں اور اُن کے باعث اہلِ اسلام کے دلوں کو تقویت پہنچ رہی تھی۔''

''بلا شک وشبہ اسلام رحمتِ حق کی بارش بن کر مُردہ دلوں کو تازہ زندگی عطا کرتا ہے۔ جس طرح زوردار بارش کے وقت بسا اوقات تیز آندھیاں اور گھٹائیں چھا جاتی ہیں اور بادل کی ہولناک کڑک سے دل دہلنے لگتے ہیں اسی طرح اسلام کی آمد کے ساتھ ہی باطل اور کفر وطاغوت کی طرف سے کھلی عداوتوں اور پوشیدہ سازشوں کا لامحدود سلسلہ جاری ہوگیا۔ اہلِ حق کی راہ میں طرح طرح کی مخالفتیں اور مزاحمتیں کھڑی ہوگئیں۔ مصائب وآلام کے بادل گرجنے لگے۔ ان تمام ہولناکیوں نے مل کر عجیب وحشت کا سماں پیدا کر دیا۔ جنہوں نے صدقِ دل سے نورِ ہدایت کو قبول کرلیا تھا' وہ ظاہراً ان ناسازگار حالات میں بھی ثابت قدم رہے۔ کوئی مصیبت اور مخالفت بھی اُن کے پائے استقلال کو متزلزل نہ کرسکی لیکن جو لوگ نیم دلی اور بزدلی کا شکار تھے' جن کی کیفیت تذبذب اور تحریص کی تھی' وہ اسلام کی حیات بخشی اور نفع مندی سے بھی مستفید ہونا چاہتے تھے لیکن دردمندانہ جرأت وہمت کے فقدان کے باعث مصائب وآلام کی تاریک گھٹاؤں کو دیکھ کر خوف زدہ ہو جاتے اور شدید مخالفت ومزاحمت کی ہولناک آوازوں کو سن کر اُن کے دل دہل جاتے تھے۔ اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس کر گویا وہ ان پریشان کن کیفیات سے لاتعلقی ظاہر کرتے تھے۔ یوں اسلام سے وابستگی منقطع کرنے میں وہ اپنی عافیت تصوّر کرتے تھے۔''

''یہاں اُن کے حسد کی کیفیت بیان کی جا رہی ہے۔ چونکہ مذکورہ بالا تمام مشکلات کے باوجود اسلام کو روز بروز ترقی اور فتح نصیب ہو رہی تھی' جنگوں میں فتوحات ہوتیں' اہلِ حق کے ہاتھ اموالِ غنیمت آتے۔ اُن کی مالی حیثیت بھی مستحکم ہوتی اور سیاسی ومعاشرتی بھی۔ اس طرح لحہ بہ لحہ اسلام ایک عالمگیر قوت بنتا جا رہا تھا۔ جب کبھی ایسی صورتِ حال پیدا ہوتی تو وہ حیران وششدر رہ جاتے اور اسلام کی فتح وکامرانی کو دیکھ کر حسد کی آگ میں جل اٹھتے۔ اُن کی اسی کیفیت کو بیان کیا گیا ہے کہ اسلام کی فتوحات کی چمک دمک کہیں ان حاسدوں کی بینائی ہی سلب نہ کرلے۔ ان کامیابیوں کی روشنی کو دیکھ کر انہیں اسلام کا راستہ آسان نظر آنے لگتا تو وہ مفاد پرستی اور دُنیوی منفعت کی خاطر مسلمانوں کے ساتھ ہو جاتے اور اُن کے ہمراہ اسلام کی منزل کی طرف بڑھنے لگتے لیکن اسی اثنا میں جنگ وقتال اور ایثار وقربانی کا کوئی مرحلہ آتا تو مشکلات کی تاریکیوں میں وہیں رک جاتے اور خطرات دیکھ کر مسلمانوں کو پھر چھوڑ جاتے۔ یہ تھا اُن کا مفاد پرستانہ طرزِ عمل کہ ظاہری منافع ومفادات کے حصول کی امید لگتی تو فائدہ اٹھانے کے لئے اہلِ حق کے ساتھ ہو جاتے۔ خطرات ومصائب کے لمحات میں قربانی کا وقت آتا تو فوراً لاتعلق ہو جاتے۔''

''شَـاءَ مَشِيئَةً کسی چیز کو وجود میں لانے کا نام ہے۔ اللہ تعالیٰ کی مشیت کسی شے کی ایجاد ہے جبکہ انسان کی مشیت کسی شے کے ارادے کا نام ہے۔ شَیٔ اصل میں ''شاءَ'' کا مصدر ہے جو بمعنی مفعول استعمال ہوتا ہے جس کے معنی ہیں ''جو چیز چاہی گئی'' یعنی جس چیز کو وجود میں لانے کا ارادہ کیا گیا۔ بعض علماء کے نزدیک شَیٔ اُس چیز کو کہا جاتا ہے جو جانی جائے اور جس چیز کی خبر دی جائے۔'' (الکشاف عن حقائق غوامض التنزیل ۱:۳۵۲)

لَــوْ حرف شرط ہے اور کسی خلاف مشیتِ امر کے بیان کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ اس بیان کا مقصود مذکورہ امر کی نفی ہوتا ہے جیسے فرمایا گیا :

(۱) لَوْ أَرَدْنَا أَنْ نَّتَّخِذَ لَهْوًا لَّاتَّخَذْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا اِنْ كُنَّا فٰعِلِيْنَ O (الانبیاء : ۱۷)
''اگر ہم کوئی کھیل تماشا کرنا چاہتے تو اُسے اپنی ہی طرف سے اختیار کر لیتے اگر ہم ایسا کرنے والے ہوتے۔'' (۱۷ : ۲۱)

(۲) وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ أَهْوَآءَ هُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْأَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ (المؤمنون : ۷۱)
''اور اگر دینِ حق کہیں ان لوگوں کی خواہشوں کا تابع ہو جاتا تو آسمان و زمین اور جو کچھ اُن میں (آباد) ہیں (سب) تباہ ہو جاتے۔'' (۷۱ : ۲۳)

(۳) لَوْ أَرَادَاللّٰهُ أَنْ يَّتَّخِذَ وَلَدًا لَّاصْطَفٰى مِمَّا يَخْلُقُ مَايَشَآءُ سُبْحٰنَه' (الزُّمَر : ۴)
''اگر اللہ کسی کو اولاد بنانے کا ارادہ کرتا تو اپنی مخلوق میں سے جسے چاہتا منتخب کر لیتا' وہ تو (اس سے) پاک ہے۔'' (۴ : ۳۹)

تو یہاں سورۂ البقرۃ کی آیت ۲۰ میں یہ واضح کیا جا رہا ہے کہ ''اگر میں چاہتا تو پہلے گروہ کی طرح اُن کی بصارت اور سماعت بھی سلب کر لیتا اور اسلام کی طرف وقتی طور پر راغب ہونے کی بھی توفیق نہ دیتا لیکن یہ مشیتِ الٰہی کے خلاف ہے۔ جو شخص جس قدر سننے اور دیکھنے کے لئے تیار ہو' اُسے اُسی قدر توفیق مرحمت فرمائی جاتی ہے۔ اُس پر ذاتِ حق اپنے فیصلے سے کسی قسم کا جبر نہیں کرتی۔ پہلے گروہ نے نورِ ہدایت قبول کرنے سے کھلا انکار کر دیا تھا اور اُنہوں نے تعصب کا پردہ اٹھا کر اسلام کی حقانیت کو دیکھنا ہی گوارا نہیں کیا تھا۔ اس لئے ہم نے اُنہی کے حسبِ خواہش اور حسبِ عمل اُنہیں نورِ بصارت سے محروم کر دیا یعنی اُنہیں توفیقِ ہدایت سے دُور کر دیا لیکن دوسرا گروہ کبھی مفادات کی خاطر اور کبھی عظمتِ اسلام سے مرعوب ہو کر' الغرض کچھ نہ کچھ اور کبھی نہ کبھی تو اسلام کے قریب آتا ہی ہے۔ ہر چند کہ پھر خطرات سے گھبرا کر دُور چلا جاتا ہے اس لئے اس نے اسلام کی خاطر جس حد تک اپنے دیدہ و گوش کھول رکھے ہیں' ہماری مشیت و حکمت کا یہ تقاضا نہیں کہ اُنہیں ان سے محروم کر دیا جائے۔ یہ بیان باری تعالیٰ کے عدل و انصاف اور انسانی اعمال میں اس کی آزادی اور اختیار پر کھلی دلیل کی حیثیت رکھتا ہے۔ مزید برآں اس میں حق کی دعوت دینے والوں کو یہ تعلیم بھی دی گئی ہے کہ جو لوگ جس حد تک اور جس حال میں بھی حق کے قریب آنا چاہیں' اُنہیں اس سے روکا نہ جائے۔ ممکن ہے اسلام اور حق سے قرب کے باعث ان کی مفاد پرستی رفتہ رفتہ حق پرستی میں بدل جائے اور وہ منافقت سے تائب ہو کر بالآخر سچے مسلمان بن جائیں۔ لہٰذا یہ کہہ کر کہ یہ لوگ مفادات کے پیشِ نظر حق کے قریب آ رہے ہیں اُنہیں دُور کر دینا در حقیقت ان کے لئے حق کو صدقِ دل سے قبول کرنے کے امکانات کو معدوم کرنے کے مترادف ہے۔''

قَدِیر کا معنیٰ: یہ لفظ قُدرَت سے ہے اور اللہ تعالیٰ کے لئے ہر قسم کے عجز یا کمزوری کی نفی کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ ''مفردات الفاظ القرآن'' میں اس کے معنی اصطلاحِ شرع کی رُو سے یوں بیان ہوئے ہیں:

اَلْفَاعِلُ لِمَا يَشَاءُ عَلٰى قَدرِ مَا تَقْتَضِى الْحِكْمَةُ لَا زَائِدًا عَلَيْهِ وَلَا نَاقِصًا عَنْهُ (راغب اصفہانی)

''اس کام کا کرنے والا جسے وہ چاہے اسی قدر حکمت کا تقاضا ہے' نہ اس سے زیادہ اور نہ اس سے کم۔''

''لہٰذا اللہ تعالیٰ کے قادرِ مطلق ہونے کے ہرگز یہ معنیٰ نہیں کہ ایسے کام اُس کی قدرت کی طرف منسوب کئے جائیں جو اُس کی حکمت اور مشیت کے خلاف ہوں کیونکہ قدرتِ الٰہی کے تصوّر میں اُس کی ''حکمت اور مشیت'' بھی شامل ہیں۔ پس شریعتِ اسلامیہ میں اللہ تعالیٰ کے ہر چیز پر قادر ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ ''وہ ذات ہر وہ کام کرسکتی ہے جو وہ چاہے یعنی جو اُس کی مشیت کو مطلوب ہو اور اس حد تک کرسکتی ہے جس حد تک اُس کی حکمت کا تقاضا ہو۔'' اس معاملے میں وہ نہ محتاج ہے اور نہ عاجز و کمزور لیکن جو امور اور افعال اُس کی شانِ الوہیت اور مشیت و حکمت کے منافی ہوں' اُن کا کرنا نہ وہ چاہتی ہے اور نہ اُس کی حکمت کا مقتضی ہوتا ہے اس لئے ان کے حوالے سے اُس کی قدرتِ مطلقہ کا بیان کرنا قطعاً نامناسب بلکہ اُس کے قدیر ہونے کے خلاف ہے۔'' (''منافقت اور اُس کی علامات''۔ ڈاکٹر طاہر القادری)

ضروری نوٹ :اللہ تعالیٰ کے ہر چیز پر قادرِ مطلق ہونے سے کچھ بدعقیدہ لوگوں نے اُس ذاتِ پاک کی طرف امکانِ کذب کا خود اختراعی عقیدہ گھڑ لیا یعنی اللہ تعالیٰ چونکہ ہر شے پر قادر ہے لہٰذا وہ (العیاذ باللہ) جھوٹ بھی بول سکتا ہے اور اپنے دعویٰ کی تائید میں اُنہوں نے یہ دلیل دی کہ اگر اللہ جھوٹ پر قادر نہ ہو تو مجبور ہوگا اور مجبوری اُس کی الوہیت کے خلاف ہے۔ اس کا ایک جواب تو ڈاکٹر موصوف کی درج بالا خط کشیدہ عبارت میں موجود ہے۔ اور (۲) چونکہ جھوٹ عیب ہے بلکہ تمام عیوب سے بدتر عیب ہے اور رب تعالیٰ تمام عیبوں سے پاک ہے لہٰذا جھوٹ سے بھی پاک ہے بلکہ اُس کے لئے جھوٹ بولنا محال بالذات ہے۔ (۳) جھوٹ بولنے کی صرف تین وجہیں ہوتی ہیں: لاعلمی' عاجزی اور خباثتِ نفس۔ اگر کسی کو خبر ملی اور اُس نے بلا تحقیق وہی خبر لوگوں سے بیان کردی جو دراصل غلط تھی تو وہ اپنی لاعلمی کی وجہ سے جھوٹی بات کہہ گیا۔ زید نے وعدہ کیا کہ میں ایک ہفتہ کے بعد قرض ادا کردوں گا لیکن اس مدت میں رقم اس کے ہاتھ نہ آئی تو اس وعدہ میں وہ جھوٹا ہوگیا اور یہ جھوٹ اُس کی مجبوری کی وجہ سے ہوا۔ اسی طرح کسی شخص کو جھوٹ بولنے کی عادت ہوگئی کہ بلاوجہ جھوٹ بولا کرتا ہے۔ یہ جھوٹ خباثتِ نفس کی وجہ سے ہوا۔ ربّ ذوالجلال والاکرام اِن تینوں عیوب سے پاک' لہٰذا جھوٹ سے بھی پاک ہے۔ (۴) جس کلام میں جھوٹ کا احتمال ہو' سننے والے کو اعتبار نہیں ہوتا۔ اگر اللہ کی خبروں میں جھوٹ کا امکان ہو تو اُس کی کوئی خبر یقینی نہیں رہے گی اور یقین کے بغیر ایمان حاصل نہیں ہوا کرتا۔ لہٰذا اللہ کے لئے امکانِ کذب کا عقیدہ مان کر کوئی بھی شخص مؤمن تو کیا' مسلم بھی نہیں ہوسکتا کیونکہ اُسے اللہ کی ہر خبر میں جھوٹ کا امکان نظر آئے گا اور وہ یقین جو ایمان کے لئے ضروری ہے' اُسے حاصل نہ ہوگا۔ چنانچہ مولانا عبداللہ ٹونکی اور شاہ فضل الحق خیر آبادی نے اللہ کے لئے امکانِ کذب کی تردید میں رسالے لکھے۔'' (تفسیر نعیمی' جلد اوّل' صفحات ۲۱۶' ۲۱۷)

قدیر اور قادر میں فرق : قادر اسم فاعل ہے اور قدیر صفتِ مشبہ۔ دونوں میں فرق یہ ہے کہ اسمِ فاعل اس پر بولتے ہیں جس سے فعل صادر ہو رہا ہو اور صفتِ مشبّہ اُس کے لئے بولا جاتا ہے جس میں فعل کرنے کی صفت موجود ہو خواہ وہ فی الحال کر رہا ہو یا نہ کر رہا ہو۔ جیسے سامع اُسے کہا جائے گا جو فی الحال کچھ سن رہا ہو مگر سمیع وہ ہے جس میں سننے کی قوّت موجود ہے خواہ وہ فی الحال اُسے سنے یا نہ سنے۔ اسی طرح متکلم وہ ہے جو فی الحال بول رہا ہو مگر کلیم وہ ہے جس میں بولنے کی طاقت ہو خواہ وہ فی الحال بول رہا ہو یا نہ بول رہا ہو۔

(۷۵) عبادت(IBADAT)

اللہ خالق و مالک کا نائب (خلیفہ) ہونے کے لحاظ سے حضرتِ انسان کو اُس کے احکامات کا مکمل طور پر اطاعت و فرمانبرداری کا کمال مجسمہ ہونا چاہئے۔ اُس کی تمام زندگی اور زندگی کا ہر شعبہ اپنے خالق کی بندگی کا مظہر ہونا چاہئے۔ اُس کی زندگی' اُس کی موت' اُس کی امنگوں' آرزوؤں' خواہشات اور زندگی کی تمام تنظیمات (سسٹم) کو رضائے الٰہی اور مقصوداتِ الٰہی کا عکاس ہونا چاہئے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ ضابطہ حیات کا انسانی زندگی کے ہر شعبہ اور ہر موقع پر مشاہدہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ انسان کی سرگرمی کے تمام نقوش کو محیط ہے۔ سورۃ الذاریٰت کی درجِ ذیل آیت ۵۶ میں اللہ تعالیٰ نے اسی نکتے پر زور دیا ہے:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِO

"اور میں نے تو جنات اور انسان ☆ کو پیدا ہی اسی غرض سے کیا ہے کہ وہ میری عبادت کیا کریں۔" (۵۱:۵۶)

اور انسان کی زندگی کوئی کھیل تماشا نہیں۔ خالق کا اس کے پیچھے ایک مقصد کارفرما ہے جیسا کہ سورۃ المؤمنون میں بیان کیا گیا:

أَفَحَسِبْتُمْ أَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّ أَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَO (المؤمنون : ۱۱۵)

"تو تم نے کیا سمجھ رکھا ہے کہ ہم نے تمہیں یونہی بلا مقصد پیدا کیا ہے اور یہ کہ تم ہمارے پاس لوٹا کر نہ لائے جاؤ گے؟" (۱۱۵ : ۲۳)

یعنی تم نے یہ سمجھا کہ جس طرح شمع یا چراغ گل ہو جاتا ہے' اُسی طرح انسانی روح بھی معدوم محض ہو جاتی ہے۔ یہ کیسی شدید حماقت ہے! قرآن اسی خیالِ باطل کی تردید کر رہا ہے اور انسان کی حیاتِ دنیوی کا انجام پیشگاہِ الٰہی میں حاضری بتاتا ہے۔ اسی میں ان باطل مذہبوں کا ردّ آ گیا جو انسان کا انجام فنائے محض سمجھے ہوئے ہیں۔

ایک انگریز شاعر ہنری لانگ فیلو نے اپنے ایک شعر میں سچ کہا ہے:

"زندگی ایک حقیقت ہے' زندگی پُرجوش اور پُرعزم ہے اور قبر اس کا منتہائے مقصد نہیں ہے۔"

☆"مخلوقات میں جن اور انسان دو قسمیں ایسی ہیں جن میں خالق نے پورا احساسِ ذمہ داری رکھ دیا ہے اور اُن کے اندر ابتلاء و اختیار دونوں کی صلاحیتیں جمع کر دی ہیں۔ بخلاف فرشتوں کے جو ابتلاء سے خالی رکھے گئے ہیں اور بخلاف حیوانات کے جنہیں اختیار کی پوری قوت نہیں دی گئی۔ مکمل طور پر ذمہ دار ہستیاں بنا کر یہی دو مخلوق دنیا میں بھیجی گئی ہیں۔ اُن کی اپنی تکمیلِ ذات کے لئے یہ لازمی ہے کہ وہ جو کچھ بھی کریں' عبادت ہی کی راہ سے کریں۔ کھائیں' پئیں' بولیں چالیں' چلیں پھریں' کمائیں خرچ کریں ہر فعل اور ہر عمل سے مقصود رضائے الٰہی کا حصول ہی رکھیں۔ اپنے وجود کی علتِ غائی اسی کو سمجھیں اور یہی معنیٰ ہے اُن کی عبادت کا۔ عبدیت اور عبادت سے خود انسانیت ہی کو پوری نشوونما کا موقع ملتا ہے اور جتنی اس میں کمی رہ جائے گی' اُسی نسبت سے انسان کا منشائے تکمیل ناتمام رہے گا۔" (تفسیر ماجدی اردو' صفحہ ۱۰۴۵' نوٹ:۳۳)

<u>ایک خطرناک مغالطہ روا ہمہ</u> : سورۃ الذاریت کی درج بالا آیت ۵۶ سے کچھ لوگوں نے یہ سمجھا کہ اسلام صرف مسجد ہی کا مذہب ہے بہ ایں معنیٰ کہ انسان کو اپنے خالق کی عبادت کرتے ہوئے ہر وقت مسجد ہی میں ہونا چاہئے ۔ یہ خیال کلی طور پر غلط ہے اور مقصدِ حقیقی کو سمجھا ہی نہیں گیا ۔ اسلام نہ تو محض مسجد کا مذہب ہے اور نہ ہی محض دنیاوی معاملات کا ۔ اسلام 'عبادت' کا مذہب ہے ۔ اور عبادت نام ہے اللہ کی مکمل تابعداری اور فرمانبرداری کا ۔ اسلام دراصل دونوں دنیاؤں اور مادیت و رُوحانیت دونوں کا حسین امتزاج ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کو اللہ سے دونوں دنیاؤں میں خیر اور بھلائی عطا کئے جانے کی دعا سکھائی گئی ہے اور فرمایا گیا:

رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ O (البقرة : ۲۰۱)

''اے ہمارے پالنہار! ہمیں دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی بھلائی عطا فرما اور ہمیں دوزخ کی آگ سے بچالے ۔'' (۲۰۱ : ۲)

دیکھئے اس دعا میں دُنیا نہیں مانگی گئی بلکہ ''بھلائی'' اور صرف ''بھلائی'' جہاں کہیں بھی وہ پائی جائے' اس دنیا میں یا اُس دنیا میں' کی درخواست کی گئی ہے ۔ نبی مکرّم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی یہ ایک مثالی اور دل پسند دعا تھی کیونکہ اس کے دو جملوں میں اِس دنیا اور اُس دنیا کی جملہ بھلائیوں اور نعمتوں کو جمع کر دیا گیا ہے ۔ اس جامعیت نے ایک عیسائی مصنف کو یہ لکھنے پر مجبور کر دیا ۔ وہ لکھتا ہے :

''یہ دعا اسلام میں انتہائی دقّت طلب متناقض خصوصیت کی حامل ہے ۔ اس دنیا سے لطف اندوز ہونے' اس کی نعمتوں کو استعمال کرنے اور اسے تسلیم کرنے میں اسلام بہت ہی عملی مذہب ہے لیکن اسلام کے پیش کردہ گناہوں کی مغفرت کے اصول پر وہ اِس دنیا کا نہیں بلکہ کلیتاً کسی خیالی دنیا کا مذہب معلوم ہوتا ہے ۔''

"Religious Life and Attitude in Islam"... Macdonald, p. 43)

پس اسلام میں عبادت کا تصوّر زیادہ جامع ہے ۔ اس سلسلہ میں اسد نے صحیح بخاری کے اپنے انگریزی ترجمہ کی جلد اوّل' صفحہ ۳۹ پر لکھا ہے :

''اسلام میں عبادت خالصتاً دینی وابستگی کے بندھے ہوئے طریقے تک محدود نہیں ہے بلکہ اس کی وسعت انسان کی انفرادی اور معاشرتی تمام عملی زندگی تک پھیلی ہوئی ہے ۔ اگر ہماری زندگی کا مجموعی مقصد اللہ کی عبادت کرنا ہو تو ہمیں اس کے کل پہلوؤں میں زندگی کو ایک مربوط اخلاقی ذمّہ داری سمجھنا چاہئے ۔ اس طرح ہمیں اپنے تمام اعمال کو خواہ وہ کتنے ہی معمولی نوعیت کے ہوں' عبادت کے طور پر ادا کرنے چاہئیں یعنی اُنہیں شعوری طور پر اُس کائناتی منصوبے کا حصّہ بنانا چاہئے جس کی تشکیل اللہ نے کی ہے ۔'' (ماجدی)

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ قرآنی آیت "إِنَّمَا أَمْوَالُكُمْ وَأَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ" (سورۃ التغابن:۱۵) (تمہارے مال اور تمہاری اولاد تو بس آزمائش ہی کی چیزیں ہیں ۶۴:۱۵) کے نزول پر کچھ نیک نیت مسلمانوں نے

لذت بخش غذا نہ لینے اور اپنی بیویوں سے قربت نہ کرنے کی قسم کھالی تھی۔ نبی ﷺ نے اس پر انتہائی ناگواری کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا: لَا رَهْبَانِيَّةَ فِي الْإِسْلَامِ (اسلام میں ترکِ دنیا یعنی راہبوں اور راہبات کی کوئی گنجائش نہیں)۔سورۃ المائدۃ کی ذیل کی آیت ۸۷ بھی ایسے ہی نیک نیت لوگوں کے لئے نازل ہوئی تھی:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبٰتِ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ O

''مومنو! اپنے اوپر اُن پاکیزہ چیزوں کو جو اللہ نے تمہارے لئے جائز کی ہیں' حرام نہ کرلو اور حدود سے آگے نہ نکلو۔ بے شک اللہ حدود سے آگے نکل جانے والوں کو پسند نہیں کرتا۔'' (۸۷:۵)

کسی مسلمان کا ایسی جسارت کرنا گویا اس کا اقرار کرنا ہے کہ (معاذ اللہ) شریعت سے فلاں فلاں پرہیز کے مقرر نہ کرنے میں کمی ہوئی ہے اور اب میں اپنی عقل و تجربہ سے اس فروگزاشت کی تلافی کر رہا ہوں۔ کسی جائز چیز سے کسی طبی یا انتظامی مصلحت کی بنا پر دست بردار ہوجانا اور چیز ہے جیسے یعقوب علیہ السلام نے عرق النسا کے مرض کی وجہ سے اونٹ کے دودھ اور گوشت کو اپنے اوپر ممنوع کر لیا تھا (تفسیر بیضاوی: سورہ آلِ عمران' آیت ۹۳) اور ظاہر ہے کہ اس طبی پرہیز کا حُرمتِ شرعی سے کوئی تعلق نہیں۔ تو معلوم ہوا کہ ترکِ لذات کی اور بیویوں سے دُور رہنے کی خود عائد کردہ قسموں کا کوئی اعتبار اور کوئی فائدہ نہیں جب تک کہ وہ اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ وحی کے مطابق نہ ہوں۔ اس لئے انسان کو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو جذباتِ تشکر و امتنان کے ساتھ استعمال میں لانا چاہئے لیکن اُن کے استعمال میں بھی حدود سے آگے نکل جانے کو وہ پسند نہیں کرتا اور حدود سے آگے نکل جانا اللہ کی حلال کردہ چیزوں کو اپنے اوپر حرام اور ممنوع کر دینا ہے۔

<u>عبادات کی ناگزیریت</u>: اس سلسلہ میں ایک مغربی مصنف نے یوں لکھا ہے:

''سائنسی روشنی کے اس دَور میں اس وجہ کے بارے میں بہت کم کہا گیا ہے کہ ہم دعا کیوں مانگتے ہیں یا عبادت کیوں کرتے ہیں۔ اس کا سیدھا سادہ جواب یہ ہے کہ ہم اس کے بغیر رہ نہیں سکتے۔ غالباً یہ بات بھی ہے کہ سائنس عبادت کی جتنی بھی مخالفت کرلے' انسان آخر وقت تک عبادت کرتا رہے گا۔ عبادت کے تحرک کا جذبہ اس حقیقت کا لازمی نتیجہ ہے کہ انسان کا اختباری اور تجربی نفسِ باطن معاشرتی قسم کا ہے یعنی وہ مل جل کر رہنا جانتا ہے۔'' ("Principles of Psychology"... James, Vol. 1, p. 316)

''اسلامی نشاۃ ثانیہ کے کارِ خیر میں تحریکی قیادتوں اور کارکنوں میں خوبیوں کے ساتھ ساتھ بہت سی خامیاں پائی جاتی ہیں جس کے باعث منزلِ مقصود تک رسائی نہیں ہو رہی۔ ان کمزوریوں میں سے سرِ دست صرف ایک گوشے کی طرف توجہ مبذول کرانا مقصود ہے اور وہ نماز ہے جسے اس طرح ادا نہیں کیا جاتا جیسا کہ ادا کرنے کا حق ہے بلکہ بہت سے لوگ تو اس وعید کا مصداق اور مستحق بن چکے ہیں جو سورۃ الماعون میں آئی ہے:

فَوَيْلٌ '' لِّلْمُصَلِّيْنَ O الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ O الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ O (اَلْماعُون : ۴ تا ۷)

''اُن نمازیوں کے لئے بڑی خرابی ہے جو اپنی نماز سے بے خبر ہیں جو دکھاوا کرتے ہیں اور برتنے کی معمولی چیز بھی نہیں دیتے۔'' (۴ تا ۷ : ۱۰۷)

''یہاں یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ نماز نہ پڑھنے کا انکار نہیں کیا جا رہا بلکہ اس بات کی طرف متوجہ کیا جا رہا ہے کہ وہ لوگ ہیں تو نمازی لیکن بربادی اُن کا مقدر بن چکی ہے کیونکہ وہ نماز کے لوازمات (خشوع وخضوع' تعدیلِ ارکان' مستعدی اور چستی' وقت پر ادائی وغیرہ) سے بے خبر ہیں۔ اسلام کی ترویج واشاعت اور مصطفوی انقلاب کے نعرے لگانے والوں کے لئے غور کا مقام ہے کہ اللہ کی نگاہ میں جو لوگ برباد ہیں' وہ بھلا ہمہ جہتی تبدیلی کیسے لا سکتے ہیں! انقلاب تو دوسروں کو آباد کرنے کے لئے لایا جاتا ہے۔ جو خود برباد ہے وہ کسی کو بھلا کیا آباد کرے گا!''

''بگاڑ کا سبب: جب کسی خطہ زمین پر اسلامی نظام قائم ہو جاتا ہے تو آسمان سے برکتیں نازل ہوتی ہیں اور زمین اپنے خزانے اُگل دیتی ہے۔ خوشحالی' امن اور سلامتی کا دَور دورہ ہوتا ہے۔ حکمران عوام پر مہربان ہوتے ہیں اور عوام حکمرانوں کے خیر خواہ ہوتے ہیں۔ اس کے بعد جب زوال آتا ہے تو بگاڑ کا آغاز نمازوں کو ضائع کرنے سے ہوتا ہے۔ اسلام کی شاندار عمارت کو کمزوری کا سبب بننے والی پہلی اینٹ نمازوں سے لاپروائی کی صورت میں اپنی جگہ سے کھسکتی ہے۔ پھر ایک ایک کر کے دیگر کمزوریوں کا ظہور ہوتا ہے اور دینی عمارت دھڑام سے نیچے آگرتی ہے جس کی طرف درج ذیل آیتِ قرآنی میں اشارہ کیا گیا:

فَخَلَفَ مِنۢ بَعۡدِهِمۡ خَلۡفٌ أَضَاعُوا الصَّلَاةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوۡفَ يَلۡقَوۡنَ غَيًّاO (مریم:۵۹)

''پھر اُن کے بعد ایسے ناخلف آئے جنہوں نے نماز کو ضائع کیا اور نفسانی خواہشات کی پیروی میں لگ گئے وہ جلد ہی (آخرت میں) بربادی سے دوچار ہوں گے۔'' (۵۹ : ۱۷)

''نماز ضائع کرنا کئی طرح سے ہو سکتا ہے۔ وجہ کوئی بھی ہو' نمازوں کا یہ ضیاع اسلامی اقدار اور اقتدار کی بنیادوں کو کمزور کر دیتا ہے۔ بالآخر ایک دن اقتدار سے ہاتھ دھونے پڑتے ہیں اور مسلمان مغلوب ہو کر ذلیل وخوار ہو جاتے ہیں کیونکہ اقتدار میں آ جانے کے بعد اسلامی حکومت کا پہلا کام نظامِ صلوٰۃ کو قائم کرنا ہوتا ہے۔ فرمایا:

اَلَّذِيۡنَ اِنۡ مَّكَّنّٰهُمۡ فِى الۡاَرۡضِ أَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَآتَوُا الزَّكٰوةَ وَأَمَرُوۡا بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَنَهَوۡا عَنِ الۡمُنۡكَرِ (اَلۡحَجّ : ۴۱)

''(یہ لوگ ایسے ہیں کہ) اگر ہم اُنہیں زمین میں حکومت دیں تو وہ نماز کی پابندی کریں' زکوٰۃ دیں اور (دوسروں کو بھی) نیکی کا حکم دیں اور برے کام سے روکیں۔'' (۴۱ : ۲۲)

''اصلاح کیسے ممکن ہے؟ ''قیامِ نماز'' کی اصطلاح اپنے اندر مفاہیم ومطالب کا ایک پورا جہان اور باقاعدہ نظام سموئے ہوئے ہے جس سے صَرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا۔ بعض لوگ نماز پڑھتے ہیں لیکن اُنہیں نمازی نہیں کہا جا سکتا کیونکہ وہ نماز کے حقوق کی رعایت نہیں کرتے۔ اسی لئے فرمانِ نبوی ہے کہ بعض لوگ ایسے ہیں جن کی نمازیں اُن

کے منہ پر ماردی جاتی ہیں۔ ویسے بھی کامیابی کی ضمانت وہی نماز فراہم کرتی ہے جو خشوع وخضوع کے ساتھ ادا کی جائے:

قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ O الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ O (اَلْمُؤْمِنُوْن : ۱، ۲)

''وہ مؤمن یقیناً فلاح پا گئے جو اپنی نمازوں میں خشوع وخضوع اختیار کرتے ہیں۔'' (۱، ۲ : ۲۳)

جب نماز اپنے ظاہری اور باطنی آداب کے ساتھ ادا نہ کی جائے بلکہ صرف فریضہ ٹالنے کی حد تک کام کیا جائے تو نماز پڑھنے والا دراصل نمازی نہیں بنے گا۔ ویسے بھی سب سے پہلے نماز کے بارے میں ہی سوال کیا جائے گا۔ جو ابتدائی ٹیسٹ میں فیل ہو جائے تو اُس کا آگے ٹیسٹ یا انٹرویو نہیں لیا جاتا۔ دوزخیوں سے جب جہنم میں پھینکے جانے کا سبب پوچھا جائے گا تو اُن کا جواب یہ ہوگا:

قَالُوْا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ O (المدثّر : ۴۳)

''وہ کہیں گے ہم نمازیوں میں سے نہیں تھے۔'' (۴۳ : ۷۴)

''مسجد سے شغف : رسولِ اکرم ﷺ کے مسجد سے شغف کا یہ عالم تھا کہ آپ ﷺ نے ازواج مطہرات کے حجرے بھی مسجد سے متصل بنوائے۔ جب سفر سے آپ کی واپسی ہوتی تو پہلے مسجد میں دو رکعت نماز ادا فرماتے، پھر گھر تشریف لاتے۔ جب کبھی بھی آندھی چلتی تو آپ ﷺ فوراً مسجد میں تشریف لے آتے اور ایک نماز پڑھ کر دوسری نماز کے انتظار کے لئے مسجد میں بیٹھے رہنے کی ترغیب دلاتے۔''

نبی اکرم ﷺ کا طرزِ عمل :(۱) سرورِ جہاں ﷺ درِ دولت میں جلوہ افروز ہیں۔ اہلِ خانہ کے ساتھ خوش طبعی کی باتیں ہو رہی ہیں۔ یکا یک اذان کی آواز بلند ہوتی ہے تو آقا علیہ الصلوٰۃ والسلام کا چہرہ انور متغیر ہونے لگتا ہے۔ آپ فوراً کھڑے ہو جاتے ہیں اور مسجد کی طرف چل دیتے ہیں۔ اُمّ المؤمنین سیدہ عائشہ صدیقہ فرماتی ہیں کہ جب اذان ہو جاتی تو ایسے لگتا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام ہمارے لئے اجنبی بن گئے ہیں۔ گویا اُنہیں کسی سے کوئی مطلب نہیں۔ ساری توجہ نماز کی تیاری کی طرف صَرف ہو جاتی اور سارے کام چھوڑ کر مسجد کی جانب چل دیتے۔

اصل میں نمازوں کے اوقات کا تعین اور درمیان میں وقت کا مناسب وقفہ محاسبہ نفس کے لئے بہت کار آمد ہے۔ کام کاج کو چھوڑ کر بار بار نماز کی طرف آنے سے تربیت مقصود ہے۔ مسجد میں حاضر نہ ہونے سے اور اپنی مرضی سے سہولت کے مطابق نماز پڑھنے سے نفس میں کئی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔

(۲) جنگ اپنے شباب پر ہے۔ ہر طرف تیروں کی برسات اور تلواروں کی چمک ہے۔ کشتوں کے پشتے لگ رہے ہیں لیکن اللہ کے رسول ﷺ ان نازک لمحات میں بھی نماز کے صفیں درست کرنے کا حکم فرماتے ہیں۔ ایک دستہ آپ کے ساتھ آدھی نماز پڑھ کر چلا جاتا ہے اور دوسرا آ کر اس میں شامل ہو کر نماز باجماعت ہی پڑھتا ہے۔ غزوہ خندق میں جب دشمنوں نے آپ کو نمازِ عصر پڑھنے کی مہلت نہ دی اور یوں یہ نماز قضا ہو گئی تو آپ کی زبانِ مبارک پر یہ الفاظ آ گئے:

''اُن لوگوں نے ہمیں صلاۃ وسطی (نمازِ عصر) نہ پڑھنے دی۔ اللہ تعالیٰ اُن کے گھروں اور اُن کی قبروں کو آگ سے بھر دے۔'' (صحیح بخاری وصحیح مسلم)

(۳) نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام شدید علیل ہیں۔ نقاہت کے باعث مسجد تک نہیں جا سکتے۔ فرمایا ابو بکر سے کہو کہ وہ نماز پڑھائے۔ ایک دن تھوڑا سا اِفاقہ ہوا۔ اذان سن کر آپ بے چین ہو گئے۔ حضرات عباس اور علی رضی اللہ عنہما سے فرمایا کہ مجھے مسجد میں لے چلو۔ اُن کے کندھوں پر سہارا لئے آپ ﷺ چلنے لگے۔ ٹانگوں میں چلنے کی سکت نہ تھی۔ آپ کے پاؤں زمین پر گھسٹ رہے تھے۔ اسی حالت میں مسجد میں پہنچے۔

ذرا سوچئے ہم نے وقت پر مسجد حاضر نہ ہونے کے کون کون سے عذر گھڑ رکھے ہیں۔ اللہ کے سامنے کون سا منہ لے کر حاضر ہوں گے!

(۴) نبی علیہ السلام نے نماز کو آنکھوں کی ٹھنڈک اور دل کا سکون قرار دیا۔ نماز کا وقت آنے پر آپ جناب بلال رضی اللہ عنہ کو فرماتے : ''اے بلال! اُٹھو اور نماز شروع کر کے میرے دل کو راحت پہنچاؤ۔''

(۵) جب آپ کے اہلِ خانہ سو جاتے تو آپ خاموشی کے ساتھ بستر سے اٹھتے اور عبادت میں مصروف ہو جاتے۔ اُمّ المومنین سیّدہ عائشہ صدّیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک رات میری آنکھ کھلی تو میں نے رسول اللہ ﷺ کو بستر پر نہ پایا۔ میں نے خیال کیا شاید آپ کسی اور بیوی کے حجرے میں تشریف لے گئے ہیں۔ اندھیرے میں اِدھر اُدھر ٹٹولا تو اچانک میرے ہاتھ آپ کے قدمین شریفین پر پڑے۔ آپ سجدے میں تھے اور دونوں پاؤں کھڑے تھے۔ اُس وقت آپ یہ دعا مانگ رہے تھے: ''اے اللہ! میں تیری رضا مندی کے واسطہ سے' تیری ناراضی سے اور تیرے عفو و درگزر کے واسطہ سے تیرے عذاب سے پناہ مانگتا ہوں اور تیری رحمت کے واسطہ سے تیرے غضب سے پناہ مانگتا ہوں۔ میں تیری تعریف کرنے سے عاجز ہوں۔ تو ایسی عظیم ذات ہے جس کی تو نے خود ہی ثنا بیان کی ہے۔'' سیّدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ یہ دیکھ کر مجھے اپنے گمان پر ندامت ہوئی اور دل میں کہا: سبحان اللہ! ہم کس گمان میں ہیں اور آپ ﷺ کس حال میں ہیں! (مشکوٰۃ المصابیح بحوالہ ماہنامہ ''پہچان'' لاہور' مئی ۲۰۰۵' صفحہ ۱۸)۔ خود اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی رات کی عبادت کا ذکر سورۃ المزمّل میں فرمایا ہے۔

(۶) ایک مرتبہ نبی معظم ﷺ نماز پڑھانے کے لئے مصلّی پر کھڑے ہوئے۔ نمازیوں کی جانب ایک نگاہ دوڑائی اور فرمایا کہ میرا جی چاہتا ہے کہ میں ابھی جاؤں اور جا کر اُن مسلمانوں کے گھروں کو آگ لگا دوں جو مسجد میں نماز ادا کرنے کے لئے نہیں آئے۔

اب اس سے بڑھ کر ناراضگی کا کوئی اور کیا اندازہ ہو سکتا ہے۔ اس کے بعد بھی اگر کسی کی سمجھ میں بات نہ آئے تو سوائے اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن پڑھنے کے اور کیا کیا جا سکتا ہے!

دن کے اوقات میں ختمی مرتبت ﷺ نفل نمازیں زیادہ نہیں پڑھتے تھے جس کے دو سبب تھے: ایک تو یہ کہ منصبِ رسالت اور سربراہِ مملکت کے فرائض کی ادائیگی میں آپ کا کافی وقت صَرف ہو جاتا تھا۔ ذرا اُن فرائض کا اندازہ کیجئے کہ آپ دعوت وتبلیغ اور ارشاد و ہدایت میں مشغول ہیں' ملک کے داخلی اور خارجی معاملات کو نمٹا رہے ہیں' مقدمات سن رہے ہیں' مجرموں اور خطا کاروں پر حد جاری فرما رہے ہیں' بادشاہوں اور حکمرانوں کو دعوتِ حق کے خطوط بھیج رہے ہیں اور باہر سے آنے والے وفود سے ملاقاتیں کر رہے ہیں اور اُن کی مہمانداری کر رہے ہیں' میدانِ جہاد میں فوجوں کی قیادت فرما رہے ہیں یا مجاہدین کی کسی جماعت کو اپنے کسی جاں نثار کی قیادت میں مناسب ہدایات دے کر کسی مہم (سریہ) پر روانہ فرما رہے ہیں' مریضوں کی عیادت کر رہے ہیں' اپنے وفات پا جانے والے صحابہ اور صحابیات کے جنازوں میں شریک ہو رہے ہیں اور اُن کے پسماندگان کے ساتھ تعزیت کر رہے ہیں' بازار میں یہ دیکھنے کے لئے گشت کر رہے ہیں کہ کوئی دکاندار ناپ تول میں کمی تو نہیں کر رہا' یا کوئی ناقص چیز اُس کا عیب ظاہر کئے بغیر تو نہیں بیچ رہا وغیرہ وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ اتنی مصروفیات سے فرض نمازوں کے علاوہ دوسری نمازوں (نوافل) کے لئے بہت کم وقت بچتا ہوگا۔

دوسرا سبب بہ ظاہر یہ تھا کہ اگر آپ دن کے اوقات کا بڑا حصّہ نوافل پڑھنے میں صَرف کرتے تو آپ کی محبت اور تقلید میں صحابہ کرام بھی ایسا ہی کرتے لیکن آپ نہیں چاہتے تھے کہ اُمت پر زیادہ بوجھ پڑ جائے یا اُن نوافل کا پڑھنا اُمت پر فرض کر دیا جائے۔

''ستون کے بغیر چھت: اُن لوگوں کی عقل پر ماتم کرنے کو جی چاہتا ہے جو بغیر کسی سہارے اور ستون کے عمارت پر چھت ڈالنا چاہتے ہیں۔ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے نماز کو دین کا ستون قرار دیا اور فرمایا: اَلصَّلٰوۃُ عِمَادُ الدِّیْن یعنی نماز دین کا ستون ہے۔

''ستون کے بغیر چھت کا تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا اور ستون کمزور ہوں تو بھی چھت زیادہ دیر قائم نہیں رہ سکتی۔ اگر پورے دین کو عمارت سے تشبیہ دی جائے تو اسلامی انقلاب کے ذریعے مصطفوی نظام کا قیام اسلام کی چھت ہے اور نماز ستون ہے۔ عمارت کے دیگر حصّوں میں ناقص میٹیریل لگا کر عمارت کی مضبوطی کا سوچنے والے خوابوں اور سرابوں کی دنیا میں رہتے ہیں۔ ایمان سے بنیادیں مضبوط کی جائیں' ذکر و اذکار کا پانی دیا جائے' دیگر عبادات کا مواد جمع کر کے اخوت و محبت کے سیمنٹ سے چنائی کی جائے' نمازوں کے ستون فراہم کئے جائیں اور اس کے اوپر انقلاب کے ذریعے مصطفوی نظام کی چھت ڈالی جائے تو دین کی ایک مضبوط اور پائیدار عمارت تعمیر ہوگی لیکن خیالی پلاؤ پکانے اور ہوائی قلعے تعمیر کرنے کے ہم عادی ہو چکے ہیں۔''

بزرگانِ دین فرمایا کرتے تھے کہ اگر اللہ کی نگاہ میں کسی شخص کی قدر و قیمت اور مرتبہ و مقام دیکھنا ہو تو اتنا دیکھ لینا کافی ہے کہ وہ نماز کے لئے کس اعلیٰ درجے کا اہتمام کرتا ہے اور ایسا کیوں نہ ہو کیونکہ حدیثِ پاک ہے: اَلصَّلٰوۃُ مِعْرَاجُ الْمُؤْمِن (نماز مومن کی معراج ہے)۔

''گویا حالتِ نماز میں نمازی اللہ کے انتہائی قرب اور حضور میں ہوتا ہے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی نماز میں محویت کا یہ عالم ہوتا کہ دنیا و مافیہا سے بےخبر ہو جاتے۔ نابینا صحابی اندھیروں میں چل کر پانچ وقت نماز با جماعت ادا کرنے مسجد میں آتے۔ خود نبی اکرم ﷺ پر حملے کا ہر وقت خدشہ رہتا' پہرے دئے جاتے۔ احتیاطی تدابیر اپنی جگہ لیکن نماز مسجد میں آکر پڑھتے بلکہ امامت بھی خود فرماتے۔''

''دُور جانے کی ضرورت نہیں۔ ہندوستان میں حضرت خواجہ بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ نے قبل از وصال وصیت فرمائی کہ میری نمازِ جنازہ پڑھانے والا چند خوبیوں کا حامل ہونا چاہئے۔ اُن میں سے دو کا تعلق نماز سے تھا کہ اُس نے کبھی تکبیرِ اُولیٰ ضائع نہ کی ہو اور زندگی بھر سنتِ غیر مؤکدہ بھی ترک نہ کی ہو۔ جنازہ رکھا ہے اور مطلوبہ خوبیوں کا حامل شخص نہیں مل رہا۔ آخر ایک نقاب پوش آگے بڑھ کر نمازِ جنازہ پڑھاتا ہے اور اس بات پر لرزاں اور ترساں ہے کہ اُس کی پرہیز گاری کا راز فاش ہو گیا ہے۔ جنازہ سے فارغ ہوئے تو لوگ زیارت کے لئے آگے بڑھے کہ یہ کون ہستی ہے جو ہم سے آج تک پوشیدہ رہی۔ جب نقاب ہٹایا گیا تو وہ ہندوستان کا فرمانروا سلطان شمس الدین التمش تھا۔ وہ مصروف ترین حکمران ہو کر بھی نماز کے لوازمات کے بارے میں اتنے محتاط تھے اور ہم فرائض کی پروا نہیں کرتے۔ اذان کا جواب دینے کے لئے تو تلاوتِ قرآن ترک کر دینے کا حکم ہے' کسی اور کام کا کیا جواز باقی رہ جاتا ہے!''

''جنبش اور عبادات : جس طرح مشین کو حرکت میں لانے کے لئے گیس' پٹرول اور بجلی کی قوت درکار ہوتی ہے اور حیوانی جسم کو متحرک کرنے کے لئے خوراک کی طاقت چاہئے' اسی طرح اخلاقی و مذہبی زندگی کا تحرک نظامِ عبادات کا تقاضا کرتا ہے۔ جس طرح حرکت اور قوت کے بغیر مشین رک جاتی ہے اور خوراک کی عدم دستیابی انسانی موت کا سبب بنتی ہے' بعینہٖ روحانی غذا کی عدم فراہمی سے روح کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ پھر انسان ایک چلتی پھرتی لاش بن جاتا ہے۔ وہ زندہ تو ہوتا ہے لیکن مُردوں سے بدتر ہوتا ہے۔ اس کے برعکس کسی اعلیٰ مقصد کے لئے دی ہوئی جان کی قربانی زندگی سے کہیں زیادہ قدر و قیمت کی حامل بن جاتی ہے۔''

''مراسمِ عبودیت (نماز' روزہ' حج' زکوٰۃ وغیرہ) کے پیچھے ''احساسِ تقویٰ'' رُوح کا کام کرتا ہے۔ محنت و مشقت اور جِدّ و جُہد کی رنگا رنگی اور عملی دَوڑ دھوپ اِسی روح کے دم قدم سے ہے۔ روح نکل جائے تو جسمانی حرکت بند ہو جاتی ہے۔ اب یہ سمجھنے میں کوئی دقت باقی نہیں رہتی کہ اعمال میں سستی اور لاپروائی کیوں برتی جاتی ہے۔ اصل میں احساسِ ایمان و تقویٰ کی قوّتِ متحرکہ (Driving Force) کمزور ہوتی ہے لہٰذا عمل کی حرکت کی رفتار سست ہو جاتی ہے۔ احساس زندہ ہو تو ایک نظامِ صلوٰۃ بھی انسان کو متحرک رکھنے کے لئے کافی ہے۔ دن میں پانچ مرتبہ مؤذن کے ذریعے بلایا جاتا ہے۔ انسان بار بار اپنی مصروفیات کو ترک کر کے اللہ کے دربار میں حاضر ہوتا ہے۔ اسی لئے فرمایا گیا: وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ" اِلَّا عَلَى الْخَاشِعِيْنَ (یہ نماز بہت مشکل اور بھاری ہے مگر اللہ سے ڈرنے والوں کے لئے نہیں)

''احساسِ بندگی روح کے لئے آکسیجن کا کام کرتا ہے۔ آکسیجن نہ ہو تو خوراک بھی جزوِ بدن بن کر رگوں

میں خون نہیں دوڑا سکتی۔ بعض مشینیں آٹومیٹک ہوتی ہیں لیکن ذرا غور کیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ان کے خود حرکت پذیر رہنے کا بھی ایک نظام ہوتا ہے جس کا چالو حالت (Working Order) میں رہنا ضروری ہے۔ وہ نظام درہم برہم ہو جائے تو مشین آٹومیٹک ہونے کے باوجود رک جائے گی اور مکینک کے پاس جانا پڑے گا مثلاً آٹومیٹک گھڑی کی حرکت کا تعلق بازو کی حرکت کے ساتھ ہوتا ہے۔ آپ گھڑی کلائی سے اتار کر ایک طرف رکھ دیں تو کچھ عرصہ کے بعد وہ رک جائے گی۔ اس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ متحرک سے متحرک کارکن بھی کچھ عرصہ مرکز سے رابطہ نہ رکھے تو اُس کا تحرّک جمود میں بدل جائے گا۔ یہ ایک قدرتی امر ہے جس سے کوئی اپنے آپ کو مستثنیٰ سمجھے تو نادانی کی بات ہوگی۔ رابطہ جس قدر مضبوط اور تیز تر ہوگا' اُسی قدر حرکت پذیری میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔ جلسے' جلوس' ریلیاں' اجلاس' سیمینار' میٹنگز اور اسی نوعیت کی دیگر سرگرمیوں میں شرکت کارکن کو متحرک رکھتی ہے ۔

جھپٹنا پلٹنا پلٹ کر جھپٹنا　　　لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ

''اے چارہ گر! کچھ اس کا علاج بھی چاہئے۔ غفلت' جمود اور پہلو تہی کے مرض کا اس کے سوا کچھ علاج نہیں کہ قوّتِ ارادی (Will Power) سے کام لیا جائے۔ تحریکی کام کسی شخص کی اوّلین ترجیح بن جائے اور وہ قوّتِ ارادی سے بھی کام لے تو کوئی وجہ نہیں کہ جمود نہ ٹوٹے بلکہ احساس گہرا ہو جائے تو راتوں کی نیند اور دن کا چین کھو جائے گا۔ وہ تو مارا مارا پھرے گا۔ کہے گا مجھے بتایا جائے کہ میں نے کیا کرنا ہے؟ کیا آپ نے دھوپ اور برفانی موسم میں مزدوروں کو کام کرتے نہیں دیکھا؟ ایک چوکیدار کا روزمرّہ کا معمول کیا ہے۔ کیا اُس کا دل نہیں چاہتا کہ وہ بھی نرم گرم بستر میں نیند کے مزے لے۔ فیکٹریاں' کارخانے اور ٹریفک ساری رات رواں دواں رہتے ہیں۔ اُن میں کام کرنے والے لوگ آخر کس طرح کام پر پہنچتے ہیں۔ سستی' غفلت اور لاپروائی کیوں اُن کے پاؤں کی زنجیر نہیں بنتی؟ اصل بات یہ ہے کہ وہ اپنی قوّتِ ارادی سے کام لے کر ان ساری رکاوٹوں کو عبور کر کے اپنے اپنے کام پر پہنچ جاتے ہیں کیونکہ روزگار اُن کی اوّلین ترجیح ہے۔ ضروریاتِ زندگی کی فراہمی کا تقاضا ایک زبردست محرّک ہے جو آدمی کو معاشی تگ و دو کے لئے متحرک رکھتا ہے۔ بس سمجھ لیجئے کہ نظامِ عبادات اور ذکر و اذکار کا سارا سلسلہ روحانی قوّت کے لئے ضروریات کا درجہ رکھتا ہے۔ یہاں بھی قوّتِ ارادی کو کام میں لا کر طبعی غفلت کو دُور کرنا ہوتا ہے۔ جب نیکیوں سے محبت اور برائیوں سے نفرت پیدا ہو جائے تو دینی اور روحانی زندگی میں ایک زبردست تحرّک پیدا ہوتا ہے۔ آدمی جوں جوں آگے بڑھتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ ع

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں

وہ رفتار میں اضافہ کرتا ہے لیکن ہر جہان کے بعد جہانوں کی ایک دنیا آباد دیکھ کر مزید برق رفتاری کی خواہش پیدا ہوتی ہے حتیٰ کہ نوری سال کی رفتار بھی اُس کی تسکین کا سامان نہیں بن سکتی۔ وہ هَلْ مِنْ مَّزِيْد کا نعرہ لگاتے ہوئے آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔''

''سیاروں کی تسخیر کے لئے جو تیز رفتار راکٹ بھیجے جاتے ہیں' اُن میں عام تیل استعمال نہیں ہوتا بلکہ انتہائی اعلیٰ اور مزکّی ایندھن استعمال کیا جاتا ہے۔ معلوم ہوا کہ تحرّک میں اضافہ کے لئے عملِ تزکیہ کو تیز کرنے کی ضرورت

ہے کیونکہ بلندیوں کو چھونے کا ارادہ رکھنے والے خالص، نفیس اور عمدہ قسم کا پٹرول استعمال کرتے ہیں۔ یہ امر بھی قابل توجہ ہے کہ خلانوردوں کا لباس بھی مخصوص ہوتا ہے۔ وہ اپنی وضع قطع سے ہی دوسروں سے الگ پہچانے جاتے ہیں۔''

''سردی ہو یا گرمی، کھلاڑیوں کو چاق و چوبند رکھنے کے لئے سخت ترین ریاضتوں کے عمل سے گزارا جاتا ہے۔ فوجی جوانوں سے رات دن مشقت کا کام لیا جاتا ہے، پریڈ کرائی جاتی ہے، اِدھر اُدھر دوڑایا اور بھگایا جاتا ہے۔ بظاہر یہ بے معنی کام لگتے ہیں لیکن اصل میں یہ بھی لہو گرم رکھنے کا ایک بہانہ ہے اور بڑے معرکے کے لئے تیاری کا عمل ہے۔''

''عبادات کی اُٹھک بیٹھک اور بھاگ دوڑ میں ایک بڑے دن (قیامت) کی تیاری کے مراحل ہیں۔ اُن سے روحانی تحرّک قائم رہتا ہے۔ انسان کی کہانی خاک کی کہانی نہیں۔ دمِ جستجو جب لہو گرم ہوتا ہے تو خاک کا یہ پُتلا عالمِ رنگ و بو کی تسخیر پر بھی قانع نہیں رہتا بلکہ اس سے بھی آگے کمندیں ڈالنے کے بارے میں سوچتا ہے۔ انسان نہ حیوان ہے، نہ مشین لیکن ہر انسان کے اندر ایک حیوان چھپا بیٹھا رہتا ہے اور حیوانی ضروریات کی تکمیل کے لئے انسان دن رات مشین کی طرح کام کرتا ہے۔ بعض لوگ اُن تھک محنت کرنے کے باعث مشین بن جانے پر بھی فخر کرتے ہیں حالانکہ انسان کی عظمت انسان بننے میں ہے، مشین بننے میں نہیں۔ بہر حال یہ بات ذہن میں رہنی چاہئے کہ فکرِ معاش کے ساتھ فکرِ معاد (آخرت) دامن گیر نہ ہو تو انسان اور حیوان میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔ جسم کے اعضاء و جوارح ہمارے منشاء اور مدّعا کی تکمیل کے لئے بطور آلات استعمال ہوتے ہیں لیکن آلے کے جائز اور ناجائز استعمال کی تمام تر ذمہ داری انسان پر عائد ہوتی ہے۔ آپ چُھری سے پھل کاٹ سکتے ہیں اور ناحق کسی کے گلے پر چلا سکتے ہیں تو کاٹنے کے ایک آلے سے پھل کاٹیں یا کسی کا گلہ، ذمہ دار آپ خود ہوں گے۔ یہی وہ اختیار ہے جس کے باعث ہم جوابدہ ہیں۔ لہٰذا تہذیبِ نفس کے لئے جہاں قوتِ ارادی سے کام لینا ضروری ہے، اُس سے کہیں بڑھ کر ایک پاکیزہ فضا درکار ہوتی ہے تاکہ مترتب ہونے والے اثرات زائل ہونے سے بچ جائیں۔ جس طرح صحت کی بہتری کے لئے اچھی خوراک کی فراہمی لازمی ہے، اسی طرح ساتھ ساتھ اُن باتوں سے بھی پرہیز ضروری ہے جو بیماری کا باعث بنتے ہیں۔ ایک کو پانے کے لئے دوسری سے بچ کر رہنا پڑتا ہے۔ راستہ اگرچہ دشوار ہے لیکن جوابدہی کا احساس بیدار ہو جائے تو کوئی مشکل باقی نہیں رہتی۔'' (ماہنامہ ''منہاج القرآن'' لاہور، اکتوبر ۲۰۰۷، ص ص ۲۷ تا ۲۹)

''عبادت کی ہیئتِ ترکیبی (شکل) اور روح: اسلام میں قائم کردہ ہر عبادت دو عناصر پر مشتمل ہے یعنی ظاہری شکل و صورت (ہیئتِ ترکیبی) اور اس کی روح۔ اوّل الذکر عبادت کی خارجی اور ظاہری شکل و صورت ہے جبکہ روح اُس کا داخلی پہلو ہے اور یہی داخلی اور اندرونی پہلو عبادات کا حتمی اور حقیقی مقصد ہے۔ مثلاً قیام، رکوع، سجود، جلسہ اور قعدہ نماز کی خارجی شکلیں ہیں لیکن نماز کی روحانی رفعت اور عمدگی اس صحیح اور حقیقی مقصد میں پنہاں ہے کہ نماز کے ذریعے اپنے خالق و مالک کا قرب حاصل کیا جائے۔ اگر کوئی نمازی یا عابد اُس عبادت یا نماز کے اصل مقصد سے غافل ہوتے ہوئے اُس کی ظاہری شکل و صورت میں گم رہتا ہے تو اُسے روح کے معدوم ہونے کے ناگزیر اور قدرتی نتیجے کی کھیتی کاٹنی ہوگی۔ قربِ الٰہی کے حصول کا ذریعہ قرآنِ حکیم کے نزدیک لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ یعنی تقویٰ ہے۔

افضال الرحمن اپنے ''انسائیکلو پیڈیا آف سیرۃ'' میں لکھتے ہیں :۔

''عبادت کی شکل و ہیئت اس لحاظ سے اہم ہے کیونکہ اسی کے مشاہدہ کے ذریعے دین کی روحِ حقیقی کا حصول ہوتا ہے لیکن اگر عبادت کی شکل و ہیئت میں روح مفقود ہو تو وہ مغز کے بغیر بادام کی طرح ہوگی جس کا بہ ظاہر کچھ بھی تو فائدہ نہیں ۔ اِن حالات میں زندگی کے عملی مسائل اور روئے زمین پر نظامِ عدل وانصاف' خیرو فلاح اور پاکیزگی کے استحکام کے حوالے سے محض شکل و ہیئت بے فائدہ اور غیر متعلق ہو جاتی ہے۔عبادت نظم وضبط کی بے مثال تنظیم ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کی راہ نمائی اور تربیت کے لئے مقرر کیا ہے۔ اگر اسے اس کے صحیح مفہوم میں دیکھا جائے تو یہ خالق اور اُس کے بندوں کے درمیان براہِ راست رابطے کی لائن (Hot Line) ہے جو اُنہیں کردار اور رویّے کی ایسی رفعتوں تک بلند کرتی ہے کہ کوئی دنیاوی اُکساہٹ یا ترغیب وتحریص خواہ وہ کتنی ہی شدید اور پُرکشش مال و دولت اور لذات کی حامل کیوں نہ ہو' اُنہیں نیکی' پارسائی اور عدل وانصاف کی راہ سے منحرف نہیں کرسکتی۔ اپنی نجی اور عوامی زندگی میں لوگوں کے ساتھ اُن کے برتاوے میں ایمانداری' عدل وانصاف اور نیکی کا اظہار ہوتا ہے جو صرف رضائے الٰہی کی خاطر ہوتا ہے۔'' (جلد ہفتم' صفحہ ۲۴)

<u>عبادت کی ظاہری شکل وصورت اور روح کی بابت قرآن وسنت کے حوالہ جات</u> : قرآن مجید کی مختلف آیات عبادت کی ظاہری شکل اور اس کی روح کے مابین تعلق پر روشنی ڈالتی ہیں جن میں سے چند کو ذیل میں بیان کیا جاتا ہے :

وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ فَأَيْنَمَا تُوَلُّوا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ إِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيمٌ O (البقرۃ : ۱۱۵)

''اور اللہ ہی کا ہے مشرق (بھی) اور مغرب (بھی)' سوتم جدھر کو بھی منہ پھیرو' اللہ ہی کی ذات ہے۔اللہ بڑی وسعت والا' بڑے علم والا ہے۔'' (۱۱۵ : ۲)

یہ آیت اللہ تعالیٰ کی ہمہ جہت نفوذ پذیری (All-pervasiveness) پر زور دے رہی ہے یعنی وہ کسی خاص سمت یا جہت میں نہیں ہے بلکہ وہ ہر جگہ اور ہر سمت میں مساوی طور پر موجود ہے۔ وہ تمام سمتوں اور جہتوں کو گھیرے ہوئے ہے اور اُن کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔قرآن حکیم یہاں جس بات پر زور دے رہا ہے وہ یہ ہے کہ عبادت کی جگہ یا سمت ایک ثانوی چیز ہے۔عبادت (نماز) کے دوران مشترک سمت مقرر کرنے کا مقصد ملّی وحدت کو قائم کرنا ہے تاکہ امام اور اس کے مقتدی ایک ہی طرف کو رخ کریں اور اپنی معروضات ومناجات اُس اللہ کے حضور پیش کریں جس کی قوّتِ مقتدرہ' مختار کاری (اتھارٹی) اور دائرہِ کار زمان ومکان دونوں لحاظ سے ہر شے کو محیط ہے۔علیم وخبیر ہونے کے ناطے سے اُسے بخوبی معلوم ہے کہ اُس کا کون سا بندہ کہاں' کب اور کس ارادہ کے ساتھ اُسے یاد کر رہا ہے اور اس طرح اُس کے اپنی مخلوقات کے ساتھ قریبی رابطہ ہے۔اس لئے قطب نما کی سوئی کے اشارے سے قطع نظر اپنے خالق و مالک کی عبادت میں منہمک رہو۔

سورۃ البقرۃ میں مندرجہ بالا اصول کو اس طرح بیان کیا گیا ہے:۔

سَيَقُوْلُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِيْ كَانُوْا عَلَيْهَا قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍO (البقرۃ: ۱۴۲)

''اب بیوقوف لوگ ضرور کہیں گے کہ کس چیز نے ان (مسلمانوں) کو اُن کے (اس) قبلہ سے جس پر وہ اب تک تھے' ہٹا دیا۔ آپ فرما دیجئے کہ مشرق و مغرب سب اللہ ہی کی مِلک ہیں۔ وہ جسے چاہے سیدھی راہ چلا دیتا ہے۔'' (۲ : ۱۴۲)

یعنی کسی خاص سمت و جہت میں کوئی تقدس نہیں رکھا ہوا۔ اُس کے لئے سب جہتیں برابر ہیں۔ وہ جدھر اور جس چیز کو بھی چاہے نماز کے لئے رُخ مقرر کر دے۔ یہ ضربِ کاری ہے مشرق پرستی' مغرب پرستی اور ہر قسم کی سمت پرستی پر جو مختلف مشرک جاہلی قوموں کا مذہب رہی ہے۔

یاد رہے کہ تحویلِ قبلہ (قبلہ تبدیل کرنے) کا یہ حکم سب سے زیادہ ناگوار یہودیوں کو ہوا۔ اب تک وہ یہ سمجھ کر خوش ہو رہے تھے کہ مسلمان کم از کم اُن کے ہم قبلہ تو ہیں۔ اب یہ مسرّت بھی اُن سے چھن گئی۔ کوتاہ نظر اور تنگ نظر ہوتے ہوئے کئی نادان لوگوں نے جو اس تحویلِ قبلہ کے صحیح مفہوم کی مصلحت کے سمجھنے سے عاری تھے' اس پر تنقید کرنا شروع کر دی یہ سمجھتے ہوئے کہ اللہ کسی ایک خاص سمت میں محدود ہے اور یہ کہ تحویلِ قبلہ کے اس حکم کا معنیٰ یہ ہے کہ اب رخ اُس طرف کو کر لیا جائے جہاں اللہ اپنی جگہ بدل کر پہنچ گیا ہے۔ اس بے بنیاد اعتراض کو یہ کہہ کر دُور کیا گیا کہ مشرق و مغرب اور دوسری تمام سمتیں اللہ ہی کی مِلک ہیں جو کسی ایک سمت و جہت میں محدود نہیں ہے۔

مادّی دولت اور دنیا کی جاذبیتوں سے محبت کے باعث یہودی دین کی اصل روح سے بیگانہ ہو چکے تھے اور رسوم و روایات کے غلام بن چکے تھے۔ اُن کی عبادت محض اس کی ظاہری شکل تک محدود تھی اور وہ دین کے مقصد یعنی اس کی روح کو مکمل طور پر بھول چکے تھے۔ لہٰذا یہاں قرآنِ حکیم یہود و نصاریٰ اور دوسری اقوام کو دین کی عملی اہمیت اور اصل روح کی یاد دہانی کراتا ہے کہ اس روح کا عبادت کی ظاہری شکل و صورت کے ساتھ کیا تعلق ہے اور اس بات پر زور دیتا ہے کہ اگر عبادت سے اُس کی روح مفقود ہو جائے تو انسان محض اس کی ظاہری ہیئت سے کچھ بھی حاصل نہیں کر سکتا۔''

''اگر عبادت کو صحیح طور سے اور اس کے مقصد کو سمجھتے ہوئے ادا کیا جائے تو تمام انسانی معاملات خالقِ حقیقی اللہ کے ساتھ اپنے روحانی تعلق کی عکاسی کرتے ہیں خواہ انسان عزت و اقتدار کے اعلیٰ مناصب پر کیوں نہ ہو اور وہ سونے چاندی کے خزانوں میں کیوں نہ کھیل رہا ہو۔ اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ یہ روحانی رفعت انسانوں کی اعلیٰ اخلاقیات اور اپنے ابنائے جنس کے ساتھ معاملات میں اعلیٰ کردار کی مظہر ہے۔ اگر مسلمانوں کی زندگی میں یہ اثرات معدوم و مفقود ہیں تو اُن کی عبادت میں کہیں نہ کہیں ضرور کوئی نقص ہے۔ یا تو وہ عبادت کو کماحقہ' ادا نہیں

کرتے یا یہ کہ وہ اس کی ظاہری ہیئت میں اس قدر محو ہیں کہ وہ اس کے مقصد کو کلی طور پر نظر انداز کئے ہوئے ہیں۔'' (انسائیکلو پیڈیا آف سیرۃ' جلد ہفتم' صفحہ ۲۴)

مندرجہ ذیل حدیثِ مبارکہ عبادت کی روح کی مکمل طور پر عکاسی کرتی ہے :

اَلاِحسَانُ اَنْ تَعبُدَاللّٰہَ کَاَنَّکَ تَرَاہُ وَاِنْ لَّمْ تَکُنْ تَرَاہُ فَاِنَّہٗ یَرَاکَ (صحیح بخاری)

''عبادات میں احسان (حسن پیدا کرنا) یہ ہے کہ تو اللہ کی عبادت یہ سمجھ کر کرے گویا کہ تو اُسے دیکھ رہا ہے اور اگر تجھ میں اُسے دیکھنے کی قابلیت نہیں تو (کم ازکم) یہ سمجھ کر اُس کی عبادت کرے کہ وہ تجھے دیکھ رہا ہے۔''

''اگر مسلمان آج عبادت کے عملی فائدوں کے حاصل کرنے کے قابل نہیں رہے' وہ لوگوں کے ساتھ معاملات میں عبادت کی اعلیٰ اخلاقیات کو نہیں سمو سکے اور وہ زندگی کے عملی معاملات میں سست و کاہل' غیر ذمہ دار اور نااہل ہیں تو اس میں قصور اُنہی کا ہے کیونکہ وہ عبادت کی روح سے عاری ہیں اور اس کی ظاہری شکل وصورت سے چمٹے ہوئے ہیں۔ اس لئے اُن کی پسماندگی میں کوئی تعجب کی بات نہیں اور اس بات میں بھی کوئی تعجب کی بات نہیں کہ اُن کی زندگی کے تمام ضوابط زوال پذیر اور بے لہر و ساکت ہیں۔ اُن کے لئے اللہ تعالیٰ نے عبادت کو مقرر اور فرض کیا تھا اوّل تو اس لئے کہ وہ اپنے مقتدرِ اعلیٰ سے وفادار رہیں اور دوم اس لئے کہ وہ اپنے خالق کے ساتھ قریبی تعلق قائم کریں جس سے مادّی جاذبیتوں اور تحریصات کے مقابل کافی مضبوط دفاع اُنہیں حاصل ہوگا اور وہ لوگوں کی فلاح و بہبود کی خاطر ایک اچھے' نیک اور انصاف پسند معاشرے کے قیام میں اپنی کوششوں کو جاری رکھیں گے۔''

''بہ الفاظِ دیگر اس ضابطے کا مقصد اُنہیں ایک خالص اور مبنی بر انصاف نظامِ حیات کے قائم کرنے جیسے مشکل کام کے لئے تیار کرنا تھا تاکہ عوام الناس امن و آشتی کی زندگی بسر کرسکیں اور بغیر کسی جبر و اِکراہ اور تشدد کے آزادانہ طور پر ہر اُس چیز کو بروئے کار لاسکیں جسے وہ صحیح اور حق سمجھیں۔ اسی لئے راستی اور نیکی کسی خاص اعتقاد کے ساتھ محدود نہیں ہے بلکہ اُس مقتدرِ اعلیٰ کے حضور اپنے مکمل سراپا کو کلی طور پر جھکا دینے سے حاصل کی جاسکتی ہے۔ سورۃ البقرہ اس بنیادی صداقت کی طرف یوں اشارہ کرتی ہے :

وَقَالُوْا لَنْ یَّدْخُلَ الْجَنَّۃَ اِلاَّ مَنْ کَانَ ھُوْدًا اَوْنَصَارٰی تِلْکَ اَمَانِیُّھُمْ قُلْ ھَاتُوْا بُرْھَانَکُمْ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَO بَلٰی مَنْ اَسْلَمَ وَجْھَہٗ لِلّٰہِ وَھُوَ مُحْسِنٌ'' فَلَہٗ اَجْرُہٗ عِنْدَ رَبِّہٖ وَلاَ خَوْفٌ'' عَلَیْھِمْ وَلاَ ھُمْ یَحْزَنُوْنَO (البقرۃ : ۱۱۱' ۱۱۲)

''اور وہ کہتے ہیں کہ جنت میں کوئی ہرگز داخل نہ ہوگا مگر ہاں وہی جو یہودی یا نصرانی ہوں' یہ اُن کی (نری) آرزوئیں ہیں۔ آپ کہہ دیجئے کہ اپنی سند لاؤ اگر تم سچے ہو۔ ہاں البتہ جو کوئی بھی اپنی ذات کو اللہ کے آگے جھکا دے اور وہ مخلص بھی ہو تو ایسے کے لئے اُس کے پروردگار کے پاس اس کا اجر ہے اور ایسوں پر نہ کوئی اندیشہ ہے اور نہ وہ مغموم ہوں گے۔'' (۱۱۱' ۱۱۲ : ۲)

''اس سے صاف ظاہر ہے کہ اگر لوگ عبادات کے مقصدِ حقیقی یعنی ''اپنے سراپا کو اللہ کے سپرد کر دینے'' سے صَرفِ نظر کر لیں تو تمام مناسکِ عبادت (طریق ہائے عبادت)' اعتقادات اور عبادت کی ظاہری شکلیں بے معنیٰ ہو کے رہ جاتی ہیں۔ جب تک ایک عابد اپنے تمام وجود' اپنی اَقدار' خواہشات' امنگوں' رسوم و رواج اور روایات کو مکمل طور پر کمال خلوص کے ساتھ الٰہی ضابطے کے تحت نہ کرے کہ اُس کے تمام مذہبی' اقتصادی' معاشرتی' ثقافتی اور سیاسی معاملات پر قانونِ الٰہی کی حکمرانی ہو جائے' اُس وقت تک وہ عبادت کے مطلوبہ مقصد کے حصول میں ناکام رہتا ہے۔ اس لئے لوگوں کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ عبادت کی ظاہری شکل قائم کرنے کے ساتھ ساتھ عبادت کے مقصدِ حقیقی یعنی اُس کی روح کے قیام کا بھی اہتمام کریں اور پھر کردار کی اُن اعلیٰ و ارفع خصوصیات کے حصول کی بھی کوشش کریں جو عبادت کی تمام قسموں کی حقیقی روح کی تشکیل کرتی ہیں۔ جس طرح روح کو اپنے وجود کے لئے شکل و ہیئت کی ضرورت ہوتی ہے' اسی طرح روح کے بغیر ظاہری شکل انسانی زندگی میں اپنی اہمیت کھو دیتی ہے۔ اس مفروضہ کی توثیق میں کہ ظاہری شکل و ہیئت اور روح دونوں ہی عبادت کے بنیادی اجزاء ہیں' ذیل میں کچھ احادیث ہدیہ ناظرین کی جاتی ہیں :-

(۱) ''کوئی حاکم جسے مسلمان رعایا پر با اختیار حکمران بنایا جائے' اگر اُن سے بے ایمانی اور بد دیانتی کا سلوک کرتے ہوئے مر جائے تو اُس کا جنت میں داخلہ ہرگز نہ ہوگا۔'' (صحیح بخاری' صحیح مسلم)

(۲) ''وہ شخص جسے اللہ تعالیٰ نے لوگوں پر با اختیار حاکم بنایا ہو اور وہ خیر خواہی کے ساتھ اُن کی حفاظت نہ کرے تو وہ جنت کی خوشبو تک نہ سونگھ سکے گا۔''

(۳) ''وہ لوگ جن کا عمل منصفانہ ہو' وہ بروزِ قیامت اللہ کے ساتھ نور کے منبروں پر اللہ کے دائیں طرف ہوں گے۔۔۔ یہ وہ لوگ ہوں گے جو اپنی رعایا اور ہر اُس چیز کے ساتھ منصفانہ سلوک کرتے ہیں جو اُن کے اختیار میں دی گئی ہے۔'' (صحیح مسلم)

(۴) ''حاکموں' سرداروں اور نگرانوں کے لئے ہلاکت ہے۔ روزِ محشر کو یہ لوگ آرزو کریں گے کہ اُن کی پیشانیوں کے بالوں کو بنات النعش ☆ کے ساتھ باندھ دیا جائے اور یہ کہ وہ آسمان و زمین کے درمیان جھول رہے ہوں اور یہ کہ کاش اُنہوں نے کبھی حکمرانی نہ کی ہوتی۔'' (شرح السنۃ؛ مسند احمد)

(۵) ''روزِ محشر انصاف پسند حکمران اللہ کو محبوب اور اس کے مقرب ہوں گے' اور روزِ محشر اللہ کے نزدیک ظالم و جابر حکمران قابلِ نفرت ہوں گے جنہیں سخت عذاب میں مبتلا کیا جائے گا۔'' (ترمذی)

یہ تمام احادیث اس بات کی توثیق کرتی ہیں کہ اللہ کی نظر میں حقوق العباد' حقوق اللہ اور عباداتِ الٰہی کی نسبت زیادہ باوزن ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عبادات کی ادائیگی اللہ تعالیٰ کے ساتھ زبانی اطاعت کا ذاتی معاملہ ہے اور اس میں حقوق العباد کی ادائیگی کا کوئی تعلق نہیں۔ جب تک اللہ تعالیٰ کی ذات میں زبانی ایمان کے ساتھ ساتھ اُس ایمان کا جزوِ لاینفک (یعنی حقوق العباد کی رعایت) شامل نہ ہو تو نہ تو اس زبانی اقرار کی اور نہ ہی مناسکِ عبادات کی ادائیگی کی اللہ کے نزدیک کوئی اہمیت یا حقیقت ہے۔''

☆ مجمع النجوم ثور میں واقع سات ستارے جنہیں سہیلیاں کہا جاتا ہے اور جو سات سہیلیوں کا جھمکا ہوتا ہے (آکسفورڈ انگلش اردو ڈکشنری۔۔ شان الحق حقی' صفحات ۱۲۶۳' ۱۲۶۴)

''اسی وجہ سے بہت سے حکمرانوں' فرمانرواؤں اور قاضیوں کو جو عباداتِ الٰہی کی ادائیگی میں بہت ہی باقاعدہ ہوں گے' صرف اس وجہ سے جہنم بُرد کر دیا جائے گا کہ اُنہوں نے لوگوں کے معاملات کو عدل وانصاف سے نہ نمٹایا ہوگا بلکہ ظلم وعُدوان سے اُن کے حقوق کو تلف کیا ہوگا۔ اس طرح یہ انصاف کے اور نیکی کے پابندی اور جارحیت کے کام ہی ہیں نہ کہ ایمان کا زبانی اقرار یا عبادات کی ادائیگی جن سے روزِ محشر کو انسان کی حتمی تقدیر (کامیابی یا ناکامی) کا فیصلہ ہوگا۔''

اس حقیقت کا اظہار سورۃ المُلک کی اس آیت میں کیا گیا ہے:

خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلاً (المُلک: ۲)

''اُس نے موت اور زندگی کو پیدا کیا تاکہ تمہیں آزمائے کہ تم میں عمل میں کون بہتر ہے۔''(۶۷:۲)

''موت عدمِ محض یا فقط سلبِ حیات کا نام نہیں جیسا کہ بعض جاہل فلاسفہ نے سمجھ رکھا ہے بلکہ وہ ایک مستقل وجودی مخلوق ہے۔ یہود کا ایک عقیدہ یہ بھی تھا کہ صرف حیات حق تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی ہے اور موت تو شیطان نے نافرمانی کر کے پیدا کر دی ہے۔ آیت سے اس اعتقاد کی تصحیح بھی مدِّنظر ہے۔ حیات کا عرصۂ عمل ہونا تو بالکل ظاہر ہی ہے۔ یہ مہلت اور موقع اگر حاصل نہ ہو تو انسان اچھا بُرا عمل کرے ہی کس وقت؟ اور موت حسنِ عمل کے لئے بمنزلہ شرط ہے۔ موت کے مشاہدہ سے دنیا کے فانی ہونے کا اور آخرت کے اعتقاد سے وہاں کے اجر کا اگر یقین نہ ہو تو انسان حسنِ عمل کے لئے کوشش ہی کیوں کرے!'' (تفسیر ماجدی اردو' صفحہ ۱۱۲۵' نوٹ: ۲)

''اس طرح اعتقادات اور عبادات کی اہمیت عملاً اُسی وقت قائم ہوتی ہے جب اُنہیں ٹھوس اعمال وافعال کی تائید حاصل ہو۔ قرآنِ حکیم اس نکتے کی مکمل طور پر تائید کرتا ہے کیونکہ قرآن نے اعمال صالحہ کے ذکر کے بغیر صرف ایمان کا ذکر کہیں بھی نہیں کیا بلکہ ایمان اور اعمالِ صالحہ کا ذکر ہمیشہ اکٹھا کیا ہے اور اعمالِ صالحہ کو ایمان کی تائید میں اور ایمان کو اعمالِ صالحہ کی تائید میں بیان کیا ہے۔ اس سے ہمارے اس موقف کو تقویت ملتی ہے کہ روح کے بغیر عبادت کی محض ظاہری شکل وہیئت کی کوئی حیثیت نہیں۔ عبادات کو اُن کے مقصدِ حقیقی کو سمجھتے ہوئے ادا کرنا چاہئے اور پھر عوامی معاملات میں اس کی توثیق ٹھوس اور مضبوط اعمال وافعال کے ذریعے کرنی چاہئے۔''

اپنے موقف کی تائید میں ہم کچھ مزید احادیث پیش کرتے ہیں جن میں نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا:

(۱) ''ایمان کے ساٹھ (یا ستّر) سے اوپر شعبے ہیں' اُن میں سے اعلیٰ تر اس بات کا اقرار ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبودِ برحق نہیں اور اُن میں سے ادنیٰ تر شعبہ یہ ہے کہ راستہ سے ہر اُس چیز کو ہٹا دیا جائے جو راہ گزروں کو تکلیف دے۔'' (صحیح بخاری' صحیح مسلم)

(۲) ''اے مسلم خواتین! اپنے ہمسائے کو معمولی چیز بھی تحفتاً بھیجنے میں عار محسوس نہ کیا کرو۔'' (ایضاً)

(۳) ''اپنے آپ کو نارِ جہنم سے بچاؤ اگرچہ وہ آدھی کھجور ہی بطور خیرات دینے کے ذریعے کیوں نہ ہو۔''

(۴) ''صدقہ وخیرات ہر مسلمان پر لازم ہے۔ اگر اس کے پاس خیرات میں دینے کو کچھ نہیں تو اُسے اپنے فائدہ کے لئے اپنے ہاتھوں سے کام کرنا چاہئے اور اپنی کمائی میں سے کچھ نہ کچھ خیرات میں دینا چاہئے۔ اگر وہ کام نہیں کر سکتا تو اُسے غریب ومحتاج اور مستحق کی مدد کرنی چاہئے۔ اگر وہ یہ بھی نہیں کر سکتا تو اُسے دوسروں کو نیکی کے کاموں کی ترغیب دینی چاہئے (تو یہ عمل بھی اُس کی طرف سے خیرات ہوگا)۔ اور اگر وہ یہ بھی نہیں کر سکتا تو اُسے اپنے آپ کو دوسروں سے برائی کرنے سے روکنا چاہئے تو یہ بھی اُس کی طرف سے خیرات ہوگی۔'' (ایضاً)

(۵) ''ایک مسلمان پودا لگاتا ہے یا کھیتی کاشت کرتا ہے اور پھر انسان یا جانور یا پرندے اس میں سے کچھ کھا جاتے ہیں تو یہ اُس کی طرف سے خیرات اور صدقہ ہوگا۔''

(۶) ''ایک راہ گزر کو سخت پیاس لگی۔ ایک کنویں پر پہنچ کر وہ اس کے نیچے اترا' خوب سیر ہو کر پانی پیا اور اُس سے باہر آنے پر اُس نے ایک کتے کو زبان باہر نکالے ہوئے اور اپنی پیاس کو بجھانے کے لئے مٹی کو چاٹنے کی کوشش کرتے دیکھا۔ آدمی کو خیال ہوا کہ کتے کو بھی اُسی طرح کی پیاس لگی ہے جیسے اُسے کچھ دیر پہلے لگی ہوئی تھی۔ سو وہ دوبارہ کنویں میں نیچے اترا' اپنی چرمی جرابوں کو پانی سے بھرا اور اُنہیں اپنے دانتوں سے پکڑتے ہوئے کنویں سے باہر آیا اور کتے کو پانی پلایا۔ اللہ تعالیٰ نے اُس کے اس عمل کی قدردانی کرتے ہوئے اُس کے گناہ معاف کر دئے۔ کسی صحابی نے نبی علیہ السلام سے دریافت کیا: کیا ہمیں جانوروں سے مہربانی سے پیش آنے کا بھی ثواب ملے گا؟ تو آپ نے جواب میں فرمایا کہ جانوروں سے مہربانی سے پیش آنے کا بھی ثواب ہے۔'' (صحیح بخاری' صحیح مسلم)

اسلام میں ''اعمالِ صالحہ'' ایک جامع اصطلاح ہے اور اللہ کی وحدانیت پر ایمان کی شرط کے ساتھ معاشرے کی فلاح و بہبود میں کئے گئے تمام انفرادی اور اجتماعی کاموں کو شامل ہے۔ توحید کے نظریہ کے بعد اسلامی معتقدات کا مرکزی نقطہ سماج کی فلاح و بہبود کے لئے مختلف اعمالِ صالحہ ہیں۔۔ قیامِ انصاف سے لے کر راستے سے کسی اذیت ناک چیز کے ہٹا دینے تک یا کسی پیاسے جانور اور پرندے کو پانی پلا دینے تک یا کسی سے خوشگوار اور خندہ جبینی کی بات کہنے تک' یہ تمام چھوٹے بڑے اعمال اچھائی اور خیر کے کام سمجھے جاتے ہیں اور اسلام میں صدقہ وخیرات کے ضمن میں آتے ہیں اور اس لئے اللہ کے نزدیک وہ بڑے باوزن ہیں اور یہی چھوٹے بڑے اعمال عبادت اور اسلامی معتقدات کی اصل روح ہیں۔''

''جب تک مسلمانوں نے عبادات کی ظاہری شکل اور اُس کی روح کو صحیح طور پر قائم رکھا' وہ دنیا پر غالب رہے اور اُن کے نظام ہائے حیات اور اقدارِ حیات کو اپنی عمدگی اور فوقیت کے باعث اقوامِ عالم نے بہ نظرِ عزت و تکریم دیکھا لیکن جونہی اُن کی عبادت سے روح مفقود ہوئی اور وہ صرف اس کی ظاہری شکل و ہیئت میں محدود ہو کر رہ گئے تو وہ اخروٹ کے اُس خالی خول کی طرح ہو گئے جس میں کوئی مغز نہ ہو۔''

''اگر موجودہ مسلم نسل قرآن وسنتِ نبوی کی اصل تعلیمات کی پیروی کئے بغیر اپنی تاریخ کی روایات و رسوم کی اندھی تقلید سے منسلک رہی تو وہ تاریخ کا ایک قصہ پارینہ بن کے رہ جائے گی اور اللہ اُن کی جگہ ایک نئی نسل اٹھائے گا جو قرآنِ حکیم سے وہی تحریک حاصل کرے گی اور سنتِ نبوی کی روشنی میں زندگی گزارے گی۔ کیونکہ یہ

قرآن ہی ہے جو انسانیت کے لئے ہمیشہ راہنمائی کا ذریعہ رہے گا جبکہ سنتِ نبوی قرآن حکیم کو عملی طور پر سمجھنے میں راہ نما روشنی کا کام دیتی رہے گی۔ تاریخی روایات اور رسوم زیادہ سے زیادہ نظیر کے طور پر کام دے سکتی ہیں لیکن وہ نہ تو تحریک وہبی (Inspiration) کا کام دے سکتی ہیں اور نہ ہی ہمارے دین کا حصّہ بن سکتی ہیں۔ یہ صرف وحیِ الٰہی ہی ہے جو انسانیت میں تحریکِ وہبی پیدا کرتی ہے اور اُن لوگوں کو نئے خیالات اور نئے تحرکات مہیا کرتی ہے جو اس سے راہ نمائی پانا چاہتے ہیں۔ تاریخی روایات و رسوم پر انحصار کرنا ہمارے نظامِ حیات میں صرف جمود ہی کا باعث ہوگا۔''

''مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی تفسیرِ قرآن میں بڑی خوبصورتی سے اسلام میں وحدت و یگانگت کے اصول کی وضاحت کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''قرآنِ حکیم بیان کرتا ہے کہ اللہ کی صداقت صرف ایک ہی ہے جو سب کے لئے ہے اور دراصل وہ ہر ایک معاشرے کو دی گئی۔ قرآن حکیم ہر ایک کو آفاقی اور مشترک صداقت کی طرف واپس لانا چاہتا ہے۔ یہ آفاقی اور مشترک صداقت کیا چیز ہے؟ یہ زندگی میں وہ کامیابی یا نجات ہے جو اللہ سے وابستگی اور نیک و صالح زندگی گزارنے سے حاصل ہوتی ہے۔ یہی زندگی کا وہ قانون ہے جسے اللہ تعالیٰ نے بطور مذہب کے ہمیں عطا کیا ہے اور یہی وہ مذہب ہے جسے قرآن نے ''الاسلام'' کہا ہے۔ قرآن اس بات پر زور دیتا ہے کہ نجاتِ اُخروی اور زندگی میں حقیقی کامیابی محض اللہ سے وابستگی اور صالح زندگی میں ہے نہ کہ کسی خاص ہیئت یا گروہ سے منسلک رہنے میں۔'' (''ترجمان القرآن'' بحوالہ انسائیکلوپیڈیا آف سیرۃ جلد ہفتم)

اس سلسلہ میں قرآن مجید نے نجاتِ اُخروی کا ایک معیار مقرر کیا ہے جسے اُس نے مختلف مقامات پر بیان کیا ہے مثلاً فرمایا گیا:

(۱) فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُم مِّنِّي هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ O (البقرۃ:۳۸)

''پھر اگر تمہیں میری طرف سے کوئی ہدایت پہنچے تو جو کوئی میری ہدایت کی پیروی کرے گا تو اُن کے لئے نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔'' (۳۸ : ۲)

(۲) بَلَىٰ مَنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهُ أَجْرُهُ عِنْدَ رَبِّهِ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ O (البقرۃ: ۱۱۲)

''ہاں البتہ جو کوئی بھی اپنی ذات کو اللہ کے آگے جھکا دے اور وہ مخلص بھی ہو تو ایسے کے لئے اُس کے پروردگار کے پاس اس کا اجر ہے اور ایسوں پر نہ کوئی اندیشہ ہے اور نہ وہ مغموم ہوں گے۔'' (۱۱۲: ۲)

(۳) مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثَىٰ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهُ حَيٰوةً طَيِّبَةً وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ أَجْرَهُمْ بِأَحْسَنِ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ O (النّحل: ۹۷)

''جو کوئی بھی نیک عمل کرے گا مرد ہو یا عورت بشرطیکہ صاحبِ ایمان ہو تو ہم اُسے ضرور ایک پاکیزہ زندگی عطا کریں گے اور ہم اُنہیں اُن کے اچھے کاموں کے عوض میں ضرور اجر دیں گے۔'' (۱۶:۹۷)

(۴) فَأَمَّا مَنْ طَغٰى O وَآثَرَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَاO فَإِنَّ الْجَحِيْمَ هِيَ الْمَأْوٰى O وَأَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى O فَإِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَأْوٰى O (النّازعٰت: ۳۷ تا ۴۱)

''تو جس کسی نے سرکشی کی ہوگی اور دُنیوی زندگی کو ترجیح دی ہوگی تو ایسے کا ٹھکانہ بس دوزخ ہی ہوگا اور جو کوئی اپنے پروردگار کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرا ہوگا اور نفس کو خواہش سے روکا ہوگا تو ایسے کا ٹھانہ جنت ہی ہے۔'' (۳۷ تا ۴۱ : ۷۹)

(۵) اِنَّ الَّذِيْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ أُولٰٓئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِO جَزَآءُ هُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا أَبَدًا رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ رَبَّهٗO (البيّنة : ۷، ۸)

''جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کیے تو یہی لوگ بہترین مخلوق ہیں۔ اُن کا صلہ اُن کے رب کے نزدیک ہمیشگی والی بہشتیں ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ اُن سے خوش رہے گا اور وہ اللہ سے خوش رہیں گے' یہ اُس کے لئے ہے جو اپنے پروردگار سے ڈرتا ہے۔'' (۷، ۸ : ۹۸)

انسان اگر آیت کے صرف اسی حصّہ پر غور کرے لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلاً تو اُس کی ہدایت پذیری کے لئے کافی ہے۔ اُس کے دل میں یہ احساس پختہ ہو جاتا ہے کہ یہ دنیا اُس کے لئے امتحان گاہ ہے اور یہ حیاتِ مستعار اُس کے لئے امتحان کی مدّت ہے اور امتحان وہ لے رہا ہے جو ظاہر و باطن' خفی وجلی' غیب وشہادت کا جاننے والا ہے۔ اگر یہ یقین حاصل ہو جائے تو پھر کیا مجال کہ انسان گناہوں سے اپنا دامنِ حیات ملوث کرے۔ حضور نبی کریم ﷺ نے اپنے صحابہ کرام کو اس حقیقت کی طرف بڑے دل نشیں انداز میں متوجہ فرمایا۔ آپ ﷺ نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو ان الفاظ سے نصیحت فرمائی:

خُذْ مِنْ صِحَّتِكَ لِسُقْمِكَ وَمِنْ شَبَابِكَ لِهَرَمِكَ وَمِنْ فَرَاغِكَ لِشُغْلِكَ وَمِنْ حَيَاتِكَ لِمَوْتِكَ فَإِنَّكَ لَاتَدْرِيْ مَااسْمُكَ غَدًا

''اپنی صحت کی حالت میں بیماری کے لئے' اپنی جوانی کی حالت میں بڑھاپے کے لئے' اپنے فارغ لمحات میں مصروفیت کے لئے اور جب تک زندگی کی شمع روشن ہے' موت کے لئے ذخیرہ جمع کرلو۔ کیونکہ تجھے نہیں معلوم کہ کل تیرا کیا نام ہوگا''

<u>چوبیس گھنٹے کے دورانیے میں کوئی لمحہ بھی تو ایسا نہیں جس میں پورے روئے زمین پر کہیں نہ کہیں نماز نہ پڑھی جاتی ہو:</u> ربّ قدیر نے اس خاکدانِ گیتی کو ایسا معجزاتی طور پر بیضوی بنایا ہے جس میں سورج اپنے اپنے وقت کے مطابق مختلف ملکوں پر طلوع وغروب ہوتا ہے۔ کسی مقام پر سورج طلوع ہو رہا ہے تو کسی دوسرے دُور دراز مقام پر وہ غروب ہو رہا ہوتا ہے۔ پاکستان میں اگر نمازِ عشاء کا وقت ہے تو ملکِ عرب میں وہ وقت نمازِ مغرب کا ہے۔ کسی جگہ نمازِ فجر کا وقت ہے تو کسی دوسری جگہ پر وہی وقت نمازِ عشاء کا ہے۔ کسی جگہ نمازِ ظہر ادا کی جا رہی ہے تو کہیں اور مقام پر وہ وقت نمازِ عصر یا مغرب کا ہے۔ نماز کے ان اختلافِ اوقات اور ملکوں کے طول بلد وعرض بلد کے مابین تفاوت میں احکم الحاکمین کا مقصدِ وحید یہی معلوم ہوتا ہے کہ شب وروز کا کوئی بھی لمحہ اُس کی عبادت سے خالی نہ جائے اور پورے عالم میں ہر آن اور ہر گھڑی اُس کے بندے اُس کے حضور جھکتے رہیں اور سجدہ ریز ہوتے رہیں۔ سُبْحَانَ اللّٰہ

(۷۶) ابلیس (IBLIS)

ابلیس کا اصل نام عزازیل ہے جو سجدۂ آدم (علیہ السلام) کے انکار سے پہلے معلم الملکوت یعنی فرشتوں کا استاد تھا۔ ابلیس کے جسمانی وجود کی توثیق متعدد قرآنی آیات سے ہوتی ہے۔ قرآن مجید نے اسے کئی مقامات پر شَیطان کا لقب بھی دیا ہے جو شَطَن" سے ہے بمعنی دُور رہونا (تفسیر نعیمی' جلد اوّل' صفحہ ۳۱۰)۔ سورۃُ الکہف کی آیت ۵۰ کے مطابق وہ جنات میں سے ہے اور اس میں یہودی اور نصرانی کے اس عقیدے کی بہ صراحت تردید ہے کہ ابلیس کا شمار فرشتوں میں تھا۔ ابلیس کے جنّی ہونے کے معنیٰ یہ ہیں کہ وہ ایک ناری مخلوق ہے۔ اس لئے سرکشی تو اس کے عنصرِ غالب کا عین تقاضا تھا لیکن اگر وہ اپنی قوّتِ ارادی اور اختیار سے صحیح کام لیتا تو اپنے اس مقتضائے طبعی کو بہ آسانی روک سکتا تھا' اس لئے اُسے معذور سمجھنا قطعًا غلط ہے۔ فرشتوں کی طرح (جو نوری مخلوق ہیں) جنات بھی غیر مرئی ہیں (یعنی نظر نہیں آتے) اور اُن کا تعلق مابعد الطبعیاتی دنیا سے ہے۔ انسانوں کی طرح اُنہیں بھی خیر اور شر کا راستہ آزادانہ طور پر اپنانے کا اختیار حاصل ہے۔

ابلیس اور شَیطان کے لفظی معانی: مجدالدین فیروز آبادی نے ابلیس کے مندرجہ ذیل معانی دئے ہیں:

مَنْ لَّا خَیْرَ عِنْدَہٗ' أَوْ عِنْدَہٗ' اِبْلَاس" وَ شَرٌّ" (القاموس المحیط' ج ۲' ص ۲۰۱)
"ابلیس وہ ہے جس کے ہاں کوئی خیر نہیں بلکہ وہ کمینگی اور بدی کا مجسمہ ہے۔"

عبدالماجد دریا بادی نے اس کا ترجمہ "ناامید" کیا ہے۔ کیونکہ رب تعالیٰ کی حکم عدولی کی وجہ سے وہ اُس کی رحمت سے ناامید ہو چکا ہے اس لئے یہ لقب پڑا اور جس کے نتیجے میں وہ راندۂ درگاہِ الٰہی ہوا۔

عبدالماجد دریا بادی نے ایڈورڈ ولیم لین کی عربی۔ انگریزی لغت کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ لفظِ شَیطان کا مصدر شَطَن" ہے بہ معنیٰ دُور ہونا۔ حق وصداقت اور رحمتِ الٰہی سے دُور ہونے کی وجہ سے اُسے یہ لقب دیا گیا۔

مجدالدین فیروز آبادی نے شَیطان کا یہ معنیٰ دیا ہے:

اَلشَّیْطٰنُ کُلُّ عَاتٍ مُّتَمَرِّدٍ مِّنْ اِنْسٍ اَوْ جِنٍّ اَوْ دَابَّۃٍ

"ہر سرکش' مغرور' خودسر اور باغی کو شیطان کہا جاتا ہے خواہ وہ انسانوں میں سے ہو' یا جنات میں سے یا حیوانات میں سے۔"

قرآنِ حکیم نے سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۵۶ اور سورۃ النساء کی آیات ۵۱' ۶۰' ۷۶ میں اُسے طاغوت اور سورۃ النساء کی آیت ۵۱ میں جِبْت کا لقب بھی دیا ہے۔

ابلیس کا آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے سے انکار: آدم علیہ السلام کو پیدا فرمانے کے اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ

نے فرشتوں کو حکم دیا کہ وہ آدم علیہ السلام کو بطورِ علامتِ اعزاز وتکریم سجدہ کریں۔ تمام فرشتوں نے تعمیلِ ارشاد کی لیکن ابلیس نے سجدہ کرنے سے انکار کر دیا۔ انانیت کی مستی میں اُس نے ترکی بہ ترکی یہ جواب دیا :

أَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهُ مِنْ طِيْنٍ (ص : ۷۶).

"میں اس سے بہتر ہوں، تو نے مجھے آگ سے بنایا اور اسے تو نے مٹی سے بنایا۔" (۷۶ : ۳۸)

وہ اللہ کی رحمت سے دُور ہو گیا اور عالمِ روحانی میں اس طرح ہو گیا جس طرح سیاسی شہنشاہیت میں قانون کی گرفت سے بھاگا ہوا مفرور (Outlaw) ہوتا ہے۔

شیطان کی منطق ملاحظہ ہو۔ کہنے لگا کہ چونکہ آگ اوپر کو جاتی ہے ور مٹی نیچے کو جاتی ہے اور اوپر کی سمت نیچے کی سمت سے برتر اور افضل ہوتی ہے اس لئے میں آدم سے افضل اور فائق ہوں۔ اس بد بخت نے یہ نہ دیکھا کہ حکم کس کی طرف سے ہے بلکہ یہ دیکھا کہ حکم ہے کیا؟ ابلیس کے اس تمردانہ اور خود بینی کے رویّہ نے غضبِ الٰہی کو للکارا اور رب نے کہا: فَاخْرُجْ مِنْهَا فَإِنَّكَ رَجِيْمٌ O وَإِنَّ عَلَيْكَ لَعْنَتِيْ إِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ O (ص : ۷۷، ۷۸)

"تو یہاں سے نکل جا بے شک تو مردود ہو گیا اور بے شک تجھ پر تا قیامت میری لعنت رہے گی۔" (۷۷، ۷۸: ۳۸)

سجدہ آدم کی اصل حقیقت : سجدۂ آدم علیہ السلام کے متعلق مختلف اقوال ہیں۔ بعض نے کہا کہ یہ سجدہ اللہ کو تھا اور آدم علیہ السلام کعبہ کی مثل تھے۔ جیسے ہم کعبہ کے سامنے جھک کر سجدہ اللہ کو کرتے ہیں، ایسے ہی فرشتوں نے آدم علیہ السلام کے سامنے جھک کر اللہ کو سجدہ کیا۔ لیکن یہ قول ضعیف ہے اور فخر الدین رازی نے تفسیر کبیر میں اس کی سخت تردید کی ہے، اس لئے کہ اگر آدم علیہ السلام محض قبلہ ہوتے تو اِلٰی آدَمَ فرمایا جاتا نہ کہ لِآدَمَ۔ نیز اگر آدم علیہ السلام فقط قبلہ ہوتے تو اس سے آپ کی افضلیت اور برتری ثابت نہ ہوتی۔ حضور علیہ السلام کعبے کی طرف سجدہ کرتے تھے حالانکہ آپ کعبہ سے افضل تھے (تفسیر کبیر)۔ نیز اگر آدم علیہ السلام فقط کعبہ ہوتے تو ابلیس انکار نہ کرتا کیونکہ اُس نے اب تک بیت المعمور (جو کعبہ کے بالکل مقابل آسمان میں فرشتوں کی عبادت گاہ ہے) رب کے لئے لاکھوں سجدے کئے تھے۔ وہ یہ سمجھتا کہ میرے پہلے سجدے بھی رب کے لئے تھے اور یہ بھی اُسی کے لئے ہوگا۔ اُس کے انکار سے معلوم ہو رہا ہے کہ یہ سجدہ آدم علیہ السلام کو ہی تھا۔

قولِ صحیح اور محقَّق یہی ہے کہ یہ سجدہ تعظیمی تھا اور آدم علیہ السلام ہی کے لئے تھا۔ پہلی شریعتوں میں جائز تھا۔ ہمارے اسلام میں منسوخ ہو گیا۔ اب اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو کسی قسم کا سجدہ کرنا جائز نہیں خواہ وہ سجدہ تعبّدی ہو یا تعظیمی۔ یہی قول صحیح ہے اور اسی کی قرآنی آیات اور احادیثِ صحیحہ سے تائید ہوتی ہے۔

ابلیس کو الٰہی مہلت : ابلیس کی درخواست پر رب تعالیٰ نے اُسے خاص وقت تک کے لئے مہلت دے دی:

قَالَ فَأَنْظِرْنِيْ إِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ O قَالَ فَإِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ O إِلٰى يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ (ص)

"وہ بولا: اے میرے پروردگار! تو مجھے لوگوں کے جی اٹھنے کے دن تک مہلت دے۔ ارشاد ہوا جا تجھے مہلت

روزِ موعود تک مہلت دی جاتی ہے۔'' (۷۹ تا ۸۱ : ۳۸)

احادیثِ صحیحہ کے مطابق شیطان بھیس بدل کر آدم علیہ السلام اور اُن کی اہلیہ محترمہ جنابہ حوا علیہا السلام کے پاس گیا اور اُنہیں اپنی سچی دوستی اور وفاداری کا یقین دلاتے ہوئے شجرِ خُلد تک جانے کی راہ بتائی (سورۃ الاعراف: ۲۰) جس کا پھل کھانے سے وہ اپنی انتہائی دل پسند چیز یعنی اللہ کی حضوری میں ہمیشہ رہیں گے۔ اُس نے اُن دونوں سے اللہ کی قسم کھا کر کہا کہ وہ اُن کا انتہائی خیر خواہ مشیر ہے (سورۃ الاعراف: ۲۱)۔ اِس طرح اُس کی باتوں میں آکر وہ ثمرِ ممنوعہ کھا بیٹھے۔ اس فعل میں آدم علیہ السلام کی دیدہ ودانستہ اور ارادی نافرمانی نہیں تھی جیسا کہ سورہ طٰہٰ میں قرآن مجید نے اُن کی برأت کو بیان کیا ہے:

وَلَقَدْ عَهِدْنَا إِلَىٰ آدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهُ عَزْمًا O (طٰہٰ : ۱۱۵)

''اور (بہت زمانہ) قبل ہم آدم کو ایک حکم دے چکے تھے' سو اُن سے غفلت ہوئی اور ہم نے اُن میں (ارتکابِ فعل کا) ارادہ نہیں پایا۔'' (۲۰:۱۱۵) [دیکھئے قرآنِ مبین کس طرح عصمتِ انبیاء کی حفاظت کرتا ہے!]

شیطان انسان کا مسلّمہ اور اقبالی دشمن ہے: شیطان کو جناتِ عدن سے آدم علیہ السلام کی وجہ سے نکالا گیا لہٰذا وہ حضرتِ انسان کا پکا دشمن ہوگیا۔ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے انسان کو شیطان کے خفیہ مکر وفریب سے پہلے ہی متنبہ کرتے ہوئے سورہ فاطِر کی آیت ششم میں فرمادیا:

إِنَّ الشَّيْطَٰنَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوهُ عَدُوًّا إِنَّمَا يَدْعُوا حِزْبَهُ لِيَكُونُوا مِنْ أَصْحَٰبِ السَّعِيرِ O

''بے شک شیطان تمہارا دشمن ہے سو تم اُسے دشمن (ہی) سمجھتے رہو' وہ تو اپنے گروہ کو محض اس لئے بلاتا ہے کہ وہ لوگ دوزخیوں میں سے ہوجائیں۔'' (۶ : ۳۵)

یعنی اس سے برتاؤ بھی ایسا ہی رکھو جیسا دشمن سے رکھا جاتا ہے' قدم قدم پر اس کی مخالفت کرو اور اُس کی اصل مخالفت یہی ہے کہ اطاعتِ الٰہی کی راہ اختیار کرو۔ یہاں سوال یہ ہے کہ اگر شیطان واقعی ایک خارجی ہستی اور انسان کی اتنی دشمن نہیں تو آخر قرآن مجید اس کثرت اور شدّ ومد سے اُس کا اور اُس کی خباثتوں کا ذکر کیوں کرتا ہے؟

اللہ جلّ جلالہٗ شیطان کی چالوں کو ہمیشہ ناکام بنا دیتا ہے: ظاہر ہے کہ ابلیس قادرِ مطلق اللہ کی تخلیق ہے اور مخلوق ہونے کے ناطے سے شیطان کی بے بضاعتی اور کمزوری اللہ کی قدرتِ مطلقہ کے مقابلے میں کچھ بھی تو نہیں ہے۔ اس حقیقت کو قرآن مجید کی ان آیات میں بیان کیا گیا ہے:۔

(۱) ثُمَّ نُنَجِّي رُسُلَنَا وَالَّذِينَ آمَنُوا كَذَٰلِكَ حَقًّا عَلَيْنَا نُنْجِ الْمُؤْمِنِينَ O (یونس : ۱۰۳)

''پھر ہم اپنے پیمبروں کو اور اُن لوگوں کو جو ایمان والے تھے بچا لیتے تھے' اس طرح ہم (سب) مؤمنوں کو نجات دیا کرتے ہیں' یہ ہمارا ذمّہ ہے۔'' (۱۰۳ : ۱۰)

(۲) وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَسُولٍ وَلَا نَبِيٍّ إِلَّا إِذَا تَمَنَّىٰ أَلْقَى الشَّيْطَٰنُ فِي أُمْنِيَّتِهِ فَيَنْسَخُ اللَّهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطَٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللَّهُ آيَاتِهِ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ O لِيَجْعَلَ مَا يُلْقِي

الشَّیْطٰنُ فِتْنَةً لِّلَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْقَاسِیَةِ قُلُوْبُهُمْ وَاِنَّ الظّٰلِمِیْنَ لَفِیْ شِقَاقٍ بَعِیْدٍO(الحج : ۵۲، ۵۳)

''اور ہم نے آپ سے قبل کوئی رسول اور کوئی نبی ایسا نہیں بھیجا مگر یہ کہ جب اُس نے کچھ پڑھا ہو تو شیطان نے اُس کے پڑھنے کے باب میں شبہ ڈالا' سو اللہ شیطان کے ڈالے ہوئے شبہ کو مٹا دیتا ہے پھر اللہ اپنی آیات کو (اور زیادہ) پختہ کر دیتا ہے اور اللہ خوب علم والا' خوب حکمت والا ہے۔ (اور یہ سب اس لئے ہوتا ہے) تا کہ اللہ شیطان کے ڈالے ہوئے (شبہات) کو اُن لوگوں کے لئے آزمائش بنا دے جن کے دلوں میں روگ ہے اور جن کے دل سخت ہیں' بے شک ظالم لوگ بڑی دُور کی مخالفت میں پڑے ہوئے ہیں۔'' (۲۲:۵۳'۵۲)

تَمَنّٰی کے معنی جس طرح تمنا کرنے کے ہیں' پڑھنے کے بھی ہیں (تفسیر ابن جریر و معالم التنزیل)۔ رسول وہ نبی ہوتا ہے جو شریعت کے ساتھ بہ غرض تبلیغ احکام بھیجا جاتا ہے۔ نزولِ وحی نبی اور رسول دونوں میں مشترک ہوتا ہے۔ شیطان سے یہاں مراد شیطان کی جنس مراد لی گئی ہے جو سارے شیاطینِ جن و انس کو شامل ہے (جصّاص)۔

پیر کرم شاہ الازہری ''ضیاء القرآن'' کی جلد سوم کے صفحات ۲۲۳۔۲۲۸ پر لکھتے ہیں :

''پہلے شیاطینِ جن و انس نے جو سلوک اپنے ہادیوں کے ساتھ کیا تھا' بعینہٖ وہی رویّہ مشرکینِ مکہ نے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ اختیار کیا۔ جب آیت اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَیْکُمُ الْمَیْتَةَ (اُس نے مُردار کو تم پر حرام کر دیا) نازل ہوئی تو مشرکین نے اس پر یہ اعتراض جڑ دیا کہ دیکھو جی جسے خود مارتے ہیں' اُسے تو حلال اور پاک کہہ رہے ہیں اور جسے اللہ نے مارا' اُن کے نزدیک حرام اور پلید ہے۔ جب سود کی حرمت کا حکم نازل ہوا تو اُن کی زبانیں قینچی کی طرح چلنے لگیں کہ ذرا انصاف سے تو دیکھو کہ بیع تو اِن کے لئے حلال ہے اور سود حرام ہے۔ حالانکہ دونوں میں نفع ہے۔ یہ کہاں کی عقلمندی ہے کہ دو ایک جیسی چیزوں میں سے ایک کو حرام اور دوسری کو حلال کر دیا جائے۔ اسی قسم کے متعدّد واقعات ہیں جن کے متعلق شیطان اُنہیں بھڑکاتا اور وہ اسلام کے خلاف بڑے جوش و خروش سے پراپیگنڈا کی ایک نئی مہم کھڑی کر دیتے لیکن اللہ تعالیٰ اپنی حکمتِ کاملہ اور دلائلِ قاہرہ سے باطل کا پول کھول دیتا اور حق کی روشنی پھر ہر طرف پھیل جاتی۔ آیت کا مفہوم اتنا واضح اور دوسری آیات کے عین مطابق ہے کہ کسی قسم کا تذبذب باقی نہیں رہتا لیکن بعض کتابوں میں ایک روایت کے درج ہو جانے سے اس آیت کا مطلب کچھ سے کچھ کر دیا گیا جس سے صرف اپنوں کے دلوں میں اضطراب کی لہر پیدا نہیں ہوئی بلکہ دشمنانِ اسلام کو قرآن' صاحبِ قرآن ﷺ اور دینِ اسلام کی صداقت پر حملہ کرنے کے لئے ایک مہلک ہتھیار مل گیا۔ چاہئے تو یہ تھا کہ آیت کی اس واضح اور صاف تشریح پر ہی یہ فقیر اکتفا کرتا اور اس روایت کی طرف التفات کئے بغیر آگے بڑھ جاتا لیکن کیونکہ یہ روایت ہماری کتابوں میں راہ پا گئی ہے اور دشمنانِ اسلام نے اس سے فائدہ اٹھا کر اسلام کے خلاف طوفان برپا کر رکھا ہے' اب اس سے تعرّض نہ کرنا ادائے فرض میں کوتاہی کے مترادف ہے۔ اس لئے بادلِ نخواستہ وہ روایت نقل کر رہا ہوں۔ اس کے بعد علمائے محققین نے جس طرح اس کے پرخچے اڑائے ہیں' اُن کا بالاجمال ذکر کروں گا تا کہ کسی طالبِ حق کے لئے تردّد کا کوئی امکان باقی نہ رہے۔''

''کہا یہ گیا ہے کہ اس آیت کی شانِ نزول یہ ہے کہ ایک روز حرم شریف میں کفار و مشرکین کے ایک اجتماع میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے سورہ نجم کی تلاوت فرمائی۔ جب یہاں پہنچے: أَفَرَأَيْتُمُ اللَّاتَ وَالْعُزَّىٰ O وَمَنَاةَ الثَّالِثَةَ الْأُخْرَىٰ O (''بھلا تم نے لات اور عزّٰی اور تیسرے منات کے حال میں بھی غور کیا ہے؟'') تو شیطان نے (العیاذ باللہ) زبان پر یہ الفاظ جاری کر دیئے: تِلْكَ الْغَرَانِيقُ الْعُلَى وَإِنَّ شَفَاعَتَهُنَّ لَتُرْتَجَى (''یہ بت مرغانِ بلند پرواز ہیں اور اُن کی شفاعت کی امید کی جاسکتی ہے'')۔ یہ سن کر مشرکینِ مکہ کی خوشی کی حد نہ رہی اور حضور علیہ السلام کا اسمِ گرامی لے کر کہنے لگے کہ وہ اپنے پرانے دین کی طرف لوٹ آیا ہے' آج اُس کی اور ہماری عداوت ختم ہوگئی اور جب ختمی مرتبت آقا علیہ السلام نے سورہ نجم کی سجدہ والی آیات پڑھیں تو آپ ﷺ نے بھی سجدہ کیا اور مشرکین نے بھی سجدہ کیا۔ اس کے بعد جبریلِ امین آئے اور آپ کو کہا کہ میں نے آپ کو یہ سورت اس طرح وحی نہیں کی تھی جس طرح آپ نے پڑھی۔ یہ سن کر آپ ﷺ کو از حد رنج ہوا۔ اس رنج و غم کو دُور کرنے کے لئے یہ آیت نازل ہوئی کہ آپ غم نہ کریں۔ پہلے بھی جتنے رسول اور نبی گزرے ہیں' سب کے ساتھ ایسا ہوتا رہا ہے۔''

''ایک معمولی سمجھ بوجھ کا انسان جسے حضور نبی اکرم ﷺ کے مقام کا کچھ بھی علم ہے' وہ تو اس روایت کو سنتے ہی کہہ دے گا کہ یہ جھوٹ کا پلندا ہے اور دشمنانِ اسلام کی سازش ہے لیکن آیئے علمائے محققین کے ارشادات کی روشنی میں اس کا جائزہ لیں۔ سب سے پہلے میں علاّمہ ابنِ حیّان کے جواب کا خلاصہ پیش کرتا ہوں کیونکہ وہ جامع ہونے کے ساتھ مختصر بھی ہے۔ ابتدا میں اُنہوں نے اس آیت کا وہی مطلب بیان کیا ہے جو میں اوپر لکھ آیا ہوں۔ اس کے بعد وہ فرماتے ہیں کہ اس آیت میں کوئی ایسی چیز مذکور نہیں جو رحمتِ عالمیان ﷺ کی طرف منسوب کی جاسکے بلکہ اس میں صرف پہلے رسولوں اور نبیوں کا ذکر ہے۔ اس لئے اس آیت سے یہ اخذ کرنا کہ حضور علیہ السلام سے کوئی فعل سرزد ہوا اور اس کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی' سرے ہی سے غلط ہے۔ ابن عطیہ زمخشری اور چند دوسرے لوگوں نے اپنی تفسیروں میں جو روایت یہاں نقل کی ہے' یہ بات تو ایک معمولی مسلمان سے بھی سرزد نہیں ہوسکتی' چہ جائیکہ اُسے اُس ذات کی طرف منسوب کیا جائے جو ہر قسم کی غلطی اور خطا سے معصوم ہے۔ نیز اس روایت کے متعلق سیرت کے معتبر ترین سوانح نگار امام محمد بن اسحاق رحمہ اللہ تعالیٰ سے جب پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: هٰذَا مِنْ وَضْعِ الزَّنَادِقَة کہ یہ روایت زندیقوں کی گھڑی ہوئی ہے اور اس کے ردّ میں اُنہوں نے پوری ایک کتاب تصنیف فرمائی۔ امام بیہقی کہتے ہیں: هٰذِهِ الْقِصَّةُ غَيْرُ ثَابِتَةٍ مِنْ جِهَةِ النَّقْلِ کہ یہ قصہ صحیح نقل سے ثابت ہی نہیں ہے اور جن راویوں نے اسے نقل کیا ہے' سب مطعون ہیں۔ صحاح ستّہ اور حدیث کی دیگر مشہور کتابوں میں اس کا نام و نشان تک نہیں فَوَجَبَ اِطْرَاحُه' (یعنی اُسے ردّی چیز کی طرح پھینک دینا ضروری ہے)۔ ابنِ حیّان فرماتے ہیں کہ اسی لئے میں نے اپنی تفسیر کو اس کے بیان سے آلودہ نہیں کیا اور مجھے اُن لوگوں پر حیرت ہے کہ اُنہوں نے اپنی تالیفات میں اس واقعہ کو لکھنے کی کیسے جسارت کی حالانکہ قرآن کریم کی ان آیات کی وہ تلاوت کرتے ہیں۔''

زیرِ نظر روایت کے ردّ میں فرموداتِ الٰہی: (۱) مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوَىٰ O وَمَا يَنْطِقُ

عَنِ الْهَوٰی O اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی O (سورۃ النجم : ۲۔۴) یعنی ''میرا محبوب نہ گمراہ ہوا اور نہ بھٹکا۔ وہ تو اپنی خواہش نفسانی سے بات ہی نہیں کرتا اور وہ وہی بات کہتا ہے جو اُس کی طرف وحی کی جاتی ہے۔''

(۲) قَالَ الَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ لِقَآءَ نَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَیْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ قُلْ مَا یَكُوْنُ لِیْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآءِ نَفْسِیْ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰٓی اِلَیَّ اِنِّیْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ O (یونس:۱۵) ''جن لوگوں کو ہمارے پاس آنے کا کوئی کھٹکا نہیں ہے' کہنے لگتے ہیں کہ اس کے سوا کوئی اور قرآن لاؤ یا اسی میں ترمیم کردو۔ آپ کہہ دیجئے میں اپنے جی سے ترمیم نہیں کر سکتا' میں تو بس اُسی کی پیروی کرتا ہوں جو میرے پاس وحی سے پہنچتا ہے۔ اگر میں اپنے پالنہار کی نافرمانی کروں تو میں یومِ عظیم کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔'' (۱۰:۱۵)

(۳) وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَیْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِیْلِ O لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْیَمِیْنِ O ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِیْنَ O فَمَا مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ عَنْهُ حٰجِزِیْنَ O (الحآقّۃ : ۴۴ تا ۴۷) یعنی ''اگر (یہ پیغمبر) ہم پر ایک بات بھی اپنی طرف سے بنا کر کہتے تو ہم ضرور اُن سے بہ قوت بدلہ لے لیتے' پھر اُن کی رگِ دل کاٹ دیتے (یعنی ہلاک کر ڈالتے) پھر تم میں سے کوئی اُن کو اس (سزا) سے بچانے والا نہ ہوتا۔'' (۴۴ تا ۴۷ : ۶۹) تو قدرتی طور پر سوال یہ پیدا ہوا کہ کیا رب تعالیٰ نے پیغمبر سے بہ قوت یا بلا قوت کوئی بدلہ لیا یا اُنہیں ہلاک کیا؟ نہیں اور ہرگز نہیں۔ بلکہ اُس کے جُود و کرم کی برکھا تو اب تک اپنے محبوب علیہ السلام پر برابر برس رہی ہے۔ تو ان حقائق نے ثابت کر دیا کہ پیغمبر علیہ السلام نے کبھی بھی وحیِ الٰہی میں اپنی طرف سے آمیزش یا ترمیم ہرگز نہیں کی۔

ان روشن آیات کی موجودگی میں یہ کیسے تصور کیا جا سکتا ہے کہ اسی سورۃ میں ایسے قبیح کلمات زبانِ پاک سے نکلے ہوں! پھر علامہ لکھتے ہیں کہ یہ وہ قرآنی نصوص قطعیہ ہیں جو حضور علیہ السلام کی عصمت پر دلالت کرتی ہیں۔ پھر فرماتے ہیں کہ عقلی طور پر بھی یہ روایت من گھڑت ہے کیونکہ اگر ایسا ہونا ممکن ہوتا تو تمام احکامات' آیات اور سارا دین مشکوک ہو جاتا۔ (ملخصاً البحر المحیط)

''امام فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی زور شور سے اس روایت کا رد کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ اگرچہ سطحی قسم کے لوگوں نے اس روایت کو لکھا ہے لیکن علمائے محققین نے اس کے بطلان اور موضوع ہونے پر قرآن و سنت سے اور عقلی دلائل پیش کئے ہیں۔ اس کے بعد امام موصوف نے مرقومہ بالا آیات ذکر کی ہیں اور امام محمد بن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ کا قول نقل کیا ہے کہ یہ قصہ زندیقوں کا گھڑا ہوا ہے۔ عقلی دلائل پیش کرتے ہوئے علامہ نے لکھا ہے کہ جو شخص کہتا ہے کہ آقا علیہ السلام نے بتوں کے بارے میں تعریفی جملے کہے' وہ کافر ہے کیونکہ اس طرح تو حضور علیہ السلام کی بعثت کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے اور شریعت' قرآن اور دینِ اسلام کی کسی بات پر یقین نہیں رہتا۔''

''علامہ عبداللہ القرطبی نے ''احکام القرآن'' میں اس روایت کی خوب تردید کی ہے اور ہر ہر سلسلہِ روایت پر بحث کرنے کے بعد لکھا ہے کہ یہ سب کی سب روایتیں باطل ہیں اور ان کا کوئی ثبوت نہیں اور کیونکہ یہ روایت ضعیف ہے اس لئے اس کی تاویل کرنے کی بھی قطعاً کوئی ضرورت نہیں۔ آخر میں فرماتے ہیں کہ اگر اس روایت کی کوئی سندِ صحیح ثابت ہو بھی جائے تو بھی وہ ضعیف اور نا قابلِ اعتبار ہوگی کیونکہ وہ آیاتِ قرآنی کے صراحتہ مخالف ہے۔ ان حالات میں اہلِ نظر کے لئے یہ کب قابلِ التفات ہو سکتی ہے۔ علامہ موصوف نے قاضی عیاض کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ امت کا اس بات پر اجماع ہے کہ کلامِ الٰہی کی تبلیغ میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ہرگز کوئی غلطی نہیں ہو سکتی' نہ قصداً' نہ عمداً' نہ سہواً اور نہ غلطاً۔ اس میں نبی ہر طرح معصوم ہیں۔''

''قاضی ابوبکر ابن العربی الاندلسی جب اس آیت کی تفسیر کرنے لگے تو اس روایت کا ذکر کر کے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غصہ سے اُن کی آنکھوں میں خون اتر آیا ہے اور دل بے چین اور بے قرار ہو گیا ہے۔ اپنی سابقہ روش کے بالکل برعکس اس روایت کو باطل کرنے کے لئے ایک مستقل فصل لکھی ہے جس کا عنوان ہے: تنبیہ الغبی علی مِقدار النبی اور لکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے مقامِ قرب میں مجھے عظیم جزا دے گا۔''

''نیز یہ امر بھی غور طلب ہے کہ سورۃ الحج کی یہ آیات ۵۲'۵۳ مدینہ منورہ میں نازل ہوئیں اور سورۃ النجم کا نزول اور اس گھڑے ہوئے قصہ کا وقوع ہجرت سے کئی سال پہلے مکہ مکرمہ میں ہوا۔ تو عجیب بات یہ ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو معاذ اللہ ایسا کرنے سے جو حزن و ملال ہوا' اُسے دُور کرنے کے لئے اتنے عرصہِ دراز تک کوئی آیت نازل نہ ہوئی اور کئی سالوں کے بعد اللہ تعالیٰ کو خیال آیا کہ اپنے رسول کو مطمئن کرنے کے لئے یہ آیت نازل کی۔ کیا ایسی بے تکی بات کوئی صاحبِ عقل تسلیم کر سکتا ہے؟ مزید برآں یہ حدیث متواتر ہے کہ شیطان خواب میں بھی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی شکل میں کسی کو دکھائی نہیں دے سکتا تاکہ مسلمانوں کو حضور علیہ السلام کی شکل میں دھوکہ دے سکے تو اُس کی کیا مجال کہ سرچشمہِ ہدایت کو وہ گدلا کر سکے!''

''اصل واقعہ جو صحیحین اور دیگر کتبِ حدیث میں ہے' وہ صرف اتنا ہے کہ حضور علیہ السلام نے مجمع عام میں یہ سورۃ پڑھی اور اس کے آخر میں آیت سجدہ آنے کی وجہ سے سجدہِ تلاوت کیا تو تمام حاضرین جن میں کفار بھی تھے' سب سجدہ میں گر پڑے اور ایسا ہونا عین ممکن تھا کیونکہ کلامِ الٰہی ہو اور زبانِ حبیبِ کبریاء اُس کی تلاوت کر رہی ہو تو کیوں نہ کفار بے ساختہ سجدے میں گر پڑیں۔ بس اتنی سی بات تھی جسے زنادقہ کی وضع و تحریف نے کہاں سے کہاں پہنچا دیا!''

''فَیَنْسَخُ اللّٰہُ مَا یُلْقِی الشَّیْطٰنُ ثُمَّ یُحْکِمُ اللّٰہُ اٰیٰتِہٖ یعنی آیاتِ قرآنی یا احکامِ شرعی کے متعلق شیطان لوگوں کے دلوں میں جو وسوسہ اندازی کرتا ہے' رب تعالیٰ اپنی حکمت سے اُس کا ازالہ فرما دیتا ہے اور لوگوں کے دلوں کا یقین پھر تازہ ہو جاتا ہے۔ آیاتِ قرآنی کے متعلق شیطان کی وسوسہ اندازیوں سے وہی لوگ آزمائش میں

مبتلا ہوتے ہیں جن کے دلوں میں کفر و نفاق کی بیماری ہوتی ہے اور جن کے قلوب کی سنگلاخ زمین میں ہدایت کا پاکیزہ درخت اُگ نہیں سکتا۔ ایسے ہی لوگ ان شبہات کے باعث خود بھی گمراہ ہوتے ہیں اور دوسروں کی گمراہی کا بھی باعث بنتے ہیں۔ ان سے اگلی آیت ۵۴ میں فرمایا کہ اہلِ علم و فہم ان وسوسوں کا شکار نہیں ہوتے۔ آیاتِ ربانی میں ہدایت کا جو نور درخشاں ہوتا ہے' اس سے اُن کے دل روشن ہو جاتے ہیں۔ وہ سچے دل سے اس پر ایمان لاتے ہیں اور اُن کا خشوع و خضوع اور زیادہ بڑھ جاتا ہے۔'' (ضیاء القرآن' جلد پنجم' صفحات ۲۲۳ تا ۲۲۸)

''انبیاء و رُسل علیہم السلام انسان ہی ہوتے ہیں۔ اُن کے اعمال و افعال بالکل درست اور اُن کے ارادے نیک ہوتے ہیں۔ لیکن انسانی نقطہ نگاہ سے اشیاء و معاملات کا صحیح اندازہ لگانے میں ان مقدس ہستیوں کے ذہنوں میں شیطان کی طرف سے کسی تجویز کا آنا ممکن ہے لیکن قادرِ مطلق اللہ کا دستِ غیب ہر وقت' ہر آن اور ہر گھڑی اپنے نبی کے شاملِ حال ہوتا ہے لہٰذا وہ اُن شیطانی تجاویز کے مقابل سپر بن جاتا ہے اور اس طرح شیطان کی چالیں ناکام ہو کے رہ جاتی ہیں۔ انجام کار حکم اُسی کا چلتا ہے اور اُسی کی وحی راہ نمائے انسان بنتی ہے۔'' (عبداللہ یوسف علی' نوٹ: ۲۸۳۱)

''<u>شیطان کا بس اللہ کے وفادار' مخلص بندوں پر نہیں چلتا</u>: قرآن فرماتا ہے :

اِنَّ کَیۡدَ الشَّیۡطٰنِ کَانَ ضَعِیۡفًاO (النساء : ۷۶)

''شیطان کی چال تو لچر اور کمزور ہی ہوتی ہے۔'' (۷۶ : ۴)

لہٰذا اسلام کی نظر میں شیطان کوئی ہیبت ناک قوت نہیں جس سے خوف کھایا جائے۔ سچے مؤمن اس سے نفرت کرتے ہیں اور شیطان اور اس کے چیلوں کو انجام کار شکست ہوتی ہے۔ یہ تعلیم شیطان کو بدی کی دیوی کے تصور پر ہلاکت انگیز عمل ہے۔ رب تعالیٰ نے ابلیس کو پہلے ہی بہ ایں الفاظ متنبہ کر دیا تھا:

اِنَّ عِبَادِیۡ لَیۡسَ لَکَ عَلَیۡھِمۡ سُلۡطٰنٌ'' (اَلحِجر : ۴۲؛ بنی اسرائیل : ۶۵)

''بے شک جو میرے خاص بندے ہیں اُن پر تیرا ذرا قابو نہ چلے گا۔'' (۴۲:۱۵ ؛ ۶۵ : ۱۷)

اور سورۃ النّحل میں فرمایا گیا :

اِنَّہٗ لَیۡسَ لَہٗ سُلۡطٰنٌ'' عَلَی الَّذِیۡنَ آمَنُوۡا وَعَلٰی رَبِّھِمۡ یَتَوَکَّلُوۡنَO اِنَّمَا سُلۡطٰنُہٗ عَلَی الَّذِیۡنَ یَتَوَلَّوۡنَہٗ وَالَّذِیۡنَ ھُمۡ بِہٖ مُشۡرِکُوۡنَO (النَّحل : ۹۹' ۱۰۰)

''اُن لوگوں پر اُس کا کچھ بھی قابو نہیں چلتا جو ایمان لائے اور اپنے پالنہار پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ اُس کا قابو تو بس اُنہی پر چلتا ہے جو اُسے دوست بنائے رکھتے ہیں اور جو اللہ کے ساتھ شرک کرتے رہتے ہیں۔'' (۹۹'۱۰۰:۱۶)

یہ اس بارے میں نصِ صریح ہے کہ اہلِ ایمان و اہلِ توکل پر شیطان کا وسوسہ مؤثر نہیں ہوتا۔ شیطان میں ہرگز اس کی قدرت نہیں کہ وہ بہ جبر کسی سے گناہ کرا سکے۔ یہ صاف اعلانِ الٰہی ہے کہ جب تک تم خود ہی شیطان کے

دوست نہ بن جاؤ اور اُس کے وسوسوں کو دل میں جگہ نہ دینے لگو' وہ تم پر قابو نہیں پا سکتا۔ اُس کے حملوں سے بچنے کا نسخہ ایمانِ کامل اور توکلِ راسخ ہے۔ مؤمن جب شیطان پر غالب آتا ہے تو شیطان اُس کے مقابلہ میں ایک چیونٹی سے بھی زیادہ کمزور نکلتا ہے۔ اس کا مشاہدہ جب جی چاہے کر لیا جائے۔'' (عبدالماجد دریابادی' ص ۵۷۰' نوٹ: ۱۵۹)

اور شیطان نے خود بھی اُس موقع پر اس بات کو تسلیم کرتے ہوئے کہا تھا:

قَالَ فَبِعِزَّتِكَ لَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ O إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِينَ O (صٓ: ۸۲' ۸۳)

''بولا کہ مجھے تیری عزت کی قسم کہ میں سب کو بہکاؤں گا بجز اُن میں سے اُن بندوں کے جو تیرے منتخب شدہ ہیں۔'' (۳۸ : ۸۲' ۸۳)

''ابلیس اپنے تمام دم خم اور اتنے بلند بانگ دعووں کے باوجود حق تعالیٰ کے اِن بندوں کے سامنے شروع ہی سے ہار مانے ہوئے ہے۔ جو لوگ اپنے کو اُس کے اثرات سے بچانے کی فکر میں لگے رہتے ہیں تو اُنہیں اُسے اغوا کرنے کی ہمت تک نہیں ہو پاتی۔ إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِينَ امام فخرالدین رازی رحمۃ اللہ علیہ نے یہاں یہ نکتہ بیان کیا ہے کہ ابلیس نے یہ استثناء کر کے اپنی سچائی کو قائم رکھا یعنی اندھا دھند یہ دعویٰ نہیں کر بیٹھا کہ میں سارے ہی انسانوں کو بہکا لوں گا بلکہ اللہ کے نیک و پارسا بندوں کو اس سے مستثنیٰ کر دیا۔ تو جھوٹ ایسی گندی چیز ہے جس سے ابلیس تک کو حیا آئی۔ تو اُس مسلمان کی حالت پر حیف ہے جو مؤمن ہو کر جھوٹ سے پرہیز نہ کرے (تفسیر کبیر)۔ لَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ امام رازی نے کہا ہے کہ شیطان اس فقرہ میں اغواء کو اپنی ذات کی جانب منسوب کر رہا ہے گویا وہ مذہبِ قدریہ اختیار کئے ہوئے ہے لیکن سورۃ الحجر (۱۵) کی آیت ۳۹ میں رَبِّ بِمَا أَغْوَيْتَنِي کہہ کر اغواء کو وہ رب تعالیٰ کا فعل قرار دے رہا ہے گویا یہاں وہ مسلکِ جبریہ کا اظہار کر رہا ہے اور دونوں مقولوں کے جمع کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس بارے میں وہ حیران و متردد ہے۔'' لَأُغْوِيَنَّهُمْ۔ لفظ اغواء پر خوب غور کر لیا جائے۔ اغواء کی حقیقت صرف وسوسہ اندازی کی ہے۔ ابلیس کے بس میں اس سے زیادہ کچھ بھی نہیں کہ وہ معصیتوں اور نافرمانیوں کو خوشنما اور خوش رنگ بنا کر پیش کر دے۔ وہ زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتا ہے اور اس سے آگے اپنے فخریہ اور تعلّی آمیز دعووں کے وقت بھی نہیں بڑھتا۔'' (تفسیر ماجدی اردو' صفحہ ۹۱۶' نوٹ: ۷۱)

''<u>شیطان کو صرف برائی کی راہ دکھانے کا اختیار ہے</u>: قرآنِ حکیم کے فرمان کے بموجب روزِ حساب کو جب کفّار نارِ جہنم کو بھیجے جا چکے ہوں گے تو شیطان دوزخیوں سے اُن کی تلخ ترین ڈانٹ ڈپٹ اور اُس پر اُن کی لعنت کرنے کے جواب میں کہے گا:

إِنَّ اللَّهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ وَوَعَدْتُكُمْ فَأَخْلَفْتُكُمْ وَمَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِنْ سُلْطَانٍ إِلَّا أَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِي فَلَا تَلُومُونِي وَلُومُوا أَنْفُسَكُمْ مَا أَنَا بِمُصْرِخِكُمْ وَمَا أَنْتُمْ بِمُصْرِخِيَّ إِنِّي كَفَرْتُ بِمَا أَشْرَكْتُمُونِ مِنْ قَبْلُ إِنَّ الظَّالِمِينَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ O (ابراھیم: ۲۲)

''اللہ نے تم سے جو وعدہ کیا تھا (وہ) سچا وعدہ تھا اور میں نے بھی تم سے وعدہ کیا تھا سو میں نے تم سے وعدہ

خلافی کی اور میرا تم پر کچھ زور تو تھا نہیں سوائے اس کے کہ میں نے تمہیں بلایا اور تم نے میرا کہنا مان لیا' سو تم ملامت مجھ پر نہ کرو اور ملامت اپنے آپ کو کرو۔ (آج) نہ میں تمہارا فریاد رس اور نہ تم میرے فریاد رس۔ میں خود اس سے بیزار ہوں کہ تم اس سے قبل مجھے شریکِ (خدائی) قرار دیتے تھے' یقیناً ظالموں کے حق میں دردناک عذاب ہے۔'' (۲۲ : ۱۴)

''شیطان کا وعدہ یہ تھا کہ کفر پر ایمان کو کوئی ترجیح نہیں اور آخرت میں کوئی جزا و سزا نہیں ہے۔ اس عقیدہ کے ابطال پر دنیا میں قوی دلائل قائم ہیں اور آخرت میں اس ابطال کا ظہور ہوگا۔ مَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطَانٍ یعنی میرا تم پر کچھ زور اور دباؤ تو تھا نہیں کہ میں تمہیں مجبور کر دیتا۔ یہ عقیدہ اسلام میں بالکل صاف ہے کہ شیطان کو کسی کو گمراہی پر مجبور کرنے کی قوت بالکل نہیں دی گئی۔ اِلَّآ اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِيْ یعنی میں نے تو صرف اتنا کیا کہ تمہیں سبز باغ دکھا کر اپنی راہ کی طرف بلایا' ترغیب و تشویق پیدا کی اور تم نے اپنے ارادہ و اختیار سے بہ سلامتی حواس و صحتِ عقل' میری دعوت کو قبول کر لیا تو اصلی ذمہ دار تم ہوئے نہ کہ میں۔ یہاں سے یہ حقیقت صاف ہو گئی کہ ہر کفر و معصیت کی اصل ذمہ داری خود انسان پر ہے۔ شیطان کی حیثیت محض شریکِ جرم یا معینِ جرم کی ہے۔ اَشْرَكْتُمُوْنِ شیطان کی ہر امر میں اطاعت کیے جانا ہی عملاً اُسے شریکِ خدائی بنا لینا ہے۔'' (تفسیر ماجدی اردو' صفحہ ۵۳۰' نوٹ: ۳۱)

یہاں بیان کردہ اصول بہت اہمیت کا حامل ہے اور وہ یہ کہ اسلام کی نظر میں گناہ کا انسان کی فطرت میں ہونا کوئی موروثی چیز نہیں ہے۔ گناہ اور معصیت تو ایک عادت ہے جو انسان کی کمزوری کے باعث تشکیل پذیر ہوتی ہے اور کوئی بھی آدمی جو برائی کے خلاف ہمہ تن چوکس اور خبردار ہے' ہو ہی نہیں سکتا کہ بدی اور شیطان اُس پر غالب آجائیں۔ یہ کہنا کہ شیطان کسی انسان کے گرنے یا زوال پذیر ہونے کا ذمہ دار ہے' شیطان کے (خداداد) اختیار اور قوت کو اصل سے زیادہ باوزن سمجھنا ہے جبکہ شیطان کو صرف راہِ بد دکھانے کے سوا ہرگز کوئی اختیار نہیں۔ با ایمان انسان اپنی قوتِ ارادی کے بل بوتے پر بدی کے خلاف اپنی کوشش میں بالیقین ہمیشہ کامیاب ہوگا۔ (ماجدی انگریزی نوٹ: ۴۳۳)

''<u>شیطان کی اللہ سے ڈرنے کی حقیقت</u>: سورۃ الانفال میں جنگِ بدر کے حوالے سے بیان ہوا ہے:

وَاِذْ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ وَقَالَ لَا غَالِبَ لَكُمُ الْيَوْمَ مِنَ النَّاسِ وَاِنِّيْ جَارٌ لَّكُمْ فَلَمَّا تَرَآءَتِ الْفِئَتٰنِ نَكَصَ عَلٰى عَقِبَيْهِ وَقَالَ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّنْكُمْ اِنِّيْٓ اَرٰى مَا لَا تَرَوْنَ اِنِّيْٓ اَخَافُ اللّٰهَ وَاللّٰهُ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝ (الانفال : ۴۸)

''اور (وہ وقت قابلِ ذکر ہے) جب شیطان نے اُنہیں اُن کے اعمال خوشنما کر دکھائے اور کہا کہ آج لوگوں میں سے کوئی تم پر غالب آنے والا نہیں اور میں تمہارا حامی ہوں۔ پھر جب دونوں جماعتیں آمنے سامنے ہوئیں تو وہ اُلٹے پاؤں بھاگا اور کہنے لگا کہ میں تم سے بری الذمہ ہوں' میں وہ دیکھ رہا ہوں جو تم نہیں دیکھ سکتے' میں تو اللہ سے ڈرتا ہوں اور اللہ شدید سزا دینے والا ہے۔'' (۴۸ : ۸)

ظاہر ہے کہ ایمان کے بغیر خوفِ خدا کا دعویٰ محض خالی خولی دعویٰ ہے اور اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں ۔ لہٰذا خوف کے اس شیطانی دعویٰ نے اُسے کچھ بھی فائدہ نہ دیا ۔

سورۃ الحشر (۵۹) کی آیات ۱۶ ، ۱۷ میں بھی اسی حقیقت کے ضمن میں شیطان کی پُر فریب منصوبہ بندی اور اُس کے انجام کو یوں بیان کیا گیا ہے :

كَمَثَلِ الشَّيْطَانِ إِذْقَالَ لِلْإِنْسَانِ اكْفُرْ فَلَمَّا كَفَرَ قَالَ إِنِّي بَرِيءٌ مِّنْكَ إِنِّي أَخَافُ اللهَ رَبَّ الْعَالَمِينَ ○ فَكَانَ عَاقِبَتَهُمَا أَنَّهُمَا فِي النَّارِ خَالِدَيْنِ فِيهَا وَذَٰلِكَ جَزَآءُ الظَّالِمِينَ ○

"(اُن کی) مثال شیطان کی سی ہے جو انسان سے کہتا ہے کہ کافر ہو جا ، پھر جب وہ کافر ہو جاتا ہے تو (شیطان) کہنے لگتا ہے میرا تجھ سے کوئی واسطہ نہیں ، میں تو اللہ پروردگارِ عالم سے ڈرتا ہوں ۔ سو دونوں کا آخری انجام یہ ہوا کہ دونوں دوزخ میں گئے جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے اور ظالموں کی یہی سزا ہے ۔" (۵۹ : ۱۶ ، ۱۷)

یعنی جس طرح شیطان پہلے تو انسان کو بہکاتا ، بھڑکاتا ہے اور پھر وقت پڑنے پر ساتھ نہیں دیتا ، اسی طرح منافقینِ مدینہ نے مسلمانوں کے ساتھ سلوک کیا اور وقت آنے پر صاف نکل گئے ۔

<u>شیطان کی چالوں اور مکروفریب سے کیسے بچا جائے ؟</u> : انسان قدرتی طور پر ناتواں اور اپنے عزم میں کمزور واقع ہوا ہے ۔ شیطان کی گستاخانہ اشتعال انگیزی بڑی زبردست قوت کی ہے ۔ سورۃ الاعراف کی آیت ۲۷ میں شیطان کے حملوں کی زیرکی اور پُراسراریت کو یوں آشکار کیا گیا ہے :

إِنَّهُ يَرَاكُمْ هُوَ وَقَبِيلُهُ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ إِنَّا جَعَلْنَا الشَّيَاطِينَ أَوْلِيَاءَ لِلَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ ○

"بے شک شیطان (خود) اور اُس کا لشکر تمہیں ایسے طور پر دیکھتا ہے کہ تم اُنہیں نہیں دیکھتے ۔ ہم نے تو شیطانوں کو اُنہی لوگوں کا رفیق بننے دیا ہے جو ایمان نہیں لاتے ۔" (۷ : ۲۷)

غیر مرئی مخلوق ہونے کی وجہ سے شیطان اور اس کے چیلوں سے بچنے کے لئے بڑی احتیاط اور ہمہ وقت چوکنا رہنے کی ضرورت ہے ۔ انسان کا جنات کو دیکھنا عادتِ عامّہ کے خلاف ہے لیکن دیکھنے کی قطعاً نفی بھی نہیں ۔ چنانچہ بعض اوقات انبیاء علیہم السلام یا غیر انبیاء بلکہ عوام سے بھی جو جنّات کا دیکھنا مروی ہے ، وہ اس آیت کے خلاف نہیں ۔ مِنْ حَيْثُ میں کیفیت کا بیان ہے یعنی اس طرح پر شیطان اور شیطانی لشکروں کے غیر مرئی ہونے کا اثبات ہے ۔ إِنَّا جَعَلْنَا الشَّيَاطِينَ --- الخ چنانچہ جو مومن کامل ہیں ، اُن پر شیطان کا زور نہیں چل پاتا ۔ اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ تم جس قدر شیطان کے کہنے میں آ ؤ گے ، اُسی قدر تم ایمان میں کچے اور کمزور ہو گے ۔

پس مضبوط اور غیر متزلزل ایمان ہی شیطان کی فریب کاریوں اور وسوسوں کے خلاف یقینی تریاق کا کام دیتا ہے ۔ شیطانی وسوسوں اور اثرات کے خلاف قرآن مجید نے ذیل کا نسخہ بطور تریاق تجویز کیا ہے :

وَاِمَّا يَنۡزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيۡطٰنِ نَزۡغٌ فَاسۡتَعِذۡ بِاللّٰهِ اِنَّهٗ سَمِيۡعٌ عَلِيۡمٌ O
(الاعراف:۲۰۰ ؛ حٰم السجدة:۳۶)
''اور اگر تمہیں شیطان کی طرف سے وسوسہ آنے لگے تو اللہ کی پناہ مانگ لیا کرو۔ وہی (سب) سننے والا ہے' (سب) جاننے والا ہے۔'' (۲۰۰ : ۷ ؛ ۳۶ : ۴۱)

''نزغِ شیطانی سے مراد طبیعت میں اُس غصہ و اشتعال کا پیدا ہونا اور اُس کے مقتضا پر عمل کرنا ہے جو مشرکوں اور جاہلوں کی پیہم اشتعال انگیزیوں سے پیدا ہونا تقریباً ایک امرِ طبعی تھا لیکن اس پر عمل کرنے سے صالح انتظامی میں فرق پڑنے کا بھی احتمال تھا۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا پیمبر کے لئے نزغِ شیطانی ممکن بھی ہے؟ جس کا صاف اور سیدھا جواب یہ ہے کہ ممکن کیوں نہیں۔ پیمبر سے صرف صدورِ معصیت ممتنع ہے۔ گناہ کی رائے و تجویز کا پیغمبر کے سامنے پیش ہونا' چاہے وہ انسان کی طرف سے ہو یا شیطان کی طرف سے' یہ تو کسی درجہ میں بھی ممتنع نہیں اور نزغِ شیطان کی حیثیت اس سے زیادہ کچھ بھی نہیں کہ شیطان نے ایک رائے آپ ﷺ کے سامنے پیش کی اور قرآن مجید تو ہر بری تحریک کو شیطان ہی کی جانب منسوب کرتا ہے۔ مولانا اشرف علی تھانوی نے یہاں یہ نکتہ خوب لکھا ہے کہ حضور علیہ السلام کی لطافتِ قلب اسی سے ظاہر ہے کہ جو وسوسہ شیطانی محض مَس کے درجہ میں ہوتا تھا (چنانچہ اگلی آیت ۲۰۱ میں ایسے ہی موقع کے لئے لفظ مَسّ آیا ہے اور وہاں ذکر صالحین و متقینِ امت کا ہے) تو حضور علیہ السلام کے قلب مبارک کو اُس کی اذیت مثل نزغ کے محسوس ہوتی تھی۔'' (تفسیر ماجدی اردو' صفحہ ۳۷۲' نوٹ : ۲۹۳)

شیطان اور اُس کے چیلوں کے خفیہ حملوں کے خلاف قرآنِ حکیم تریاقی نسخوں کی تجویز جاری رکھتا ہے:
اِنَّ الَّذِيۡنَ اتَّقَوۡا اِذَا مَسَّهُمۡ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّيۡطٰنِ تَذَكَّرُوۡا فَاِذَا هُمۡ مُّبۡصِرُوۡنَ O (الاعراف: ۲۰۱)
''یقیناً جن لوگوں میں خدا خوفی ہے' جب اُنہیں کوئی شیطانی خطرہ لاحق ہوتا ہے تو وہ یادِ الٰہی میں لگ جاتے ہیں جس سے یکا یک اُنہیں سوجھ آ جاتی ہے۔'' (۲۰۱ : ۷)

''محققین نے لکھا ہے کہ وسوسہ شیطانی سے تقویٰ میں کوئی نقصان نہیں آتا اور اس محفوظیت کے تین درجے ہیں: درجہِ اعلیٰ یہ کہ وسوسہ کا اثر ہی سرے سے نہ ہو جیسا کہ حضرات ابراہیم خلیل اللہ اور اسمٰعیل ذبیح اللہ کے واقعہ میں منقول ہے۔ درجہ اوسط یہ کہ وسوسہ اثر دکھائے مگر معاً تنبیہ ہو جائے اور وسوسہ کے شر سے حفاظت رہے۔ یہ مقام صدّیقین کا ہے اور قصہ یوسف و زلیخا میں اس کی نظیر موجود ہے۔ محفوظیت کا درجہ ادنیٰ یہ ہے کہ پھسلے مگر معاً سنبھل جائے' ڈرے جھکے اور باز آ جائے۔ یہ مقام تائبین کا ہے۔'' (ماجدی اردو' صفحہ ۳۷۲' نوٹ: ۲۹۴)

<u>خوفِ خدا بندوں کے خوف سے کہیں زیادہ بلند و بالا ہونا چاہیے</u> : ایمان کی صداقت کا مطلب یہی ہے کہ خوفِ خدا اُس کی تمام مخلوقات سے بڑھ کر ہونا چاہیے جیسا کہ قرآن نے فرمایا: فَلَا تَخَافُوۡهُمۡ وَخَافُوۡنِ اِنۡ كُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِيۡنَ (آلِ عمران: ۱۷۵) ''اگر تم صاحبِ ایمان ہو تو اُن سے نہ ڈرو بلکہ مجھ ہی سے ڈرو۔'' (۱۷۵ : ۳)

(۷۷) ابن اُمِّ مکتوم (رضی اللہ تعالیٰ عنہ)

آپ کا اصل نام عبداللہ بن شُرَیح بن مالک بن ربیعہ الفہری ہے۔ آپ کا تعلق قبیلہ بنی عامر بن لُوئی سے ہے۔ امام فخر الدین رازی کا کہنا ہے کہ اُمِّ مکتوم آپ کی دادی کا نام تھا لیکن اکثر راویوں کے نزدیک اُمِّ مکتوم آپ کی والدہ کا نام تھا۔ آپ اُمّ المومنین سیّدہ خدیجۃ الکبریٰ کے خالو زاد بھائی (Cousin) تھے۔ آپ پیغمبر علیہ السلام کے نابینا صحابی تھے۔ آپ کا شمار اُن خوش نصیب صحابہ کرام میں ہے جنہیں قرآن نے ''سابقون الاوّلون'' کے اعزاز سے نوازا ہے۔ سورہ عَبَس (۸۰) کی ابتدائی دس آیات آپؓ کے حق میں نازل ہوئیں۔

واقعہ یوں ہوا کہ ایک مرتبہ ختمی مرتبت ﷺ بڑی دلسوزی اور محویت سے مکہ کے مشرک سرداروں (ابوجہل، عتبہ، شیبہ پسرانِ ربیعہ، امیہ بن خلف، ولید بن مغیرہ وغیرہ) کو اس امید میں تبلیغ اسلام فرما رہے تھے اور اُنہیں کفر و شرک کے اندھیروں سے نکالنے کی سعی فرما رہے تھے کہ وہ اسلام قبول کر لیں گے۔ حَرِیصٌ ''عَلَیْکُم'' کی شان اپنے پورے جوبن پر تھی۔ دریں اثنا عبداللہ ابنِ اُمِّ مکتوم رضی اللہ عنہ حاضر ہوئے۔ نابینا ہونے کی وجہ سے محفل کا رنگ نہ دیکھ سکے۔ انہوں نے اپنے شوقِ فراواں سے مجبور ہو کر آتے ہی عرض کی: یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اِعَلِّمْنِیْ مِمَّا عَلَّمَکَ اللّٰہُ' (اے اللہ کے رسول! جو اللہ نے آپ کو سکھایا، اُس میں سے مجھے بھی سکھایئے)

یہ مداخلت بے جا حضور علیہ السلام کو پسند نہ آئی۔ رخِ انور پر ناگواری کے آثار نمایاں ہوئے، جبینِ سعادت پر شکن پڑ گئے۔ اللہ تعالیٰ کو یہ گوارا نہ ہوا۔ اُس وقت یہ آیات نازل ہوئیں:

عَبَسَ وَتَوَلّٰی ٥ أَنْ جَآءَهُ الْأَعْمٰی ٥ وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰی ٥ أَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰی ٥
أَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰی ٥ فَأَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰی ٥ وَمَا عَلَيْكَ أَلَّا يَزَّكّٰی ٥ وَأَمَّا مَنْ جَآءَكَ يَسْعٰی ٥
وَهُوَ يَخْشٰی ٥ فَأَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰی ٥ (عَبَس : ۱ تا ۱۰)

''چیں بہ جبیں ہوئے اور منہ پھیر لیا (بایں وجہ کہ) اُن کے پاس ایک نابینا آیا اور آپ کیا جانیں شاید وہ پاکیزہ تر ہو جاتا یا نصیحت قبول کر لیتا اور اُسے نصیحت کرنا فائدہ ہی پہنچاتا، سو جو شخص (دین سے) بے پروائی کرتا ہے آپ اُس کی تو فکر میں پڑ جاتے ہیں حالانکہ آپ پر کوئی الزام نہیں اگر وہ نہ سنورے، اور جو شخص آپ کے پاس دوڑتا ہوا آتا ہے اور وہ خشیتِ (الٰہی) رکھتا ہے تو آپ اُس سے بے اعتنائی برتتے ہیں۔'' (۱ تا ۱۰ : ۸۰)

امام فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ یہاں ایک سوال اٹھاتے ہیں، پھر خود ہی اُس کا جواب دیتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ غلطی حضرت عبداللہ سے ہوئی تھی۔ حضور علیہ السلام کفار کو دعوتِ اسلام دے رہے تھے۔ جناب عبداللہ نے قطع کلام کرتے ہوئے اپنی بات چھیڑ دی۔ نیز ایک کافر کو دعوتِ اسلام دینا ایک مسلمان کو قرآن کی تعلیم دینے سے مقدم ہے۔ آدابِ مجلس کا تقاضا بھی یہی تھا کہ جو سلسلہ کلام پہلے شروع ہے، وہ ختم ہو جائے تو نئی بات چھیڑی جائے۔ عبداللہ پہلے ہی مسلمان ہو چکے تھے۔ مزید تعلیم حاصل کرنے کے لئے اُن کے پاس بے شمار مواقع تھے۔ بہ ظاہر غلطی جناب عبداللہ کی ہے کہ اُنہوں نے مجلسِ نبوّت کے آداب کا پاس نہ رکھا۔ نیز حضور علیہ السلام اپنے کسی ذاتی کام میں مصروف نہ تھے بلکہ بَلِّغْ مَا اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ کے حکم کی تعمیل میں مشغول تھے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ عبداللہ کو سرزنش کی جاتی کہ اُنہوں نے فرائضِ نبوت کی ادائیگی میں مداخلت کیوں کی ہے لیکن اُن کی بجائے اپنے محبوب کریم کو تنبیہ فرما دی کہ

آپ نے ناگواری کا اظہار کیوں کیا اور اُس سے بے رُخی کیوں برتی۔ اس میں کیا حکمت ہے؟'' ان تمام باتوں کے پیشِ نظر عتاب حضرت عبداللہ کو ہونا چاہئے تھا۔ حضور علیہ السلام کو عتاب کرنے میں کیا حکمت ہے؟

''امام رازی فرماتے ہیں کہ یہ ساری باتیں بجا ہیں اور عتاب کی اس کے بغیر کوئی حکمت نہیں کہ وہ کفار جو اُس وقت حاضر تھے' وہ مکہ کے سردار اور دولتمند لوگ تھے' اُنہیں اپنی اس برتری کا احساس بھی تھا اور اُس پر اُنہیں گھمنڈ بھی تھا۔ اُن کی موجودگی میں اپنے کسی نیاز مند کے ساتھ یہ بے اعتنائی عام لوگوں کو اس غلط فہمی میں مبتلا کر سکتی تھی کہ یہ بے رخی' تبلیغ میں انہماک کی وجہ سے نہیں برتی گئی بلکہ محض ان لوگوں کی دولت و ثروت اور اُن کی ریاست کی وجہ سے اُن کی پاسداری کی گئی ہے اور عبداللہ کو محض اس وجہ سے نظر انداز کیا گیا ہے کہ وہ غریب عوام کا ایک فرد ہے اور جس نبی کو اللہ تعالیٰ نے بھیجا ہی غریب نواز بنا کر ہو اور جس کا مقصدِ اوّلیں ہی شکستہ دلوں اور غمزدوں کی دلجوئی اور دل داری ہو اور جو تشریف ہی اس لئے لایا ہو کہ فقراء و مساکین کی عزت افزائی کرے' اُس ہستی سے کسی ایسی بات کا صدور جس سے اُس کے منصبِ رفیع کے خلاف کوئی واہمہ پیدا ہو سکے' اللہ تعالیٰ کو ہرگز گوارا نہیں۔''

''عبداللہ ابنِ اُمّ مکتوم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دلِ نیاز مند پر صد ہا شیبہ و عتبہ قربان کئے جا سکتے ہیں۔ بارگاہِ نبوّت کے درویشوں اور فقیروں کی درویشی اور فقر کے سامنے دنیا بھر کے رئیسوں کی کوئی حیثیت نہیں:

قطرۂ آبِ وضوئے قنبرے خوب تر از خونِ نابِ قیصرے

(قنبر کے وضو کے پانی کا قطرہ' قیصر کے خونِ ناب سے قدر و قیمت میں کہیں فزوں تر ہے)

وَمَا يُدْرِيكَ لَعَلَّهُ يَزَّكَّى کی آیت میں عبداللہ کے پاسِ خاطر کی وجہ بتائی جا رہی ہے کہ وہ کفار جن کی طرف آپ ہمہ تن متوجہ تھے' اُن میں سے کسی کے دل میں طلبِ حق کا جذبہ نہ تھا۔ اُنہیں تو اپنی دولت کا گھمنڈ اور اپنے رئیس ہونے پر ناز تھا۔ وہ آپ کی دعوت کو سمجھنے اور سمجھ کر اُسے قبول کرنے کی نیت سے حاضر نہیں ہوئے تھے بلکہ آپ کی خصوصی توجہ کے باعث وہ اِس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے تھے کہ اسلام کو اُن کی بڑی ضرورت ہے۔ اگر اُنہوں نے اس دعوت کو قبول نہ کیا تو اسلام کی ترقی اور عروج کے اِمکانات ختم ہو کر رہ جائیں گے۔ ان نادانوں نے اس حقیقت کو نہ سمجھا کہ بیمار کو مسیحا کی ضرورت ہوتی ہے' پیاسا چشموں کا محتاج ہوا کرتا ہے نہ کہ اس کے برعکس۔ غیرتِ خداوندی یہ کب گوارا کر سکتی تھی کہ وہ اپنے دل میں اسلام اور ہادیِ اسلام ﷺ کے بارے میں اس قسم کے تصوّرات کو جگہ دیں اور یہ درویش تو پہلے ہی حق کی شمع اپنے سینہ میں فروزاں کر چکا تھا اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی غلامی سے عہدِ وفا باندھ چکا تھا۔ ان ازلی محروموں کے ساتھ جو کوشش ہو رہی تھی' اُنہیں اس کا کوئی فائدہ پہنچنے والا نہ تھا۔ البتہ اُسے جو آپ سکھاتے' وہ اُسے حرزِ جاں بناتا' صدقِ دل سے اس پر عمل کرتا' اُس کا آئینۂ دل اور زیادہ شفاف اور تابناک ہو جاتا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے جنابِ عبداللہ کی دلجوئی کرتے ہوئے سورہ مبارکہ عَبَسَ نازل فرمائی تاکہ دنیا کو پتہ چل جائے کہ اس بارگاہِ بیکس پناہ میں شکستہ دلوں اور سوختہ جگروں کی جو قدر و منزلت ہے' وہ کسی اور کی نہیں۔''

''یہاں ایک چیز غور طلب ہے۔ قرآن کریم میں دوسرے مقامات پر جہاں بھی اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب لبیب ﷺ سے خطاب فرمایا ہے' وہاں محبت' پیار اور دلجوئی کی حد کر دی گئی ہے لیکن اُن مقامات کے برعکس یہاں اسلوبِ بیان میں بڑا اجلال ہے۔ اندازِ خطاب میں تندی کا پہلو غالب ہے۔ آخر اس کی وجہ کیا ہے؟

''آیات میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسا تند لہجہ اختیار کر کے رؤسائے مکہ کی اُسی غلط فہمی کا ازالہ کرنا مقصود ہے جس کا ذکر قبل ازیں ہو چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس سورت کی ابتدائی آیتوں میں قیامت تک کے آنے والے رئیسوں' دولتمندوں' خاقانوں اور قیصروں کی غلط فہمی کو دُور کر کے فرما دیا کہ یہاں تو پذیرائی اُسے بخشی جاتی ہے جو خلوص اور طلبِ صادق لے کر حاضر ہوتا ہے خواہ وہ مفلس و کنگال ہی کیوں نہ ہو۔ جس شخص کو اپنی دولت اور جاہ و منصب پر گھمنڈ ہے اور جس کے دل میں جذبہ صادق نہیں اُس کی یہاں کوئی گنجائش نہیں۔ آیات کے لہجہ میں یہ تندی اسی اہم ضرورت کے پیشِ نظر اختیار کی گئی۔ لیکن اس عتاب میں بھی لطف و کرم اور پیار کے جلوے دمک رہے ہیں۔ عتاب کرتے ہوئے عَبَسْتَ وَتَوَلَّیْتَ خطاب کے صیغے استعمال نہیں کئے بلکہ عَبَسَ وَ تَوَلّٰی (وہ چیں بہ جبیں ہوا اور اُس نے منہ پھیر لیا) یعنی غیاب کے پردے میں عتاب کیا گیا ہے کیونکہ رُو برو عتاب خاطرِ عاطر پر بہت گراں گزرتا۔''

''ان آیات کے نزول کے بعد نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں جب حضرت عبداللہ حاضر ہوتے تو حضور علیہ السلام فرماتے: مَرْحَبًا بِمَنْ عَاتَبَنِیْ رَبِّیْ (خوش آمدید! اے وہ شخص جس کے بارے میں میرے رب نے مجھے عتاب فرمایا)۔ پھر آپ پوچھتے: هَلْ لَكَ مِنْ حَاجَةٍ؟ (کوئی کام ہے تو بتاؤ)۔ کسی مہم کے سلسلہ میں حضور علیہ السلام بیرونِ مدینہ تشریف لے جاتے تو مدینہ منورہ میں اپنا کسی کو نائب بنا جاتے۔ جنابِ عبداللہ کو یہ شرف دو بار حاصل ہوا۔''

''یہاں اس بات کا تذکرہ کرنا بھی ضروری ہے کہ جنابِ عبداللہ بن اُمِّ مکتوم کو (أَعْمٰی) یعنی ''نابینا'' کہنے میں اُن کی تحقیر مقصود نہیں بلکہ اُن کی طرف سے معذرت پیش کی جا رہی ہے کہ یہ نابینا معذور تھا' نہ محفل کے رنگ کو دیکھ سکا اور نہ حاضرین کو پہچان سکا اور نہ اُسے یہ پتہ چلا کہ آپ ﷺ اس قدر مصروف ہیں۔''

''جو لوگ اِن آیات سے سرورِ عالم ﷺ کے مرتبہ عالیہ کی تنقیص کرتے ہیں' وہ پرلے درجے کے کم فہم اور گستاخ ہیں۔ علامہ اسماعیل حقی لکھتے ہیں کہ فاروقِ اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو معلوم ہوا کہ ایک امام ہمیشہ نماز میں اسی سورت عَبَسَ کی تلاوت کرتا ہے تو آپ نے ایک آدمی بھیجا جس نے اُس کا سر قلم کر دیا۔ چونکہ وہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مرتبہ عالی کی تنقیص کے ارادے سے اس کی قرأت کیا کرتا تھا تاکہ مقتدیوں کے دل میں بھی نبوّت کی عظمت کم ہو جائے' اس لئے نگاہِ فاروقی میں وہ مرتد تھا اور مرتد واجب القتل ہوتا ہے (روح البیان)۔ ایسے مقامات پر انسان کو سنبھل کر قدم اٹھانا چاہئے کہ کہیں ایمان کی شمع گل نہ ہو جائے۔'' (''ضیاء القرآن'' جلد ۵' صفحات ۴۸۹ تا ۴۹۲)

(۷۸) (جدّ الانبیاء) ابراہیم علیہ السلام اور آپ کے صاحبزادے

ابراہیم علیہ السلام کا زمانہ: ''محمد بن عمر واقدی بیان کرتے ہیں کہ حضرت نوح اور حضرت آدم علیہما السلام کے درمیان دس صدیاں ہیں اور حضرت ابراہیم اور نوح علیہما السلام کے درمیان دس صدیاں ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش کے دو ہزار سال بعد پیدا ہوئے۔'' (''تبیان القرآن''۔۔۔ علامہ غلام رسول سعیدی، جلد سوم، صفحہ ۵۵۲)

ابراہیم علیہ السلام کا نسب نامہ: توراۃ کے مطابق حضرت ابراہیم علیہ السلام کا نسب نامہ اس طرح ہے:

ابراہیم (خلیل اللہ) بن تارخ، بن ناجور، بن سروج، بن رعو، بن فالج، بن عابر، بن شالخ، بن ارفکشاذ، بن سام بن نوح علیہ السلام۔ (ابن کثیر، جلد اوّل، صفحہ ٦٧)

یہ تصریح تورات اور تاریخ ابن کثیر کے مطابق ہے۔ کچھ مفسرین کا کہنا ہے کہ قرآنِ عزیز نے اُن کے والد کا نام آزر بتایا ہے:

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِاَبِيْهِ آزَرَ اَتَتَّخِذُ اَصْنَامًا آلِهَةً (الانعام: ۷۴)

''اور جب ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ آزر سے کہا کہ کیا تم بتوں کو معبود قرار دیتے ہو؟'' (۶:۷۴)

آزر کی تحقیق: علامہ ابوالفرج عبدالرحمٰن علی بن محمد الجوزی (م ۵۹۷ھ) نے آزر کے متعلق چار قول لکھے ہیں:

(۱) امام بن ابی حاتم اور امام ابوالشیخ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ آزر بت ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے باپ کا نام یازر ہے۔ (تفسیر دُرِّ منثور لجلال الدین السیوطی، ج ۳، ص ۳۰۰)

(۲) مجاہد نے کہا کہ آزر بت کا نام ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد کا نام تارخ ہے۔

(۳) زجاج نے کہا کہ آزر نام نہیں ہے بلکہ مذمت کا کلمہ ہے۔ گویا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: اے خطا کار! تو بتوں کو معبود قرار دے رہا ہے!

(۴) مقاتل بن حیّان نے کہا کہ آزر حضرت ابراہیم علیہ کے باپ کا نام نہیں ہے۔ یہ اُن کا لقب ہے۔''
(زادالمسیر، جلد سوم، ص ص ۷۵،٦٧ بحوالہ ''تبیان القرآن'')

''اس میں مفسرین کا اختلاف ہے کہ آیا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد کا نام آزر ہے یا تارخ ہے۔ علامہ نیشا پوری، علامہ سیوطی اور علامہ آلوسی کی تحقیق یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے آباء کرام مؤمن تھے اور ہمارے نبی سیّدنا محمد ﷺ کے سلسلہ نسب میں تمام آباء اور اُمّہات مؤمن تھے لہٰذا آزر باپ نہیں ہوسکتا۔

"آزر کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا باپ کہنے کی توجیہ: قرآن مجید میں آزر پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اَب (باپ) کا اطلاق کیا گیا ہے۔ اس کی توجیہ یہ کی گئی ہے کہ عرب میں اَب "کا اطلاق عَمّ" (چچا) پر بکثرت کیا جاتا ہے اگرچہ یہ مجاز ہے۔ قرآن فرماتا ہے:

أَمْ كُنتُمْ شُهَدَآءَ إِذْ حَضَرَ يَعْقُوبَ الْمَوْتُ إِذْ قَالَ لِبَنِيهِ مَا تَعْبُدُونَ مِنْ بَعْدِي قَالُوا نَعْبُدُ إِلٰهَكَ وَإِلٰهَ آبَآئِكَ إِبْرٰهِيمَ وَإِسْمٰعِيلَ وَإِسْحٰقَ إِلٰهًا وَّاحِدًا (البقرة: ۱۳۳)

"کیا تم اُس وقت موجود تھے جب یعقوب علیہ السلام کا وقتِ وفات آیا۔ جب اُنہوں نے اپنے بیٹوں سے فرمایا کہ تم میرے بعد کس کی عبادت کرو گے؟ اُنہوں نے کہا کہ ہم آپ کے معبود اور آپ کے باپ دادا ابراہیم، اسماعیل اور اسحاق کے معبودِ واحد کی عبادت کریں گے۔" (۲: ۱۳۳)

"اس آیت میں حضرت اسماعیل علیہ السلام پر باپ کا اطلاق کیا گیا ہے حالانکہ وہ یعقوب علیہ السلام کے باپ نہیں بلکہ چچا ہیں اور امام ابوالعالیہ نے اس آیت کی تفسیر میں کہا کہ اس آیت میں چچا پر باپ کا اطلاق کیا گیا ہے اور اُنہوں نے محمد بن کعب قرظی سے روایت کیا کہ ماموں والد ہے اور چچا والد ہے اور اس آیت کی تلاوت کی۔"
(الحاوی للفتاویٰ لجلال الدین السیوطی، ج ۲، ص ۲۱۴ مکتبہ نوریہ رضویہ لائلپور پاکستان، بحوالہ تبیان القرآن)

امام ابن ابی حاتم نے سندِ صحیح کے ساتھ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے (عرفی) باپ کے لئے مسلسل استغفار کرتے رہے اور جب وہ مر گیا تو آپ کو معلوم ہوا کہ یہ اللہ کا دشمن ہے۔ اس کے بعد اُنہوں نے اس کے لئے استغفار نہیں کیا۔

"قیامت کے دن آزر کو باپ کہنے کی توجیہ: امام محمد بن اسماعیل بخاری (م ۲۵۶ھ) روایت کرتے ہیں:
حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبیِ معظم ﷺ نے فرمایا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اپنے (عرفی) باپ آزر سے قیامت کے دن ملاقات ہوگی اور آزر کے چہرے پر دھواں اور گرد و غبار ہوگا۔ حضرت ابراہیم اُس سے فرمائیں گے کیا میں نے تمہیں کہا نہیں تھا کہ تم میری نافرمانی نہ کرنا؟ اُن کا (عرفی) باپ کہے گا کہ آج میں آپ کی نافرمانی نہیں کروں گا۔ ابراہیم علیہ السلام عرض کریں گے کہ اے میرے رب! تو نے مجھ سے وعدہ فرمایا تھا کہ تو قیامت کے دن مجھے شرمندہ نہیں کرے گا اور اس سے بڑی اور کیا شرمندگی ہوگی کہ میرا (عرفی) باپ رحمت سے دور ہوا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا میں نے کافروں پر جنت حرام کر دی ہے۔ پھر کہا جائے گا اے ابراہیم! تمہارے پیروں کے نیچے کیا ہے؟ ابراہیم علیہ السلام دیکھیں گے تو وہ گندگی میں لتھڑا ہوا ایک بجو ہوگا اور اُسے ٹانگوں سے پکڑ کر دوزخ میں ڈال دی جائے گا۔" (صحیح البخاری، ج ۴، رقم الحدیث: ۳۳۵۰؛ سنن الکبریٰ للنسائی ج ۶، رقم الحدیث ۱۱۳۷۵؛ المستدرک للحاکم ج ۶، ص ۲۳۸؛ کنز العمال، ج ۱۱، رقم الحدیث ۳۲۹۲؛ مشکوٰۃ المصابیح)

حافظ عماد الدین ابن کثیر شافعی (م ۷۷۴ھ) لکھتے ہیں:
"یہ حدیث اس پر دلالت کرتی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے باپ کا نام آزر ہے اور جمہور اہلِ نسب' بہ شمول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سب اس پر متفق ہیں کہ آپ کے باپ کا نام تارخ ہے اور اہلِ کتاب تارح کہتے ہیں۔" (البدایہ و النّہایۃ' ج ۱' ص ۱۴۲' مطبوعہ دار الفکر' بیروت' ۱۹۷۴ء)

شیخ عبد الحق محدّث دہلوی (م ۱۰۵۲ھ) اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:
"بعض علماء رحمہم اللہ تعالیٰ اس بات کے قائل ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے آبائے کرام شرک اور کفر کی آلودگی سے پاک اور منزّہ ہیں۔ اُن کے نزدیک آزر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے چچا ہیں اور اُنہیں مجازاً باپ کہا گیا ہے۔ اُن کے باپ کا نام تارخ ہے۔ اسی وجہ سے مطلقاً نہیں فرمایا کہ حضرت ابراہیم کی اپنے باپ سے ملاقات ہوگی تاکہ اُن کے حقیقی والد کی طرف ذہن متوجہ نہ ہو اور اُن کے والد کے ساتھ آزر کا ذکر کیا تاکہ معلوم ہو کہ یہاں مجازی باپ مراد ہے۔" (اشعۃ اللمعات' ج ۴' ص ۳۶۸' مطبوعہ مطبع تیج کمار' لکھنؤ)

شیخ محمد ادریس کاندھلوی (م ۱۳۹۴ھ) اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:
"تحقیق یہ ہے کہ آزر حضرت ابراہیم علیہ السلام کا چچا تھا۔ اُسے مجاز متعارف کے طور پر باپ کہا گیا ہے اور آپ کے باپ کا نام تارخ ہے۔ بعض محققین علماء جنہوں نے آدم علیہ السلام سے لے کر ہمارے نبی ﷺ کے تمام آباء سے کفر کی نفی کی ہے' اُن کی بھی یہی تحقیق ہے۔ اس بناء پر اس حدیث میں آزر کا ذکر اس لئے ہے کہ اگر یوں کہا جاتا کہ حضرت ابراہیم کی اپنے باپ سے ملاقات ہوگی تو اس سے اُن کے حقیقی والد کی طرف ذہن چلا جاتا اور جب آزر کی قید لگائی تو اُن کے حقیقی والد کی طرف ذہن نہیں جائے گا۔ حضرت ابراہیم کے اس چچا پر باپ کا اطلاق اس لئے کیا گیا ہے کہ حضرت ابراہیم کا اختلاط اور اُن کی الفت اپنے اس چچا کے ساتھ بہت زیادہ تھی اور وہ مشرکین کا رئیس تھا اور اسی کے ساتھ اُن کا مناظرہ ہوا تھا۔"
(التعلیق الصبیح' ج ۶' ص ۳۰۱ مطبوعہ مکتبہ نعمانیہ لاہور)

"اس حدیث پر ایک اعتراض یہ ہوتا ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام زندگی میں آزر کے دشمنِ خدا ہونے کی وجہ سے اُس سے بیزار ہو گئے تھے تو پھر قیامت کے دن اُس کی سفارش کیوں کی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام آزر کے لئے نجات کی دعا کرنے سے بیزار ہو گئے تھے اور قیامت کے دن اُنہوں نے اس کی نجات کے لئے سفارش نہیں کی بلکہ اُس کے عذاب میں تخفیف کے لئے سفارش کی تھی اور بعض خصوصیات کی بناء پر کفار کے عذاب میں تخفیف کر دی جاتی ہے۔" ("تبیان القرآن"۔ علامہ غلام رسول سعیدی' ج ۳' ص ۵۵۸)

<u>نبی ﷺ کے تمام آباء کرام کے مؤمن ہونے پر دلیل</u>: ہمارے نبی سیّدنا محمد ﷺ کے سلسلہ نسب

میں تمام آباء کرام مؤمن تھے جس کی دلیل یہ ہے کہ احادیثِ صحیحہ اس پر دلالت کرتی ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر آپ کے والد ماجد حضرت عبداللہ تک نبی ﷺ کے تمام آباء کرام اپنے اپنے زمانوں میں سب سے خیر (بہتر) اور سب سے افضل تھے اور قرآن مجید میں یہ تصریح ہے :

وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَّلَوْ أَعْجَبَكُمْ (البقرۃ: ۲۲۱)

"اور بے شک مؤمن غلام مشرک (آزاد) سے بہتر ہے خواہ وہ تمہیں اچھا لگے۔" (۲ : ۲۲۱)

اور جب مؤمن مشرک سے بہتر اور افضل ہے اور نبی ﷺ کے آباء کرام اپنے اپنے زمانہ میں سب سے بہتر اور افضل تھے تو ضروری ہوا کہ وہ مؤمن ہوں۔ نیز احادیث اور آثار اس پر دلالت کرتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام یا حضرت نوح علیہ السلام کے بعد سے سیدنا محمد ﷺ کی بعثت تک بلکہ قیامت تک روئے زمین پر کچھ ایسے لوگ رہے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی توحید پر قائم رہے اور اُس کی عبادت کرتے رہے اور اُنہی کی وجہ سے زمین محفوظ رہی ورنہ زمین اور زمین والے ہلاک ہو جاتے اور ان مقدمات سے قطعی طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ نبی ﷺ کے آباء میں کوئی مشرک نہیں تھا۔"

"رسول اللہ ﷺ کے تمام آباء کرام کا اپنے اپنے زمانہ میں سب سے افضل اور بہتر ہونا: امام محمد بن اسمٰعیل بخاری (م ۲۵۶ ھ) روایت کرتے ہیں :

"حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مجھے بنی آدم کے ہر قرن اور ہر طبقہ میں سب سے بہتر قرن اور طبقہ سے مبعوث کیا جاتا رہا حتیٰ کہ جس قرن میں میں ہوں۔" (صحیح البخاری، ج ۴، رقم الحدیث ۳۵۵۷ ؛ کنز العمال، ج ۱۱، رقم الحدیث ۳۳۰۰۵ ؛ مسند احمد، ج ۹، رقم الحدیث ۹۳۶۰ ؛ دلائل النبوۃ للبیہقی، ج ۱، ص ۱۷۵ ؛ مشکوٰۃ المصابیح، ج ۳، رقم الحدیث ۵۷۳۹)

امام ابو بکر احمد بن حسین بیہقی (م ۴۵۸ ھ) روایت کرتے ہیں :

"حضرت اَنس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے خطبہ دیتے ہوئے فرمایا : میں محمد بن عبداللہ بن عبدالمطلب بن ہاشم بن عبد مناف بن قصی بن کلاب بن مُرّہ بن کعب بن لؤی بن غالب بن فہر بن مالک بن نضر بن کنانہ بن خزیمہ بن مدرکہ بن الیاس بن مضر بن نزار ہوں۔ جب بھی لوگوں کے دو گروہ ہوئے، اللہ تعالیٰ نے مجھے ان میں سے بہتر گروہ میں رکھا۔ میں جائز ماں باپ سے پیدا کیا گیا ہوں، مجھے زمانہ جاہلیت کی بدکاری سے کوئی چیز نہیں پہنچی۔ میں نکاح سے پیدا کیا گیا ہوں، بدکاری سے پیدا نہیں کیا گیا۔ حضرت آدم کے زمانہ سے لے کر پاکیزگی کا یہ سلسلہ میرے باپ اور میری ماں تک پہنچا ہے۔ میں بطور شخصیت کے تم سب سے بہتر ہوں اور بہ طور باپ کے تم سب سے بہتر ہوں۔" (دلائل النبوۃ، ج ۱، ص ۱۷۴، ۱۷۵)

امام ابو نعیم اصبہانی (م ۴۳۰ ھ) اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

(۱) ''حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میرے ماں باپ کبھی بھی بدکاری پر جمع نہیں ہوئے۔ اللہ عزّ وجلّ مجھے ہمیشہ پاک پشتوں سے پاک رحموں کی طرف منتقل فرماتا رہا جو صاف اور مہذّب تھیں۔ جب بھی دو شاخیں پھوٹیں، میں اُن میں سے بہتر شاخ میں تھا۔'' (دلائل النبوۃ، ج ۱)

(۲) ''حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سورۃ الشُّعراء کی آیت ۲۱۹ وَتَقَلُّبَكَ فِي السَّاجِدِيْن کی تفسیر میں بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ پیدا ہونے تک ہمیشہ انبیاء علیہم السلام کی پشتوں میں مُنقلب ہوتے رہے۔'' ☆ (دلائل النبوۃ، ج ۱، رقم الحدیث: ۱۷)

امام مسلم بن حجاج قُشیری (م ۲۶۱ ھ) روایت کرتے ہیں:
''حضرت واثلہ بن اسقع رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد سے کنانہ کو پسند کرلیا اور کنانہ سے قریش کو پسند کرلیا اور قریش میں سے بنو ہاشم کو پسند کرلیا اور بنو ہاشم میں سے مجھے پسند کیا۔'' (صحیح مسلم: فضائل ۱، (۲۲۷۶)، سنن ترمذی، ج ۵، رقم الحدیث: ۳۶۲۵ ؛ صحیح ابن حبان، ج ۱۴، رقم الحدیث: ۶۲۴۲؛ مسند احمد ج ۶، رقم الحدیث: ۱۶۹۸۴؛ المعجم الکبیر، ج ۲۲، رقم الحدیث: ۱۶۱)

امام فخر الدین رازی نے اپنی کتاب ''اسرار التنزیل'' میں لکھا ہے کہ آزر ابراہیم علیہ السلام کا والد نہیں تھا اور اس پر کئی وجوہ سے استدلال کیا ہے۔ ایک دلیل یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے آباء کافر نہیں تھے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اَلَّذِیْ يَرَاكَ حِيْنَ تَقُوْمُ وَتَقَلُّبَكَ فِي السَّاجِدِيْن (الشعراء: ۲۱۹) اس آیت کا معنی یہ ہے کہ آپ کا نور ایک ساجد سے دوسرے ساجد کی طرف منتقل ہوتا رہا اور اس تقدیر پر یہ آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ سیدنا محمد ﷺ کے تمام آباء مسلمان تھے اور اب قطعی طور پر یہ کہنا واجب ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کے والد کافروں میں سے نہیں تھے اور آزر آپ کا چچا تھا۔ پھر امام رازی نے کہا کہ سیدنا محمد ﷺ کے تمام آباء کے مشرک نہ ہونے پر یہ حدیث دلالت کرتی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں ہمیشہ پاکیزہ پشتوں سے پاکیزہ رحموں کی طرف منتقل ہوتا رہا اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ'' (سورۃ التوبۃ: ۲۸) مشرک تو نرے ناپاک ہیں۔ پس واجب ہوا کہ آپ کے آباء اور اجداد کرام سے کوئی شخص مشرک نہ ہو۔'' (تفسیر کبیر)

☆ عبدالماجد دریا آبادی اپنی اردو تفسیر کے صفحہ ۲۹۷، نوٹ: ۱۱۳ کے تحت لکھتے ہیں: ''ایک گمراہ فرقہ اپنے مخصوص عقائد کے تحفظ و پشت پناہی کی خاطر شروع سے کہتا آرہا ہے کہ آزر حضرت ابراہیم خلیل علیہ السلام کے والد کا نہیں بلکہ چچا کا نام تھا اور حال کے ایک آدھ جدید گمراہ فرقے بھی یہی کہہ رہے ہیں لیکن اُن میں سے کسی کے پاس بھی دلیل نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ محض احتمالات و امکانات تو ہر قطعی سے قطعی مسئلہ میں بھی پیدا کیے جاسکتے ہیں۔''

محولہ بالا روایات کی روشنی میں کیا ہم دریا آبادی سے یہ سوال کرنے میں حق بجانب ہیں کہ کیا انبیاء علیہم السلام کی عصمت وعزت کی حفاظت کرنا گمراہی ہے اور کیا درج بالا سیدنا ابن عباس، ابن کثیر، جلال الدین السیوطی، امام بخاری، امام مسلم، رازی، شیخ عبدالحق محدث دہلوی وغیرہ جیسی برگزیدہ ہستیاں جو آزر کو ابراہیم علیہ السلام کا چچا مانتے ہیں، سب کے سب گمراہ ہیں؟ دریا آبادی صاحب موصوف کے نشتر سے تو پھر اُن کے ہم مسلک اور ہم مشرب بھائی ادریس کاندھلوی بھی نہیں بچ سکے! ربِ جلیل عقلِ سلیم اور فہم صحیح عطا فرمائے!

امام فخر الدین رازی یہ بھی کہتے ہیں کہ اہلِ کتاب (یہود و نصاریٰ) کے نزدیک ابراہیم علیہ السلام کے والد کا نام تارح ہے۔ تو پھر اہلِ کتاب نے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام پر یہ اعتراض کیوں نہیں کیا کہ قرآن نے آزر کو باپ کہا ہے جبکہ اہلِ کتاب کے نزدیک اُن کے باپ کا نام تارح ہے اور آزر ابراہیم علیہ السلام کا چچا تھا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اہلِ کتاب محاوراتِ عرب سے واقف تھے کہ محاوراتِ عرب میں چچا پر باپ کا اطلاق کیا جاتا ہے۔ نیز قرآن مجید میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کو اولادِ یعقوب علیہ السلام کا باپ فرمایا ہے حالانکہ وہ بالاتفاق اُن کے چچا تھے (حوالہ صفحہ سابق ۲۱۸۶ پر موجود ہے) اور اس پر بھی اہلِ کتاب نے اسی وجہ سے اعتراض نہیں کیا تھا ورنہ امام رازی کی تقریر کے مطابق یہودیوں کو اس کی تکذیب کرنی چاہئے تھی۔" (''تبیان القرآن'' ج ۳' ص ۵۶۲)

''ان تمام احادیثِ صحیحہ اور روایاتِ معتبرہ سے معلوم ہوا کہ حضرت آدم علیہ السلام سے حضرت عبداللہ تک نبی علیہ السلام کے نسب میں تمام آباء کرام اپنے اپنے زمانہ کے تمام لوگوں سے خیر اور افضل تھے اور قرآن مجید میں تصریح ہے اور اس پر مسلمانوں کا اجماع بھی ہے کہ مؤمن مشرک سے خیر اور افضل ہے۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ آپ ﷺ کے تمام آباء کرام مؤمن تھے اور مشرک یا بت پرست ہرگز نہیں تھے۔'' (ایضاً' جلد سوم' صفحہ ۵۶۱)

بتوں کی مذمت کے سلسلہ میں ابراہیم علیہ السلام کا جو مناظرہ اپنے چچا آزر سے ہوا' اُس میں آپ نے انتہائی اعلیٰ اخلاقی اقدار' شریفانہ اور انتہائی نرم رویّہ کا اظہار کیا اس کے باوجود کہ آزر کا رویّہ ناگوار اور مکروہ تھا کیونکہ اس نے ابراہیم علیہ السلام کو سخت برہمی میں اور زچ ہو کر یوں سرزنش کی تھی:

أَرَاغِبٌ'' أَنتَ عَنْ آلِهَتِي يَا إِبْرَاهِيمُ لَئِن لَّمْ تَنتَهِ لَأَرْجُمَنَّكَ وَاهْجُرْنِي مَلِيًّاO (مریم : ۴۶)

''اے ابراہیم! کیا تو میرے خداؤں سے بیزار ہے؟ تو اگر اس حرکت سے باز نہ آیا تو میں تجھے ضرور سنگسار کردوں گا اور جا' میرے سامنے سے دُور ہو جا۔'' (۴۶ : ۱۹)

تو اس سخت گیر اور دل آزار گفتگو کے موقع پر بھی ابراہیم علیہ السلام نے پدری رشتہ کی بزرگی کا احترام کیا اور جواب میں صرف اتنا فرمایا:

سَلَامٌ'' عَلَيْكَ سَأَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّي إِنَّهُ' كَانَ بِي حَفِيًّاO (مریم : ۴۷)

''تجھ پر سلامتی ہو' میں عنقریب تیرے لئے اپنے پروردگار سے بخشش چاہوں گا' بلا شبہ وہ مجھ پر بڑا مہربان ہے۔'' (۴۷ : ۱۹)

یہ نرم و ملائم جواب جہاں ایک طرف محبت' ہمدردی اور بخشش کے جذبات سے پُر ہے تو دوسری طرف حق و صداقت کے پیکرِ مجسّم کے غیر متزلزل' پختہ ایمان کا بھی عکاس ہے۔

''مستشرقینِ یورپ کی ہرزہ سرائی : مستشرقینِ یورپ کی ایک جماعت اسلام دشمنی میں یدِطولیٰ رکھتی ہے اور بغض وعناد کی مشتعل آگ میں حقائق و واقعات تک کے انکار پر آمادہ ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اس قسم کے مواقع میں سے کہ جہاں قرآنِ عزیز کے خلاف بے دلیل اُن کی تنقید کی تلوار چلتی رہتی ہے' ایک موقع ابراہیم علیہ السلام کی شخصیت کا بھی ہے۔''

''دائرۃ المعارف الاسلامیہ کی جلد اوّل کے صفحات ۲۷' ۲۸ پر ونسنک (Wensinck) کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ سب سے پہلے اسپرنگر (Sprenger) نے یہ دعویٰ کیا کہ قرآن میں ایک عرصہ تک ابراہیم علیہ السلام کی شخصیت کعبہ کے بانی اور دینِ حنیف کے ہادی کی حیثیت سے روشنی میں نہیں آئی اور عرصہ دراز کے بعد اُن کی شخصیت کو ان صفات کے ساتھ متصف ظاہر کیا گیا ہے اور اُن کی ذات کی خاص اہمیت نظر آتی ہے۔ چونکہ یہ دعویٰ اپنی اجمالی تعبیر کے لحاظ سے ابھی تشنہ تکمیل تھا اس لئے ایک طویل زمانہ کے بعد اسپرنگر کے اس دعویٰ کو سنوگ ہیکر وغیرہ نے بڑے شرح وبسط کے ساتھ پیش کیا اور اپنے مزعومہ دلائل کے ذریعے اس کو خاص آب و رنگ سے رنگین بنایا۔ اُس نے کہا:

''قرآن میں جس قدر مکی آیات اور سورتیں ہیں' اُن میں کسی ایک مقام پر بھی اسمٰعیل (علیہ السلام) کا ابراہیم (علیہ السلام) کے ساتھ رشتہ نظر نہیں آتا اور نہ ان کو اولِ مسلمین بتایا گیا ہے بلکہ وہ صرف ایک نبی اور پیغمبر کی حیثیت سے نظر آتے ہیں۔ اُن کے تذکرہ کی ایک آیت بھی ایسی نہیں جو اُنہیں مؤسسِ کعبہ' اسمٰعیل علیہ السلام کا باپ' عرب کا پیغمبر و ہادی اور ملتِ حنیفی کا داعی' ظاہر کرتی ہو۔ سورۃ الذاریات' الحجر' الصافات' الانعام' ھود' مریم' انبیاء اور عنکبوت جو سب مکی سورتیں ہیں ہمارے اس دعویٰ کی شاہد ہیں۔ اس سے صاف نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ محمد (ﷺ) سے پہلے سرزمینِ عرب میں کوئی نبی نہیں آیا اور یہی پہلے شخص ہیں جنہوں نے نبوّت کا دعویٰ کیا۔ البتہ جب محمد (ﷺ) کی مدنی زندگی شروع ہوتی ہے تو مدنی سورتوں میں حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے ذکر کے وقت یہ تمام خصوصیات نمایاں کی جاتی اور اہمیت کے ساتھ روشنی میں لائی جاتی ہیں۔''

''اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ مکی زندگی میں محمد (ﷺ) اپنے تمام امور میں یہود پر اعتماد رکھتے اور اُنہی کے طور طریقوں کو پسند فرماتے تھے لہٰذا اُس وقت تک ابراہیم (علیہ السلام) کی شخصیت کو بھی اُنہوں نے اُسی نظر سے دیکھا جس نظر سے یہود دیکھتے تھے لیکن جب مدینہ پہنچ کر اُنہوں نے یہود کو اپنے مشن ''اسلام'' کی دعوت دی تو اُنہوں نے قبول کرنے سے انکار کر دیا اور وہ آپ کے دشمن ہو گئے۔ اب محمد (ﷺ) نے فکر و تامل کیا اور خوب سوچا۔ آخر اُن کی ذکاوت اور جودتِ طبع نے رہنمائی کی اور انہوں نے عرب کے لئے یہود کی یہودیت سے جدا ایک ایسے دین کی بنیاد ڈالی جسے یہودیتِ ابراہیمی کہنا چاہئے۔ لہٰذا اس سلسلہ کی تکمیل کے لئے قرآن کی مدنی سورتوں میں ابراہیم (علیہ السلام) کی شخصیت کو اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ وہ ملتِ حنیفی کے داعی' عرب کے پیغمبر' اسمٰعیل کے والد' کعبہ کے مؤسس نظر آتے ہیں۔''

''یہ ہے وہ دعویٰ اور اس کی دلیل جو اسپرنگر، سنوک اور وینسنک جیسے اسلام دشمن مستشرقین کی جانب سے محض اس لئے اختراع کئے گئے ہیں کہ اس قسم کی لچر بنیادوں پر مسیحیت کی برتری اور اسلام کی تحقیر کی عمارت تیار ہو سکے اور یہ کہ ابراہیم علیہ السلام کے متعلق یہ ثابت کیا جائے کہ اُن کا عرب کے ساتھ نہ نسلی تعلق ہے اور نہ دینی لیکن جب ایک مؤرخ اور ایک نقاد مستشرقین کے اس دعویٰ اور دعویٰ کے دلائل کو صرف تاریخی اور تنقیدی حیثیت سے دیکھتا ہے تب بھی اُسے یہ صاف نظر آتا ہے کہ یہ جو کچھ کہا گیا ہے، حقائق اور واقعات سے قطعاً چشم پوشی کر کے محض عداوت اور بغض وعناد کی راہ سے بے دلیل کہا گیا ہے۔ اس لئے کہ اس سلسلہ میں سب سے بڑی دلیل یہ پیش کی گئی ہے کہ مکی سورتوں میں حضرت ابراہیم کے متعلق وہ اوصاف نظر نہیں آتے جو مدنی آیات میں پائے جاتے ہیں۔ مگر افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ یہ سرتاسر غلط بلکہ قصد و ارادہ کے ساتھ علمی بددیانتی ہے کہ مکی سورتوں میں سے صرف اُنہی کا حوالہ دیا گیا ہے جن میں ابراہیم علیہ السلام کو فقط ایک پیغمبر کی صورت مین ظاہر کیا گیا ہے۔ لیکن وہ مکی سورت جو ابراہیم علیہ السلام کی شخصیت کو ہمہ حیثیت سے نمایاں کرنے کے لئے ان کے نام ہی سے مَعنُون کر کے نازل کی گئی یعنی سورہ ابراہیم، اُسے نظر انداز کر دیا گیا تا کہ قرآنِ عزیز سے براہِ راست فائدہ نہ اٹھا سکنے والے حضرات کے سامنے جہالت کا پردہ پڑا رہے اور اُن کی کورانہ تقلید میں وہ اُن کے غلط دعوے کو صحیح سمجھتے رہیں۔''

سورہ ابراہیم مکی ہے۔ اُس کی آیات کا نزول ہجرت سے قبل مکہ ہی میں ہوا ہے اور وہ حسب ذیل حقائق کا اعلان کرتی ہے:

(۱) حضرت ابراہیم علیہ السلام عرب (حجاز) کے اندر قیام پذیر ہیں اور اللہ کے رسول کی حیثیت سے خود کو اور اپنی اولاد کو بت پرستی سے بچنے اور اُس مقام کو امنِ عالم کا مرکز بنانے کی دعا کر رہے ہیں:

رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ آمِنًا وَّاجْنُبْنِيْ وَبَنِيَّ أَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ ○ (ابراهيم: ۳۵)

''اے پروردگار! اس شہر (مکہ) کو تو امن کا مرکز بنا اور مجھ کو اور میری اولاد کو بتوں کی پرستش سے دور رکھ۔''

(۲) ابراہیم علیہ السلام اقرار کرتے ہیں کہ سرزمینِ حجاز (جو عرب کا قلب ہے) اُن ہی کی اولاد سے آباد ہوئی اور اُنہوں نے ہی اُسے بسایا ہے اور وہی اس چٹیل میدان میں بیت الحرام (کعبہ) کے مؤسس ہیں:

رَبَّنَا اِنِّيْ أَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ أَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْ اِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ ○ ابراهيم: ۳۷)

''اے ہمارے پروردگار! بے شک میں نے اپنی بعض اولاد کو اس بن کھیتی کی سرزمین میں تیرے گھر (کعبہ) کے نزدیک آباد کیا ہے۔ اے ہمارے پروردگار! یہ اس لئے تا کہ وہ نماز قائم کریں پس تو لوگوں میں سے کچھ کے دل اس طرف پھیر دے کہ وہ (اس کعبہ کی بدولت) ان کی جانب مائل ہوں اور اُنہیں پھلوں سے رزق عطا کرتا کہ وہ شکر گزار بنیں۔'' (۳۷ : ۱۴)

(۳) حضرت ابراہیم علیہ السلام والد ہیں حضرات اسمٰعیل و اسحٰق علیہما السلام کے اور یہی اسمٰعیل علیہ السلام اہلِ عرب کے باپ ہیں اور حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے اور اپنی اولاد کے لئے ملّتِ حنفی کے شعار ''صلٰوۃ'' کی بہ ایں الفاظ دعا کر رہے ہیں:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ وَهَبَ لِیْ عَلَی الْكِبَرِ اِسْمٰعِیْلَ وَ اِسْحٰقَ اِنَّ رَبِّیْ لَسَمِیْعُ الدُّعَآءِ O رَبِّ اجْعَلْنِیْ مُقِیْمَ الصَّلٰوةِ وَمِنْ ذُرِّیَّتِیْ رَبَّنَاوَتَقَبَّلْ دُعَآءِO رَبَّنَااغْفِرْلِیْ وَلِوَالِدَیَّ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ یَوْمَ یَقُوْمُ الْحِسَابُO (ابراهیم : ۳۹ تا ۴۱)

''سب تعریف اللہ کے لئے ہے جس نے مجھے بڑھاپے میں اسمٰعیل اور اسحٰق بخشے۔ بلاشبہ میرا پالنہار دعا کا ضرور سننے والا ہے۔اے پروردگار! مجھے اور میری اولاد کو نماز قائم کرنے والا بنا دے۔اے ہمارے پروردگار! ہماری دعا سن لے۔اے ہمارے پروردگار! تو مجھے اور میرے والدین کو اور کُل مؤمنوں کو قیامِ حساب (قیامت) کے دن بخش دینا۔'' (۳۹ تا ۴۱ : ۱۴)

عَلَی الْكِبَرِ توریت میں ہے کہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی ولادت کے وقت جناب ابراہیم علیہ السلام کی عمر ۸۴ سال تھی (پیدائش ۱۶ : ۱۶) اور حضرت اسحٰق علیہ السلام کی ولادت کے وقت ۱۰۰ سال تھی (پیدائش ۲۱ : ۵)۔

اِن آیات کا مطالعہ کرنے کے بعد کیا ایک لمحہ کے لئے بھی کسی شخص کو یہ جرأت ہو سکتی ہے کہ وہ ان لغو اور بے سروپا دعووں کی تصدیق کرے جن کو مستشرقینِ یورپ نے اپنی جہالت یا ارادی جھوٹ کے ساتھ علمی تنقید کا عنوان دیا ہے۔ کیا یہ آیات مکی نہیں ہیں اور کیا ان سے وہ سب کچھ ثابت نہیں ہوتا جو مدنی آیات میں مذکور ہے؟

(۴) اسی طرح سورہ ابراہیم کے علاوہ سورہ اَنعام اور سورۃ النحل بھی مکی سورتیں ہیں۔ان میں بصراحت موجود ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام شرک کے مقابلے میں ملّتِ حنفی کے داعی ہیں اور اُن کی شخصیت اس دعوت میں بہت نمایاں اور ممتاز ہے:۔

(i) اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَO (الانعام : ۷۹)

''یقیناً میں نے تو اپنا رخ یکسو ہو کر اُس کی طرف کر لیا ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے اور میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں۔'' (۷۹ : ۶)

(ii) قُلْ اِنَّنِیْ هَدٰىنِیْ رَبِّیْ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ دِیْنًا قِیَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَO (الانعام : ۱۶۱)

''آپ کہہ دیجئے کہ مجھے میرے پروردگار نے ایک سیدھا راستہ بتا دیا ہے ایک دینِ مستحکم' طریقۂ ابراہیم راست رَو کا اور وہ مشرکین میں سے نہ تھے۔'' (۱۶۱ : ۶)

(iii) اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِيْفًا وَلَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ O (النَّحل: ۱۲۰)

"بے شک ابراہیم (علیہ السلام) بڑے مقتدا اور اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار اور اُس کی طرف یک رخ رہنے والے تھے اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھے۔" (۱۲۰ : ۱۶)

(iv) ثُمَّ اَوْحَيْنَا اِلَيْكَ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ O (النَّحل: ۱۲۳)

"پھر ہم نے آپ کی طرف وحی بھیجی کہ ابراہیم (علیہ السلام) کے طریقہ پر چلئے جو بالکل ایک رخ کے تھے اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھے۔" (۱۲۳ : ۱۶)

"تو کیا ان واضح آیات کے بعد بھی ان دلائل کو دلائل کہنا کوئی حقیقت رکھتا ہے جو اس سلسلہ میں سنوک اور اُس کے ہمنواؤں نے بیان کئے ہیں؟ مکّی سورتیں ہوں یا مدنی' دونوں جگہ ابراہیم علیہ السلام کی شخصیت ایک ہی طرح نمایاں نظر آتی ہے۔ وہ دونوں حالتوں میں ملتِ حنیفی کے داعی' حضرت اسمٰعیل علیہ السلام اور عرب کے باپ' کعبہ کے مؤسّس و بانی اور عرب کے ہادی ہیں اور اس لئے مستشرقینِ یورپ کا یہ کہنا کہ ابراہیم علیہ السلام کی شخصیت قرآنِ عزیز کی مکّی اور مدنی آیات میں دو جدا جدا صورتوں میں نظر آتی ہے' کذب اور صریح بہتان ہے۔ نیز یہ بھی خلافِ واقعہ ہے کہ عرب میں رسول اکرم ﷺ کے دعوائے نبوت سے قبل کوئی بھی پیغمبر نہیں گزرا اس لئے کہ ابراہیم و اسمٰعیل' ہود و صالح علیہم السلام اِسی سرزمین کے ہادی و پیغمبر ہیں۔"

"اِن مدّعیانِ علم کو تعصب نے ایسا نادان بنا دیا کہ قرآن اور صاحبِ قرآن ﷺ پر اعتراض کرتے وقت اُنہیں یہ خیال بھی نہ رہا کہ اس قسم کے دعوے سے ہم صرف قرآن ہی کی نہیں بلکہ بائبل (تورات) کی بھی تکذیب کر رہے ہیں۔ اس لئے کہ تورات میں تصریح ہے کہ اسمٰعیل' ابراہیم علیہ السلام کے بیٹے ہیں اور اسمٰعیل علیہ السلام ہی عرب کے باپ ہیں اور ابراہیم علیہ السلام کی اسی اولاد سے حجاز کی سرزمین آباد ہوئی اور یہ دونوں باپ بیٹا عرب کی نمایاں شخصیتیں ہیں۔"

"نیز یہ الزام بھی قطعاً بے بنیاد اور لغو ہے کہ مکہ کی زندگی میں رسولِ اکرم ﷺ نے یہود اور اُن کے مذہبی امور کی تقلید کی اور جب مدینہ میں پہنچ کر یہود کے انکار اور اُن کے مخالفانہ جذبہ کو دیکھا تو یہود سے الگ ایک نئی یہودیت کی بنیاد ڈالی اور اُسے ملتِ ابراہیمی کا لقب دیا۔ اس لئے کہ مکہ کی زندگی میں تو یہود سے آپ کا سابقہ ہی نہیں پڑا تو پھر مخالفت و موافقت یا اتباع کا سوال ہی کیا' البتہ مدینہ منوّرہ میں آ کر آپ نے مشرکین کے مقابلہ میں یہود کی جانب زیادہ توجہ فرمائی اور یہ اس لئے کہ وہ اسلام کے عقیدہ کے مطابق دینِ موسوی کے پیرو تھے اگرچہ اس میں تحریف ہو چکی تھی مگر وہ مشرکین کے خلاف توحید کے قائل تھے اور اُن کی محرّف کتابوں میں تحریف کے بعد بھی بہت سے ایسے جملے موجود تھے جو نبیِ اکرم ﷺ کی بعثت و رسالت کے شاہد اور گواہ ہیں اور اُن سے آپ کے حق میں بشارات نکلتی ہیں۔ نیز بہت سے وہ احکام بھی موجود تھے جو صحیح معنی میں وحیِ الٰہی کی حیثیت رکھتے ہیں اور دینِ موسوی کی اساس و بنیاد رہے ہیں۔ اس لئے آپ کو خیال تھا کہ یہ مشرکین کے مقابلہ میں جلد ہی ملتِ ابراہیمی یعنی اسلام قبول

کرلیں گے۔لیکن جب آپ نے اُن کے انکار اور بغض وحسد کا تجربہ کرلیا تو پھر اُن کے ساتھ بھی آپ کا معاملہ وہی ہو گیا جو مشرکین کے ساتھ تھا اور بمصداق اَلْکُفْرُ مِلَّۃٌ وَّاحِدَۃٌ" (کفر سب ایک ہی ملت ہے) آپ نے اُن سب کو ایک ہی حیثیت میں رکھا۔"

"اسپرنگر، سنوک اور اُن کے ہمنوا اتنی صاف بات سمجھنے سے بھی قاصر ہیں یا عمداً سمجھنا نہیں چاہتے کہ جبکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام، اسرائیل (یعقوب) علیہ السلام کے دادا تھے اور یہود اپنے دین کی نسبت حضرت اسرائیل علیہ السلام کی جانب کرتے اور بنی اسرائیل ہونے کی حیثیت سے اس پر فخر کرتے تھے تو اُن کا یہ کہنا کہ ابراہیم بھی یہودی تھے' کس قدر مضحکہ خیز تھا۔کیا پوتے کے دین کے متعلق کسی طرح یہ کہنا درست ہوسکتا ہے کہ عرصہ دراز کے گزرے ہوئے دادا کا دین پوتے کے دین کے تابع تھا؟ اس حقیقت کو واضح کرنے کے لئے قرآنِ عزیز نے یہ اعلان کیا :

مَا کَانَ اِبْرٰھِیْمُ یَھُوْدِیًّا وَّلَانَصْرَانِیًّا وَّلٰکِنْ کَانَ حَنِیْفًا مُّسْلِمًا (آلِ عمران : ۶۷)

"ابراہیم (علیہ السلام) نہ تو یہودی تھے اور نہ ہی نصرانی' البتہ وہ ایک خدا کی جانب جھکنے والے مسلمان تھے۔" (۳ : ۶۷)

"مگر ان کور چشموں نے اس کے معنی یہ لئے کہ نبی اکرم ﷺ مکہ میں تو یہود کے دین پر تھے لیکن مدینہ جا کر جب یہود نے اُنہیں پیغمبر ماننے سے انکار کردیا تو یہود کے دین کے مقابلہ میں ذکاوتِ طبع سے یہودیتِ ابراہیمی ایجاد کرلی۔سُبْحٰنَکَ ھٰذَا بُھْتَانٌ عَظِیْمٌ"

"سنوک اور اُس کے ہمنواؤں نے اس دعویٰ کی دلیل میں کہ نبی اکرم ﷺ سے پہلے عرب میں کوئی پیغمبر نہیں گزرا' قرآنِ عزیز کی اس آیت کو بھی پیش کیا ہے :

لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّا اَتَاھُمْ مِّنْ نَّذِیْرٍ مِّنْ قَبْلِكَ (القصص : ۴۶)

"تاکہ آپ ایسے لوگوں کو ڈرائیں جن کے پاس آپ سے پہلے کوئی ڈرانے والا نہیں آیا۔" (۲۸:۴۶)

"وہ کہتے ہیں کہ اگر ابراہیم واسمٰعیل علیہما السلام عرب کے پیغمبر ہوتے تو قرآنِ عزیز اُمّتِ عربیہ کے متعلق اس طرح محمد (ﷺ) سے خطاب نہ کرتا۔مگر یہ بھی ایک سخت مغالطہ ہے جو قرآنِ عزیز کے طرزِ خطابت' اسلوبِ بیان اور باطل پرستوں کی باطل پرستی کے خلاف دلائل کی ترتیب سے ناواقفیت کی بناء پر پیدا ہوا ہے یا گزشتہ اعتراضات کی طرح محض بغض وعناد کی خاطر اختیار کیا گیا ہے۔"

"مستشرقین کی طرف سے سورۃ القصص کی پیش کردہ آیت ۴۶ بالا کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ سرزمینِ عرب (حجاز) ہمیشہ سے اللہ کے نبی اور پیغمبر کے وجود سے محروم ہے اور اس ملک میں نبی اکرم ﷺ کی آواز سب سے پہلی آواز ہے۔ قرآنِ عزیز ایسی خلافِ حقیقت بات کیسے کہہ سکتا تھا جبکہ سورہ ابراہیم' الانعام اور النمل کی آیات

میں حضرت ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام کے عربی ہونے کی صاف اور صریح شہادتیں موجود ہیں جن کا حوالہ ابھی اوپر دیا جا چکا ہے۔ بلاشبہ قرآنِ عزیز اس قسم کے تضاد اور اختلاف سے قطعاً بَری ہے کہ ایک جگہ وہ ایک بات کا انکار کرے اور دوسری جگہ اُسی بات کا اقرار کرے۔

سورۂ القصص کی زیرِ نظر آیت ۴۶ کا مطلب اگر یوں بیان کیا جائے تو آیت کے سمجھنے میں کوئی اشکال باقی نہیں رہتا۔ فرمایا: ہم نے آپ کو اس قوم میں مبعوث فرمایا جس میں اسماعیل علیہ السلام کے وقت سے لے کر اب تک کے عرصہ دراز میں کوئی نبی اور نذیر (ڈرانے والا) نہیں آیا تھا۔ ہدایت کی روشنی مدت سے ناپید تھی، ہر طرف کفر و جہالت کی تاریکی پھیلی ہوئی تھی تاکہ آپ اُنہیں عذاب الٰہی سے بروقت ڈرائیں۔

لہٰذا قرآن عزیز کے خلاف سنوک، اسپرنگر اور وینسنک کے یہ تمام دعاوی اور اُن کے دلائل تاریخی حقائق اور واقعات کی روشنی میں قطعاً باطل اور محض افترا ہیں اور اُن کے طرزِ عمل سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ اور اس قسم کے دوسرے ناقدین قرآنِ عزیز پر علمی دیانت کے ساتھ تنقید نہیں کرتے اور نہ اُن کی فہم اور سمجھ کا قصور ہے بلکہ اس کے برعکس وہ علمی بددیانتی سے کام لے کر قرآن کے خلاف زہر اگلتے، غلط الزام قائم کرتے اور صریح اور واضح مسائل میں اپنے پیشِ نظر مقاصد کے مطابق تخلک پیدا کر کے ناواقف دنیا کو گمراہ کرتے ہیں بلکہ اس قسم کے الزامات سے اُن کا صرف ایک ہی مقصد ہوسکتا ہے جسے قرآن عزیز نے اس قسم کے معاندین کے لئے ایک مستقل قانون کی طرح واضح کردیا ہے:

وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ سَوَآءً (النساء : ۸۹)

''یہ (منکرینِ قرآن و اسلام) تو دل سے چاہتے ہیں کہ کاش تم بھی اُنہی کی طرح منکر بن جاؤ تاکہ وہ اور تم (سب) برابر ہو جاؤ۔'' (۴ : ۸۹)

''بہرحال قرآنِ حکیم کی مسطورہ بالا زیرِ بحث آیت کا مطلب صاف اور واضح ہے اور اُس کے درمیان اور الانعام، ابراھیم اور النّحل جیسی سورتوں میں ابراہیم علیہ السلام کے پیغمبرِ عرب ہونے کے درمیان قطعاً کوئی تضاد اور اختلاف نہیں ہے۔ اس پیش کردہ تفصیل و تشریح کے علاوہ عام مفسرین نے اس قسم کی آیات کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ یہ خطاب صرف اُنہی لوگوں سے متعلق ہے جو نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں موجود تھے۔ اُن کے گزشتہ آباء و اجداد اور گزشتہ تاریخ عرب سے اس خطاب کا کوئی تعلق نہیں ہے۔'' (''قصص القرآن''۔ حفظ الرحمٰن سیوہاروی، ج ۱، ص ص ۱۵۱ تا ۱۶۷ ملخصًا)

''ابراہیم علیہ السلام کا ذکر قرآنِ حکیم میں: قرآنِ عزیز کے رشد و ہدایت کا پیغام چونکہ ملّتِ ابراہیمی کا پیغام ہے اس لئے اُس نے جگہ جگہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر کیا ہے اور جیسا کہ گزشتہ سطور میں کہا جا چکا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کا ذکر مکّی اور مدنی دونوں قسم کی سورتوں میں موجود ہے، صفحہ آئندہ کی جدول اُن تمام سورتوں اور آیتوں کو ظاہر کرتی ہے:

(۱) سورۃ البقرۃ (۲) آیات ۱۲۴ تا ۱۲۷، ۱۳۰، ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۴۰۔ = ۱۰
(۲) سورہ آلِ عمران (۳) آیات ۳۳، ۳۵، ۶۷، ۶۸، ۸۴، ۹۵، ۹۷۔ = ۷
(۳) سورۃ النساء (۴) آیات ۵۴، ۱۲۵، ۱۶۳۔ = ۳
(۴) سورۃ الانعام (۶) آیات ۷۴، ۷۵، ۸۳، ۱۶۱۔ = ۴
(۵) سورۃ التوبۃ (۹) آیات ۷۰، ۱۱۴۔ = ۲
(۶) سورہ ھود (۱۱) آیات ۶۹، ۷۴، ۷۵، ۷۶۔ = ۴
(۷) سورہ یوسُف (۱۲) آیات ۶، ۳۸۔ = ۲
(۸) سورہ ابراھیم (۱۴) آیت ۳۶۔ = ۱
(۹) سورہ اَلحِجر (۱۵) آیت ۵۱۔ = ۱
(۱۰) سورۃ النَّحل (۱۶) آیات ۱۲۰، ۱۲۳۔ = ۲
(۱۱) سورہ مریم (۱۹) آیات ۴۱، ۵۸۔ = ۲
(۱۲) سورۃ الانبیاء (۲۱) آیات ۵۱، ۶۰، ۶۲، ۶۹، ۷۲۔ = ۵
(۱۳) سورۃ الحج (۲۲) آیات ۲۶، ۴۳، ۷۸۔ = ۳
(۱۴) سورۃ الشعراء (۲۶) آیت ۷۰۔ = ۱
(۱۵) سورۃ العنکبوت (۲۹) آیات ۱۶، ۳۱۔ = ۲
(۱۶) سورۃ الِاحزاب (۳۳) آیت ۷۔ = ۱
(۱۷) سورۃ الصَّافَّات (۳۷) آیات ۸۳، ۱۰۴، ۱۰۹۔ = ۳
(۱۸) سورہ صٓ (۳۸) آیت ۴۵۔ = ۱
(۱۹) سورۃ الشُّوریٰ (۴۲) آیت ۱۳۔ = ۱
(۲۰) سورۃ الزُّخرُف (۴۳) آیت ۲۶۔ = ۱
(۲۱) سورہ اَلذّاریٰت (۵۱) آیت ۲۴۔ = ۱
(۲۲) سورہ اَلنَّجم (۵۳) آیت ۳۷۔ = ۱
(۲۳) سورۃ الحدید (۵۷) آیت ۲۶۔ = ۱
(۲۴) سورہ اَلمُمتَحِنہ (۶۰) آیت ۴۔ = ۱
(۲۵) سورۃ الاعلیٰ (۸۷) آیت ۱۹۔ = ۱

سورتوں کا مجموعہ = ۲۵ — آیات کا مجموعہ = ۶۱

جناب ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ کے ساتھ چند انبیاء علیہم السلام کے واقعات بھی وابستہ ہیں مثلاً حضرت لوط علیہ السلام کا واقعہ اس لئے کہ وہ ابراہیم علیہ السلام کے بھتیجے بھی ہیں اور اُن کے پیرو بھی۔ اسی طرح اُن کے صاحبزادوں حضرات اسمٰعیل و اسحٰق علیہما السلام کے واقعات بھی اُن سے وابستہ ہیں۔

''ابراہیم علیہ السلام کی عمر مبارک: تورات کے مطابق ابراہیم علیہ السلام کی عمر اپنے پہلے لڑکے جناب اسمٰعیل علیہ السلام کی ولادت کے وقت ۸۷ برس تھی اور دوسرے لڑکے حضرت اسحٰق علیہ السلام کی پیدائش کے وقت ۱۰۰ برس تھی۔ آپ کی کل عمر ایک سو پچھتر (۱۷۵) سال ہوئی۔'' (''قصص القرآن''۔ حفظ الرحمٰن سیوہاروی' ج ۱' ص ۱۶۸)

''ابراہیم علیہ السلام کا مسکن اور آپ کی عظمت: تورات یہ بتاتی ہے کہ ابراہیم (علیہ السلام) عراق کے قصبہ ''اُور'' کے باشندے اور اہلِ فدّ ان میں سے تھے۔ اُن کی قوم بت پرست تھی اور انجیل برنا باس میں تصریح ہے کہ اُن کے والد بڑھئی کا پیشہ کرتے تھے اور اپنی قوم کے مختلف قبائل کے لئے لکڑی کے بت بناتے اور فروخت کیا کرتے تھے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو شروع ہی سے حق کی بصیرت اور رشد و ہدایت عطا فرمائی تھی اور آپ یہ یقین رکھتے تھے کہ بت نہ سن سکتے ہیں اور نہ کسی کی پکار کا جواب دے سکتے ہیں اور نہ ہی کسی کے نفع و نقصان سے اُن کا کوئی واسطہ ہے۔''

آپ کی بعثت: قرآن ابراہیم علیہ السلام کی اس حقیقت بیں اور بصیرت افروز رشد و ہدایت کا یوں ذکر کرتا ہے:

وَلَقَدْ آتَيْنَا إِبْرٰهِيمَ رُشْدَهُ مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا بِهِ عَالِمِينَ ○ إِذْ قَالَ لِأَبِيهِ وَقَوْمِهِ مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيلُ الَّتِي أَنْتُمْ لَهَا عَاكِفُونَ ○ قَالُوا وَجَدْنَا آبَاءَنَا لَهَا عَابِدِينَ ○ قَالَ لَقَدْ كُنْتُمْ أَنْتُمْ وَآبَاؤُكُمْ فِي ضَلَالٍ مُبِينٍ ○ قَالُوا أَجِئْتَنَا بِالْحَقِّ أَمْ أَنْتَ مِنَ اللّٰعِبِينَ ○ قَالَ بَلْ رَبُّكُمْ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ الَّذِي فَطَرَهُنَّ وَأَنَا عَلٰى ذٰلِكُمْ مِنَ الشّٰهِدِينَ ○ (الانبیاء : ۵۱ تا ۵۶)

''اور بلاشبہ ہم نے ابراہیم کو شروع ہی سے رشد و ہدایت عطا کر دی تھی اور ہم ان کے (معاملہ) کے جاننے والے تھے۔ جب آپ نے اپنے چچا اور اپنی قوم سے کہا کہ یہ مجسمے کیا ہیں جن پر تم جمے بیٹھے ہو۔ وہ بولے: ہم نے اپنے باپ دادا کو انہی کی پوجا کرتے پایا ہے۔ آپ نے کہا: بلاشبہ تم اور تمہارے باپ دادا کھلی گمراہی میں مبتلا رہے۔ اُنہوں نے کہا کیا تو ہمارے لئے کوئی حق بات لایا ہے یا دل لگی ہی کر رہے ہو؟ آپ نے کہا: (یہ بت تمہارے رب نہیں ہیں) بلکہ تمہارا پروردگار زمینوں اور آسمانوں کا پروردگار ہے جس نے ان سب کو پیدا کیا ہے اور میں اس پر گواہوں میں سے ہوں۔'' (۲۱ : ۵۱ تا ۵۶)

قوم کو پیغامِ حق دیتے ہوئے آپ نے فرمایا: اے قوم! یہ کیا ہے کہ تم اپنے ہاتھ سے بنائے ہوئے بتوں کی پوجا میں مشغول ہو۔ یہ تمہاری کس قدر نادانی ہے کہ جس بے جان لکڑی کو اپنے ہاتھوں اور آلات سے گھڑ کر تم مجسمے تیار کرتے ہو اور اگر وہ مرضی کے مطابق نہیں بنتے تو اُنہیں توڑ کر دوسرے بنا لیتے ہو اور بنا لینے کے بعد پھر اُنہی کو پوجتے اور نفع و نقصان کا مالک سمجھنے لگتے ہو۔ تم اس خرافات سے رک جاؤ' اپنے خالق و مالک اللہ کی توحید کے نغمے گاؤ اور اُسی کے سامنے اپنا سرِ نیاز جھکاؤ۔ مگر قوم نے آپ کی آواز پر مطلق کان نہ دھرا بلکہ دعوتِ حق کا مذاق اڑایا۔

''چچا کو دعوتِ اسلام اور چچا بھتیجے کا مناظرہ: ابراہیم علیہ السلام دیکھ رہے تھے کہ شرک کا سب سے بڑا مرکز خود اُن کے اپنے گھر میں قائم ہے اور آزر کی بت سازی اور بت پرستی پوری قوم کے لئے مرجع و محور بن ہوئی ہے۔

اس لئے فطرت کا تقاضا ہے کہ دعوتِ حق اور پیغامِ صداقت کے ادائے فرض کی ابتدا گھر ہی سے ہونی چاہئے۔اس لئے ابراہیم علیہ السلام نے سب سے پہلے اپنے چچا ''آزر'' ہی کو مخاطب کیا۔سورہ مریم میں اس واقعہ کو یوں بیان کیا گیا ہے:

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِبْرٰهِيْمَ اِنَّه' كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّاO اِذْقَالَ لِاَبِيْهِ يٰاَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَايَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِيْ عَنْكَ شَيْئًاO يٰاَبَتِ اِنِّيْ قَدْجَآءَ نِيْ مِنَ الْعِلْمِ مَالَمْ يَاْتِكَ فَاتَّبِعْنِيْ اَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّاO يٰاَبَتِ لَاتَعْبُدِالشَّيْطٰنَ اِنَّ الشَّيْطٰنَ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ عَصِيًّاO يٰاَبَتِ اِنِّيْ اَخَافُ اَنْ يَّمَسَّكَ عَذَابٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ فَتَكُوْنَ لِلشَّيْطٰنِ وَلِيًّاO قَالَ اَرَاغِبٌ اَنْتَ عَنْ اٰلِهَتِيْ يٰا اِبْرٰهِيْمُ لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّكَ وَاهْجُرْنِيْ مَلِيًّاO قَالَ سَلَامٌ عَلَيْكَ سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّيْ اِنَّه' كَانَ بِيْ حَفِيًّاO وَاَعْتَزِلُكُمْ وَمَا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَاَدْعُوْا رَبِّيْ عَسٰى اَلَّا اَكُوْنَ بِدُعَآءِ رَبِّيْ شَقِيًّاO (مریم : ۴۱ تا ۴۸)

''اور آپ (اس) کتاب میں ابراہیم کا ذکر کیجئے' وہ بڑے راستی والے تھے نبی تھے۔ (وہ وقت یاد کرنے کے قابل ہے) جب اُنہوں نے اپنے چچا سے کہا تھا کہ اے چچا! آپ ایسی چیز کی پوجا کیوں کرتے ہیں جو نہ سنے نہ دیکھے اور نہ آپ کے کچھ کام آئے؟ اے میرے چچا! میرے پاس وہ علم آچکا ہے جو آپ کے پاس نہیں آیا' سو آپ میری پیروی کیجئے میں آپ کو سیدھا راستہ بتادوں گا۔ اے چچا! آپ شیطان کی پرستش نہ کیجئے' شیطان بے شک خدائے رحمٰن کا نافرمان ہے۔اے چچا! مجھے اندیشہ ہے کہ آپ پر خدائے رحمٰن کی طرف سے عذاب آ پڑے تو آپ شیطان کے ساتھی بن جائیں۔(آزر نے) کہا: تو کیا اے ابراہیم! تم میرے معبودوں سے پھر گئے ہو؟ اگر تم باز نہ آئے تو میں تمہیں سنگسار کرڈالوں گا اور مجھے تو ایک مدت کے لئے چھوڑ ہی دو۔ ابراہیم بولے: آپ پر میرا سلام ہو' آپ کے لئے میں اپنے پروردگار سے بخشش کی درخواست کروں' بے شک وہ مجھ پر بہت مہربان ہے۔اور میں تم لوگوں سے اور اُن سے بھی کنارہ کرتا ہوں جنہیں تم اللہ کے سوا پکارتے ہو اور میں تو اپنے رب ہی کو پکاروں گا کہ میں اپنے رب کو پکار کر محروم نہ رہوں گا۔'' (۴۱ تا ۴۸ : ۱۹)

اور سورۃُ الانعام (۶) میں آزر کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نصیحت کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے:۔

وَاِذْقَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِاَبِيْهِ اٰزَرَ اَتَتَّخِذُ اَصْنَامًا اٰلِهَةً اِنِّيْ اَرٰكَ وَقَوْمَكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍO

''اور جب ابراہیم نے اپنے چچا آزر سے کہا کہ کیا تم بتوں کو معبود قرار دیتے ہو؟ بے شک میں تو تمہیں اور تمہاری قوم کو کھلی ہوئی گمراہی میں (مبتلا) دیکھتا ہوں۔'' (۷۴ : ۶)

''<u>قوم کو دعوتِ اسلام اور اس سے مناظرہ</u> : چچا اور بھتیجے کے درمیان جب اتفاق کی کوئی صورت نہ بنی اور آزر نے کسی طرح ابراہیم علیہ السلام کی رُشد و ہدایت کو قبول نہ کیا تو ابراہیم علیہ السلام نے آزر سے جدائی اختیار کرلی اور اپنی دعوتِ حق اور پیغامِ رسالت کو وسیع کردیا اور اب صرف آزر ہی مخاطب نہ رہا بلکہ پوری قوم کو مخاطب بنالیا۔مگر قوم اپنے باپ دادا کے دین کو کب چھوڑنے والی تھی۔اُس نے ابراہیم علیہ السلام کی ایک نہ سنی اور دعوتِ حق کے سامنے اپنے باطل معبودوں کی طرح گونگے' اندھے اور بہرے بن گئے۔''

ابراہیم علیہ السلام کی قوم بت پرستی کے ساتھ ساتھ کواکب (ستارہ) پرستی میں بھی مبتلا تھی اور اُن کا یہ عقیدہ تھا کہ انسانوں کی موت وحیات، اُن کا رزق، اُن کا نفع وضرر، خشک سالی اور قحط سالی، فتح وشکست، غرض تمام کارخانہِ عالم کا نظم ونسق ستاروں اور اُن کی حرکات کی تاثیر پر چل رہا ہے۔ اس لئے اُن کی خوشنودی ضروری ہے جو اُن کی پرستش کے بغیر ممکن نہیں۔ چنانچہ ابراہیم علیہ السلام نے ضروری سمجھا کہ اُن کے ان (علوی) معبودانِ باطل کی بے ثباتی اور فنا کے منظر کو پیش کر کے اس حقیقت سے بھی آگاہ کر دیں کہ تمہارا یہ خیال قطعاً غلط ہے کہ ان چمکتے ہوئے ستاروں، چاند اور سورج کو خدائی طاقت حاصل ہے، ہرگز نہیں۔ مگر یہ باطل پرست جبکہ اپنے خود ساختہ بتوں سے اس قدر خائف تھے کہ اُنہیں برا کہنے والے کے لئے ہر آن یہ تصور کرتے تھے کہ وہ اُن کے غضب میں آکر برباد وتباہ ہو جائے گا تو ایسے اوہام پرستوں کے دلوں میں بلند ستاروں کی پرستش کے خلاف جذبہ پیدا کرنا کچھ آسان کام نہ تھا۔ اس لئے جدّ الانبیاء ابراہیم علیہ السلام نے اُن کے دماغوں کے مناسب ایک عجیب اور دلچسپ پیرایہِ بیان اختیار فرمایا۔

تاروں بھری رات میں ایک ستارہ خوب روشن تھا۔ ابراہیم علیہ السلام نے اُسے دیکھ کر فرمایا: ھٰذَا رَبِّی ''میرا رب یہ ہے؟'' کیونکہ سب اجرامِ فلکی میں ممتاز اور روشن ہونے کی وجہ سے اس میں ربوبیت کی صفت ہو سکتی ہے۔ لیکن جب وہ اپنے وقتِ مقررہ پر نظر سے اوجھل ہو گیا تو آپ نے فرمایا: ''میں چھپ جانے والے کو پسند نہیں کرتا۔'' پھر نگاہ اُٹھائی تو چاند کو اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ سامنے موجود پایا جسے دیکھ کر فرمایا: ھٰذَا رَبِّی ''یہ میرا رب ہے؟'' اس لئے کہ یہ خوب روشن ہے اور اپنی خنک روشنی سے سارے عالم کو بقعہِ نور بنایا ہوا ہے۔ پس اگر کواکب کو رب بنانا ہی ہے تو اسی کو کیوں نہ بنایا جائے کیونکہ یہی اس کا زیادہ مستحق نظر آتا ہے۔

اب سحر کا وقت ہونے لگا تو چاند کے بھی ماند پڑ جانے اور روپوش ہو جانے کا وقت آپہنچا اور جس قدر طلوعِ آفتاب کا وقت قریب ہوتا گیا، تو چاند کا جسم دیکھنے والوں کی آنکھوں سے اوجھل ہونے لگا۔ اِس پر ابراہیم علیہ السلام نے ایک ایسا جملہ فرمایا جس سے چاند کے رب ہونے کی نفی کے ساتھ ساتھ خدائے واحد کی ہستی کی جانب قوم کی توجہ اس خاموشی کے ساتھ پھیر دی جائے کہ قوم اس کا احساس بھی نہ کر سکے اور اس گفتگو کا جو مقصدِ وحید ہے یعنی ''صرف خدائے واحد پر ایمان'' وہ اُن کے دلوں میں بغیر قصد وارادہ کے پیوست ہو جائے۔ فرمایا: اگر میرا حقیقی رب میری رہنمائی نہ کرتا تو میں بھی ضرور گمراہ قوم ہی میں سے ہوتا۔'' اس قدر فرما کر خاموش ہو گئے اس لئے کہ ابھی سلسلہ کی ایک اور کڑی باقی ہے اور قوم کے پاس ابھی مقابلہ کے لئے ایک ہتھیار موجود ہے۔ اس لئے اس سے زیادہ کہنا مناسب نہیں تھا۔

تاروں بھری رات ختم ہوئی۔ چمکتے ستارے اور چاند سب نظر سے اوجھل ہو گئے۔ اس لئے کہ اب آفتابِ عالمتاب کا رخ روشن سامنے آرہا ہے۔ دن نکل آیا اور سورج پوری آب وتاب سے چمکنے دمکنے لگا۔ اُسے دیکھ کر ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: ھٰذَا رَبِّی ھٰذَا☆ اَکْبَرُ (یہی میرا رب ہے، یہی سب سے بڑا ہے) لیکن دن بھر چمکنے اور تمام عالم کو روشن کرنے کے بعد وقتِ مقررہ پر وہ بھی نظروں سے غائب ہو گیا۔ تو اب وقت آن پہنچا کہ اللہ کا پیارا خلیل

☆ سورج کے لئے باز غۃً مؤنث کا صیغہ استعمال ہوا اور ھٰذَا مذکر اسم اشارہ فرمایا گیا کیونکہ لفظ رب کا احترام اسی میں ہے کہ اس کے لئے ھٰذِہٖ مؤنث کا صیغہ استعمال نہ کیا جائے۔ (تفسیر نعیمی۔ مفتی احمد یار خاں نعیمی، جلد ہفتم، صفحہ ۵۰۶)

اصل حقیقت کا اعلان کردے اور قوم کو لاجواب کردے کہ اُن کے عقیدہ کے مطابق اگران اجرامِ فلکی کو ربوبیت اور معبودیت حاصل ہے تو اس کی کیا وجہ کہ ہم سے بھی زیادہ اُن میں تغیرات نمایاں ہیں اور اگر وہ معبود ہیں تو اُن میں ڈوب جانا اور چھپ جانا (اُفول) کیوں ہے؟ آپ کا اعلان یہ تھا کہ اے میری قوم! میں ان مشرکانہ عقائد سے بَری اور شرک کی زندگی سے بیزار ہوں۔ بلاشبہ میں نے اپنا رخ صرف اُسی ایک خدا کی جانب کرلیا ہے جو آسمانوں اور زمینوں کا خالق ہے۔ میں ''حنیف'' ہوں اور ''مشرک'' نہیں ہوں (الانعام: ۷۹)

قوم ان دلائل و براہین کے مقابل بالکل عاجز اور لاجواب ہوگئی اور جب کوئی بس نہ چلا تو صدائے حق کو قبول کرنے کی بجائے آپ سے جھگڑنے اور اپنے معبودانِ باطل سے ڈرانے لگی کہ وہ تیری توہین کا تجھ سے ضرور انتقام لیں گے۔ آپ نے فرمایا کہ کیا تم مجھ سے جھگڑتے اور اپنے بتوں سے مجھے ڈراتے ہو حالانکہ رب تعالیٰ نے مجھے سیدھی راہ دکھائی ہے اور تمہارے پاس گمراہی کے سوا کچھ بھی نہیں۔ مجھے تمہارے بتوں کی مطلق کوئی پروانہیں۔ جو کچھ میرا رب چاہے گا وہی ہوگا۔ تمہارے بت کچھ بھی نہیں کرسکتے۔ کیا تمہیں ان باتوں سے کوئی نصیحت حاصل نہیں ہوتی؟ تمہیں تو خدا کی نافرمانی کرنے اور اُس کے ساتھ بتوں کو شریک ٹھہرانے میں بھی کوئی خوف نہیں آتا جس کے لئے تمہارے پاس ایک بھی دلیل نہیں ہے اور مجھ سے یہ توقع رکھتے ہو کہ خدائے واحد کا ماننے والا اور امنِ عالم کا ذمہ دار ہوکر میں تمہارے بتوں سے ڈر جاؤں گا۔ کاش کہ تم سمجھتے کہ کون مفسد ہے اور کون مصلح و امن پسند؟

''سورۃ الانعام کی آیات ۷۶ تا ۷۸ کی تفسیر میں قولِ فیصل: اس کلی اتفاق کے باوجود کہ ابراہیم علیہ السلام نے کبھی کواکب پرستی نہیں کی اور اُن کی تمام زندگی شرک کی آلودگی سے پاک ہے' سورۃ الانعام کی محولہ بالا آیات کی تفسیر میں علماء کے مختلف اقوال ہیں جن میں سے ایک کا حاصل یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کی یہ گفتگو قوم کی کواکب پرستی کے رد میں اُنہیں لاجواب کرنے کے لئے تھی۔ اس لئے کہ جب دو فریق کسی مسئلہ میں اختلاف کر بیٹھتے ہیں تو احقاقِ حق کے لئے مناظرانہ دلائل میں سے دلیل کا ایک یہ بھی طریقہ ہے کہ اپنے دعوئ کے ثبوت میں صرف نظریوں اور تھیوریوں سے کام نہ لیا جائے بلکہ مشاہدہ اور معائنہ کی ایسی راہ اختیار کی جائے کہ مخالف اس کے دعوے کے مقابلہ میں لاجواب ہوجائے اور اُس کی دلیل کے ردّ کرنے کی تمام راہیں اُس کے سامنے بند ہوجائیں۔ اب اگر اُس میں سلامت روی باقی ہے اور اُس کے دل میں قبولِ حق کی گنجائش ہے تو وہ اُسے قبول کرلیتا ہے ورنہ بے دلیل لڑنے جھگڑنے پر آمادہ ہوجاتا ہے۔ اس طرح حق و باطل میں امتیاز ہوجاتا ہے اور اصل اور حق بات نکھر کر صاف ہوجاتی ہے۔'' (قصص القرآن)

جناب ابراہیم علیہ السلام جلیل القدر پیغمبر ہیں اس لئے اُن کی تبلیغ کا متن منطق صغریٰ کبریٰ پر قائم نہ تھا بلکہ حقیقت کو فطری دلائل کی سادگی کے ساتھ واضح کرنا ہی اُن کا طغرائے امتیاز تھا۔ آپ کا ستارے' چاند وغیرہ کے متعلق یہ کہنا کہ یہ میرا رب ہے' یہ آپ نے بطور تنزل فرمایا تھا کہ اگر بر سبیل فرض یہ ستارہ میرا رب ہو تو اُس کا غروب ہوجانا اُس کے رب ہونے کی تکذیب کرتا ہے اور یا یہاں استفہام محذوف ہے جس کا آپ نے ذکر نہیں فرمایا کہ کہیں قوم بات اور استدلال مکمل ہونے سے پہلے ہی بدک نہ جائے۔ اس لئے آپ نے سوال کو دل میں رکھ کر فرمایا: یہ میرا رب ہے

اور آپ کا منشا تھا کیا یہ میرا رب ہے؟ یہ توجیہات اس لئے ضروری ہیں کہ نبی ایک آن کے لئے بھی حقیقتاً ستارے کو اپنا رب نہیں کہہ سکتا اور نہ کبھی اُسے اللہ تعالیٰ کی توحید میں تردّد ہو سکتا ہے۔ ہر نبی پیدائشی مؤمن اور نبی ہوتا ہے۔ نیز حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق قرآن مجید میں تصریح ہے کہ وہ اپنی قوم سے مناظرہ کرنے سے پہلے بھی مؤمن تھے۔ (حوالہ جات ملاحظہ ہوں بر صفحات ۲۱۹۳ تا ۲۱۹۵، ۲۱۹۸ جلد ہذا)۔

''حسنِ اتفاق کہ قریب ہی زمانہ میں قوم کا ایک مذہبی میلہ پیش آ گیا۔ جب سب اُس کے لئے چلنے لگے تو کچھ لوگوں نے ابراہیم علیہ السلام سے بھی اصرار کیا کہ وہ بھی ساتھ چلیں۔ آپ نے اوّل تو انکار فرمایا اور جب اُس جانب سے اصرار بڑھنے لگا تو ستاروں کی جانب نگاہ اٹھائی اور فرمانے لگے: اِنِّیْ سَقِیْم ''میں آج کچھ علیل سا ہوں''۔ چونکہ آپ کی قوم کواکب پرستی کی وجہ سے نجوم میں کمال بھی اور اعتقاد بھی تھا۔ اس لئے اپنے عقیدہ کے لحاظ سے وہ یہ سمجھے کہ ابراہیم علیہ السلام کسی نحس ستارہ کے اثرِ بد میں مبتلا ہیں اور یہ سوچ کر بغیر کسی تشریح حال کے ابراہیم علیہ السلام کو چھوڑ کر میلہ میں چلے گئے۔ اب جبکہ ساری قوم' بادشاہ' کاہن اور مذہبی پیشوا میلہ میں مصروف اور شراب و کباب میں مشغول تھے تو ابراہیم علیہ السلام نے سوچا کہ وقت آ گیا ہے کہ جمہور پر واضح کر دوں کہ اُن کے دیوتاؤں کی حقیقت کیا ہے۔ وہ اٹھے اور سب سے بڑے دیوتا کے ہیکل (مندر) میں پہنچے تو وہاں دیوتاؤں کے سامنے قسم قسم کے حلووں' پھلوں' میووں اور مٹھائیوں کے چڑھاوے رکھے تھے۔ ابراہیم علیہ السلام نے طنزیہ لہجے میں چپکے چپکے ان مورتیوں سے خطاب کر کے کہا کہ یہ سب کچھ موجود ہے' اُنہیں کھاتے کیوں نہیں ہو؟ اور پھر کہا کہ میں بات کر رہا ہوں لیکن تم میری بات کا جواب بھی نہیں دیتے؟ اس کے بعد آپ نے اُن سب کو توڑ پھوڑ ڈالا اور سب سے بڑے بت کے کاندھے پر کلہاڑا رکھ کر اپنی راہ چل دیے۔''

جب لوگ میلے سے واپس ہوئے تو مندر میں بتوں کا یہ حال پایا۔ سخت برہم ہوئے اور ایک دوسرے سے دریافت کرنے لگے کہ یہ کیا ہوا اور کس نے کیا؟ ان میں وہ بھی تھے جن کے سامنے ابراہیم علیہ السلام تَاللّٰہِ لَاَکِیْدَنَّ اَصْنَامَکُمْ (اللہ کی قسم! میں تمہاری عدم موجودگی میں ضرور تمہارے بتوں کے ساتھ خفیہ چال چلوں گا) کہہ چکے تھے۔ وہ سمجھ گئے کہ یہ اس شخص کا کام ہے جس کا نام ابراہیم ہے کہ وہی ہمارے دیوتاؤں کا دشمن ہے۔ کاہنوں اور سرداروں نے جب یہ سنا تو غم وغصہ سے سرخ ہو گئے اور کہنے لگے کہ اس کو مجمع کے سامنے پکڑ کر لاؤ تاکہ سب دیکھیں کہ مجرم کون شخص ہے۔ ابراہیم علیہ السلام سامنے لائے گئے تو بڑے رعب و داب سے انہوں نے پوچھا: کیوں ابراہیم! تو نے ہمارے دیوتاؤں کے ساتھ یہ سب کچھ کیا ہے؟ آپ نے دیکھا کہ اب کاہنوں اور مذہبی پیشواؤں کو جمہور کی موجودگی میں اُن کے باطل عقیدہ پر نادم کر دینے کا وقت آ گیا ہے۔ چنانچہ آپ نے فرمایا کہ یہ سب اس بڑے بت کی کارروائی ہے' اس سے دریافت کرو۔ ابراہیم علیہ السلام کی اس یقینی حجت اور دلیل کا کاہنوں اور پجاریوں کے پاس کیا جواب ہو سکتا تھا۔ وہ ندامت میں غرق تھے اور سوچتے تھے کہ کیا جواب دیں جبکہ بت تو بول سکتے ہی نہیں۔ سرنگوں ہو کر کہنے لگے ابراہیم! تو خوب جانتا ہے کہ ان دیوتاؤں میں بولنے کی سکت نہیں ہے کہ یہ بے جان مورتیاں ہیں۔ اس طرح ابراہیم علیہ السلام کی حجت و دلیل کامیاب ہوئی اور دشمن نے اعتراف کر لیا کہ ظالم ہم ہی

ہیں۔ تو اب ابراہیم علیہ السلام نے مختصر مگر جامع الفاظ میں اُنہیں نصیحت بھی کی اور ملامت بھی اور بتایا کہ جب یہ دیوتا نہ نفع پہنچا سکتے ہیں اور نہ نقصان تو پھر یہ خدا اور معبود کیسے ہو سکتے ہیں! افسوس تم اتنا بھی نہیں سمجھتے یا عقل سے کام نہیں لیتے؟

''حدیثِ بخاری: ابراہیم علیہ السلام کے واقعات میں قرآنِ عزیز نے اس موقع پر جبکہ ابراہیم علیہ السلام اور قوم کے بعض افراد کے درمیان میلے کی شرکت کے لئے گفتگو ہو رہی تھی' ابراہیم علیہ السلام کا یہ قول نقل کیا ہے اِنِّیْ سَقِیْم'' (میں بیمار ہوں) اور جب بتوں کی شکست و ریخت کے سلسلہ میں اُن سے دریافت کیا گیا تو اس کا جواب آپ نے یوں دیا: بَلْ فَعَلَهٗ كَبِیْرُهُمْ هٰذَا فَاسْئَلُوْهُمْ اِنْ كَانُوْا یَنْطِقُوْنَ O (الانبیاء: ۶۳)

''بلکہ ان میں سے سب سے بڑے بت نے یہ کیا ہے۔ پس اُن سے پوچھو اگر یہ بول سکتے ہیں۔'' (۶۳: ۲۱)

حدیث صحیح میں ابراہیم خلیل اللہ کے اس قول کو کِذب سے تعبیر کیا گیا ہے اور اس سے منکرینِ حدیث کو بخاری' مسلم' ترمذی کے خلاف ایک طومار کذب باندھنے کا موقع مل گیا ہے حالانکہ بالکل صاف ظاہر ہے کہ یہ کذب صرف صورۃً تھا۔ نہ حضرت کی نیت کسی غلط بات کہنے کی تھی اور نہ اس کلام سے اس بڑے مجمع میں کسی ایک متنفس کو بھی دھوکا یا مغالطہ ہوا۔ مقصود تمام مشرکین پر حجتِ الزامی قائم کرنا تھی اور اس کے لئے آپ اعلان پیشتر سے کر بھی چکے تھے کہ ''اللہ کی قسم! میں تمہاری عدم موجودگی میں ضرور تمہارے بتوں کے ساتھ خفیہ چال چلوں گا''۔ یہ تو صرف ایک بلیغ' مؤثر اور خطیبانہ پیرایہ گفتگو موقع کے مناسبِ حال تھا۔ ایسا کذب (اور کذب عربی میں ہرگز اردو کے جھوٹ کے مترادف نہیں بلکہ اس سے کہیں وسیع معنی رکھتا ہے) ہرگز عصمتِ انبیاء کے منافی نہیں۔

اِنِّیْ سَقِیْم'' میں علالتِ طبع کا ذکر ہے جسے ابراہیم علیہ السلام ہی خوب جان سکتے ہیں کہ کیا وہ بیمار ہیں۔ اس میں دوسرے کو خواہ مخواہ شک اور تردّد کا کون سا موقع ہے۔ حتیٰ کہ اگر ایک شخص ظاہر بیں نگاہوں میں تندرست نظر آتا ہو تب بھی ضروری نہیں کہ وہ واقعی تندرست ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس کا مزاج کسی وجہ سے حدِ اعتدال پر نہ ہو اور ایسی تکلیف میں مبتلا ہو جس کا اظہار کئے بغیر دوسرا اُسے نہ سمجھ سکے۔

لہٰذا ان دونوں جملوں میں ایک بات بھی ایسی نہیں ہے جسے حقیقتاً یا صورۃً جھوٹ کہا جا سکے۔ یہ دو باتیں تو قرآن عزیز میں مذکور ہیں لیکن صحیح بخاری' صحیح مسلم اور بعض دوسری حدیث کی کتابوں میں مسطورہ بالا دونوں باتوں کے علاوہ ایک تیسری بات کا بھی ذکر ہے جو اس طرح ہے:

لَمْ یَكْذِبْ اِبْرَاهِیْمُ النَّبِیُّ عَلَیْهِ السَّلَامُ قَطُّ اِلَّا ثَلَاثُ كَذَبَاتٍ (صحیح بخاری ج ۶' ص ۳۰۱)

''ابراہیم علیہ السلام نے کبھی بھی ہرگز جھوٹ نہیں بولا سوائے تین جھوٹوں کے۔''

ان میں سے دو کا ذکر ابھی ہو چکا اور تیسری بات یہ مذکور ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کا جب مصر سے گزر ہوا تو آپ نے مصر پہنچنے سے پہلے اپنی زوجہ مطہرہ حضرت سارہ رضی اللہ عنہا سے یہ فرمایا کہ یہاں کا بادشاہ جابر و ظالم ہے۔ اگر وہ کسی حسین عورت کو دیکھتا ہے تو اُسے زبردستی چھین لیتا ہے اور اُس کے ساتھی مرد کو اگر وہ اُس عورت کا

شوہر ہے تو قتل کر ڈالتا ہے اور اگر کوئی دوسرا عزیز ہے تو اُس سے کوئی تعرض نہیں کرتا۔ تم چونکہ میری دینی بہن ہو اور اس سرزمین میں میرے اور تمہارے علاوہ دوسرا کوئی مسلمان نہیں ہے اس لئے تم اُس سے کہہ دینا کہ یہ میرا بھائی ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور جب شب میں اُس نے ارادۂ بد کیا تو اُس کا ہاتھ شل ہو کر رہ گیا اور وہ کسی طرح سیّدہ سارہ کو ہاتھ نہ لگا سکا۔ یہ دیکھ کر اُس نے سارہ رضی اللہ عنہا سے کہا کہ اپنے خدا سے دعا کر کہ میرا ہاتھ درست ہو جائے تو میں تجھے رہا کر دوں گا۔ سارہ نے دعا کی مگر پھر اُس نے ارادۂ بد کیا اور دوبارہ اُس کا ہاتھ شل ہو گیا۔ تیسری مرتبہ پھر یہی تمام قصہ پیش آیا۔ تب اُس نے کہا کہ معلوم ہوتا ہے یہ جن ہے انسان نہیں۔ اُسے میرے پاس سے جلد لے جاؤ اور ساتھ ہی سیّدہ ہاجرہ رضی اللہ عنہا کو حوالے کر کے کہا کہ اسے بھی اپنے ساتھ لے جا' میں نے اُسے تیرے حوالے کیا۔ جب سیّدہ سارہ سیّدہ ہاجرہ کو لے کر ابراہیم علیہ السلام کے پاس پہنچیں تو اُنہوں نے حال دریافت کیا اور حضرت سارہ رضی اللہ عنہا نے مبارک باد دی اور کہا: شکر ہے خدائے عزوجل کا کہ اس نے ہمیں اس فاسق و فاجر سے نجات دی اور آپ کے لئے ایک خادمہ اور ساتھ کر دی۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے یہ حدیث نقل کر کے فرمایا: اے شریف النسب اہلِ عرب' یہ ہیں وہ ہاجرہ جو تم سب کی ماں ہیں۔'' (قصص القرآن' ج ۱' ص ۲۰۰)

صحیح بخاری کے علاوہ یہ روایت صحیح مسلم' مسند احمد' صحیح ابن خزیمہ' مستدرک حاکم' معجم طبرانی' مصنف ابن ابی شیبہ' ترمذی اور مسند ابی عوانہ میں مختلف صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے منقول ہے۔

''**زیرِ بحث مسئلہ**: اس مقام پر پہنچ کر ایک مرتبہ پھر یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ مسئلہ زیرِ بحث یہ نہیں کہ ابراہیم علیہ السلام نے (العیاذ باللہ) واقعی جھوٹ بولا کیونکہ قرآن عزیز کی قطعی نصوص اور زیرِ بحث روایات کے علاوہ احادیثی نصوص ابراہیم علیہ السلام کو نبی' پیغمبر اور رسول بتاتی اور اُن کی امتیازی صفات صدّیق' مجتبیٰ' نبی' حنیف اور رسول ثابت کرتی ہیں۔ نیز زیرِ بحث روایت میں بھی یہ واضح ہے کہ اُن کے یہ کلمات اللہ کے دین کی حمایت و مدافعت کے لئے تھے نہ کہ کسی دنیاوی غرض و مصلحت کے لئے۔ لہٰذا ایک لمحہ کے لئے بھی اس میں تردّد کی گنجائش نہیں ہے کیونکہ ''کذب'' اُن سے اسی طرح دور ہے جس طرح دن سے رات اور روشنی سے تاریکی اور وہ بلاشبہ ایک نبی معصوم ہیں اور ہر قسم کی معصیت و گناہ سے پاک ہیں۔''

''(۱) بلاشبہ حضرت سارہ حضرت ابراہیم کی دینی بہن تھیں اور بیوی کے رشتہ سے اسلامی اخوت کا رشتہ منقطع نہیں ہو جاتا نیز ابن کثیر اور دوسرے مؤرخین کی تحقیق میں وہ اُن کے چچا حاران کی بیٹی تھیں' اس لئے چچازاد بہن بھی تھیں۔ (۲) بلاشبہ ابراہیم علیہ السلام کا مزاج ناساز تھا گو سخت بیماری نہ سہی اس لئے اِنِّیْ سَقِیْمٌ'' ہر حیثیت سے صحیح ہے۔ (۳) بلاشبہ اُنہوں نے مناظرانہ طرزِ خطابت میں دشمن کو لاجواب کرنے کے لئے فرمایا: بَلْ فَعَلَهٗ كَبِيْرُهُمْ اور یہ علمی دنیا میں کسی بھی حیثیت سے بھی جھوٹ نہیں تھا۔ علم بدیع کی اصطلاح میں اس قسم کے کلام کو ''معاریض'' کی اقسام میں شمار کیا جاتا ہے جو فصحاء و بلغاء کے کلام میں اکثر رائج ہے۔'' (''قصص القرآن''۔ حفظ الرحمٰن سیوہاروی ج ۱' ص ص ۲۰۲' ۲۰۳)

اوپر حدیثِ بخاری کے حوالے سے پہلے ابراہیم علیہ السلام کا اپنی قوم کو نصیحت و موعظت کا ذکر ہوا جس کا اثر یہ ہونا چاہئے تھا کہ تمام قوم اپنے باطل عقیدہ سے تائب ہو کر ملّتِ حنفی کو اختیار کر لیتی اور کجروی چھوڑ کر راہِ مستقیم پر گامزن ہو جاتی لیکن دلوں کی کجی، نفوس کی سرکشی، تمرّدانہ ذہنیت اور باطنی خباثت نے اس جانب نہ آنے دیا بلکہ اس کے برعکس اُن سب نے ابراہیم علیہ السلام کی عداوت و دشمنی کا نعرہ بلند کر دیا اور ایک دوسرے سے کہنے لگے کہ اگر دیوتاؤں کی خوشنودی چاہتے ہو تو اُسے اس گستاخی اور مجرمانہ حرکت پر سخت سزا دو اور دہکتی ہوئی آگ میں ڈالو تاکہ اس کی تبلیغ و دعوت کا قصہ ہی پاک ہو جائے۔

''بادشاہ کو دعوتِ اسلام اور اس سے مناظرہ: ابھی یہ مشورے ہو ہی رہے تھے کہ شدہ شدہ بادشاہِ وقت تک یہ باتیں پہنچ گئیں۔ اُس زمانہ میں عراق کے بادشاہ کا لقب نمرود ہوتا تھا اور وہ رعایا کے صرف بادشاہ ہی نہیں ہوتے تھے بلکہ خود کو اُن کا رب اور مالک جانتے تھے اور رعایا بھی دوسرے دیوتاؤں کی طرح اُسے اپنا خدا اور معبود مانتی تھی اور اُس کی بھی اسی طرح پرستش کرتی تھی جس طرح دیوتاؤں کی بلکہ ان سے بھی زیادہ پاس و ادب کے ساتھ پیش آتی تھی اس لئے کہ وہ صاحبِ عقل و شعور بھی ہوتا تھا اور مالکِ تخت و تاج بھی۔''

''نمرود کو جب یہ معلوم ہوا تو وہ آپے سے باہر ہو گیا اور سوچنے لگا کہ اس شخص کی پیغمبرانہ تبلیغ و دعوت کی سرگرمیاں اگر اِسی طرح جاری رہیں تو یہ میری الوہیت، ربوبیت اور ملوکیت سے بھی سب رعایا کو برگشتہ کر دے گا اور اس طرح باپ دادا کے مذہب کے ساتھ ساتھ میری یہ سلطنت بھی زوال میں آ جائے گی۔ اس لئے اس قصہ کا ابتدا ہی میں خاتمہ کر دینا بہتر ہے۔ چنانچہ اُس کے بلانے پر آپ جب نمرود کے دربار میں پہنچے تو اُس نے آپ سے دریافت کیا کہ تو باپ دادا کے دین کی مخالفت کس لئے کرتا ہے اور مجھے رب ماننے سے تجھے کیوں انکار ہے؟ آپ نے فرمایا کہ میں خدائے واحد کا پرستار ہوں اور اُس کے علاوہ کسی کو اُس کا شریک نہیں مانتا۔ ساری کائنات اور تمام عالم اُسی کی مخلوق ہے اور وہی ان سب کا خالق و مالک ہے۔ تو بھی اُسی طرح ایک انسان ہے جس طرح ہم سب انسان ہیں۔ پھر تو کس طرح رب یا اللہ ہو سکتا ہے اور کس طرح یہ گونگے، بہرے لکڑی کے بت خدا ہو سکتے ہیں؟ میں صحیح راہ پر ہوں اور تم سب غلط راہ پر ہو اس لئے میں تبلیغِ حق کو کس طرح چھوڑ سکتا ہوں اور تمہارے باپ دادا کے خود ساختہ دین کو کیسے اختیار کر سکتا ہوں؟''

''نمرود نے ابراہیم علیہ السلام سے دریافت کیا کہ اگر میرے علاوہ تیرا کوئی رب ہے تو اس کا ایسا وصف بیان کر کہ جس کی قدرت مجھ میں نہ ہو۔ آپ نے فرمایا کہ میرا رب وہ ہے جس کے قبضہ میں موت و حیات ہے۔ کج فہم نمرود موت و حیات کی حقیقت سے نا آشنا کہنے لگا کہ اس طرح موت و حیات تو میرے قبضہ میں بھی ہے اور یہ کہہ کر اُسی وقت ایک بے قصور شخص کے متعلق جلاّد کو حکم دیا کہ اس کی گردن اڑا دو۔ جلاّد نے فوراً حکم کی تعمیل کی اور قتل کے ایک سزا یافتہ مجرم کو جیل سے بلا کر حکم دیا کہ جاؤ ہم نے تمہاری جان بخشی کی اور پھر ابراہیم علیہ السلام کی جانب متوجہ ہو کر کہنے لگا: دیکھا میں بھی کس طرح زندگی بخشتا اور موت دیتا ہوں۔ پھر تیرے خدا کی خصوصیت کیا رہی؟''

''ابراہیم علیہ السلام سمجھ گئے کہ نمرود یا تو موت و حیات کی اصل حقیقت سے نا آشنا ہے اور یا جمہور اور رعایا کو مغالطہ دینا چاہتا ہے تاکہ وہ اس فرق کو نہ سمجھ سکیں کہ زندگی بخشنا اس کا نام نہیں ہے بلکہ نیست سے ہست کرنے کا نام زندگی بخشنا ہے اور اسی طرح کسی کو قتل یا پھانسی سے بچالینا موت کا مالک ہونا نہیں ہے۔ موت کا مالک وہی ہے جو روحِ انسانی کو اُس کے جسم سے نکال کر اپنے قبضہ میں کر لیتا ہے۔ اس لئے بہت سے دار رسیدہ انسان زندگی پا جاتے ہیں اور بہت سے قتل و دار سے بچائے ہوئے انسان لقمہ اجل بن جاتے ہیں اور کوئی طاقت اُنہیں روک نہیں سکتی۔ تاہم آپ نے سوچا کہ اگر میں نے اس موقع پر موت و حیات کے دقیق فلسفہ پر بحث شروع کر دی تو نمرود کا مقصد پورا ہو جائے گا اور وہ جمہور کو مغالطہ میں ڈال کر اصل معاملہ کو الجھا دے گا اور تبلیغِ حق کے سلسلہ میں سرِ محفل نمرود کو لاجواب کرنے کا موقع ہاتھ سے جاتا رہے گا کیونکہ بحث و مباحثہ اور جدل و مناظرہ میرا اصل مقصد نہیں ہے بلکہ لوگوں کے دل و دماغ میں خدائے واحد کا یقین پیدا کرنا میرا مقصدِ وحید ہے اس لئے آپ نے اس دلیل کو نظر انداز کر کے سمجھانے کا ایک دوسرا پیرایہ اختیار کیا اور ایسی دلیل پیش کی جس کا صبح و شام ہر شخص آنکھوں سے مشاہدہ کرتا ہے اور بغیر کسی منطقی دلیل کے روز و شب کی زندگی میں اس سے دوچار ہوتا رہتا ہے۔''

''ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ میں اُس ہستی کو ''اللہ'' کہتا ہوں جو روزانہ سورج کو مشرق سے لاتا اور مغرب کی جانب لے جاتا ہے۔ پس اگر تو بھی اسی طرح خدائی کا دعویدار ہے تو اس کے خلاف سورج کو مغرب سے نکال اور مشرق میں چھپا لے۔ یہ سن کر نمرود مبہوت اور لاجواب ہو کر رہ گیا اور اس طرح ابراہیم علیہ السلام کی زبان سے نمرود پر خدا کی حجت پوری ہوئی۔''

''نمرود سورج دیوتا کا اوتار اور سورج کے خدائے اعظم ہونے کا قائل تھا۔ اُس کے عقیدہ کے ردّ میں سورج ہی کو مثال میں پیش کرنا اُس پر بہترین گرفت تھی۔ چنانچہ آپ نے فرمایا کہ تم سورج کے قادر و متصرف ہونے کے قائل ہو تو زیادہ نہیں، یہی کر دکھاؤ کہ سورج اپنے ارادہ سے عام سنتِ الٰہی کے خلاف ذرا اپنا رخ ہی بدل دے۔ دوسروں پر قدرت رکھنا تو الگ رہا، خود اپنے ہی پر ذرا اپنا ارادہ صَرف کر دکھائے اور ارادہ بھی صرف رخ بدل دینے جیسا ہلکا۔ کسی خدا کی بے بسی کا منظر اس سے بڑھ کر اور کیا پیش ہو سکتا تھا! عاجز و لاجواب ہونے کے باوجود نمرود ایمان نہ لایا اور ایمان لاتا ہی کیسے؟ جو لوگ غصہ اور عناد سے کجروی اختیار کئے رہتے ہیں، انہیں ہدایت کبھی بھی نصیب نہیں ہوتی۔ آیت سے یہ بھی ظاہر ہو رہا ہے کہ ایمانِ مستقیم اور فہمِ سلیم کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔''

''نمرود کے لئے جواب دینے کی تین ہی صورتیں ہو سکتی تھیں (۱) وہ یہ کہے کہ مجھے آفتاب پر پوری قدرت حاصل ہے اور میں نے ہی یہ سارا نظام بنایا ہے مگر اُس نے یہ جواب اس لئے نہیں دیا کہ وہ خود اس کا قائل نہیں تھا کہ یہ ساری کائنات اُس نے بنائی ہے اور آفتاب کی حرکت اس کے قبضہِ قدرت میں ہے بلکہ وہ تو خود کو اپنی رعایا کا رب اور دیوتا کہلاتا تھا۔''

(۲) یا وہ یہ کہتا کہ ''میں اس عالم کو کسی کی مخلوق نہیں مانتا اور آفتاب تو خود مستقل دیوتا ہے'، اُس کے

اختیارات میں خود بہت کچھ ہے۔'' مگر اُس نے یہ بھی اس لئے نہ کہا کہ اگر وہ ایسا کہتا تو ابراہیم علیہ السلام کا وہی اعتراض سامنے آجاتا جو اُنہوں نے جمہور کے سامنے آفتاب کی ربوبیت کے خلاف اٹھایا تھا کہ اگر یہ ''رب'' ہے تو عابدوں اور پجاریوں سے زیادہ اس معبود میں تغیرات اور فنا کے اثرات کیوں موجود ہیں۔ رب کو فنا اور تغیر سے کیا واسطہ! اور کیا اُس کی قدرت میں یہ ہے کہ اگر وہ چاہے تو وقتِ مقررہ سے پہلے یا بعد طلوع یا غروب ہو جائے؟''

(۳) ''تیسری صورت یہ تھی کہ ابراہیم علیہ السلام کی تحدّی (چیلنج) کو وہ قبول کر لیتا اور مغرب سے آفتاب کو طلوع کر کے دکھا دیتا مگر نمرود چونکہ ان تینوں صورتوں میں سے کسی صورت میں بھی جواب پر قادر نہ تھا اس لئے مبہوت اور لاجواب ہو جانے کے علاوہ اُس کے پاس دوسرا کوئی چارۂ کار باقی نہ رہا۔'' (قصص القرآن' ج ۱)

نمرود' آزر اور جمہور سب ابراہیم علیہ السلام کے دلائل سے لاجواب اور دلوں میں قائل تھے۔ تاہم ان میں سے کسی نے راہِ مستقیم کو اختیار نہ کیا اور قبولِ حق سے منحرف ہی رہے اور صرف یہی نہیں بلکہ اس کے برعکس اپنی ندامت وذلت سے جھنجھلا کر بہت زیادہ غیظ وغضب میں آگئے اور بادشاہ سے رعایا تک سب نے متفقہ فیصلہ کر لیا کہ دیوتاؤں کی توہین اور باپ دادا کے دین کی مخالفت میں ابراہیم کو دہکتی آگ میں جلا دینا چاہئے کیونکہ ایسے سخت مجرم کی سزا یہی ہو سکتی ہے اور دیوتاؤں کی تحقیر کا انتقام اسی طرح لیا جا سکتا ہے۔

''<u>آگ کا سرد ہونا</u>: اس مرحلہ پر پہنچ کر ابراہیم علیہ السلام کی جدّ وجُہد کا معاملہ ختم ہو گیا اور اب دلائل و براہین کی قوّت کے مقابلہ میں مادّی طاقت وسطوت نے مظاہرہ شروع کر دیا۔ چچا اُس کا دشمن' جمہور اس کے مخالف اور شاہِ وقت اُس کے درپے آزار۔ ایک ہستی اور چہار جانب سے مخالفت کی آواز' دشمنی کے نعرے اور نفرت و حقارت کے ساتھ سخت انتقام اور خوفناک سزا کے ارادے۔ ایسے وقت میں اس کی مدد کون کرے اور اس کی حمایت کا سامان کس طرح مہیا ہو؟ ابراہیم علیہ السلام کو اُس وقت بھی بڑا زبردست سہارا حاصل تھا جو تمام سہاروں کا سہارا تھا اور وہ خدائے واحد کا سہارا تھا۔ اُس نے اپنے جلیل القدر پیغمبر' قوم کے عظیم المرتبت ہادی اور رہنما کو بے یارومددگار نہ رہنے دیا اور دشمنوں کے تمام منصوبوں کو خاک میں ملا دیا۔ ہوا یہ کہ نمرود اور قوم نے آپ کی سزا کے لئے ایک مخصوص جگہ بنائی جس میں کئی روز تک مسلسل آگ دہکائی گئی' حتی کہ اس کے شعلوں سے قرب وجوار کی اشیاء تک جھلسنے لگیں۔ اس طرح جب بادشاہ اور قوم کو کامل اطمینان ہو گیا کہ اب ابراہیم کے اس سے بچ نکلنے کی کوئی صورت باقی نہیں رہی' تب ایک گوپھن میں آپ کو بٹھا کر دہکتی ہوئی آگ میں پھینک دیا گیا۔ اُس وقت آگ میں جلانے کی تاثیر بخشنے والے نے آگ کو حکم دیا کہ وہ ابراہیم پر اپنی سوزش کا اثر نہ کرے اور ناری عناصر کا مجموعہ ہوتے ہوئے بھی اُس کے حق میں سلامتی کے ساتھ سرد پڑ جائے۔ آگ اُسی وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام کے حق میں بـرد و سـلام بن گئی اور دشمن اُنہیں کسی قسم کا نقصان نہ پہنچا سکے اور اللہ کا پیارا خلیل آگ سے سالم ومحفوظ دشمنوں کے نرغہ سے نکل گئے۔ ''دشمن اگر قویست نگہباں قوی ترست''

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جب آگ میں ڈالا گیا تو ہمارے نبی سیدنا محمد ﷺ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پشت میں موجود تھے تو آگ اُنہیں کیسے جلا سکتی تھی۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے غزوہ تبوک سے واپسی پر نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نعت میں چند اشعار پڑھے جن میں ایک شعر یہ بھی تھا:

وَرَدْتَّ نَارَ الْخَلِيْلِ مُسْتَتِرًا فِیْ صُلْبِهٖ أَنْتَ كَيْفَ يَحْتَرِقُ

''حضرت خلیل اللہ کی آگ میں آپ بھی پوشیدہ طور پر وارد تھے اور جس کی پشت میں آپ موجود ہوں، اُسے آگ کیسے جلا سکتی ہے!''

حافظ جلال الدین سیوطی نے ان اشعار کو المستدرک اور دلائل النبوت کے حوالے سے ذکر کیا ہے۔

جب خدا تعالیٰ نے دشمنوں کے ارادوں کو ذلیل و رسوا کر کے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے حق میں آگ کو برد و سلام بنا دیا تو اب آپ نے ارادہ کیا کہ کسی دوسری جگہ جا کر پیغامِ الٰہی سنائیں اور دعوتِ حق پہنچائیں۔ یہ سوچ کر ''فدان آرام'' سے ہجرت کا ارادہ کرلیا:

وَقَالَ اِنِّیْ ذَاهِبٌ اِلٰی رَبِّیْ سَيَهْدِيْنِ ○ (الصّٰفّٰت : ۹۹)

''اور ابراہیم نے کہا میں اپنے پروردگار کی طرف چلا جاتا ہوں، وہ میری راہ نمائی فرمائے گا۔'' (۳۷:۹۹)

اِلٰی رَبِّیْ سے مراد یہ کہ جہاں میرے رب نے مجھے جانے کا حکم دیا یا جہاں میں تسکین کے ساتھ اپنے رب کی عبادت کر سکوں گا۔ چنانچہ آپ وہاں سے مصر اور مصر سے ہوتے ہوئے شام تشریف لے گئے جو آپ کے وطن عراق سے شمال مغرب میں واقع ہے۔

''اس آیت میں یہ دلیل ہے کہ جس جگہ اسلام دشمن لوگ زیادہ ہوں اور ایمان اور اسلام پر قائم رہنے کی وجہ سے انسان کی جان، اُس کی عزت اور اُس کا مال خطرے میں ہو، اس پر وہاں سے ہجرت کرنا واجب ہے کیونکہ ابراہیم علیہ السلام نے اپنے وطن کے لوگوں سے شدید عداوت اور خطرہ محسوس کیا تو آپ نے عراق سے شام کی طرف ہجرت کرنے کا قصد فرمالیا۔ قرآن مجید کی یہ آیت ہجرت اور ایامِ فتنہ کی عزلت نشینی کی اصل ہے اور جس شخص نے اس پر سب سے پہلے عمل کیا وہ سیّدنا ابراہیم خلیل اللہ ہیں۔'' (تبیان القرآن، جلد ۹، صفحہ ۹۱۱)

''**اور کلدانیین کی طرف ہجرت**: بہرحال ابراہیم علیہ السلام اپنے چچا آزر اور قوم سے جدا ہو کر فرات کے غربی کنارہ کے قریب ایک بستی میں چلے گئے جو اور کلدانیین کے نام سے مشہور ہے۔ یہاں کچھ عرصہ قیام کیا اور حضرت لوط علیہ السلام اور حضرت سارہ رضی اللہ عنہا ہم سفر ہیں۔ کچھ دنوں کے بعد یہاں سے حران (حاران) کی جانب روانہ ہو گئے اور وہاں دینِ حنیف کی تبلیغ شروع کر دی مگر اس عرصہ میں برابر اپنے چچا آزر کے لئے بارگاہِ الٰہی میں استغفار کرتے اور اُس کی ہدایت کے لئے دعا مانگتے رہے اور یہ سب کچھ اس لئے کیا کہ آپ نہایت رقیق

القلب، رحمدل اور بہت ہی بُردبار تھے۔ اس لئے آزر کی جانب سے ہر قسم کی عداوت کے مظاہروں کے باوجود اُنہوں نے آزر سے یہ وعدہ کیا تھا کہ اگرچہ میں تجھ سے جدا ہو رہا ہوں اور افسوس کہ تو نے خدا کی رشد و ہدایت پر توجہ نہ کی تاہم میں برابر تیرے حق میں خدا سے مغفرت کی دعا کرتا رہوں گا۔ آخر کار آپ کو وحیِ الٰہی نے مطلع کیا کہ آزر ایمان لانے والا نہیں ہے۔ ابراہیم علیہ السلام کو جب یہ معلوم ہوگیا تو آپ نے آزر سے اپنی براءت کا صاف صاف اعلان کر دیا کہ جو اُمید موہوم میں نے لگا رکھی تھی وہ اب ختم ہوگئی۔ اس لئے اب استغفار کا سلسلہ بے محل ہے۔ سورۃ التّوبہ میں اس واقعہ کا ذکر یوں کیا گیا ہے:

وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرَاهِيْمَ لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَا اِيَّاهُ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ اِنَّ اِبْرَاهِيْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌO (التّوبۃ: ۱۱۴)

''اور ابراہیم کا اپنے چچا کے حق میں دعائے مغفرت کرنا تو محض اُس وعدہ کے سبب تھا جو اُنہوں نے اس سے کر لیا تھا۔ پھر جب اُن پر ظاہر ہو گیا کہ وہ اللہ کا دشمن ہے تو اس سے لاتعلق ہو گئے، بے شک ابراہیم بڑے ہی نرم دل اور بردبار تھے۔'' (۹ : ۱۱۴)

''ہجرتِ فلسطین: اس طرح ابراہیم علیہ السلام تبلیغ کرتے کرتے فلسطین پہنچے۔ اس سفر میں بھی اُن کے ہمراہ حضرت سارہ، حضرت لوط اور لوط علیہ السلام کی بیوی تھیں۔ سورۃ العنکبوت میں ہے:

فَاٰمَنَ لَهٗ لُوْطٌ وَقَالَ اِنِّیْ مُهَاجِرٌ اِلٰی رَبِّیْ اِنَّهٗ هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُO (العنکبوت: ۲۶)

''پھر لوط (علیہ السلام) نے ابراہیم (علیہ السلام) کی تصدیق کی اور ابراہیم بولے کہ میں اپنے پروردگار کی طرف ترکِ وطن کر کے چلا جاؤں گا، بے شک وہی بڑا زبردست، بڑی ہی حکمت والا ہے۔'' (۲۹:۲۶)

جنابِ لوط علیہ السلام اللہ کے نبی تھے اور نبی پیدائشی مؤمن اور موحّد ہوتا ہے۔ حضرت لوط علیہ السلام کا اللہ کی توحید پر تو پہلے ہی ایمان تھا۔ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام پر آگ کے گلزار ہونے کا معجزہ دیکھ کر اُن کی نبوّت پر ایمان لے آئے اور حضرت سارہ اُن کی عم زاد بہن تھیں۔ وہ بھی اس معجزہ کو دیکھ کر آپ پر ایمان لے آئیں اور اُنہوں نے ابراہیم علیہ السلام سے نکاح بھی کر لیا۔

(تفسیر امام ابن ابی حاتم، ج ۹، ص ۳۰۵۰؛ تفسیر ثعلبی، ج ۷، ص ۲۷۶، بحوالہ تبیان القرآن، ج ۹، ص ۲۷)

علّامہ آلوسی لکھتے ہیں کہ اس آیت سے صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ اس قوم سے صرف لوط علیہ السلام آپ پر ایمان لائے اور آپ کے سوا کسی اور کو یہ سعادت نصیب نہ ہوئی۔

''حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فلسطین کے غربی اطراف میں سکونت اختیار کی۔ اُس زمانہ میں یہ علاقہ کنعانیوں کے زیرِ اقتدار تھا۔ پھر قریب ہی شکیم (نابلس) میں چلے گئے اور وہاں کچھ عرصہ قیام کیا۔ اس کے بعد یہاں بھی زیادہ مدت قیام نہیں فرمایا اور غرب ہی کی جانب بڑھتے چلے گئے حتیٰ کہ مصر تک جا پہنچے۔'' (قصص القرآن)

''ہجرتِ مصر اور حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا: جب آپ نابلس سے چل کر مصر پہنچے تو بخاری اور مسلم کی روایت کے مطابق ملکِ جبار کا وہ واقعہ پیش آیا جو گزشتہ سطور میں صفحات ۲۲۰۳، ۲۲۰۴ میں سپردِ قلم ہو چکا ہے۔

''حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ایک اہم مقام: یہاں ایک اہم مقام کا ذکر کر دینا از بس ضروری ہے جس کے ساتھ ابراہیم علیہ السلام کا بہت گہرا تعلق ہے اور جو پیروانِ ملتِ ابراہیمی کے لئے ''مقامِ بصیرت'' کی حیثیت رکھتا اور جدّ الانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پیغمبرانہ عظمت و جلال کو تابندہ تر بناتا ہے:

''سورۂ الممتحنہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ایک خاص دعا کا تذکرہ ہوا۔ وہ بارگاہِ الٰہی میں دستِ طلب دراز کئے عجز و نیاز کے ساتھ یہ عرض کرتے ہیں:

رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا (الممتحنه : ۵)

''اے ہمارے پروردگار! ہمیں ان لوگوں کے لئے ''فتنہ'' نہ بنا جو کافر ہیں۔'' (۵ : ۶۰)

فِتنہ ''فتن'' سے ماخوذ ہے۔ جب سونے کو اس لئے آگ میں تپاتے ہیں کہ کھوٹ اور میل جل کر خالص سونا باقی رہ جائے تو اس کے لئے فتن الذھب بولتے ہیں۔ اب اصطلاح میں امتحان اور آزمائش اور پرکھ کو کہتے ہیں اور اس لئے انسان پر جو شدائد و مصائب آتے ہیں، وہ اس مناسبت سے فِتنہ کہلاتے ہیں۔ قرآنِ حکیم نے بھی مال، اولاد اور منصب و جاہ کو اسی معنی کے پیشِ نظر ''فِتنہ'' کہا ہے اور صاف صاف اعلان کیا ہے کہ صادق و کاذب کی جانچ کے لئے مؤمن کو اس کسوٹی پر ضرور پرکھا جاتا ہے۔

تو اب قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ اس دعائے ابراہیمی کی مراد کیا ہے؟ اور وہ کافروں کے لئے فتنہ نہ بننے سے متعلق کیا خواہش رکھتے ہیں؟ کتبِ تفاسیر میں لفظِ ''فتنہ'' کی مختلف تعبیریں ملتی ہیں۔ مثلاً یہ کہ:

(۱) ''اے ہمارے پروردگار! ہمیں اتنا کمزور ہونے سے محفوظ رکھا جائے کہ کفار کو ہم پر حملہ کرنے اور تباہ و برباد کرنے کی جرأت ہو۔''

(۲) لفظِ ''فتنہ'' سے ابراہیم علیہ السلام نے عذاب مراد لیا ہے کیونکہ عذاب بھی فتنہ کی ہیبت ناک صورت ہے۔ آپ بارگاہِ الوہیت میں فریاد کناں ہیں کہ اے ہمارے رب! ہمیں ایسی صورت میں نہ رکھنا کہ ہم دشمن کے دستِ تظلّم کا شکار ہو جائیں جس کے نتیجے میں ہم ایک طرف اپنی ذلت، کمتری، بے عزتی اور ماتحتی کو دیکھ کر اور دوسری طرف دشمن کے عروج و ترقی اور جاہ و منصب کو دیکھ کر یہ کہنے پر مجبور ہو جائیں کہ اگر ہم راہِ راست پر ہوتے تو ایسی اندوہناک اور دردناک حالت میں نہ ہوتے اور یہ کہ اگر شرک و کفر اللہ کے نزدیک قابلِ نفرت ہوتے تو مشرکین و کفار کا طبقہ ایسی عزت و منصب کا حامل نہ ہوتا۔ تو آپ کی دعا کا خلاصہ یہ ہوا کہ ہم اپنے رب سے خواستگار ہیں کہ وہ

ہمیں اُس صورتِ حال سے محفوظ رکھے جس میں حق و باطل اور حلال و حرام کی تمیز نہیں رہتی۔

ابراہیم علیہ السلام کی اس دعا میں ہمارے لئے متعدد پُر از تنبیہ اور آنکھیں کھولنے والے سبق موجود ہیں۔ گزشتہ دو صدیوں سے عالمِ اسلام نو آبادیاتی اثر کے تحت خود ساختہ غیر اسلامی طریقوں کی شدید گرفت میں ہے۔ اُن کے ظاہری فریب نظر اور بے دین طرزِ زندگی سے مسحور ہوتے ہوئے اور ایک طویل مدت تک اُن کی سیاسی حکومت کے تحت رہتے ہوئے مسلمان اپنے مذہب کے مرکز سے دور چلے گئے ہیں اور خود فراموشی اور خدا فراموشی کی دلدل میں ٹامک ٹوئیاں مار رہے ہیں۔

صورتِ حال کی سنجیدگی اپنے نقطہ کمال کو یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ آج کے اکثر نوجوان اپنے مذہب سے ناواقف ہونے اور یہ نہ جانتے ہوئے کہ خدائی کلام کی شکل میں کتنا قابلِ قدر خزانہ اُنہیں عطا ہوا ہے اور مادیت کے خیرہ کن حسن و جمال سے دہشت زدہ ہونے کے سبب اُن کا یہ یقین ہو چلا ہے کہ جاہ و منصب کے حامل اور دولتمند افراد ہی حقیقتاً اللہ کے پیارے ہیں جبکہ اللہ کے پرستار پسماندہ اور محرومی کا شکار ہیں۔ ایسی جرأت مندانہ اور بے خوفی کی سوچ الحاد کی گھٹیا اور شکست خوردہ ذہنیت کی پیداوار ہے اور اسی ہیبت ناک حقیقت نے معمارِ کعبہ اور دینِ حنیف کے علمبردار (جناب خلیل اللہ) کو کپکپا دیا تھا اور آپ نے بڑی انکساری سے اپنے خالق سے فریاد کی تھی کہ وہ اُسے ایسی ناپاک، غیر خالص اور شرمناک زندگی سے اُنہیں محفوظ رکھے:

رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا (المُمتحِنه : ۵)

''اے ہمارے پروردگار! ہمیں ان لوگوں کے لئے ''فتنہ'' نہ بنا جو کافر ہیں۔'' (۵ : ۶۰)

ایک مرتبہ جمال الدین افغانی نے صحیح کہا تھا:

''میں نے اپنے ذہن کی تمام مشینری کو مشرق کی بیماری اور اس کا علاج معلوم کرنے میں لگا دیا۔ تو میں نے معلوم کیا کہ اس کی بیماریوں میں سب سے زیادہ تباہ کن بیماری اس کے لوگوں کے مابین عدم اتحاد، اُن کی آراء میں انتشار، اتحاد پر اُن کی نا اتفاقی اور عدمِ اتحاد پر اُن کا متفق ہونا ہے۔ بالآخر میں نے اُن کے ہم آواز ہونے پر کام کیا اور اُنہیں مغربی خطرے کے خلاف تنبیہ کی جو اُنہیں گھیرے ہوئے ہے۔''

(''خطرات جمال الدین افغانی۔ محمد باشا المخزومی، صفحہ ۴۸)

جمال الدین افغانی کی تنبیہ سورۃ الانفال میں بیان کردہ اس الٰہی حکم کے بالکل موافق تھی:

وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ وَاصْبِرُوْا (الانفال : ۴۶)

''اور آپس میں جھگڑا مت کیا کرو ورنہ کم ہمت ہو جاؤ گے اور تمہاری ہوا اُکھڑ جائے گی اور صبر (مستقل مزاجی) سے کام لیتے رہو۔'' (۴۶ : ۸)

اب ہم ابراہیم علیہ السلام کے صاحبزادگان۔ اسمٰعیل اور اسحٰق علیہما السلام کے حال کی طرف آتے ہیں:

۲۲۱۲ (ابراہیم علیہ السلام اور اُن کے صاحبزادے)

(الف) حضرت اسمٰعیل علیہ السلام

پچاسی سال کی عمر تک ابراہیم علیہ السلام بے اولاد تھے۔ ایک دن آپ نے خدائے تعالیٰ کی بارگاہ میں فرزند کے لئے دعا کی اور اللہ تعالیٰ نے اُن کی دعا کو قبول فرمالیا اور اُنہیں تسلی دی:

رَبِّ هَبْ لِي مِنَ الصَّالِحِينَ O فَبَشَّرْنَاهُ بِغُلَامٍ حَلِيمٍ O (اَلصَّافّات : ۱۰۰، ۱۰۱)

''اے میرے پالنہار! مجھے ایک صالح فرزند عطا فرما۔ سو ہم نے اُنہیں ایک حلیم المزاج لڑکے کی بشارت دی۔'' (۳۷ : ۱۰۰، ۱۰۱)

حلیم المزاج لڑکے سے مراد اسمٰعیل علیہ السلام ہیں۔ لڑکے کے لئے حلم مزاجی کی اِس صفت کی تصریح یہود و نصاریٰ کے ردّ میں ہے جو آج تک حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو تند مزاجی و بدخوئی میں ضرب المثل کی شہرت دیئے ہوئے ہیں۔

یہ حمل آپ کی زوجہ مطہرہ سیّدہ ہاجرہ رضی اللہ عنہا کو ہوا۔ جب سیّدہ سارہ رضی اللہ عنہا کو اس کا علم ہوا تو اُنہیں بہ تقاضائے بشریت حضرت ہاجرہ سے رشک پیدا ہو گیا اور اُنہوں نے حضرت ہاجرہ کو تنگ کرنا شروع کیا۔ حضرت ہاجرہ مجبور ہو کر اُن کے پاس سے چلی گئیں۔ تھوڑے عرصہ کے بعد ہاجرہ کے ہاں بیٹا پیدا ہوا جس کا نام اسمٰعیل رکھا گیا۔

اسمٰعیل ''اِسمَع'' اور ''ایل'' دو لفظوں سے مرکب ہے۔ عبرانی میں ''ایل'' اللہ کے مرادف (ہم معنیٰ) ہے اور عربی کے اِسمَع کے معنی ہیں ''سُن''۔ چونکہ اسمٰعیل علیہ السلام کی ولادت کے بارہ میں اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کی دعا سن لی' اس لئے اُن کا یہ نام رکھا گیا۔ عبرانی میں اس کا تلفظ ''شماع ایل'' ہے۔

<u>وَادٍ غَيْرِ ذِي زَرْعٍ اور سیّدہ ہاجرہ و اسمٰعیل علیہما السلام</u>: سیّدہ ہاجرہ کے بطن سے اسمٰعیل علیہ السلام کا پیدا ہو جانا سیّدہ سارہ پر بے حد شاق گزرا۔ جناب ابراہیم علیہ السلام کی پہلی اور بڑی بیوی' قدیم سے گھر کی مالکہ' ہاجرہ چھوٹی بیوی اور اُن کی خدمت گزار' یہ سب باتیں تھیں جنہوں نے بشری تقاضے کے پیشِ نظر اسمٰعیل کی ولادت کو سیّدہ سارہ کے لئے سوہانِ روح بنا دیا تھا۔ اس لئے سیّدہ سارہ نے ابراہیم علیہ السلام سے اصرار کیا کہ ہاجرہ اور اُس کا بچہ اسمٰعیل میری نگاہ کے سامنے نہ رہیں اور اُنہیں علیحدہ کسی جگہ لے جاؤ۔ ابراہیم علیہ السلام کو یہ اصرار بے حد ناگوار گزرا لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ کو مطلع کیا کہ ہاجرہ' اسمٰعیل اور آپ کے لئے مصلحت اسی میں ہے کہ سارہ جو کچھ کہتی ہے' اُسے مان لو۔

تورات کے مخالف اور متضاد بیانات کے مقابلہ میں صحیح قول یہ ہے کہ ہاجرہ اور اسمٰعیل علیہما السلام کے خروج کے وقت اسمٰعیل شیر خوار بچہ تھے اور اسحٰق ابھی پیدا نہیں ہوئے تھے۔ صحیح بخاری میں سیّدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے جو روایت منقول ہے' وہ بھی اسی قول کی تائید کرتی ہے۔ اس روایت کا مضمون یہ ہے:

''ابراہیم ہاجرہ اور اُس کے شیر خوار بچہ اسمٰعیل کو لے کر چلے اور جہاں آج کعبہ ہے' اُس جگہ ایک بڑے درخت

کے نیچے زمزم کے موجودہ مقام سے بالائی حصہ پر اُنہیں چھوڑ گئے۔ وہ جگہ ویران اور غیر آباد تھی اور پانی کا بھی نام و نشان نہیں تھا۔ اس لئے آپ نے پانی کا ایک مشکیزہ اور کھجور کی ایک تھیلی اُن کے پاس چھوڑ دیں اور پھر منہ پھیر کر روانہ ہوئے۔ ہاجرہ اُن کے پیچھے پیچھے یہ کہتی ہوئی چلیں اے ابراہیم! تم ہمیں ایسی وادی میں کہاں چھوڑ کر چل دئے جہاں نہ آدمی ہے' نہ آدم زاد اور نہ کوئی مونس و غمخوار۔ ہاجرہ برابر یہ کہتی جاتی تھیں مگر ابراہیم علیہ السلام خاموش چلے جا رہے تھے۔ آخر ہاجرہ نے دریافت کیا کہ کیا آپ کے خدا نے آپ کو یہ حکم دیا ہے؟ تب آپ نے فرمایا کہ ہاں یہ خدا کے حکم سے ہے۔ ہاجرہ یہ سن کر کہنے لگیں کہ اگر یہ خدا کا حکم ہے تو بلاشبہ وہ ہمیں ضائع اور برباد نہیں کرے گا اور واپس ہولیں۔ ابراہیم چلتے چلتے جب ایک ٹیلے پر ایسی جگہ پہنچے کہ اُن کے اہل و عیال نگاہ سے اوجھل ہو گئے تو اُس جانب جہاں کعبہ ہے' رخ کیا اور ہاتھ اٹھا کر یہ دعا مانگی :

رَبَّنَا اِنِّیْ أَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِیْ بِوَادٍ غَيْرِذِیْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ أَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِیْٓ اِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ O (ابراھیم:۳۷)

''اے ہم سب کے پروردگار! میں نے اپنی کچھ اولاد کو ایک بے زراعت میدان میں تیرے معظم گھر کے قریب آباد کر دیا ہے (یہ اس لئے) اے ہمارے پروردگار! کہ وہ لوگ نماز کا اہتمام کریں' سو تو کچھ لوگوں کے دل اُن کی طرف مائل کر دے اور اُنہیں کھانے کو پھل دے جس سے وہ شکر گزار رہیں۔'' (۱۴:۳۷)

ہاجرہ چند روز تک مشکیزہ سے پانی اور خورجی سے کھجوریں کھاتی اور اسمٰعیل کو دودھ پلاتی رہیں لیکن وہ وقت بھی آ گیا کہ نہ پانی رہا اور نہ کھجوریں۔ تب وہ سخت پریشان ہوئیں۔ چونکہ وہ بھوکی پیاسی تھیں اس لئے دودھ بھی نہ اترتا تھا اور بچہ بھی بھوکا پیاسا رہا۔ جب حالت دگرگوں ہونے لگی اور بچہ بیتاب ہونے لگا تو ہاجرہ اسمٰعیل کو چھوڑ کر دُور جا بیٹھیں تاکہ اس حالتِ زار میں اُسے اپنی آنکھ سے نہ دیکھ سکیں۔ کچھ سوچ کر قریب کی پہاڑی صفا پر چڑھیں کہ شاید اللہ کا کوئی بندہ یا پانی نظر آ جائے لیکن کچھ نظر نہ آیا۔ پھر بچے کی محبت میں دوڑ کر وادی میں آ گئیں۔ اس کے بعد دوسری جانب کی پہاڑی مروہ پر چڑھ گئیں اور وہاں بھی جب کچھ نظر نہ آیا تو پھر تیزی سے لوٹ کر وادی میں بچے کے پاس آ گئیں۔ اس طرح آپ نے سات مرتبہ کیا۔ نبی اکرم ﷺ نے اس مقام پر پہنچ کر فرمایا کہ یہی وہ ''سعی بین الصفا والمروۃ'' ہے جو حج میں لوگ کرتے ہیں۔ آخر میں جب وہ مروہ پر تھیں تو کانوں میں ایک آواز آئی۔ چونکیں اور دل میں کہنے لگیں کہ کوئی پکارتا ہے۔ کان لگایا تو پھر آواز آئی۔ ہاجرہ کہنے لگیں کہ اگر تم مدد کر سکتے ہو تو سامنے آؤ۔ دیکھا تو افضل الملائکہ جبریل ہے۔ فرشتے نے اپنی ایڑی اُس جگہ پر ماری جہاں زمزم ہے۔ اُس جگہ سے پانی ابلنے لگا۔ ہاجرہ نے یہ دیکھا تو پانی کے چاروں طرف باڑ بنانے لگیں مگر پانی برابر ابلتا رہا۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ اُمِّ اسمٰعیل پر رحم کرے۔ اگر وہ زمزم کو اس طرح نہ روکتیں اور اُس کے چاروں جانب باڑ نہ لگاتیں تو آج وہ زبردست چشمہ ہوتا۔ ہاجرہ نے پانی پیا اور پھر اسمٰعیل کو دودھ پلایا۔ فرشتہ نے ہاجرہ سے کہا کہ خوف اور غم نہ کر۔ اللہ تعالیٰ تجھے اور اس بچہ کو ضائع نہ کرے گا۔ یہ مقام ''بیت اللہ'' ہے جس کی تعمیر اس بچہ (اسمٰعیل) اور اُس کے باپ ابراہیم کی قسمت میں مقدر ہو چکی ہے' اس لئے اللہ تعالیٰ اس خاندان کو ہلاک نہیں کرے گا۔ بیت اللہ کی یہ جگہ قریب کی زمین

سے نمایاں تھی مگر پانی کا سیلاب دائیں بائیں اس حصّہ کو برابر کرتا جارہا تھا۔ ابھی دوران میں بنی جرہم کا ایک قبیلہ اس وادی کے قریب آکر ٹھہرا۔ دیکھا تو تھوڑے سے فاصلہ پر پرندے اُڑ رہے ہیں۔ جرہم نے کہا یہ پانی کی علامت ہے، یہاں ضرور پانی موجود ہے۔ جرہم نے بھی قیام کی اجازت مانگی۔ ہاجرہ نے فرمایا: قیام کر سکتے ہو لیکن پانی میں ملکیت کے حصّہ دار نہیں ہو سکتے۔ جرہم نے یہ بات بخوشی منظور کر لی اور وہیں مقیم ہو گئے۔ جرہم نے اپنے باقی ماندہ اہلِ خاندان کو بھی بلا لیا اور یہاں مکانات بنا کر رہنے لگے۔ اُنہی میں اسمٰعیل بھی رہتے اور کھیلتے اور اُن سے اُن کی زبان سیکھتے۔ جب اسمٰعیل بڑے ہو گئے تو اُن کا طرز و انداز اور اُن کی خوبصورتی بنی جرہم کو بہت بھائی اور انہوں نے اپنے خاندان کی لڑکی سے اُن کی شادی کر دی۔ اس کے کچھ عرصہ بعد سیّدہ ہاجرہ رضی اللہ عنہا کا انتقال ہو گیا۔ ابراہیم علیہ السلام برابر اپنے اہل و عیال کو دیکھنے آتے رہتے تھے۔

یہ طویل روایت صحیح بخاری کی کتاب الرؤیا اور کتاب الانبیاء میں دو جگہ منقول ہے اور دونوں سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ اسمٰعیل علیہ السلام وَادٍ غَيْرِ ذِي زَرْعٍ (بن کھیتی کی سرزمین) یعنی مکہ میں بحالتِ شیر خوارگی پہنچے تھے۔ مگر سید سلیمان ندوی ''ارض القرآن'' میں تورات کی روایت کی تردید یا تصحیح کرتے ہوئے یہ تحریر فرماتے ہیں کہ اسمٰعیل علیہ السلام اُس وقت سن رُشد کو پہنچ چکے تھے اور سورۃ الصّٰٓفّٰت کی آیات ۱۰۰ تا ۱۰۲، ۱۱۲ اور ۱۱۳ سے استدلال کرتے ہیں جو صحیح نہیں ہے۔

ذبحِ عظیم : مقربین بارگاہِ الٰہی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا معاملہ وہ نہیں ہوتا جو عام انسانوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ اُنہیں امتحان و آزمائش کی سخت سے سخت منزلوں سے گزرنا پڑتا ہے اور قدم قدم پر جاں سپاری اور تسلیم و رضا کا مظاہرہ کرنا ہوتا ہے۔ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ہے کہ ہم گروہِ انبیاء اپنے اپنے مراتب کے اعتبار سے امتحان کی صعوبتوں میں ڈالے جاتے ہیں۔ ابراہیم علیہ السلام بھی چونکہ جلیل القدر نبی اور پیغمبر ہیں اس لئے اُنہیں بھی مختلف آزمائشوں سے دوچار ہونا پڑا اور اپنی جلالتِ قدر کے لحاظ سے ہر دفعہ امتحان میں کامل و مکمل ثابت ہوئے۔ نارِ نمرود میں ڈالا جانا اور بڑھاپے کی تمناؤں کے مرکز، شب و روز کی دعاؤں کے ثمر اور گھر کے چشم و چراغ یعنی شیر خوار اسمٰعیل کو مع اُن کی والدہ کے بے آب و گیاہ میدان میں چھوڑ آنا اس کی زندہ مثالیں ہیں۔

ان دونوں کٹھن منزلوں کو عبور کرنے کے بعد اب ایک تیسرے امتحان کی تیاری ہے جو پہلے دونوں سے بھی زیادہ جاں گسل امتحان ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام تین شب مسلسل خواب دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اے ابراہیم! ہماری راہ میں اپنے اکلوتے بیٹے کی قربانی دو۔ انبیاء علیہم السلام کا خواب ''رؤیائے صادقہ'' اور وحیِ الٰہی ہوتا ہے۔ اس لئے آپ رضا و تسلیم کا پیکر بن کر تیار ہو گئے مگر چونکہ یہ معاملہ تنہا اپنی ذات سے وابستہ نہ تھا بلکہ اس آزمائش کا دوسرا جزء وہ ''بیٹا'' تھا جس کی قربانی کا حکم دیا گیا تھا۔ اس لئے باپ نے بیٹے کو اپنا خواب اور خدا کا حکم سنایا۔ بیٹا بھی تو ابراہیم جیسے جدّ الانبیاء والرسل جناب خلیل اللہ کا بیٹا تھا، فوراً سرِ تسلیم خم کر دیا اور کہنے لگا:

يٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِيٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ O (اَلصّٰٓفّٰت : ۱۰۲)

''ابا جان! جو حکم آپ کو ملا ہے اُسے کر ڈالئے، آپ انشاء اللہ مجھے صابرین میں سے پائیں گے۔'' (۳۷:۱۰۲)

اس گفتگو کے بعد باپ بیٹا اپنی قربانی پیش کرنے کے لئے جنگل روانہ ہو گئے۔ باپ نے بیٹے کی مرضی پا کر جانور کی طرح اسمٰعیل علیہ السلام کے ہاتھ پیر باندھے' چھری کو تیز کیا اور بیٹے کو پیشانی کے بل پچھاڑ کر ذبح کرنے لگے۔ فوراً وحیِ الٰہی نازل ہوئی:

يَاإِبْرٰهِيمُ قَدْصَدَّقْتَ الرُّءْ يَا إِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُحْسِنِيْنَ ○ إِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلٰٓؤُ الْمُبِيْنُ ○ وَفَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ ○ (الصَّافّات : ۱۰۴ تا ۱۰۷)

''اے ابراہیم! تم نے خواب کو خوب سچ کر دکھایا' ہم مخلصین کو ایسا ہی صلہ دیا کرتے ہیں۔ بے شک یہ تھا بھی کھلا امتحان۔ اور ہم نے اس کے عوض میں ایک بڑا ذبیحہ دیا۔'' (۱۰۴ تا ۱۰۷ : ۳۷)

عَظِیْم یہاں بمعنی عظیم القدر ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ ایک دنبہ تھا جو جنت سے آیا تھا۔ اس پر یہ شبہ نہ ہو کہ جنت کی چیز کو فنا کیسے آ گئی۔ جواب یہ ہے کہ جب وہ ناسوت میں لایا گیا تو تاثیرات و خصوصیات بھی یہاں کی پیدا ہو گئیں اور ہو سکتا ہے کہ جنت میں شروع ہی سے اسی غرضِ مخصوص کے لئے رکھا گیا ہو۔ فقہاء نے یہاں یہ سوال پیدا کیا ہے کہ آیا ذبحِ ولد کی نذر ماننا اور اس کا ایفاء بکری کے ذبح سے کرنا جائز ہے؟ اور پھر جواب دیا کہ آیت کو نذر سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ تو محض امتثالِ امر تھا نہ کہ ایفائے نذر۔ لڑکے کے ذبح کرنے کی نذر بہرصورت اور بالاتفاق ناجائز ہے لیکن اگر کوئی بدعقل ایسی نذر مان لے تو امام مالک کے نزدیک اس کے بدلے بکری قربان کر دے لیکن امام شافعی نے کہا ہے کہ یہ سرے سے معصیت ہے جس پر اُسے استغفار کرنا چاہئے۔ امام ابو یوسف کی رائے ہے کہ ایسی نذر ہی سرے سے باطل ہے' اس لئے اس کا کچھ کفارہ اور بدلہ بھی نہیں۔ (تفسیر ماجدی اردو' صفحہ ۹۰۱' نوٹ ۵۵)

یہی وہ قربانی ہے جو بارگاہِ الوہیت میں ایسی مقبول ہوئی کہ بطور یادگار کے ہمیشہ کے لئے ملّتِ ابراہیمی کا شعار قرار پائی اور آج بھی ذی الحجہ کی دسویں تاریخ کو تمام دنیائے اسلام میں یہ ''شعار'' اسی طرح منایا جاتا ہے۔

آیا ذبیح اللہ اسمٰعیل علیہ السلام ہیں یا اسحٰق علیہ السلام؟ ابراہیم علیہ السلام کو اپنے دو بیٹوں اسمٰعیل اور اسحٰق علیہما السلام میں سے کس بیٹے کے ذبح کرنے کا حکم ہوا' ایک اہم سوال ہے جسے حل ہونا چاہئے۔ بیٹوں کی یہ دونوں ہستیاں پیغمبرِ خدا ہونے اور ایک جلیل القدر نبی کی اولاد ہونے کے باعث ہمارے نزدیک انتہائی محترم اور ہمارا جزوِ ایمان ہیں۔ علاوہ ازیں ہمارے پیارے پیغمبر ﷺ کی خداداد عظمت و توقیر اس قدر اعلیٰ و ارفع ہے کہ اگر اسمٰعیل علیہ السلام کو ذبح ہونے جیسے معزز کام کے لئے نہ بھی منتخب کیا جاتا تو بھی ہمارے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی شانِ رفیعت میں ذرّہ بھر فرق نہیں آتا تھا۔ اس لئے ہم مسلمان ایسے متعصّبانہ خیال سے بہت دُور ہیں کہ کسی عظیم انسان کی فضیلت کو چھین کر کسی اور کو عطا کر دیں۔ لیکن تاریخی حقائق اور مسلّمہ واقعات کا ردّ کرنا اور ایک صحیح خیال کی جگہ غلط خیال کو جگہ دینا بھی تو درست بات نہیں۔ لہٰذا غیر متعصبانہ ذہن اور بے رنگی عینکوں (چشموں) کے ذریعے ہم معروضی طور پر معاملے کا تجزیہ کرتے ہیں تاکہ کسی صحیح نتیجے تک پہنچ سکیں۔

یہود کا دعویٰ ہے کہ ذبیح اللہ اُن کے پیغمبر اسحٰق علیہ السلام ہیں اور اسحٰق علیہ السلام کی قربانی کا ذکر ہم تورات

کے باب پیدائش Genesis:22 میں پاتے ہیں لیکن اُسی باب کے مختلف مقامات پر اس بات کا بھی ذکر ہے کہ ابراہیم علیہ السلام اپنے جس بیٹے کو قربانی کے لئے ساتھ لے گئے وہ اُن کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اس چیز کے پیشِ نظر کیا یہود یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ حضرت اسحٰق علیہ السلام اپنے والد کے اکلوتے بیٹے تھے؟ بلکہ پیدائش کے اکیسویں باب کی آیات ہشتم اور نہم یہ بتاتی ہیں کہ سیّدہ ہاجرہ کے ہاں ایک بیٹا اسحٰق علیہ السلام سے پہلے پیدا ہو چکا تھا اور اسحٰق علیہ السلام بڑے ہوئے' اُن کا دودھ چھڑایا گیا اور اُن کے دودھ چھڑانے کے دن ابراہیم علیہ السلام نے ایک عظیم ضیافت کا اہتمام کیا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اسمٰعیل علیہ السلام اپنے بھائی اسحٰق علیہ السلام کے دودھ چھڑانے کے وقت اُن سے عمر میں خاصے بڑے تھے۔

جیسا کہ پہلے بیان ہوا کہ ابراہیم علیہ السلام' اسمٰعیل علیہ السلام کی پیدائش کے وقت چھیاسی (۸۶) برس کے اور اسحٰق علیہ السلام کی پیدائش کے وقت سو (۱۰۰) برس کے تھے جس کا مطلب یہ ہے کہ اسحٰق علیہ السلام کی پیدائش کے وقت اسمٰعیل علیہ السلام چودہ برس کے تھے اور جب آپ کے والد نے قربانی کے لئے ان کی تیرہ برس کی عمر میں اُنہیں ساتھ لیا تو اُس وقت ابراہیم علیہ السلام کا اکلوتا بیٹا اسمٰعیل علیہ السلام ہی تھا نہ کہ اسحٰق علیہ السلام۔

تورات کی ان روایات کا تجزیہ کرنے کے بعد ہم اب اللہ کی آخری کتاب یعنی قرآن مجید کی طرف رجوع کرتے ہیں اور ابراہیم علیہ السلام کو بارگاہِ الوہیت میں ایک نیک و صالح فرزند دئے جانے کی دعا کرتا دیکھتے ہیں۔ اُن کی دعا قبول ہوتی ہے۔ بچہ پیدا ہوتا ہے' بڑا ہوتا ہے اور جوان ہوتا ہے۔ ابراہیم علیہ السلام خواب میں اپنے بچے کے ذبح کرنے کا اشارہ پاتے ہیں۔ جب اس ذبحِ عظیم کے امتحان میں کامیاب ہوتے ہیں تو آپ کو مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْن (الصّافّات: ۱۱۱) کے مژدہِ جانفزا سے نوازا جاتا ہے۔ ان تمام واقعات کے بعد کہا جاتا ہے:

وَبَشَّرْنَاهُ بِإِسْحٰقَ نَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ O وَبٰرَكْنَا عَلَيْهِ وَعَلٰى إِسْحٰقَ ((الصّافّات: ۱۱۲' ۱۱۳)

''اور ہم نے اُسے اسحاق کی بشارت دی کہ نبی اور نیک بندوں میں ہوں گے۔ اور ہم نے ابراہیم پر اور اسحٰق پر برکتیں نازل کیں۔'' (۱۱۲' ۱۱۳ : ۳۷)

مزید برآں حضرت اسحٰق علیہ السلام کی پیدائش کی خوشخبری دینے کے ساتھ ساتھ یعقوب علیہ السلام کی ولادت کی خوشخبری بھی دی گئی:

فَبَشَّرْنٰهَا بِإِسْحٰقَ وَمِنْ وَّرَآءِ إِسْحٰقَ يَعْقُوْبَ O (ھود: ۷۱)

''پھر ہم نے اُنہیں (حضرت سارہ کو) اسحاق کی بشارت دی اور اسحٰق کے آگے یعقوب کی۔'' (۷۱ : ۱۱)

اس سے ظاہر ہے کہ اسحٰق علیہ السلام کے ہاں یعقوب نامی بیٹا پیدا ہوا۔ قابلِ توجہ نکتہ یہ ہے کہ ایک طرف تو اللہ تعالیٰ اسحٰق علیہ السلام اور اُن کے بیٹے یعقوب علیہ السلام کی پیدائش کی خبر دیتا ہے جبکہ دوسری طرف وہ اسحٰق علیہ السلام کے جوان ہونے سے پہلے اُن کے قربان کرنے کا حکم دیتا ہے۔ اللہ کے کلام میں ایسی تضاد بیانی کا تصور تک نہیں کیا جا سکتا! بعض حضرات نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ حضرت اسحٰق کو قربانی دینے کے لئے آپ اُس وقت لے گئے جب حضرت یعقوب کی پیدائش ہوگئی۔ یہ جواب قطعاً قابلِ تسلیم نہیں کیونکہ قرآن میں ہے فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ

(جب وہ اتنا بڑا ہو گیا کہ آپ کے ساتھ دوڑ دھوپ کر سکے)۔ اس کے علاوہ یہ امر بھی غور طلب ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جس میدان میں اپنے بیٹے کو ذبح کرنا چاہا وہ منیٰ کا میدان ہے جو مکہ میں ہے۔ یہ تاریخی واقعہ عرب میں ساڑھے چار ہزار سال سے معروف و مشہور تھا اور تاریخ میں کوئی ایسی شہادت نہیں جس سے معلوم ہو کہ حضرت اسحاق مکہ میں تشریف لائے ہوں۔ مکہ میں آنے والے حضرت اسماعیل ہی ہیں اور وہی ذبیح اللہ ہیں۔ (ضیاء القرآن' جلد چہارم' صفحات ۲۱۲ تا ۲۱۴) ☆

''تعمیر کعبہ: ابراہیم علیہ السلام اگرچہ فلسطین میں مقیم تھے مگر برابر مکہ میں ہاجرہ و اسمٰعیل علیہما السلام کو دیکھنے آتے رہتے تھے۔ اسی اثناء میں ابراہیم علیہ السلام کو حکمِ الٰہی ہوا کہ کعبۃ اللہ کی تعمیر کرو۔ آپ نے اسمٰعیل علیہ السلام سے تذکرہ کیا اور دونوں باپ بیٹوں نے بیت اللہ کی تعمیر شروع کر دی۔

حافظ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری کی جلد ہشتم کے صفحہ ۱۳۸ میں ایک روایت نقل کی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بیت اللہ کی سب سے پہلی اساس حضرت آدم علیہ السلام کے ہاتھوں رکھی گئی اور ملائکۃ اللہ نے انہیں وہ مقام بتا دیا تھا جہاں کعبہ کی تعمیر ہونی تھی۔ مگر ہزاروں سالوں کے حوادث نے عرصہ ہوا' اُسے بے نشان کر دیا۔ البتہ اب بھی وہ ایک ٹیلہ یا ابھری ہوئی زمین کی شکل میں موجود تھا۔ یہی وہ مقام ہے جسے وحیِ الٰہی نے ابراہیم علیہ السلام کو بتایا اور اُنہوں نے اسمٰعیل علیہ السلام کی مدد سے اُسے کھودنا شروع کیا تو سابق تعمیر کی بنیادیں نظر آنے لگیں۔ انہی بنیادوں پر بیت اللہ کی تعمیر کی گئی مگر قرآنِ عزیز نے بیت اللہ کی تعمیر کا معاملہ ابراہیم علیہ السلام ہی سے شروع کیا ہے اور اس سے پہلی حالت کا کوئی تذکرہ نہیں کیا۔ اور صرف اسی بیان پر اکتفا کیا:

إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِىْ بِبَكَّةَ مُبَارَكًا وَّهُدًى لِّلْعَالَمِيْنَ O (آل عمران: ۹۶)

''سب سے پہلا مکان جو لوگوں کے لئے وضع کیا گیا' وہ وہ ہے جو مکہ میں ہے' (سب کے لئے) برکت والا اور جہان والوں کے لئے ہدایات (کا سرچشمہ) ہے۔'' (۳:۹۶)

مُبَارَكًا یہ وہ مقام ہے جس میں مادّی اور روحانی' دنیاوی اور دینی برکتیں جمع کر دی گئی ہیں۔ هُدًى یعنی اس سے جو پیغام دنیا کو سنایا گیا' اس میں سب کے لئے رُشد و ہدایت کی روشنی ہے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ مکہ نام ہے کل شہر کا اور بکّہ کا اطلاق ہے مسجدِ حرام اور مطاف پر۔ (ابن جریر)

اسی تعمیر کو یہ شرف حاصل ہے کہ ابراہیم جیسا جلیل القدر پیغمبر اُس کا معمار ہے اور اسمٰعیل جیسا نبی و ذبیح اُس کا مزدور ہے۔ باپ بیٹا برابر اُس کی تعمیر میں مصروف ہیں اور جب اُس کی دیواریں اوپر کو اُٹھتی ہیں اور بزرگ باپ کا ہاتھ اوپر تعمیر سے معذور ہو جاتا ہے تو قدرت کی ہدایت کے مطابق ایک پتھر کو باڑ بنایا جاتا ہے جسے اسمٰعیل علیہ السلام اپنے ہاتھ سے سہارا دیتے اور ابراہیم علیہ السلام اُس پر چڑھ کر تعمیر کرتے جاتے ہیں۔ یہی وہ یادگار ہے جو

☆اس مسئلہ پر مولانا عبدالحمید صاحب فراہی مرحوم کا رسالہ 'الرائے النجیح فی من هو الذبیح'' بہترین معلومات کا حامل ہے۔

آج ''مقامِ ابراہیم'' کے نام سے موسوم ہے۔ جب تعمیر اس حد پر پہنچی جہاں آج حجرِ اسود نصب ہے' تو جبریلِ امین نے اُن کی راہ نمائی کی اور حجرِ اسود کو اُن کے سامنے ایک پہاڑی سے محفوظ نکال کر دیا جسے جنت سے لایا ہوا پتھر کہا جاتا ہے تاکہ وہ نصب کر دیا جائے۔

بیت اللہ تعمیر ہو گیا تو اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو بتایا کہ یہ ملتِ ابراہیمی کے لئے قبلہ اور ہمارے سامنے جھکنے کا نشان ہے اس لئے اسے توحید کا مرکز قرار دیا جاتا ہے۔ رب تعالیٰ نے اپنے خلیل کو حکم دیا کہ وہ لوگوں میں حج کا اعلان کر دیں:

وَاَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَأْتُوْكَ رِجَالاً وَّعَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّأْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍo لِيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ وَ يَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰى مَارَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ فَكُلُوْا مِنْهَا وَ اَطْعِمُوا الْبَآئِسَ الْفَقِيْرَo ثُمَّ لْيَقْضُوْا تَفَثَهُمْ وَلْيُوْفُوْا نُذُوْرَهُمْ وَلْيَطَّوَّفُوْا بِالْبَيْتِ الْعَتِيْقِo (اَلْحَجّ: ۲۷ تا ۲۹)

''اور لوگوں میں حج کا اعلان کر دو' لوگ تمہارے پاس پیدل بھی آئیں گے اور دُبلی اونٹنیوں پر بھی جو دُور دراز راستوں سے پہنچی ہوں گی تاکہ وہ اپنے فوائد کے لئے آموجود ہوں اور تاکہ ایامِ معلوم میں اُن چوپایوں پر اللہ کا نام لیں جو اللہ نے اُنہیں عطا کئے ہیں' پس تم بھی اس میں سے کھاؤ اور مصیبت زدہ محتاج کو بھی کھلاؤ۔ پھر لوگوں کو چاہئے کہ اپنا میل کچیل دُور کریں' اپنے واجبات کو پورا کریں اور چاہئے کہ اس مقدس گھر کا طواف کریں۔''

يَـأْتُوْكَ میں كَ بول کر جگہ مراد لی گئی۔ معنًا یہ دراصل يَـأْتُوا بَيْتَكَ یا مَـقَامَكَ ہے۔ (تفسیر نعیمی' جلد ۷' صفحہ ۴۹' لاہور مطبوعہ اکتوبر ۱۹۹۹ء/ رجمادی الثانی ۱۴۲۰ھ)

فوائد سے مراد اصلاً تو منافعِ اُخروی ہیں مثلاً حج' عمرہ' رضائے الٰہی اور تبعاً دنیوی بھی مثلاً تجارت البتہ دنیوی منافع کو مستقل مقصود بنا لینا ممنوع ہے۔ احکامِ الٰہی کی تعمیل بذاتِ خود سب سے بڑی روحانی لذت ہے۔ پھر اسلام کے مولد' سردارِ اسلام کے وطن اور ان تمام مقامات کی زیارت جن سے اسلام و سردارِ اسلام دونوں کی اوّلین تاریخ وابستہ ہے' کس درجہ سبق آموز' ولولہ انگیز و مؤثر ہو سکتی ہے۔ دنیوی و ملّی حیثیت کو لے تو مسلمانانِ عالم کے درمیان تبادلہ خیالات اور یک جہتی پیدا کرنے کے لئے نیز بین الاقوامی تجارت و سیاست کے لئے اس سالانہ عالمگیر اجتماع سے بہتر ذریعہ اور کیا ہو سکتا ہے؟ اور افراد کو اکثر بحری سفر کے جو لمبے تجربے ہو جاتے ہیں وہ ان سب کے علاوہ ہیں۔

مقامِ ابراہیم: مقامِ ابراہیم ایک چھوٹا سا گنبد نما قبّہ (Cupola) ہے جو بابِ کعبہ کے مقابل فولادی ستونوں پر کھڑا ہے۔ اگرچہ مسجدِ حرام کی تمام زمین مقدس اور قابلِ تعظیم ہے لیکن وہ جگہ جسے تعمیرِ کعبہ کے دوران ابراہیم علیہ السلام کے پاؤں مبارک کا چھونا نصیب ہوا' ایسی خوش بخت ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی ایسی محبوب ہوئی کہ

حاجیوں اور عمرہ کرنے والوں کے لئے سجدہ گاہ بن گئی۔ سورۃ البقرۃ میں اُنہیں طوافِ کعبہ کی تکمیل کے بعد مقامِ ابراہیم کے قریب دو رکعت نماز پڑھنے کا حکم دیا گیا اور فرمایا گیا:

وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهِيْمَ مُصَلًّى (البقرۃ: ۱۲۵)

''اور مقامِ ابراہیم کو نماز کی جگہ بنالو۔'' (۱۲۵ : ۲)

اسمٰعیل علیہ السلام کا ذکر قرآنِ حکیم میں: حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کا ذکر قرآنِ حکیم میں کثیر الوقوع ہوا ہے۔ سورۃ الصّافّات کی آیت ۱۰۱ میں اُنہیں ''غلام حلیم'' کہا گیا ہے۔ سورہ مریم میں اُن کا ذکر اُن کی تمام صفاتی خصوصیات کے ساتھ کیا گیا ہے:

وَاذْكُرْ فِى الْكِتٰبِ اِسْمٰعِيْلَ اِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا ۝ وَكَانَ يَاْمُرُ اَهْلَهٗ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ وَكَانَ عِنْدَ رَبِّهٖ مَرْضِيًّا ۝ (مریم: ۵۴، ۵۵)

''اور آپ (اس) کتاب میں اسمٰعیل کا (بھی) ذکر کیجئے' بے شک وہ وعدہ کے (بڑے ہی) سچے تھے اور رسول تھے' نبی تھے۔ اور وہ اپنے گھر والوں کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیتے رہتے تھے اور وہ اپنے رب کے نزدیک پسندیدہ تھے۔'' (۵۴، ۵۵ : ۱۹)

اس طرح اسمٰعیل علیہ السلام اُمتِ عرب کے اصل منبع (Fountain head) ہیں اور اللہ کے آخری نبی اور رسول ﷺ آپ ہی کی اولاد میں ہیں۔

اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد: آپ کی اولاد کا ذکر نہ تو قرآنِ حکیم میں اور نہ ہی احادیثِ مبارکہ میں ہے۔ تاہم تورات ہمیں بتاتی ہے کہ آپ کے بارہ بیٹے تھے جو اپنے اپنے قبیلوں کے سردار تھے۔ بشامہ نامی آپ کی ایک لڑکی بھی تھی (پیدائش: ۱۲-۱۶)۔ نابت اور قیدار نامی آپ کے دو مشہور و معروف لڑکوں کا ذکر تورات میں کثیر الوقوع ہوا ہے۔ نابت کی اولاد اَصحابُ الحِجر کہلائی (بحوالہ سورۃ الحِجر: ۸۰) اور قیدار کی اولاد اصحاب الرّسّ کہلائی (بحوالہ سورہ قٓ: ۱۲)۔ آپ کے دیگر لڑکوں اور اُن کے خاندان کی سوانح بہت شاذ ہی ملتی ہیں۔

اسمٰعیل علیہ السلام کی وفات: حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی وفات ایک سو چھتیس (۱۳۶) سال کی عمر میں ہوئی۔ اُس وقت اُن کے سامنے اُن کی اولاد اور نسل کا سلسلہ بہت پھیل گیا تھا جو حجاز' شام' عراق' فلسطین اور مصر تک پھیلی۔ تورات ایک موقع پر اشارہ کرتی ہے کہ آپ کا مزارِ مبارک فلسطین ہی میں ہے اور یہیں اُن کی وفات ہوئی اور عرب مؤرخین کہتے ہیں کہ وہ اور اُن کی والدہ ہاجرہ رضی اللہ عنہا بیت اللہ کے قریب حرم کے اندر مدفون ہیں۔
(تاریخ طبری' جلد اوّل)

(ب) حضرت اسحٰق علیہ السلام

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عمر سو سال کی ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے اُنہیں بشارت دی کہ سارہ کے بطن سے بھی تمہارا ایک بیٹا ہوگا' اُس کا نام اسحٰق رکھنا۔ اُس وقت سیّدہ سارہ رضی اللہ عنہا کی عمر نوّے (۹۰) برس تھی۔ قرآن حکیم میں اس واقعہ کا ذکر کئی مقامات پر ہوا ہے جن میں سے ایک یہ ہے :۔

وَلَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُنَا اِبْرٰهِیْمَ بِالْبُشْرٰی قَالُوْا سَلٰمًا قَالَ سَلٰمٌ فَمَا لَبِثَ اَنْ جَآءَ بِعِجْلٍ حَنِیْذٍO فَلَمَّا رَاٰۤ اَیْدِیَهُمْ لَا تَصِلُ اِلَیْهِ نَكِرَهُمْ وَ اَوْجَسَ مِنْهُمْ خِیْفَةً قَالُوْا لَا تَخَفْ اِنَّاۤ اُرْسِلْنَاۤ اِلٰی قَوْمِ لُوْطٍO وَامْرَاَتُهٗ قَآئِمَةٌ فَضَحِكَتْ فَبَشَّرْنٰهَا بِاِسْحٰقَ وَ مِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ یَعْقُوْبَO قَالَتْ یٰوَیْلَتٰۤی ءَاَلِدُ وَاَنَا عَجُوْزٌ وَّهٰذَا بَعْلِیْ شَیْخًا اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ عَجِیْبٌO قَالُوْۤا اَتَعْجَبِیْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ رَحْمَتُ اللّٰهِ وَبَرَكٰتُهٗ عَلَیْكُمْ اَهْلَ الْبَیْتِ اِنَّهٗ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌO (ھود : ۶۹ تا ۷۳)

''اور بالیقین ہمارے فرستادے ابراہیم کے پاس خوشخبری لے کر آئے اور بولے: آپ پر سلام ہو۔ (ابراہیم نے) کہا (تم پر بھی) سلام۔ پھر تھوڑی ہی دیر بعد آپ ایک تلا ہوا بچھڑا لے آئے۔ پھر جب ابراہیم نے دیکھا کہ اُن کے ہاتھ اس (کھانے) کی طرف نہیں بڑھ رہے تو اُن سے متوحش ہوئے اور اُن سے دل میں خوفزدہ ہوئے۔ وہ بولے کہ ڈریئے نہیں ہم تو قوم لوط کی طرف بھیجے گئے ہیں۔ اور آپ کی بیوی کھڑی تھیں پس وہ ہنسیں پھر ہم نے اُنہیں بشارت دی اسحٰق کی اور اسحٰق کے آگے یعقوب کی۔ وہ بولیں: ہائے خاک پڑے کیا (اب) میں بچہ جنوں گی درآنحالیکہ میں بوڑھی ہو چکی ہوں اور یہ میرے میاں (بھی) بالکل بوڑھے ہیں' یہ تو بڑی ہی عجیب بات ہے۔ وہ بولے: کیا تم اللہ کے کام میں تعجب کرتی ہو؟ اے خاندان والو! تم پر اللہ کی (خاص) رحمت اور اُس کی برکتیں نازل ہوتی رہتی ہیں' بے شک وہ تعریف کے لائق اور بڑی ہی شان والا ہے۔'' (۶۹ تا ۷۳ : ۱۱)

فقہاء مفسرین نے اس سے یہ نکالا ہے کہ سلام فرشتوں کا طریقہ ہے اور اہلِ اسلام میں بھی ہر دَور میں رائج و شائع رہا ہے۔ وقت کا دستور یہ تھا کہ جو دشمن یا ڈاکو کسی کو اپنا ہدف بنانا چاہتے تھے تو اُس کے ہاں کھانے سے پرہیز کرتے تھے اور جس کے ہاں سے کھا لیتے تو اُسے نہ ستاتے۔ ابراہیم علیہ السلام کو قدرۃً ایسے موقع پر یہی خیال گزرا اور اُن سے خوف دہراس بھی طبعی طور پر پیدا ہوا جو بھوک اور پیاس کی طرح امورِ طبعی ہیں اور مرتبہ ولایت تو کیا' مرتبہِ رسالت کے بھی ذرّہ بھر منافی نہیں۔ خوشگوار حیرت کے وقت ہنسی کا آ جانا بالکل امرِ طبعی ہے اور خوشگوار حیرت کا موقع اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا کہ گھر کے اندر جن آنے والوں کو انسان اور وہ بھی دشمن سمجھا جا رہا تھا وہ دوست اور دوست بھی کیسے اللہ کے فرشتے نکلے۔ اِمْرَاَتُہ' سے مراد ابراہیم علیہ السلام کی زوجہ اُولیٰ سیّدہ سارہ بنت حاران رضی اللہ عنہا ہیں جو ظاہراً پہلے اس جگہ نہ تھیں شاید پردہ میں ہوں۔ پھر جب معلوم ہو گیا کہ فرشتے ہیں' اُن سے کیا پردہ؟ سامنے چلی آئیں جیسا کہ سورۃ الذاریات (۵۱) کی آیت (۲۹) کے لفظ فَاَقْبَلَتْ سے معلوم ہوتا ہے۔ سیّدہ سارہ کا یہ خوشخبری سن کر اسبابِ ظاہری و مادّی کے لحاظ سے اس پر تعجب کرنا بالکل قدرتی تھا اور یہیں سے ہمارے محققین نے

کہا ہے کہ کسی واقعہ پر اسبابِ ظاہر کے لحاظ سے تعجب کرنا مسبب الاسباب پر یقینِ کامل رکھنے کے منافی نہیں۔عربی میں یٰوَیْلَتٰیٓ اظہارِ حیرت و تعجب کے موقع پر بولتے ہیں۔ زوجہ پیغمبر سیّدہ سارہ رضی اللہ عنہا کے اس اظہارِ حیرت پر اب خود فرشتے اظہارِ حیرت کر رہے ہیں۔ محققین نے اس مکالمہ سے یہ نکالا ہے کہ ملائکہ کی گفتگو غیر نبی کے ساتھ ناممکن نہیں۔ أَهلَ الْبَيْت نے اسے صاف کر دیا کہ پیغمبر کے زوج پر ''اہلِ بیت'' کا اطلاق تو بہر حال ہوتا ہے بلکہ اہل بیتِ نبوی کا مفہومِ اوّل تو ازواجِ نبی ہی ہوتے ہیں۔

''اسحٰق تلفّظ کے اعتبار سے ''یصحق'' ہے جو عبرانی لفظ ہے جس کا عربی ترجمہ ''یَضحَك'' (ہنسنا) ہے۔فرشتوں نے جب ابراہیم علیہ السلام کو سو برس اور سیّدہ سارہ کو نوّے سال کی عمر میں بیٹا ہونے کی بشارت دی تھی تو ابراہیم علیہ السلام نے اچنبھا سمجھا تھا اور سیّدہ سارہ کو بھی یہ سن کر ہنسی آ گئی تھی۔اس لئے اُن کا یہ نام تجویز ہوا یا اس لئے یہ نام رکھا گیا کہ اُن کی پیدائش حضرت سارہ کی مسرت و شادمانی کا باعث ہوئی۔عربی قاعدہ سے یَضحَك مضارع کا صیغہ ہے۔اہلِ عرب کا ہمیشہ سے ہی یہ دستور رہا ہے کہ وہ مضارع کے صیغوں کو بھی بطور نام کے استعمال کرتے ہیں۔چنانچہ یَعرب' یملك جیسے نام عرب میں معروف و مشہور ہیں۔'' (قصص القرآن' ج ۱' ص ۲۵۰)

''اسحٰق علیہ السلام کی اولاد : رفقہ سے اسحٰق علیہ السلام کے دو جڑواں لڑکے عیسو اور یعقوب پیدا ہوئے۔اُس وقت حضرت اسحٰق کی عمر ساٹھ سال تھی۔اسحٰق علیہ السلام عیسو کو زیادہ چاہتے تھے اور رفقہ یعقوب سے زیادہ پیار رکھتی تھیں۔عیسو شکاری تھا اور بوڑھے ماں باپ کو شکار کا گوشت لا کر دیتا تھا اور یعقوب خیمہ ہی میں رہتا تھا

ابراہیم علیہ السلام اور حق الیقین کی طلب : ابراہیم علیہ السلام کو حقائقِ اشیاء کی جستجو اور طلب کا طبعی ذوق تھا اور وہ ہر شے کی حقیقت تک پہنچنے کی سعی کو اپنی زندگی کا خاص مقصد سمجھتے تھے تاکہ اُن کے ذریعے ذاتِ واحد (اللہ جلّ شانہٗ) کی ہستی' اُس کی وحدانیت اور اُس کی قدرتِ کاملہ کے متعلق علم الیقین کے بعد حق الیقین ☆ حاصل کر سکیں۔اس لئے آپ نے حیات بعد الممات یعنی مر جانے کے بعد دوبارہ جی اٹھنے کے متعلق اللہ تعالیٰ سے یہ سوال کیا کہ وہ کس طرح ایسا کرے گا؟ رب تعالیٰ نے فرمایا: کیا تمہارا اس بارے میں یقین و ایمان نہیں؟ عرض کیا کیوں نہیں میں بلا تامّل اُس پر ایمان رکھتا ہوں لیکن میرا یہ سوال ایمان و یقین کے خلاف اس لئے نہیں ہے کہ میں علم الیقین کے ساتھ ساتھ عین الیقین اور حق الیقین کا خواستگار ہوں۔میری تمنا یہ ہے کہ تو مجھے میری آنکھوں سے مشاہدہ کرا دے کہ حیات بعد الممات کی شکل کیا ہوگی؟ تب اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اچھا اگر تمہیں اس کے مشاہدہ کی طلب ہے تو چند پرندلو

☆ کسی خبر کو سن کر یا دلائل میں غور و فکر کرنے سے یقین حاصل ہو تو وہ علم الیقین کہلاتا ہے اور کسی چیز کو دیکھ کر جو یقین حاصل ہو وہ عین الیقین ہے اور تجربہ سے جو یقین حاصل ہو وہ حق الیقین ہے۔آگ کی تپش اور سوزش کا یقینی علم علم الیقین ہے۔ آگ کے قریب بیٹھنے والے کے یقینِ سوزش و حرارت کا نام عین الیقین ہے جبکہ آگ میں گرنے والے کو آگ کی سوزش اور حرارت کا یقین حق الیقین ہے۔یا یوں سمجھئے کہ حضور نبی کریم ﷺ کی نبوّت و رسالت پر ہمارا یقین علم الیقین ہے۔صحابہ کرام کا آپ کی نبوت پر یقین عین الیقین تھا اور آپ ﷺ کو جو اپنی نبوت پر یقین تھا وہ حق الیقین تھا۔

اور اُن کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے سامنے والے پہاڑ پر ڈال دو اور پھر فاصلہ پر کھڑے ہو کر اُنہیں پکارو۔ آپ نے ا
ہی کیا اور جب آپ نے اُنہیں آواز دی تو اُن سب کے اجزاء علیحدہ علیحدہ ہو کر فوراً اپنی شکل پر آ گئے اور زندہ ہو
ابراہیم علیہ السلام کے اُڑتے ہوئے چلے آئے۔

سورۃ البقرۃ میں اس واقعہ کو اس معجزانہ بلاغت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے:
وَاِذْقَالَ اِبْرٰهِيْمُ رَبِّ أَرِنِيْ كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى قَالَ أَوَلَمْ تُؤْمِنْ قَالَ بَلٰى وَلٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِيْ قَا
فَخُذْ أَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَيْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰى كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءً ثُمَّ ادْعُهُنَّ يَأْتِيْنَ
سَعْيًا وَاعْلَمْ أَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ O (البقرۃ: ۲۶۰)
"اور (وہ وقت بھی قابلِ ذکر ہے) جب ابراہیم نے عرض کی: اے میرے پروردگار! مجھے دکھادے کہ تو مُردوں کو
زندہ کرے گا۔ ارشاد ہوا کیا تمہیں یقین نہیں ہے؟ عرض کی: ضرور ہے لیکن (یہ درخواست) اس لئے ہے کہ دل کو
اطمینان ہو جائے۔ ارشاد ہوا کہ چار پرندے لیجئے، پھر اُنہیں اپنے سے ہلا لیجئے، پھر ان میں کا ایک ایک حصہ پہاڑ پر
دے دیجئے۔ پھر اُنہیں اپنی طرف بلائیے تو وہ دوڑتے ہوئے آپ کے پاس چلے آئیں گے اور یقین کیجئے کہ
بڑا زبردست ہے، بڑی ہی حکمت والا ہے۔" (۲۶۰: ۲)

مجاہد نے بیان کیا ہے کہ یہ چار پرندے مرغ، مور، کوّا اور کبوتر تھے (جامع البیان، ج ۳، ص ۳۵)
بیضاوی نے لکھا ہے کہ بعض روایات میں کبوتر کی جگہ گدھ کا ذکر ہے اور اس میں یہ اشارہ ہے کہ نفسِ انسانی کو
ابدیہ اُس وقت حاصل ہوگی جب وہ اپنی شہوت اور حسن و زیبائش کو ذبح کر دے جو مور کی صفت ہے۔ دوسروں
کرنے کے جذبہ کو فنا کر دے جو مرغ کی صفت ہے۔ نفس کی خساست اور گھٹیا پن کو دُور کر دے جو کوّے کی صفت
اور اپنی خواہشات کو جلدی پورا کرنے کی عادت کو دُور کر دے جو کبوتر کی صفت ہے۔ ابراہیم علیہ السلام کو حکم دیا
کہ وہ ان پرندوں کو ذبح کر دیں، اُن کے پر نوچ ڈالیں اور اُن کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے اُنہیں باہم خلط ملط کر دیں
ان منتشر اجزاء کو مختلف پہاڑوں پر ڈال دیں، پھر اُنہیں بلائیں۔ جب ابراہیم علیہ السلام نے اُنہیں بلایا تو وہ اجزا
ہوئے اور آپس میں مل گئے اور آخر میں اُن کے ساتھ اُن کا سر جڑ گیا۔ اس میں یہ اشارہ ہے کہ اگر انسان حیات
چاہتا ہے تو وہ اپنے بدن کی طاقت کو ٹکڑے ٹکڑے کر دے (غالباً اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ کے احکام سے رُوگردا
سرکشی کی طاقت کو ٹکڑے ٹکڑے کر دے)۔ پھر جب وہ اپنے بدن کو احکامِ شرعیہ پر عمل کرنے کے لئے بلائے گا تو و
کی اطاعت کرے گا اور اُسے دائمی حیات حاصل ہو جائے گی۔ (انوار التنزیل المعروف بہ تفسیر بیضاوی، صفحہ ۶۰)

"بنی قطورہ: حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سیّدہ سارہ اور سیّدہ ہاجرہ رضی اللہ عنہما کے علاوہ ا
شادی کی تھی۔ اُن بی بی کا نام قطورہ تھا۔ اُن کے بطن سے ابراہیم علیہ السلام کے چھ بیٹے پیدا ہوئے۔ مدین کی
اپنی آبادی اپنے باپ کے نام پر مدین کے نام سے بسائی اور یہ اصحاب مدین کہلائے۔ حضرت ابراہیم کے
وُ ڈان کی نسل اصحاب الایکہ کے نام سے مشہور ہوئی۔ یہی اصحابِ مدین اور اصحاب الایکہ دو قومیں
میں ہدایت وسعادت کی پیغامبری کے لئے حضرت شعیب علیہ السلام کا ظہور ہوا۔" (قصص القرآن، ج ۱، ص ۵۵

(۷۹) بت شکنی (Iconoclasm)

اسلام بت سازی اور مجسمہ سازی اور ان سے کسی قسم کی وابستگی رکھنے یا اُن کی تعظیم و توقیر کرنے کے قطعاً خلاف ہے۔ قرآن مجید نے قبل از اسلام کے عربوں اور اُن کی جانب سے بتوں اور دیوتاؤں کی پرستش اور اُن کے ساتھ اُن کی وابستگی کی بیخ کنی ہے۔ دیوتا اور دیویاں جھوٹے خدا ہیں اور قرآن مجید نے جناب ابراہیم علیہ السلام کی زبان سے اُن کی مذمت کی ہے:

(۱) قَالَ أَفَتَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ مَالَا يَنۡفَعُكُمۡ شَيۡئًا وَّلَا يَضُرُّكُمۡ ۝ أُفٍّ لَّكُمۡ وَلِمَا تَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ أَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ ۝ (الانبیاء: ۶۶، ۶۷)

"ابراہیم علیہ السلام نے کہا کیا تم اللہ کے سوا ایسوں کو پوجتے ہو جو نہ تمہیں نفع پہنچا سکیں اور نہ ہی تمہیں نقصان پہنچا سکیں۔ تف ہے تم پر بھی اور اُن پر بھی جنہیں تم اللہ کے سوا پوجتے ہو تو کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے؟ (۲۱:۶۷،۶۶)

(۲) قَالَ أَتَعۡبُدُوۡنَ مَا تَنۡحِتُوۡنَ ۝ وَاللّٰهُ خَلَقَكُمۡ وَمَا تَعۡمَلُوۡنَ ۝ (الصّٰفّٰت: ۹۵، ۹۶)

"آپ نے کہا کیا تم اُن چیزوں کی پرستش کرتے ہو جنہیں خود ہی تراشتے ہو حالانکہ تم کو اور جو کچھ تم بناتے ہو (سب کو) اللہ ہی نے پیدا کیا ہے۔" (۳۷:۹۶،۹۵)

اس سے پہلے ابراہیم علیہ السلام کی جانب سے بت شکنی کے عمل کو یوں بیان کیا گیا ہے:

فَرَاغَ إِلٰى آلِهَتِهِمۡ فَقَالَ أَلَا تَأۡكُلُوۡنَ ۝ مَا لَكُمۡ لَا تَنۡطِقُوۡنَ ۝ فَرَاغَ عَلَيۡهِمۡ ضَرۡبًا بِالۡيَمِيۡنِ ۝ (الصّٰفّٰت: ۹۱ تا ۹۳)

"تو (ابراہیم) اُن کے ٹھاکروں میں جا گھسے اور کہنے لگے کیا تم کھاتے نہیں ہو؟ تمہیں کیا ہوا تم بولتے ہی نہیں ہو۔ پھر اُن پر قوت سے جا پڑے اور مارنے لگے۔" (۹۱ تا ۹۳ : ۳۷)

مورتیوں پر اُن کے پجاری چڑھاوے چڑھاتے رہتے تھے۔ "کیا تم کھاتے نہیں ہو؟" کے الفاظ میں اشارہ اسی جانب ہے۔ چونکہ یـمـیـن (دایاں ہاتھ) بڑی قوت والا ہوتا ہے اس لئے آیت کا مطلب یہ ہوا کہ آپ بڑی شدت وقوت کے ساتھ اُن پر ٹوٹ پڑے جس سے ساری مورتیاں ٹوٹ پھوٹ گئیں۔ یـمـیـن کا ایک معنیٰ قسم کا بھی ہے اور اس معنیٰ کی رُو سے اشارہ آپ کی اُس قسم کی طرف ہے جس میں آپ نے حلفاً کہا تھا تَاللّٰهِ لَأَكِيۡدَنَّ أَصۡنَامَكُمۡ (بخدا! میں تمہارے بتوں کی ضرور بالضرور گت بنا ڈالوں گا جب تم پیٹھ پھیر کر چلے جاؤ گے)۔

سورۃ الانبیاء میں ابراہیم علیہ السلام کے بت شکنی کے عمل کو یوں بیان کیا گیا ہے:

تَاللّٰهِ لَأَكِيۡدَنَّ أَصۡنَامَكُمۡ بَعۡدَ أَنۡ تُوَلُّوۡا مُدۡبِرِيۡنَ ۝ فَجَعَلَهُمۡ جُذٰذًا إِلَّا كَبِيۡرًا لَّهُمۡ لَعَلَّهُمۡ إِلَيۡهِ يَرۡجِعُوۡنَ ۝ (الانبیاء: ۵۷، ۵۸)

"بخدا! میں تمہارے بتوں کی ضرور بالضرور گت بنا ڈالوں گا جب تم پیٹھ پھیر کر چلے جاؤ گے۔ چنانچہ آپ نے اُنہیں ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا سوائے اُن کے بڑے (بت) کے تاکہ وہ اسی (اللہ) کی طرف رجوع کریں۔"

۲۲۴ (بت شکنی ---Iconoclasm)

قرآنِ حکیم عرب جاہلیت کے دَور کے تین بڑے بتوں اور نوح علیہ السلام کی قوم کے بتوں کی بالترتیب یوں مذمّت کرتا ہے:

(۱) أَفَرَأَيْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰى O وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْأُخْرٰى O (أَلنَّجْم : ۱۹، ۲۰)

'' بھلا تم نے لات اور عزّٰی اور تیسرے منات کے حال میں بھی غور کیا ہے؟'' (۱۹، ۲۰: ۵۳)

لات، عزّٰی اور منات تینوں مشرکینِ عرب کے مشہور بت تھے۔ اللّٰت عرب کی مشہور و قدیم دیوی تھی۔ نباطی کتبات تک میں اس کا نام موجود ہے۔ یہ سورج دیوتا کی مظہر تھی اور قبیلہ ثقیف کی دیوی تھی۔ اس کا بت طائف میں نصب تھا۔ حال ہی میں بعض سیّاحوں نے اُسے دیکھا ہے چنانچہ Doughty کی Arabia-Diserta کی جلد دوم میں اس کا فوٹو بھی دیا ہوا ہے۔ الْعُزّٰی یہ قوّت و طاقت کی دیوی تھی جیسے ہندوستان میں دُرگا دیوی، یونان و رومہ کی زہرہ دیوی کی قائم مقام۔ ظہورِ اسلام کے وقت عربوں میں اُس کا سب سے زیادہ شہرہ تھا۔ اس کا بت نخلہ میں نصب تھا اور یہ دیوی قبیلہ غطفان کی تھی۔ مَنَات: یہ دیوی تقدیر کی حکمران تھی۔ اس کا بت قدید میں نصب تھا۔ مدینہ کے اوس و خزرج والے اس کے خاص طور پر معتقد تھے۔ عجب نہیں کہ تحقیقات کے بعد اس کا تعلق ہندوستان کے مشہور بت و بتکدہ ''سومنات'' سے بھی ثابت ہو جائے۔ مشرکینِ عرب کے عقیدہ میں یہ تینوں دیویاں خدا کی بیٹیاں تھیں۔ أَفَرَأَيْتُمْ کے حرف ف میں اس طرف اشارہ ہے کہ پیغمبر کی عظمت و صداقت کے محقق ہو جانے کے بعد تو تم کو سمجھ جانا چاہیے تھا۔ (تفسیر ماجدی اردو، صفحہ ۱۰۵۲، نوٹ: ۱۵)

(۲) وَقَالُوا لَا تَذَرُنَّ آلِهَتَكُمْ وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَّلَا سُوَاعًا وَّلَا يَغُوثَ وَيَعُوقَ وَنَسْرًا O (نوح: ۲۳، ۲۴)

''اور اُنہوں نے کہا کہ اپنے معبودوں کو ہرگز نہ چھوڑنا اور نہ وَدّ کو اور نہ سواع کو اور نہ یغوث، یعوق، نسر (غرض کسی کو بھی نہ) چھوڑنا۔'' (۲۳، ۲۴ : ۷۱)

وَدّ نامی دیوتا قوتِ مردانہ اور عشق و محبت کا تھا۔ اس کی مورت قوی ہیکل مرد کی شکل میں تھی۔ اہلِ عرب اس سے خوب مانوس تھے۔ اس کی پوجا شمالی عرب میں جاری تھی۔ ''عبدوَد'' عرب میں ایک نام کثرت سے لوگوں کا ہوتا تھا۔ سُوَاع یہ دیوتا حُسن و محبوبی کا تھا۔ اس کی مورتی حسین عورت کی شکل میں تھی اور اس کی پوجا قبیلہ ہذیل میں جاری تھی۔ یَغُوث نامی دیوتا جسمانی قوّت و طاقت کا تھا۔ اس کی مورت شیر اور بیل کی شکلوں میں ہوتی تھی۔ یمن میں اس کی پوجا کا رواج تھا۔ یَعُوق: یہ دوڑ بھاگ کا دیوتا تھا۔ اس کی مورت گھوڑے کی شکل میں ہوتی تھی۔ اس کی بھی پوجا یمن میں پائی گئی۔ نَسر: یہ دُور بینی اور حدّتِ نظر کا دیوتا تھا۔ اس کی مورت پرندہ (باز یا عقاب) کی شکل کی ہوتی تھی۔ (تفسیر ماجدی اردو، صفحہ ۱۱۴۶، نوٹ: ۱۲)

باطل دیوتاؤں (طاغوت) کی مذمت میں قرآنِ حکیم فرماتا ہے:

(۱) وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولًا أَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ (أَلنَّحل : ۳۶)

''اور ہم نے یقیناً ہر امت میں ایک پیامبر بھیجا ہے کہ اللہ کی عبادت کرو اور شیطان (کی راہ) سے بچو۔''

اللہ کے سوا جس کسی کی بھی پرستش کی جائے' وہ طاغوت ہے خواہ وہ بت ہوں یا سفلی اور جنسی خواہشات۔

(۲) وَالَّذِيْنَ اجْتَنَبُوا الطَّاغُوْتَ أَنْ يَّعْبُدُوْهَا وَأَنَابُوْا إِلَى اللّٰهِ لَهُمُ الْبُشْرٰى فَبَشِّرْ عِبَادِO الَّذِيْنَ يَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُوْنَ أَحْسَنَه' (أَلزُّمَر : ۱۷' ۱۸)

"اور جو لوگ طاغوت (شیطان) کی پرستش کرنے سے بچے رہتے ہیں اور اللہ کی طرف متوجہ رہتے ہیں اُن کے لئے بشارت ہے' سو آپ میرے ان بندوں کو بشارت دے دیجئے جو (اس) کلام کو کان لگا کر سنتے ہیں' پھر اس کی اچھی باتوں پر چلتے ہیں۔" (۳۹ : ۱۷' ۱۸)

"احکام شرعیہ میں بعض اعمال صحیح اور حسن ہوتے ہیں اور بعض اصح اور احسن ہوتے ہیں۔ تو جو شخص عقل اور نظر صحیح سے کام لے گا وہ صحیح اور حسن کے مقابلہ میں اصح اور احسن پر عمل کرے گا اور اس آیت میں احسن افعال کی اتباع کی تحسین کی گئی ہے مثلاً اگر کسی شخص نے اپنے مقتول کا قصاص قاتل کو قتل کرنے کی صورت میں لے لیا تو یہ صحیح ہے اور احسن یہ ہے کہ وہ اپنے قاتل کو معاف کر دے۔ اسی طرح برائی کے بدلہ میں اتنی ہی برائی کرنا صحیح ہے اور برا سلوک کرنے والے کو معاف کر دینا اور اس سے جواب میں نیک سلوک کرنا احسن ہے۔" (تبیان القرآن' ج ۱۰' ص ۲۱۰)

اگر اللہ ایک اور صرف ایک ہی ہے تو تمام دوسرے دیوتا جھوٹے ہیں اور بت اس جھوٹے پن کے نمائندے ہیں:

وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖ آلِهَةً لَّا يَخْلُقُوْنَ شَيْئًا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ وَلَا يَمْلِكُوْنَ لِأَنْفُسِهِمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا وَّلَا يَمْلِكُوْنَ مَوْتًا وَّلَا حَيٰوةً وَّلَا نُشُوْرًاO (أَلفرقان : ۳)

"اور (مشرکوں نے) اللہ کے علاوہ (اور ایسے خدا) بنا رکھے ہیں جو کسی چیز کے خالق نہیں اور خود ہی مخلوق ہیں اور خود اپنے لئے نہ کسی نقصان کا اختیار رکھتے ہیں اور نہ کسی نفع کا اور نہ (کسی کی) موت کا اختیار رکھتے ہیں اور نہ (کسی کی) زندگی کا اور نہ (کسی کے) دوبارہ اٹھانے کا۔" (۲۵ : ۳)

قرآنِ حکیم نے پیدا کرنے والے (خالقِ حقیقی) اور پیدا نہ کرنے والوں (معبودانِ باطل) کے مابین نمایاں فرق کو جگہ جگہ واضح کیا ہے۔ مثلاً فرمایا:

(۱) أَفَمَنْ يَّخْلُقُ كَمَنْ لَّا يَخْلُقُ أَفَلَا تَذَكَّرُوْنَO (النحل : ۱۷)

"اچھا تو کیا وہ جو پیدا کرتا ہے' اُسی جیسا ہو جائے گا جو پیدا نہیں کر سکتا؟ تو کیا تم اتنا بھی غور نہیں کر سکتے!" (۱۶ : ۱۷)

(۲) اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ ثُمَّ رَزَقَكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ هَلْ مِنْ شُرَكَآئِكُمْ مَّنْ يَّفْعَلُ مِنْ ذٰلِكُمْ مِّنْ شَيْءٍ سُبْحٰنَه' وَتَعَالٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَO (أَلرّوم : ۴۰)

"اللہ ہی وہ ہے جس نے تمہیں پیدا کیا' پھر تمہیں روزی دی' پھر تمہیں موت دیتا ہے پھر تمہیں جلائے گا۔ کیا تمہارے شرکاء میں بھی کوئی ایسا ہے جو اِن کاموں میں سے کچھ بھی کر سکے؟ وہ اللہ اُن کے شرک سے پاک و برتر ہے۔" (۳۰ : ۴۰)

اسی طرح قرآن مجید بتوں کی پرستش اور اُن کی تعظیم وتوقیر کے مابین کوئی فرق نہیں کرتا ☆:
اِذْ قَالَ لِأَبِيْهِ وَقَوْمِهٖ مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْٓ أَنْتُمْ لَهَا عَاكِفُوْنَO(الانبیاء : ۵۲)
"(وہ وقت یاد کیجئے) جب ابراہیم نے اپنے چچا اور اپنی قوم سے کہا یہ کیا (واہیات و خرافات) مورتیاں ہیں جن پر تم جمے بیٹھے ہو۔" (۵۲ : ۲۱)

بتوں کے پرستار بتوں ہی سے وابستہ (عاکف) ہو کے رہ جاتے ہیں اور اُن کی تمام تر توجہ ان بتوں کو خوش کرنے میں مرکوز ہوتی ہے جس کے نتیجے میں وہ عقل سے عاری ہو جاتے ہیں چنانچہ اس سلسلہ میں قرآن فرماتا ہے:

(۱) وَجٰوَزْنَا بِبَنِيْٓ إِسْرَآءِيْلَ الْبَحْرَ فَأَتَوْا عَلٰى قَوْمٍ يَّعْكُفُوْنَ عَلٰٓى أَصْنَامٍ لَّهُمْ قَالُوْا يٰمُوْسَى اجْعَلْ لَّنَآ إِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ قَالَ إِنَّكُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَO (الاعراف : ۱۳۸)
"اور ہم نے بنی اسرائیل کو سمندر سے پار اتار دیا پھر وہ ایسے لوگوں پر گزرے جو اپنے بتوں پر جمے بیٹھے تھے (اس پر بنی اسرائیل) کہنے لگے: اے موسیٰ! ہمارے لئے بھی ایک ایسا ہی دیوتا بنا دیجئے جیسے اُن کے (یہ) دیوتا ہیں۔ موسیٰ (علیہ السلام) نے کہا: واقعی تم لوگوں میں بڑی جہالت ہے۔" (۷:۱۳۸)

(۲) اِذْ قَالَ لِأَبِيْهِ وَقَوْمِهٖ مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْٓ أَنْتُمْ لَهَا عَاكِفُوْنَO(الانبیاء : ۵۲)
"(وہ وقت یاد کیجئے) جب ابراہیم نے اپنے چچا اور اپنی قوم سے کہا یہ کیا (واہیات و خرافات) مورتیاں ہیں جن پر تم جمے بیٹھے ہو۔" (۵۲ : ۲۱)

(۳) اِذْ قَالَ لِأَبِيْهِ وَقَوْمِهٖ مَا تَعْبُدُوْنَO قَالُوْا نَعْبُدُ أَصْنَامًا فَنَظَلُّ لَهَا عٰكِفِيْنَO(الشعراء: ۷۰،۷۱)
"جب ابراہیم نے اپنے چچا اور اپنی قوم سے کہا تم کس چیز کی عبادت کرتے ہو؟ وہ بولے: ہم تو بتوں کی عبادت کرتے ہیں اور ہم اُنہی پر جمے رہتے ہیں۔" (۷۰،۷۱ : ۲۶)

قرآنِ حکیم نے بڑے ہی فصیحانہ اور بلیغانہ انداز میں کسی تخلیق کار کی تخلیق کے مضبوط دعویٰ کا یہ کہتے ہوئے گلا دبا کر رکھ دیا ہے:۔

قَالَ أَتَعْبُدُوْنَ مَا تَنْحِتُوْنَO وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَO (الصّٰفٰت : ۹۵، ۹۶)
"آپ نے کہا کیا تم اُن چیزوں کی پرستش کرتے ہو جنہیں خود ہی تراشتے ہو حالانکہ تم کو اور جو کچھ تم بناتے ہو (سب کو) اللہ ہی نے پیدا کیا ہے۔" (۹۵،۹۶ : ۳۷)

اس کے بعد قرآن مجید بتوں کی نجاست اور ہر قسم کی جھوٹی بات سے دُور رہنے کی ہدایت کرتا ہے:
فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْأَوْثَانِ O وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِO (الحج : ۳۰)
"سو تم بتوں کی گندگی سے بچے رہو اور جھوٹی بات سے بچے رہو۔" (۳۰ : ۲۲)

☆ خیال رہے کہ تعظیم وتوقیر کی یہ ممانعت بتوں کے لئے ہے۔ شعائر اللہ کی تعظیم میں گناہ کی کوئی بات نہیں بلکہ قرآن نے اسے دل کا تقویٰ کہا ہے (سورۃ الحج: ۳۲)۔ کعبہ کے نزدیک صفا اور مروۃ کی دو پہاڑیاں اور اللہ کے نام پر قربانی کے جانور یہ سب شعائر اللہ ہیں۔

۲۲۲۷ (بت شکنی۔۔۔Iconoclasm)

چونکہ بتوں کے پجاری دل اور روح دونوں لحاظ سے پلید اور نجس ہیں' اس لئے اُنہیں سورۃ التوبہ (۹) کی ۲۸ میں مسجد حرام کی مقدس حدود کے اندر آنے سے روک دیا گیا ہے :

یٰاَیُّهَاالَّذِیْنَ اٰمَنُوْااِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَس " فَلَا یَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا

" مؤمنو! مشرکین تو نرے ناپاک ہیں' سو اس سال کے بعد وہ مسجدِ حرام کے پاس بھی نہ آنے پائیں۔ "

''اس سال'' سے مراد سن ۹ ہجری ہے جبکہ سیّدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی زیرِ اَمارت حج ہوا تھا۔ اُس سے مراد سن ۱۰ ہجری ہے جب سے اس کا نفاذ شروع ہوا۔ آیتِ بالا میں لفظِ ''نجس'' کا حوالہ مشرکین کی پلیدی سے نہیں ہے۔

''اسلام بت رکھنے سے روکتا ہے : ملاحظہ ہوں صفحات ۱۹۰۱' ۱۹۰۲ جلد چہارم انسائیکلوپیڈیا ہٰذا۔

نوٹ: کچھ فقہاء نے بچوں کو گڑیاؤں سے کھیلنے کی اجازت دی ہے۔ تاہم اس بات کا اندیشہ ضرور ہے کہ ؤں کی تصویروں سے کھیلنے کی اجازت دینے میں بچوں کے دلوں سے خیر اور راستی کے جذبات کم ہو جائیں لئے بہتر ہے کہ اُنہیں گڑیاؤں سے کھیلنے کی اجازت نہ دی جائے۔ ..("Amusement & Play"
Mufti Mahmood Ashraf Usmani, p

الفقه علی مذاهب الاربعه۔۔ عبدالرحمٰن الجزیری' جلد دوم' صفحہ ۷۰ اردو ترجمہ۔

مجسمے بنانے کی ممانعت میں حکمت : ملاحظہ ہوں صفحات ۱۹۰۲' ۱۹۰۳ جلد چہارم انسائیکلوپیڈیا ہٰذا۔

ناتمام یا مسخ شدہ مجسمے : ملاحظہ ہوں صفحات ۱۹۰۴' ۱۹۰۵ جلد چہارم انسائیکلوپیڈیا ہٰذا۔

حرمتِ تصویر کے منصوص اسباب : ملاحظہ ہو صفحہ ۱۹۰۵ جلد چہارم انسائیکلوپیڈیا ہٰذا۔

تصویر کے جواز اور عدم جواز کی صورتیں : ملاحظہ ہو صفحہ ۱۹۰۶ جلد چہارم انسائیکلوپیڈیا ہٰذا۔

مسخ شدہ تصویر کی اجازت : ملاحظہ ہوں صفحات ۱۹۰۶' ۱۹۰۷ جلد چہارم انسائیکلوپیڈیا ہٰذا۔

رنگوں سے بنائی ہوئی تصاویر اور یک مادّی جسامت والی تصاویر : بتوں سے متعلق اسلام کے بالوضاحت درجِ بالا حوالہ جات میں بیان کر دیا گیا ہے۔ اب ہم کاغذ' کپڑے' پردوں' دیواروں' سکوں' کرسی اور اسی قسم کی اشیاء پر بنائی گئی تصویروں اور فنی کاموں کی بابت اسلام کے نظریہ کا جائزہ لیتے ہیں:۔

''اس مسئلے میں کوئی اصول اور ضابطہ وضع نہیں کیا گیا اور ہر قسم کی صورت سے متعلق انفرادی طور پر فیصلہ کیا جائے گا۔ وہ تصویر کس چیز کو ظاہر کرتی ہے؟ اُسے رکھا کہاں گیا ہے؟ اس کا موضوعِ بحث کیا ہے؟ تصویر بنانے میں فنکار کا مقصد کیا ہے؟ یہی وہ سوال ہیں جن کا جائزہ لیا جانا چاہیے۔''

''اگر تو تصویر میں پرستش کا مقصد ہے جیسا کہ ہندوؤں میں گئو سالہ پرستی ہے' تو جو کوئی اس مقصد سے تصویر بناتا ہے وہ فی الواقع کافر و مشرک ہے جو شرک اور باطل کی تشہیر کر رہا ہے اور ایسے ہی لوگوں کے متعلق پیغمبرِ اسلام ﷺ نے روزِ قیامت سخت سزا کی وعید سنائی ہے۔''

''علامہ طبری نے اس حدیث کی وضاحت میں بتایا ہے کہ ایسی تصویریں بنانے والے وہ لوگ ہیں جن کا مقصد اِن تصویروں کی پوجا کرنا ہوتا ہے اور یہ صریحاً کفر ہے۔ لیکن جو مصوّر اس مقصد سے تصویر نہیں بناتے تو وہ بہر حال تصویر گری کے نمائندہ ہونے کے مجرم تو ہیں۔ اسی طرح اگر کوئی شخص ان تصاویر کو احترام کی غرض سے دیواروں پر لٹکاتا ہے تو اُس کا یہ عمل مسلمان کا عمل نہیں ہے کیونکہ اُس کے دل سے اسلام جدا ہو چکا ہے۔''

''اب معاملہ اُس شخص کا ہے جو تصویر پرستش کیے جانے کی غرض سے نہیں بناتا بلکہ وہ اللہ کی تخلیق سے مشابہت کی غرض سے بناتا ہے اور اپنے اس فعل میں وہ اس بات پر نازاں ہے کہ اُس نے بھی ویسی ہی چیز تخلیق کی ہے جیسی اللہ کرتا ہے' تو ایسا شخص ''توحید'' کے خلاف باغیانہ عقیدے کا مرتکب ہے اور اس کے متعلق نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

''قیامت کے دن اُس شخص کو سخت ترین سزا دی جائے گی جو ایسی چیز تخلیق کرنے کی کوشش کرے جیسی اللہ نے تخلیق کی ہے اور اس سے مشابہت کرے۔''

اس چیز کا براہِ راست تعلق فنکار کی نیت سے ہے۔ غالباً ذیل کی حدیثِ قُدسی میں بھی اس کا ثبوت ہے جس میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى : وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذَهَبَ يَخْلُقُ كَخَلْقِي فَلْيَخْلُقُوا ذَرَّةً اَوْلِيَخْلُقُوا حَبَّةً اَوْ شَعِيْرَةً (صحیح بخاری' صحیح مسلم)

''اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اُس شخص سے زیادہ ظالم کون ہوگا جو میرے تخلیق کرنے کی طرح کوئی چیز تخلیق کرنا چاہتا ہے۔ وہ ایک ذرّہ اور جَو کا ایک دانہ تو بنا کے دکھائیں۔''

اللہ تعالیٰ کا ان فنکاروں کو اس چیلنج میں کہ وہ ایک ذرّہ یا جَو کا ایک دانہ بنا کے دکھائیں' اُن فنکاروں کو روزِ قیامت سرِ عام شرمندہ کرنا ہے کہ جو کچھ تم نے تخلیق کیا' اُن میں ذرا جان ڈال کے تو دکھاؤ' اور وہ ایسا نہیں کر سکیں گے۔ اُن افراد کی تصویریں لینے یا بنانے کی ممانعت ہے جو مذہبی لحاظ سے محترم ہیں یا اُن کے دنیاوی منصب کی وجہ

سے اُن کی عزت کی جاتی ہے۔ پہلی قسم میں پیغمبر علیہم السلام' فرشتے' مریم سلام اللہ علیہا جیسے نیک اور پارسا لوگ شامل ہیں اور ایسے لوگوں کی تصویریں بنانا یہود و نصاریٰ کا طریقہ ہے۔ بدقسمتی سے کچھ مسلمان مذہب میں نئی نئی اختراعات کرتے ہوئے اور اہلِ کتاب (یہود و نصاریٰ) کی تقلید میں جناب علی و فاطمہ علیہما السلام اور دیگر لوگوں کی تصویریں لینے لگے ہیں۔''

''دوسری قسم میں ہمارے زمانے کے بادشاہوں' قائدین اور فنکاروں کی تصویریں شامل ہیں۔ اگرچہ اس صورت میں برائی کم ہی ہے تاہم ہمیں اس کی برائی کو نظرانداز نہیں کرنا چاہئے بالخصوص جبکہ وہ تصاویر کافروں' جابروں یا غلط کاروں کی ہوں یا اُن حاکموں کی جو مرضیِ الٰہی کے مطابق فیصلے نہیں کرتے یا اُن قائدین کی جو لوگوں کو پیغامِ الٰہی کی دعوت نہیں دیتے' جو جھوٹ کو مزین کر کے پیش کرتے ہیں اور عوام میں بے حیائی اور بے راہروی کی تشہیر کرتے ہیں۔''

''پودوں' درختوں اور جھیلوں' سمندروں' جہازوں' پہاڑوں' سورج' چاند' ستاروں جیسی بے جان چیزوں اور اس قسم کے مظاہرِ قدرت کی تصویریں کھینچنے یا رنگوں سے اُن کی تصویریں بنانے کی اجازت ہے اور اس بارے میں کوئی اختلافِ رائے نہیں ہے۔ علاوہ ازیں اگر کوئی شخص کسی جاندار کی تصویر بنانا چاہتا ہے اور اس کی نیت یہ نہیں ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے تخلیقی عمل کا مقابلہ کرے اور نہ ہی اس تصویر کے احترام کی نیت ہے تو اس میں بھی کوئی ممانعت نہیں ہے اور اس سلسلہ میں متعدد صحیح احادیث موجود ہیں۔''

''مندرجہ بالا ممانعت بتوں اور ٹھوس قسم کی تصاویر میں ہے۔ جہاں تک اُن تصاویر کا تعلق ہے جو لکڑی' کاغذ' کپڑے' دریوں' قالینوں' دیواروں اور اس قسم کی دوسری چیزوں پر بنائی جاتی ہیں تو اُن کی ممانعت کے بارے میں کوئی مضبوط' واضح اور براہِ راست متن کی حدیث موجود نہیں ہے۔ یہ درست ہے کہ کچھ ایسی صحیح احادیث موجود ہیں جن میں نبی اکرم ﷺ نے ایسی تصویروں کے خلاف اپنی نفرت کا اظہار کیا ہے کیونکہ وہ اُن لوگوں کی یادگار ہیں جو عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتے ہیں اور گھٹیا قدر کی چیزوں سے اُنہیں محبت ہے۔''

''سیّدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے دروازے پر ایک پردہ لٹکایا جس پر کچھ تصویریں بنی ہوئی تھیں۔ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی جب اُس پر نگاہ پڑی تو میں آپ کے چہرہ انور کو دیکھ کر سمجھ گئی کہ آپ نے اسے پسند نہیں کیا۔ نبی علیہ السلام نے اُسے کھینچ کر پھاڑ دیا اور فرمایا: اللہ تعالیٰ نے ہمیں پتھر اور مٹی کو لباس پہنانے کا حکم نہیں دیا۔ سیّدہ فرماتی ہیں کہ ہم نے اس پردے کو کاٹا اور اس کپڑے سے دو تکیے تیار کئے جو کھجور کے پتوں سے بھرے ہوئے تھے۔ اس پر پیغمبر کریم ﷺ نے کوئی اعتراض نہیں فرمایا۔''

''اس حدیثِ مبارکہ سے اس کے سوا کوئی اور نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ دیواروں اور اس قسم کی چیزوں کو

ایسے پردوں سے مزین کرنا جن پر تصویریں بنی ہوں' پر ناپسندیدگی کا اظہار کچھ نرمائش ہی سے دیا گیا ہے۔ امام نووی کا کہنا ہے کہ حدیثِ پاک میں ممانعت کی کوئی بات نہیں ہے۔ دراصل فیصلہ کن الفاظ یہ ہیں کہ اللہ نے ہمیں ایسا کرنے کا حکم نہیں دیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسی چیز نہ تو لازم ہے اور نہ ہی مستحب اور اس سے کسی طرح بھی ممانعت ثابت نہیں ہوتی۔''

''امام مسلم نے سیّدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ اُنہوں نے فرمایا کہ ہمارے پاس ایک پردہ تھا جس پر پرندے کی شکل بنی ہوئی تھی۔ جب رسول اللہ ﷺ حجرہ مبارکہ میں داخل ہوئے تو آپ نے اُسے اپنے سامنے پایا اور فرمایا کہ اُسے یہاں سے دُور کرو۔ جب داخل ہونے پر میں اُسے دیکھتا ہوں تو مجھے اِس دنیا کی یاد آتی ہے۔ پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام نے سیّدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کو پردہ چاک کرنے کا نہیں کہا بلکہ اُسے داخلے کی جگہ سے ہٹانے کا حکم دیا۔ آپ اس کے دیکھنے کو اس لئے ناپسند کرتے تھے کہ وہ آپ کے ذہن میں دنیا اور اس کی جاذبیتوں کے لانے کا موجب تھا اور اس میں کوئی تعجب کی بات بھی نہیں کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام اپنے حجرہ مبارکہ میں فرض اور نوافل نمازیں ادا فرماتے تھے۔ پردے' پلنگ پوش یا مجسمے شاید آپ کی عبادت میں خلل کا موجب ہوتے ہوں اور اپنی مناجات اور دعاؤں میں کامل توجہ میں حارج ہوتے ہوں۔''

''مندرجہ بالا احادیث سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ممانعت اُن تصاویر کی ہے جن کا سایہ ہے نہ کہ اُن تصاویر کی جن کا سایہ نہیں ہے۔''

''**فوٹوگرافی** : ملاحظہ ہوں صفحات ۱۹۱۱' ۱۹۱۲ (جلد چہارم)۔

''**فوٹوگرافی کا نفسِ مضمون** : ملاحظہ ہو صفحہ ۱۹۱۲ (جلد چہارم)

''**تصویروں اور مصوّروں سے متعلق اصول وضوابط کا خلاصہ** : ملاحظہ ہو صفحہ ۱۹۱۳ (جلد چہارم)

''**شادی بیاہ جیسی خوشی کے موقعوں پر کی وڈیو فلمیں** : ملاحظہ ہو صفحہ ۱۹۱۴ (جلد چہارم)۔

''**فلموں' ٹیلیویژن' وی سی آر اور سٹیج ڈراموں کا دیکھنا** : ملاحظہ ہو صفحہ ۱۹۱۴ (جلد چہارم)۔

(۸۰) عدّت (IDDAT)

یہ ایک معینہ عرصہ تک انتظار کرنا ہے جس کے دوران میں بیوہ یا مطلقہ عورتیں سابقہ نکاح کے فسخ ہو جانے کے بعد نیا نکاح نہیں کر سکتیں ۔ شریعت کی رو سے بیواؤں کی مدّتِ عدّت ۴ ماہ ۱۰ دن مقرر ہے:

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ أَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَّعَشْرًا (البقرة: ۲۳۴)

"تم میں سے جو لوگ مر جائیں اور اُن کے پیچھے اگر اُن کی بیویاں زندہ ہوں تو وہ اپنے آپ کو چار مہینے دس دن روکے رکھیں ۔" (۲: ۲۳۴)

"قدیم عربوں کے ہاں ماتم کے موقع پر اس کی مدت اس سے زیادہ مقرر تھی ۔ اُس زمانے میں یہ دستور تھا کہ خاوند کے مرنے کے بعد بیوہ ایک چھوٹے سے خیمے میں گوشہ نشین ہو جاتی تھی جہاں وہ ایک سال گزارتی تھی اور اس عرصے میں اُسے نہانے دھونے کی قطعی ممانعت ہوتی تھی ۔ قدیم عربوں میں طلاق کے بعد عدت کا وجود نہیں تھا ۔ اگر کوئی شخص کسی ایسی مطلقہ عورت سے شادی کر لیتا ہو جو حاملہ ہو تو وہی شخص شادی کے بعد پیدا ہونے والے بچے کا باپ سمجھا جاتا تھا خواہ اصل میں اس کا باپ عورت کا پہلا شوہر ہی کیوں نہ ہو ۔ بہر حال اسلام میں بچے کا اصل باپ ہی اُس کا باپ تصور کیا جاتا ہے اور کسی عورت کو اجازت نہیں کہ پہلے نکاح کے فسخ ہونے پر ایک مقررہ میعاد (عدّت) گزارے بغیر دوسرا نکاح کرے ۔ اگر اس دوران میں اُس کے ہاں بچہ پیدا ہوتا ہے تو صرف اُس کا سابق شوہر ہی اُس کا باپ سمجھا جاتا ہے ۔ شریعت کی رُو سے مطلقہ کے لئے ایامِ عدت یہ ہیں:

(۱) حائضہ کے لئے تین بار حیض آنے تک:

وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْءٍ (البقرة: ۲۲۸)

"اور طلاقنیں اپنے آپ کو تین میعادوں تک روکے رہیں ۔" (۲: ۲۲۸)

(۲) غیر حائضہ (یعنی وہ عورت جسے کبر سنی کی بناء پر یا وہ لڑکی جسے صغر سنی کے باعث ایامِ ماہواری نہ آتے ہوں) کے لئے تین ماہ تک:

وَالّٰئِىْ يَئِسْنَ مِنَ الْمَحِيْضِ مِنْ نِّسَآئِكُمْ اِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُهُنَّ ثَلٰثَةُ أَشْهُرٍ وَّالّٰئِىْ لَمْ يَحِضْنَ (الطلاق: ۴)

"اور تمہاری مطلقہ بیویوں میں سے جو حیض آنے سے مایوس ہو چکی ہیں، اگر تمہیں شبہ ہو تو اُن کی عدت تین مہینے ہے اور اسی طرح اُن کی بھی جنہیں ابھی حیض نہیں آیا ۔" (۶۵: ۴)

(۳) اگر کوئی مطلقہ حاملہ ہو تو وضع حمل یعنی بچے کی پیدائش تک کا زمانہ اُس کے لئے عدت ہے:

وَأُولَاتُ الْأَحْمَالِ أَجَلُهُنَّ أَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ (الطلاق: ۴)

''اور حاملہ عورتوں کی عدّت کی حد یہ ہے کہ اُن کا وضعِ حمل ہو جائے۔'' (۴ : ۶۵)

(۴) لونڈیوں کے لئے بھی عدت کی مدت معیّن ہے لیکن اُن کے لئے چار ماہ دس دن کی عدّت کی جگہ دو ماہ پانچ دن کی اور تین قُروء کی عدت کی جگہ دو قُروء کی اور تین ماہ کی مدت کی جگہ ڈیڑھ ماہ کی عدت مقرر ہے۔

''عدّت کے دوران میں عورت کے لئے ایسی زیبائش جائز نہیں جو عورتیں اپنے شوہروں کے لئے اختیار کرتی ہیں۔'' (کتاب الفقه علی مذاهب الاربعة ' لعبدالرحمٰن الجزیری' جلد چہارم)
(ماخوذ از ''اردو دائرہ معارفِ اسلامیہ'' دانش گاہ پنجاب لاہور' جلد ۱۳' صفحات ۲' ۳)

عدّت کے عائد کرنے کے پسِ پردہ حکمتیں: عدّت کے عائد کرنے کے پسِ پردہ حکمت حسب و نسب کی حفاظت کے سوا کچھ نہیں۔ اس مقصد کے لئے زنا قبل از نکاح (Fornication) یا زنا بعد از نکاح (Adultery) دونوں ہی حرام ہیں۔ عدّت کے پس پردہ کارفرما حکمت کے بارے میں قرآنِ حکیم فرماتا ہے:
وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ أَنْ يَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِيْٓ أَرْحَامِهِنَّ إِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ (البقرۃ:۲۲۸)
''اور ان کے لئے یہ جائز نہیں کہ اللہ نے اُن کے رِحموں میں جو پیدا کر رکھا ہے' وہ اُسے چھپائے رکھیں' اگر وہ اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتی ہیں۔'' (۲۲۸ : ۲)

جس کا مطلب یہ ہے کہ چھپائے رکھنے کا عمل مدّتِ عدّت کے شمار کرنے میں مزاحم ہوگا اور یہ چیز کئی دیگر طریقوں سے قانون شکنی کے ارتکاب کی موجب ہوگی۔

سورۃ الطلاق میں نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام سے خطاب کرتے ہوئے یہ حکم دیا گیا:۔
يٰٓأَيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ وَأَحْصُوا الْعِدَّةَ وَاتَّقُوا اللّٰهَ رَبَّكُمْ
''اے نبی ☆ (صلی اللہ علیک وسلّم!) جب تم عورتوں کو طلاق دینے لگو تو اُنہیں اُن کی عدت پر طلاق دو اور عدت کو خیال میں رکھو اور اپنے پروردگار اللہ سے ڈرتے رہو۔'' (۱ : ۶۵)

''اور اللہ سے ڈرتے رہو'' کا مطلب یہ ہے کہ ازدواجی تعلقات کو ہلکے پن میں نہ لیا جائے اور یہ یاد رہنا چاہئے کہ یہ قانون بھی رب تعالیٰ کا دیا ہوا ہے جس کے ارشادات کا ایک ایک جز ئیہ اپنی جگہ پر پوری اہمیت رکھتا ہے اور پھر وہ اللہ بھی کیسا تمہارا پروردگار ہے جو ہر ہر حکم اور ہر ہر ہدایت میں تمہاری ہی تربیت کا' تمہاری ہی مصلحتوں کا لحاظ رکھنے والا ہے۔

☆نبی کا لفظ واحد ہے لیکن اس کے بعد کا فعل طَلَّقْتُمْ واحد کی بجائے جمع کی صورت میں لایا گیا ہے۔ اس کی ایک وجہ ایک تو یہ ہے کہ اگر اس میں خطاب براہِ راست نبی علیہ السلام سے ہے تو جمع کا فعل لانے میں آپ ﷺ کی تعظیم وتوقیر مقصود ہے۔ دوسری صورت میں خطاب آپ کی اُمت سے ہے اور اس صورت میں یہ الفاظ محذوف و مقدر رہوں گے: قُلْ لِأُمَّتِكَ (اپنی امت کو فرما دیجئے)۔

(۸۱) اِدریس علیہ السلام

ادریس علیہ السلام کا ذکر قرآنِ حکیم میں: قرآنِ عزیز میں حضرت ادریس علیہ السلام کا ذکر صرف دو جگہ آیا ہے: سورہ مریم (۱۹) اور سورۃ الانبیاء (۲۱) میں:

(۱) وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِدْرِيْسَ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّاO وَرَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّاO (مریم: ۵۶، ۵۷)

''اور (اس) کتاب میں اِدریس کا ذکر کیجئے' بلاشبہ وہ سچے نبی تھے اور ہم نے اُن کا مقام بلند کیا۔''

(۲) وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِدْرِيْسَ وَذَا الْكِفْلِ كُلٌّ مِّنَ الصّٰبِرِيْنَO (الانبیاء: ۸۵)

''اور اسمٰعیل اور اِدریس اور ذوالکفل (یہ) سب کے سب صبر کرنے والے تھے۔'' (۸۵ : ۲۱)

''**نام ونسب اور زمانہ:** حضرت اِدریس علیہ السلام کے نام' نسب اور زمانہ کے متعلق مؤرخین کو سخت اختلاف ہے اور تمام اختلافی وجوہ کو سامنے رکھنے کے بعد بھی کوئی فیصلہ کن یا کم از کم راجح رائے قائم نہیں کی جا سکتی۔ وجہ یہ ہے کہ قرآنِ عزیز نے تو اپنے مقصدِ رُشد و ہدایت کے پیشِ نظر تاریخی بحث سے جدا ہو کر صرف اُن کی نبوّت' رفعتِ مرتبت اور اُن کی صفاتِ عالیہ کا ذکر کیا ہے اور اسی طرح حدیثی روایات بھی اس سے آگے نہیں جاتیں' اس لئے اس سلسلہ میں جو کچھ بھی ہے وہ اسرائیلی روایات ہیں اور وہ بھی تضاد و اختلافات سے معمور۔ ایک جماعت کہتی ہے کہ وہ نوح علیہ السلام کے جدِّ امجد ہیں اور اُن کا نام اخنوخ ہے اور ادریس لقب ہے یا عربی زبان میں ادریس اور عبرانی یا سریانی میں اُن کا نام اخنوخ ہے اور اُن کا نسب نامہ یہ ہے:

''خنوخ یا اخنوخ (ادریس) بن یارد بن مہلائیل بن قینان بن انوش بن شیث بن آدم علیہ السلام۔ ابنِ اسحٰق کا رُجحان اسی جانب ہے اور دوسری جماعت کا خیال ہے کہ وہ انبیاءِ بنی اسرائیل میں سے ہیں اور الیاس و ادریس ایک ہی ہستی کے نام اور لقب ہیں۔ ان دونوں روایات کے پیشِ نظر بعض علماء نے یہ تطبیق دینے کی کوشش کی ہے کہ جدِّ نوح علیہ السلام کا نام اخنوخ ہے اور اِدریس لقب اور بنی اسرائیل کے پیغمبر کا نام اِدریس ہے اور الیاس لقب۔ مگر یہ رائے بے سند اور بے دلیل ہے بلکہ قرآنِ عزیز کا الیاس اور اِدریس کو جدا جدا بیان کرنا شاید اسے متحمل نہ ہو سکے۔''

''صحیح ابن حبّان میں روایت ہے کہ حضرت ادریس علیہ السلام پہلے شخص ہیں جنہوں نے قلم کا استعمال کیا۔ ایک حدیث میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ سے کسی نے رمل کے خطوط کے متعلق سوال کیا تو آپ نے فرمایا کہ یہ علم ایک نبی کو دیا گیا تھا۔ پس اگر کسی شخص کے نقوش اس کے مطابق آ جاتے ہیں تو نشانہ صحیح بیٹھ جاتا ہے ورنہ نہیں۔''

حافظ عماد الدین ابن کثیر ان روایات کے ساتھ یہ بھی نقل فرماتے ہیں کہ بہت سے علمائے تفسیر و احکام کا یہ خیال ہے کہ حضرت ادریس علیہ السلام ہی پہلے شخص ہیں جنہوں نے رمل کے کلمات ادا کئے اور وہ اُنہیں ''ہرمس الہرامسہ'' کا لقب دیتے ہیں اور ان کی جانب بہت سی غلط باتیں اسی طرح منسوب کرتے ہیں جس طرح اُن کے علاوہ

بہت سے انبیاء، علماء، حکماء اور اولیاء اللہ کے متعلق منسوب کی گئی ہیں۔''

''معراج کی صحیحین والی حدیث میں صرف اسی قدر ذکر ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے حضرت ادریس علیہ السلام سے چوتھے آسمان پر ملاقات کی۔'' (صحیح بخاری: باب الاسراء ؛ صحیح مسلم جلد اوّل، باب الاسراء۔)

اوپر سورہ مریم کی آیت ۵۷ میں بیان ہوا تھا وَرَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا (اور ہم نے ادریس کو بلند جگہ پر اٹھالیا) بعض علماء نے کہا کہ اس سے کسی جگہ پر اٹھانا مراد نہیں ہے بلکہ اس سے مراتب کی بلندی مراد ہے یعنی اُن کے درجات کو بلند کیا۔ لیکن یہ تعبیر صحیح نہیں ہے کیونکہ درجات کی بلندی تو کسی نہ کسی طرح ہر نبی کو حاصل رہی ہے۔ صحیح بات یہی ہے کہ اُنہیں زمین سے اوپر اٹھا کر لے جایا گیا۔ کعب رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ اُن کی روح چھٹے آسمان پر قبض کر لی گئی۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ کا بھی یہی قول ہے۔ مجاہد اور ابوسعید خدری رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ وہ چوتھے آسمان پر ہیں اور زید بن اسلم نے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ ادریس علیہ السلام جنت میں زندہ ہیں۔ (تبیان القرآن، جلد ہفتم، صفحہ ۲۹۴)

امام الحسین بن مسعود بغوی (م ۵۱۶ ھ) لکھتے ہیں :

''اس میں اختلاف ہے کہ حضرت ادریس آسمان پر زندہ ہیں یا فوت شدہ ہیں۔ بعض نے کہا وہ فوت شدہ ہیں اور بعض نے کہا: وہ زندہ ہیں۔ انہوں نے کہا: چار نبی زندہ ہیں، دو زمین پر ہیں خضر اور الیاس علیہما السلام اور دو آسمان میں ہیں، ادریس اور عیسیٰ علیہما السلام۔'' (معالم التنزیل، ج ۳، ص ۱۶۷، مطبوعہ دار الکتب العلمیہ بیروت ۱۴۱۴ھ)

''جب حضرت ادریس علیہ السلام سنِ شعور کو پہنچے تو اللہ تعالیٰ نے اُنہیں نبوّت سے سرفراز فرمایا۔ تب اُنہوں نے شریر اور مفسدوں کو راہِ ہدایت کی تبلیغ شروع کی مگر مفسدوں نے اُن کی ایک نہ سنی اور حضرت ادریس علیہ السلام کے مخالف ہی رہے۔ البتہ ایک چھوٹی سی جماعت ضرور مشرف بہ اسلام ہو گئی۔ ادریس علیہ السلام نے جب یہ رنگ دیکھا تو وہاں سے ہجرت کا ارادہ کیا اور اپنے پیروؤں کو بھی ہجرت کی تلقین فرمائی۔ پیروانِ ادریس نے جب یہ سنا تو اُنہیں ترکِ وطن بہت شاق گزرا اور کہنے لگے کہ بابل ☆ جیسا وطن ہمیں کہاں نصیب ہو سکتا ہے!'' حضرت ادریس نے تسلی دیتے ہوئے فرمایا کہ اگر تم یہ تکلیف اللہ کی راہ میں اٹھاتے ہو تو اُس کی رحمت وسیع ہے۔ وہ اس کا نعم البدل ضرور عطا کرے گا۔ پس ہمت نہ ہارو اور اللہ کے حکم کے آگے سرِ نیاز جھکا دو۔''

''مسلمانوں کی رضامندی کے بعد ادریس علیہ السلام اور اُن کی جماعت مصر کی جانب ہجرت کر گئی۔ جماعت نے جب نیل کی روانی اور اس کی سرزمین کی شادابی دیکھی تو بہت خوش ہوئی۔ ادریس علیہ السلام اور اُن کی پیرو جماعت نے جب مصر میں سکونت اختیار کر لی تو یہاں بھی اُنہوں نے پیغامِ الٰہی اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فرض انجام دینا

☆ ''بابل کے معنی نہر کے ہیں اور چونکہ بابل دجلہ وفرات کی نہروں سے سرسبز و شاداب تھا اس لئے اس نام سے موسوم ہوا۔ یہ عراق کا مشہور شہر تھا جو فنا ہو گیا۔'' (قصص القرآن ۔۔۔ حفظ الرحمٰن سیوہاروی، جلد اوّل، صفحہ ۹۴)

شروع کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ اُن کے زمانہ میں بہتر (۷۲) زبانیں بولی جاتی تھیں اور اللہ تعالیٰ کی عطا و بخشش سے آپ وقت کی تمام زبانوں کے زباں داں تھے اور ہر ایک جماعت کو اُسی کی زبان میں تبلیغ فرمایا کرتے تھے۔''

''ادریس علیہ السلام نے دینِ حق کے پیغام کے علاوہ سیاستِ مُدن' شہری زندگی اور بود و باش کے متمدن طریقوں کی بھی تعلیم و تلقین کی اور اس کے لئے اُنہوں نے ہر ایک فرقہ و جماعت سے طلباء جمع کئے اور اُنہیں مدنی سیاست اور اُس کے اصول و قواعد سکھائے۔ جب یہ طلبہ کامل و ماہر بن کر اپنے قبائل کی طرف لوٹے تو انہوں نے شہر اور بستیاں آباد کیں جنہیں مدنی اصول پر بسایا۔ ان شہروں کی تعداد کم و بیش دو صد کے قریب تھی جن میں سب سے چھوٹا شہر ''رہا'' تھا (یہ شہر صفحۂ عالم سے مٹ گیا مگر اس کے کھنڈرات باقی ہیں)۔ ادریس علیہ السلام نے ان طلبہ کو دوسرے علوم کی بھی تعلیم دی جن میں علمِ حکمت اور علمِ نجوم جیسے علوم بھی شامل ہیں۔''

''ادریس علیہ السلام پہلی ہستی ہیں جنہوں نے علمِ حکمت و نجوم کی ابتدا کی۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اَفلاک اور اُن کی ترکیب' کواکب اور اُن کے اجتماع و افتراق کے نقاط اور اُن کے باہم کشش کے رموز و اسرار کی تعلیم دی اور اُنہیں علمِ عدد و حساب کا عالم بنایا اور اگر اس پیغمبرِ خدا کے ذریعے ان علوم کا انکشاف نہ ہوتا تو انسانی طبائع کی وہاں تک رسائی مشکل تھی۔ اُنہوں نے مختلف گروہوں اور اُمتوں کے لئے ان کے مناسبِ حال قوانین و قواعد مقرر فرمائے اور اقطاعِ عالم کو چار حصّوں میں منقسم کر کے ہر ربع کے لئے ایک حاکم مقرر کیا جو اس حصّہ زمین کی سیاست و ملوکیت کا ذمہ دار قرار پایا اور ان چاروں کے لئے ضروری قرار دیا کہ تمام قوانین سے مقدم شریعت کا وہ قانون رہے گا جس کی تعلیم وحیِ الٰہی کے ذریعے میں نے تمہیں دی ہے۔''

<u>بعد میں آنے والے نبیوں کے متعلق بشارت</u>: ادریس علیہ السلام نے اپنی امت کو یہ بھی بتایا کہ میری طرح اس عالم کی دینی و دنیوی اصلاح کے لئے بہت سے انبیاء علیہم السلام تشریف لائیں گے اور اُن کی نمایاں خصوصیات یہ ہوں گی: (۱) وہ ہر بُری بات سے بَری اور پاک ہوں گے۔ (۲) وہ قابلِ ستائش اور فضائل میں کامل ہوں گے' زمین و آسمان کے احوال سے وحیِ الٰہی کے ذریعے اس طرح واقف ہوں گے کہ کوئی سائل تشنہ کام نہ رہے گا۔ وہ مستجاب الدعوات ہوں گے اور اُن کے مذہب کی دعوت کا خلاصہ اصلاحِ کائنات ہوگا۔''

''<u>ادریس علیہ السلام کی خلافت ارضی</u>: جب ادریس علیہ السلام اللہ کی زمین کے مالک بنا دیئے گئے تو اُنہوں نے علم و عمل کے اعتبار سے اللہ کی مخلوق کو تین طبقات میں تقسیم کر دیا: کاہن' بادشاہ اور رعیّت اور حسبِ ترتیب اُن کے مراتب مقرر فرمائے۔ کاہن سب سے پہلا اور بلند درجہ قرار پایا اس لئے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنے نفس کے علاوہ بادشاہ اور رعیت کے معاملات میں بھی جوابدہ ہے۔ بادشاہ کا دوسرا درجہ رکھا گیا اس لئے کہ وہ اپنے نفس اور امورِ مملکت کے متعلق جواب دہ ہے اور رعیّت صرف اپنے نفس ہی کے لئے جواب دہ ہے اس لئے وہ تیسرے طبقہ میں شامل ہے۔ لیکن یہ طبقات فرائض کے اعتبار سے تھے نہ کہ نسل و خاندان کے امتیازات کے لحاظ سے۔ بہرحال ادریس علیہ السلام ''رفع الی اللہ'' تک انہی قوانینِ شریعت و سیاست کی تبلیغ فرماتے رہے۔''

(۸۲) سانحہ اِفک (IFK)

حق وصداقت کی پامالی کو عربی زبان میں ''اِفک'' کہا جاتا ہے۔ وہ ہوائیں جو اپنے معمول کے خلاف الٹی چلتی ہیں، بھی اِفک کہلاتی ہیں۔ اِفک کا لفظی معنیٰ جھوٹ اور افتراء ہے۔ قرآنی اصطلاح میں واقعہ اِفک (جس کی تشہیر زیادہ تر منافقینِ مدینہ نے کی تھی) کا تعلق اُمّ المؤمنین سیّدہ عائشہ صدّیقہ رضی اللہ عنہا کی مقدّس ہستی سے ہے۔

سانحہ اِفک سن چھ ہجری میں غزوہ بنی مصطلق کے بعد پیش آیا۔ سیّدہ عائشہ صدّیقہ رضی اللہ عنہا حسبِ معمول اونٹ کی ہودج میں بیٹھی سفر کر رہی تھیں۔ مدینہ سے تھوڑے ہی فاصلے پر ایک مقام پر مختصر سے قیام کے دوران سیّدہ اونٹ سے اتر کر قضائے حاجت کے لئے کچھ دُور گئیں۔ جب واپس آئیں تو لشکر وہاں سے کوچ کر چکا تھا۔ جو لوگ سیّدہ کے ہودج کو رکھنے اور پھر اتارنے پر مامور تھے، اُنہوں نے حسبِ عادت وہ ہودج اٹھایا اور اونٹ پر کس دیا۔ اُنہیں یہ معلوم نہ ہو سکا کہ سیّدہ ہودج میں نہیں ہیں کیونکہ آپ ہلکی پھلکی تھیں اور کم عمر بھی تھیں۔ یہ خیال کر کے کہ جب وہ سیّدہ کو ہودج میں نہ پائیں گے تو آپ کی تلاش میں ضرور وہاں آئیں گے، آپ وہیں ٹھہر گئیں۔ صفوان بن معطل کی یہ ڈیوٹی تھی کہ وہ لشکر کے پیچھے پیچھے رہتے۔ جب لشکر کوچ کرتا تو وہاں پہنچتے۔ اگر کسی کی کوئی چیز پڑی ہوئی ملتی تو اسے اٹھا کر اس کے مالک تک پہنچا دیتے۔ سیّدہ چادر لپیٹ کر لیٹ گئیں۔ اتنے میں صفوان آ پہنچے۔ ابھی صبح کا اندھیرا تھا۔ اُنہوں نے کسی کو دُور سے سویا ہوا دیکھا تو قریب آئے۔ پردہ کے احکام کے نزول سے پہلے اُنہوں نے سیّدہ کو دیکھا ہوا تھا اس لئے وہ سیّدہ کو پہچان گئے اور بہ آوازِ بلند اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن پڑھا جس سے سیّدہ اٹھ بیٹھیں اور اپنا چہرہ ڈھانپ لیا۔ فرماتی ہیں کہ صفوان نے اپنا اونٹ میرے قریب کیا اور مجھے سوار کر کے چل دیئے اور اس طرح ہم دوپہر کے وقت لشکر سے آملے۔ رئیس المنافقین عبداللہ بن اُبی نے جب یہ دیکھا تو اس نے طوفان برپا کر دیا۔

سیّدہ فرماتی ہیں کہ جب میں مدینہ پہنچی تو بیمار ہو گئی اور ایک ماہ تک بیمار پڑی رہی۔ لوگوں میں اس بات کا خوب چرچا ہوتا رہا لیکن مجھے قطعاً اس کا علم نہ تھا۔ البتہ ایک بات مجھے کھٹک رہی تھی کہ میری علالت کے وقت جو لطف و عنایت حضور علیہ السلام مجھ پر فرمایا کرتے تھے، وہ مفقود تھی۔ آپ ﷺ جب مزاج پرسی کے لئے تشریف لاتے تو صرف اتنا دریافت کرتے کہ تمہارا کیا حال ہے؟ اس سے مجھے شک گزرتا۔ تاہم مجھے اس شرانگیز پروپیگنڈے کی خبر تک نہ تھی۔ بیماری کے بعد میں بہت نقاہت اور کمزوری محسوس کرنے لگی۔ ایک دن میں کمزوری کی حالت میں نکلی۔ میرے ساتھ مِسطح کی ماں بھی میدان کی طرف گئیں اور یہ میدان ہماری قضائے حاجت کی جگہ تھی اور ہم صرف رات کے وقت ہی وہاں جاتے تھے کیونکہ اس وقت تک ہمارے گھروں میں بیت الخلاء بنے ہوئے نہیں تھے اور ہمارا معمول عرب کے پہلے لوگوں کی طرح تھا۔ حضرت مِسطح کی ماں جو سیّدنا صدّیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کی خالہ تھیں، میں اور وہ میدان میں گئے۔ فراغت کے بعد جب ہم لوٹ رہے تھے تو مِسطح کی ماں چادر میں الجھ کر لڑکھڑا گئیں۔ اُنہوں نے کہا: مِسطح ہلاک ہو جائے۔ میں نے اُن سے کہا کہ آپ نے بُری بات کہی ہے۔ کیا آپ ایسے شخص کو بُرا کہہ رہی ہیں جو مجاہدینِ بدر سے ہے۔ اُنہوں نے کہا کیا آپ نے نہیں سنا وہ کیا کہتا ہے! میں نے پوچھا وہ کیا کہتا ہے؟ تب اُنہوں نے مجھے تہمت لگانے

والوں کی بات سنائی۔ میرے استفسار پر اُس نے سارا واقعہ مجھے کہہ سنایا۔ یہ سن کر میرا مرض پھر عود کر آیا۔ جب میں اپنے گھر لوٹی اور رسول اللہ ﷺ تشریف لائے۔ آپ نے سلام کیا اور میرا حال پوچھا۔ میں نے کہا: کیا آپ مجھے اپنے والدین کے ہاں جانے کی اجازت دیتے ہیں؟ میرا ارادہ یہ تھا کہ میں وہاں جا کر اپنے والدین سے اس خبر کی تصدیق کروں۔ رسول اللہ ﷺ سے اجازت پا کر میں اپنے ماں باپ کے گھر گئی اور اپنی والدہ سے پوچھا: امی جان! یہ لوگ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟ اُنہوں نے کہا: بیٹی! حوصلہ رکھو' کم ہی کوئی حسین عورت ہوگی جو اپنے شوہر کے نزدیک محبوب ہو اور اس کی سوکنیں بھی ہوں مگر وہ اس پر غالب آنے کی کوشش کرتی ہیں۔ میں نے کہا: سبحان اللہ! کیا واقعی لوگ ایسی باتیں کر رہے ہیں! میرے آنسو تھمتے نہیں تھے اور میں نیند کو سرمہ نہیں بنا سکی' حتیٰ کہ مجھے روتے روتے صبح ہوگئی تب بھی میرے آنسو جاری تھے۔ جب نزولِ وحی میں تاخیر ہوئی تو نبی اکرم ﷺ نے حضرت علی اور اُسامہ بن زید کو بلایا۔ اُسامہ نے تو میری براءت کی۔ اُن کے دل میں حضور علیہ السلام کے اہل کی جو محبت تھی' اُسے انہوں نے ظاہر کیا۔ حضرت علی کرّم اللہ وجہہ' نے عرض کیا: یا رسول اللہ! آپ اتنے رنجیدہ خاطر کیوں ہیں؟ اس کے علاوہ عورتوں کی کیا کمی ہے؟ اگر حضور تصدیق فرمانا چاہتے ہیں تو بریرہ لونڈی کو بلا کر دریافت فرمائیے' وہ حقیقتِ حال سے آگاہ کر دے گی۔ چنانچہ بریرہ رضی اللہ عنہا سے حضور علیہ السلام نے پوچھا: اے بریرہ! هَلْ رَأَيْتِ مِنْ شَيْءٍ يُرِيْبُكِ مِنْ عَائِشَةَ؟ کیا تم نے کوئی ایسی چیز دیکھی ہے جس سے تمہیں عائشہ کے بارے میں کوئی شک ہو؟ اُس نے عرض کی: مجھے اُس اللہ کی قسم! جس نے آپ کو سچا رسول بنا کر بھیجا ہے اس کے سوا میں نے عائشہ میں کوئی عیب نہیں دیکھا کہ آٹا گوندھا ہوا رکھا ہوتا ہے۔ یہ اپنی کم سنی کی وجہ سے سو جاتی ہیں اور بکری آ کر آٹا کھا جاتی ہے۔ پھر سرورِ عالم ﷺ مسجد میں تشریف لے گئے اور منبر پر کھڑے ہو کر ارشاد فرمایا:

يَا مَعْشَرَ الْمُسْلِمِيْنَ! مَنْ يَّعْذُرُنِيْ مِنْ رَّجُلٍ قَدْ بَلَغَنِيْ أَذَاهُ فِيْ أَهْلِيْ فَوَاللهِ مَا عَلِمْتُ عَلَى أَهْلِيْ إِلَّا خَيْرًا وَمَا عَلِمْتُ عَلَى أَهْلِيْ مِنْ سُوْءٍ

''اے گروہِ مسلمانان! اس شخص کے بارے میں مجھے کون معذور رکھتا ہے جس کی اذیت رسانی میرے اہلِ خانہ کے بارے میں مجھ تک پہنچی ہے۔ بخدا! میں اپنے اہل کے لئے خیر کے بغیر کچھ نہیں جانتا اور مجھے ان سے کسی غلطی کا کوئی علم نہیں ہے۔''

سیّدہ فرماتی ہیں کہ میرے آنسو تھے کہ رکتے نہیں تھے۔ میرے والدین یہ گمان کر رہے تھے کہ میرا رونا میرے جگر کو پاش پاش کر دے گا۔ فرماتی ہیں کہ جس وقت ہم اس کیفیت میں تھے تو ہمارے پاس رسول اللہ ﷺ تشریف لائے اور سلام کر کے بیٹھ گئے اور جب سے یہ تہمت لگائی گئی تھی' آپ میرے پاس نہیں بیٹھے تھے اور ایک ماہ تک میرے متعلق کوئی وحی نازل نہیں ہوئی تھی۔ جب رسول اللہ ﷺ بیٹھ گئے تو آپ نے کلمہ شہادت پڑھا۔ پھر آپ نے فرمایا: اے عائشہ! تیرے بارے میں مجھے ایسی اطلاع ملی ہے۔ اگر تو پاکدامن ہے تو اللہ تعالیٰ تیری براءت کرے گا۔۔۔۔۔ میرے آنسو یکدم خشک ہو گئے اور میں منہ پھیر کر بستر پر لیٹ گئی۔ مجھے یقین تھا کہ اللہ ضرور میری براءت فرمائے گا۔ حضور علیہ السلام ابھی وہیں تشریف فرما تھے کہ نزولِ وحی کے آثار ظاہر ہونے لگے۔ سردی کے موسم میں بھی نزولِ وحی کے وقت پسینے کے قطرے موتیوں کی طرح ڈھلکنے لگتے تھے۔ جب وہ کیفیت ختم ہوئی تو حضور ہنس

رہے تھے اور پہلی بات جو آپ نے فرمائی وہ یہ تھی: أَبْشِرِی یَا عَائِشَةُ أَمَّا اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ فَقَدْ بَرَّءَكِ (اے عائشہ! خوشخبری ہو۔ اللہ تعالیٰ نے تیری براءت فرمادی ہے)۔ اس وقت سورہ النور کی یہ دس آیات نازل ہوئیں اِنَّ الَّذِیْنَ جَآءُوْ بِالْاِفْكِ عُصْبَةٌ مِّنْكُمْ لَا تَحْسَبُوْهُ شَرًّا لَّكُمْ بَلْ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ تا رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ O

اِفك کے صرف ایک لفظ ہی سے منافقین کی سازش کو بے نقاب کر دیا کہ اس کا صداقت سے دُور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ یہ سراسر جھوٹ، افتراء اور بہتان ہے۔ جس واقعہ کو زبانِ قدرت جھوٹ کا پلندہ کہہ دے، اس کی مزید تصدیق کی ضرورت نہیں رہتی لیکن واقعہ کی سنگینی کے پیشِ نظر اور مسلمانوں کی تربیت کے لئے اسے مزید وضاحت سے بیان فرمادیا۔ درج بالا آیت ۱۱ میں خطاب تمام مسلمانوں کو ہے، خصوصاً حضرت صدّیق اور اُن کے خانوادہ کو یعنی اس بہتان تراشی سے جو قلبی اور روحانی تکلیف تمہیں پہنچی ہے، اُسے شر خیال نہ کرو، اس میں تمہارے لئے خیر ہی خیر ہے۔ اس جھوٹے الزام سے تمہیں دکھ ہوا۔ رضائے الٰہی کے لئے تم نے صبر کیا، اس پر تمہیں اجرِ عظیم ملے گا۔ اے صدّیق! تمہیں چند دن تکلیف ضرور ہوئی لیکن اب قیامت تک تیری نورِ نظر کی پاک دامنی کی شہادت قرآن دیتا رہے گا، تیری لختِ جگر کی عفت اور پاک دامنی کو ماننا ایمان اور اسلام ہوگا۔ جو اس کا انکار کرے گا بلکہ جو اس میں ذرّہ بھر شک کرے گا وہ بھی دائرہ اسلام سے خارج اور نعمتِ ایمان سے محروم کر دیا جائے گا۔

آیت ۱۲ میں اللہ تعالیٰ مؤمنوں کو عتاب اور سرزنش فرما رہا ہے کہ تم نے سنتے ہی اس بہتان کی تردید کیوں نہ کر دی اور اس میں تردد کی غلطی کیوں کی؟ تمہیں تو فوراً کہہ دینا چاہئے تھا: هٰذَا اِفْكٌ مُّبِيْنٌ کہ یہ کھلا ہوا جھوٹ ہے۔ آیت ۱۳ میں فرمایا کہ اگر منافقین کے اس دعویٰ میں رائی کے برابر بھی صداقت ہوتی تو وہ گواہ پیش کرتے لیکن اُن کا گواہ پیش کرنے سے قاصر رہنا اس بات کی واضح دلیل ہے کہ یہ الزام بالکل من گھڑت ہے اور محض حسد کا نتیجہ ہے۔ آیات ۱۴، ۱۵ میں فرمایا کہ یہ اللہ تعالیٰ کا محض فضل واحسان اور اس کی رحمت ہے کہ اس نے تمہیں فوراً عذاب میں مبتلا نہیں کر دیا ورنہ بے پر کی اُڑانے والوں نے تو قہرِ الٰہی کو دعوت دینے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔ اُنہوں نے تو یہ خیال کیا کہ یہ ایک معمولی سی بات ہے۔ اُنہیں کیا خبر کہ جس بات سے اللہ تعالیٰ کے محبوب کا دل رنجیدہ ہو، اس سے اللہ تعالیٰ کی آتشِ غضب بھڑک اٹھتی ہے۔ جس ذاتِ پاک کو پاک دامنی اور پاک بازی کا درس دینے کے لئے منتخب فرمایا گیا ہو، اُس کے دامنِ تقدس کو داغ دار کرنے کی کوشش اللہ تعالیٰ کے نزدیک بڑی ہی مذموم اور ناپاک ہے۔

''آیت ۱۶ میں سُبْحٰنَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ '' فرما کر اس امر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سے پاک اور منزّہ ہے کہ اس کے رسول کی زوجہ محترمہ کا دامن ایسے الزام سے آلودہ ہو (بحرالمحیط)۔ گویا نبی مکرّم کی رفیقہ حیات پر الزام لگانا نبی مکرّم پر الزام لگانا اور نبی مکرّم پر ایسا الزام آپ پر نہیں بلکہ ربّ کریم پر ہے جس نے ایسا نبی بنایا۔ یاد رہے کہ حضرت صدّیقہ کی پاکدامنی کو ثابت کرنے کے لئے زبانِ قدرت نے وہی اسلوب اختیار کیا جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ٹھہرانے والوں کی تردید کے وقت اختیار کیا جاتا ہے۔''

امام رازی رحمۃ اللہ علیہ تصریح فرماتے ہیں کہ وحی کے نزول سے پہلے بھی حضور علیہ السلام کو سیّدہ عائشہ کی

پاکدامنی کا علم تھا کیونکہ نبی کا ایسے عیوب سے پاک ہونا جو لوگوں کو اس سے متنفر کر دیں' ضروریاتِ عقلیہ میں سے ہے جیسے اس کا جھوٹا ہونا' کمینہ خاندان کا فرد ہونا اس کے والدین کا تہمتِ زنا سے متہم ہونا' اس طرح اس کی اہلیہ کی عصمت کا مشکوک ہونا۔ اگر نبی میں ان عیوب میں سے کوئی ایک عیب بھی پایا جائے گا تو لوگ اس سے متنفر ہو جائیں گے اور اس کی بعثت کا مقصد ہی فوت ہو جائے گا (تفسیر کبیر بحوالہ ضیاء القرآن' جلد سوم' صفحات ۳۰۰'۳۰۱)۔

امام موصوف نے اپنے اس کلام پر دو شبہے پیش کئے ہیں اور خود ہی اُن کا جواب دیا ہے:

(۱) نبی کی بیوی کا کافر ہونا قرآن سے ثابت ہے (نوح اور لوط علیہما السلام کی ازواج بحوالہ سورۃ التحریم آیت دہم) اور کفر زنا سے زیادہ سنگین ہے۔ اگر نبی کی اہلیہ سے کفر جیسے سنگین جرم کا ارتکاب ہو سکتا ہے تو اس سے کم درجہ کے گناہ کا بھی صدور ممکن ہے۔ اس کا جواب فرمایا کہ بیوی کا کفر لوگوں کو متنفر نہیں کرتا۔ البتہ اس کے دامنِ عصمت کا داغدار ہونا لوگوں کو بلاشبہ متنفر کر دیتا ہے۔

(۲) دوسرا شبہ یہ ذکر کیا ہے کہ اگر حضور علیہ السلام کو علم ہوتا تو آپ اتنا عرصہ پریشان کیوں رہتے۔ اس کے ردّ میں فرماتے ہیں کہ آپ کی پریشانی عدمِ علم کی دلیل نہیں۔ کفار کی ایسی باتیں جن کا بطلان اظہر من الشمس تھا وہ سن کر بھی حضور پریشان ہوتے نیز سیّدہ عائشہ کی پاکدامنی ایک مسلّمہ حقیقت تھی جس کے متعلق کسی کو ادنیٰ شبہ بھی نہ تھا۔ الزام لگانے والے سارے منافق تھے اور اُن کے پاس اس الزام کو ثابت کرنے کے لئے کوئی ثبوت نہ تھا۔ ان قرائن کے ہوتے ہوئے ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ نزولِ وحی سے پہلے بھی اس الزام کا جھوٹا ہونا حضور علیہ السلام کو بخوبی معلوم تھا۔ اس کے علاوہ جو خطبہ آپ نے منبر پر کھڑے ہو کر ارشاد فرمایا تھا جس کا حوالہ صفحہ ۲۲۳ پر دیا جا چکا ہے' وہ شک وشبہ کو دُور کرنے کے لئے کافی ہے۔

آپ کا یہ خطبہ بالاتفاق نزولِ آیات سے پہلے کا ہے۔ اپنے اہلِ بیت کی براءت حلف اٹھا کر بیان فرمائی اور مفتری سے انتقام لینے کا حکم دیا۔ آپ ﷺ کا حلف اٹھانا اور مفتری سے انتقام لینے کا حکم دینا اسی وقت متصوّر ہو سکتا ہے جب آپ کو سیّدہ عائشہ کی پاکیزگی اور الزام لگانے والوں کے جھوٹے ہونے کا یقینی علم ہو۔ اگر آپ کو ذرا بھی تردّد ہوتا تو آپ قطعاً حلف نہ اٹھاتے اور نہ مفتری کو سزا دینے کی ترغیب دیتے۔

نزولِ وحی میں تاخیر کی جو حکمتیں ہیں ان کا کوئی کیا اندازہ لگا سکتا ہے! ابتلاء میں شدت' اس کی مدت میں طوالت بایں ہمہ صبر واستقامت کا مظاہرہ ان تمام امور میں بھی لطف ہے اور اس کی قدر ومنزلت اہلِ محبت ہی جانتے ہیں۔

''رہا یہ سوال کہ اگر آپ کو اُمّ المؤمنین کی براءت کا پہلے سے علم تھا تو آپ نے حضرت عائشہ کی طرف توجہ کم کیوں کر دی تھی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ آپ کا حضرت امّ المؤمنین کی طرف توجہ کم کرنا لاعلمی کی وجہ سے نہ تھا بلکہ اس

تہمت کے بعد آپ کی غیرت کا تقاضا تھا کہ جب تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے سیّدہ کی براءت کا اعلان نہ ہو جائے اس وقت تک آپ توجہ کم رکھیں تا کہ کسی دشمنِ اسلام کو یہ کہنے کا موقع نہ ملے کہ آپ کو اس قسم کی تہمت سے کوئی نفرت نہ تھی۔''

''دوسرا اعتراض یہ ہے کہ اگر آپ کو حضرت اُمّ المؤمنین کی براءت کا پہلے سے علم تھا تو آپ نے اس مسئلہ میں اصحاب سے مشورہ کیوں کیا اور حضرت بریرہ سے حضرت عائشہ کے چال چلن کے متعلق استفسار کیوں کیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ سب اس لئے کیا تھا کہ کسی دشمنِ اسلام کو یہ کہنے کی گنجائش نہ ہو کہ دیکھو جب ان کے اپنے اہل پر تہمت لگی تو انہوں نے اس کے متعلق کوئی تحقیق اور تفتیش نہیں کی۔ آپ نے اس مسئلہ کی پوری تحقیق کی اور تفتیش کے تمام تقاضوں کو پورا کیا۔ حضرت عائشہ کی سوکن (سیّدہ زینب بنتِ جحش رضی اللہ عنہا)' حضرت عائشہ کی خادمہ بریرہ اور دیگر قریبی ذرائع سے حضرت عائشہ کے چال چلن کے متعلق استفسار کیا اور سب نے اُن کی براءت اور پاکیزگی کا اظہار کیا اور سب نے بہ یک زبان کہا کہ ہم حضرت عائشہ کے متعلق پاکیزگی کے سوا اور کچھ نہیں جانتے۔''

تیسرا اعتراض یہ ہے کہ اگر آپ کو حضرت اُمّ المؤمنین کی براءت اور پاکیزگی کا پہلے سے علم تھا تو آپ اس قدر پریشان اور غمگین کیوں رہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ غم اور صدمہ کی وجہ یہی تو تھی کہ بے گناہ پر تہمت لگی ہے۔ ذرا سوچیں تو سہی کہ اگر ان کی بہو بیٹی پر ایسا بہتان لگایا جائے یا خود اُن کی اپنی ذات کو ہدف بنایا جائے اگر چہ انہیں اپنی پاکدامنی کا حق الیقین بھی ہو تو کیا ان کا جگر چھلنی نہیں ہو جائے گا؟ نیز زیادہ غم اور پریشانی کا سبب یہ تھا کہ بعض مسلمان بھی تہمت لگانے والوں میں شامل ہو گئے تھے جیسے مسطح اور حسان بن ثابت وغیرہ۔ ایسے میں اگر رسول اللہ ﷺ از خود حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی براءت کا اعلان کرتے تو یہ خدشہ تھا کہ وہ مسلمان آپ کے متعلق یہ بدگمانی کرتے کہ آپ اپنے اہل کی رعایت فرما رہے ہیں اور آپ کے متعلق بدگمانی کر کے وہ کافر ہو جاتے۔''

''<u>کسی نبی کی زوجہ نے کبھی بدکاری نہیں کی</u>: نبی اکرم ﷺ کو سیّدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی پاکدامنی کا علم تھا۔ اس پر ایک قوی دلیل یہ ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ کسی نبی کی بیوی نے کبھی بدکاری نہیں کی تو جب نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کو ہر نبی کی پاکدامنی کا علم ہے تو اپنی زوجہ مطہرہ کی پاکدامنی کا علم آپ کو کیسے نہیں ہوگا! امام ابو جعفر محمد بن جریر طبری (م ۳۱۰ ھ) اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

عَنِ الضحاك مَا بَغَتْ اِمْرَأَةُ نَبِيٍّ قَطُّ (جامع البیان رقم الحدیث: ۲۶۷۱۰ مطبوعہ بیروت ۱۴۱۵ ھ)

''ضحاک بیان کرتے ہیں کہ کسی نبی کی بیوی سے کبھی بدکاری نہیں کی۔''

امام الحسین بن مسعود الفراء بغوی (م ۵۱۶ ھ) نے معالم التنزیل میں' حافظ ابوالقاسم علی بن الحسن المعروف بابن عساکر (م ۵۷۱ ھ) نے تاریخ دمشق الکبیر میں' ابوالقاسم محمود بن عمر الزمخشری الخوارزمی (م ۵۳۸ ھ) نے الکشاف میں' علامہ السیوطی (م ۹۱۱ ھ) نے اور علامہ شوکانی (م ۱۲۵۰ ھ) نے اس روایت کا ذکر کیا ہے۔

''<u>سیّدہ عائشہ کی براءت پر اہلِ سنت کے دلائل</u>: امام رازی اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''سیّدہ عائشہ کا نبی معصوم ﷺ کی زوجہ ہونا اس فاحشہ کے ارتکاب سے مانع ہے کیونکہ انبیاء علیہم السلام کفار کو دینِ حق کی طرف دعوت دینے کے لئے مبعوث ہوتے ہیں۔ اس لئے واجب ہے کہ اُن میں کوئی ایسا عیب نہ ہو جو لوگوں کو اُن سے متنفر کرے اور جس شخص کی بیوی بدکار ہو اس سے لوگ بہت نفرت کرتے ہیں۔ اگر یہ سوال ہو کہ نبی کی بیوی کا کافرہ ہونا کیوں جائز ہے جیسا کہ حضرات نوح اور لوط علیہما السلام کی بیویاں کافرہ تھیں اور جب اُن کا کافرہ ہونا جائز ہے تو فاجرہ ہونا کیوں جائز نہیں ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ کفار کے نزدیک کفر موجبِ نفرت نہیں ہے اور بیوی کا فاجرہ ہونا اُن کے نزدیک بھی موجبِ نفرت ہے۔''

علامہ ابوالبرکات نسفی لکھتے ہیں:

''روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے رسول ﷺ سے عرض کیا کہ مجھے منافقین کے جھوٹ کا یقین ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس بات سے محفوظ رکھا ہے کہ آپ کے جسم پر مکھی بیٹھے کیونکہ مکھی نجاست پر بیٹھ کر نجاست سے آلودہ ہوتی ہے تو جب اللہ تعالیٰ نے اتنی معمولی نجاست والی چیز کے مس سے آپ کو محفوظ رکھا ہے تو آپ کو اس فاحشہ کے ساتھ متلوّث ہونے والی عورت سے کیسے محفوظ نہیں رکھے گا! حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے سائے کو زمین پر پڑنے سے محفوظ رکھا ہے تاکہ کسی انسان کا اُس سائے پر قدم نہ پڑے تو جب کسی شخص کے لئے آپ کے سائے پر قدم رکھنا ممکن نہیں ہے تو کسی شخص کے لئے آپ کی زوجہ کی عزت کو پامال کرنا کس طرح ممکن ہوگا! اور حضرت علی کرّم اللہ وجہہٗ نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے جبریل کو بھیج کر آپ کو یہ خبر دی کہ آپ کے نعلین میں گھناؤنی چیز ہے اور آپ کو یہ حکم دیا کہ آپ اپنے پیر سے وہ جوتی اتار دیں تاکہ آپ کے پیر میں وہ گھن والی چیز نہ لگے تو اگر بالفرض آپ کی زوجہ اس فاحشہ سے متلوّث ہوگئی ہوتیں تو اللہ تعالیٰ آپ کو ان سے الگ ہونے کا حکم ضرور دیتا۔ اور حضرت ابوایوب انصاری نے اپنی بیوی سے کہا: کیا تمہیں اس چیز کی خبر ہے؟ اُن کی بیوی نے کہا: یہ بتاؤ کہ اگر تم حضرت صفوان بن معطّل کی جگہ ہوتے تو کیا تم رسول اللہ ﷺ کے حرمِ محترم کے ساتھ کسی فاحشہ کا ارادہ کر سکتے تھے؟ اُنہوں نے کہا: ہرگز نہیں۔ اُن کی بیوی نے کہا: اگر میں حضرت عائشہ کی جگہ ہوتی تو کبھی رسول اللہ ﷺ کے ساتھ خیانت کا ارادہ نہ کرتی اور حضرت عائشہ مجھ سے افضل ہیں اور حضرت صفوان تم سے افضل ہیں تو ان کے متعلق اس فاحشہ کا تصور کیسے ہو سکتا ہے!'' (مدارک التنزیل ج ۳، ص ۳۴۳، بحوالہ ''تبیان القرآن'' جلد ہشتم، صفحات ۸۹، ۹۰)

<u>سیّدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی براءت پر شیعہ علماء کے دلائل</u>: شیعہ مفسرین میں سے شیخ الطائفہ ابوجعفر طوسی (م ۴۶۰ھ) لکھتے ہیں:

فَالْاٰیَةُ دَالَّةٌ عَلٰی کِذْبِ مَنْ قَذَفَ عَائِشَةَ وَاَفْکِ عَلَیْهَا (التبیان، ج ۳، ص ۳۴۳)

''یہ آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ جس نے حضرت عائشہ پر تہمت لگائی وہ جھوٹا ہے۔''

شیخ فتح اللہ کاشانی لکھتے ہیں :

''ایشانند دروغ گویان در ظاہر و باطن چہ اگر گواہ آوردندے در ظاہر در حکم کاذب نبودندے اما در باطن کاذب بودندے زیرا کہ ایں صورت در ازواج انبیاء ممتنع است و چوں گواہ نیاوردند در ظاہر نیز کاذبند''
(منہج الصادقین' ج ٦' ص ص ۲۸۳' ۲۸۲ مطبوعہ خیابان ناصر خسرو ایران)

''یہ تہمت لگانے والے ظاہر اور باطن میں جھوٹے تھے کیونکہ اگر وہ گواہ پیش کر دیتے تو ظاہر میں تو جھوٹے نہ ہوتے لیکن باطن میں جھوٹے ہوتے کیونکہ انبیاء علیہم السلام کی ازواج کے لئے یہ صورت ممتنع ہے اور جب وہ گواہ پیش نہیں کر سکے تو باطن کی طرح ظاہر میں بھی جھوٹے ہوئے۔''

نیز شیخ کاشانی لکھتے ہیں :

''چہ فجور زوجاتِ پیغمبر ﷺ موجب تنفیر مردمانست از آنحضرت و انبیاء مبعوث شدہ اند بکفار بجہت آنکہ ایشانرا دعوت کنند بدین خدا پس واجب است کہ منتفی باشد از ایشاں چیزے کہ موجب تنفیر انست بہ خلاف کفر کہ نزد ایشاں منفر نبود ازایں جہت واجب است کہ ازواجِ انبیاء از فجور مصون باشند و لازم نیست کہ از کفر بری باشندے۔'' (ایضاً' ج ٦' ص ۲۸۴)

''کیونکہ نبی ﷺ کی ازواج سے فاحشہ کا صدور لوگوں کی حضور سے نفرت کا موجب ہے اور انبیاء علیہم السلام کفار کی طرف اس لئے بھیجے جاتے ہیں کہ اُنہیں اللہ کے دین کی دعوت دیں۔ اس لئے واجب ہے کہ وہ ان چیزوں سے محفوظ رہیں جو کفار کے تنفر کا موجب ہو اور بدکاری سب سے زیادہ تنفر کا موجب ہے۔ اس کے بر خلاف کفر اُن کے نزدیک تنفر کا موجب نہیں ہے اس لئے واجب ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی ازواج اس فاحشہ سے محفوظ ہوں اور یہ لازم نہیں ہے کہ وہ کفر سے بَری ہوں۔''

شیخ طبرسی لکھتے ہیں :

لِأَنَّ اللّٰہَ تَعَالٰی یُبَرِیُٔ عَائِشَةَ وَیَأْجُرُھَا بِصَبْرِھَا وَاِحْتِسَابِھَا وَیَلْزِمُ أَصْحٰبَ الْإِفْكِ مَااسْتَحَقُّوْہُ بِالْإِثْمِ الَّذِیْ اِرْتَکَبُوْھَا فِیْ أَمْرِھَا (مجمع البیان' ج ۷' ص ۲۰٦)
''کیونکہ اللہ تعالٰی نے حضرت عائشہ کو بَری کر دیا اور اُنہیں اُن کے صبر کرنے پر اجر عطا فرمایا اور تہمت لگانے والوں کو وہ سزا ملے گی جس کے وہ مستحق ہوتے ہیں۔''

رہی سورۃ التحریم کی یہ آیت جس میں کچھ لوگوں کو لفظ ''خیانت'' سے دھوکہ لگا کہ نبی کی بیوی اپنے خاوند کی خائنہ ہو سکتی ہے:

ضَرَبَ اللّٰہُ مَثَلاً لِّلَّذِیْنَ کَفَرُو امْرَأَۃَ نُوحٍ وَامْرَأَۃَ لُوطٍ کَانَتَا تَحْتَ عَبْدَیْنِ مِنْ عِبَادِنَا صَالِحَیْنِ فَخَانَتٰھُمَافَلَمْ یُغْنِیَا عَنْھُمَا مِنَ اللّٰہِ شَیْئًا وَّقِیْلَ ادْخُلاَ النَّارَ مَعَ الدّٰاخِلِیْنَ O
(أَلتَّحْریم : ۱۰)

"اللہ تعالیٰ نے کافروں کے لئے حضرت نوح کی بیوی اور حضرت لوط کی بیوی کی مثال بیان فرمائی ہے۔ وہ دونوں ہمارے نیک بندوں میں سے دو بندوں کے گھر میں تھیں، پھر اُن دونوں نے اُن دونوں سے خیانت کی، وہ دونوں بندے اُن سے اللہ کے عذاب کو نہ روک سکے اور حکم دے دیا گیا کہ اے عورتو! تم بھی آگ میں جاؤ ساتھ جانے والوں کے۔" (۱۰ : ۶۶)

حضرت نوح اور حضرت لوط علیہما السلام دونوں پیغمبروں کی بیویاں اُن پر ایمان نہ لائی تھیں۔ حضرات نوح اور لوط علیہما السلام کی بیویوں کی اپنے شوہروں سے خیانت کی نوعیت یہ تھی کہ وہ دونوں کافرہ تھیں۔ نوح علیہ السلام کی بیوی آپ کو مجنوں اور دیوانہ کہتی اور مذاق اُڑاتی۔ لوط علیہ السلام کی بیوی آپ کے دشمنوں سے ملی ہوئی تھی۔ جب بھی آپ کے ہاں کوئی مہمان آتا تو اُس کے اطلاع دینے پر وہ بے غیرت دندناتے ہوئے حضرت لوط کے مہمان خانہ پر ہلّہ بول دیتے۔ خیانت سے مراد بدکاری نہیں کیونکہ ہر نبی کی بیوی اس عیب سے ہمیشہ پاک ہوتی ہے۔

بہر حال ربِّ ذوالجلال والاکرام نے مؤمنوں کو سخت تنبیہ فرمائی کہ اگر وہ مؤمن ہیں تو وہ آئندہ ایسی بات کبھی بھی نہ کریں:

یَعِظُکُمُ اللّٰہُ أَنْ تَعُوْدُوْا لِمِثْلِہٖ أَبَدًا اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ O (أَلنُّور : ۱۷)

"اللہ تعالیٰ تمہیں نصیحت کرتا ہے کہ پھر اس قسم کی حرکت کبھی نہ کرنا اگر تم ایمان والے ہو۔" (۲۴:۱۷)

پہلے تو سیّدہ صدّیقہ کی ذاتِ اقدس پر الزام لگانے والوں کی کمینگی کا ذکر ہوا اور وہ سزا بیان کی گئی جو ایسے نابکاروں کو دی جانی چاہئے۔ اب آیت ۲۳ میں حضرت صدّیقہ کی قیامت تک آنے والی خادماؤں اور کنیزوں کی آبرو پر حملہ کرنے والوں کے متعلق اپنی ناراضگی کا اظہار فرمایا گیا:

اِنَّ الَّذِیْنَ یَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ الْغٰفِلٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ لُعِنُوْا فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ وَلَھُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ O (أَلنُّور : ۲۳)

"جو لوگ پاکدامن عورتوں پر تہمت لگاتے ہیں جو انجان ہیں، ایمان والیاں ہیں، ایسے لوگوں پر دنیا اور آخرت میں پھٹکار ہے اور اُن کے لئے عذابِ عظیم ہے۔" (۲۳ : ۲۴)

اَلْغٰفِلٰت سے مراد وہ پاک طینت خواتین ہیں جو طبعاً اتنی نیک ہوتی ہیں کہ اُن کے دلوں میں ان فضول حرکتوں کا کبھی خیال تک بھی نہیں آتا۔ وہ اپنی فطری عفّت کے باعث کمینہ خصلت لوگوں کے طور اطوار سے بالکل ناواقف اور انجان ہوا کرتی ہیں۔ نیز اُنہیں بھولے سے بھی کبھی یہ خیال نہیں آتا کہ اُن پر کوئی انگشت نمائی کر سکتا ہے۔

اور بالآخر ربِّ ذوالجلال والاکرام نے صاف اور واضح انداز میں اُمّ المؤمنین سیّدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے کردار کی پاکیزگی اور تقدّس کا ان الفاظ میں اعلان کر دیا:

اَلْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ وَالْخَبِيْثُوْنَ لِلْخَبِيْثٰتِ وَالطَّيِّبٰتُ لِلطَّيِّبِيْنَ وَالطَّيِّبُوْنَ لِلطَّيِّبٰتِ اُولٰٓئِكَ مُبَرَّءُوْنَ مِمَّا يَقُوْلُوْنَ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ O (النور: ۲۶)

''گندی عورتیں گندے مَردوں ہی کے لائق اور گندے مرد گندی عورتوں ہی کے لائق ہوتے ہیں اور پاک دامن عورتیں پاکباز مَردوں کے لائق اور پاکباز مرد پاکدامن عورتوں ہی کے لائق ہوتے ہیں۔ یہ لوگ اس بات سے پاک ہیں جو یہ (منافق) بکتے پھرتے ہیں۔ ان کے لئے تو بخشش اور عزت کی روزی ہے۔'' ☆

دشمنِ اسلام ولیم میور (William Muir) نے اس آیت پر اس طرح رائے زنی کی ہے:

''سبحان اللہ! یہ ایک غیر معقول اور ناروا بہتان ہے۔ سیّدہ عائشہ کے کردار کے متعلق تبصرہ کرنا خالی از ضرورت ہے۔ نکاح سے پہلے اور نکاح کے بعد اُن کی زندگی کا ہر لحہ ہمیں اُن کی پاکیزگی کردار کو باور کرانے کے لئے کافی ہے۔'' ("Life of Mahomet", pp. 303, 304)

سورۃ الاحزاب میں قرآن مجید نے نبی ﷺ کے اہلِ خانہ کی پاکیزگی کردار کا اس طرح اعلان کیا:

اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا O (الاحزاب: ۳۳)

''اللہ تو بس یہی چاہتا ہے کہ (اے نبی کے گھر والو!) تم سے آلودگی کو دُور رکھے اور تمہیں خوب نکھار دے۔'' (۳۳ : ۳۳)

اسی سورۃ الاحزاب کی آیت ۳۲ میں نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ازواجِ مطہرات کی منقبت یوں بیان کی گئی:

☆ یہاں ایک روح پرور نکتہ ملاحظہ ہو۔ اس سے پہلے حضرت یوسف علیہ السلام کے کردار کی پاکیزگی اور اُن کی براءت میں شاہِ وقت کے خانوادے کے ایک گواہ نے گواہی دی تھی (بحوالہ سورہ یوسف: ۲۶، ۲۷) اور رب تعالیٰ خود نہیں بولا تھا۔ کچھ صدیوں بعد جناب عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ ماجدہ سیّدہ مریم سلام اللہ علیہا پر یہودیوں نے بدکاری کا الزام لگایا تو اُن کی براءت کے لئے بھی رب تعالیٰ نہیں بولا بلکہ چند دن کے شیر خوار عیسیٰ علیہ السلام کی زبانی اُن کی پاکیزگی کردار کا اعلان فرمایا (بحوالہ سورہ مریم: ۳۰ تا ۳۳)۔ لیکن یہاں سیّدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی براءت کے اعلان میں کسی مخلوق کو رب نے استعمال نہیں فرمایا بلکہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کو بھی خاموش رہنے اور کچھ نہ کہنے کا حکم دیا گیا۔ اس لئے کہ اگر رسول اللہ ﷺ اس ضمن کچھ تبصرہ فرماتے تو وہ بن جاتی حدیث اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس پر قیل وقال ہوتی۔ بعض اُسے ضعیف کا درجہ دے کر اور بعض راویوں پر جرح و تنقیص کر کے آپ کی حدیث سے اُلجھ کر آپ کی زوجہ مطہرہ کی پاکدامنی سے انکار کے مرتکب ہوتے۔ لہٰذا حکمتِ الٰہی اس بات کی مقتضی ہوئی کہ پیارے! انہی وجوہ کی بناء پر ہم نہیں چاہئے کہ آپ کچھ کہیں بلکہ اب ہم گزشتہ دونوں واقعات کے برعکس معاملے کو خود ہاتھ میں لے کر آپ کی زوجہ مطہرہ کے تقدس اور اُن کی پاکیزگی کردار کا اعلان کر کے اسے قرآنِ حکیم کا حصّہ بنا دیں گے۔

یَا نِسَآءَ النَّبِیِّ لَسْتُنَّ کَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ (الاحزاب : ۳۲)
''اے نبی کی بیویو! تم عام عورتوں کی طرح نہیں ہو۔'' ☆ (۳۲ : ۳۳)

''اسلامی نظامِ اخلاق کے اعلیٰ معیار کا مظاہرہ: سیّدہ صدیقہ پر بہتان لگانے والوں میں سے مسطح بن اثاثہ بھی تھے جو سیّدہ کی خالہ زاد بہن کے بیٹے تھے۔ اُن کی مالی حالت بڑی ناگفتہ بہ تھی۔ سیّدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ہمیشہ اُن کی اعانت فرمایا کرتے تھے اور ان کی ضرورت پوری کرنے میں خصوصی توجہ کرتے۔ جب مسطح اس غلط الزام کو پھیلانے میں پیش پیش ہوئے تو جناب صدیق اکبر کو سخت صدمہ پہنچا۔ جب اللہ تعالیٰ نے سیّدہ کی براءت فرمادی تو آپ نے قسم اٹھائی کہ وہ آئندہ مسطح کی اعانت نہیں کریں گے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کو اس آیت میں قسم توڑنے کا حکم دیا اور بڑے دلکش اور مؤثر انداز میں مسطح کا قصور معاف کردینے کی تلقین کرتے ہوئے فرمایا :

وَلَا یَأْتَلِ أُولُوا الْفَضْلِ مِنْکُمْ وَالسَّعَةِ أَنْ یُّؤْتُوْا أُولِی الْقُرْبٰی وَالْمَسٰکِیْنَ وَالْمُهَاجِرِیْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَلْیَعْفُوْا وَلْیَصْفَحُوْا أَلَا تُحِبُّوْنَ أَنْ یَّغْفِرَ اللّٰهُ لَکُمْ (النور : ۲۲)۔

''تم میں جو لوگ بزرگی والے اور وسعت والے ہیں وہ قرابت والوں کو، مسکینوں کو اور اللہ کی راہ میں ہجرت کرنے والوں کو نہ دینے کی قسم نہ کھا بیٹھیں، چاہیے کہ معاف کرتے رہیں اور درگزر کرتے رہیں۔ کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ تمہارے قصور معاف کرتا رہے۔'' (۲۲ : ۲۴)

یہ سنتے ہی حضرت صدیق اکبر نے فرمایا: بَلٰی وَاللّٰهِ یَا رَبَّنَا إِنَّا لَنُحِبُّ أَنْ تَغْفِرَ لَنَا (اے پروردگار! مجھے تیری قسم، ہم تو اس بات کو پسند کرتے ہیں کہ تو ہمیں معاف فرمادے) اور آپ نے پہلے سے بھی زیادہ مسطح کی امداد اور دلداری شروع کردی۔

''ذرا غور فرمائیے کہ قرآنِ حکیم اپنے ماننے والوں کو اخلاق کی کن بلندیوں پر پہنچانا چاہتا ہے۔ مسطح نے اپنے خاندان کے بزرگ اور اپنے ذاتی محسن کی ناموس پر حملہ کیا تھا اور ایسا چرکا لگایا تھا کہ یہ زخم کبھی مندمل نہیں ہوسکتے تھے۔ آپ نے اس کے خلاف کوئی انتقامی کارروائی بھی نہیں کی اور صرف مالی امداد سے ہاتھ کھینچ لئے تھے لیکن اللہ تعالیٰ کو یہ بھی پسند نہ آیا۔ اس سے بھی باز آنے کا حکم دیا کہ تم جس نبی مکرّم کے فیض یافتہ ہو، اُس نے تو ہمیشہ پتھر مارنے والوں اور راستے میں کانٹے بچھانے والوں کے لئے بھی ہدایت کی دعائیں مانگی ہیں۔ تمہیں یہ زیب دیتا ہے کہ جس شخص نے تمہاری آبرو کو داغدار کرنے کی ناپاک کوشش کی ہے، اس کے کرتوت کو خاطر میں نہ لاؤ اور حسبِ دستور اس کی مالی اعانت کرتے رہو۔'' (ضیاء القرآن، جلد سوم، صفحات ۳۰۴، ۳۰۵)

فَضْل سے مراد بزرگی اور السَّعَة سے مراد دولتمندی اور کشادہ دستی ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ آیت جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے حق میں نازل ہوئی کیونکہ آپ مذکورہ ان دونوں نعمتوں سے سرفراز تھے۔

☆ جب نبی علیہ السلام کی ازواج عام عورتوں کی طرح نہیں تو خود نبی علیہ السلام جن کی بدولت آپ کی ازواج کو یہ اعزاز مل رہا ہے عام مردوں کی طرح کیسے ہوگئے!

یہاں ایک مسئلہ کا ذکر کر دینا بھی فائدہ سے خالی نہ ہوگا کہ اگر کوئی شخص کسی بات پر قسم اٹھالے اور اس سے کوئی دوسری چیز بہتر ہو تو وہ اپنی قسم کو توڑ دے۔ اُس کا کفّارہ ادا کر دے اور وہ کام کرے جو زیادہ بہتر اور مفید ہو۔

سیّدہ عائشہ صدّیقہ رضی اللہ عنہا کی فضیلت میں احادیث و آثار

(۱) عَنْ أَبِي سَلَمَةَ اِنَّ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا قَالَتْ :قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَوْمًا : يَا عَائِشَةُ هٰذَا جِبْرِيْلُ يُقْرِءُ كِ السَّلَامَ فَقُلْتُ : وَعَلَيْهِ السَّلَامُ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُه' تَرٰى مَالَا أَرٰى تُرِيْدُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ (صحيح البخاری و مسلم والترمذی)

''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ ایک دن رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اے عائشہ! یہ جبریل ہیں جو تمہیں سلام کہہ رہے ہیں۔ میں نے کہا: اُن پر بھی سلام اور اللہ کی رحمت اور اُس کی برکت ہو۔ آپ اُن چیزوں کو دیکھتے ہیں جنہیں میں نہیں دیکھ سکتی۔''

(۲) عَنْ عُرْوَةَ بْنِ الزُّبَيْرِ قَالَ : كَانَتْ عَائِشَةُ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا لَا تُمْسِكُ شَيْئًا مِّمَّا جَاءَ هَا مِنْ رِّزْقِ اللّٰهِ تَعَالٰى اِلَّا تَصَدَّقَتْ بِهٖ (صحيح البخاری)

''عروہ ابن الزبیر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ سیّدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس جب بھی اللہ کے رزق میں سے کوئی چیز آتی تو آپ اُسے خیرات کر دیتیں۔''

(۳) عَنْ عَائِشَةَ أَنَّ جِبْرِيْلَ جَاءَ بِصُوْرَتِهَا فِيْ خِرْقَةِ حَرِيْرٍ خَضْرَاءَ اِلَى النَّبِيِّ ﷺ فَقَالَ : اِنَّ هٰذِهٖ زَوْجَتُكَ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ (الترمذی و ابن حبّان)

''سیّدہ عائشہ فرماتی ہیں کہ جبریلِ امین نبی علیہ السلام کے پاس میری تصویر سبز ریشم کے کپڑے میں لائے اور کہا کہ یہ دنیا اور آخرت میں آپ کی رفیقۂ حیات ہیں۔''

(۴) عَنْ أَبِي مُوْسٰى قَالَ : مَا أَشْكَلَ عَلَيْنَا أَصْحَابَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ حَدِيْث'' قَطُّ فَسَأَلْنَا عَائِشَةَ اِلَّا وَجَدْنَا عِنْدَهَا مِنْهُ عِلْمًا (السنن الترمذی رقم: ۳۸۸۳ و المستدرک ج ۴)

''حضرت ابو موسیٰ اشعری فرماتے ہیں کہ ہمیں کبھی بھی کوئی مسئلہ مشکل پیش نہیں آیا مگر ہمیں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ان کا علمی حل مل جاتا تھا۔''

(۵) عَنْ مُوْسَى بْنِ طَلْحَةَ قَالَ: مَا رَأَيْتُ اَحَدًا اَفْصَحَ مِنْ عَائِشَةَ (رواه الترمذی والحاکم)

''حضرت موسیٰ بن طلحہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے زیادہ فصیح اللسان کسی کو نہیں پایا۔''

(۶) عَنْ أَبِي عُثْمَانَ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ بَعَثَ عَمْرَوبْنَ الْعَاصِ عَلٰى جَيْشِ ذَاتِ السَّلَاسِلِ قَالَ

فَأَتَيْتُه' فَقُلْتُ: اَیُّ النَّاس أَحَبُّ اِلَيْكَ؟ قَالَ: عَائِشَة قُلْتُ: مِنَ الرِّجَال؟ قَالَ: أَبُوْهَا قُلْتُ: ثُمَّ مَنْ؟ قَالَ: عُمَرُ فَعَدَّ رِجَالاً فَسَكَتُّ مَخَافَةَ أَنْ يَّجْعَلَنِيْ فِي آخِرِهِمْ (مُتَّفق' عَلَيْه)

''ابوعثمان رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ذات السلاسل کی جنگ میں عمرو بن العاص کو کمانڈر بنا کر بھیجا۔ وہ کہتے ہیں کہ میں آپ ﷺ کے پاس آیا اور پوچھا: آپ کو سب سے زیادہ محبوب کون ہے؟ آپ نے فرمایا: عائشہ۔ پوچھا: مردوں میں سے؟ آپ نے فرمایا: ان کے باپ۔ میں نے پوچھا: ان کے بعد کون؟ آپ نے فرمایا: عمر۔ آپ نے کچھ اور نام بھی گنوائے۔ میں خاموش ہو گیا اس ڈر کے مارے کہ کہیں آپ مجھے اُن کے آخر میں جگہ نہ دے دیں۔''

(۷) عَنِ الْقَاسِمِ بْنِ مُحَمَّدٍ قَالَ: قَالَ مُعَاوِيَةُ: مَا رَأَيْتُ خَطِيْبًا قَطُّ أَبْلَغَ وَلَاأَفْطَنَ مِنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا (رواه الطبرانی)

''قاسم بن محمد بیان کرتے ہیں کہ حضرت معاویہ نے فرمایا: میں نے سیّدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے زیادہ بلیغ اللسان اور زیادہ ذہین کسی خطیب کو کبھی بھی نہیں پایا۔''

(۸) عَنْ عُرْوَةَ أَنَّ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا كَانَتْ تَسْرُدُ الصَّوْمَ وَعَنِ الْقَاسِمِ أَنَّ عَائِشَةَ كَانَتْ تَصُوْمُ الدَّهْرَ اِلَّا يَوْمَ الاَضْحٰى أَوْ يَوْمَ فِطْرٍ

وَفِیْ رِوَايَةٍ عَنْهُ قَالَ: كُنْتُ اِذَاغَدَوْتُ أَبَدًا بِبَيْتِ عَائِشَةَ أُسَلِّمُ عَلَيْهَا فَغَدَوْتُ يَوْمًافَإِذَا هِيَ قَائِمَة'' تُسَبِّحُ وَتَقْرَأُ: ''فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَوَقَانَا عَذَابَ السَّمُوْمِ'' وَتَدْعُوْوَتَبْكِيْ وَتُرَدِّدُهَا فَقُمْتُ حَتّٰى مَلَلْتُ الْقِيَامَ فَذَهَبْتُ اِلَى السُّوْقِ لِحَاجَتِيْ ثُمَّ رَجَعْتُ فَإِذَا هِيَ قَائِمَة'' كَمَا هِيَ تُصَلِّيْ وَتَبْكِيْ (رواه عبدالرزاق والبیهقی وابنُ الجوزی فی صفوة الصفوة)

''عروۃ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ سیّدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا مسلسل روزے رکھنے کی عادی تھیں حضرت قاسم بیان کرتے ہیں کہ وہ سوائے عید الاضحیٰ اور عید الفطر کے سال بھر روزہ رکھتی تھیں۔
اور عروۃ یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ صبح کے وقت اپنے گھر سے نکلتے ہوئے میں سب سے پہلے سیدہ عائشہ کے گھر اُنہیں سلام کرنے کے لئے جاتا تھا۔ ایک دن جب میں اُن کے ہاں گیا تو میں نے اُنہیں قیام کی حالت میں اللہ کی تسبیح بیان کرتے ہوئے اور سورۃ الطّور کی آیت ۲۷ ''سو اللہ نے ہم پر بڑا احسان کیا اور ہمیں عذابِ دوزخ سے بچالیا'' تلاوت کرتے ہوئے پایا۔ وہ مسلسل دعا کرتی رہیں اس حال میں کہ اُن کی آنکھوں سے آنسو تھمتے نہ تھے اور وہ بار بار اُس آیت کی تلاوت کر رہی تھیں۔ میں اُن کی دعا و مناجات سے فارغ ہونے کے انتظار میں کھڑا رہا حتی کہ میں کھڑے کھڑے بیزار ہو گیا اور اپنی ضرورت کی تکمیل کے لئے بازار کو چلا گیا۔ پھر جب میں وہاں سے واپس ہوا تو اُس وقت بھی آپ اُسی طرح نماز کی حالت میں تھیں اور گریہ وزاری کر رہی تھیں۔''

(۸۳) اجتہاد (Ijtehad)

''اجتہاد'' کا مصدر ج ۔ ہ ۔ د (جہد) ہے جس کا لفظی معنی ''کوشش'' کا ہے یعنی کسی کام کی تکمیل کے لئے زیادہ سے زیادہ کوشش کرنے کا نام ''جہد'' ہے۔ اصطلاح میں اس کا معنیٰ وہ کوشش ہے جو ایک ''مجتہد'' تاویل کے ذریعے احکامِ الٰہی کو معلوم کرنے میں کرتا ہے۔

''اجتہاد'' اور ''جہاد'' دونوں ہی مصدر ''ج ۔ ہ ۔ د'' سے ماخوذ ہیں اور دونوں کا مقصد ایک ہی ہے یعنی تمام مخلوق کو دنیاوی بندھنوں سے آزاد کر کے ایک ہی خالق کا بندہ بنانے' سماج کی تمام بے انصافیوں اور توہمات سے نکال کر اسلام کے قائم کردہ عدل و انصاف کی طرف لانے اور محدود سوچ اور اس مادّی دنیا کی بندشوں سے آزاد کر کے اسلام اور قرآنِ حکیم کے وسیع تر خطِ اُفق کی طرف لانے کی کوشش کا نام ''اجتہاد'' اور ''جہاد'' ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ''اجتہاد'' کو اُسی طرح اسلام کے ستونوں میں شمار کیا جاتا ہے جس طرح ''جہاد'' کو۔ ''جہاد'' کے بغیر اُمّت کا وجود نہیں اور ''اجتہاد'' کے بغیر اُمّت کی گرم خیزی اور جان داری (Vitality) نہیں ہے۔ اس طرح ''اجتہاد'' اور ''جہاد'' دونوں اسلامی ضابطہ میں ناگزیر اور مسلسل ذمہ داریوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔'' (The American Journal of Islamic Social Sciences, Vol. X, Summer 1993 : Islamabad)

''اجتہاد کا قانونی پہلو: پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری لکھتے ہیں:

''قرآن و سنت اور اجماعِ اُمّت سے حاصل شدہ بنیادی اصولوں کی انتہائی مطابقت میں قانون سازی' تفسیر و توضیح' ضمنی و اشارتی مفہوم' طول دینے' نئے سرے سے قوانین اور شریعتِ اسلامی کے تفصیلی احکامات کی قدر کا تعین کرنے کا نام ''اجتہاد'' ہے۔'' ("Islam in Various Perspectives", p. 311)

اجتہاد کی اہمیت و افادیت: دنیا میں حالات بدلتے رہتے ہیں۔ ہر قوم کا مزاج مختلف ہوتا ہے۔ نئی نئی ضرورتیں اور جدید تقاضے بھی پیش آتے رہتے ہیں۔ ہر ہر واقعہ اور پیش آنے والی حاجتوں اور ضرورتوں کی صراحت کر کے قانونی دفعات کا مرتب کرنا نہ تو ممکن ہے اور نہ ہی مصلحت کے مطابق ہو سکتا ہے۔ اسی وجہ سے کتاب اللہ اور سنتِ رسول ﷺ کے ذریعے امت کو ایسے جامع اصول اور ضوابط مل گئے جن کے ذریعے ہر جدید ضرورت کا حکم اور ہر قوم کی حاجت اور ہر خطہ میں پیش آنے والے مسائل کا حل ہو سکتا ہے۔ بالفرض اگر یہ ہوتا کہ حالات کی تبدیلی اور پیش آنے والے تقاضوں پر ہر قوم یا جماعت اپنی رائے اور غور و فکر کے ذریعے احکام اور قوانین مرتب کرنے لگتی تو دینِ اسلام کی نہ جامعیت باقی رہتی اور نہ اللہ رب العزت کی اس اعلان کی کوئی حقیقت باقی رہتی:

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا (المائدۃ:۳)

''آج میں نے تمہارے لئے تمہارے دین کو کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت کا اِتمام کر دیا☆ اور تمہارے لئے اسلام کو دین کے طور پر پسند کر لیا۔'' (۵ : ۳)

بلکہ دینِ اسلام مدّعیانِ عقل وفکر اور اغراض وخواہشات کی ایک جولان گاہ بن جاتا۔ اس وجہ سے یہ تو ممکن ہی نہ تھا کہ ہر دَور میں پیش آنے والے مسائل اور جدید تقاضوں کے لئے جدید سے جدید شریعتیں مرتب کی جاتی رہیں۔ پس طے یہ ہوا کہ شریعت وہی رہے گی جو سرورِ کائنات محمدؐ رسول اللہ ﷺ لائے ہیں' قرآن وہی رہے گا اور سنتِ رسول اُسوۂ رسول کی شکل میں وہی رہے گی۔ اسی سے اور اسی کے اصول سے ہر پیش آنے والے مسئلہ کا حل اور ہر قوم اور خطہ کے دینی تقاضوں کو پورا کیا جائے گا۔ فقہائے اسلام کی اصطلاح میں اسی کا نام ''اجتہاد'' ہے کہ نئے نئے پیش آنے والے مسائل کا حل کتاب وسنت کے قائم کردہ اصولوں سے نکالا جائے۔

اجتہاد کی اہمیت وضرورت اس واقعہ میں بھی ملتی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے جب معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن کا گورنر اور قاضی بن کر بھیجا تو اُن سے پوچھا کہ تم فیصلے کس طرح کرو گے؟ تو اُنہوں نے جواب دیا: کتاب اللہ سے۔ آپ نے پوچھا کہ اگر کتاب اللہ میں نہ پاؤ تو پھر کیا کرو گے؟ عرض کیا: پھر اللہ کے رسول ﷺ کی سنت سے فیصلے کروں گا۔ فرمایا: اگر تمہیں وہ چیز حدیث میں بھی نہ ملے تو پھر کیا کرو گے؟ عرض کیا: میں قرآن وسنت کی روشنی میں اپنی رائے اور اجتہاد سے استنباط کروں گا اور اس میں کوئی دقیقہ باقی نہ چھوڑوں گا یعنی محنت وکوشش سے اس واقعہ کا فیصلہ کتاب وسنت کے اصول وقوانین کے ماتحت کروں گا۔ آنحضرت ﷺ اس جواب پر بہت خوش ہوئے اور فرطِ مسرّت سے جنابِ معاذ کے سینے پر ہاتھ رکھ کر فرمایا: ''اللہ کا شکر ہے کہ اُس نے اپنے رسول ﷺ کے قاصد کو ایسی بات کی توفیق دی جسے اللہ اور اُس کا رسول پسند کرتا ہے۔''

''اجتہاد'' شریعت کا ایک اصطلاحی لفظ ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ عقلِ سلیم اور فہمِ صحیح کے ذریعے احکام شرعیہ اُن دلائل و اصول سے معلوم کئے جائیں جو قرآن و حدیث میں مقرر کر دئے گئے ہیں۔ تو گویا کتاب اللہ اور سنتِ رسول کی نصوص کی گہرائیوں میں سے احکام شرعیہ نکال لانے کا نام اجتہاد واستنباط ہوا جیسے زمین کھود کر اُس کی تہوں میں سے پانی نکال لیا جائے۔ قرآنِ حکیم اور ارشاداتِ رسول ﷺ کی تہوں میں علوم و معارف کے ذخیرے چھپے ہوئے ہیں۔ آلاتِ فکریہ سے ان علوم و معارف کو نکالنا اجتہاد کا عمل ہوتا ہے۔ اسی حقیقت کو حق تعالیٰ جلّ شانہ' نے سورۃ النّساء کی اس آیت ۵۹ میں بیان فرمایا ہے:

☆ ''دین'' عقائد اور اصول وقواعد کو اور ''مذہب'' فروعی مسائل کو کہا جاتا ہے۔ حنفی' شافعی' مالکی' حنبلی مختلف مذہب ہیں' مختلف دین نہیں۔ اسلام' یہودیت اور عیسائیت مختلف دِین ہیں۔ دین کی نسبت اللہ کی طرف بھی' نبی کی طرف بھی اور بندوں کی طرف بھی کی جاتی ہے۔ اِکمال اور اِتمام دونوں کا لغوی لحاظ سے معنی ایک ہی ہے یعنی مکمل اور پورا کرنا۔ لیکن اِکمال اس طرح پورا کرنا ہوتا ہے کہ اس میں نہ زیادتی ہوسکتی ہے اور نہ کمی اور اِتمام اس طرح پورا کرنا کہ اس میں زیادتی تو ہوسکے مگر کمی نہ ہوسکے (تفسیراتِ احمدیہ' بحوالہ تفسیر نعیمی' جزء ششم' صفحہ ۱۸۷)۔

يَأَيُّهَاالَّذِينَ آمَنُوْا أَطِيْعُوا اللهَ وَأَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَأُولِى الْأَمْرِ مِنكُمْ فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ إِلَى اللهِ وَالرَّسُوْلِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ذٰلِكَ خَيْرٌ " وَّأَحْسَنُ تَأْوِيْلاً O
''مومنو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور اپنے میں سے اہلِ اختیار کی اطاعت کرو، پھر اگر کسی چیز میں تم میں باہم اختلاف ہو جائے تو اُسے اللہ اور اُس کے رسول کی طرف لوٹا دیا کرو اگر تم اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتے ہو۔ یہی بہتر ہے اور انجام کے لحاظ سے بھی خوش تر ہے۔'' (۵۹ : ۴)

''امام رازی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ اس آیت میں شریعت کے ادلّہ اربعہ کی طرف اشارہ ہے یعنی کتاب وسنت، اجماعِ امت اور قیاس۔ أَطِيْعُوا اللهَ میں کتاب اللہ کا ذکر ہے۔ أَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ میں سنتِ رسول کی طرف اشارہ ہے اور أُولُو الْأَمْرِ سے اجماعِ امت مراد ہے۔ فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ میں قیاس کا ذکر ہے یعنی جس چیز کا حکم کتاب وسنت میں نہ ہو اور نہ اجماعِ امت سے اس کا حکم ثابت ہو تو اس صورت میں اس غیر منصوص حکم کو معلوم کرنے کے لئے کتاب وسنت کی طرف رجوع کرنا چاہئے۔ ''رجوع'' کا مطلب یہ ہے کہ کتاب وسنت میں اس کے نظائر تلاش کئے جائیں اور اس کی علت میں غور وفکر کیا جائے۔ جب اس درپیش مسئلہ کی نظیر کتاب وسنت میں مل جائے اور علت میں شرکت اور مماثلت بھی پائی جاتی ہو تو اس غیر منصوص میں وہی حکم جاری کر دیا جائے جو منصوص میں ہے۔''

''فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ میں تنازع سے مراد باہمی خصوصیت واختلاف نہیں کیونکہ اگر ایسی چیز ہو تو اس کے لئے سہل علاج یہ تھا کہ یہ فرما دیا جاتا کہ اس نزاع کو ترک کر دو۔ بلکہ یہاں تنازع سے مراد اصولِ شریعت اور دلائل کا باہمی اختلاف ہے۔ یعنی درپیش مسئلہ میں ایک دلیل اپنی طرف مسئلہ کو کھینچ رہی ہے اور اس پر مرتب ہونے والا حکم کوئی اور ہے اور دوسری دلیل مسئلہ کو اپنی طرف کھینچتی ہے جس پر حکم اس کے برعکس مرتب ہوتا ہے تو اس طرح دلائل کا اختلاف ہی تنازع ہے جسے آیت میں بیان فرمایا گیا ہے تو ایسی صورت میں مسئلہ کو کتاب اللہ اور سنتِ رسول ﷺ کی طرف لوٹایا جائے گا کہ جو دلائل کتاب وسنت سے زیادہ قریب ہیں، اُنہی کو مجتہد اختیار کرتے ہوئے فیصلہ کرے گا۔''

''یہ بات ظاہر ہے کہ عقل ایک بینا آنکھ کی طرح ہے اور ہر بینا آنکھ اپنے نورِ بصیرت اور قوتِ بینائی کے ساتھ باہر کے نور کی بھی محتاج ہے۔ اگر باہر کا نور نہ ہو تو بینا آنکھ کچھ نہیں کر سکتی۔ بالکل اسی طرح یہ حقیقت ہے کہ انسانی عقل اجتہاد واستنباط کے میدان میں کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ کے دلائل اور اصول کی راہنمائی کے بغیر کچھ نہیں کر سکتی۔'' (ماہنامہ ''مؤمن'' لاہور، جون ۲۰۰۳ء، صفحات ۱۹، ۲۱)

''<u>اجتہاد سنتِ رسول ہے</u>: فقہ کے چاروں اماموں (حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی) کا اُن نئے پیش آنے والے مسائل کو جن کا ذکر قرآن وحدیث میں نہیں، اجتہاد کے ذریعے حل کرنے پر اتفاق ہے۔ اجتہاد کی بنیادیں وہ ہدایات ہیں جو نبی کریم ﷺ نے حضرات عبداللہ بن مسعود اور معاذ بن جبل رضی اللہ عنہما کو دی تھیں۔ علاوہ ازیں نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام، صحابہ کرام اور ائمہ فقہاء کی مثالیں اجتہاد کی ضرورت کا واضح اور روشن ثبوت ہیں جو ایک باضابطہ

تنظیم کا نام ہے نہ کہ کسی ظریفانہ جذبے کا اظہار۔

"مجتہد کی شرائط: معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی قانون کی تاریخ میں مجتہد کی شرائط اور اس کی اہلیت کا سوال بعد کے زمانے کی پیداوار ہے۔ہجرت کی ابتدائی دو صدیوں میں یہ شرائط مقرر نہیں کی گئی تھیں۔ شافعی مکتبِ فکر کے بانی محمد بن ادریس الشافعی رحمۃ اللہ علیہ کے زمانہ کے بعد ان شرائط کو بہت اہمیت دی گئی۔اس سے پہلے قانونِ اسلامی کے میدان میں مجتہد کی کارکردگی کو لوگوں کا اعتماد حاصل تھا۔تاہم مجتہد میں کچھ شرائط کا ہونا لازم ہے جو حسبِ ذیل ہیں:۔

(۱) عربی زبان سے واقفیت: فقہائے اسلام نے شرائطِ اجتہاد میں سب سے اوّل شرط یہ بیان کی ہے کہ صاحبِ اجتہاد علومِ عربیہ یعنی لغت، صرف ونحو اور فنِ بلاغت کا ماہر ہو کیونکہ قرآن وحدیث عربی ہے اور جب تک آدمی عربی زبان سے واقف نہ ہو، اسلوبِ زبان اور اصولِ صرف ونحو کا ماہر نہ ہو، وہ اصل کلام کی مراد ہی سمجھنے سے قاصر رہے گا چہ جائیکہ وہ اجتہاد واستنباط کے مراحل طے کرنے لگے۔فنِ طب اور ڈاکٹری میں وہی شخص دخل دے سکتا ہے جو طب کے اصولوں اور اس کے تمام متعلقات کی پوری بصیرت رکھتا ہو۔یہ بات ناقابلِ تصوّر ہے کہ اس فن کو باقاعدہ حاصل کئے بغیر کوئی شخص کسی ترجمہ میں چند دواؤں کا ذکر اور اُن کے خواص دیکھ کر مریضوں کا علاج اور اُن کے طبی مسائل کا حل اور فیصلے کرنے لگے۔ظاہر ہے کہ ان تمام علوم میں مہارت کے بغیر کلامِ عربی کی دلالت نہیں سمجھی جاسکتی۔

(۲) دوسری شرط یہ ہے کہ کتاب اللہ، سنت رسول اللہ ﷺ اور اقوالِ صحابہ وتابعین پر وہ پوری طرح مطلع ہو حتی کہ آیاتِ قرآنیہ کی قراتِ متواترہ اور روایات واحادیث کی سندوں کی صحت وضعف کو بھی جانتا ہو کیونکہ احکام استنباط آیات کلام اللہ کی قراءتِ متواترہ اور احادیثِ صحیحہ سے ہی ہوا کرتا ہے تو وہ شخص جو حدیث کی قوت وضعف اور صحت وعدمِ صحت کا علم نہ رکھتا ہو وہ کیونکر احکام کا استنباط کرسکے گا۔اسی کے ساتھ اُسے راویانِ حدیث کے ثقہ ہونے کا علم ہو اس لئے کہ احادیث کی سندوں کا دارومدار راویانِ حدیث کے ثقہ اور غیر ثقہ ہونے پر ہے۔ پھر صحابہ اور تابعین کے اقوال پر عبور ہو۔وہ اس لئے کہ یہی حضرات کتاب وسنت کے سب سے پہلے مخاطب ہیں تو اُن کا فہم اور اُن کا بیانِ تشریح اور اُن کا تعامل احکام شریعت میں بنیاد کا درجہ رکھتا ہے۔ان کی تشریحات وتحقیقات سے کتاب کی مراد واضح ہوسکے گی۔اُن کے تعامل ہی کو منہاج یعنی طریقۂ عمل اور شارع کی غرض سمجھا جائے گا۔اس وجہ سے درپیش مسائل کا حل اور ان کا شرعی فیصلہ ان چیزوں میں مہارت کے بغیر ممکن نہیں ہوسکتا۔

(۳) تیسری شرط فہم وفراست اور علوم قرآن وحدیث میں ذہانت وذکاوت کا حاصل ہونا ہے۔کیونکہ بسا اوقات انسان باوجود اہلِ زبان ہونے کے بھی کلام کے اسرار ونکات اور اغراض ومقاصد پر قرآنی فہم اور علومِ الٰہیہ میں بصیرت کے بغیر مطلع نہیں ہوسکتا۔ہم دن رات اس بات کا مشاہدہ کرتے ہیں کہ ہمارے کلام کی اصل مراد ہمارے وہ بہت سے مخاطب نہیں سمجھ سکتے جو ذکاوت اور تدبر کا وصف نہ رکھتے ہوں تو ظاہر ہے کہ اس وصف کے بغیر اصول اور سنتِ رسول ﷺ کے دلائل سے کوئی شخص مسائل کا حل اور فیصلے کیسے کرسکتا ہے۔

(۴) چوتھی شرط یہ ہے کہ وہ شخص صاحبِ تقویٰ ہو اور اس کا نفس کے تقاضوں اور اغراض و خواہشات سے متاثر ہونے کا احتمال نہ ہو۔ کیونکہ تقویٰ اور قلب کی طہارت کے بغیر وہ مسائل کے حل میں اپنی فکری صلاحیتوں کو صحیح رُخ کی طرف متوجہ نہیں کر سکے گا۔ اسی طرح صاحبِ غرض اور خواہشاتِ نفس میں پڑنے والا انسان ہر بات میں اپنی اغراض و خواہشات اور اپنے خیالات ہی کی تکمیل کا ارادہ کرے گا۔ اِس عیب کے باعث تو انسان اصل شریعت ہی کو مسخ کر ڈالے گا جس کی مثال بنی اسرائیل کی وہ تمام ملحدانہ اور تحریفِ دین کی حرکتیں ہیں جنہیں قرآن کریم نے بڑی وضاحت اور تفصیل کے ساتھ بیان فرما دیا۔ مسائل کا حل وہی شخص ہی صحیح کر سکے گا جو ایمان و تقویٰ سے متصف ذاتی اغراض اور نفس کی خواہشات سے پاک ہو ورنہ تو وہ اصل احکام کو اپنی خواہشات کے لئے آلہ کار بنانے لگے گا۔

(۵) پانچویں شرط یہ ہے کہ مجتہد اجتہاد و استنباط کے طریقوں اور ان کی اقسام و شرائط' استنباط اور اس کی صحت و فساد سے بھی واقف ہو۔ چونکہ اجتہاد و استنباط احکام کتاب و سنت سے ہوتا ہے اس لئے ضروری ہے کہ وہ قرآن و حدیث کے عبارتی انواع و اقسام کا ماہر ہو اور سمجھ سکتا ہو کہ اس میں کون سی آیت نص ہے' کون سی ظاہر ہے' کون سی مجمل' کون سی مفسر' کون سی محکم اور کون سی متشابہ ہے۔ ان سب تعبیرات کے انداز اور طرز کو وہ جانتا ہو۔ اس لئے ضروری ہے کہ درپیش مسائل کے حل کے لئے ان تمام امور کو وہ ملحوظ رکھے۔ اس کے بغیر کوئی فقیہ یقیناً صحیح شرعی فیصلہ نہیں کر سکتا۔

(۶) چھٹی شرط یہ ہے کہ مجتہد کو مقاصدِ شریعت کا علم ہو اگرچہ اس شرط کا اضافہ بعد کے فقہاء نے کیا ہے۔ چونکہ مقاصدِ شریعت بنیادی اقدار کی حامل ہیں' اس لئے انہیں سمجھنے اور اُنہیں عمل میں لانے کے لئے عربی زبان کا علم ہونا لازمی نہیں ہے۔

(۷) ''<u>اجتہاد کی صلاحیت</u>: کچھ فقہاء کے نزدیک مجتہد میں قانون اور اجتہاد کی فطری صلاحیت کا ہونا ضروری ہے۔ یہ صفت اکتسابی نہیں بلکہ خداداد ہوتی ہے۔ جس طرح عربی زبان کا اچھا خاصا علم ہونا کسی کو شاعر نہیں بنا دیتا' اسی طرح مندرجہ بالا شرائط کی تکمیل سے کوئی شخص مجتہد نہیں بن جاتا۔''
("Islamic Jurisprudence"...
Imran Ahsan Khan Nyazee, pp. 271, 272)

<u>اجتہاد کا پہلا طریقِ عمل متن کی تاویل ہے (''بیان'' کا تصوّر یعنی وضوح)</u>: یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ سنتِ رسول اللہ ﷺ قرآنِ حکیم کا تبصرہ ہے اور بہت سی صورتوں میں متن کے معانی کی وضاحت کرتی ہے اگرچہ کچھ مواقع پر قرآنِ حکیم خود بھی ان کی وضاحت کرتا ہے۔ ان کے معانی کی وضاحت کا یہ مطلب ہے کہ بہت سی ایسی اصطلاحات کو جو اپنے لفظی مفہوم میں لی جاتی ہیں' اصطلاحی قانونی معانی مل جاتے ہیں۔ پھر یہ اصطلاحات قانون میں اپنے تکنیکی معانی میں استعمال ہوتی ہیں اور متن کی تاویل کرنے میں اُنہیں استعمال کیا جاتا ہے۔ صلوٰۃ' زکوٰۃ اور ربٰو ایسی اصطلاحات کی مثالیں ہیں۔ متون میں اصطلاحات کی توضیح خود متن کے ذریعے ہونا ''بیان'' کہلاتا ہے۔ یہ خیال رہے کہ ''بیان'' تکنیکی اصطلاحات کی وضاحت تک ہی محدود نہیں ہوتا' یہ کئی طریقوں سے اصولِ قانون کو بھی ظاہر کرتا ہے۔ ہم ''بیان'' کی مختلف اقسام کا یہاں ذکر کرتے ہیں:

(۱) ''بیانِ تقریر : بیان کی اس قسم میں اُن معانی کی وضاحت ہوتی ہے جو عبارت میں پہلے ہی سے موجود ہوتے ہیں۔ متن میں موجود ممکنہ معانی سے متعلق جتنے بھی شکوک وشبہات پیدا ہو سکتے ہیں' بیان کی اس قسم سے وہ سب دُور ہو جاتے ہیں۔ متن میں یہ ممکنہ معانی یا تو مجاز کے استعمال سے یا کسی عمومی لفظ کے استعمال سے پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً سورۃ الحجر کی آیت ۳۰ : فَسَجَدَ الْمَلَائِكَةُ كُلُّهُمْ أَجْمَعُوْنَ (پس سارے کے سارے فرشتوں نے اکٹھے سجدہ کیا) میں اَلْمَلَائِکَۃ (فرشتے) کے عمومی لفظ کا معنیٰ ''کچھ فرشتے'' بھی ہوسکتا تھا یعنی یہ لفظ کچھ فرشتوں تک کی حد بندی کرسکتا تھا لیکن كُلُّهُمْ أَجْمَعُوْنَ (اُن سب نے اکٹھے) کے الفاظ نے ''کچھ'' کے شک کو دُور کر دیا۔ اسی طرح سورۃ الانعام کی آیت ۳۸ : وَلَا طَائِرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ (اور نہ ہی وہ پرند جو اپنے دونوں بازوؤں سے اُڑنے والا ہے) میں لفظ طَائِر (پرندہ) مجازاً اُن پرندوں کے لئے بھی استعمال ہوسکتا ہے جن میں اُڑان نہیں ہے (جیسے مرغی وغیرہ) لیکن جَنَاحَيْهِ (اس کے پَر) کے لفظ نے مجازی معنیٰ لینے کے امکان کو ختم کر دیا۔''

''بیانِ تقریر'' معقول اور جائز (Valid) تب ہوتی ہے جب وہ متن کے ساتھ بھی ہو اور تب بھی جب اُسے متن سے علیحدہ کر دیا جائے جیسے مذکورہ بالا دونوں مثالوں سے ظاہر ہے۔''

(۲) ''بیانِ تفسیر : یہ ایک ایسی وضاحت ہے جو متن میں موجود تفصیلات کو بیان کرتی ہے اور متن میں موجود حکم پر عمل کرنے کے قابل بناتی ہے۔ اس وضاحت سے قبل متن میں موجود حکم پر عمل کرنا عدمِ تفصیل کے باعث ممکن نہیں ہوتا۔ یہ وضاحت اُن الفاظ کے لئے ہوتی ہے جو مجمل یعنی غیر وضاحتی یا مشترک یعنی ذومعنیٰ ہوتے ہیں۔ اگر ان الفاظ کی وضاحت ''بیان'' کے ذریعے ہو جائے تو وہ ''بیانِ مفسّر'' کہلاتے ہیں۔ مثلاً آیت أَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَآتُوا الزَّكٰوةَ (نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو) پر عمل کرنا مشکل ہے کیونکہ الصَّلٰوۃ (نماز) اور الزَّکٰوۃَ دونوں الفاظ میں نماز اور زکوٰۃ کا اصطلاحی معنی مفقود ہے کہ الصَّلٰوۃ کا لغوی معنیٰ آگ تاپنا اور الزَّکٰوۃَ کا لغوی معنیٰ پاک کرنا ہے۔ تو اَلصَّلٰوۃ کے اصطلاحی مفہوم کی وضاحت اس فرمودۂ رسول ﷺ سے ہوئی جس میں آپ نے فرمایا : صَلُّوْا كَمَا رَأَيْتُمُوْنِيْ أُصَلِّيْ (اس طرح صلوٰۃ یعنی نماز پڑھو جس طرح تم مجھے پڑھتے ہوئے دیکھتے ہو)۔ اسی طرح زکوٰۃ کی ادائیگی کی مختلف شرحوں کی وضاحت سنتِ رسول ﷺ میں ملتی ہے۔''

(۳) ''بیانِ تغییر : ''تغییر'' کا معنیٰ تبدیلی ہے۔ بیان کی یہ قسم استثناء (Exception) تک محدود ہوتی ہے۔ سورۃ العنکبوت کی آیت ۱۴: فَلَبِثَ فِيْهِمْ أَلْفَ سَنَةٍ إِلَّا خَمْسِيْنَ عَامًا (تو نوح علیہ السلام اُن میں ایک ہزار برس مگر پچاس برس کم رہے) میں لفظ أَلْف ہزار کے معنیٰ میں ہے اور اگر استثناء نہ ہوتا تو اس کا معنیٰ ''ہزار'' ہی لیا جاتا۔ یہاں لفظِ استثناء إِلَّا (مگر) لاکر اصل عدد ہزار کو بدل کر اسے ۹۵۰ کر دیا گیا۔ بہ الفاظِ دیگر اگر استثناء کو نہ لایا جاتا تو متن سے ایک ہزار کے معنیٰ ہی سمجھ میں آتے لیکن استثناء نے اس (ہزار) میں تبدیلی پیدا کر دی۔''

(۴) ''بیانِ تبدیل (مشروطی اظہار) : امام سرخسی کے نزدیک بیانِ تبدیل میں کسی شرط کی تکمیل کے

ساتھ ایک حکم کا لانا ہوتا ہے، جیسے سورۃ الطلاق کی یہ آیت ششم: فَاِنۡ اَرۡضَعۡنَ لَکُمۡ فَاٰتُوۡهُنَّ اُجُوۡرَهُنَّ (تو اگر وہ عورتیں تمہارے لئے دودھ پلائیں تو اُنہیں اُن کی اجرت دو) کا مطلب یہ ہے کہ معاہدہ ہونے کے بعد اجرت کی ادائیگی اُس وقت تک نہیں ہوگی جب تک بچے کی رضاعت نہ ہو تو گویا اس شرط کی تکمیل کے بغیر حکم کا وجود نہیں پایا جائے گا۔ رضاعت کے معاہدہ کی تکمیل اجرت کی ادائیگی کی متقاضی ہے لیکن ایسے تقاضا میں شرط کی قرارداد ایک تبدیلی ہے۔

''بیانِ تبدیل'' اور ''بیانِ تغییر'' میں یہ فرق ہے کہ اگر ''بیانِ تغییر'' میں استثناء کو نہ لایا جائے تو بھی معانی مکمل ہو جاتے ہیں لیکن ''بیانِ تبدیل'' میں شرط کے بغیر معانی مکمل نہیں ہوتے۔

(۵) ''بیانِ ضرورۃ'': یہ وضاحت کی ایسی قسم ہے جو متن کو ایسے معنیٰ دیتی ہے جو اصل متن میں موجود نہیں ہوتے مثلاً سورۃ النساء کی آیت: فَاِنۡ لَّمۡ یَکُنۡ لَّهٗ وَلَدٌ وَّوَرِثَهٗۤ اَبَوٰهُ فَلِاُمِّهِ الثُّلُثُ (اگر مورث کے کوئی اولاد نہ ہو اور اُس کے والدین ہی اس کے وارث ہوں تو اُس کی ماں کا ایک تہائی ہے) میں ظاہر ہے کہ ترکہ کا ایک تہائی ماں کو ملے گا۔ ''بیانِ ضرورۃ'' کے ذریعے یہ واضح ہو گیا کہ ترکہ کا بقایا حصہ باپ کو ملے گا۔'' ("Islamic Jurisprudence"... Imran Ahsan Khan Nyazee, pp. 275, 277-279)

احکام کے استحکام کے چار مختلف ابتدائی طریقے: مجتہد کا ابتدائی کام متن سے احکام کا معلوم کرنا ہوتا ہے جو متن کے مطالعہ ہی سے ہو سکتا ہے۔ متن پر انحصار کرتے ہوئے مجتہد کئی ایسے طریقے اختیار کرتا ہے جن کے ذریعے احکام کا استحکام ثابت ہوتا ہے۔ امام سرخسی کے مطابق مندرجہ ذیل چار وسیع طریقوں کا نام ''دلالت'' ہے جن کے ذریعے متن کی تعبیر و مفہوم معلوم کی جاتی ہے:۔

(1) عبارۃ النص: یہ اصل معانی کو جو متن کا مقصدِ حقیقی ہے، متن کے مطالعہ کے بعد معلوم کرنا ہے۔ عبارۃ النص کے ذریعے اصل حکم کسی گہری سوچ کے بغیر معلوم ہو جاتا ہے جو متن میں بذاتِ خود موجود ہوتا ہے۔ بیشتر قانونی متون اس اصول کے تابع ہوتے ہیں۔ مندرجہ ذیل امثلہ عبارۃ النص کی ہیں:

(i) لَا تَقۡتُلُوا النَّفۡسَ الَّتِیۡ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالۡحَقِّ (الانعام: ۱۵۱) (جس جان کو اللہ نے محفوظ کر رکھا ہے، اسے قتل مت کرو بجز حقِ شرعی کے)۔ اس آیت کا صاف اور واضح مطلب یہی ہے کہ قتلِ انسان کی ممانعت ہے۔ یہی اس کے اصل معنیٰ ہیں اور اس میں کوئی دوسرے معنیٰ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

(ii) اَقِیۡمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ (نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو) کا صاف اور واضح معنیٰ یہی ہے کہ نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دیتے رہو۔ یہی اس کے اصل معنیٰ ہیں اور اس میں کوئی دوسرے معنیٰ کرنے کی ضرورت نہیں۔

(iii) بعض اوقات متن میں ایک سے زیادہ بھی معنیٰ ہو سکتے ہیں جن میں سے ایک اصل اور دوسرا ثانوی ہوتا ہے مثلاً سورۃ البقرۃ کی یہ آیت ۲۷۵: ذٰلِكَ بِاَنَّهُمۡ قَالُوۡۤا اِنَّمَا الۡبَيۡعُ مِثۡلُ الرِّبٰوا وَاَحَلَّ اللّٰهُ الۡبَيۡعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا (یہ سزا اس لئے ہوگی کہ وہ کہتے ہیں کہ بیع بھی تو سود ہی کی طرح ہے حالانکہ اللہ نے بیع کو حلال اور سود کو حرام کیا ہے)

عبارۃ النص کی رُو سے دو معانی کو شامل ہے۔ ایک معنیٰ تو بیع اور ربٰو میں عدم مشابہت کا ہے جبکہ اس میں دوسرا معنیٰ بیع کے جواز اور ربٰو (سود) کی ممانعت کا ہے۔ پہلا معنیٰ اصل ہے جبکہ دوسرا ثانوی ہے۔

(iv) فَانكِحُوا مَا طَابَ لَكُم مِّنَ النِّسَاءِ مَثْنَىٰ وَثُلَاثَ وَرُبَاعَ فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوا فَوَاحِدَةً (النساء : ۳) (تو جو عورتیں تمہیں پسند ہوں اُن سے نکاح کرلو دو دو سے، خواہ تین تین سے، خواہ چار چار سے لیکن اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ تم عدل نہ کر سکو گے تو پھر ایک ہی پر بس کرو) (۴ : ۳) یہ آیت تین معانی پر مشتمل ہے: (۱) نکاح کی اجازت (۲) چار سے زیادہ شادیاں کرنے کی ممانعت اور (۳) عدمِ انصاف کے اندیشہ کی صورت میں صرف ایک عورت پر اکتفا۔ یہ تینوں معانی عبارۃ النص ہی سے معلوم ہوئے۔ تاہم ان میں پہلا معنیٰ ثانوی ہے جبکہ آخری دو معانی اصل ہیں۔

(2) ''اشارۃ النص : اس طریقے میں حکم کو متن کے کسی اشارے سے معلوم کیا جاتا ہے اس طرح کہ اصل معانی کو جو متن کا مقصودِ اصلی ہے، مدِّ نظر رکھا جاتا ہے۔ اس طرح ایسے معلوم شدہ حکم کا اثبات متن کا حقیقی مقصد نہیں ہوتا بلکہ وہ تھوڑے سے سوچ بچار کے بعد اپنی مکمل شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔''

''امام سرخسی نے واضح کیا ہے کہ سڑک پر چلتا ہوا کوئی شخص دوسرے شخص کو سڑک کے بیچ میں چلتا ہوا سیدھا اُس کی طرف آتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اُسی نظر میں وہ اپنے گوشہ ہائے نظر سے سڑک پر چلتے ہوئے دوسرے لوگوں کو بھی دائیں بائیں چلتا ہوا دیکھتا ہے اگرچہ اس کا مقصد صرف اُس آدمی کو دیکھنا ہے جو سڑک کے بیچ میں چل رہا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص کسی جانور پر تیر چلائے تو ممکن ہے کہ تیر اپنے صحیح نشانے پر لگ کر پاس کھڑے ہوئے کسی دوسرے کو جا لگے۔ پس عبارۃ النص اور اشارۃ النص سے معلوم شدہ احکام ایک ہی متن سے ثابت ہوتے ہیں۔''

(i) سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۳۳: وَعَلَى الْمَوْلُودِ لَهُ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ (اور جس کا بچہ ہے، اُس کے ذمہ اُن ماؤں کا کھانا اور کپڑا دستور کے موافق ہے) میں عبارۃ النص کے ذریعے اس بات کا اشارہ ہے کہ دودھ پلانے والی ماں کا نان و نفقہ اُس کے خاوند کے ذمہ ہے۔ متن میں موجود اشارات میں کئی احکام ثابت ہوتے ہیں جن میں سے یہاں دو کا ذکر کیا جاتا ہے:

(۱) بچہ باپ کا ہوتا ہے کہ اُس سے نسب ہے نہ کہ ماں سے کیونکہ یہاں باپ کو مَولُود لہ، فرمایا گیا۔ لہٰذا جس کا باپ سید ہو اور ماں غیر سید ہو وہ بچہ سید ہے اور جس کی ماں سیدہ اور باپ غیر سید ہو تو بچہ سیّد نہیں ہے۔

(۲) باپ اپنی اولاد کے مال کا مالک ہے کہ اُسے اس کا خرچ کرنا جائز ہے کیونکہ یہاں باپ کو مَولُود لہ، فرمایا گیا۔ جب وہ بچے کا مالک ہوا تو اُس کے مال کا بدرجہ اولیٰ مالک ہوا۔ اس کا ثبوت اس حدیثِ پاک میں بھی ملتا ہے جس میں نبی علیہ السلام نے فرمایا: أَنْتَ وَمَالُكَ لِأَبِيكَ (تو بھی اور تیرا مال بھی تیرے والد کا ہے)۔

(ii) سورۃ النّحل کی آیت ۴۳: فَسْئَلُوا أَهْلَ الذِّكْرِ إِن كُنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ (اگر تم لوگوں کو علم نہیں تو

اہلِ علم سے پوچھ دیکھو) میں عبارۃ النص سے معلوم ہوتا ہے کہ أهل الذكر سے معلوم کرنا لازم ہے کیونکہ آیت کا مقصودِ اصلی یہی ہے۔ لیکن اشارۃ النص سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ أهل الذكر کی جماعت کا موجود ہونا ضروری ہے تاکہ اُن سے معلوم کیا جا سکے۔

(iii) سورہ آلِ عمران کی آیت ۱۵۹ : وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ (اوران سے معاملات میں مشورہ لیتے رہئے) میں عبارۃ النص سے معلوم ہوتا ہے کہ معاملات کے سلسلہ میں اسلام کا اصل اصول مشورہ ہے لیکن اشارۃ النص سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسی مجلس مشاورت کا ہونا ضروری ہے کیونکہ ملک کی تمام آبادی سے مشورہ لینا ناممکن ہے۔

(iv) سورۃ الاحقاف کی آیت ۱۵ : وَحَمْلُهُ وَفِصَالُهُ ثَلَاثُونَ شَهْرًا (اوراُس کا حمل اوراُس کی دودھ چھڑائی تیس مہینوں میں ہو پاتی ہے) اور سورہ لقمان کی آیت ۱۴: وَفِصَالُهُ فِي عَامَيْنِ (اوردوبرس میں اُس کا دودھ چھوٹتا ہے) دونوں آیتوں کو ملا کر پڑھنے سے اشارۃ النص کے ذریعے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کم از کم زمانۂ حمل 24-30 = چھ ماہ ہے۔

مندرجہ بالا مثالوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اشارۃ النص کے ذریعے معلوم شدہ احکام بلا دقت مہیا نہیں ہوتے۔ اُن کے لئے متن میں کچھ غور وخوض کی ضرورت ہوتی ہے جس کے لئے فقہ میں مہارت کا ہونا لازمی امر ہے۔

(3) دلالۃ النص: اس طریقے میں کسی چیز کا حکم متن کے الفاظ کے باہمی ربط کو پڑھ کر معلوم کیا جاتا ہے اور اس میں قیاس کے اصولوں کی ضرورت نہیں ہوا کرتی۔ مثالیں درج ذیل ہیں:

(i) سورۃ الاسراء کی آیت ۲۳ : فَلَا تَقُلْ لَّهُمَا أُفٍّ (اُن والدین سے اُف تک نہ کہنا) میں عبارۃ النص سے معلوم ہوتا ہے کہ والدین سے ''اُف'' کہنے کی ممانعت ہے جس کی وجہ اُنہیں اذیت دینے سے بچنا ہے۔ متن کی عبارت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اُنہیں گالی دینے اور زدوکوب کرنے وغیرہ جیسی پُر آزار اذیتیں دینے کی بھی ممانعت ہے۔ دراصل گالی دینے اور زدوکوب کرنے کی بھی تو بہ طریقِ اولیٰ ممانعت ہے کیونکہ وہ ''اُف'' کہنے کی نسبت زیادہ اذیت ناک ہیں۔

(ii) سورۃ النساء کی آیت ۱۰ : إِنَّ الَّذِينَ يَأْكُلُونَ أَمْوَالَ الْيَتَامَىٰ ظُلْمًا إِنَّمَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ نَارًا (بے شک جولوگ یتیموں کا مال ناحق کھا لیتے ہیں وہ بس اپنے پیٹوں میں آگ ہی بھرتے ہیں) میں عبارۃ النص سے یتیم کے مال کو ناحق کھانے کی ممانعت معلوم ہوتی ہے۔ تاہم ''دلالۃ النص'' سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ یتیم کے مال کو آگ لگانا یا کسی اور طرح اسے ظلماً برباد کرنے کی بھی ممانعت ہے کیونکہ ایسے اعمال بھی تو یتیم کا مال کھانے کے مرادف ہیں۔ ان تمام صورتوں میں وجہِ اصلی از راہِ ظلم بربادی ہے۔

(4) اقتضاء النص: لفظ ''اقتضاء'' کا معنی ضرورت اور طلب ہے۔ اس سیاق میں اقتضاء النص کا مفہوم متن میں بیان شدہ الفاظ سے نہیں لیا جاتا بلکہ وہ متن کا تقاضا ہوتا ہے۔ یہ ضرورت متن کے معنی کو معلوم کرنے کے لئے اس لئے ضروری ہے کہ اس کے بغیر متن میں بیان شدہ حکم پر عمل کرنا مشکل ہوتا ہے۔ دلالۃ النص کے برعکس اقتضاء

النص کو الفاظ کی ترتیب اور باہمی جوڑ کے ذریعے معلوم نہیں کیا جاتا بلکہ قانون کی رُو سے حکمِ اصلی کو معلوم کیا جاتا ہے۔ مثالیں ملاحظہ ہوں :

(i) حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ أُمَّهَاتُكُمْ وَبَنَاتُكُمْ وَأَخَوَاتُكُمْ وَعَمَّاتُكُمْ وَخَالَاتُكُمْ۔۔ الخ(النساء:۲۳)
''تم پر حرام کی گئیں تمہاری مائیں، تمہاری بیٹیاں، تمہاری بہنیں، تمہاری پھوپھیاں۔ وغیرہ وغیرہ''

یہاں ماؤں، بیٹیوں وغیرہ کی حرمت اُن سے شادی کرنے میں ہے یعنی اِن رشتوں سے شادی کرنا حرام ہے۔ متن، نکاح (شادی) کے معنیٰ کا متقاضی ہے اگرچہ متن میں اس کا ذکر نہیں ہے۔

(ii) حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنزِيرِ۔۔ الخ (المائدۃ : ۳)
''تم پر حرام کیے گئے ہیں مُردار اور خون اور سوٴر کا گوشت۔۔۔ وغیرہ وغیرہ'' (۳ : ۵)

آیت کے متن میں اقتضاء النص کی رُو سے جو معانی بنتے ہیں وہ ان مذکورہ چیزوں کے کھانے اور اُن کے استعمال کی ممانعت سے متعلق ہیں۔ لہٰذا آیت کا ترجمہ مکمل مفہوم اور مرادی مطلب فراہم نہیں کرتا۔ "Islamic Jurisprudence"... Imran Ahsan Khan Nyazee, pp. 283-287)

''چاروں طریقوں کے مابین تضاد اور اُن سے احکام کا ماخوذ ہونا: اِن مذکورہ بالا چاروں طریقوں سے احکام کا ماخوذ ہونا ترتیب وار ہے۔ اس طرح عبارۃ النص کے ذریعے ثابت شدہ حکم قوی ترین اور مضبوط ترین ہوتا ہے۔ اس کے بعد اشارۃ النص کے ذریعے اخذ شدہ حکم کا درجہ ہے اور پھر دلالۃ النص کا درجہ ہے۔ اقتضاء النص کی رُو سے ثابت شدہ حکم نسبتاً کمزور ترین ہوتا ہے۔ ان طریقوں کو قوت و مضبوطی کے درجات دینے کی اہمیت یہ ہے کہ تضاد کی صورت میں مضبوط تر طریقے کو کمزور تر طریقے پر ترجیح حاصل ہوگی۔ چند مثالیں درج ذیل ہیں:

(1) عبارۃ النص اور اشارۃ النص کے مابین تضاد : سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۳۳: وَعَلَى الْمَوْلُودِ لَهُ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ (اور جس کا بچہ ہے اُس کے ذمہ اُن ماؤں کا کھانا اور کپڑا دستور کے موافق ہے) میں اشارۃ النص کی رُو سے باپ کے بچے پر حقوق کے حوالے سے باپ کو اہمیت دی گئی ہے (جیسا کہ اوپر بیان ہوا)۔ اس کے مقابل جب حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے دریافت کیا گیا کہ رشتہ داروں میں حسنِ سلوک کا کون زیادہ مستحق ہے؟ تو آپ نے فرمایا: تمہاری ماں۔ پوچھا گیا: اس کے بعد کون؟ جواب دیا: تمہاری ماں۔ پوچھا گیا: اس کے بعد کون؟ جواب دیا: تمہاری ماں۔ پوچھا گیا: اس کے بعد کون؟ جواب دیا: تمہارا باپ۔ عبارۃ النص کی رُو سے یہ حدیثِ مبارکہ ماں کو باپ سے تین درجے زیادہ عطا کرتی ہے۔ جب اِن دو اخذ شدہ اصولوں کا باہم موازنہ کیا جائے تو اشارۃ النص کی رُو سے باپ کو اپنے بچے کی دولت و جائداد پر بڑا حق حاصل ہے جبکہ حدیثِ مبارکہ ماں کو بڑے حقوق عطا کرتی ہے۔

(ii) سورۃ النساء کی آیت ۹۳: وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآءُه' جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيْهَا (اور جو کوئی کسی مؤمن کو قصداً قتل کر دے تو اُس کی سزا جہنم ہے جس میں وہ ہمیشہ پڑا رہے گا) میں عبارۃ النص کی رُو سے معلوم ہوتا ہے کہ قاتل کے لئے آخرت میں بہت سزائیں ہیں۔ تاہم اشارۃ النص کی رُو سے قاتل کے لئے اس دنیا میں کوئی قصاص نہیں ہے۔ اور سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۷۸: كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰي (تم پر مقتولوں کے بارے میں قصاص فرض کر دیا گیا ہے) میں عبارۃ النص کی رُو سے معلوم ہوتا ہے کہ قتلِ انسانی کا قصاص ہے۔ اور اسی آیت ۱۷۸ کے حکم کو عبارۃ النص کی رُو سے سورۃ النساء کی آیت ۹۳ کے حکم پر جو اشارۃ النص سے معلوم ہوا تھا' ترجیح دی جائے گی۔

(2) "اشارۃ النص اور دلالۃ النص کے مابین تضاد: سورۃ النساء کی آیت ۹۳: وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآءُه' جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيْهَا (اور جو کوئی کسی مؤمن کو قصداً قتل کر دے تو اُس کی سزا جہنم ہے جس میں وہ ہمیشہ پڑا رہے گا) میں عبارۃ النص کی رُو سے معلوم ہوتا ہے کہ قتلِ عمد میں کوئی کفّارہ نہیں ہے۔ اور اسی سورۃ النساء کی آیت ۹۲: وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَأً فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَّدِيَةٌ" مُّسَلَّمَةٌ" اِلٰى أَهْلِهِ (اور جو کوئی کسی مؤمن کو غلطی سے قتل کر دے تو ایک مسلمان غلام کا آزاد کرنا (واجب ہے) اور خوں بہا بھی جو اس کے عزیزوں کے حوالے کیا جائے گا) میں دلالۃ النص کے ذریعے معلوم ہوتا ہے کہ قتلِ عمد میں بھی کفارہ ہونا چاہئے۔ فقہائے احناف اشارۃ النص کو دلالۃ النص پر ترجیح دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ قتل خطا میں کفارہ نہیں ہے۔"

(3) "عبارۃ النص اور اقتضاء النص کے مابین تضاد: سورۃ النساء کی آیت ۹۲: وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَأً فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَّدِيَةٌ" مُّسَلَّمَةٌ" اِلٰى أَهْلِهِ (اور جو کوئی کسی مؤمن کو غلطی سے قتل کر دے تو ایک مسلمان غلام کا آزاد کرنا (واجب ہے) اور خوں بہا بھی جو اس کے عزیزوں کے حوالے کیا جائے گا) میں عبارۃ النص کی رُو سے معلوم ہوتا ہے کہ قتلِ خطا میں سزا ہے۔ لیکن حدیثِ مبارکہ: اِنَّ اللّٰهَ رَفَعَ عَنْ أُمَّتِىْ اَلْخَطَا وَ النِّسْيَانَ وَمَا اسْتُكْرِهُوْا عَلَيْهِ (اللہ تعالیٰ نے میری امت سے خطا' بھول چوک سے کئے گئے کام اور وہ کام جو اُن سے جبراً کرائے جائیں' معاف کر دئے ہیں) میں اقتضاء النص سے معلوم ہوتا ہے کہ خطا میں کوئی سزا نہیں ہے۔ پہلے معنیٰ کو جو عبارۃ النص کی رُو سے حاصل ہوا' دوسرے معنیٰ پر جو اقتضاء النص سے معلوم ہوا' پر ترجیح دی جائے گی۔

"تقلید اور اجتہاد کا دائرہ عمل (Scope): ہمیں شاہ ولی اللہ محدّث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر علمائے کرام سے پورا اتفاق ہے کہ ہمیں فقہِ اسلامی کے مسلّمہ مکاتبِ فکر (حنفی' شافعی' مالکی' حنبلی) کے خلاف اجتہاد کی کوئی نئی لہر نہیں اٹھانی چاہئے جس سے کسی نئے فقہی مکتبِ فکر کو وجود ملے۔ اجتہاد کا یہ نیا مکتبِ فکر اُمتِ مسلمہ کی ذہنی ابتری اور سوچ کی بدنظمی اور افراتفری پیدا کرنے کا سبب بنے گا۔ اُمّت مسلمہ کو جو پہلے ہی ٹوٹ پھوٹ اور تقسیم کا شکار ہو چکی ہے' اتحاد و اتفاق کی نئی خوراک کی ضرورت ہے۔ مسلمانوں کی صحیح الدماغی اور توازن و استحکام اس حقیقت میں مضمر ہے کہ وہ اپنے آپ کو کسی ایک مکتبِ فکر سے وابستہ کر لیں اور اس کے بانی کی جانب سے تشکیل شدہ اجتہاد پر عمل

پیدا ہوں۔ اگر آج ہر مسلمان اپنے ذاتی رجحان اور توہمات کی پیروی کرے تو اختلافاتِ رائے کا یہ شدید بہاؤ مذہبی غیر اخلاقیت کا موجب بنے گا۔ یہ بات پنڈورا کے صندوق (Pandora's Box) ☆ کو کھولنے کے مرادف ہوگی جو امت کے انتشار و افتراق کی ترقی کی راہ کھولے گی جو پہلے ہی اندرونی تصادم اور خلفشار کے ہاتھوں پارہ پارہ ہو چکی ہے۔ ان حالات میں اعتدال کا رویّہ اسلام کے لئے بہتر ثابت ہوگا اور ہمارے مذہبی علماء کو ایک مثبت رخ کی طرف موڑے گا۔ ہماری نظر میں اسی کا نام ''تقلید'' ہے جس کا مطلب چاروں یا پانچوں مکاتبِ فقہ کے وضع کردہ اصولوں کا اندھا اور غیر معقول تبع (پیروی) نہیں ہے کیونکہ اس صورت میں بحث مباحثہ کا دروازہ بند ہو جائے گا اور ذہانتی بے بسی کا موجب بنے گا۔ تقلید کا مطلب اُمتِ مسلمہ کی ذہنی موت نہیں بلکہ وہ اُس تمام تحقیق سے معقول اور متوازن رویّے کا نام ہے جو ذہانتی دریافت کے نام پر کی جاتی ہے۔ اس طرح ''تقلید'' مذہب کے متعلق ایک مثبت رویّے کو وجود میں لاتی ہے۔'' ("Islam in Various Perspectives".. Prof. Dr. Muhammad Tahir-ul-Qadri, pp. 316-317)

<u>عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے اجتہاد کی عمدہ ترین مثالیں</u> : مختلف اوقات میں خلیفہ ثانی سیّدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی طرف سے اجتہاد کی مثالیں بہترین مثالیں ہیں جو آج بھی ہمارے غور و فکر اور سوچ بچار کی راہ کو تابندگی بخشتی ہیں۔ اُن میں سے ایک مثال کا ذکر حسبِ ذیل کیا جاتا ہے:۔

''عراق اور شام کی فتح کے بعد مفتوحہ علاقوں کے انتظام و انصرام کا سوال کھڑا ہوا۔ شیخ محمد الخُدری کے مطابق اگر قرآنِ مجید کے متون (Texts) کو اُن کی ظاہری شکل میں لیا جاتا تو مفتوحہ علاقوں کی زمینوں کو مالِ غنیمت کے طور پر سمجھا جاتا جس کا خمس (پانچواں حصہ) فوجی سپاہیوں میں تقسیم ہو جاتا۔ اس لئے مجاہدین نے جناب عمر فاروق سے اسی چیز کا مطالبہ کیا۔ لیکن آپ نے اُن سے اتفاق نہیں کیا اور ان زمینوں کو سلطنتِ اسلامیہ کی جائداد کے طور پر ہونے کا فیصلہ کیا۔ مجاہدین نے جنابِ عمر کی اس بات سے اتفاق نہیں کیا کہ جو زمینیں اُنہوں نے بزورِ شمشیر حاصل کی ہیں' وہ آنے والی نسلوں کی ہیں۔ لیکن عمر فاروق رضی اللہ عنہ اپنے فیصلے پر ڈٹے رہے اور اس بارے میں مجاہدین سے مشورہ کیا۔ عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ بھی مجاہدین کی رائے کے حق میں تھے لیکن عثمانؓ' علیؓ' ابنِ عمر اور طلحہ رضی اللہ عنہم نے جنابِ عمر کے نقطہ نظر سے اتفاق کیا۔ پھر عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے دس مشہور و معروف اور پختہ علم کے انصار صحابہ سے مشورہ کیا اور فیصلہ کیا کہ یہ زمینیں تمام مسلمانوں اور اُن کے بچوں کی جائداد ہیں (یعنی سلطنتِ اسلامیہ کی مِلک ہیں)۔'' (''تاریخ التشریع الاسلامی'' صفحات ۱۲۲۔۱۲۴ بحوالہ ''اسلام اینڈ کرنٹ افیئرز۔ آر اے جالندھری)

''یہ واقعہ اجتہاد کا بہترین واقعہ ہے جس میں شریعت کی روشنی میں آزادانہ رائے کا اظہار ہے اور جس میں مسئلہ کو کافی غور و خوض اور مساعی جمیلہ کے بعد حل کیا گیا۔ جو کچھ عمر فاروق رضی اللہ عنہ اُمت کے مفاد میں بہتر سمجھتے تھے <u>اُنہوں نے کافی غور و خوض اور مشاورت کے بعد اسے قانونی طور پر نافذ کیا۔ عمر فاروقؓ کا یہ واقعہ اور دوسرے فیصلے</u>

☆ یونانی دیو مالا میں وہ صندوق جس میں پہلی فانی عورت پنڈورا کے ہاتھوں تمام انسانی آلام ابل پڑے تھے اور صرف ''امید'' بچ گئی تھی۔

جو عوام کی فلاح و بہبود میں کئے گئے' اس بات کو عیاں طور پر واضح کرتے ہیں کہ ہر نسل کو اپنے مسائل اپنے حالات کے مطابق حل کرنے کا حق حاصل ہے۔ اس لئے اگر آج حکومت اپنے ذرائع کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے آنے والی نسلوں کی خوشحالی اور فلاح و بہبود کے لئے کوئی اقدام کرتی ہے تو یہ بالکل صحیح اور جائز بات ہوگی بشرطیکہ یہ اقدام کسی بھی طرح شریعتِ اسلامی کے بنیادی مقاصد کے خلاف نہ ہو۔'' ...("Islam and Current Affairs"
Rashid Ahmad Jullundhri, pp. 129, 130)

''اگر ہم کسی ایک امام کے اجتہاد کے پیرو ہیں تو ہمیں دوسرے ائمہ فقہ کے اجتہادات کے متعلق تنگ نظر نہیں ہونا چاہئے۔ اجتہاد کا مقصد نزاع و تصادم کو صلح و صفائی میں بدلنا اور مزاحمت کو کم سے کم کرنا ہوتا ہے۔ لہٰذا کسی ایک مکتبِ فکر کے اجتہاد کی نری متشددانہ اور ہٹ دھرمانہ پیروی کوئی اچھی بات نہیں ہے کیونکہ یہ تعصّب کی حوصلہ افزائی کرتی ہے اور دوسرے ائمہؒ فقہ کے اجتہادات کی قدر و قیمت کو کمزور کرتی ہے۔ تفصلیت اور کھلے ذہن سے کسی ایک فقہ کا انتخاب بہترین راستہ ہے جو مسلمانوں میں اتحاد و اتفاق کا سبب بنے گا۔ تفصلیت کی ایسی مثالیں خود ائمہ فقہ کی زندگیوں میں بکثرت ملتی ہیں۔ دراصل یہ وسعتِ نظر ''تقلید'' کے نظریہ ہی میں سموئی ہوئی ہے۔ علامہ شامی اور شاہ عبدالعزیز محدّث دہلوی نے اس توضیح کی ''تلفیق'' کے نظریہ کے تحت توثیق کی ہے۔'' ("Islam in Various
Perspectives".... pp. 319-320)

''فی زمانہ مجتہد کون ہے؟ آج کے اس دَور میں درجِ بالا تمام اہلیتوں کا حامل ہونا کسی شخص کو ''مجتہد'' کے مقام پر نہیں پہنچا دیتا کیونکہ بہت کچھ عوام کی طرف سے قبولیت پر منحصر ہوتا ہے۔ چونکہ فقہ کے مکاتبِ فکر پہلے ہی سے قائم و ثابت ہیں' لہٰذا عوام کی جانب سے کسی ایسی قبولیت کا وجود نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امام سرخسی' الغزالی اور دیگر علماء کو جو کامل ''مجتہد'' کی تمام تر اہلیتوں کے مالک تھے' مجتہد کا مقام نہیں دیا گیا۔''

''اجتہاد ابتدائی طور پر قانون سازی کا عمل ہے اور آج قانون سازی پر حکومت کی اجارہ داری ہے۔ مجتہد کی رائے کی اُس وقت تک کوئی اہمیت نہیں ہوتی جب تک اُسے حکومت منظور نہ کرے اور قانون سازی کے ذریعے اُسے قانون میں تبدیل نہ کرے۔ بعض صورتوں میں عدالتیں بھی کسی ایک رائے کو تسلیم کر کے اپنے فیصلوں میں اسی کو باوزن بنا دیتی ہیں۔ ایسی صورت میں ''مجتہد'' خود حکومت بن جاتی ہے نہ کہ وہ فردِ (مجتہد)۔''

''اب پاکستان میں کونسل آف اسلامک آئیڈیالوجی کو مجتہد کی اہلیت کا حامل نہیں کہا جا سکتا' اس کا مقام ''مفتی'' جیسا ہے جس کے فیصلے نافذ اور عائد نہیں ہوتے۔ یہ کونسل آف اسلامک آئیڈیالوجی بذاتِ خود ریاست کا ایک حصّہ ہے۔ بین الاقوامی سطح پر او۔ آئی۔ سی کی ''فقہ'' اکیڈمی کا بھی وہی مقام ہے کیونکہ اس کے فیصلے اور آراء محض سفارشات ہی ہوتے ہیں اور اُن کا نفاذ کسی پر نہیں ہوتا۔''

(۸۴) ایلاء

لفظ ''ایلاء'' ''اِلْوَۃ'' بہ حرکتِ ثلاثہ وسکونِ لام ہے بمعنی قَسم۔

''لفظ ''ایلاء'' کے لغوی معنی صرف قسم کھالینے کے ہیں خواہ یہ قسم اپنی بیوی سے مقاربت نہ کرنے کی ہو یا کسی اور بات کی۔ واضح ہو کہ بیوی سے ترکِ مقاربت کی قسم کھالینے کا رواج عہدِ جاہلیت (قبل از اسلام) میں بھی تھا اور اُس کا خاص حکم تھا۔ یعنی ایلاء سے مراد ہمیشہ کے لئے بیوی کو حرام کر لینا تھا۔ چنانچہ اگر کسی شخص نے کہا کہ قسم خدا کی میں اپنی بیوی سے مباشرت نہ کروں گا تو عہدِ جاہلیت میں اس کا مطلب یہ تھا کہ اُس نے ہمیشہ کے لئے بیوی کو اپنے اوپر حرام کر لیا۔ پس ایلاء کے لغوی معنی اس کے شرعی معنی سے زیادہ عام (وسیع) ہیں کیونکہ اصطلاحِ شرع میں ''ایلاء'' کے معنی خصوصیت کے ساتھ بیوی سے ترکِ مباشرت کی قسم کھالینا ہے۔ لہٰذا فقہاء کے نزدیک لفظ ''ایلاء'' کا اطلاق کھانے پینے کی اشیاء کے بارے میں قسم کھانے پر نہ ہوگا۔''

''شرعِ اسلام میں ایلاء کے متعلقہ احکام عہدِ جاہلیت کے ایلاء سے مختلف ہیں کیونکہ شرع میں بیوی کے ساتھ ایلاء کرنے سے ہمیشہ کے لئے بیوی حرام نہیں ہو جاتی جیسا کہ بتایا جائے گا۔''

''اصطلاحِ شرع میں اس لفظ (ایلاء) کے معنی اس بات کی قسم کھانے کے ہیں کہ وہ شخص اپنی بیوی سے مقاربت نہیں کرے گا۔ یہ قسم غیر مشروط بھی ہو سکتی ہے مثلاً یہ کہنا کہ اللہ کی قسم! میں اپنی بیوی سے مباشرت نہیں کروں گا اور اس کے ساتھ ''ہمیشہ'' کی قید بھی لگائی جا سکتی ہے کہ میں ہمیشہ کے لئے مقاربت نہ کرنے کی قسم کھاتا ہوں۔ یا چار ماہ یا اس سے زیادہ عرصہ کی قید بھی لگائی جا سکتی ہے مثلاً یوں کہا کہ اللہ کی قسم! میں پانچ ماہ یا سال بھر تک یا عمر بھر یا جب تک آسمان و زمین قائم ہیں' اپنی بیوی کے پاس نہیں جاؤں گا وغیرہ۔ اس طرح کہنے سے وہ شخص مُولِی (یعنی ایلاء کرنے والا) قرار پائے گا۔ لیکن اگر دو' تین یا چار ماہ کے لئے قسم کھائی یعنی چار ماہ سے زیادہ کی قسم نہ ہو خواہ ایک ہی دن زیادہ ہو' اُسے ایلاء قرار نہ دیا جائے گا۔ خیال رہے کہ احناف کے نزدیک ایلاء کی کم سے کم مدت صرف چار ماہ ہے۔ ایلاء اس سے زیادہ عرصہ کے لئے نہیں ہو سکتا جیسا کہ احکامِ ایلاء کے بیان میں بتایا جائے گا۔''

''مُولِی (ایلاء کرنے والے) نے اگر اللہ کی صفات میں سے کسی صفت کی قسم کھائی مثلاً کہا کہ قسم ہے اللہ کی قدرت یا اللہ کے علم کی وغیرہ تو اسے بھی اللہ کی قسم تصور کیا جائے گا۔''

اللہ تعالیٰ کے ارشاد:

لِلَّذِیْنَ یُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآءِ ھِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْھُرٍ فَاِنْ فَآءُوْ فَاِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ O وَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَاِنَّ اللّٰہَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ O (البقرۃ: ۲۲۶' ۲۲۷)

''جولوگ اپنی بیویوں سے (ہمبستری نہ کرنے کی) قسم کھا بیٹھتے ہیں' اُن کے لئے مہلت چار ماہ تک ہے۔ پھر اگر وہ رجوع کرلیں تو اللہ بخشنے والا' بڑا ہی مہربان ہے۔ اور اگر وہ طلاق (ہی) کا پختہ ارادہ کرلیں تو بے شک اللہ تعالیٰ بڑا سننے والا' بڑا جاننے والا ہے۔'' (۲۲۶'۲۲۷: ۲)

کا مطلب یہی ہے کہ جولوگ اپنی بیویوں سے ترکِ مباشرت کی قسم کھا لیتے ہیں تو اُنہیں چار مہینے تک انتظار کرنا چاہئے۔ اگر تو وہ اپنی قسم سے رجوع کر کے مباشرت کرلیں جس کے ترک کرنے کی قسم کھائی ہے تو یہ رجوع اس گناہ سے توبہ کرنے کے مترادف ہے۔ اب اس قسم کا کفّارہ ادا کردیا جائے تو اللہ اُن کی مغفرت فرما دے گا۔ اس سے واضح ہے کہ ایلاء (بذاتِ خود) امرِ حرام ہے کیونکہ اس میں خاوند سے مفارقت کے باعث عورت کو ایذاء ہوتی ہے اور بشریت کے فطری تقاضے کو ترک کرنا پڑتا ہے جو بقائے نوعِ انسانی کے لئے ضروری ہے اور عورت اُس لطف سے جو اس میں قدرت نے رکھ دیا ہے' محروم رہتی ہے۔ اسی لطف کی خاطر تو وہ تربیتِ اولاد کی سختیاں اور مشقتیں جھیلتی ہے نیز اُسے خاوند کی ناپسندیدگی اور بے رخی کی کوفت ہوتی ہے اور یہ تمام باتیں اُس کے لئے باعثِ اذیت ہیں۔

''چار ماہ کی مہلت دینے میں حکمت یہ ہے کہ خاوند علاقۂ زوجیت کے تحفظ اور فطرتِ بشری کے تقاضے کو بحال رکھنے کی تدبیر کرے۔ اتنے عرصہ تک بیوی سے دور رہنے میں خاوند کا اشتیاق بیوی کے لئے پیدا ہوگا اور وہ اپنی حالت سے بیوی کی حالت کا صحیح موازنہ نہ کرسکے گا۔ اب اگر اس مفارقت کا خاوند پر کچھ اثر نہ ہوا اور بیوی کی پروا نہ رہی تو اُس سے جدا ہونا آسان ہوگا یا اپنے کئے پر پشیمان ہو کر بیوی کی طرف رجوع کرے گا اور اُس کے ساتھ خوش گزرانی کا عزم کرلے گا۔ یہی صورتِ حال عورت کی بھی ہے کہ خاوند سے مفارقت بیوی کی اصلاح کا ایک وسیلہ ہے۔ بعض اوقات خاوند کی بے رخی کا سبب بیوی کا بناؤ سنگھار ترک کرنا اور ایسا رویہ اختیار کرنا ہوتا ہے جو خاوند کی بیزاری کا موجب ہو۔ اتنے عرصہ تک بیوی کا خاوند سے جدا رہنا ایسے اقدامات سے مانع ہوگا جو خاوند کی زیادتی کا موجب ہوسکتے ہیں۔ غرض اتنے عرصہ تک توقّف کرنا علاقۂ زوجیّت کی بحالی کے لئے ضروری ہے۔ اس معنی کی رُو سے یہ مطلب ہوگا کہ مدتِ ایلاء گزر جانے کے بعد ایلاء کرنے والے مباشرت کی طرف مائل ہوں اور اپنی قسموں کا کفارہ ادا کردیں تو اللہ مغفرت کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے اور اگر مدتِ ایلاء ختم ہونے کے بعد طلاق ہی دینے کا ارادہ کرلیں تو اللہ تعالیٰ اُس ظلم و اذیت کو سننے اور جاننے والا ہے جو رجوع نہ کرنے کی صورت میں بیوی پر ہوا جس پر اُنہیں سزا دی جائے گی۔''

''اللہ تعالیٰ کے ارشاد وَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَاِنَّ اللّٰہَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ کے مفہوم میں دو احتمال ہیں: (۱) ایک معنی یہ ہیں کہ اگر ایلاء کرنے والے اپنی قسم پر جمے رہنے اور اپنی عورتوں کو چھوڑ دینے ہی کا عزم کرچکے ہیں تو بیوی کے پاس نہ جائیں یہاں تک کہ ایلاء کی مدت چار ماہ پوری ہوجائے تو اس سے ظاہر ہوگا کہ اُنہیں اس بات پر اصرار ہے' لہٰذا اس کے بعد بیوی کو از خود طلاق ہوجائے گی خواہ خاوند طلاق نہ دے یا عورت طلاق کا مطالبہ نہ کرے یعنی اس مدت کا گزر جانا بذاتِ خود ایک طلاق ہے۔ (۲) اس آیت کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ مدت ایلاء گزر جانے

کے بعد اگر خاوند طلاق کا ارادہ کرے یعنی جب تک کہ ایلاء کی مدت نہ گزر جائے تو ارادہِ طلاق کا تحقق نہیں ہو سکتا بایں طور کہ خاوند (اس کے بعد) بطورِ خود طلاق دے دے یا پھر اس معاملہ کو باقاعدہ حاکم شرع کے پیش کرے۔ ان معنی کی رُو سے اُس شخص کو تنبیہ ہے جو ایلاء کی مدت گزر جانے پر خود بیوی کو طلاق دے یا حاکم اُس کی طرف سے طلاق دے دے۔''

ضروری نوٹ : (۱) اگر خاوند اپنی قسم کو توڑ دے تو اُسے ساٹھ مسکینوں کو پیٹ بھر کر کھانا کھلانا ہو گا یا کفارہ کے طور پر مسلسل دو ماہ کے روزے رکھنا ہوں گے۔

(۲) اگر بیوی سے مباشرت کئے بغیر چار ماہ کا عرصہ گزر جائے تو وہ آزاد ہو گی اور جس سے چاہے نکاح کرنے کی مجاز ہو گی۔ اگر وہ عورت چار ماہ گزرنے کے بعد اُسی خاوند سے دوبارہ نکاح کرنا چاہے تو ''حلالہ'' کی شرط کے بغیر نکاح ہو سکتا ہے لیکن خاوند کو کفارہ بطورِ سزا ادا کرنا ہو گا۔

(۳) تمام ائمہ اربعہ کا اس پر اتفاق ہے کہ ایلاء قسم کھانے کی صورت میں ہو گا ورنہ یہ ایلاء نہیں ہو گا۔

(۴) اگر خاوند قسم اٹھائے کہ وہ اپنی بیوی سے ایک دن کم چار مقاربت نہیں کرے گا تو یہ ایلاء نہیں ہو گا کیونکہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے فرمان کے مطابق ایلاء کا اطلاق چار ماہ سے کم کی مدت پر نہیں ہوتا۔

(۵) اگر خاوند قسم اٹھائے کہ وہ اپنی بیوی سے ایک دن کم ایک سال تک مقاربت نہیں کرے گا تو احناف کے نزدیک یہ ایلاء نہیں ہو گا کیونکہ ہو سکتا ہے کہ ایک سال میں ایک دن کا استثناء کر کے چار ماہ کے دوران کسی بھی دن وہ اُس سے قربت کر لے۔

(۶) اگر ترکِ مباشرت کی قسم غیر معینہ مدت تک کے لئے ہے یا چار ماہ سے زیادہ کی ہے تو ایلاء واقع ہو جائے گا۔

(۷) اگر ایلاء کو کسی شرط کے ساتھ معلق کر دیا گیا ہو تو بھی ایلاء واقع ہو جائے گا مثلاً خاوند بیوی سے کہے کہ اگر میں نے تم سے مباشرت کر لی تو مجھ پر ایک حج کا کرنا واجب ہو جائے گا۔

(۸) ایلاء کے عمل کی تکمیل ناقابلِ تنسیخ طلاق (طلاقِ مغلظہ) پر منتج ہو گی۔

(۸۵) الیاس علیہ السلام

''نام : قرآنِ عزیز نے اُن کا نام الیاس بتایا ہے اور انجیل یوحنا میں اُنہیں ایلیاہ (Elijah) نبی کہا گیا ہے۔ الیاس علیہ السلام اسرائیلی نبی ہیں اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد مبعوث ہوئے ہیں۔ طبری کہتے ہیں کہ آپ حضرت الیسع علیہ السلام کے چچازاد بھائی تھے اور یہ کہ ان کی بعثت حزقیل نبی کے بعد ہوئی ہے۔''

''نسب : بیشتر مورّخین کا اس پر اتفاق ہے کہ حضرت الیاس، حضرت ہارون علیہ السلام کی نسل سے ہیں اور اُن کا نسب نامہ یہ ہے :

الیاس بن یاسین بن فنحاص بن یعزار بن ہارون (یا) الیاس بن عازر بن یعزار بن ہارون علیہ السلام۔''

''قرآنِ عزیز اور حضرت الیاس علیہ السلام : قرآنِ عزیز میں حضرت الیاس علیہ السلام کا ذکر دو جگہ آیا ہے: سورۃ الانعام کی آیت ۸۵ میں اور سورۃ الصّافّات کی آیات ۱۲۳، ۱۳۰ میں۔ سورۃ الانعام میں تو اُنہیں صرف انبیاء علیہم السلام کی فہرست میں شمار کیا ہے جبکہ سورۃ الصّافّات میں بعثت اور قوم کی ہدایت سے متعلق حالات کو مختصر طور پر بیان کیا ہے۔'' (آیاتِ مذکورہ کا حوالہ اگلے صفحہ پر ہے)۔

''بعثت : حضرت الیاس علیہ السلام کی بعثت کے متعلق مفسرین اور مورخین کا اتفاق ہے کہ وہ شام کے باشندوں کی ہدایت کے لئے بھیجے گئے تھے اور بعلبک کا مشہور شہر اُن کی نبوّت و ہدایت کا مرکز تھا۔ الیاس علیہ السلام کی قوم مشہور بت بعل کی پرستار اور توحید سے بیزار شرک میں مبتلا تھی۔ اللہ کے برگزیدہ پیغمبر نے اُنہیں سمجھایا اور راہِ ہدایت دکھائی۔ صنم پرستی اور کواکب (ستارہ) پرستی کے خلاف وعظ و پند کرتے ہوئے توحیدِ خالص کی طرف اُنہیں دعوت دی۔''

''الیاس علیہ السلام کی قوم اور بعل : یہ مشرق میں آباد سامی اقوام کا مشہور اور سب سے زیادہ مقبول دیوتا تھا۔ یہ بت مذکر تھا اور زحل یا مشتری کا مثنی سمجھا جاتا تھا۔ فینقی، کنعانی، موآبی اور مدیانی قبائل خاص طور پر اس کی پرستش کرتے تھے۔ اس لئے بعل کی پرستش عہدِ قدیم سے چلی آتی تھی اور موآبی اور مدیانی اُسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عہد سے پوجتے چلے آتے تھے۔ چنانچہ شام کا مشہور شہر بعلبک بھی اسی نام سے منسوب تھا اور شعیب علیہ السلام کو مدین میں اسی کے پرستاروں سے واسطہ پڑا تھا۔ بعض مورخین کا خیال ہے کہ حجاز کا مشہور بت ہُبَل بھی یہی بعل ہے۔''

''بعل دیوتا کی عظمت کا یہ حال تھا کہ وہ مختلف مربیانہ عطاء و نوال کی وجہ سے مختلف ناموں کے ساتھ موسوم تھا۔ یہود یا مشرقی اسرائیلیوں کے یہاں بعل کی پرستش کے لئے مختلف موسموں میں عظیم الشان مجالس منعقد ہوا کرتی تھیں اور اس کے لئے بڑے بڑے ہیکل اور عظیم الشان قربان گاہیں بنائی جاتی تھیں اور کاہن اُسے بخورات کی دھونی دیتے اور اُس پر طرح طرح کی خوشبوئیں چڑھاتے تھے اور کبھی کبھی اُسے انسانوں کی بھینٹ بھی دی جاتی تھی۔'' (دائرۃ المعارف البستانی، جلد پنجم)

۲۲۶۵ (الیاس علیہ السلام)

تفسیر روح المعانی کی جلد ۲۳ کے صفحہ ۱۲۷ پر مرقوم ہے کہ بعل سونے کا تھا' اُس کا قد بیس گز کا تھا اور اس کے چار منہ تھے۔ اس کی خدمت پر چار سو خادم مقرر تھے۔

''سامی اور عبرانی زبانوں میں بعل کے معنی مالک' سردار' حاکم اور رب کے آتے ہیں۔ اسی لئے اہلِ عرب شوہر کو بھی ''بعل'' کہتے ہیں لیکن جب بعل پر الف لام لے آتے ہیں یا کسی شے کی جانب اضافت کر کے بولتے ہیں تو اُس وقت فقط دیوتا اور معبود مراد ہوتا ہے۔''

حضرت الیاس علیہ السلام کے زمانہ میں بھی یمن و شام کا یہ بت ہی محبوب دیوتا تھا اور الیاس علیہ السلام کی قوم دوسرے بتوں کے ساتھ خصوصیت سے اس بت کی پرستش کرتی تھی۔ چنانچہ اسی تقریب سے قرآنِ عزیز میں اُس کا ذکر آیا ہے:

وَاِنَّ اِلْيَاسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ O اِذْقَالَ لِقَوْمِهٖٓ اَلَا تَتَّقُوْنَ O اَتَدْعُوْنَ بَعْلًا وَّ تَذَرُوْنَ اَحْسَنَ الْخَالِقِيْنَ O اللّٰهَ رَبَّكُمْ وَرَبَّ اٰبَآءِكُمُ الْاَوَّلِيْنَ O فَكَذَّبُوْهُ فَاِنَّهُمْ لَمُحْضَرُوْنَ O اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ O وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِى الْاٰخِرِيْنَ O سَلٰمٌ عَلٰٓى اِلْ يَاسِيْنَ O اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ O اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ O (الصّافّات: ۱۲۳ تا ۱۳۲)

''اور بے شک الیاس بھی (ہمارے) پیمبروں میں تھے (اُس وقت کا ذکر کیجئے) جب اُنہوں نے اپنی قوم سے کہا کہ تم (اللہ سے) ڈرتے نہیں ہو؟ کیا تم بعل کو پکارا کرتے ہو اور اُسے چھوڑے ہوئے ہو جو سب سے بڑھ کر بہتر بنانے والا ہے۔ اللہ ہی تمہارا بھی پروردگار ہے اور تمہارے باپ دادوں کا بھی۔ سو اُن لوگوں نے اُنہیں جھٹلایا پس وہ لوگ پکڑے جائیں گے مگر ہاں جو اللہ کے خاص کئے ہوئے بندے تھے (وہ ثواب و اجر میں ہوں گے) اور ہم نے الیاس کے لئے پیچھے آنے والوں میں یہ بات رہنے دی کہ سلام ہو اِلیاسین پر' ہم مخلصین کو ایسا ہی صلہ دیا کرتے ہیں۔ بے شک وہ ہمارے کامل ایماندار بندوں میں سے تھے۔'' (۱۲۳ تا ۱۳۲ : ۳۷)

''تفسیری نکتہ: سورۃ الانعام میں حضرت الیاس علیہ السلام کا جن آیات میں ذکر آیا ہے وہ حضرت نوح اور حضرت ابراہیم علیہما السلام کی اولاد اور اُن کی نسل کے انبیاء و رُسُل کی ایک مختصر فہرست ہے۔ ارشاد ہے:

كُلًّا هَدَيْنَا وَنُوْحًا هَدَيْنَا مِنْ قَبْلُ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهٖ دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ وَاَيُّوْبَ وَيُوْسُفَ وَمُوْسٰى وَهٰرُوْنَ وَكَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ O وَزَكَرِيَّا وَيَحْيٰى وَعِيْسٰى وَاِلْيَاسَ كُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ O وَاِسْمٰعِيْلَ وَالْيَسَعَ وَيُوْنُسَ وَلُوْطًا وَكُلًّا فَضَّلْنَا عَلَى الْعٰلَمِيْنَ O (الانعام: ۸۴ تا ۸۶)

''ہر ایک کو ہم نے ہدایت دے دی۔ اور نوح کو ہم زمانہ ماقبل میں ہدایت دے چکے تھے اور اُن کی نسل میں سے داؤد' سلیمان' ایوب' یوسف' موسیٰ اور ہارون کو' اور ہم نیکو کاروں کو اسی طرح جزا دیا کرتے ہیں اور ہم نے ہدایت دی زکریا' یحییٰ' عیسیٰ اور الیاس کو (یہ) سب صالحین میں سے تھے اور ہم نے ہدایت دی تھی اسمٰعیل' یسع' یونس اور لوط کو اور ان میں سے ہر ایک کو ہم نے جہان والوں پر فضیلت دی تھی۔'' (۸۴ تا ۸۶ : ۶)

۲۲۶۶ (الیاس علیہ السلام)

''قرآنِ عزیز نے اس فہرست میں انبیاء علیہم السلام کو تین جدا جدا حلقوں میں بیان کیا ہے۔ اس کی حکمت میں سب سے بہتر توجیہ صاحب ''المنار'' کی ہے جس کا حاصل یہ ہے :

''اللہ تعالیٰ نے اس مقام پر انبیاء و رُسل کو تین جدا جدا جماعتوں میں اس لئے بیان فرمایا ہے کہ انبیائے بنی اسرائیل میں خصوصی امتیازات کے پیشِ نظر تین قسم کی جماعتیں تھیں۔ بعض انبیاء علیہم السلام وہ تھے جو صاحبِ تخت و تاج اور صاحبِ حکومت تھے یا وزارت و سرداری کے مالک تھے۔ اس کے برعکس بعض انبیاء علیہم السلام کی زندگی زاہدانہ اور راہبانہ تھی اور دولت و ثروت سے یکسر نفور وہ فقیرانہ معیشت کے حامل تھے۔ بعض انبیائے کرام نہ تو اپنی قوم میں حاکم اور صاحبِ تاج و تخت تھے اور نہ خالص راہبانہ زندگی کے حامل تھے بلکہ ایک طرف قوم کے ہادی اور پیغمبر تھے تو دوسری جانب متوسط معیشت سے وابستہ تھے۔ لہٰذا جب قرآنِ عزیز نے ان انبیاء و رُسل کا ذکر کیا تو اُن کے زمانہ ہائے بعثت اور بعض دوسری خصوصیات میں مشابہت سے الگ ہو کر اسی نقطہ نظر سے اُنہیں تین جماعتوں میں تقسیم کر دیا اور پھر ترتیب درجات کے لحاظ سے ترتیبِ ذکر کو بھی ضروری سمجھا یعنی پہلی فہرست میں اول حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام کا ذکر کیا جو نبی و رسول ہونے کے علاوہ صاحبِ مملکت بھی تھے اور اس کے بعد حضرت ایوب اور حضرت یوسف علیہما السلام کا تذکرہ کیا جو اگرچہ صاحبِ مملکت نہ تھے مگر اوّل الذکر (ایوب علیہ السلام) چھوٹی سی ریاست کے مالک تھے اور ثانی الذکر (یوسف علیہ السلام) حکومتِ مصر کے وزیر اور مختارِ کُل تھے۔ ان کے بعد حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کا نام آیا جو نہ بڑی حکومت اور نہ چھوٹی ریاست کے مالک تھے اور نہ ہی کسی حکومت کے وزیر اور مختارِ کل تھے بلکہ اپنی قوم کے رسول اور پیغمبر بھی تھے اور اُن کے سردار بھی۔''

''دوسری فہرست میں اُن انبیاء کرام کا تذکرہ ہے جنہوں نے ساری عمر زہد میں گزار دی۔ اُنہوں نے نہ رہنے کو مکان بنایا اور نہ کھانے پینے کا سامان فراہم کیا۔ دن بھر تبلیغِ حق میں مصروف رہتے اور شب کو یادِ الٰہی کے بعد جہاں جگہ میسر آجاتی، ہاتھ کا تکیہ سر کے نیچے رکھ کر سو رہتے۔ حضرات یحییٰ، زکریا، عیسیٰ اور الیاس علیہم السلام اس سلسلہ میں بہت مشہور و ممتاز ہیں۔''

''اور تیسری فہرست میں اُن پیغمبروں کا تذکرہ ہے جنہوں نے نہ حکومت و سرداری کی اور نہ خالص زہد اختیار کیا بلکہ متوسط زندگی سے وابستہ رہ کر حقِ تبلیغ و ریاست ادا کیا۔ چنانچہ حضرات اسمٰعیل، الیسع، یونس اور لوط علیہم السلام اسی درمیانی زندگی کے حامل تھے۔''

''موعظت: حضرت الیاس علیہ السلام اور اُن کی قوم کا واقعہ اگرچہ قرآن میں بہت مختصر طور پر آیا ہے تاہم اس سے یہ سبق حاصل ہوتا ہے کہ یہود بنی اسرائیل کی ذہنیت اس درجہ مسخ تھی کہ دنیا کی کوئی برائی ایسی نہیں تھی جس کے کرنے پر وہ حریص نہ ہوں اور کوئی خوبی ایسی نہ تھی جس سے وہ نفور و بیزار نہ ہوں۔ انبیاء و رُسل کے ایک طویل اور پیہم سلسلہ کے باوجود بت پرستی، عناصر پرستی، کواکب پرستی غرض غیر اللہ کی پرستش کا کوئی شعبہ ایسا نہ تھا جس کے وہ پرستار نہ ہوں۔'' (''قصص القرآن'' ـ حفظ الرحمٰن سیوہاروی، جلد دوم، صفحات ۲۶ تا ۳۱)

(۸۶) زنا بالمحارم (INCEST) اور دوسرے ممنوعہ نکاح

''محارم سے بدکاری کرنے کا بیان : اگر کسی شخص نے اپنے محرم سے (جس کے ساتھ نکاح حرام ہے) بدکاری کی، خواہ اس کے ساتھ مباشرت ازدواجی رشتہ کی بناء پر حرام ہو یا دودھ کے رشتہ کی بناء پر یا نسبی رشتہ کی بناء پر، جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ ایسے شخص کی گردن ماردی جائے اور اس جرم کی پاداش میں اُس کا تمام مال بحقِ حکومت ضبط کر کے بیت المال (خزانہ حکومت) میں داخل کردیا جائے تا کہ اُسے قرار واقعی سزا ملے اور دوسروں کے لئے موجب عبرت ہو کہ اتنے بڑے گناہ کی جرأت نہ کریں۔''

حضرت براء رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے اپنے ماموں کو ہاتھ میں ایک رات علم یا نیزہ اٹھائے ہوئے دیکھا۔ میں نے پوچھا: کہاں کا ارادہ ہے؟ اُنہوں نے کہا:

بَعَثَنِی رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ اِلٰی رَجُلٍ نَکَحَ اِمْرَأَۃَ أَبِیْہِ أَنْ أَضْرِبَ عُنُقَہ، وَآخِذُ مَالَہٗ (ابوداؤد، ترمذی)

''مجھے رسول اللہ ﷺ نے بھیجا ہے کہ فلاں شخص کی جس نے اپنے باپ کی بیوی سے نکاح کرلیا ہے، گردن اُڑادوں اور اُس کا مال ضبط کرلوں)''

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

مَنْ وَقَعَ عَلٰی ذَاتِ مَحْرَمٍ مِّنْہُ فَاقْتُلُوْہُ (ابن ماجہ)

''جو شخص اپنے محرم سے ملوّث ہو، اُسے قتل کردو۔''

کیونکہ وہ شخص اللہ کی حرام کردہ شے کو حلال کرنے کا مجرم ہے۔ چونکہ یہ عمل اسلام سے مرتد کردیتا ہے لہٰذا ایسے شخص کا قتل کیا جانا بالکل جائز ہے اور اس کا مال تمام مسلمانوں کے مشترکہ خزانہ میں داخل کرلیا جائے۔

ممنوعہ نکاحوں کی فہرست سورۃ النساء میں اس طرح آئی ہے :

حُرِّمَتْ عَلَیْکُمْ أُمَّھٰتُکُمْ وَ بَنَاتُکُمْ وَ أَخَوَاتُکُمْ وَ عَمّٰتُکُمْ وَخَالاَتُکُمْ وَبَنٰتُ الْأَخِ وَ بَنٰتُ الْأُخْتِ وَ أُمَّھٰتُکُمُ الّٰتِیْ أَرْضَعْنَکُمْ وَ أَخَوَاتُکُمْ مِّنَ الرَّضَاعَۃِ وَ أُمَّھٰتُ نِسَآءِکُمْ وَ رَبَآئِبُکُمُ الّٰتِیْ فِیْ حُجُوْرِکُمْ مِّنْ نِّسَآءِکُمُ الّٰتِیْ دَخَلْتُمْ بِھِنَّ فَاِنْ لَّمْ تَکُوْنُوْا دَخَلْتُمْ بِھِنَّ فَلاَ جُنَاحَ عَلَیْکُمْ وَحَلَاۗئِلُ أَبْنَآءِکُمُ الَّذِیْنَ مِنْ أَصْلاَبِکُمْ وَأَنْ تَجْمَعُوْا بَیْنَ الْأُخْتَیْنِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ وَکَانَ اللّٰہُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًاO وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ (النساء : ۲۳، ۲۴)

''تم پر حرام کی گئی ہیں تمہاری مائیں، تمہاری بیٹیاں، تمہاری بہنیں، تمہاری پھوپھیاں، تمہاری خالائیں، بھائی کی بیٹیاں، بہن کی بیٹیاں اور تمہاری وہ مائیں جنہوں نے تمہیں دودھ پلایا، تمہاری دودھ شریک بہنیں، تمہاری بیویوں کی مائیں، تمہاری بیویوں کی بیٹیاں جو تمہاری پرورش میں رہی ہیں اور جو تمہاری اُن بیویوں سے ہوں جن سے تم نے صحبت کی ہے لیکن اگر تم نے ان سے صحبت نہ کی ہو تو تم پر کوئی گناہ نہیں

اور جو بیٹے تمہاری نسل سے ہوں' اُن کی بیویاں اور یہ بھی (حرام ہے) کہ تم دو بہنوں کو یکجا کرو مگر ہاں جو ہو چکا سو ہو چکا' بے شک اللہ بڑا ہی بخشنے والا' بڑا ہی مہربان ہے اور وہ عورتیں بھی (حرام کی گئی ہیں) جو قیدِ نکاح میں ہوں۔'' (۴ : ۲۳'۲۴)

حُرمت تین طرح کی ہے: حرمتِ نسب' حرمتِ رضاعت اور حُرمتِ مصاہرت۔

(1) حرمتِ نسب: آیتِ مذکورہ میں پہلے اُن عورتوں کا ذکر ہے جن کی حرمت کا سبب نسب ہے۔ اُن کی تعداد سات ہے:

(۱) ماں (اس میں دادی' نانی اور اس سے اوپر سب داخل ہیں)۔
(۲) بیٹی (اس میں پوتی' نواسی اور اس سے نیچے تک سب داخل ہیں)۔
(۳) بہن (سگی اور سوتیلی یعنی ماں شریک بہن یا باپ شریک بہن)۔
(۴) پھوپھی (۵) خالہ (۶) بھتیجی (۷) بھانجی

نسبی محرّمات کی گنتی یہیں تک ہے لہٰذا پھوپھی اور خالاؤں کی بیٹیاں حرام نہیں ہیں اور نہ ہی چچا یا ماموں کی بیٹیاں حرام ہیں۔

یہ بھی خیال رہے کہ باپ کی بیوی خواہ وہ مطلقہ ہو یا بیوہ' بیٹے پر حرام ہے۔ زمانہ قبل از اسلام (جاہلیت) میں ایسے نکاح جائز تھے لیکن اسلام نے ان کی ممانعت کر دی کیونکہ ایک عورت کی شادی جب اُس آدمی کے باپ سے کر دی جاتی ہے تو اُس عورت کو اس شخص کے لئے ماں کا مقام مل جاتا ہے اور اس سے نکاح کی یہ ممانعت اپنے والد کے احترام و اعزاز کی وجہ سے ہے۔ علاوہ ازیں چونکہ اس مقدّس اور قابلِ احترام ممانعت میں بیٹے اور اس کی سوتیلی ماں کے مابین جنسی کشش کی کوئی گنجائش نہیں' لہٰذا ان کے تعلقات عزت و احترام کی بنیاد پر ہوتے ہیں۔

ممانعت کی وجوہ: (۱) ماں' بیٹی اور بہن جیسے قریبی اور مقدّس رشتوں کے لئے جنسی خیالات کا ہونا فطرتِ انسانی کے نزدیک قابلِ نفرت ہے۔ کچھ جانور ایسے بھی ہیں جو ایسے قریبی رشتوں سے مقاربت کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ آدمی کی اپنی پھوپھیوں اور خالاؤں کی عزت و تکریم ایسی ہی ہے جیسی وہ اپنی ماں کی کرتا ہے اور اسی طرح چچاؤں اور ماموؤں کو باپ کی طرح سمجھا جاتا ہے۔

(۲) چونکہ ایک خاندان کو اکٹھے طور پر اور نجی طور پر اُنس و محبت کی فضا میں رہنا ہوتا ہے جس میں جنسی تحرکات کو دخل نہ ہو' لہٰذا شریعتِ اسلامی نے ایسے قریبی رشتوں کے مابین ہر قسم کی جنسی جاذبیت کی جڑ کاٹ دی ہے۔

(۳) چونکہ ایسے قریبی خونی رشتوں کے مابین قدرتی محبت و الفت ہوتی ہے لہٰذا شریعت کا مقصد محبت کے

۲۲۶۹ (زنا بالمحارم INCEST اور ممنوعہ نکاح)

اس دائرہ کو زنا بالمحارم کو حرام کر کے وسعت دینا ہے اور آدمی کو اس بات کی ترغیب دینا ہے کہ وہ ان مقدّس رشتوں کے علاوہ نکاح کے لئے کوئی اور رشتہ تلاش کرے۔ اس طرح ہر نکاح اُنس و محبت کے دائرے کو پھیلاتا ہے اور ایسی ترقی پذیر الفت و محبت کے اس جال میں نئے نئے لوگوں کو لاتا ہے جیسا کہ فرمایا:

وَجَعَلَ بَيْنَكُم مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً (الرُّوم : ۲۱)

''اُس نے تمہارے (یعنی میاں بیوی کے) درمیان محبت و ہمدردی پیدا کر دی۔'' (۳۰:۲۱)

(۴) آدمی اور مذکورہ بالا نسوانی رشتوں کے مابین محبت و الفت کے قدرتی جذبات کو ہمیشہ مضبوط تر رہنا چاہئے۔ اگر ان محرّمات سے نکاح کی اجازت ہوتی تو یہ حسد و رقابت، تشتّت و افتراق اور خاندانوں کی ابتری کا باعث بن جاتی جس میں الفت و ہمدردی نام کو نہ ہوتی اور ہمدردی اور الفت ہی تو باہمی چسپیدگی کے دوام و استقلال کا باعث بنتے ہیں۔

(۵) ان خونی رشتوں کے محرّمات سے نکاح میں ہونے والے بچے اغلباً ناقص الخلقت اور کمزور ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں اگر کسی خاندان کے افراد میں جسمانی یا دماغی نقص موجود ہوں تو وہ بیماریاں ایسے نکاح میں ہونے والے بچوں میں اور زیادہ نمایاں ہوں گی۔

(۶) عورت کو خاوند کے مقابل اپنے حقوق کے تحفظ اور اپنی امداد کے لئے کسی سہارے کی ضرورت ہوتی ہے بالخصوص اُس وقت جب میاں بیوی کے درمیان تعلقات کشیدہ ہو جائیں۔ اگر وہ عورتیں جو اُس کا دفاع کر سکتی ہیں، باہم رقیب بن جائیں تو اُس عورت کے حقوق کا تحفظ کیونکر ممکن ہوگا!!

(رضاعت کی تعریف): رَضاع یا رِضاع کا لفظ لغت کی رُو سے پستان کے چوسنے کو کہتے ہیں خواہ انسان کی چھاتی سے چوسا جائے یا کسی جانور وغیرہ سے۔ جہاں تک اس لفظ کے معنی کا تعلق ہے اس میں یہ شرط نہیں کہ پستان چوسنے والا بچہ ہی ہو لیکن اصطلاحِ شرع میں اس لفظ کے معنی کسی عورت کے دودھ کا ایسے بچے کے پیٹ میں جانا ہے جس کی عمر دو سال یعنی چوبیس ماہ سے زیادہ نہ ہو۔ پس اگر ایک بچے اور ایک بچی نے کسی جانور کا دودھ پیا تو وہ لڑکی اُس لڑکے پر حرام نہ ہوگی (یعنی دونوں کا باہم نکاح جائز ہوگا)۔ اس سے فرق نہیں پڑتا کہ دودھ پلانے والی (مُرضعہ) کا دودھ بچے کے منہ سے پستان کو چوس کر پیٹ میں پہنچے یا اُس کے حلق میں ڈال دیا جائے یا ناک کی راہ سے پیٹ میں پہنچایا جائے، غرض جس طرح بھی دودھ دو سال مذکورہ کے اندر بچے کے معدے میں پہنچ جائے تو اُس پر حرمت عائد ہوتی ہے۔ لیکن جس کی عمر دو سال سے زائد ہو اور اُس نے کسی عورت کا دودھ پی لیا تو اس کے اس پینے سے کچھ نہیں ہوتا۔ اس کا ثبوت اللہ تعالیٰ کا یہ ارشادِ پاک ہے:

وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ أَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ (البقرة : ۲۳۳)

''مائیں اپنے بچوں کو پورے دو سال تک دودھ پلائیں۔'' (۲ : ۲۳۳)

اس آیتِ کریمہ سے یہ ثابت ہوا کہ شرع کی رُو سے دودھ پلانے کی مدت دو سال ہے۔ پس اگر اس مدت کے ایک لحظہ بعد بھی دودھ پلایا تو اُسے رضاعت (دودھ پلانا) قرار نہ دیا جائے گا اور نہ اس سے حرمت عائد ہوگی۔ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشادِ گرامی ہے: لَا رَضَاعَ اِلَّا مَا کَانَ فِي الْحَوْلَيْنِ (البیہقی) یعنی دو سال کی عمر کے اندر اگر نہ ہو تو وہ رضاعت نہیں ہے۔" ("کتاب الفقہ"۔ عبدالرحمن الجزیری، ج ۴، ص ص ۴۶۳ تا ۴۶۶)

"اگر بالفرض پستان کے دودھ کو کسی عمل سے دہی یا بالائی وغیرہ بنا لیا جائے اور بچہ اُسے کھائے تو اُسے رضاعت قرار دیا جائے گا۔ اسی طرح اگر پانی وغیرہ کے ساتھ دودھ کو ملا لیا جائے اور دودھ کی صفت اُس میں باقی رہ جائے تو اُس سے بھی حرمت عائد ہو جائے گی لیکن اگر اس کی خصوصیات پانی میں پڑنے سے جاتی رہیں تو حرمت عائد نہ ہوگی۔ اگر دودھ حلق میں ڈال دیا اور بچے نے قے کر دی اور دودھ پیٹ میں نہیں پہنچا تو حرمت عائد نہ ہوگی۔ اس طرح اگر حقنہ کے ذریعے مقعد یا شرم گاہ کے راستے پیٹ میں دودھ پہنچایا گیا تب بھی حرمت عائد نہ ہوگی کیونکہ یہ دودھ پلانا نہیں ہے اور اس حالت میں اُسے غذا نہیں کہتے۔" (ایضاً ص ۴۸۴ ذیلی نوٹ)

(2) حُرمتِ رضاعت: مذکورہ بالا سات رشتے جو نسب سے حرام تھے، وہی رضاع (دودھ شریک) سے بھی حرام ہیں۔ نبی مکرّم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشادِ گرامی ہے: يَحْرُمُ مِنَ الرَّضَاعِ مَا يَحْرُمُ مِنَ النَّسَبِ (یعنی جو رشتے نسب (خاندان یا خون) کی وجہ سے حرام ہیں وہ سب دودھ پینے سے بھی حرام ہو جاتے ہیں۔)

(3) حُرمتِ مصاہرت: مصاہرت کا مصدر صِہر ہے بمعنی سُسر۔ حرمتِ مصاہرت کا معنی ہوگا وہ رشتے جو ازدواجی تعلق کی وجہ سے حرام ہو جاتے ہیں۔ ان میں سے بعض وہ ہیں جو ہمیشہ کے لئے حرام ہو جاتے ہیں اور بعض وہ ہیں جن کے ساتھ اُس وقت تک نکاح حرام ہے جب تک اس کی بیوی اس کے نکاح میں ہے۔

"پہلی قسم میں بیوی کی ماں (یعنی ساس) اور اس بیوی کی بیٹی شامل ہے جس سے صحبت کی جا چکی ہو لیکن اگر صحبت سے پہلے بیوی کو طلاق دے دی تو اس کی بیٹی سے نکاح درست ہوگا اور حقیقی بیٹوں کی بیویاں (نہ کہ منہ بولے بیٹوں کی بیویاں) بھی ہمیشہ کے لئے حرام ہو جاتی ہیں۔ یہی حکم پوتوں اور نواسوں کی بیویوں کا ہے۔" حقیقی بیٹوں کی قید اہلِ عرب کی اس غلط رسم کو مٹانے کے لئے بڑھائی گئی ہے کہ وہ جسے متبنّیٰ (لے پالک) بناتے، تو اُن کی بیویوں کے بیوہ یا مطلقہ ہونے کے بعد بھی ان سے نکاح کرنا حرام خیال کرتے۔" ("ضیاء القرآن"۔ پیر کرم شاہ الازہری، جلد اوّل، صفحہ ۳۳۳)

"دوسری قسم میں بیوی کی بہن، پھوپھی، خالہ، بھتیجی اور بھانجی ہیں۔ جب تک بیوی زندہ ہے یا نکاح میں ہے، اُس وقت تک ان سے نکاح درست نہیں اور اگر بیوی فوت ہو جائے یا اُسے طلاق دے دے تو پھر ان سے نکاح درست ہے۔" (ایضاً صفحہ ۳۳۲)

(4) دو بہنوں کو خواہ وہ حقیقی ہوں یا رضاعی ایک نکاح میں جمع کرنا بھی حرام ہے۔ اور نبی معظم ﷺ نے پھوپھی اور بھتیجی، خالہ اور بھانجی کا ایک عقد میں جمع کرنا ممنوع فرمایا ہے اور اس کی وجہ یہ بیان فرمائی کہ یہ رشتے پیار و محبت کے رشتے ہیں۔ اگر یہ ایک دوسرے کی سوکنیں بن جائیں تو محبت و اُنس کی جگہ حسد و عناد جو عام طور پر سوکنوں میں پایا جاتا ہے، رونما ہو جائے گا۔ تفسیر قرطبی اور ابن حبان میں نبی علیہ السلام کا ارشادِ گرامی درج ہے:

اِنَّكُمْ اِذَا فَعَلْتُمْ ذٰلِكَ قَطَعْتُمْ أَرْحَامَكُمْ

(اگر تم نے ایسا کرلیا تو تم نے اپنی رشتہ داریوں کو توڑ دیا)

نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشادِ گرامی ہے:

لَا تُنْكَحُ الْمَرْأَةُ عَلٰى عَمَّتِهَا وَلَا عَمَّةٌ عَلٰى بِنْتِ أَخِيهَا لَا الْكُبْرٰى عَلَى الصُّغْرٰى وَلَا الصُّغْرٰى عَلَى الْكُبْرٰى (ابو داؤد)

"کوئی عورت اپنی پھوپھی پر شادی نہ کرے اور نہ کوئی پھوپھی اپنے بھائی کی بیٹی (بھتیجی) پر کرے یعنی نہ بڑے رشتہ والی چھوٹے رشتے والی پر اور نہ چھوٹے رشتہ والی بڑے رشتہ والی پر شادی کرے۔"

(5) کسی شخص کی منکوحہ سے کوئی بھی دوسرا شخص نکاح نہیں کرسکتا جب تک وہ اس کے حبالۂ عقد میں ہے۔ وہ عورت کسی اور سے مندرجہ ذیل دو شرائط کے پائے جانے کی صورت میں نکاح کرسکتی ہے:

(۱) اُس کا نکاح یا تو خاوند کی وفات کی وجہ سے یا مطلّقہ ہونے کے باعث فسخ ہو گیا ہو۔

(۲) اُس نے حکمِ الٰہی کے تحت عدّت کا عرصہ گزار دیا ہے۔ حاملہ عورتوں کے لئے انتظار (عدت) کا یہ عرصہ بچے کی پیدائش سے ختم ہو جاتا ہے۔ بیوہ کے لئے اگر وہ حاملہ نہیں تو عدت چار ماہ دس دن ہے۔ اگر وہ مطلّقہ ہے اور معلوم نہیں کہ آیا وہ حاملہ ہے یا نہیں تو اس کی عدت تین حیض ہے (بحوالہ سورۃ البقرۃ: ۲۲۸) یہ عدت اُن عورتوں کے لئے ہے جنہیں حیض آتا ہو اور اگر انہیں حیض نہ آتے ہوں (یعنی وہ آئسہ ہوں) تو اُن کی عدت تین ماہ ہے (بحوالہ سورۃ البقرۃ: ۲۲۸ و سورۃ الطلاق: ۴)۔

<u>مشرکہ عورتوں سے نکاح</u>: اسلام بالخصوص نکاح کے معاملے میں بڑا ہی حساس ہے۔ وہ مسلمانوں کو کافر اور مشرک مَردوں اور کافر و مشرک عورتوں سے نکاح کرنے کی ممانعت کرتا ہے۔ سورۃ البقرۃ میں نکاح کا ضابطہ بیان کیا گیا ہے اور سورۃ النور میں نکاح کا معیار بیان کیا گیا ہے جو حسب ذیل ہیں:

(۱) وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ وَلَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّلَوْ أَعْجَبَتْكُمْ وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَّلَوْ أَعْجَبَكُمْ أُولٰٓئِكَ يَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ بِاِذْنِهٖ (البقرۃ: ۲۲۱)

"اور مشرک عورتوں کے ساتھ نکاح نہ کرو جب تک وہ ایمان نہ لے آئیں، مؤمنہ کنیز تک بہتر ہے (آزاد) مشرک عورت سے اگرچہ وہ تمہیں پسند ہو اور اپنی عورتوں کو (بھی) مشرکوں کے نکاح میں نہ دو

جب تک وہ ایمان نہ لے آئیں اور مومن غلام تک بہتر ہے مشرک (آزاد) سے اگر چہ وہ تمہیں پسند ہو۔ وہ لوگ دوزخ کی طرف بلاتے ہیں اور اللہ جنت و مغفرت کی طرف بلا رہا ہے۔'' (۲۲۱: ۲)

اِن آیات میں حکم ہوا کہ مسلمان مرد کو مشرکہ سے شادی نہیں کرنی چاہئے اور نہ ہی کسی مسلمان عورت کو مشرک مرد سے نکاح کرنا چاہئے کیونکہ دونوں نظام ہائے اعتقاد کے مابین نہ پاٹی جانے والی (Unbridgeable) خلیج حائل ہے۔ اسلام لوگوں کو جنت اور اللہ کی مغفرت کی طرف بلاتا ہے جبکہ شرک اور بت پرستی اُنہیں نارِ جہنم کو لے جاتے ہیں۔ مسلمان اللہ' اُس کے رسول اور یوم آخرت پر ایمان لاتا ہے جبکہ مشرکین غیر اللہ کو اللہ کے ساتھ ملاتے ہیں اور اُس کے رسولوں کا اور یومِ آخرت کا انکار کرتے ہیں۔ شادی کا مطلب ایک چھت کے نیچے پیار و اُنس کے ساتھ رہنا ہوتا ہے تو ایسے متضاد عقائد و اعمال کے لئے ایک ہی گھر میں پُر امن طور پر رہنا کیسے ممکن ہے؟

(۲) اَلْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ وَالْخَبِيْثُوْنَ لِلْخَبِيْثٰتِ وَالطَّيِّبٰتُ لِلطَّيِّبِيْنَ وَالطَّيِّبُوْنَ لِلطَّيِّبٰتِ أُولٰٓئِكَ مُبَرَّءُوْنَ مِمَّا يَقُوْلُوْنَ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ O (النور : ۲۶)

'' گندی عورتیں گندے مَردوں ہی کے لائق اور گندے مَرد گندی عورتوں ہی کے لائق ہوتے ہیں اور پاک دامن عورتیں پاکباز مَردوں کے لائق اور پاکباز مرد پاکدامن عورتوں ہی کے لائق ہوتے ہیں۔ یہ لوگ اس بات سے پاک ہیں جو یہ (منافق) بکتے پھرتے ہیں۔ ان کے لئے تو بخشش اور عزت کی روزی ہے۔''

کتابیہ (یہود و نصاریٰ) عورتوں سے نکاح: اسلام نے مسلمان مَردوں کے لئے یہود و نصاریٰ کی عورتوں سے نکاح کو جائز قرار دیا ہے کیونکہ وہ ''اہلِ کتاب'' ہیں (سورۃ المائدۃ : ۵)۔ اگر چہ ان لوگوں نے اپنی آسمانی کتابوں (تورات و انجیل) میں تحریف و تبدیلی کر دی ہے تاہم اُن کا دین الہیت پر مبنی ہے۔ اسلام نے ان اہلِ کتاب سے رویّہ کے معاملہ میں کچھ مستثنیات کو مدِّ نظر رکھا ہے اور فرمایا ہے:

وَطَعَامُ الَّذِيْنَ أُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ وَ الْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ أُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ إِذَا آتَيْتُمُوْهُنَّ أُجُوْرَهُنَّ مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ وَلَا مُتَّخِذِيْٓ أَخْدَانٍ (المائدۃ : ۵)

''اور جو لوگ اہلِ کتاب ہیں اُن کا کھانا تمہارے لئے جائز اور تمہارا کھانا اُن کے لئے جائز ہے اور (اسی طرح تمہارے لئے جائز ہیں) مسلمان پارسائیں اور اُن کی پارسائیں جنہیں تم سے قبل کتاب مل چکی ہے جب تم اُن کے مہر دے دو اور قیدِ نکاح میں لانے والے ہو نہ کہ (محض) مستی نکالنے والے اور نہ چوری چھپے آشنائی کرنے والے۔'' (۵ : ۵)

طَعَام سے مراد حلال جانور ہیں جو اہلِ کتاب کے ہاتھ کے ذبح کئے ہوئے ہوں۔ مطلق کھانا تو دوسرے غیر مسلموں کے ہاں کا بھی جائز ہے کچھ اہلِ کتاب کی تخصیص نہیں۔ مسلمان تذبذب میں تھے کہ معلوم نہیں کہ ہمارے لئے جائز

بھی ہے کہ نہیں کہ ہم اہلِ کتاب کو اپنے کھانے میں سے کھلا سکیں۔ یہاں یہ تصریح کر دی گئی ہے کہ انہیں کھلانا بے تکلف جائز ہے (تفسیر کبیر)۔ یہ صراحت اس لئے بھی ضروری تھی کہ نکاح کا بیان معاً بعد آ رہا ہے۔ ذبیحہ تو طرفین سے حلال ہے لیکن مناکحت کا قیاس اس پر درست نہ ہوگا۔ نکاح صرف اُن کی عورتوں سے مسلمان مرد کا جائز ہے' اُن کے مردسے مسلمان عورت کا نکاح جائز نہیں۔ مواکلت کی طرح مناکحت بھی انسان کی ایک طبعی خواہش ہے اس لئے دونوں کے احکام اگر اکٹھے لائے گئے ہوں تو یہ عین باہمی مناسبت کا تقاضا ہے۔ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ مِنَ الَّذِيْنَ أُوْتُوا الْكِتٰبَ۔ مسلمات اور کتابیات دونوں کے درمیان اصلاً قدرِ مشترک سلسلہ وحی ونبوت پر ایمان ہے۔ یہود اور نصرانیوں کے اعمال کیسے ہی فاسقانہ ہوں اور بعض عقائد کیسے ہی غالیانہ ہوں' بہرحال اصلاً وہ لوگ توحید ہی کے قائل ہیں اور سلسلہِ وحی ونبوت کے ماننے والے ہیں اور عقائد کے باب میں یہی دو عنوانات اہم ترین ہیں۔۔ البتہ یہ خیال رہے کہ ''نصرانیت'' موجودہ یورپی قوموں کی مسیحیت کے مرادف نہیں۔ کتابیوں کے ساتھ نکاح بالکل جائز ہے البتہ فقہاء نے مفسدوں پر نظر کر کے اور مصلحتِ شرعی کا لحاظ کر کے فتویٰ یہ دیا ہے کہ بلا ضرورت ایسے نکاحوں سے بچنا چاہئے بالخصوص جبکہ مسلمان برادری میں رشتے موجود ہوں۔'' (تفسیر ماجدی اردو' صفحہ ۲۳۸' نوٹ: ۳۱' ۳۲) نبی علیہ السلام نے فرمایا کہ اس عورت سے نکاح کرو جو دیندار ہو اور کثیرالولود (بہت زیادہ بچے جننے والی) ہو۔

ظاہر ہے کہ ایک مسلمان عورت قطع نظر اس کے کہ وہ کون ہے' مسلمان مرد کے لئے مناسب وموافق ہے بہ نسبت یہودن یا عیسائی عورت کے قطع نظر اس کی خصوصیات کے۔ اگر مسلمان مرد کو تھوڑا سا بھی اندیشہ ہو کہ اُس کی غیر مسلم بیوی اُس کے بچوں کے اعتقادات اور رویّوں پر اثر انداز ہو گی تو اس کے لئے احتیاط کرنا لازم ہوگا۔

اگر کسی ملک میں مسلمان اقلیت میں ہیں مثلاً وہ کسی غیر مسلم ملک میں مہاجرین کے طور پر رہ رہے ہیں تو اُن کے مردوں کو غیر مسلم عورتوں سے نکاح کرنے سے روکا گیا ہے کیونکہ مسلمان عورتوں کو غیر مسلم مَردوں کے ساتھ نکاح کرنے سے روکا گیا ہے تو مسلمان مَردوں کا غیر مسلم عورتوں سے نکاح کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ بہت سی مسلمان لڑکیاں بن بیاہی رہ جائیں گی۔ چونکہ یہ صورتِ حال مسلم سماج کے لئے ضرر رساں ہے تو اس اجازت پر عارضی طور پر پابندی لگانے سے اس ضرر سے بچا جا سکتا ہے۔

''مسلمان عورت کو غیر مسلم مرد سے نکاح کرنے کی ممانعت: مسلمان عورت کو غیر مسلم مرد سے نکاح کرنا حرام ہے قطع نظر اس کے کہ وہ مرد اہلِ کتاب میں سے ہے یا نہیں (سورۃُ البقرۃ: ۲۲۱)۔ سورۃ المُمتَحِنہ (۶۰) کی آیت دہم میں یہی حکم دوبارہ دیا گیا ہے:

فَإِنْ عَلِمْتُمُوْهُنَّ مُؤْمِنٰتٍ فَلَا تَرْجِعُوْهُنَّ إِلَى الْكُفَّارِ لَا هُنَّ حِلٌّ'' لَّهُمْ وَلَا هُمْ يَحِلُّوْنَ لَهُنَّ

''پس اگر وہ عورتیں تمہاری جانچ پڑتال میں مسلمان ثابت ہو جائیں تو انہیں کافروں کی طرف واپس مت کرو۔ وہ عورتیں اُن (کافروں) کے لئے نہ حلال ہیں اور نہ وہ (کافر) اُن کے لئے حلال ہیں۔''

اسی مذکور بالا آیت کی بنیاد پر اُمتِ مسلمہ کا اس ممانعت پر اجماع ہے۔اس طرح جبکہ مسلمان مرد کو نصرانی یا یہودی عورت سے نکاح کرنے کی اجازت ہے' تو مسلمان عورت کو عیسائی یا یہودی مرد سے نکاح کرنے کی اجازت نہیں ہے جس کی کئی ٹھوس وجوہات ہیں: ایک تو یہ کہ مرد گھر کا سربراہ ہوتا ہے جو عائلی ضروریات کا کفیل اور اپنی بیوی کا ذمہ دار ہوتا ہے اور جبکہ اسلام مسلمان مرد کی عیسائی یا یہودی بیوی کو آزادیِ عقیدہ اور آزادیِ عمل کی ضمانت دیتا ہے اور اُس کے حقوق کی پاسداری کرتا ہے جبکہ یہودیت یا عیسائیت غیر عقیدے کی عورت کے حقوق کو کوئی تحفظ فراہم نہیں کرتے تو ایسی صورتِ حال میں اسلام کیسے اپنی بیٹیوں کے مستقبل کو اُن لوگوں کے ہاتھوں میں دے کر داؤ پر لگا سکتا ہے جن کے ہاں اپنے مذہب کی کوئی تکریم نہیں اور نہ ہی اُن کے ہاں دوسروں کے حقوق کے تحفظ تک کا کوئی تصوّر ہے؟''

''مختلف مذاہب و نظریات کے حامل مرد و زن کے درمیان شادی کی بنیاد اس بات پر ہے کہ مرد اپنی بیوی کے اعتقادات کی کس قدر تعظیم و تکریم کرتا ہے جس کے بغیر اُن کے درمیان اچھا تعلق قائم نہیں ہو سکتا۔اب مسلمان کا یہ ایمان ہے کہ یہودیت اور عیسائیت دونوں مذاہب الہامی ہیں اگرچہ بعد میں تبدیلیوں اور ترامیم کے ذریعے اُن کی شکل بگاڑ دی گئی۔اُس کا اس بات پر بھی ایمان ہے کہ موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام دونوں ہی اللہ کے اولوالعزم رسول ہیں۔اس طرح مسلمان مرد کی یہودی یا عیسائی بیوی ایسے شخص کی حفاظت میں رہتی ہے جس کے دل میں اپنی بیوی کے اعتقاد کے مبادیات' اُس کی آسمانی کتاب (تورات یا انجیل) اور اس کے رسولوں کا احترام ہے جبکہ اس کے برعکس یہودی اور عیسائی نہ تو اسلام کو الہامی مذہب مانتا ہے اور نہ ہی قرآن کو کلامِ الٰہی اور صاحبِ قرآن ﷺ کو اللہ کا رسول مانتا ہے۔تو پھر ایک مسلمان عورت ایسے شخص کے ساتھ کیسے رہ سکتی ہے۔اس صورت میں مسلمان عورت کے لئے اپنے عقیدہ کی تکریم کو بحال رکھنا ناممکن ہوگا اور اُس کے لئے اپنی عبادات کے فریضے کو صحیح طور پر ادا کرنا بھی ممکن نہ ہوگا کیونکہ اُس کا (غیر مذہب کا) شوہر قدم قدم پر عبادات کی تکمیل میں رکاوٹ بنے گا۔''

''اس بیان سے یہ معلوم کرنا آسان ہے کہ اسلام نے مسلمان مرد کو مشرکہ عورت کے ساتھ شادی کرنے سے روکا ہے کیونکہ اسلام ''شرک'' کے سراسر خلاف ہے۔لہٰذا میاں بیوی میں سے ہر ایک کے لئے مختلف اعتقادات و نظریات کا حامل ہونے کے حوالے سے ایک ہی چھت تلے اُنس و محبت کے ساتھ رہنا ناممکن ہوگا۔'' (''الحلال والحرام فی الاسلام''۔۔۔یوسف القرضاوی' صفحات ۱۷۷ تا ۱۸۶۔انگریزی ترجمہ)

<u>زانیہ عورت کے ساتھ نکاح</u>: اس سے مراد پیشہ ور عصمت فروش عورت ہے۔روایت ہے کہ مرثد بن ابو مرثد نے نبی معظم ﷺ سے عَنَق نامی ایک پیشہ ور عورت سے نکاح کرنے کی اجازت چاہی جس کے ساتھ زمانہ جاہلیت میں اُس کا جنسی تعلق تھا۔نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا یہاں تک کہ یہ آیت نازل ہوئی:

اَلزَّانِیْ لَا یَنْکِحُ اِلَّا زَانِیَۃً اَوْمُشْرِکَۃً وَالزَّانِیَۃُ لَا یَنْکِحُھَا اِلَّا زَانٍ اَوْمُشْرِکٌ وَحُرِّمَ ذٰلِکَ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ O (النور: ۳)

''زنا کار مرد نکاح بھی کسی کے ساتھ نہیں کرتا سوائے زنا کار عورت یا مشرکہ عورت کے اور زنا کار عورت کے ساتھ بھی کوئی نکاح نہیں کرتا سوائے زانی یا مشرک کے اور اہلِ ایمان پر یہ حرام کر دیا گیا ہے۔'' (۲۴:۳)

(زنا بالمحارم INCESTاور ممنوعہ نکاح)

نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس آیت کی مرثد کے آگے تلاوت فرمائی اور اُسے اُس عورت سے نکاح کرنے سے روک دیا۔

مذکورہ آیت ۳ کا مطلب یہ ہے کہ مشرکہ اور زانیہ دونوں سے نکاح کرنا گناہ کا کام ہے۔ مشرکہ سے جوازِ نکاح کی تو کوئی صورت ہی نہیں۔ زانیہ سے نکاح قانونی لحاظ سے نافذ ہو جائے گا لیکن عنداللہ معصیت تو بہرحال رہے گی۔ جاہلی عرب میں یہ دستور تھا کہ عورت ایک طرف کسی کے نکاح میں بھی ہے اور دوسری طرف شوہر کے علم میں بلکہ اس کی اجازت سے زناکاری میں بھی مبتلا ہے۔ آیتِ قرآنی کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ ایسی بے عصمت عورت کی طرف کوئی رغبت کر بھی کیسے کرسکتا ہے جب تک کہ وہ خود بھی ایسی ہی مسخ شدہ ذہنیت کا شکار نہ ہو۔ (ماجدی)

اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے مسلمانوں کو پاکدامن مسلمان عورتوں یا اہلِ کتاب کی پاکدامن عورتوں سے نکاح کرنے کی اجازت دی ہے۔ اسی طرح اُس نے مَردوں کے لئے شادی کو اس شرط پر جائز قرار دیا ہے کہ وہ عورتوں کو شریفانہ طور پر قیدِ نکاح میں لانے والے ہوں نہ کہ مستی نکالنے والے (سورۃ النساء: ۲۴) یعنی مقصود یہ ہے کہ زوجین نکاح کے ذریعہ سے مستقل طور پر پاک ومنزّہ، باعفت زندگی بسر کریں گے۔ اگر کوئی اس حکمِ الٰہی کو ماننے کے لئے تیار نہیں اور نہ ہی وہ اسے ضروری سمجھتا ہے تو وہ ''مشرک'' ہے اور مشرک کے سوا کوئی بھی اس سے نکاح کرنے کے لئے تیار نہ ہوگا۔ اگر کوئی اس حکمِ الٰہی کو لازم مانتے ہوئے کسی زانیہ سے نکاح کرتا ہے جس کی اللہ تعالیٰ نے ممانعت کردی ہے تو وہ خود زانی ہے۔

سورۃ النور کی مذکورہ آیت ۳ اُس آیت ۲ کے بعد آتی ہے جس میں زانیوں کے لئے کوڑوں کی سزا مقرر کی گئی ہے اور فرمایا گیا ہے:

اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ (النور: ۲)

''زناکار مرد اور زناکار عورت (دونوں کا حکم یہ ہے کہ) ان میں سے ہر ایک کو سو دُرّے مارو۔''

آیت ۲ میں بیان کردہ یہ سزا جسمانی سزا ہے جبکہ آیت ۳ میں بیان کردہ سزا شائستہ (Civil) سزا ہے کیونکہ زانیوں کو پاکدامن عورتوں سے نکاح کرنے سے محروم کرنا ایسے ہی ہے جیسے کسی کو کسی جرم کی پاداش میں کسی ملک کی باشندگی، اس کی قومیت یا کسی اور شہری حق سے محروم کرنا ہے۔

حافظ ابن القیم سورۃ النور کی مندرجہ بالا آیت کی وضاحت میں لکھتے ہیں:۔

''قرآنِ حکیم کا یہ واضح حکم انسانی فطرت اور معقولیت کے عین مطابق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے مسلمان بندے کو اپنی منچلی بیوی کا دیوّث بننے سے روکا ہے کیونکہ اُس نے دیوّثیت سے نفرت انسان کی جبلّت اور

فطرت میں رکھ دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب لوگ کسی کو انتہائی حقارت سے برا بھلا کہتے ہیں تو وہ اُسے "دیوث خاوند" کا بُرا لقب دیتے ہیں۔"

"اس ممانعت پر مزید روشنی اُس زانیہ عورت کے اپنے خاونداور سماج کے خلاف جرم کے مدِّ نظر ڈالی گئی ہے۔ وہ اپنے خاوند کے بستر کے تقدّس کو پامال کرتی ہے اور حسب ونسب کو اس برے کام کے ذریعے بگاڑ دیتی ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے سماج کو اخلاقی بلندی اور معتدل ومتوازن طور پر چلانے کے لئے اہتمام کیا ہے اور جسے وہ انسانیت پر اپنا انعام قرار دیتا ہے۔ زنا ولدیت کو خلط ملط کر دیتا ہے اور ولدیت میں شک وشبہ کا باعث بنتا ہے۔ اس طرح یہ شریعتِ اسلامی کا حسن و جمال ہی ہے کہ وہ ایک فاحشہ عورت سے نکاح کو ممنوع قرار دیتا ہے جب تک وہ اپنے کئے پر نادم نہ ہو اور یہ یقین نہ ہو جائے کہ وہ حاملہ نہیں ہے۔"

"علاوہ ازیں بدکار عورت ذلیل ورسوائے زمانہ ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ شادی میاں بیوی کے مابین اُنس ومحبت اور رحم دلی کا ذریعہ ہونا چاہئے تو پھر ایک ذلیل اور رسوائے زمانہ عورت ایک نیک آدمی کا مرکزِ محبت کیسے ہوسکتی ہے کیونکہ رفیقانِ حیات میں اگر باہمی محبت اور افہام وتفہیم کو پروان چڑھانا ہے تو ان کے خیالات، رویّوں اور کردار میں باہمی موافقت ہونی چاہئے۔ چونکہ ذلالت اور نیکی، فطرتی اور اخلاقی لحاظ سے ایک دوسرے کی ضد ہیں تو ایسے میاں بیوی کے درمیان ہمدردی، موانست اور الفت و محبت قائم ہو ہی نہیں ہوسکتے۔ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے ایسی ہی صورت میں سچ فرمایا ہے:

اَلْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ وَالْخَبِيْثُوْنَ لِلْخَبِيْثٰتِ وَالطَّيِّبٰتُ لِلطَّيِّبِيْنَ وَالطَّيِّبُوْنَ لِلطَّيِّبٰتِ أُولٰٓئِكَ مُبَرَّءُوْنَ مِمَّا يَقُوْلُوْنَ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ○ (النور: ۲۶)

"گندی عورتیں گندے مَردوں ہی کے لائق اور گندے مَرد گندی عَورتوں ہی کے لائق ہوتے ہیں اور پاک دامن عورتیں پاکباز مَردوں کے لائق اور پاکباز مرد پاکدامن عورتوں ہی کے لائق ہوتے ہیں۔ یہ لوگ اس بات سے پاک ہیں جو یہ (منافق) بکتے پھرتے ہیں۔ ان کے لئے تو بخشش اور عزت کی روزی ہے۔"

"<u>عارضی نکاح (مُتعہ)</u>: اسلام میں نکاح ایک مضبوط بندھن اور ایک مضبوط عہد و پیان ہے جس کی بنیاد زوجین میں سے ہر ایک کے اس عزم صمیم پر ہے کہ وہ مستقل طور پر ایک دوسرے کے جیون ساتھی بن کر رہیں گے تاکہ وہ آرام وسکون، الفت ومحبت اور باہمی ہمدردی سے مستفید ہوں اور اس کے ساتھ ساتھ بحکمِ الٰہی نوعِ انسانی کی افزائش اور اس کے تسلسل کا سماجی مقصد حاصل کریں جیسا کہ قرآنِ حکیم فرماتا ہے:

وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجًا وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنْ أَزْوَاجِكُمْ بَنِيْنَ وَحَفَدَةً وَّرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ أَفَبِالْبَاطِلِ يُؤْمِنُوْنَ وَبِنِعْمَتِ اللّٰهِ هُمْ يَكْفُرُوْنَ ○ (النحل: ۷۲)

"اور اللہ نے تمہی میں سے تمہارے لئے بیویاں بنائیں اور تمہارے لئے تمہاری بیویوں سے بیٹے اور پوتے پیدا کئے اور تمہیں کھانے کو نفیس چیزیں دیں۔ تو کیا پھر بھی یہ لوگ باطل پر ایمان رکھیں گے اور اللہ کی نعمتوں کی ناشکری کرتے رہیں گے؟" (۱۶: ۷۲)

آیت کے آخری حصے میں نکاح اور اِزدواج کو اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی نسل کو رب تعالیٰ کی نعمت کہا گیا ہے جس پر شکر ادا کیا جانا چاہئے۔ اس کے ساتھ ساتھ دوسرے تمام غیر اسلامی نظریات (مثلاً برتھ کنٹرول اور تحدید نسل) کو باطل قرار دے کر اُن کی پیروی کرنے پر بیزاری کا اظہار کیا گیا ہے۔

اب عارضی شادی یعنی متعہ میں جو فریقین کے درمیان کچھ رقم کے بدلے میں ایک مخصوص مدت کا معاہدہ ہوتا ہے' نکاح کے درج بالا مقاصد حاصل نہیں کئے جا سکتے۔ جبکہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اسلامی قانون سازی کی تکمیل سے پہلے سفروں اور عسکری مہمات کے دوران عارضی نکاح (متعہ) کی اجازت مرحمت فرمائی تھی تو بعد میں آپ نے اسے ہمیشہ کے لئے حرام بھی قرار دے دیا تھا۔

ابتدا میں اس اجازت کی وجہ یہ تھی کہ مسلمان دَورِ جاہلیت سے اسلام کی طرف آ رہے تھے اور قبل از اسلام کے عربوں میں زنا کاری عام اور دُور دُور تک پھیلی ہوئی تھی۔ اسلام کی آمد پر جب مسلمانوں کو فوجی مہمات پر جانے کی ضرورت پڑی تو اپنی بیویوں سے طول طویل عرصے تک دُور رہنے کی وجہ سے اُن پر جنسی دباؤ پڑا۔ مسلمانوں میں کچھ کے ایمان مضبوط تھے اور کچھ ایمان کے کمزور تھے۔ ایمان کے کمزور لوگوں کو خوف ہوا کہ کہیں وہ زنا کے مرتکب نہ ہو جائیں جو کہ ایک قبیح اور گھناؤنا گناہ ہے۔ اس کے برعکس مضبوط ایمان والے اپنے آپ کو خصّی کرانے پر تیار ہو گئے جیسا کہ عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

> ''ہم رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ ایک مہم پر تھے اور ہمارے ساتھ ہماری بیویاں نہیں تھیں لہٰذا ہم نے نبی ﷺ سے دریافت کیا کہ کیا ہم خصّی نہ ہو جائیں؟ آپ نے ایسا ہونے سے ہمیں منع فرمایا اور ہمیں عورت سے ایک مخصوص مدت کے لئے نکاح کرنے کی اجازت دی جس میں اُسے ایک پوشاک بطور مہر دی جائے۔'' (صحیح بخاری' صحیح مسلم)

''اس طرح عارضی نکاح نے اُس مشکل کا حل فراہم کر دیا جس کا شکار مضبوط اور کمزور ایمان والے دونوں تھے۔ یہ اُس مکمل ازدواجی زندگی کے حتمی جواز کی طرف بھی ایک قدم تھا جس میں دوام واستقلال' پاکیزگیِ کردار' تولید وتناسل' محبت' ہمدردی' اور ازدواجی بندھنوں کے سبب تعلقات کے دائرے کو وسیع کرنے کے مقاصد کا حصول تھا۔''

''ہمیں معلوم ہونا چاہئے کہ منشیات اور سود کو ممنوع کرنے میں قرآنِ حکیم نے تدریجی عمل کو اختیار کیا کیونکہ یہ دونوں برائیاں دُور دُور تک پھیلی ہوئی تھیں اور جاہلیت کے سماج میں بہت گہری گڑ چکی تھیں۔ اسی طرح پیغمبر علیہ السلام نے جنس کے معاملے میں تدریجی عمل کو اختیار کیا کہ اوّلاً تو آپ نے زنا اور بدکاری کو روکنے کے لئے متعہ کی اجازت دی اور شادی کے مستقل تعلق کو بھی ساتھ ساتھ قائم رکھا۔ بعد میں آپ نے متعہ کو قطعاً حرام قرار دے دیا جیسا کہ حضرت علی کرّم اللہ وجہہٗ اور دوسرے صحابہ سے مروی ہے۔ امام مسلم نے اپنی صحیح مسلم میں روایت بیان کی ہے اور کہا ہے کہ فتحِ مکّہ کے موقع پر الجہانی نامی ایک صحابی آپ ﷺ کے ساتھ تھے اور پیغمبر علیہ السلام نے کچھ مسلمانوں کو متعہ (عارضی نکاح) کی اجازت دی تھی۔ الجہانی کہتے ہیں کہ مکہ سے روانگی سے قبل آپ نے اسے ممنوع قرار دے دیا تھا۔

ایک اور حدیث میں نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے متعہ کو قیامت تک کے لئے حرام کر دیا ہے۔

''رہا یہ سوال کہ کیا متعہ زنا بالمحارم کی طرح قطعاً حرام ہے یا اُس کی حرمت اس طرح ہے جیسے خنزیر اور مردار کا کھانا حرام ہے جس کا کھانا اضطراری حالت میں ضرورت بھی بن جاتا ہے جس میں اس کے کھانے کی اجازت ہے۔ اور متعہ کی سہولت نہ ملنے کے باعث زنا جیسے گھناؤنے گناہ میں ملوث ہونے کا خطرہ ہے؟''

''جمہور صحابہ کرام کا یہ نظریہ ہے کہ اسلامی قانون سازی کی تکمیل کے بعد عارضی شادی (متعہ) کو بالکل حرام کر دیا گیا۔ تاہم سیّدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا نظریہ اس سے مختلف ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ضرورت کے تحت متعہ کی اجازت ہے کہ ایک آدمی نے آپ سے عورتوں کے ساتھ عارضی شادی کرنے کی بابت پوچھا تو آپ نے اُسے اجازت دے دی۔ بعد میں جب ابن عباس رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ لوگ غیر محتاط ہو گئے ہیں اور وہ ضرورت کے بغیر ہی عارضی شادیاں کرنے لگے ہیں تو آپ نے اپنا نظریہ بدل لیا اور متعہ کی حرمت پر اصرار کیا۔'' (صحیح مسلم؛ ''زاد المعاد'' لحافظ ابن القیم' جلد ۴' صفحہ ۷ بحوالہ یوسف القرضاوی صفحات ۱۸۶ تا ۱۹۰)

<u>جماع کرنے کی ممنوع جگہیں</u> : جنسی تعلق کی بابت یہ آیت نازل ہوئی :

نِسَآءُکُمْ حَرْثٌ'' لَّکُمْ فَأْتُوْا حَرْثَکُمْ أَنّٰی شِئْتُمْ وَقَدِّمُوْا لِأَنفُسِکُمْ وَاتَّقُوااللّٰہَ وَاعْلَمُوْا أَنَّکُمْ مُّلٰقُوْہُ وَبَشِّرِالْمُؤْمِنِیْنَ O (البقرۃ : ۲۲۳)

''تمہاری بیویاں تمہاری کھیتی ہیں' سو تم اپنے کھیت میں جس طرح بھی چاہو آؤ اور اپنے حق میں آئندہ کے لئے کچھ کرتے رہو اور اللہ سے ڈرتے رہو اور یقین رکھو کہ تمہیں اللہ سے ملنا ہے اور آپ ایمان والوں کو خوشخبری سنا دیجئے۔'' (۲۲۳ : ۲)

شاہ ولی اللہ محدّث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ اس آیت کے شان نزول اور اس کی اہمیت کی بابت رقم طراز ہیں :

''یہود نے کسی الٰہی سند کے بغیر عورت کے ساتھ مجامعت پر پابندی لگا دی تھی۔ انصارِ مدینہ نے اُن کے دوست ہونے کی وجہ سے اُن کے طریق پر چلنا شروع کیا اور یہ کہنا شروع کیا کہ اگر آدمی عورت کی پشت کی جانب سے اُس کی فرج میں جماع کرے تو بچہ بھینگا پیدا ہوگا۔ اس موقع پر آیت فَأْتُوْا حَرْثَکُمْ أَنّٰی شِئْتُمْ (سو تم اپنے کھیت میں جس طرح بھی چاہو آؤ) نازل ہوئی یعنی اس بات کی کوئی حقیقت نہیں کہ آیا خاوند اپنی بیوی کے اوپر ہے یا اُس کی پشت پر ہے جب تک کہ مجامعت فرج میں ہے اور اسی کا نام کھیتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسی باتوں کا دینی یا سماجی پالیسی کے ساتھ کوئی تعلق نہیں بلکہ اُن کا تعلق ذاتی ذوق سے ہے۔ ایسی کہاوتیں یہود کی خرافات ولغویات ہیں اور اللہ تعالیٰ نے اُنہیں مسترد کر دیا۔'' (حُجَّةُ اللّٰہِ البالِغَة' جلد دوم' صفحہ ۱۳۴ بحوالہ یوسف القرضاوی' صفحہ ۱۹۶)

''جنسی مجامعت کے مختلف طریقے اور انداز بیان کرنا مذہب کا کام نہیں۔ تاہم ایک مسلمان جسے اپنی بیوی کے ساتھ تعلق کے معاملہ میں اللہ کا خوف ہے اور اس کا ایمانِ کامل ہے کہ اُسے بالآخر اللہ کے حضور اپنے ہر عمل کا جوابدہ ہونا ہے' بیوی کے مقعد میں جماع کرنے سے گریز کرتا ہے کیونکہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد پاک ہے:
''بیوی کے مقعد میں جماع کرنے سے گریز کرو۔'' (ترمذی' ابن ماجہ' نسائی' احمد)

ایک اور موقع پر آپ ﷺ نے اسے چھوٹی قسم کی اغلام بازی قرار دیا۔ (احمد' نسائی)

ایک دن عمر فاروق رضی اللہ عنہ دربارِ نبوی میں یہ فریاد کرتے ہوتے آئے: ''اے اللہ کے رسول! میں تو لُٹ گیا!'' نبی علیہ السلام نے وجہ پوچھی تو اُنہوں نے جواب دیا کہ گزشتہ شب میں نے اپنی بیوی کو اوندھا کیا جس سے میرا مطلب اُن کی پشت کی جانب سے اُن کی فرج میں جماع کرنا تھا۔ اس پر پیغمبر علیہ السلام نے اُن سے کچھ نہیں کہا یہاں تک کہ مندرجہ بالا آیت ۲۲۳ نازل ہوئی۔ اس کے بعد نبی علیہ السلام نے اُنہیں بتایا:
''سامنے کی جانب سے یا پشت کی جانب سے جماع کرو لیکن مقعد میں کرنے اور ایامِ حیض میں جماع کرنے سے گریز کرو۔'' (احمد' ترمذی)

<u>حائضہ عورت سے جماع کرنے کی ممانعت</u>: یہودیوں کا حیض والی عورتوں سے رویہ غیر معقول تھا۔ وہ ایسی عورت کے ساتھ بیٹھنے اور کھانے پینے تک کے تعلق کو ختم کردیتے تھے۔ حیض کے دوران اُس کے ہاتھوں کا پکایا ہوا کھانا پلید اور گندا سمجھا جاتا تھا۔ اُن کے نزدیک عورت اُن دنوں میں پلیدی کا مجسمہ ہوتی ہے۔ ملحدین (اللہ کی ہستی کے منکرین) کا بھی اِن باتوں میں یہودیوں کا سا رویہ تھا۔ زمانہِ حیض کے دوران عیسائی' عورت کے ساتھ جماع کرنے سے نہیں رکتے تھے۔ اس طرح عورت اِن تینوں طبقات کے ہاتھوں مصیبت کا شکار تھی۔

معتدل مذہب ہونے کے لحاظ سے اسلام نے اِن انتہا پسند عادات کا خاتمہ کردیا۔ اسلام نے حیض کے زمانہ میں اُس سے جماع کرنے کی ممانعت اس (معقول) وجہ سے کردی کہ وہ اُن دنوں کمزور ہوتی ہے' چڑچڑی ہو جاتی ہے اور اُسے اُن دنوں کوئی جنسی خواہش نہیں ہوتی۔ تاہم خاوند کو اُن دنوں بیوی کی مرضی کے مطابق اُس کے ساتھ بیٹھنے' ہم کلام ہونے اور ایک ساتھ ہو کر کھانے پینے کی اجازت ہے۔ قرآن نے فرمایا:
وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ قُلْ هُوَ أَذًى فَاعْتَزِلُوا النِّسَاءَ فِي الْمَحِيْضِ وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ (البقرة : ۲۲۲)
''(اے نبی!) لوگ آپ سے حیض کا حکم دریافت کرتے ہیں۔ فرما دیجئے کہ وہ ایک (طرح کی) گندگی ہے پس تم حیض کے دوران عورتوں کو چھوڑے رہو اور جب تک وہ پاک نہ ہو جائیں اُن سے قربت نہ کرو۔''

<u>ایّامِ حیض میں جماع سے ممانعت کی بابت چند ماہرین کی آراء</u>: ملاحظہ ہو صفحہ ۱۳۹۵ جلد سوم (انسائیکلو پیڈیا ہٰذا) ''تحریکِ آزادیِ نسواں (FEMINISM)'' کے عنوان کے تحت۔

(۸۷) میراث (INHERITANCE)

علم المیراث: یہ وہ علم ہے جس سے اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ حصوں کے مطابق ترکہ کی تقسیم اور اُس کے مستحقین معلوم ہوتے ہیں۔ اسے ''علم الفرائض'' بھی کہتے ہیں جو اپنی ریاضیاتی پیچیدگی کے باعث بجا طور پر مشہور و معروف ہے۔

علم میراث کی اہمیت: علمِ میراث کی اہمیت کا اندازہ ان ارشاداتِ نبوی سے ہوسکتا ہے:

(۱) ''علم الفرائض خود بھی سیکھو اور دوسروں کو بھی سکھاؤ کیونکہ وہ منفعت بخش علم کا نصف حصّہ ہے۔''
(سنن بیہقی، جلد ششم، صفحہ ۲۰۸)

(۲) ''قرآن مجید خود بھی سیکھو اور دوسروں کو بھی سکھاؤ۔ علم الفرائض خود بھی سیکھو اور دوسروں کو بھی سکھاؤ اس لئے کہ میں دنیا سے رحلت کر جاؤں گا اور علم اٹھا لیا جائے گا اور ایک وقت ایسا آئے گا کہ دو آدمی میراث کے کسی مسئلہ کے بارے میں آپس میں اختلاف کریں گے مگر اُنہیں صحیح مسئلہ بتانے والا کوئی نہیں ہوگا۔'' (الدارمی ۱/۳۷؛ مستدرک للحاکم ۴/۳۳۳؛ الدار قطنی ۴/۱۸)

''علم الفرائض کی اہمیت اس بات سے بھی واضح ہو جاتی ہے کہ میراث کے اکثر و بیشتر احکام اور ہر وارث کے حصّے خود قرآن مجید نے پوری تفصیل کے ساتھ بیان کئے ہیں۔ اس کے احکام بیان کرنے کی ذمہ داری کسی انسان پر نہیں ڈالی۔ میراث کے بہت تھوڑے احکام ایسے ہیں جو سنتِ نبوی ﷺ یا اجماعِ امت سے ثابت ہیں۔ بہر حال احکامِ وراثت ملکیتِ مال کا ایک اہم حصّہ ہیں جبکہ فرد و جماعت کے حوالے سے مال کو شہ رگ کی حیثیت حاصل ہے جس سے زندگی کا نظام قائم ہے۔ اس بناء پر اس کے حصول کے ایک اہم ذریعہ کے احکام کو پوری شرح و بسط کے ساتھ بیان کرنا ناگزیر تھا تاکہ اس طرح اس حوالے سے پیدا ہونے والے تنازعات کا بھی سدِّ باب ہو جائے گا۔''

اسلامی قانونِ میراث کے اصول: ''اسلام نے صحت مند معاشرہ کو معرضِ وجود میں لانے کے لئے کنبہ کو بڑی اہمیت دی ہے اور اس کے افراد کے مفاد کو یوں ایک دوسرے سے وابستہ کر دیا ہے کہ محبت و قرابت کا باہمی رشتہ کبھی ٹوٹنے نہ پائے۔ اس کے لئے جو وسائل اختیار کئے ہیں، اُنہی میں سے ایک نظامِ میراث ہے۔ زندگی میں اگر کنبہ کا کوئی فرد غربت و اِفلاس کا شکار ہو جائے تو دوسرے افراد پر اس کے نفقہ کو فرض قرار دیا۔ اسی طرح موت کے بعد متوفّی کے قریبی رشتہ داروں میں اس کی جائداد کو تقسیم کرنے کا حکم دیا تاکہ زندگی اور موت میں کنبہ کا مفادیوں باہم پیوستہ رہے کہ جدائی کا خیال ہی اُن میں راہ نہ پا سکے۔ اسلامی نظامِ میراث کے اصول حسب ذیل ہیں:

(۱) ''کنبہ کے اتحاد کو برقرار رکھنے کے لئے نظامِ وراثت میں قرابت کا اصول پیشِ نظر رکھا گیا۔ میراث میں حصّہ کے ملنے یا نہ ملنے اور حصّہ کے کم یا زیادہ ہونے میں رشتہ کی نزدیکی اور دُوری کو بہت بڑا دخل ہے۔''

(۲) ''دوسرا اُصول ضرورت ہے یعنی قریبی رشتہ داروں میں حصّہ کی کمی بیشی کا مدار ضرورت کو قرار دیا۔ جتنی کسی کی ضرورت زیادہ اور ذمّہ داریاں کثیر ہوں گی' اُسی لحاظ سے اُس کا حصّہ مقرر کیا جائے گا۔ مثلاً متوفّی کے والدین اور اس کی اولاد کی قرابت بالکل مساوی نوعیت کی ہے لیکن اولاد جو زندگی کے سفر کا اب آغاز کر رہی ہے' اُس کی ضروریات والدین کی ضروریات سے کہیں زیادہ ہوتی ہیں جو اس طویل سفر کی آخری منزل میں قدم رکھ چکے ہیں نیز والدین کے پاس تو زندگی بھر کا کچھ نہ کچھ اندوختہ ہوتا ہی ہے اور اولاد بالکل خالی ہاتھ ہے۔ یہی فرق لڑکی اور لڑکے میں ہے۔ لڑکی پر کسی قسم کی ذمّہ داری نہیں۔ شادی سے پہلے اُس کے والدین اُس کی تمام ضروریات کے کفیل ہوتے ہیں اور شادی کے بعد اُس کی رہائش' لباس' خور و نوش کی تمام تر ذمّہ داری اُس کے خاوند پر ہوتی ہے۔ اس کی اولاد کی تعلیم و تربیت کے جملہ مصارف بھی اُس کے خاوند کے ذمّہ ہوتے ہیں۔ مزید برآں عملی زندگی کی سرگرمیاں جس سرمایہ کی محتاج ہیں' اُس کا مہیا کرنا بھی خاوند کی ذمّہ داری ہے۔ یہ حقائق ہیں جن کے پیشِ نظر اسلام نے والدین اور اولاد' عورت اور مرد کے حصّوں میں فرق کیا ہے اور یہ فرق ہی عین عدل ہے۔ ان امتیازات کی موجودگی میں اُن کے حصّوں کو مساوی رکھنا مساوات تو ہوگی لیکن کھُلی اور ظالمانہ ہوگی اور اسلام صرف اُس مساوات کا علمبردار ہے جو عدل و انصاف پر مبنی ہو۔''

(۳) ''تیسرا اُصول تقسیمِ دولت کا ہے۔ اسلام چاہتا ہے کہ دولت سمٹ کر چند ہاتھوں میں جمع نہ ہو جائے (سورۃ الحشر: ۷) اور وراثت کی تقسیم میں بھی اس اصول کو ملحوظ رکھا۔ اس لئے صرف بڑے لڑکے یا صرف لڑکوں کو ہی وارث تسلیم نہیں کیا بلکہ تمام اولاد لڑکے اور لڑکیاں اور ان کے علاوہ کئی اور رشتہ داروں کو وارث قرار دیا تا کہ زیادہ سے زیادہ افراد میں یہ دولت تقسیم ہو۔ قرابت' ضرورت اور تقسیمِ دولت کے یہ وہ تین اصول ہیں جن پر اسلام کا یہ بے نظیر نظامِ وراثت قائم ہے۔'' (''ضیاء القرآن''۔۔ جسٹس کرم شاہ الازہری' جلد اوّل' صفحات ۳۲۲' ۳۲۳)

اسلامی نظامِ میراث کی بابت چند مستشرقین کی آراء: (۱) این جے کولسن نے اسلامی نظامِ میراث کی اہمیت کو بڑے صحیح طور پر یوں بیان کیا ہے:۔

''وہ انتہائی تعظیم و تکریم جو اس قانونی علم کو مسلمانوں میں حاصل ہے' بالخصوص اس کی مذہبی اہمیت کی رہینِ منت ہے۔ اسلامی قانون میں صحیح علم وحیِ الٰہی سے آتا ہے اور محمد ﷺ کے اس ارشاد سے جس میں آپ نے فرمایا کہ قوانینِ میراث علمِ صحیح کا نصف حصّہ ہیں۔ اسلام کے کسی اور بنیادی قانون کو اس قدر الٰہی اختصاص حاصل نہیں جتنا اسلامی قوانین میں علمِ میراث کو حاصل ہے۔ ترجیحات کے ڈھانچے کی سکیم اور بالخصوص ترکہ کے مقرر شدہ کسری (Fractional) حصّوں کو جن پر ورثاء کا استحقاق ہے' خود قرآن مجید میں بیان کر دیا گیا ہے۔'' ("Succession in the Mislim Family".. N.J. Coulson, p. 3) Cambridge University Press, 1971.

ایک اور ماہرِ میراث اسلامی نظامِ میراث پر یوں تبصرہ کرتا ہے:

''اِن احکامات میں ہم اُن وارثوں کے لئے خاصی توجہ پاتے ہیں جن کی محبت والفت قدرتی طور پر ہماری نہاد اور فطرت میں ہے اور کسی بھی دوسرے نظام میں ایسے منصفانہ اور مساویانہ حقوق کی نظیر تلاش کرنے کا تصور بھی نہیں ہوسکتا۔''
("Principles and Precedents of Muhammadan Law"... Macnaghten w. ref. to Mohammad Shoaib Umar)

ایک اور ماہرِ میراث Rumsey نے ان الفاظ میں اسلامی نظامِ میراث کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے:
''اسلام کا نظامِ میراث کسی سوال و اعتراض کے بغیر انتقالِ جائداد کے لئے انتہائی نفیس اور واضح قوانین کو شامل ہے جن سے آج کی تہذیب یافتہ دنیا متعارف ہے۔''
("The Mohammadan Law of Inheritance"... Rumsey, quoted by Mohammad Shoaib Umar, p. 1)

یہی مصنف اُسی کتاب میں اسلامی نظامِ میراث کو ان الفاظ میں پھر خراجِ تحسین پیش کرتا ہے:
''اسلامی نظامِ میراث آج ایک مقرر شدہ، سائنسی اور بڑی ہی خوبصورتی سے ترتیب پایا ہوا خوش آئند و متوازن نظام ہے۔''

<u>علمِ میراث کے ماخذ</u>: علمِ میراث کے چار بنیادی ماخذ ہیں: قرآن مجید، سنتِ مطہرہ، صحابہ کرام کا اجماع اور اُن کے انفرادی اجتہادات۔ ذیل میں میراث سے متعلق مفصل قرآنی آیات اور بعض احادیث کا ذکر کیا جاتا ہے:

يُوصِيكُمُ اللّٰهُ فِيْ أَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ فَإِنْ كُنَّ نِسَآءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَاتَرَكَ وَإِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ وَلِأَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ إِنْ كَانَ لَهٗ وَلَدٌ فَإِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلَدٌ وَّوَرِثَهٗ أَبَوَاهُ فَلِأُمِّهِ الثُّلُثُ فَإِنْ كَانَ لَهٗ إِخْوَةٌ فَلِأُمِّهِ السُّدُسُ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوصِيْ بِهَا أَوْدَيْنٍ آبَآءُكُمْ وَأَبْنَآءُكُمْ لَا تَدْرُوْنَ أَيُّهُمْ أَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ إِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا O (النساء: ۱۱)

''اللہ تمہیں تمہاری اولاد کی میراث کے بارے میں حکم دیتا ہے، مرد کا حصہ دو عورتوں کے حصہ کے برابر ہے اور اگر دو سے زائد عورتیں ہوں تو اُن کے لئے دو تہائی (حصہ) اُس مال کا ہے جو مورث چھوڑ گیا ہے اور اگر ایک ہی لڑکی ہو تو اُس کے لئے نصف حصہ ہے اور مورث کے والدین یعنی ان دونوں میں سے ہر ایک کے لئے اُس (مال) کا چھٹا حصہ ہے جو وہ چھوڑ گیا ہے بشرطیکہ مورث کی کوئی اولاد ہو اور اگر مورث کی کوئی اولاد نہ ہو اور اُس کے والدین ہی اس کے وارث ہوں تو اس کی ماں کا ایک تہائی ہے لیکن اگر مورث کے بھائی بہن ہوں تو اس کی ماں کے لئے چھٹا حصہ ہے وصیت کے نکالنے کے بعد کہ مورث اس کی وصیت کر جائے یا ادائے قرض کے بعد۔ تمہارے باپ ہوں کہ تمہارے بیٹے، تم نہیں جانتے کہ اُن میں سے فائدہ پہنچانے میں تم سے قریب تر کون ہے۔ یہ سب اللہ کی طرف سے مقرر ہے۔ بے شک اللہ ہی علم والا ہے، حکمت والا ہے۔'' (۴: ۱۱)

وَلَكُمْ نِصْفُ مَاتَرَكَ أَزْوَاجُكُمْ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهُنَّ وَلَدٌ فَاِنْ كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمُ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْنَ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوْصِيْنَ بِهَا أَوْدَيْنٍ وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّكُمْ وَلَدٌ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُمْ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ تُوْصُوْنَ بِهَا أَوْدَيْنٍ وَاِنْ كَانَ رَجُلٌ يُّوْرَثُ كَلَالَةً أَوِامْرَأَةٌ وَّلَهٗ أَخٌ أَوْأُخْتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ فَاِنْ كَانُوْا أَكْثَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَهُمْ شُرَكَآءُ فِي الثُّلُثِ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصٰى بِهَا أَوْدَيْنٍ غَيْرَ مُضَآرٍّ وَصِيَّةً مِّنَ اللّٰهِ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَلِيْمٌ ○ (النساء : ۱۲)

''اور تمہارے لئے اُس (مال) کا آدھا حصّہ ہے جو تمہاری بیویاں چھوڑ جائیں بشرطیکہ اُن کی کوئی اولاد نہ ہو۔ اور اگر اُن کی اولاد ہو تو تمہارے لئے بیویوں کے ترکے کی چوتھائی ہے وصیّت نکالنے کے بعد جس کی وہ وصیّت کر جائیں یا ادائے قرض کے بعد۔ اور اُن بیویوں کے لئے تمہارے ترکہ کی چوتھائی ہے بشرطیکہ تمہاری کوئی اولاد نہ ہو لیکن اگر تمہاری کوئی اولاد ہو تو اُن (بیویوں) کو تمہارے ترکہ کا آٹھواں حصّہ ہے بعد وصیت نکالنے کے جس کی تم وصیت کر جاؤ یا ادائے قرض کے بعد۔ اگر کوئی مُورث مرد یا عورت ایسا ہو جس کے نہ اصول ہوں نہ فروع اور اس کا ایک بھائی یا ایک بہن ہو تو دونوں میں سے ہر ایک کے لئے چھٹا حصّہ ہے اور اگر یہ لوگ اس سے زیادہ ہوں تو وہ ایک تہائی میں شریک ہوں گے بعد وصیّت نکالنے کے جس کی وصیت کر دی جائے یا ادائے قرض کے بعد بغیر کسی نقصان پہنچائے۔ یہ حکم اللہ کی طرف سے ہے اور اللہ بڑا علم والا ہے' بڑا بُردبار ہے۔'' (۴ : ۱۲)

''کَلالۃ کے لئے اردو میں کوئی ایک لفظ موجود نہیں۔ کَلالۃ عربی میں ایسے شخص کو کہتے ہیں جس کے نہ باپ دادا میں سے کوئی موجود ہو اور نہ اولاد در اولاد میں سے کوئی موجود ہو۔ غَیرَ مُضَآرٍّ یعنی مُورث کسی کو نقصان نہ پہنچائے نہ عملاً نہ ارادۃً۔ عملاً کی مثال یہ کہ وصیّت ایک تہائی سے زائد کی کر دی۔ ایسی وصیّت قانونِ شریعت کے خلاف ہونے کی بناء پر نا قابلِ نفاذ ہوگی۔ ارادۃً یہ کہ وصیّت رکھے تو ایک تہائی کے اندر ہی لیکن نیت یہ ہو کہ وارث کا حصّہ کٹ جائے۔ ایسی وصیّت کا نفاذ قانوناً تو ہو جائے گا لیکن وصیّت کرنے والا عنداللہ گنہگار رہو گا۔ اسلام اپنے پیرووں سے قدم قدم پر عمل کے ساتھ ساتھ نیّت میں بھی اخلاص و صداقت چاہتا ہے۔'' (تفسیر ماجدی اردو' صفحہ ۱۸۲' نوٹ: ۴۶۱' ۴۶۲)

يَسْتَفْتُوْنَكَ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِي الْكَلٰلَةِ اِنِ امْرُؤٌ هَلَكَ لَيْسَ لَهٗ وَلَدٌ وَّ لَهٗ أُخْتٌ فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ وَهُوَ يَرِثُهَا اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهَا وَلَدٌ فَاِنْ كَانَتَا اثْنَتَيْنِ فَلَهُمَا الثُّلُثٰنِ مِمَّا تَرَكَ وَاِنْ كَانُوْا اِخْوَةً رِّجَالًا وَّنِسَآءً فَلِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ (النساء : ۱۷۶)

''لوگ آپ سے حکم دریافت کرتے ہیں۔ آپ کہہ دیجئے کہ اللہ تمہیں (میراثِ) کلالہ کے بارے میں حکم دیتا ہے کہ اگر کوئی شخص مر جائے اور اس کے کوئی اولاد نہ ہو اور اس کی ایک بہن ہو تو اُسے اُس ترکہ کا نصف ملے گا اور وہ مرد وارث ہوگا اُس بہن کے کل ترکہ کا اگر اُس بہن کے اولاد نہ ہو۔ اگر دو بہنیں ہوں تو اُن دونوں کو ترکہ میں سے دو تہائی ملے گا اور اگر (وارث) چند بھائی بہن مرد و عورت ہوں تو ایک مرد کو دو عورتوں کے حصّہ کے برابر ملے گا۔'' (۴ : ۱۷۶)

<u>احکامِ میراث سے متعلق احادیث:</u> (۱) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

''جن ورثاء کے حصے مقرر ہیں' اُنہیں اُن کے حصے دے دو۔ جو بچ جائے وہ زیادہ قریبی مرد رشتہ دار کا ہے۔'' (صحیح بخاری: کتاب الفرائض' حدیث نمبر ۶۷۴۶ ؛ صحیح مسلم : کتاب الفرائض' حدیث نمبر ۴۱۴۱)

(۲) حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جنگِ اُحد کے بعد حضرت سعد بن ربیع رضی اللہ عنہ کی بیوی اپنی دو بچیوں کو لئے ہوئے بارگاہِ نبوی میں حاضر ہوئی اور عرض کیا: یا رسول اللہ! یہ سعد کی بچیاں ہیں جو اُحد میں شہید ہوئے ہیں۔ ان کے چچا نے پوری جائداد اپنے قبضہ میں کر لی ہے اور ان کے لئے ایک حبّہ تک نہیں چھوڑا۔ اب بھلا ان بچیوں سے کون نکاح کرے گا؟ اس پر میراث کی درج بالا آیات نازل ہوئیں اور رسول اللہ ﷺ نے اُن کے چچا کو بلا کر کہا کہ سعد کی بچیوں کو کل ترکہ کا دو تہائی اور اُن کی ماں کو آٹھواں حصہ دے دو۔ جو بچ جائے وہ تمہارا ہے۔'' (مسند احمد ۳۵۲/۳ ؛ ابوداؤد حدیث نمبر ۲۸۹۲ کتاب الفرائض' باب میراث الصلب ؛ ترمذی: کتاب الفرائض' حدیث نمبر ۲۰۹۲ میراث البنات ؛ ابن ماجہ: کتاب الفرائض باب: فرائض الصلب حدیث: ۲۷۲۰)

(۳) حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ان سے پوچھا گیا کہ ایک عورت کا ترکہ اس کے شوہر اور سگی بہن میں کس طرح تقسیم ہوگا؟ تو انہوں نے دونوں کو ترکہ میں سے نصف نصف کا حق دار ٹھہرایا اور کہا کہ میں نے نبی اکرم ﷺ کو اسی طرح فیصلہ فرماتے دیکھا ہے۔ (مسند احمد ۱۸۸/۵)

(۴) حضرت ہُزَیل بن شُرجیل رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے میراث کے مسئلہ میں پوچھا گیا جس میں متوفی ایک بیٹی' پوتی اور بہن چھوڑ مرا تھا تو انہوں نے کہا کہ کل ترکہ کا نصف بیٹی کو اور بقیہ نصف بہن کو ملے گا۔ پھر کہا کہ حضرت عبداللہ بن مسعود سے بھی پوچھ لو اور وہ میری تائید کریں گے۔ سائل نے حضرت ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ کے ہاں حضرت ابوموسیٰ اشعری کے فتویٰ کا ذکر کیا تو انہوں نے کہا کہ اگر میں بھی وہی فتویٰ دوں جو ابوموسیٰ نے دیا ہے تو یقیناً میں راہِ راست سے ہٹ جاؤں گا۔ میں اس کے بارے میں وہی فتویٰ دوں گا جو آنحضور ﷺ نے دیا تھا کہ بیٹی کو کل ترکہ کا نصف' پوتی کو چھٹا حصّہ (بیٹوں کے دو تہائی حصّہ کی تکمیل کے طور پر) اور باقی بہن کا ہوگا۔ بخاری اور مسند احمد کی روایت میں ہے کہ ہم نے حضرت ابوموسیٰ کو ابن مسعود کے فتویٰ کے متعلق بتایا تو انہوں نے کہا کہ جب تک ایسا بڑا عالم تمہارے درمیان موجود ہے تو مجھ سے مسائل نہ پوچھا کرو۔ (مسند احمد ۳۸۹/۱ ؛ صحیح بخاری: کتاب الفرائض' حدیث نمبر ۶۷۳۶ ؛ ابوداؤد: کتاب الفرائض' حدیث نمبر ۲۸۹۰ ؛ ترمذی: کتاب الفرائض' حدیث نمبر: ۲۰۹۳ ؛ ابن ماجہ: کتاب الفرائض' باب: فرائض الصلب' حدیث: ۲۷۲۱)

(۵) اسود کہتے ہیں کہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے میت کے ورثاء صرف بہن اور بیٹی ہونے کی صورت میں ہر ایک کو ترکہ میں سے نصف دیا۔ اُس وقت حضور نبی کریم ﷺ حیات تھے۔'' (ابوداؤد: کتاب الفرائض' حدیث ۲۸۹۳' باب: میراث الصلب' نیز بخاری شریف میں بھی اس مفہوم کی حدیث روایت ہوئی ہے۔)

(٦) حضرت بریدہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ماں کی عدم موجودگی میں دادی رنانی کو کل ترکہ کا چھٹا حصہ عطا فرمایا۔ (ابوداؤد: کتاب الفرائض' حدیث نمبر: ۲۸۹۵)

(٧) حضرت مقدام بن معدیکرب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: جو شخص مال چھوڑ کر فوت ہو وہ اس کے ورثاء کا ہوگا اور میں (اسلامی حکومت کے سربراہ کے طور پر) اُس شخص کا وارث ہوں جس کا کوئی وارث نہ ہو' میں اس کی مالی ذمہ داریاں ادا کروں گا اور اس کے ترکہ کا وارث بنوں گا اور جس شخص کا کوئی اور قریبی وارث موجود نہ ہو تو اُس کا ماموں اُس کا وارث ہوگا۔ (مسند احمد' حدیث: ۴/۱۳۱/۱۷؛ ابوداؤد: کتاب الفرائض' باب میراث ذوی الارحام' حدیث نمبر: ۲۸۹۹' ۲۹۰۰)

(٨) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: جب کسی بچے نے پیدائش کے بعد چیخنے کی آواز نکالی اور پھر فوت ہوگیا تو وہ وارث بنے گا۔ (ابوداؤد: کتاب الفرائض' حدیث: ۲۹۲۰)

(٩) حضرت اُسامہ بن زید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: مسلمان کسی کافر کا اور نہ کوئی کافر کسی مسلمان کا وارث بن سکتا ہے۔ (صحیح بخاری: کتاب الفرائض' حدیث: ۶۷۶۴؛ موطا امام مالک ۲/۵۱۹؛ صحیح مسلم: کتاب الفرائض' حدیث نمبر: ۴۱۴۰)

(١٠) حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ قاتل کو مقتول کے ترکہ میں سے حصہ نہیں ملے گا۔ (موطا امام مالک ۲/۸۶۷؛ ابن ماجہ: کتاب الفرائض' حدیث: ۲۶۴۶)

<u>مرد کا حصہ دوگنا کیوں؟</u> میراث کے معاملے میں یہ اولین اصولی ہدایت ہے کہ مرد کا حصہ عورت کے حصے سے دوگنا ہے۔ جیسا کہ گزشتہ صفحات میں بیان ہوا کہ اسلامی نظام میراث کی بنیاد کی ایک شق نظریہ ضرورت بھی ہے۔ چونکہ شریعت نے خاندانی زندگی میں مرد پر زیادہ معاشی ذمہ داریوں کا بوجھ ڈالا ہے اور عورت کو بہت سی معاشی ذمہ داریوں کے بارے میں سبکدوش رکھا ہے چاہے وہ کتنی مالدار کیوں نہ ہو۔ لہٰذا انصاف کا تقاضا یہی تھا کہ میراث میں عورت کا حصہ مرد کی بہ نسبت کم رکھا جاتا۔ (مزید وضاحت کے لئے صفحہ ۲۲۸۱ شق (۲) کے تحت ملاحظہ ہو)

<u>اسلام کے قانونِ وراثت کی چند اہم خصوصیات</u> : اسلام نے ورثاء کی ایک بڑی تعداد کو ترکہ میں حصہ دار بنا کر ایک جگہ جمع ہو جانے والی دولت کو پھیلایا اور اُسے گردش میں لایا ہے (سورۃ الحشر: ۷)۔ اس سے ایک طرف تو بڑے بڑے سرمائے ایک جگہ جمع ہو رہنے کی بجائے مختلف چھوٹی چھوٹی ملکیتوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں تو دوسری طرف اسلام میں عورت کے حصّہ کا مرد سے آدھا ہونے پر مغربی طرزِ فکر سے متاثر حضرات کی طرف سے اعتراضات کا ایک سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ مثلاً یہ کہ عورت کے ساتھ صنفی تخصیص روا رکھی گئی ہے یا یہ کہ عورت کو آدھے

مرد کے برابر قرار دیا گیا ہے۔ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ مرد کو دو حصّے دے جائیں اور عورت کو ایک جبکہ عورت زیادہ قابلِ رحم اور مالی اعانت کی زیادہ مستحق ہے۔ وہ مردوں کی طرح تجارت و زراعت نہیں کر سکتی۔ شوہر کی وہ دست بستہ غلام ہے' بچوں کی پرورش کرنے والی ہے۔ علاوہ ازیں حمل کی گرانی' وضعِ حمل کی تکالیف اور رضاعت کی محنت و مشقت اُسے بالکل ناتواں کر دیتی ہے۔ اس لئے اس کا حصہ ہونا تو زیادہ چاہئے تھا اور اگر زیادہ نہیں تو کم از کم برابر تو ضرور ہونا چاہئے تھا۔

''ان سارے اعتراضات کی وجہ دراصل ہماری کم علمی اور ہمارے ہاں عورت کی موجودہ ابتر معاشی حالت ہے اور اس حالت کا سبب اسلامی نظامِ میراث نہیں بلکہ ہمارا معاشرہ ہے جس میں آج تک عملی زندگی میں عورت کے حقِ وراثت کو تسلیم نہیں کیا گیا اور عموماً عورتوں کو اُن کے حق سے محروم رکھا جاتا ہے خصوصاً بیٹیاں پرایا دھن سمجھی جاتی ہیں لہٰذا اُنہیں بوقتِ شادی جہیز کی صورت میں کچھ دے دلا کر رخصت کر دیا جاتا ہے اور اُنہیں خاندانی جائداد اور وراثت میں حصّہ نہیں دیا جاتا حالانکہ ایسا کرنے والا صریحاً اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کے احکام کی نافرمانی کا مرتکب ہوتا ہے۔''

''اس نظامِ الٰہی کی مصالح اور حکمتوں کو کما حقہٗ سمجھنا ہماری ناقص و ناتواں عقل سے باہر ہے۔ بایں ہمہ ہمارے خیال میں اس حکمِ میراث کی مصلحتیں حسب ذیل ہیں:

''(۱) اسلام میں عورت کا حصہ میراث نصف مقرر کرنے میں اللہ تعالیٰ کی عظیم حکمت کارفرما ہے۔ اس سلسلے میں جس کی وضاحت گزشتہ صفحات میں دی جا چکی ہے۔ اس سلسلہ میں نامور مفکر محمد قطب لکھتے ہیں:

''اسلام کا قانون یہ ہے کہ میراث میں مرد کا حصہ عورت سے دوگنا ہے۔ یہ بالکل فطری اور منصفانہ تقسیم ہے کیونکہ عورت پر مالی ذمہ داریوں کا بوجھ نہیں ہوتا۔ دوسرے انداز سے دیکھئے۔ کل ورثے کا ایک تہائی عورت (بیٹی) کو صرف اپنی ذات کے لئے ملتا ہے جبکہ باقی دو تہائی مرد (بیٹے) کو دیا جاتا ہے تاکہ وہ اپنے بیوی بچوں اور خاندان کی ضروریات پوری کرے۔ اس سے ظاہر ہے کہ وراثت کا بیشتر حصہ کس کو ملتا ہے' عورت کو یا مرد کو؟'' (''اسلام اور جدید ذہن کے شبہات'')

''مرد سارے خاندان کی معاشی ذمہ داریاں پوری کرنے کا پابند ہے۔ اگر وہ بیوی کو نان و نفقہ دینے سے انکار کر دے یا آمدنی کے لحاظ سے اُسے کم خرچ دے تو بیوی ذاتی طور پر مالدار اور صاحبِ حیثیت ہونے کے باوجود بھی اس کے خلاف مقدمہ دائر کر کے نان و نفقہ کا مطالبہ کر سکتی ہے۔ اس لئے مرد کو سارے گھرانے کا سربراہ ہونے کی وجہ سے جو ذمہ داریاں پوری کرنا پڑتی ہیں' اُن کا تقاضا ہے کہ اُسے وراثت میں دوگنا حصّہ دیا جائے۔''

''(۲) میراث میں آدھے حصے کی تلافی بھی اسلام کرتا ہے وہ اس طرح کہ ایک تو بیوی کو شوہر سے مہر دلواتا ہے جو بلا شرکتِ غیرے صرف اُس کا ذاتی حق ہے۔ دوسرا یہ کہ شادی میں جو مال و زر اور تحفے تحائف دئے جاتے ہیں

اُن کی مالک بھی وہ عورت خود ہی ہوتی ہے۔ اسی طرح اگر اُس کے پاس کوئی جائیداد وغیرہ ہے تو وہ صرف اسی اکیلی خاتون کا حق ہے۔ کوئی اُسے اس کے خاوند یا بچوں پر خرچ کرنے پر مجبور نہیں کر سکتا جبکہ مرد قانوناً اپنے حصے کے مال و دولت کو دوسروں پر خرچ کرنے کے اختیارات رکھتا ہے۔ ماں باپ کی طرف سے ملنے والا ورثہ بھی ذاتی طور پر اُسے مل جاتا ہے اور اُسے اپنے بچوں یا شوہر کی کفالت بھی نہیں کرنا پڑتی۔''

''(۳) ان دو پہلوؤں سے قطع نظر جہاں اسلام نے محض رشتہ کا خیال کیا ہے' وہاں عورت اور مرد کو مساوی درجہ دیا ہے۔ مثلاً میت کی اولاد کی موجودگی میں والدین کے حصے یکساں ہوں گے یا اَخیافی (ماں جائے بہن بھائی) کے حصوں کے درمیان بھی اسلام نے کوئی فرق نہیں رکھا ہے۔''

''(۴) اس سلسلے میں ایک اور حکمت یہ بھی ہے کہ شریعت نے یہ اصول مقرر کیا ہے کہ میراث کے مقررہ حصے اور حقوق اصحابِ حقوق تک پہنچائے جائیں اور جو کچھ باقی رہے وہ قریبی رشتہ دار کا ہے۔ اسلام نے مرد پر مالی ذمہ داری ڈالنے کے ساتھ خاندان کے افراد کے درمیان تعاون وتناصر کے ضابطے بھی مقرر کئے ہیں۔ یہ ضابطے نہ صرف اخلاقی اہمیت کے حامل ہیں بلکہ انہیں قانونی حیثیت بھی حاصل ہے۔ اگر ایک شخص افلاس کا شکار ہو جائے تو خاندان کے مرد افراد میں نسبتاً جو اس کے قریب تر ہو گا اس پر سب سے زیادہ مالی تعاون اور کفالت کی ذمہ داری ہو گی۔''

''(۵) قانونِ وراثت میں اصل اہمیت چونکہ نسب کو دی جاتی ہے اس لئے اس ضابطہ کے تحت ضروری نہیں کہ مرد کو زیادہ حصّہ ہی ملے۔ یہ عین ممکن ہے کہ ایک عورت مورث (میت) سے قریبی تعلق رکھتی ہو اور اس مرد سے زیادہ حصہ پائے جو مورث کا دُور کا رشتہ دار ہے۔ بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ عورت اپنے خاندان (والدہ' والد' بھائی' بہن وغیرہ) سے بھی وراثت میں حصہ پاتی ہے اور اپنے خاوند کے خاندان (خاوند' اپنے بیٹے بیٹیوں وغیرہ) سے بھی۔''

''بایں ہمہ شریعتِ اسلامیہ کے پورے قانون میں معاشی' معاشرتی اور قانونی ذمہ داریوں کا بار چونکہ زیادہ تر مرد پر ہی عائد کیا گیا ہے اس لئے عورت کو مرد کے مقابلہ میں اکثر اوقات نصف حصہ دیا جاتا ہے۔ مثلاً وراثت' دیت اور قانونِ شہادت وغیرہ میں عورت کا حصہ کئی جگہ مرد کے مقابلے میں نصف رکھا گیا ہے مگر اس کا مطلب عورت کے درجے اور رُتبے میں کمی ہر گز نہیں۔ بے شمار دوسرے مواقع پر عورت کا درجہ زیادہ یا مساوی رکھا گیا ہے۔ مثلاً علم وعمل اور اُخروی اجر وثواب کے حصول میں دونوں میں کوئی فرق نہیں جبکہ خدمت واطاعت میں اولاد کے لئے والدہ کا درجہ زیادہ ہے۔ اولاد میں سے دختری اولاد کی پرورش' تربیت اور نگہداشت پر لڑکوں کی نسبت زیادہ اجر وثواب ہے۔ علاوہ ازیں بہت سے مقامات پر اللہ تعالیٰ نے عورت کا درجہ مرد سے بڑھا دیا ہے۔ اس طرح شریعت نے دونوں کے مابین توازن اور اعتدال قائم رکھا ہے جو کہ صحتمند معاشرے کے لئے ضروری ہے۔''

''اسلام کے نقطہ نظر سے ترکہ کی تقسیم ناگزیر ہے۔ کوئی شخص اپنی زندگی میں اپنے ترکہ میں سے حصہ پانے والے کسی وارث کو اس سے محروم نہیں کر سکتا۔ وارث کو ہر صورت میں میت کے ترکہ میں سے حصہ مل کر رہے گا بشرطیکہ اس میں

حصہ پانے کی تمام شرائط پائی جائیں۔ البتہ وارث کسی ایک یا تمام ورثاء کے حق میں اپنی آزادانہ رضامندی سے اپنے حصہ سے دستبردار ہوسکتا ہے۔''

''اسلامی قانونِ وراثت میں میت کے ترکہ میں سے حصہ پانے والوں کا تعین خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے اور ترکہ کی تقسیم کا اختیار مورّث (میّت) کو نہیں دیا۔ اس لئے کہ انسان پر خواہشاتِ نفس کا غلبہ ہوسکتا ہے جن کی بناء پر وہ کسی جذبے کے تحت ترکہ کے بعض حقداروں کو یا تو بالکل محروم کرسکتا ہے یا پھر بلا جواز اُن کے حصّوں میں کمی بیشی کر سکتا ہے۔ اس لئے شریعتِ اسلامیہ نے ورثاء اور اُن کے حصّوں کا تعین فرما کر اس خطرے کا سدّ باب کر دیا ہے۔''
(''فقہ القرآن'' نصاب برائے ایم اے علوم اسلامیہ' علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد' کوڈ: ۴۵۵۳ صفحات ۷۲۶ تا ۷۲۹)

''یتیم پوتے کی وراثت: مسلم فیملی لاز آرڈی نینس مجریہ ۱۹۶۱ء کی دفعہ نمبر ۴ کی رُو سے دادا اور نانا کے اُن پوتوں' پوتیوں اور نواسوں اور نواسیوں کو دادا اور نانا کا وارث قرار دیا گیا ہے جن کے باپ یا ماں مورث کی زندگی ہی میں وفات پا گئے ہوں۔ اُس وقت کے وزیر قانون کے خیال میں یہ قرآنی قانون کی پیروی ہے لیکن اس کے اندر قرآن کی چار صریح قاعدوں کی خلاف ورزی کی گئی ہے:۔

''(۱) قرآن ایک مورث کے ترکے میں صرف اُن رشتہ داروں کے حصے مقرر کرتا ہے جو مورث کی وفات کے وقت زندہ موجود ہوں لیکن آرڈی نینس کی یہ دفعہ بعض اُن رشتہ داروں کو حصہ دلواتی ہے جو مورث کی زندگی میں وفات پا چکے ہیں۔ گویا اس دفعہ کی رُو سے پہلے یہ فرض کیا جائے گا کہ وہ وفات یافتہ رشتہ دار مورث کی وفات کے وقت زندہ ہیں اور اس مفروضے کی بناء پر واقعی زندہ رشتہ داروں کے ساتھ اُن کا حصہ نکالا جائے گا۔ پھر اُن کا حصہ نکالتے ہی اُنہیں مردہ تسلیم کر دیا جائے گا اور آگے اُن کے وارثوں میں وہ حصہ تقسیم کیا جائے گا۔ سوال یہ ہے کہ قرآن کی کس آیت سے یہ قانونی مفروضات اور قانونی حیلے اخذ کیے گئے ہیں؟''

''(۲) قرآن کریم میں جن رشتہ داروں کے حصے مقرر کیے گئے ہیں اُن میں بیٹوں اور بیٹیوں کے علاوہ ماں' باپ' بیوی' شوہر اور مورث کے کلالہ ہونے کی صورت میں بھائی اور بہن بھی شامل ہیں لیکن آرڈیننس کی یہ دفعہ اُن میں سے صرف بیٹوں اور بیٹیوں کو اس امتیاز کے لئے منتخب کرتی ہے کہ مورث کی زندگی میں مرجانے کے باوجود وہ حصہ وصول کرنے کے لئے مورث کی موت کے وقت زندہ فرض کیے جائیں اور پھر آگے حصہ تقسیم کرنے کے لئے مردہ تسلیم کر لئے جائیں۔ یہ امتیاز قرآن کی کس نص یا اُس کی کس اقتضاء یا دلالت یا اشارے سے ماخوذ ہے؟''

''(۳) قرآن کی رُو سے ایک مورث کے ترکے میں اُس کے تمام بیٹے اور بیٹیوں کا حق ہے۔ قطع نظر اس کے کہ وہ صاحبِ اولاد ہوں یا نہ ہوں' شادی شدہ ہوں یا نہ ہوں' بالغ ہوں یا نہ ہوں لیکن اس آرڈیننس میں مزید

امتیاز برتا گیا ہے کہ جو بیٹے اور بیٹیاں مورث کی زندگی میں لاولد مر گئے ہوں' اُنہیں تو حصّہ وصول کرنے کے لئے زندہ فرض نہیں کیا جائے گا۔ البتہ جو اولاد وہ چھوڑ گئے ہوں ان کا حصہ وصول کیا جائے گا۔ اس امتیاز کے لئے قرآن میں کیا دلیل ہے؟''

''(۴) یہ آرڈیننس مزید امتیاز یہ برتتا ہے کہ فوت شدہ صاحبِ اولاد بیٹوں اور بیٹیوں کی بھی صرف اولاد کو حصّہ پہنچاتا ہے حالانکہ قرآن کی رُو سے اگر مورث کے مال میں اُن کا کوئی حق ہے تو پھر وہ اُن کی ماں یا اُن کے باپ اور ان کی بیوی یا ان کے شوہر کو بھی پہنچتا ہے مثلاً ایک متوفی بیٹی کا حصّہ نکالا جائے تو اس کا شوہر بھی حقدار ہے۔ اگر وہ زندہ ہو اور اس کی ماں بھی حقدار ہے۔ اگر وہ متوفی باپ سے حصّہ پا رہی ہو تو اس کا باپ بھی حقدار ہے۔ اگر وہ متوفی ماں سے حصّہ پا رہی ہو۔ نانا سے صرف نواسوں اور نواسیوں کا حصہ دلوانا اور دوسرے وارثوں کا چھوڑ دینا قرآن کے کس حکم پر مبنی ہے؟''

''جواز کی واحد دلیل اور اس کی غلطی: ان سوالات کے جواب میں زیادہ سے زیادہ جو بات کہی جا سکتی ہے' وہ یہ ہے کہ تمام نئے مفروضات اور قاعدے صرف قرآن کے اس منشا کو پورا کرنے کے لئے وضع کیے گئے ہیں کہ یتامیٰ کی مدد کی جائے۔ اگرچہ بجائے خود یہ قاعدے اور مفروضے قرآن سے ماخوذ نہیں ہیں۔ لیکن یہ عذر دو وجوہ سے بالکل غلط ہے۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ قرآن کا قانونِ میراث سرے سے اس اصول پر مبنی ہی نہیں ہے کہ کسی پر رحم کھا کر اس کی مدد کی جائے ورنہ کوئی وجہ نہیں تھی کہ قرآن ایک مالدار رشتہ دار کو میراث کا حق پہنچاتا محض اس بناء پر کہ وہ قاعدے کے مطابق حقدار رشتوں کے دائرے میں آتا ہے اور ایک انتہائی مفلس اور قابلِ رحم رشتہ دار کو محروم رکھتا محض اس بناء پر کہ وہ قاعدے کے مطابق حقدار رشتوں کے دائرے میں شامل نہیں ہے۔ ایک اپاہج مفلس بھائی کو محروم کرنا اور ایک دولتمند بیٹے کو دولتمند باپ کی جائیداد کا وارث بنانا بالکل غلط ہو جاتا' اگر قانونِ میراث بنانے سے قرآن کا منشا یہ ہوتا کہ حاجتمندوں کی مدد کی جائے۔ دوسری وجہ جس کی بناء پر یہ عذر قطعاً غلط ہوگا' یہ ہے کہ اگر فی الواقع قرآن کا ایسا کوئی منشا ہوتا کہ یتیم پوتوں اور نواسوں کی مدد دادا اور نانا کی میراث میں انہیں حصہ دار بنا کر کی جانی چاہیے تو آخر کیا امر اس میں مانع تھا کہ قرآن اپنے اس غامض منشا کو ایک صاف حکم کے ذریعے سے کھول دیتا اور اگر قرآن نے نہ کھولا تھا تو یہ منشا صاحبِ قرآن ﷺ سے مخفی نہیں رہنا چاہئے تھا۔ اُنہوں نے ایسا حکم کیوں نہیں دیا؟ اگر حضور ﷺ نے اس کو نہیں کھولا تھا تو آخر کیا معقول وجہ چودہ صدیوں میں اسلام کے سارے فقہاء سے مخفی رہ گیا اور اُسے پایا تو اس زمانہ میں چند اُن لوگوں نے جنہوں نے قرآن وسنت کے علم کی تعلیم و تربیت نہیں پائی۔''

''مسئلہ کا صحیح حل: باپ کی زندگی میں فوت ہو جانے والے بیٹوں اور بیٹیوں کی اولاد کو جو مشکلات پیش آتی ہیں' اُنہیں حل کرنے کا صحیح طریقہ بارہا علماء کی طرف سے پیش کیا جا چکا ہے۔ یہ حل ایک تو دادا اور نانا کی طرف سے یتیم پوتے اور نواسے کے حق میں اپنی زندگی میں ہبہ کی صورت ہے جو پوری جائیداد کا بھی ہو سکتا ہے اور دوسرا وصیت کے ذریعے ہے جو ایک تہائی جائیداد تک ہو سکتی ہے۔ اور اگر دادا یا نانا اپنی زندگی میں یہ انتظام نہ کرے تو

قانون کے ذریعے عدالت کو اس کا مجاز کیا جا سکتا ہے کہ وہ ایسی صورت پیش آنے پر دادا یا نانا کی جائیداد سے ایک تہائی تک جتنا حصّہ مناسب سمجھے، یتیم پوتے تک پہنچا دے۔ مصر میں یہی صورت اختیار کی گئی ہے۔''

اسلامی قانونِ میراث کے اصول : متوفّی کی وفات پر اُس کا ترکہ اُس کے قانونی ورثاء کو اُن کے حصّوں کی مناسبت سے منتقل کر دیا جاتا ہے۔ یہ انتقال متوفّی کی وصیت یا اُس کی دوسری کسی ہدایت سے قطع نظر شرعی قانون کے مطابق ہوتا ہے۔

''علاوہ ازیں اسلامی قانونِ وراثت کی لازمی خصوصیت یہ ہے کہ قرآنِ حکیم میں بیان کردہ ورثاء کے استحقاق میں کسی قسم کی ترمیم یا تبدیلی کی گنجائش نہیں ہے یہاں تک کہ وصیت کرنے والا بھی قرآنِ حکیم میں بیان کردہ کسی جائز وارث کو محروم کرنے یا اُس کی جگہ کسی اور کو حصّہ دلانے کا مجاز نہیں ہے۔ مُوصی (وصیت کرنے والے) کی ہدایات، اگر کوئی ہیں، شریعت کے قانونِ میراث کے مطابق ہونی چاہئیں ورنہ وہ باطل، بے اثر اور ناقابلِ نفاذ ہوں گی۔ اُن کی قطعیت اور حتمیت کے پس پردہ منطقی دلیل یہ ہے کہ وہ خالصتاً حکمِ الٰہی ہیں اور مختلف ورثاء کے کسری حصص کو سورۃ النساء کی آیات ۱۱، ۱۲، ۳۳ اور ۱۷۶ میں بیان کر دیا گیا ہے۔ اس طرح اسلامی قانونِ میراث شریعتِ اسلامی کے ناگزیر تقاضوں کی تکمیل کرتا ہے۔'' ("Law Reforms in the Muslim World"... N. Anderson, p. 146, University of London Series, 1976.

تقسیمِ میراث کے سلسلے میں درج ذیل اہم اصول مدِّ نظر رہنے چاہئیں :-

(۱) متوفّی کے کفن، دفن، انتظامی اخراجات نکالنے اور اس کا قرض (اگر کوئی ہے) چکانے کے بعد وہ اپنے ترکہ کے ایک تہائی کی وصیت کرنے کا مجاز ہے بشرطیکہ میراث پانے والے وارث ہونے کے مجاز نہ ہوں۔

(۲) یہ ایک تہائی وصیت کسی وارث کے حق میں نہیں ہوگی کیونکہ ایسا کرنا اُسے ایک ناجائز ترجیح عطا کرنے کے ساتھ ساتھ قانونِ میراث کے تحت مختلف وارثوں کے استحقاق میں اختلاف پیدا کرنے کا سبب بنے گا۔

(۳) مرض الموت میں بھی آدمی کی وصیت اُس کی کل جائیداد کے ایک تہائی تک ہو سکتی ہے۔

(۴) مندرجہ بالا اصول (۲) کی رُو سے دوسرے وارثوں کی رضامندی کے بغیر مرض الموت میں کی گئی وصیت باطل اور بے اثر ہوگی۔

درج بالا اصول نمبر (۱) اور (۲) کے سلسلے میں وارث کو ایک تہائی سے زائد کی وصیت دوسرے وارثوں کی رضامندی کے ساتھ جائز اور نافذ العمل ہو سکتی ہے۔

وضاحت : میں نو ہزار کی جائیداد کا مالک ہوں۔ لہٰذا اس کے ایک تہائی یعنی تین ہزار تک کی وصیت جائز اور نافذ العمل ہے۔

اولاد کے ساتھ مساویانہ سلوک: ''بالخصوص تحفے تحائف دینے میں تمام بچوں کے ساتھ مساویانہ سلوک کرنا والد پر فرض ہے۔ اس طرح کسی ضرورت یا معقول وجہ کے بغیر والد کو اپنی کچھ اولاد کی دوسروں سے زیادہ طرفداری کرنے کی ممانعت ہے کیونکہ یہ چیز حسد کا سبب بن سکتی ہے اور اُن میں دشمنی اور نفرت پیدا کر سکتی ہے۔ اس اصول کا اطلاق بالکل والدہ پر بھی ہوتا ہے۔ صحیح مسلم، مسند احمد اور ابوداؤد کی روایت کے مطابق نبی اکرم ﷺ نے تین مرتبہ زور دیتے ہوئے فرمایا کہ ''اپنے بچوں میں انصاف کیا کرو۔''

اس حدیث کے پس پردہ کہانی اس طرح ہے کہ بشیر بن سعد انصاری رضی اللہ عنہ کی اہلیہ نے اپنے شوہر سے کہا کہ وہ اُن کے بیٹے نعمان بن بشیر کو ایک باغ یا غلام ہبہ کر دیں۔ اُنہوں نے اپنے خاوند بشیر سے کہا کہ وہ نبی ﷺ کے ہاں جائیں اور اُنہیں اس معاملے کا گواہ بننے کا کہیں۔ بشیر بارگاہِ نبوی میں پہنچے اور کہا: میری بیوی نے مجھے اپنے بیٹے کو غلام ہبہ کرنے کا کہا ہے۔ پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام نے دریافت کیا کہ کیا تمہارے اس بیٹے کے کوئی بھائی بھی ہیں؟ بشیر نے کہا: جی ہاں۔ آپ ﷺ نے پوچھا: کیا تم نے اُن سب کو ایسی ہی چیز ہبہ کی ہے؟ بشیر نے کہا: جی نہیں۔ اس پر پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا:

''یہ درست نہیں ہے اور میں غیر انصافی کے معاملے میں گواہ نہیں بن سکتا۔'' (صحیح ابن حبان)

اس سلسلے میں کچھ اور احادیث درج ذیل ہیں :

(۱) ''بے انصافی پر مجھے گواہ بننے کا نہ کہا کرو۔ تمہارے بچوں کا اُن سے مساوی سلوک کئے جانے کا اسی طرح حق ہے جس طرح تمہارا اُن پر عزت و تکریم کئے جانے کا حق ہے۔'' (ابوداؤد)

(۲) ''اللہ سے ڈرتے رہو اور اپنے بچوں کے ساتھ مساویانہ انصاف کیا کرو۔'' (بخاری، مسلم)

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ ایک اپاہج اور معذور بچے سے ترجیحی سلوک کرنے کی اجازت ہے جبکہ دوسرے بچے صحیح سالم اور صحت مند ہوں۔

''المغنی کی جلد پنجم کے صفحہ ۶۰۵ پر مذکور ہے کہ بچے کی کسی جائز ضرورت، معذوری، اندھے پن اور طلبِ علم یا اسی قسم کی کسی اور وجہ سے اُس سے ترجیحی سلوک کرنا جائز ہے بالکل اسی طرح جس طرح ایک ایسے بچے سے اُس کی رقم روک لینے کی اجازت ہے کہ اگر وہ اُسے دے دی جائے تو وہ اُسے معصیت اور گناہ اور گندے کاموں میں اُڑا دے گا۔'' (''الحلال والحرام فی الاسلام''۔۔ یوسف القرضاوی، صفحات ۲۳۰، ۲۳۱)

تقسیم میراث میں حدود اللہ کی پابندی : والدین کے لئے اپنے بچوں کو میراث سے محروم رکھنا حرام

ہے۔لڑکیوں یا اُس بیوی کے بچوں کو بھی میراث سے محروم کرنا حرام ہے جو اپنے خاوند سے موافقت نہیں کرتی۔اسی طرح ایک رشتہ دار کا کسی دوسرے رشتہ دار کو جو قانوناً وارث ہے' کسی چال کے ذریعے میراث سے محروم کرنا بھی حرام ہے۔اللہ سبحانہ' وتعالیٰ ہی ہے جس نے اپنے علم' حکمت اور انصاف کے تحت میراث کی تقسیم کے نظام کو قائم کیا ہے تا کہ ہر اہل اور جائز وارث کو اُس کا حصّہ مل جائے اور اُس نے اپنی مخلوق کو اپنے قانون کی حدود کے اندر رہنے کا حکم دیا ہے۔لہٰذا جو کوئی تقسیمِ حصص میں الٰہی قانونِ میراث سے گریز کرتا ہے' اپنے خالق و مالک کو ناراض کرتا ہے۔''

ربِّ ذوالجلال والاکرام نے معاملاتِ میراث کو تین آیات میں بیان کیا ہے۔پہلی آیت کے آخر میں فرمایا:

آبَآءُ كُمْ وَأَبْنَآءُ كُمْ لَا تَدْرُونَ أَيُّهُمْ أَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا فَرِيضَةً مِّنَ اللّٰهِ إِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيمًا حَكِيمًا O (النساء : ۱۱)

''تمہارے باپ ہوں کہ تمہارے بیٹے' تم نہیں جانتے کہ اُن میں سے فائدہ پہنچانے میں تم سے قریب تر کون ہے۔یہ سب اللہ کی طرف سے مقرر ہے۔بے شک اللہ ہی علم والا ہے' حکمت والا ہے۔''

اور دوسری آیت کے آخر میں فرمایا :

غَيْرَ مُضَآرٍّ وَصِيَّةً مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عَلِيمٌ حَلِيمٌ O تِلْكَ حُدُودُ اللّٰهِ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهٰرُ خٰلِدِينَ فِيهَا وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ O وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ وَيَتَعَدَّ حُدُودَهُ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيهَا وَلَهُ عَذَابٌ مُّهِينٌ O (النساء: ۱۲ تا ۱۴)

''(تقسیمِ میراث میں) کسی کو نقصان نہیں پہنچایا جائے گا۔یہ حکم اللہ کی طرف سے ہے اور اللہ بڑا علم والا ہے' بڑا بُردبار ہے۔یہ سب خداوندی ضابطے ہیں اور جو کوئی اللہ اور اُس کے رسول کی اطاعت کرے گا' اللہ اُسے بہشت کے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی' اُن میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور یہ بڑی کامیابی ہے۔اور جو کوئی اللہ اور اُس کے رسول کی نافرمانی کرے گا اور اُس کے ضابطوں کی حدود سے باہر نکل جائے گا' وہ اُسے دوزخ کی آگ میں داخل کرے گا' اس میں وہ ہمیشہ پڑا رہے گا اور اُسے ذلّت دینے والا عذاب ہوگا۔'' (۱۲ تا ۱۴ : ۴)

اور قانونِ میراث کی تیسری آیت کے آخر میں فرمایا:

يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ أَنْ تَضِلُّوا وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ O (النساء: ۱۷۶)

''اللہ تعالیٰ تمہارے لئے (یہ احکام) کھول کر بیان کرتا ہے کہ تم گمراہی میں نہ پڑو اور اللہ ہر شے کا پورا علم رکھتا ہے۔'' (۴:۱۷۶)

یعنی معاشرتِ دنیوی اور جزائے آخرت دونوں میں نقصان سے محفوظ رہو۔اِس آیت میں اپنی صفتِ علم لاکر یاد دلایا کہ اِن احکام میں بندوں کی ساری رعایتیں اور مصلحتیں جمع کردی گئی ہیں۔

۲۲۹۳ (میراث ۔۔ Inheritance)

ورثاء کی ترتیب: ''شریعت نے جن رشتہ داروں کو وارث ٹھہرایا ہے' استحقاق کے لحاظ سے وہ سب یکساں نہیں بلکہ ان کے مختلف درجے اور مراتب ہیں ۔ ورثاء میں ترکہ کی تقسیم حسب ذیل ترتیب سے ہوگی :

''(۱) **ذوی الفروض** : یہ وہ رشتہ دار ہیں جن کے حصے شریعت نے مقرر کر دیئے ہیں اور جن کے متعلق قرآن مجید یا سنتِ رسول یا اجماعِ امت میں واضح احکام موجود ہیں ۔''

(۲) **عصبات** : یہ وہ رشتہ دار ہیں جنہیں وارث تو ٹھہرایا گیا ہے مگر اُن کا کوئی حصّہ مقرر نہیں کیا گیا ۔ اگر اُن میں سے کوئی تنہا وارث ہو تو کل ترکہ کا اور ذوی الفروض کے ساتھ وارث بنے تو ان سے باقی ماندہ ترکہ کا مستحق ہوگا ۔''

(۳) **ذوی الارحام**: یہ میت کے وہ تمام ددھیالی اور ننھیالی رشتہ دار ہیں جو ذوی الفروض یا عصبہ نہ ہوں اور میت سے اُن کا رشتہ صرف کسی عورت کے واسطے سے ہو یا وہ خود عورتیں ہوں جیسے نانا' نواسہ' نواسی' ماموں' خالہ اور پھوپھی وغیرہ ۔''

''ذوی الارحام اُس وقت وارث ہوتے ہیں جب میت کے کوئی ذوی الفروض اور عصبہ ورثاء موجود نہ ہوں یا صرف میاں بیوی میں سے کوئی موجود ہو ۔ پہلی صورت میں کل ترکہ اور دوسری صورت میں شوہر یا بیوی کے حصے سے باقی ماندہ ترکہ ذوی الارحام کو ملے گا ۔'' (''فقہ القرآن'' نصاب برائے ایم اے علومِ اسلامیہ' علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی' اسلام آباد' کوڈ نمبر ۴۵۵۳)

''اولاد کے وارث ہونے کی چار صورتیں ہیں :

(۱) لڑکے بھی ہوں اور لڑکیاں بھی ۔ اس صورت میں لڑکے کو دو حصے اور لڑکی کو ایک حصّہ ملے گا ۔
(۲) صرف ایک لڑکی ہو ۔ اس صورت میں لڑکی نصف جائیداد کی وارث ہوگی ۔
(۳) صرف دو لڑکیاں ہوں ۔
(۴) دو سے زائد اور لڑکا کوئی نہ ہو ۔ ان دونوں صورتوں میں لڑکیوں کو جائیداد کا دو تہائی حصّہ ملے گا ۔''

''والدین کے وارث بننے کی تین مختلف صورتیں ہیں :

(۱) ماں باپ بھی موجود ہوں اور اولاد بھی ہو خواہ لڑکا یا لڑکی ایک یا زیادہ ۔ اس صورت میں ماں باپ کو چھٹا چھٹا حصّہ ملے گا اور بقایا ۴/۶ اولاد میں حسب قاعدہ تقسیم ہوگا ۔
(۲) صرف ماں باپ وارث ہوں ۔ میت کی اولاد بھی نہ ہو اور بہن بھائی بھی نہ ہوں ۔ اس صورت میں ماں کا تہائی اور بقیہ دو تہائی باپ کا ہوگا ۔ یہاں بہن بھائی کے نہ ہونے کی تصریح نہیں کیونکہ تیسری صورت میں اس کی وضاحت آ رہی ہے ۔

(۳) میت کی اولاد تو نہ ہو لیکن اس کے بھائی یا بہن ہوں ۔ اس صورت میں ماں کو چھٹا حصّہ اور بقیہ ۵/۶ باپ کو ملے گا ۔ بھائی بہن خواہ عینی ہوں یعنی ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہوں' یا علاتی یعنی باپ ایک مائیں الگ الگ یا اخیافی یعنی ماں ایک باپ الگ الگ ۔ ان سب حالتوں میں ایک ہی حکم ہے ۔ باپ کے باعث بھائی بہنوں کو حصّہ نہ ملے گا ۔'' (''ضیاء القرآن'' ۔۔۔ کرم شاہ الازہری' جلد اوّل' صفحات ۳۲۳' ۳۲۴)

''بیوی کی وراثت تقسیم کرنے کی دو صورتیں ہیں :

(۱) متوفّیہ بیوی کی کوئی اولاد نہ ہو' نہ لڑکا نہ لڑکی' نہ تم سے اور نہ کسی دوسرے خاوند سے ۔ اس صورت میں نصف خاوند کو ملے گا اور بقیہ نصف دوسرے وارثوں میں حسبِ قاعدہ شرعی تقسیم ہوگا ۔

(۲) متوفیہ کی کوئی اولاد ہو تو اس صورت میں چوتھائی خاوند کو اور بقیہ دوسرے وارثوں کو ملے گا ۔''

''خاوند کی وراثت تقسیم کرنے کی دو صورتیں ہیں :

(۱) خاوند کی کوئی اولاد نہ ہو' نہ لڑکا نہ لڑکی' نہ موجودہ بیوی سے اور نہ کسی دوسری بیوی سے تو چوتھائی حصہ بیوی کو ملے گا خواہ ایک ہو یا زیادہ ۔

(۲) اگر خاوند کی اولاد ہو (بہ تفصیلِ سابق) تو بیوی کو آٹھواں حصہ ملے گا ایک ہو یا زیادہ ۔ بقیہ دیگر وارثوں میں تقسیم کیا جائے گا ۔'' (ایضاً' صفحہ ۳۲۵)

''ترکہ میت سے متعلق حقوق : کسی شخص کی وفات کے بعد اُس کے ترکہ سے درجِ ذیل حقوق متعلق ہوتے ہیں :

(۱) تجہیز و تکفین : سب سے پہلے ترکہ میت کی تجہیز و تکفین پر صَرف کیا جائے گا چاہے پورا ترکہ اس میں صَرف ہو جائے لیکن اعتدال ملحوظ رہے مثلاً کفن ایسے کپڑے کا دیا جائے جس قسم کا کپڑا متوفّی اپنی زندگی میں ''عیدین'' یا جمعہ وغیرہ میں استعمال کرتا تھا ۔

(۲) قرض کی ادائیگی : تجہیز و تکفین کے بعد جو بچے' اُس سے میت کے وہ قرضے ادا کئے جائیں جن کا تعلق حقوق العباد سے ہو' اس لئے کہ نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے: ''مؤمن کی روح اُس وقت تک معلق رہتی ہے جب تک اس پر جو قرضہ ہو' ادا نہ کر دیا جائے ۔'' (فقہ الاسلامی وأدلتہ' محمد علی الصابونی ۸/۲۴۹)

''جو قرضے خالص حقوق اللہ ہیں جیسے زکوٰۃ' نذر' کفارات' اَحناف کے نزدیک وہ ترکہ سے ادا نہیں کئے جائیں گے جبکہ باقی فقہاء کے نزدیک ترکہ کی ورثاء میں تقسیم سے قبل ان کی ادائیگی بھی ضروری ہے ۔ یہ اختلاف اس صورت میں ہے جبکہ متوفّی نے ایسے قرضوں (حقوق اللہ) کی ادائیگی کے بارے میں وصیت نہ کی ہو ۔ متوفّی کی طرف سے وصیت ہونے کی صورت میں ترکہ کی تقسیم سے قبل بالاتفاق وہ بھی ادا کر دئے جائیں گے ۔''

''(۳) تنفیذِ وصیت : تجہیز و تکفین اور قرضہ ادا کرنے کے بعد جو کچھ ترکہ میں سے بچے' اُس سے میّت کی وصیت پوری کی جائے لیکن اس کے لئے یہ شرائط ہیں کہ:

(i) وصیت کل ترکہ کے ایک تہائی سے زائد نہ ہو۔
(ii) وصیت کسی ایسے وارث کے لئے نہ ہو جس کو اس ترکہ میں از روئے شرع حصّہ ملنے والا ہو۔
(iii) وصیت کسی ناجائز کام کے لئے نہ ہو۔''

''اگر متوفّی نے ایک تہائی سے زائد کی وصیت کی ہو یا کسی وارث کے لئے وصیت کی ہو تو ایسی وصیت دیگر ورثاء کی رضامندی سے پوری کی جاسکتی ہے ورنہ نہیں۔ اگر تمام ورثاء راضی نہ ہوں تو زائد وصیت کو کم کر کے اُسے ایک تہائی کر دیا جائے۔''

''مندرجہ بالا مصارف کے بعد ترکہ میں سے جو کچھ بچے' وہ میت کے ورثاء میں شریعت کے احکام کے مطابق تقسیم کر دینا چاہیے۔'' (''فقہ القرآن'' نصاب برائے ایم اے علومِ اسلامیہ کوڈ نمبر ۴۵۵۳' صفحات ۳۰/۷' ۳۱/۷)

''ایک تہائی سے زائد وصیت کا نفاذ : اگر میّت نے کل ترکہ کے ایک تہائی سے زائد وصیت کی ہو تو ایسی صورت کو ورثاء کے مفاد کے پیشِ نظر رد کیا گیا تھا۔ اب اگر کوئی وارث موجود ہی نہ ہو تو متوفّی کی وصیت پورے طور پر رُو بہ عمل لائی جائے گی' چاہے ترکہ کے ایک تہائی سے زائد ہی کیوں نہ ہو۔'' (ایضاً' صفحات ۳۲/۷' ۳۳/۷)

''وراثت پانے کے اسباب : بنیادی طور پر آج کل کے لحاظ سے وراثت میں حصّہ پانے کے دو اسباب ہیں: رشتۂ نسب اور رشتۂ نکاح۔

''(1) رشتۂ نسب : یہ کسی انسان کا وہ نسبی تعلق اور قرابت ہے جو اُسے اُس کے اصول (باپ دادا) اور فروع (بیٹے پوتے) اور ان کے متعلقین کے ساتھ جوڑتا ہے۔ اس میں درج ذیل افراد شامل ہیں:
(۱) اولاد اور اُن کی مذکر و مؤنث اولاد۔
(۲) باپ' دادا اور اُن کے اصول اور ماں' دادی اور نانی۔
(۳) بھائی بہنیں۔
(۴) چچا اور اُن کی صرف اولادِ نرینہ۔''

''(2) رشتۂ نکاح : اس میں وہ مرد و عورت شامل ہیں جن کے مابین نکاحِ صحیح کا عقد ہو' چاہے اس کے نتیجے میں زن و شوئی کے تعلقات قائم ہوئے ہوں یا نہ ہوئے ہوں۔ چنانچہ اگر عقدِ صحیح کے بعد اور رخصتی سے پہلے میاں بیوی میں سے کوئی فوت ہو جائے تو دوسرا اُس کا وارث بنے گا۔ نیز اگر کسی عورت کو اس کے شوہر نے طلاقِ رجعی دے دی اور وہ عدت کے دوران فوت ہو گیا تو ایسی مطلقہ شوہر کی وراثت سے حصّہ پائے گی۔'' (ایضاً' ص ۳۴/۷)

''وراثت کی شرائط : کوئی شخص وراثت میں حصّہ پانے کا اُس وقت ہی مستحق ہوسکتا ہے جب اس کے اندر درجِ ذیل شرائط پائی جائیں :۔

(1) مُورث کا فوت ہونا : تقسیمِ ترکہ کے لئے مورث کا وفات پانا اور اُس کی وفات کا حقیقی طور پر یا لاپتہ ہونے کی صورت میں عدالتی فیصلے کی روشنی میں ثابت ہونا ضروری ہے اس لئے کہ کسی شخص کی زندگی میں اُس کا مال ملکیت ترکہ نہیں بن سکتا۔''

(2) وارث کا زندہ ہونا : کسی مورث کا وارث وہی شخص بن سکتا ہے جو اُس کی وفات کے وقت حقیقتاً یا حکماً زندہ ہو۔ چنانچہ اگر کسی شخص کی وفات کے وقت اس کی بیوی یا بہو حاملہ تھی اور مقررہ مدت کے اندر اس نے زندہ بچے کو جنم دیا تو وہ اپنے باپ یا دادا کی وفات کے وقت سے حکماً زندہ تصور کیا جائے گا اور اس کے ترکہ میں حصّہ پانے کا حقدار ہوگا۔''

(3) کسی مانع کا نہ ہونا / وارث کی حیثیت کا علم ہونا : درجِ بالا شرائط کے ساتھ یہ بات بھی ضروری ہے کہ متعلقہ وارث میں وراثت پانے میں کوئی مانع (رکاوٹ) موجود نہ ہو (مثلاً قاتل یا کافر ہونا)۔ موانع کی تفصیل آگے آرہی ہے۔ دوسرے یہ کہ میت کے ساتھ اس شخص کے تعلق کی حیثیت بھی یقینی طور پر معلوم ہونی چاہئے کہ اس کے ساتھ اس کا کون سا تعلق ہے: نکاح کا تعلق ہے یا نسبی تعلق ہے۔ نیز نسبی تعلق میں وہ اس کے ساتھ اصول کا تعلق رکھتا ہے یا فروع کا وغیرہ۔ اس لئے کہ ہر تعلق کی الگ حیثیت اور حصّہ ہے۔''

''وراثت کے موانع : وہ حالات یا افعال جن کی وجہ سے ورثاء میں سے کوئی شخص (چاہے میت کے ساتھ نسب و قرابت داری یا نکاح کا رشتہ رکھتا ہو) از روئے شریعت اپنے مورث کے ترکہ میں سے حصہ پانے کا اہل نہیں رہتا اور کلی طور پر محروم ہو جاتا ہے ''موانع ارث'' کہلاتے ہیں۔ یہ چار موانع ہیں :

(۱) غلامی (آج کے دَور میں یہ موجود نہیں)۔
(۲) وارث کا اپنے مورث کو قتل کرنا۔
(۳) وارث اور مورث کا مذہب الگ الگ ہونا۔
(۴) وارث اور مورث کا اشتباہ (پہلے فوت ہونے والے کا علم نہ ہونا)۔''

''مورث کا قتل : اگر کوئی شخص اپنے مورث کو ناحق قتل کر دے تو قاتل مقتول کے ترکے اور وصیت دونوں سے محروم ہو جاتا ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے : لَیْسَ لِقَاتِلٍ مِّیْرَاث'' (قاتل مقتول کے ترکہ میں سے کچھ نہیں لے سکتا) [مؤطا امام مالک ۲/۸۶۷ ؛ مسند احمد ۱/۴۹ ؛ ابنِ ماجہ' کتاب الفرائض] اس لئے کہ قاتل مقتول کو قتل کر کے میراث قبل از وقت حاصل کرنا چاہتا تھا جبکہ شرعی قاعدہ ہے:

مَنِ اسْتَعْجَلَ شَیْئًا قَبْلَ أَوَانِهِ عُوْقِبَ بِالْحِرْمَانِ مِنْهُ
''جو شخص کسی چیز کو قبل از وقت حاصل کرنا چاہے' اُسے اس سے محرومی کی صورت میں سزا دی جائے گی۔''

''اگر کسی شخص نے قتل اپنے ہاتھوں سے کیا ہو اور وہ قتل شرعاً ناجائز بھی ہو تو اس کے مانع ارث ہونے پر تمام فقہاء کا اتفاق ہے البتہ قتل کی دیگر اقسام کے بارے میں اُن کے مابین اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔''

''اختلاف دین: یہ مانع مسلمانوں کی میراث کے ساتھ مخصوص ہے۔اس لئے مسلمان کسی غیر مسلم کا اور غیر مسلم کسی مسلمان کا وارث نہیں بن سکتا۔حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشادِ گرامی ہے:

لَا یَرِثُ الْمُسْلِمُ الْکَافِرَ وَلَا الْکَافِرُ الْمُسْلِمَ (صحیح بخاری' صحیح مسلم)
''مسلمان کافر کا اور کافر مسلمان کا وارث نہیں بن سکتا۔''

''لیکن ایک عیسائی یہودی کا' سکھ ہندو کا (وغیرہ وغیرہ) وارث ہو سکتا ہے اس لئے کہ اس قاعدہ کا اطلاق صرف مسلمان پر ہوگا۔''

''مرتد کی میراث: جو شخص اسلام کو چھوڑ کر کوئی دوسرا مذہب اختیار کرلے (یعنی مرتد ہو جائے) وہ بھی مسلمان کا وارث نہیں بن سکتا اور جمہور علماء کا قول یہ ہے کہ کوئی مسلمان رشتہ دار بھی اُس کا وارث نہیں بن سکتا بلکہ اُس کا سارا مال بیت المال کو دے دیا جائے گا۔حنفی فقہاء یہ تفصیل پیش کرتے ہیں کہ جو مال اُس نے مرتد ہونے سے پہلے حاصل کیا تھا' وہ اُس کے مسلم ورثاء کو دے دیا جائے گا اور جو مرتد ہونے کے بعد اُس نے حاصل کیا ہے' وہ بیت المال کو دے دیا جائے گا۔اور اگر مرتد عورت ہو تو اُس کا تمام مال ملکیت اس کے مسلم ورثاء ہی کو دیا جائے۔''

اشتباہِ وارث اور مورث: یعنی یہ معلوم نہ ہو سکے کہ کون وارث اور کون مورث ہے۔مثلاً باپ بیٹا ایک حادثے میں اکٹھے فوت ہو گئے اور یہ معلوم نہ ہو سکا کہ کون پہلے فوت ہوا اور کون بعد میں۔ایسی صورت میں اُن دونوں کے درمیان وراثت جاری نہیں ہوگی۔فقہاء نے اس ضمن میں ایک قاعدہ وضع کیا ہے کہ:

لَا تُرَاثَ بَیْنَ الْغَرْقٰی وَالْهَدٰی
''بیک وقت دب کر یا آگ میں جل کر یا کسی مکان کے نیچے دب کر ہلاک ہونے والے ایک دوسرے کے وارث نہ بن سکیں گے۔''

(۸۸) بیمہ (Insurance)

''کمپنی یا سماج یا حکومت کی طرف سے یہ معاہدہ کہ وہ کسی نقصان' بیماری' موت وغیرہ کی تلافی کی ضمانت دے جس کے بدلہ میں باقاعدہ ادائیگیاں کی جائیں۔'' (Oxford Advanced Learner's Dictionary -- p. 620) 1996 Edn.

''بیمہ کے معاہدہ میں ایک فریق یعنی بیمہ کرنے والا یہ عہد کرتا ہے کہ وہ رقم (پریمیم) کی ادائیگی کے بدلہ میں دوسرے فریق یعنی بیمہ کرانے والے کو مالی فائدہ پہنچائے گا یا اُسے اُس وقوعہ کے وقت مفاد بہم کرے گا جس کا ذکر معاہدہ میں ہو چکا ہے۔'' ("Insurance Law"... Parkington and Anthony, p. 3) London, 1981.

عصرِ حاضر کے جمہور مسلمان فقہاء جدید بیمہ پالیسی کو اسلامی قانون کی روح سے متصادم پاتے ہیں اور اس لئے اُن کے خیال میں یہ غیر معتبر اور غیر اسلامی ہے۔ اُن کا یہ موقف ہے کہ بیمہ' رازق و رزّاق اللہ کے خلاف عدمِ اعتماد اور اُس پر عدم ایمان کا دوسرا نام ہے کیونکہ اُس نے خود اپنی تمام مخلوق کو ضروریاتِ زندگی مہیا کرنے کا ذمہ لیا ہوا ہے جس حقیقت کی طرف قرآن مجید نے کئی مقامات پر اشارہ بھی کیا ہے۔ مثلاً فرمایا گیا:

(۱) وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا (هود : ٦)
''اور زمین پر کوئی جاندار ایسا نہیں کہ اللہ کے ذمّہ اُس کا رزق نہ ہو۔'' (۶ : ۱۱)

(۲) وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ وَمَنْ لَّسْتُمْ لَهٗ بِرٰزِقِيْنَ O (الحجر: ٢٠)
''اور ہم نے اُس (زمین) میں معاش کے سامان تمہارے لئے بھی بنائے اور اُن کے لئے بھی جنہیں تم روزی نہیں دیتے۔'' (۲۰ : ۱۵)

(۳) وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ O (الحج : ۵۸)
''اور اللہ ہی سب رزق دینے والوں سے بہتر اور بڑھ کر ہے۔'' (۵۸ : ۲۲)

(۴) وَمَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ءَ اِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ (النّمل : ٦۴)
''اور تمہیں آسمان اور زمین سے کون رزق دیتا ہے؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی (اور بھی) خدا ہے؟''

(۵) وَكَاَيِّنْ مِّنْ دَآبَّةٍ لَّا تَحْمِلُ رِزْقَهَا اَللّٰهُ يَرْزُقُهَا وَاِيَّاكُمْ (العنکبوت : ٦٠)
''اور کتنے ہی جانور ہیں جو اپنی غذا اُٹھائے نہیں پھرتے' اللہ ہی اُنہیں روزی پہنچاتا ہے اور تمہیں بھی۔''

اس آیت میں ایک بار پھر یہ حقیقت دلوں میں اتاردی ہے کہ اللہ کا تعلق بندوں سے صرف معادی ہی زندگی کا

نہیں بلکہ اس ناسوتی زندگی اور اس کے معاشی پہلوؤں پر بھی پورا پورا ہے اور اس کے ایک ایک جزیئیہ کے ساتھ ہے۔ بے صبرے انسان کو سمجھایا ہے کہ جانوروں کی حالت پر غور کرو۔ وہ کب اپنا رزق اپنے ساتھ لئے لئے پھرتے ہیں لیکن اس کے باوجود اُنہیں بھی کہیں بھوکا نہیں رکھا جاتا اور اُن کی غذا اُنہیں بہم پہنچائی ہی جاتی ہے تو انسان کیوں اپنے متعلق اتنا بے آس ہوا جاتا ہے؟ انسان کے لئے کیا اتنا بھی اہتمام نہ ہوگا جتنی پرواحیوانات کے لئے کی جاتی ہے؟

بیمہ پالیسی کی مخالفت اور اس کے عدم جواز میں یہ دلیل دی جاتی ہے کہ اسلامی قانون غرار (یعنی بے یقینی) کے معاملات کرنے کی اجازت نہیں دیتا جن میں نہ تو فروخت کرنے والے کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے کیا چیز بیچی ہے اور نہ ہی خریدنے والے کو معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے کیا خریدا ہے۔ بیمہ میں انشورنس پالیسی کے خریدار کو نہیں معلوم کہ اُس نے اپنے پریمیم سے کیا خریدا ہے۔ فریقین کے لئے وقتِ وقوع بھی غیر یقینی ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے بیمہ بنیادی طور پر ایک غرار (غیر یقینی) معاہدہ ہے۔ اپنے موقف کی تائید میں وہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیثِ مبارکہ کا حوالہ دیتے ہیں جس میں نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے غرار (غیر یقینی) فروخت سے منع فرمایا۔ (بدایۃ المُجتہد۔۔ابن رُشد' صفحہ ۳۳۱)

''پریمیم: یہ وہ رقم ہے جس پر بیمہ کرنے والی کمپنی خطرہ مول لینے کے لئے تیار ہوتی ہے اور بیمہ کے معاہدہ میں ہونے والے ممکنہ نقصان کے بار کی متحمل ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے پریمیم' بیمہ معاہدہ کی قسط ہوتی ہے۔ قانونِ اوسط (Law of Averages)☆ اور تجربہ کی رُو سے بیمہ کرنے والا اپنے ممکنہ خطرے سے نمٹنے اور دوسرے اخراجات بہ شمول منافع کے معقول رقم حاصل کرتا ہے۔'' ("Islamic Law of Contract"... Liaqat Ali Khan Niazi, p. 384)

''بیمہ کی اقسام: بیمہ کی حسبِ ذیل چار اقسام ہیں:

(۱) بیمہ حیات: ''زندگی کا بیمہ کرنے والی کمپنی اس بات کا اقرار اور عہد کرتی ہے کہ اگر بیمہ کرانے والا ایک مقررہ مدت تک ایک خاص رقم ماہوار' ششماہی یا سالانہ ادا کرتا رہے گا تو وہ مقررہ مدت کے خاتمے یا موت پر مقرر کردہ رقم ادا کرے گی۔'' (فیروز اللغات۔۔فیروز سنز لاہور' صفحہ ۲۷۲)

''بیمہ حیات کا مقصد بیمہ کرانے والوں کی وفات کے بعد اُن کے اہل وعیال کی مالی امداد کرنا ہوتا ہے تاکہ اُن کے جانے کے بعد اہلِ خانہ مفلس وکنگال نہ ہو جائیں۔'' ("Islamic Law of Contracts and Business Transactions"... Dr. Muhammad Tahir Mansuri, pp. 102, 103)

☆ یہ اصول کہ اگر دو انتہاؤں میں سے ایک واقع ہو تو دوسری بھی ہوگی تاکہ توازن رہے۔ (آکسفورڈ اردو انگلش ڈکشنری۔۔شان الحق حقی صفحہ ۸۴)

(۲) ''بیمہ صحت: یہ انشورنس پالیسی بیمہ ہونے والے کی بیماری یا جسمانی ضرر کی صورت میں طبی علاج معالجہ کو شامل ہوتی ہے۔''

(۳) ''بیمہ جائیداد: یہ پالیسی اُس بیمہ دار کی تلافی کرتی ہے جو کسی حادثے یا المیہ کے نتیجہ میں اپنی جائیداد، اثاثے یا دوسرے متعلقات کے بارے میں نقصان سے دوچار ہوا ہو۔''

(۴) قرضوں اور مالی واجبات کا بیمہ (Liability Insurance): اسے ''تھرڈ پارٹی انشورنس'' بھی کہا جاتا ہے اور اُس صورتِ حال سے متعلق ہوتی ہے جس میں بیمہ دار کے علاوہ نقصان اٹھانے والے کسی اور فریق کے تحفظ کے لئے بیمہ ہوا ہو۔ یہ پالیسیاں مختلف قسم کی تجارتوں اور مختلف پیشہ ورانہ خدمات کو شامل ہوتی ہیں۔ وہ لوگوں اور تنظیموں کے نقصان کے مقابل تحفظ کرتی ہیں۔'' ("Islamic Law of Contracts and Business Transactions"... Dr. Muhammad Tahir Mansuri, pp. 102, 103)

''بیمہ میں غرار (بے یقینی) کی اقسام: بیمہ میں غرار کا قدرتی عنصر مندرجہ ذیل اقسام کا ہوتا ہے:

''(۱) انشورنس کی رقم کی ادائیگی کا غیر یقینی ہونا: بیمہ کے مخالفین کا کہنا ہے کہ یہ بات غیر یقینی ہے کہ آیا بیمہ دار کو تلافی کی رقم وصول ہوگی یا نہیں؟ بہ الفاظِ دیگر بیمہ دار غیر یقینی کیفیت میں ہے کہ اُس نے پریمیئم کے بدلے میں کیا خریدا ہے۔''

''کار کے بیمہ کی مثال کو لیجئے۔ اس قسم کی انشورنس میں بیمہ دار تمام سال کار چلاتا ہے۔ اگر اُسے کوئی حادثہ پیش نہیں آتا تو وہ کمپنی سے کسی قسم کا مطالبہ نہیں کرتا اور اس طرح اُس کی پریمیئم کی رقم کسی مادّی منفعت کے بغیر ضائع جاتی ہے۔ اور اگر اُسے کوئی سنجیدہ حادثہ پیش آتا ہے جس سے اُس کی کار کو بہت نقصان پہنچتا ہے تو اُسے کمپنی اُس کے ادا شدہ پریئمم سے کئی گنا زیادہ ادا کرتی ہے۔ ظاہر ہے کہ بیمہ دار کو بہ وقت معاہدہ یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ پریئمم کی رقم سے کیا خرید رہا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر وہ کسی حادثے سے دوچار نہیں ہوتا تو اُسے کچھ بھی نہ ملے گا' ورنہ حادثہ کی صورت میں وہ ادا شدہ پریئمم سے کئی گنا زیادہ وصول کرے گا۔ یہ دونوں صورتیں اُس کے لئے غیر یقینی ہیں۔''

''(۲) وقتِ ادائیگی کے بارے میں غرار (بے یقینی): بہ وقتِ معاہدہ فریقین میں سے کسی کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ آیا کوئی وقوعہ درپیش ہوگا کہ نہیں۔ اگر کوئی حادثہ پیش آ جائے تو یہ بیمہ دار کے لئے مالی منفعت کا سبب بن جاتا ہے ورنہ اُسے کچھ نہیں ملتا۔ اس طرح مالی منفعت کا حصول اُس حادثے کے واقع ہونے پر منحصر ہے جس کی تخصیص معاہدہ میں کر دی گئی ہے۔''

''(۳) طبیعی مقدار کے بارے میں غرار: اس کا مطلب یہ ہے کہ بہ وقتِ معاہدہ بیمہ دار کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اُس کے نقصان کی کس قدر تلافی کی جائے گی کیونکہ اس کا انحصار اُس ناخوشگوار واقعہ کے حجم و مقدار پر ہے جس

کی تخصیص معاہدہ میں کی گئی ہے۔''

''غرار کے بارے میں بیمہ کے حامیوں کا موقف اور اُس کا جواب: مندرجہ بالا موقف کی تردید میں مسلمان علماء کی ایک اور جماعت کے نزدیک بیمہ پالیسی شریعت کے خلاف نہیں ہے اور وہ اس میں غرار (بے یقینی) کا کوئی عنصر نہیں دیکھتے۔اس جماعت کے کچھ علماء کو یہ بات تسلیم ہے کہ بیمہ پالیسی میں غرار کا عنصر موجود تو ہے لیکن وہ اتنا اہم نہیں جس کی وجہ سے بیمہ پالیسی کو ناجائز کہا جا سکے۔اُن کا نقطہ نظر قدرے تفصیل کے ساتھ ذیل میں زیرِ بحث لایا جاتا ہے:۔

''(۱) بیمہ پالیسی کے معاہدہ میں بے یقینی (غرار) کی کوئی بات نہیں: بیمہ پالیسی میں جب بیمہ دار انشورنس کوَر وصول کرتے وقت جو چیز خریدتا ہے وہ اُس حادثے کی تلافی کی رقم نہیں ہوتی جو اُسے یا اُس کی جائیداد کو پیش آتا ہے۔دراصل وہ تو ذہنی سکون خریدتا ہے۔اُس کی اداشدہ رقم کا یہ باوثوق بدل ہے اور اُس کی سرمایہ کاری پر یہ صحیح بدل ہے۔اگر اُسے یا اُس کے اثاثہ جات کو کوئی حادثہ پیش آتا ہے تو اُس کی تلافی کر دی جاتی ہے اور اُس کے نقصان کا ازالہ ہو جاتا ہے۔لیکن اگر کوئی حادثہ یا وقوعہ پیش نہیں آتا تو وہ پہلے سے زیادہ خوش نصیب ہوتا ہے کیونکہ اُسے کسی مصیبت سے دوچار نہیں ہونا پڑا۔''

''دراصل یہ موقف درست نہیں ہے۔بیمہ پالیسی کا خریدار اپنے پریمئم کے ذریعے سکون یا تحفظ نہیں خریدتا بلکہ وہ تو بیمہ کی رقم کو خریدتا ہے جس کا ذکر معاہدہ میں واضح طور پر کر دیا جاتا ہے کہ پریمئم کی رقم اصل پریمئم کی قیمت ہے۔اب اس بات کے کہنے کی ضرورت نہیں کہ انسانی جذبات کوئی ایسے ٹھوس اثاثہ جات تو ہیں نہیں جنھیں خریدا یا بیچا جا سکے۔کوئی شخص دوسرے سے یہ وعدہ نہیں کر سکتا کہ وہ اُسے خوشی' ذہنی سکون یا تن آسانی مہیا کرے گا۔''

''(۲) بیمہ پالیسی میں غرار کم درجے کی ہے: چونکہ بیمہ میں غرار (بے یقینی) کم درجے کی ہے لہٰذا یہ چیز معاہدہِ بیمہ کو عدمِ نفاذ کے قابل نہیں بناتی۔اس کی وجہ یہ ہے کہ بیمہ کمپنی اصل واقعہ کے وقوع کی پیش گوئی کر سکتی ہے۔اپنے ماضی کے تجربہ اور کچھ واقعات کے سائنسی مشاہدہ کی رُو سے وہ خطرے کا تعین کر لیتی ہے۔کثیر التعدادی اصول کی مدد سے وہ کچھ متوقع وقوعات کا کسی قدر صحت کے ساتھ اندازہ کر لیتی ہے۔اس طرح معاہدہِ بیمہ میں غرار کا عنصر نظر انداز کرنے کے قابل ہوتا ہے۔''

''اس خاص پہلو پر غور کرنے سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ موقف کہ بیمہ پالیسی میں غرار کا عنصر نظر انداز کئے جانے کے قابل ہے' صحیح نہیں ہے۔بیمہ قدرتی طور پر غیر یقینی کا ہی معاہدہ ہوتا ہے۔غرار اور غیر یقینی ہمیشہ اس معاہدہ کے نمایاں پہلو ہوتے ہیں۔لیکن اگر ہم تھوڑی دیر کے لئے فرض کر لیں کہ بیمہ معاہدہ غیر یقینی کا معاہدہ نہیں ہے کیونکہ کمپنی وقوعہ کے وقوع کی کچھ صحت کے ساتھ پیش گوئی کر دیتی ہے تو پھر ہمارا یہ موقف بھی تو ناقابلِ تردید ٹھہرتا ہے کہ

بیمہ دار کے لئے وقوعہ بھی تو غیر یقینی ہوتا ہے۔ اُسے معلوم نہیں ہوتا کہ وقوعہ واقع ہوگا کہ نہیں۔ پس ثابت ہوا کہ بیمہ دار کے لئے معاہدۂ بیمہ غیر یقینی ہوتا ہے۔''
("Islamic Law of Contracts and Business Transactions"... Dr. Muhammad Tahir Mansuri, pp. 105- 106)

مصر کے مشہور و معروف سکالر ڈاکٹر یوسف القرضاوی اپنی تصنیف ''الحلال و الحرام فی الاسلام'' میں بیمہ پالیسی کے متعلق لکھتے ہیں :

''موجودہ دور کی لائف انشورنس اور اس قسم کی دوسری انشورنس کمپنیوں کی بابت اسلام کا موقف کیا ہے اور شریعتِ اسلامی اس بارے میں کیا کہتی ہے' اس سوال کا جواب دینے سے پہلے ہمیں ان کمپنیوں کی فطری خصوصیت اور بیمہ دار اور بیمہ فرم کے باہمی تعلق کی فطری خصوصیت کے متعلق معلوم کرنا چاہئے۔ بہ الفاظ دیگر یہ معلوم کریں کہ آیا بیمہ دار فرم کے مالکان کا حصہ دار ہے۔ اگر ایسا ہے تو فرم کی طرف سے ہر بیمہ کئے گئے شخص کا اس فرم کے نفع و نقصان میں حصہ ہونا چاہئے کیونکہ اسلام میں شراکت داری اور حصہ داری کا یہی مطلب ہے۔''

''حادثات کے بیموں میں بیمہ دار سال میں ایک مخصوص پریمئم ادا کرتا ہے۔ اگر انشورنس پالیسی میں مخصوص کئے گئے جائداد (دکان' کارخانہ وغیرہ) سے متعلق وہ سال بھر کسی حادثے سے دوچار نہیں ہوتا تو حاصل شدہ پریمئم کمپنی کا ہوتا ہے اور بیمہ دار کو کچھ بھی نہیں دیا جاتا۔ اس کے برعکس اگر بیمہ دار کو کوئی حادثہ پیش آتا ہے تو اُسے معاہدہ کے مطابق رقم ادا کی جاتی ہے۔ اس قسم کا معاملہ تجارت یا حصہ داری سے بہت دُور ہے۔''

''فرض کریں ایک آدمی اپنی زندگی کا بیمہ بیس ہزار ڈالر میں کراتا ہے اور پہلا پریمئم ادا کرنے کے بعد ہی مرجاتا ہے تو اُس کے ورثاء بیس ہزار ڈالر کی پوری رقم لینے کے مستحق ہو جاتے ہیں۔ اگر یہ معاہدہ شراکتی تجارت کا ہوتا تو اُس کے ورثاء صرف ادا شدہ پریمئم بہ شمول اُس پر منافع کے حقدار ہوتے۔ اسی طرح اگر ایک بیمہ دار کچھ پریمئم ادا کرنے کے بعد انشورنس معاہدہ کے مطابق باقی پریمئم ادا نہیں کر پاتا تو وہ اپنی ساری ادا شدہ رقم یا اُس کے جزوی حصہ سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ اس بارے میں کم از کم جو بات کہی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ اسلامی نظامِ قانون میں یہ صورت عدم نفاذ کے قابل ہے۔''

''وہ دلیل جس میں بیمہ دار اور بیمہ فرم کے ہر دو فریق اپنی آزادانہ رضامندی سے اپنے مفادات کے تحت اس معاہدہ میں شامل ہوتے ہیں' اپنے اندر کچھ وزن نہیں رکھتی بالکل اسی طرح جیسے دو جوئے باز یا سود دینے والا اور سود لینے والا باہمی رضامندی سے معاہدہ کرتے ہیں۔ وہ معاملہ جو مبنی بر انصاف نہ ہو یا مہلات اور استحصال پر مبنی ہو تو اس میں فریقین کی باہمی رضامندی کسی کام کی نہیں ہوتی۔ علاوہ ازیں چونکہ یہاں انصاف جس میں کسی بھی فریق کا نقصان نہیں ہوتا' ہی اصل معیار ہے تو ایسا معاملہ جس میں کچھ صورتوں میں تو ایک فریق سب کچھ لے جائے جبکہ دوسرے فریق کو کسی قسم کے مفاد کی ضمانت حاصل نہ ہو تو وہ نافذ العمل نہیں ہو سکتا۔''

''کیا انشورنس کمپنیوں کی تشکیل تعاونِ باہمی کی بنیاد پر ہے؟ یہ بات واضح ہے کہ بیمہ دار اور بیمہ فرم کے مابین تعلق کو شراکتی یا حصّہ داری کا تعلق نہیں کہا جا سکتا۔ تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اُن کا یہ باہمی تعلق کس نوعیت کا ہے؟ کیا یہ تعلق امدادِ باہمی کا ہے یعنی کیا بیمہ کی فرموں کو امدادِ باہمی کی فرمیں سمجھنا چاہئے جنہیں اُن کے ارکان نے کچھ رقم بطور حصّہ داری ادا کرنے پر ایک دوسرے کی مدد کرنے کے لئے تشکیل کیا ہے؟''

''کسی بھی جماعت میں مضبوط بنیادوں پر امدادِ باہمی کے نظام کے استحکام کے لئے جس کا مقصد ہر پیش نہادہ اُفتاد یا مصیبت میں اپنے ممبران کی مدد کرنا ہو، جمع شدہ رقم کے معاملہ میں درجِ ذیل شرائط کی پابندی ضروری ہے:۔

''(۱) ہر وہ رکن جو اپنا مقرر شدہ حصّہِ رقم ادا کرتا ہے، جذبہِ اخوت میں بطور عطیہ دے۔ انہی عطیات سے ضرورت مندوں کی مدد کی جاتی ہے۔''

''(۲) اگر اس رقم کے کچھ حصہ کی سرمایہ کاری کی جائے تو صرف حلال و جائز تجارت میں کی جائے۔''

''(۳) کسی ممبر کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ اپنا عطیہ اس شرط پر دے کہ وہ کسی ناگہانی آفت کے وقت پہلے سے طے شدہ رقم وصول کرے گا۔ بلکہ اُسے اتنی رقم ملے گی جس سے اس کے کل یا جزوی نقصان کی تلافی ہو جائے جس کا انحصار جماعت کے اُن ذرائع پر ہوگا جو حاصل شدہ رقوم پر ہوتا ہے۔''

''(۴) مُعطی (عطیہ دینے والے) کی جانب سے عطیہ ہبہ (Gift) ہوتا ہے جس کا واپس لینا حرام ہے۔''

''بیمہ کی فرمیں اپنا سرمایہ ایسی تجارتوں میں لگاتی ہیں جس کا انحصار سودی لین دین پر ہوتا ہے جو حرام ہے اور مسلمان کو ایسی سرگرمیوں سے روکا گیا ہے۔ تمام کے تمام متشدّد اور بہت روادار فقہاء اس نکتے پر متفق ہیں۔''

''علاوہ ازیں بیمہ عوامی نظریہ امدادِ باہمی سے متصادم ہے۔ اب جبکہ امدادِ باہمی کا اصول اس بات کا متقاضی ہے کہ غریب و نادار اور ضرورتمند کو امیر اور خوشحال سے زیادہ دیا جائے، امیر جو زیادہ سے زیادہ پریمئم ادا کرسکتا ہے، موت یا حادثے کے وقت غریب سے کہیں زیادہ لے جاتا ہے۔''

''ایک ترمیم اور اصلاح: میرے خیال میں حادثات کے بیموں میں اس طرح اصلاح کی جا سکتی ہے جس سے وہ قانونِ اسلامی کے قریب ہو جائے اور وہ تلافی کی شرط کے ساتھ عطیہ دینے کے معاہدے کی صورت میں ہو۔ بیمہ دار اپنی ادائیگیوں کے عطیہ کو کمپنی کو ادا کرے گا اس اقرار کے ساتھ کہ کمپنی کسی حادثے یا اُفتاد کے وقت اُس کی تلافی اتنی رقم سے کرے گی جو اُس کی معاونت کا سبب ہوگی اور اُس کے نقصان کے بار کو کم کرے گی۔ اس قسم کے کاروباری معاملہ کی فقہ کے کچھ اسلامی مکاتبِ فکر میں اجازت ہے۔ اگر ایسی ترمیم بااثر ہو جاتی ہے اور اگر کمپنی

سودی کاروبار سے آزاد ہو جاتی ہے تو حادثاتی بیمہ کو جائز قرار دیا جا سکتا ہے۔ جہاں تک بیمۂ حیات کا تعلق ہے تو میں اسے اسلامی طرزِ تجارت سے بہت بعید پاتا ہوں۔''

''اسلام کا نظام بیمہ: ہمارا یہ مشاہدہ کہ جدید طرز کی بیمہ کمپنیاں اور اُن کی حالیہ کارکردگی اسلامی نقطہ نظر سے قابلِ اعتراض ہے' کیا یہ مطلب نہیں کہ اسلام بیمہ کے نظریہ کے خلاف ہے۔۔ نہیں ہرگز نہیں۔۔ بلکہ اسلام اِن کمپنیوں کے ذرائع اور طریقوں کے خلاف ہے۔ اگر بیمہ کے کوئی ایسے طریقے اختیار کئے جائیں جو اسلامی طرزِ تجارت سے متصادم نہ ہوں تو اسلام اُنہیں خوش آمدید کہتا ہے۔''

''بہر حال اسلامی نظام نے مسلمانوں اور دوسرے اُن لوگوں کا پہلے ہی سے منفرد انداز میں بیمہ کیا ہوا ہے جو اس کی ریاست میں رہ رہے ہیں' ایسا منفرد انداز جو اس کی تمام تعلیمات اور قانون سازی میں سرایت کئے ہوئے ہے۔ بیمہ رسانی کا یہ عمل یا تو افراد کے امدادِ باہمی کے ذریعے یا حکومت اور اس کے محکمہ مال کے ذریعے تکمیل پاتا ہے کیونکہ محکمہ مال یعنی ''بیت المال'' اُن سب کے لئے بین الاقوامی بیمہ کمپنی ہے جو اسلامی ریاست کے اندر رہنے والے ہیں۔''

''شریعتِ اسلامی میں ہم افراد کے لئے حادثات کا بیمہ اور اُن حادثات میں اُن کی مدد کرنا پاتے ہیں جن سے وہ دوچار ہوں۔ قبل ازیں ہم نے یہ بیان کیا تھا کہ جو شخص کسی اُفتاد اور بلائے ناگہانی کی وجہ سے کنگال اور مفلس ہو جائے تو اُسے مالی معاونت کے لئے بالخصوص انتظامی سربراہان کے آگے ہاتھ پھیلانے کی اجازت ہے جب تک کہ مکمل طور پر اُس کی تلافی نہ ہو جائے اور وہ دوبارہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو سکنے کے قابل نہ ہو جائے۔☆

''ہمیں متوفّی کے ورثاء کے لئے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ایک حدیثِ مبارکہ میں بھی بیمہ کا نظریہ ملتا ہے جو صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں درج ہے۔

☆ صحیح مسلم کی روایت ہے کہ ابوبشر قُبیصہ ابن المخارف رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں جملہ دینے پر تیار ہو گیا [حملہ وہ رقم ہوتی ہے جو امن و امان کو قائم رکھنے کے لئے دو متحارب (لڑنے والے) فریقوں کو ادا کی جاتی ہے] اور رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا کہ آپ میری مدد فرمائیں۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''اُس وقت تک انتظار کرو جب تک ہمارے پاس صدقات آئیں اور ہم اُن میں سے تمہیں دیں۔ آپ نے فرمایا: اے قُبیصہ! تین صورتوں کے سوا کسی سے کچھ مانگنا جائز نہیں: اُس شخص کے لئے جس نے حملہ ادا کرنے کا ذمہ لیا ہو تو وہ لوگوں سے مدد کرنے کو کہہ سکتا ہے یہاں تک کہ مطلوبہ رقم اکٹھی ہو جائے تو اُسے مدد کو کہنے سے رک جانا چاہئے۔ دوسرا وہ جو کسی بلائے ناگہانی سے دوچار ہونے کے نتیجہ میں اپنی جائیداد سے محروم ہو جائے تو اُسے سوال کرنا جائز ہے یہاں تک کہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جائے۔ تیسرا وہ شخص جو بھوکوں مر رہا ہو یہاں تک کہ اُس کی برادری میں سے تین معتبر شخص اس بات کی گواہی دے دیں کہ یہ شخص واقعی تنگ و غربت کا شکار ہے تو اُس کے لئے دستِ سوال دراز کرنا جائز ہے یہاں تک کہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جائے۔ اے قُبیصہ! ان تین لوگوں کے علاوہ دوسرے لوگوں کا بھیک مانگنا نارِ جہنم ہے اور نارِ جہنم کا کھانا ہے۔'' (ابوداؤد' نسائی)

’’میں ہر مسلمان سے اُس کی اپنی ذات کی نسبت زیادہ قریب ہوں ۔ اگر تو وہ اپنے پیچھے کوئی ترکہ چھوڑ جائے تو وہ اُس کے وارثوں کا ہے اور اگر وہ اپنے پیچھے کوئی قرض یا بال بچوں والا کنبہ چھوڑ جائے تو گویا اُس نے اُنہیں مجھ پر چھوڑا ہے اور اُن کی کفالت میری ذمہ داری ہے ۔‘‘

یعنی حکومتِ اسلامیہ پر اُن کی کفالت کی ذمہ داری ہے ۔

’’بیمہ کی عظیم ترین شکل جسے اسلام نے مسلمانوں کے لئے قانونی شکل دی ہے‘ وہ زکوٰۃ کے مستحقین کے زمرہ میں ’’غارمین‘‘ (مقروضوں) کا طبقہ ہے ۔ لفظِ غارم کا مطلب شروع کے علمائے تاویل نے یہ لیا ہے: ’’وہ شخص جس کا مکان جل گیا ہو‘ یا جس کی جائیداد یا تجارت طوفان وسیلاب یا دوسری کسی آفت سے تباہ و برباد ہو گیا ہو ۔‘‘ کچھ فقہاء کا کہنا ہے کہ ایسے شخص کو زکوٰۃ فنڈ سے اتنی رقم دینی چاہیے جس سے اُس کی مالی حالت سنبھل کر پہلی جیسی ہو جائے اگر چہ وہ رقم ہزاروں ڈالرز تک پہنچتی ہو ۔‘‘ [’’الحلال و الحرام فی الاسلام‘‘ (انگریزی ترجمہ) ۔ ـ ڈاکٹر یوسف القرضاوی‘ صفحات ۲۷۴ تا ۲۷۷]

جیسا کہ پہلے بیان ہوا کہ از روئے حدیثِ مبارکہ متوفّی کے ورثاء کی کفالت اسلامی حکومت کی ذمہ داری ہے لیکن جہاں اسلامی حکومت نہ ہو‘ تو ایسی صورتِ حال سے نمٹنے کے لئے ’’کفالہ‘‘ کا طریق کار ہے: ۔

’’<u>کفالہ کی کارکردگی</u>: کفالہ کا لفظ کفل سے نکلا ہے جس سے مراد کسی بات کی ذمہ داری قبول کر لینا ہے ۔ اس کا فاعل ’’کَافِل‘‘ بمعنیٰ ضامن اور کفیل ہے ۔ عربی میں کہا جاتا ہے: رَجُل ’’کَفِیْل‘‘ ۔ اِمْرَءَة ’’کَفِیْلَة‘‘ وَ قَوْم ’’کَفِیْل‘‘ اس کی جمع کفلاء آتی ہے (المُنجد) ۔ سورہ آلِ عمران کی آیت ۳۷ میں ہے: وَكَفَّلَهَا زَكَرِيَّا یعنی زکریا علیہ السلام کو سیّدہ مریم کی پرورش اور تربیت کا ذمہ دار مقرر کیا ۔ گویا کہ لغوی اعتبار سے اس لفظ کے تین معنی ظاہر ہوتے ہیں: ۔

(۱) اَلتَّحَمُّل : یعنی کسی کا بار اٹھا لینا اور کسی کی ذمہ داری کا بوجھ اٹھانا ۔
(۲) اَلتَّکَفُّل : کسی کی کفالت‘ پرورش اور تربیت وغیرہ کی ذمہ داری قبول کر لینا ۔
(۳) اَلْمَسْئُوْلِیَّة : کسی انسان کے متعدد یا بعض معاملات کی جوابدہی اپنے ذمے لے لینا ۔

ان تینوں معنوں میں لغوی طور پر ذمہ داری کا احساس عبارۃ النص سے واضح ہو رہا ہے اس لئے کفالت کو اردو میں ضمانت کے معنی میں بھی اکثر استعمال کیا جاتا ہے اور ضامن‘ کفیل اور ضمانتی وغیرہ ہم معنی لفظ اور مترادفات شمار ہوتے ہیں ۔

’’<u>کفالہ کی شرعی حیثیت</u>: عقدِ کفالہ کے تمام اقسام کی اجازت قرآنِ حکیم اور حدیث سے ثابت ہے ۔

قرآنِ حکیم میں حضرت یوسف علیہ السلام کے قصہ میں جب اُن کے بھائیوں نے دوسرے بھائی کو ساتھ لے جانے کا عندیہ دیا تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا:

لَنْ أُرْسِلَهُ مَعَكُمْ حَتّٰى تُؤْتُوْنِ مَوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ لَتَأْتُنَّنِيْ بِهٖ (یوسف : ۶۶)

"میں اُسے ہرگز تمہارے ساتھ نہ بھیجوں گا جب تک کہ تم اللہ کے نام سے مجھے پیمان نہ دے دو کہ اُسے میرے پاس ضرور واپس لے آؤ گے۔" (۶۶ : ۱۲)

اسی طرح سورہ یوسف میں جب سپاہی حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کو پکڑنے آئے تو اُنہوں نے بھی اُن سے عہدِ کفالت کیا کہ:

وَلِمَنْ جَآءَ بِهٖ حِمْلُ بَعِيْرٍ وَّأَنَا بِهٖ زَعِيْمٌ O (یوسف : ۷۲)

"اور جو شخص بادشاہ کا پیالہ لا کر دے گا، اُس کے لئے ایک بار شتر انعام ہے۔" (۷۲ : ۱۲)

اسی سورۃ میں پھر ایک مقام پر برادرانِ یوسف علیہ السلام کو عقدِ کفالہ کی ترغیب دیتے ہوئے اس طرح ضامن بنتے ہیں:

قَالُوْا يَا أَيُّهَا الْعَزِيْزُ إِنَّ لَهٗ أَبًا شَيْخًا كَبِيْرًا فَخُذْ أَحَدَنَا مَكَانَهٗ (یوسف : ۷۸)

"کہنے لگے کہ اے سردار! اس کا باپ بہت بوڑھا ہے۔ اِس کی جگہ آپ ہم میں سے کسی کو رکھ لیجئے۔"

اسی طرح سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۸۲ میں ارشادِ باری تعالیٰ ہوا:

فَإِنْ كَانَ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيْهًا أَوْ ضَعِيْفًا أَوْ لَا يَسْتَطِيْعُ أَنْ يُّمِلَّ هُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهٗ بِالْعَدْلِ

"لیکن اگر قرض لینے والا خود کم عقل یا ضعیف ہو یا خود لکھوا نہ سکتا ہو تو اُس کا ولی انصاف کے ساتھ املا کرا دے۔" (۲۸۲ : ۲)

اسی طرح یہ احادیثِ مبارکہ ہیں:

(۱) اَلزَّعِيْمُ غَارِمٌ" (کفیل یا ضامن قرض یا ذمہ داری ادا کرنے کا پابند ہے) (ابوداؤد، ترمذی: کتاب القرض)

(۲) مَنْ خَلَّفَ مَالًا أَوْ حَقًّا فَلِوَرَثَتِهٖ وَمَنْ خَلَّفَ كَلًّا أَوْ دَيْنًا فكله عَلَيَّ وَدَيْنُهٗ عَلَيَّ (نیل الاوطار للشوکانی : باب ضمان دَين البيت)

"جو شخص فوت ہوا اور ترکہ میں مال چھوڑا تو وہ مال اُس کے ورثاء کا ہے اور اگر کوئی شخص مقروض فوت ہوا اور اُس کے ترکہ میں قرض ادا کرنے کے لئے کچھ نہیں تو اُس کے قرض کا میں ضامن ہوں۔"

قرآن وحدیث کے علاوہ بھی مفسرین کی رائے میں کفالہ کی اجازت اجماعِ صحابہ سے بھی ثابت ہے او

آج تک امت اس پر عمل کرتی آ رہی ہے اور کسی نے بھی اس کی مخالفت نہیں کی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ کفالہ شرعی طور پر جائز ہے۔'' (''فقہ القرآن'' نصاب ایم اے علوم اسلامیہ' علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد' کوڈ نمبر: ۴۵۵۳' صفحات ۲۷۵' ۲۷۸' ۲۷۹)

کفالہ کی مبادیات سے متعارف کرانے کے بعد اب ہم اصل موضوع کی طرف آتے ہیں:

''اسلامی طرزِ تجارت کی دو قسمیں (مضاربہ اور تبرع) بیمہ کے معاہدہ سے سود اور غرار (بے یقینی) کو خارج کر دیتے ہیں۔ کفالت طریق کار کی مختلف قسمیں درج ذیل ہیں:۔

(۱) خاندان کی کفالت (بیمہ زندگی) : اٹھارہ سے پچپن سال تک کی عمر کا کوئی بھی آدمی اس قسم میں شریک ہو سکتا ہے۔ شراکت داروں کو ایک خاص قسم کا فنڈ قسط وار ادا کرنا ہوتا ہے۔ ہر ادا شدہ قسط کو دو مختلف کھاتوں میں تقسیم کیا جاتا ہے: یعنی شراکت داروں کا کھاتہ (PA) اور کھاتہ داروں کا خصوصی کھاتہ (PSA)۔(PA) کھاتہ میں اقساط کا ایک وقیع حصہ بچت اور سرمایہ کاری کے لئے مختص کیا جاتا ہے۔ اقساط کا کچھ حصہ (PSA) کھاتہ میں بطور ''تبرع'' رکھا جاتا ہے جس سے شراکت دار کی موت کی صورت میں اُس کے ورثاء کو رقم ادا کی جاتی ہے۔(PA) کھاتہ میں رکھی گئی رقوم اسلامی طریقہِ تجارت کے مطابق مختلف تجارتوں میں سرمایہ کاری کے لئے مختص ہوتی ہیں اور اُن سے حاصل ہونے والے منافع شراکت داروں اور حصہ داروں میں اُس خاص تناسب کے ساتھ تقسیم کئے جاتے ہیں جس پر فریق رضامند ہوں۔ حصہ داروں کے حصہ کا حساب (PA) میں رکھی گئی رقوم کے مطابق کیا جاتا ہے۔'' ("Islamic Law of Contracts and Business Transactions"... Dr. Muhammad Tahir Mansuri, pp. 108- 109)

''کسی ناخوشگوار واقعہ' موت یا معذوری کی صورت میں شراکت کمپنی' پالیسی ہولڈر یا اُس کے وارثوں کو رقم ادا کرتی ہے۔(PA) میں رکھی گئی رقوم بہ شمول منافع اور ایک فارمولہ کے مطابق (PSA) میں سے کچھ رقم کمپنی ادا کرتی ہے۔'' (ایضاً صفحہ ۱۱۰)

''کفالہ عمومی : کفالہ عمومی بنیادی طور پر شراکتی ضمانت کا مختصر مدت کا معاہدہ ہوتا ہے جو مضاربت کے اصول پر قائم ہے۔ اس مضاربت میں حصہ داران کسی حصہ دار کے نقصان کی صورت میں اُس نقصان کی تلافی کرتے ہیں۔ ایسی سکیموں کا مقصد افراد اور شراکتی اداروں (Corporate Bodies) کو جائیداد اور اثاثہ جات کو لاحق کسی نقصان یا المیہ کی صورت میں تحفظ فراہم کرنا ہوتا ہے۔''

''جو شخص کفالہ عمومی میں حصّہ دار بننا چاہتا ہے جیسے موٹر کار کفالہ' آگ کفالہ (جس سے اُس کے مکان کو آگ لگ جانے سے نقصان کا ازالہ ہو) وغیرہ تو اُسے ایک خاص رقم ادا کرنا پڑتی ہے جو جائیداد یا اثاثہ جات کی قدر و قیمت کے مطابق ہوتی ہے۔'' (ایضاً صفحہ ۱۱۲)

''کفالہ بزنس کی شرعی تشخیص : کفالہ بزنس کی تعمیر اسلامی نظریہ مضاربت اور تبرّع پر ہے۔ یہ سودی عنصر سے پاک ہے کیونکہ حصّہ دار یا پالیسی ہولڈر اپنے کھاتے (PA) پر کوئی مقرر شدہ منافع نہیں لیتا بلکہ اُس کی حاصل شدہ رقم مختلف اوقات میں مختلف ہوتی ہے۔ اُس کا سرمایہ ''نفع و نقصان'' کے اصول پر اس حدیثِ نبوی کے تحت ہوتا ہے جس میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا : ''منافع خطرات کے پہلو بہ پہلو چلتا ہے۔''

(PA) میں جمع شدہ رقوم اسلامی اصول ہائے تجارت کے مطابق مختلف تجارتوں میں لگائی جاتی ہیں۔ جہاں تک مخصوص کھاتہ میں شراکت داری کا تعلق ہے تو یہ وہی فنڈ ہے جسے ہند و پاکستان کے علماء نے ''وقف'' کا نام دیا ہے۔ چونکہ یہ عطیہ کا معاہدہ ہوتا ہے' لہٰذا کسی حصّہ دار کی جانب سے کفالہ منافع میں غیر یقینی کی کیفیت معاہدہ کے جواز پر اثر انداز نہیں ہوتی۔ عطیہ کے ایسے معاہدہ کی شرعاً اجازت ہے جس میں غرار ہو۔ اس طرح ایک حصّہ دار جو حصّہ داری کے پانچویں سال میں فوت ہو جائے یا مکمل طور پر معذور ہو جائے تو اُسے اپنے سرمائے کا بہ شمول منافع اور پانچ سالہ اقساط کا عطیہ فنڈ سے لینے کا حق حاصل ہوتا ہے۔ یہ فائدہ قانونی طور پر جائز ہے اور سود کی مد میں نہیں آتا کیونکہ یہ اُسے بطور عطیہ دیا گیا ہے۔ فقہائے اسلام اس نکتے پر باہم متفق ہیں کہ غرار (بے یقینی) تبادلہ کے معاہدوں کو باطل کر دیتا ہے نہ کہ عطیہ کے معاہدوں کو۔ اُن کا کہنا ہے کہ کسی نامعلوم جانور یا کسی حادثاتی چیز کا عطیہ یا پھل کے پکنے سے پہلے کا عطیہ یا غصب شدہ چیز کے عطیہ کی اجازت ہے لیکن اُن کی فروخت ناجائز ہے۔ اس سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ کفالہ بزنس موجودہ بیمہ طرزِ تجارت کا اسلامی متبادل ہے۔'' (ایضاً' صفحہ ۱۱۴)

''سود سے پاک بیمہ کی ممکنہ صورت : جمع شدہ رقوم شریعتِ اسلامی کے مضاربت کے اصول پر کاروبار میں لگائی جائیں اور سود کی بجائے منافع حصّہ داروں میں تقسیم کئے جائیں۔''

''بیمہ کو امدادِ باہمی کی بنیاد پر ہونا چاہئے۔ اگر پالیسی ہولڈرز متفق ہوں تو منافع کی کل رقم' نصف' تہائی یا چوتھائی کو علیحدہ تحفظاتی مد میں رکھا جائے تاکہ اُسے بوقتِ ضرورت حادثات کے وقت اصولوں کے مطابق خرچ کیا جا سکے۔ یہ معاونت صرف کمپنی میں اُن حصّہ داروں کے لئے ہوگی جو متعلقہ معاہدہ کے پابند ہوں گے۔''

''حادثاتی صورتوں میں معاونت کے مناسب اصول بنائے جانے چاہئیں۔ عمومی قسم کے حادثات سے نمٹنے یا غرباء کی مدد کے لئے ایک خاص رقم علیحدہ مختص ہونی چاہئے۔ عمومی طور پر ایک صحتمند شخص جو ساٹھ سال کی عمر سے پہلے

فوت ہو جائے' (کہ ساٹھ سال کی عمر کو عام عرصہ حیات سمجھا جاتا ہے) تو اُس کے وارثوں کو کچھ مالی امداد دی جانی چاہیئے اور عمومی صحت کے موجودہ طبی نظام کو جاری رہنا چاہیئے۔''

''اگر بیمہ دار اپنی اقساط کی ادائیگی جاری نہیں رکھ سکتا تو اُس کی پہلی ادا شدہ اقساط غصب یا تلف نہیں ہونی چاہئیں کیونکہ اسلام میں ایسا کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ کمپنی کو کسی قسم کے نقصان سے بچانے کے لئے ایک شرط یہ ہونی چاہیئے کہ ادا شدہ رقم پانچ یا پانچ سال سے زائد کے اختتام سے پہلے قابلِ ادا نہیں ہوگی۔ منافع میں سے بیمہ دار کا حصّہ بھی کم کیا جا سکتا ہے۔ یہ تمام معاملات کمپنی کو طے کرنے چاہئیں کیونکہ وہ ان معاملات کے جواز یا عدمِ جواز پر اثر انداز نہیں ہوتے۔'' ("Our Socio-Economic Order"... Justice Mufti Muhammad Taqi Usmani, pp. 88-90)

''<u>موجودہ بیمہ انڈسٹری اور اسلامی بیمہ انڈسٹری میں فرق</u> : موجودہ بیمہ انڈسٹری اور اسلامی بیمہ انڈسٹری میں فرق نہ صرف اُن کی ہیئت میں ہے بلکہ کاروبار سے نمٹنے کی نوعیت میں بھی ہے۔ بیمہ کے میدان میں بنائی جانے والی آج کی بھیڑ چال تنظیموں میں اسلامی اقدارِ حیات کی نفی ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ موجودہ بیمہ انڈسٹری اپنے سرمائے کو سودی سرمایہ کاری میں لگاتی ہے۔ لیکن اسلامی بیمہ کمپنیاں اس کی بجائے قرضہ جات یا تو براہِ راست مضاربہ کی شکل میں مہیا کرتی ہیں یا اسلامی بنکوں کے ساتھ مشارکت کی بنیاد پر یہ معاملہ ہوتا ہے۔ اسلامی بنکوں میں بیمہ کا شعبہ قائم کیا جانا خصوصی توجہ کا مستحق ہے۔'' ("Islamic Economics"... M.A. Mannan, p. 360)

ایم۔ اے منان اپنی کتاب مذکورہ میں بیمہ کی اہمیت کے بارے میں لکھتے ہیں :

''یہ حقیقت کہ تمام حصّہ داروں کی ادائیگیاں بوقتِ ضرورت ہر حصّہ دار کی معاونت کرتی ہیں' بیمہ کی لازمی خصوصیت ہے۔ ''باہمی مشترک امداد'' (Principle of Mutuality) کا اصول امدادِ باہمی کی کمپنیوں تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ اس کا اطلاق بیمہ کی تمام تنظیموں' جوائنٹ سٹاک کمپنیوں اور سرکاری فنڈوں پر بھی ہوتا ہے۔۔۔ اس طرح بیمہ سماج میں باہمی وابستگی کی ضرورت کی تعلیم دیتا ہے۔ یہی وہ جذبہ ہے جو آفاقی اخوت کے حصول میں بہت مددگار ہے۔ پھر پیداواری مقاصد میں بیمہ کو قومی بچت کی حرکت پذیری میں بہت ہی مؤثر مانا گیا ہے۔ مثلاً سرمایہ داری معیشت کے اس حیات آفریں شعبہ سے پاکستان بخوبی آگاہ ہے اور بیمہ انڈسٹری نے حیاتیاتی اور بے حیاتیاتی دونوں میدانوں میں تیز رفتاری جاری رکھی ہے۔'' (ایضاً صفحہ ۳۵۷)

(۸۹) عقیدہ شفاعت (Intercession)

لفظ ''شفاعت'' سے متعلق کئی الفاظ اُنتیس (۲۹) مرتبہ قرآن مجید میں استعمال ہوئے ہیں۔

عقیدہ شفاعت کے مخالفین کے اعتراضات اور اُن کا جواب : (1) عقیدہِ شفاعت کے مخالفین کی پہلی دلیل یہ ہے کہ اُن کے مطابق قرآن مجید میں شفاعت کی پُرزور تردید کی گئی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ بروزِ قیامت شفاعت سے متعلق قرآن مجید کا بنیادی نکتہ یہ ہے کہ اللہ قادرِ مطلق ہونے کے ناطے سے اپنے اور اپنی مخلوق کے درمیان تعلق قائم کرنے میں خود مختار ہے اور اس لئے اُس دن شفاعت کی کوئی بھی کوشش باثمر اور مؤثر ثابت نہیں ہوگی۔ وہ اس حدیث کا حوالہ بھی دیتے ہیں جس میں ختمی مرتبت ﷺ نے اپنی بیٹی سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ میں تم سے خدا کا عذاب دفع نہیں کرسکتا۔ نیز اپنے موقف کی تائید میں وہ درج ذیل آیات بھی پیش کرتے ہیں :۔

(۱) وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِىْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْئًا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ O (البقرة : ۱۲۳)

''اور اُس دن سے ڈرو جب کوئی کسی کے بھی کام نہ آئے گا اور نہ اُس کی طرف سے معاوضہ قبول کیا جائے گا اور نہ اُسے سفارش نفع پہنچا سکے گی اور نہ اُنہیں مدد ہی پہنچ سکے گی۔'' (۱۲۳ : ۲)

جواب : آیتِ مذکورہ اور اس سے قبل کی آیت (۱۲۲) بنی اسرائیل (یہود) سے متعلق ہے جو اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان لانے کے باوجود ختمی مرتبت ﷺ کی رسالت کا انکار کر کے کافر ہوئے اور راندہِ درگاہِ الٰہی ہوئے۔ ایسے ہی لوگوں کی بابت قرآن نے یہ وعید سنائی ہے :

مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ حَمِيْمٍ وَّلَا شَفِيْعٍ يُّطَاعُ O (المؤمن : ۱۸)

''ظالموں کا نہ کوئی دلی دوست ہوگا اور نہ سفارشی جس کی بات مان بھی لی جائے۔'' (۱۸ : ۴۰)

یعنی کافروں کا نہ کوئی دوست اور نہ کوئی سفارشی ہوگا جس کا کہا مانا جائے۔ اگر مسلمانوں کا بھی کوئی دوست اور شفیع نہ ہو تو مؤمن و کافر میں فرق کیا رہا؟

سیّدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا سے یہی تو فرمایا جار ہا ہے کہ اگر تم نے ایمان قبول نہ کیا تو تمہاری شفاعت نہ ہوگی۔ (تفسیر نعیمی ج ا ص ۴۰۴ ـ مفتی احمد یار خاں گجراتی)

(۲) لَا يَمْلِكُوْنَ الشَّفَاعَةَ (مریم : ۸۷)

''شفاعت کا اختیار کوئی بھی نہ رکھے گا۔'' (۸۷ : ۱۹)

جواب : اس کا جواب اس سے متصل آیت ہی میں اِلَّا سے استثناء کر کے دے دیا گیا اور فرمایا گیا :

اِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا O (مریم : ۸۷)

''بجز اس کے جس نے خدائے رحمان سے اجازت لے رکھی ہے۔'' (۸۷ : ۱۹)

آیت متقین سے متعلق ہے جنہوں نے خدائے رحمان سے شفاعت کا عہد لے رکھا ہے۔ معلوم ہوا کہ متقین باذنِ الٰہی شفاعت کریں گے اور جب (عام) متقین کا یہ مقام ہے تو امام المتقین ﷺ کے مقام و مرتبہ کا کیا کہنا!

ہم کہتے ہیں کہ اگر شفاعت کوئی چیز نہیں تو نمازِ جنازہ بھی نہیں ہونی چاہئے کیونکہ وہ بھی شفاعت ہی ہے جو اس میت کو سامنے رکھ کر اُس کے لئے دعا کرتے ہیں اور بچے کو اپنا شفیع بناتے ہیں اور بچے کے جنازے پر پڑھتے ہیں:

اَللّٰهُمَّ اجْعَلْهُ لَنَا فَرَطًا وَّاجْعَلْهُ لَنَا شَافِعًا وَّمُشَفَّعًا

''اے اللہ! اس بچے کو ہمارا شفیع (سفارشی) بنا۔''

(۳) اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُفَعَاءَ قُلْ أَوَلَوْ كَانُوْا لَا يَمْلِكُوْنَ شَيْئًا وَّلَا يَعْقِلُوْنَ ○ قُلْ لِّلّٰهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيْعًا لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ (الزُّمَر: ۴۳، ۴۴)

''اچھا تو کیا ان لوگوں نے اللہ کے سوا دوسروں کو سفارشی قرار دے رکھا ہے؟ کہہ دیجئے کہ اگرچہ یہ (سفارشی) کچھ بھی قدرت نہ رکھتے ہوں اور نہ کچھ سمجھتے بوجھتے ہوں۔ آپ فرما دیجئے کہ تمام تر سفارش اللہ ہی کے اختیار میں ہے، اُسی کی سلطنت آسمانوں اور زمین میں ہے۔'' (۴۳، ۴۴: ۳۹)

یہ آیت بھی مشرکین اور کفار کے بارے میں ہے جو رب کے دشمنوں کو شفیع مان کر عذابِ الٰہی کے مورد ہو رہے ہیں۔ یہ کفار اور مشرکین سمجھتے تھے کہ رب تعالیٰ کو بتوں کی سفارش (معاذ اللہ) مجبوراً ماننی پڑے گی کیونکہ وہ اُس کی خدائی میں دخیل ہیں لہٰذا وہ کافر ہوئے۔ ہم مقبولانِ خدا کی شفاعت بالاذن اور شفاعت بالعزت اور بالوجاہت عطائی مانتے ہیں۔

آیت ۴۴ میں فرمایا جا رہا ہے کہ شفاعت کرنے کا اختیار تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے دیا جاتا ہے اور اُس کے اِذن کے بغیر تو کسی کی مجال نہیں کہ لب کشائی کر سکے جیسا کہ سورۃُ البَقَرۃ کی آیت ۲۵۵ میں فرمایا: مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗ إِلَّا بِإِذْنِهٖ یعنی اللہ کی اجازت کے بغیر شفاعت کیسی! اور اُن کے معبودوں کو تو شفاعت کا کوئی اختیار نہیں دیا گیا تو وہ کیسے اُن کی شفاعت کریں گے؟ کفار اہلِ کتاب کہتے تھے کہ ہم اگرچہ کفر کریں، ہمارے آباء و اجداد جو انبیاء و مرسلین تھے، ہمیں بخشوا لیں گے۔ اُنہیں فرمایا گیا کہ وہ حضرات واقعی شفاعت کرنے کے اہل ہیں مگر تم لوگ شفاعت حاصل کرنے کے اہل نہیں کہ تم کافر ہو۔ شفاعت کے لئے ضروری ہے کہ شفاعت کرنے والا شفاعت کرنے کا اہل ہو اور حاصل کرنے والا شفاعت پانے کا اہل ہو۔ سورۃ البقرۃ کی مذکورہ آیت (۲۵۵) میں شفاعت بالاذن کا ثبوت ہے۔

(۴) فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشَّافِعِيْنَ ○ (اَلْمُدَّثِّر: ۴۸)

''سو اُنہیں سفارش کرنے والوں کی سفارش کوئی نفع نہ دے گی۔'' (۷۴:۴۸)

اس آیت کا سباق یوم آخرت کے منکرین سے متعلق ہے اور اُنہی کے بارے میں فرمایا جا رہا ہے کہ اُنہیں سفارش کرنے والوں کی سفارش کوئی فائدہ نہ دے گی۔ اُن پر قہر و غضب الٰہی ہوگا کہ اُنہیں شفاعت فائدہ نہ دے گی۔ اگر مسلمانوں کا بھی یہی حال ہو تو اُن میں اور کفار میں کیا فرق رہا؟ جیسا کہ سورۃ الشُّعَراء (۲۶) کی آیات ۸۸، ۸۹ میں فرمایا: یَوۡمَ لَا یَنۡفَعُ مَالٌ" وَّلَا بَنُوۡنَ O اِلَّا مَنۡ اَتَی اللّٰہَ بِقَلۡبٍ سَلِیۡمٍ O (جس دن نہ مال کام آئے گا اور نہ اولاد مگر ہاں جو اللہ کے پاس پاک دل لے کر آئے) یعنی ایسا دل جو کفر و شرک کی آلائش سے پاک ہو۔ معلوم ہوا کہ مسلمانوں کے لئے مال بھی کارآمد اور اولاد بھی فائدہ مند۔ جبکہ مشرکین کے لئے مال و اولاد بے کار رہوں گے۔

(۵) عقیدہ شفاعت کے منکرین کا یہ بھی کہنا ہے کہ اس عقیدے سے مسلمان بدعمل ہو جائیں گے کیونکہ وہ شفاعت پر اعتماد کر کے اعمال سے غافل ہو جائیں گے۔

جواب : یہ اعتراض تو ایسا ہی ہے جیسے آریہ کہتے ہیں کہ توبہ کا مسئلہ بدعمل بناتا ہے۔ منکرین کو معلوم نہیں کہ شفاعت سے امید بڑھے گی اور امید سے شوقِ عمل زیادہ ہوگا۔

عقیدہ شفاعت کے قطعی انکار میں معتدل عنصر : عقیدہ شفاعت سے بہ ظاہر قطعی انکار کو قرآن مجید کی کچھ دیگر آیات میں معتدل عنصر کے طور پر لیا گیا ہے۔ وہ لوگ (بہ شمول فرشتے) جنہوں نے اللہ بزرگ و برتر سے وعدہ لے رکھا ہے، سب اللہ کی طرف سے شفاعت کے مختار ہیں۔ مثلاً ذیل کی آیات ملاحظہ ہوں:

(۱) لَا یَمۡلِکُوۡنَ الشَّفَاعَۃَ اِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنۡدَ الرَّحۡمٰنِ عَہۡدًا O (مریم : ۸۷)
"شفاعت کا اختیار کوئی بھی نہ رکھے گا بجز اس کے جس نے خدائے رحمان سے اجازت لے رکھی ہے۔" (۸۷ : ۱۹)

(۲) وَلَا یَمۡلِکُ الَّذِیۡنَ یَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِہِ الشَّفَاعَۃَ اِلَّا مَنۡ شَہِدَ بِالۡحَقِّ وَہُمۡ یَعۡلَمُوۡنَ O (الزخرف : ۸۶)
"اور جنہیں یہ اللہ کے سوا پکارتے ہیں، اُنہیں تو سفارش تک کا اختیار نہیں، ہاں جن لوگوں نے حق کا اقرار کیا اور وہ (پیغمبر علیہ السلام کی) تصدیق بھی کرتے ہیں وہ البتہ سفارش کر سکیں گے۔" (۸۶ : ۴۳)

(۳) وَکَمۡ مِّنۡ مَّلَکٍ فِی السَّمٰوٰتِ لَا تُغۡنِیۡ شَفَاعَتُہُمۡ شَیۡئًا اِلَّا مِنۡۢ بَعۡدِ اَنۡ یَّاۡذَنَ اللّٰہُ لِمَنۡ یَّشَآءُ وَیَرۡضٰی O (اَلنّجم : ۲۶)
"اور آسمانوں میں بہت سے فرشتے ہیں کہ اُن کی سفارش ذرا بھی کام نہیں آسکتی مگر ہاں بعد اس کے کہ اللہ اجازت دیدے جس کے لئے وہ چاہے اور اُس کی رضا ہو۔" (۲۶ :۵۳)

کفار کی اس غلط فہمی کو دور کیا جا رہا ہے کہ ان بتوں اور مورتیوں کا تو خیر ذکر ہی نہیں جو سرے سے شفاعت کی کوئی اہلیت ہی نہیں رکھتے۔ نورانی مخلوق ملائکہ مقربین تک کی یہ مجال نہیں کہ اپنی رائے اور ارادہ سے جس کی چاہیں،

ہماری جناب میں بے دھڑک سفارش کر ڈالیں اور اُسے بخشوا کر جنت میں پہنچا دیں بلکہ وہ بھی صرف اجازتِ الٰہی کے بعد ہی اس کی جرأت کر سکتے ہیں۔ لِمَنۡ یَّشَآءُ کا مطلب بھی یہی ہے کہ سفارش کی اجازت بھی صرف اُسی کے حق میں ملے گی جسے خود حضرتِ حق کی مشیّت چاہ رہی ہو۔ وَیَرۡضٰی کی قید غالبًا اس لئے بڑھادی کہ کہیں دنیا والوں کی طرح وہاں بھی یہ قیاس نہ کیا جائے کہ نعوذ باللہ حق تعالیٰ کو بھی کسی کے لحاظ یا خوف سے اپنی مرضی کے خلاف اجازت دے دینا پڑے گی۔ مرضیِ حق خود ہی سب سے بالا تر ہے جس کے اوپر کوئی مؤثر نہیں۔ معلوم ہوا کہ جب فرشتے بھی کفر و شرک پر مرنے والوں کی شفاعت نہیں کر سکتے تو یہ بت تمہاری نجات کا سبب کیسے بن سکتے ہیں؟

(2) (۱) اپنے موقف کی تائید میں عقیدۂ شفاعت کے منکرین سورۃ البقرۃ کی مندرجہ ذیل آیت بھی پیش کرتے ہیں جس میں مؤمنین تک کو تنبیہ کی جا رہی ہے کہ اُس دن کوئی سودے بازی نہیں ہوگی، کوئی دوستی کام نہیں آئے گی اور کوئی سفارش فائدہ نہیں دے گی:۔

یَا اَیُّھَاالَّذِیۡنَ آمَنُوۡا أَنفِقُوۡا مِمَّا رَزَقۡنٰکُمۡ مِّنۡ قَبۡلِ أَنۡ یَّأۡتِیَ یَوۡمٌ" لَّا بَیۡعٌ "فِیۡهِ خُلَّةٌ" وَّلَا شَفَاعَةٌ" وَ الۡکَافِرُوۡنَ هُمُ الظَّالِمُوۡنَ O (البقرۃ : ۲۵۴)

''مؤمنو! ہمارے دیئے میں سے اللہ کی راہ میں وہ دن آنے سے پہلے خرچ کرو جس میں نہ تجارت کام آئے گی، نہ دوستی اور نہ سفارش اور کافر ہی تو ظالم ہیں۔'' (۲۵۴ : ۲)

جواب: کفار ہی دراصل اِن نعمتوں سے محروم ہیں ورنہ یہاں اُن کا ذکر نہ کیا جاتا۔ یہاں مؤمنین کو اس لئے خطاب کیا جارہا ہے کہ کہیں زکوٰۃ کا انکار کر کے اُن کا شمار کفار میں نہ ہو جائے۔ یہاں کفار سے مراد منکرینِ زکوٰۃ ہیں جیسا کہ تفسیر روح البیان نے فرمایا: اَیۡ وَالتَّارِکُوۡنَ لِلزَّکوٰةِ۔ مؤمنین کا تو رب تعالیٰ کے ہاں بڑا مرتبہ اور مقام ہے کہ بروئے حدیثِ مبارکہ مسلمانوں کے چھوٹے بچے اپنے والدین کے لئے رب سے جھگڑا کریں گے۔ معلوم ہوا کہ یہ حضرات بارگاہِ الٰہی میں ناز کرتے ہیں اور اُن کے ناز قبول فرمائے جاتے ہیں۔ (نعیمی ج ۱، ص ۴۰۲)

(۲) وَلَاتَزِرُ وَازِرَةٌ" وِّزۡرَ أُخۡرٰی (الانعام : ۱۶۴ ؛ اَلنَّجم : ۳۸)

''اور کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے گا۔'' (۱۶۴ : ۶ ؛ ۳۸ : ۵۳)

جواب: علامہ بیضاوی نے فرمایا کہ یہ آیت بت پرستوں کے اُس زعم کے جواب میں ہے جس میں اُنہوں نے مسلمانوں سے کہا تھا:

اِتَّبِعُوۡا سَبِیۡلَنَا وَلۡنَحۡمِلۡ خَطٰیٰکُمۡ (العنکبوت : ۱۲)

''ہماری راہ پر چلو اور تمہارے گناہ ہمارے ذمہ ہیں۔'' (۱۲ : ۲۹)

لَاتَزِرُ وَازِرَةٌ" وِّزۡرَ أُخۡرٰی کی آیت عیسائی عقیدے ''کفّارۂ مسیح'' کی بھی نفی کرتی ہے۔

مندرجہ ذیل حدیثِ مبارکہ جس کے راوی جناب ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہیں، عقیدہ شفاعت کا انتہائی مضبوط

اور نا قابلِ انکار ثبوت ہے کہ ختمی مرتبت ﷺ نے فرمایا :

إِذَا مَاتَ الْإِنْسَانُ اِنْقَطَعَ عَمَلُه' إِلَّا مِنْ ثَلَاثَةٍ : إِلَّا مِنْ صَدَقَةٍ جَارِيَةٍ أَوْعِلْمٍ يُنْتَفَعُ بِهِ أَوْ وَلَدٍ صَالِحٍ يَدْعُوْا لَه'(مسلم : كتاب الوصايا ؛ سنن ابی داؤد: كتاب الوصايا ؛ نسائی: كتاب الوصايا ؛ ترمذی و مسند احمد بن حنبل؛ السنن الكبرىٰ للبيهقی ؛ شرح السُّنّة للبغوی)

''انسان کے مرنے پر اُس کا عمل سوائے تین چیزوں کے کٹ جاتا ہے: صدقہ جاریہ' یا ایسا علم جس سے فائدہ اٹھایا جائے یا نیک اولاد جو اُس کے لئے (مغفرت کی) دعا کرے۔''

یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ اولاد کے نیک اعمال والدین کے لئے اُن کی وفات کے بعد بھی ذریعہ نجات بن جاتے ہیں جس سے صاف ظاہر ہے کہ ایک آدمی کی نیکیاں دوسرے کے بھی کام آتی ہیں۔ کوئی شک نہیں کہ حدیثِ مذکورہ میں اوّل الذکر دو کام متوفّی (مرنے والے) کے ذاتی کام ہیں لیکن اُس کی اولاد کی نیکیاں تو اُس کی اپنی ذاتی نہیں لیکن اس کے باوجود اُن کا اُسے فائدہ مل رہا ہے۔ اُن لوگوں کو جو رحمتِ الٰہی کو محدود و مقیّد کرنے پر تلے ہوئے ہیں' اپنے رویّے پر شرم آنی چاہئے کہ اُن کا یہ رویّہ تعلیماتِ اسلامی کے سراسر خلاف ہے۔

نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے وصال پر سیدنا ابو بکر صدّیق رضی اللہ عنہ نے ختمی مرتبت ﷺ کے چہرہ انور سے نقاب اٹھایا اور یوں ملتجی ہوئے :

أُذْكُرْنَا يَامُحَمَّدُ عِنْدَ رَبِّكَ وَلْنَكُنْ مِّنْ بَالِكَ (زهرالآداب ١ : ٣٥)

''اے قابلِ صد ستائش ہستی! اپنے رب کے ہاں ہمارا ذکر کر دینا اور ہمیں اپنے دل میں یاد رکھنا۔''

ایک اور حدیثِ مبارکہ میں آپ ﷺ نے فرمایا :

إِذَا سَمِعْتُمُ الْمُؤَذِّنَ فَقُوْلُوْا مِثْلَ مَا يَقُوْلُ ثُمَّ صَلُّوْا عَلَيَّ فَإِنَّه' مَنْ صَلّٰى عَلَيَّ صَلَاةً صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ بِهَا عَشْرًا ثُمَّ سَلُوا اللّٰهَ لِيَ الْوَسِيْلَةَ فَإِنَّهَا مَنْزِلَةٌ فِي الْجَنَّةِ لَا تَنْبَغِيْ إِلَّا لِعَبْدٍ مِّنْ عِبَادِاللّٰهِ وَأَرْجُوْا أَنْ أَكُوْنَ أَنَا هُوَ فَمَنْ سَأَلَ لِيَ الْوَسِيْلَةَ حَلَّتْ لَهُ الشَّفَاعَةُ (صحيح مسلم : كتاب الصلوٰة ؛ سنن ابی داؤد : كتاب الصلوٰة ؛ جامع الصحيح للترمذی : كتاب المناقب ؛ سنن نسائی: كتاب الاذان ؛ مسند احمد بن حنبل ؛ شرح السُّنّة للبغوی ؛ صحيح ابن حبّان ؛ السُّنن الكبرىٰ للبيهقی ؛ مشكوة المصابيح : كتاب الصلاة ؛ كنزالعمال لعلاء الدين)

''جب تم مؤذن کو اذان کہتے سنو تو جیسے وہ کہے تم بھی (اُسی طرح) کہتے جاؤ پھر مجھ پر درود بھیجو کیونکہ جو شخص مجھ پر ایک مرتبہ درود بھیجتا ہے تو رب تعالیٰ اُس کے بدلے میں اُس پر دس رحمتیں بھیجتا ہے۔ اس کے بعد تم میرے لئے جنت میں مقامِ وسیلہ کی (رب سے) درخواست کرو جس کا کوئی بندہ اہل نہیں اور مجھے امید ہے کہ میں ہی اُس کا اہل ہوں۔ تو جو شخص میرے لئے مقامِ وسیلہ کی (رب سے) درخواست کرے تو اُس کے لئے (میری) شفاعت واجب ہوگئی۔''

قرآنِ حکیم نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام اور فرشتوں کی طرف سے شفاعت کا ذکر بھی کرتا ہے جو گنہگار اور نادم و تائب مسلمانوں اور مؤمنوں کی مغفرت کی دعا کرتے رہتے ہیں :

(۱) فَاعۡفُ عَنۡهُمۡ وَاسۡتَغۡفِرۡ لَهُمۡ (آلِ عمران : ۱۵۹)

''سو آپ اُن سے درگزر کیجئے اور اُن کے لئے بخشش مانگئے۔'' (۱۵۹ : ۳)

(۲) وَلَوۡ أَنَّهُمۡ إِذۡ ظَّلَمُوۡا أَنۡفُسَهُمۡ جَآءُوۡكَ فَاسۡتَغۡفَرُوا اللّٰهَ وَاسۡتَغۡفَرَ لَهُمُ الرَّسُوۡلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيۡمًا ○ (اَلنساء : ۶۴)

''اور کاش کہ جس وقت یہ لوگ اپنی جانوں پر ظلم کر بیٹھے تھے تو آپ کے پاس آجاتے پھر اللہ سے مغفرت چاہتے اور رسول بھی اُن کے حق میں مغفرت چاہتے تو وہ ضرور اللہ کو توبہ قبول کرنے والا اور مہربان پاتے۔'' (۶۴ : ۴)

(۳) اَلَّذِيۡنَ يَحۡمِلُوۡنَ الۡعَرۡشَ وَمَنۡ حَوۡلَهٗ يُسَبِّحُوۡنَ بِحَمۡدِ رَبِّهِمۡ وَيُؤۡمِنُوۡنَ بِهٖ وَ يَسۡتَغۡفِرُوۡنَ لِلَّذِيۡنَ آمَنُوۡا رَبَّنَا وَسِعۡتَ كُلَّ شَيۡءٍ رَّحۡمَةً وَّعِلۡمًا فَاغۡفِرۡ لِلَّذِيۡنَ تَابُوۡا وَاتَّبَعُوۡا سَبِيۡلَكَ وَقِهِمۡ عَذَابَ الۡجَحِيۡمِ ○ رَبَّنَا وَ أَدۡخِلۡهُمۡ جَنّٰتِ عَدۡنِ ﹰالَّتِيۡ وَعَدۡتَّهُمۡ وَ مَنۡ صَلَحَ مِنۡ آبَآئِهِمۡ وَأَزۡوَاجِهِمۡ وَذُرِّيّٰتِهِمۡ إِنَّكَ أَنۡتَ الۡعَزِيۡزُ الۡحَكِيۡمُ ○ (المؤمن : ۷، ۸)

''جو (فرشتے) عرش کو اٹھائے ہوئے ہیں اور جو (فرشتے) اُس کے اِردگرد ہیں وہ اپنے پروردگار کی تسبیح حمد کے ساتھ کرتے رہتے ہیں اور اُس پر ایمان رکھتے ہیں اور ایمان والوں کے لئے استغفار کیا کرتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! تیری رحمت اور علم ہر چیز کو شامل ہے۔ سو تو اُن لوگوں کو بخش دے جنہوں نے توبہ کر لی ہے اور تیری راہ پر چلتے ہیں' اُنہیں دوزخ کے عذاب سے بچالے۔ اے ہمارے پروردگار! اُنہیں ہمیشگی کی بہشتوں میں داخل کردے جن کا تو نے اُن سے وعدہ کیا ہے اور اُن کے والدین اور بیویوں اور اولادمیں سے جو (بہشت کے) لائق ہیں سو اُنہیں بھی داخل کر دے۔ بے شک تو زبردست ہے' حکمت والا ہے۔'' (۷، ۸ : ۴۰)

<u>مقامِ محمود اور روزِ حساب کو نبی علیہ السلام کا شفاعتِ کبریٰ کے منصبِ جلیلہ کا حامل ہونا</u>

سورہ بنی اسرائیل کی آیت ۷۹ میں ربِّ ذوالجلال والاکرام نے اپنے محبوب علیہ السلام سے باَیں الفاظ وعدہ فرمایا : عَسٰى أَنۡ يَّبۡعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحۡمُوۡدًا ○ (عنقریب آپ کا رب آپ کو مقامِ محمود پر فائز فرمائے گا۔)

''مقامِ محمود کی تفسیر میں چار قول ذکر کئے گئے ہیں : (۱) نبی ﷺ کو شفاعتِ کبریٰ عطا فرمانا۔ (۲) نبی ﷺ کو حمد کا جھنڈا (لِوَاءُ الۡحَمۡد) عطا فرمانا (۳) نبی علیہ السلام کو دوزخ سے مسلمانوں کو نکالنے کے لئے شفاعت کی اجازت عطا فرمانا۔ (۴) اللہ تعالیٰ کا نبی ﷺ کو اپنے ساتھ عرش پر بٹھانا (یہ قول مخدوش ہے) (الجامع لاحکام القرآن' جز ۱۰' ص ص ۲۷۶ تا ۲۸۰ بحوالہ تبیان القرآن از علامہ غلام رسول سعیدی' جز ۶' ص ۷۷۵)

<u>شفاعتِ کبریٰ کے متعلق احادیث</u>: شفاعتِ کبریٰ سے مراد وہ شفاعت ہے جو سب سے پہلی شفاعت

ہو گی کہ اللہ تعالیٰ محشر والوں کا حساب شروع کرے گا۔ اُس دن اللہ تعالیٰ اس قدر جلال میں ہو گا کہ کوئی شخص اُس سے کلام کرنے کی جرأت نہیں کر سکے گا۔ سب خوف زدہ ہوں گے۔ اُس وقت نبی ﷺ عرش کے نیچے ربّ ذوالجلال و الاکرام کو سجدہ کریں گے اور پھر ربّ ذوالجلال آپ کو اذنِ شفاعت عطا فرمائے گا۔ یہی ''مقامِ محمود'' ہے کہ جو کام کوئی نہ کر سکے گا' وہ کام آپ قیامت کے دن کریں گے اور تمام اوّلین و آخرین آپ کی تعریف و تحسین کریں گے۔

(۱) ''سیّدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ قیامت کے دن لوگ مختلف گروہوں میں بٹ جائیں گے۔ ہر گروہ اپنے نبی کی پیروی کرے گا۔ وہ کہیں گے کہ اے فلاں! ہماری سفارش کیجئے حتی کہ شفاعت نبی ﷺ تک پہنچے گی۔ یہ وہ دن ہے جب اللہ تعالیٰ آپ کو مقامِ محمود پر فائز کرے گا۔'' (صحیح بخاری رقم الحدیث: ۴۷۱۸؛ سنن النسائی' رقم الحدیث: ۲۵۸۵)

(۲) ''سیّدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ سے اس آیت کے متعلق سوال کیا گیا: عَسٰٓی اَنْ یَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا O تو آپ نے فرمایا کہ یہ وہ مقام ہے جس میں میں اپنی امت کی سفارش کروں گا۔'' (مسند احمد' رقم الحدیث: ۹۶۹۰ ؛ جامع البیان' رقم الحدیث: ۱۷۰۷۰)

(۳) ''سیّدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا: قیامت کے دن سورج قریب آجائے گا حتی کہ لوگوں کے آدھے کانوں تک پسینہ پہنچ جائے گا۔ وہ اسی حال میں ہوں گے پھر وہ حضرت آدم علیہ السلام سے شفاعت کی فریاد کریں گے' پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے' پھر سیّدنا محمد ﷺ سے تو آپ شفاعت کریں گے تاکہ مخلوق کے درمیان فیصلہ کیا جائے۔ پھر آپ جا کر جنت کے دروازے کے حلقے کو پکڑ لیں گے۔ اُس وقت اللہ تعالیٰ آپ کو مقامِ محمود پر فائز کرے گا اور تمام اہلِ محشر آپ کی تعریف اور تحسین کریں گے۔'' (صحیح بخاری' رقم الحدیث: ۱۴۷۵؛ صحیح مسلم' رقم الحدیث: ۱۰۴۰؛ سنن النسائی' رقم الحدیث: ۲۵۸۵)

(۴) ''سیّدنا اَنس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ قیامت کے دن لوگ دریا کی موجوں کی طرح بے قرار ہوں گے۔ پھر وہ حضرت آدم علیہ السلام کے پاس جائیں گے اور کہیں گے کہ آپ ہمارے لئے اپنے رب سے شفاعت کیجئے۔ وہ کہیں گے کہ میں اس کے لئے نہیں ہوں۔ لیکن تم حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس جاؤ کہ وہ خلیل الرحمٰن ہیں۔ تو لوگ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس جائیں گے۔ وہ کہیں گے کہ میں اس کے لئے نہیں ہوں۔ لیکن تم موسیٰ علیہ السلام کے پاس جاؤ کہ وہ اللہ کے کلیم ہیں۔ تو لوگ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس جائیں گے۔ وہ کہیں گے کہ میں اس کے لئے نہیں ہوں۔ لیکن تم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پاس جاؤ کہ وہ اللہ کی پسندیدہ روح اور اُس کا کلمہ ہیں۔ تو لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پاس جائیں گے۔ وہ کہیں گے کہ میں اس کے لئے نہیں ہوں۔ لیکن تم پر لازم ہے کہ تم سیّدنا محمد ﷺ کے پاس جاؤ۔ پھر وہ میرے پاس آئیں گے۔ پس میں کہوں گا اَنَا لَهَا اَنَا لَهَا کہ میں ہی اس کے لئے ہوں۔ پھر میں اپنے رب سے اجازت طلب کروں گا تو میرے لئے اجازت دی جائے گی اور میرے دل میں اللہ تعالیٰ کی حمد سے ایسے کلمات ڈالے جائیں گے جو اِس وقت مجھے مستحضر نہیں ہیں اور میں ان کلمات سے اللہ تعالیٰ کی حمد کروں گا اور اللہ کے لئے سجدہ میں گر جاؤں گا۔ پھر کہا جائے گا: یَا مُحَمَّدُ! اِرْفَعْ رَاْسَكَ فَاشْفَعْ تُشَفَّعْ

سَـلْ تُـعْـطَ ''اے سراپا حمد وستائش! اپنا مکھ تو دکھلایئے۔ آپ شفاعت کیجئے' آپ کی شفاعت قبول کی جائے گی اور مانگ کے تو دیکھئے' خالی ہاتھ نہ لوٹاؤں گا۔'' میں کہوں گا: اے میرے رب! میری امت' میری امت۔ آپ سے کہا جائے گا کہ آپ جایئے اور دوزخ سے اُنہیں نکال لیجئے جن کے دل میں ایک جَو کے برابر بھی ایمان ہو۔ میں جاؤں گا اور اسی طرح کروں گا۔ پھر میں واپس آ کر انہی کلمات سے اللہ تعالیٰ کی حمد کروں گا اور پھر اللہ کے حضور سجدہ میں گر جاؤں گا۔ پھر کہا جائے گا: ''اے سراپا حمد وستائش! اپنا مکھ تو دکھلایئے۔ آپ شفاعت کیجئے' آپ کی شفاعت قبول کی جائے گی اور مانگ کے تو دیکھئے' خالی ہاتھ نہ لوٹاؤں گا۔'' میں کہوں گا: اے میرے رب! میری امت' میری امت۔ آپ سے کہا جائے گا کہ آپ جایئے اور دوزخ سے اُنہیں نکال لیجئے جن کے دل میں رائی کے دانہ کے برابر بھی ایمان ہو۔ میں جاؤں گا اور اسی طرح کروں گا۔ پھر میں واپس آ کر انہی کلمات سے اللہ تعالیٰ کی حمد کروں گا اور پھر اللہ کے حضور سجدہ میں گر جاؤں گا۔ پھر کہا جائے گا: ''اے سراپا حمد وستائش! اپنا مکھ تو دکھلایئے۔ آپ شفاعت کیجئے' آپ کی شفاعت قبول کی جائے گی اور مانگ کے تو دیکھئے' خالی ہاتھ نہ لوٹاؤں گا۔'' میں کہوں گا: اے میرے رب! میری امت' میری امت۔ آپ سے کہا جائے گا کہ آپ جایئے اور دوزخ سے اُنہیں نکال لیجئے جن کے دل میں ادنیٰ' ادنیٰ رائی کے درجہ کے برابر بھی ایمان ہو۔ میں جاؤں گا اور اسی طرح کروں گا۔ پھر میں چوتھی بار جاؤں گا اور اسی طرح اللہ تعالیٰ کی حمد کروں گا۔ پھر اللہ کے لئے سجدہ میں گر جاؤں گا۔: ''اے سراپا حمد وستائش! اپنا مکھ تو دکھلایئے۔ آپ شفاعت کیجئے' آپ کی شفاعت قبول کی جائے گی اور مانگ کے تو دیکھئے' خالی ہاتھ نہ لوٹاؤں گا۔'' میں کہوں گا: اے میرے رب! مجھے اُس شخص کے لئے اجازت دیجئے جس نے لَا اِلٰهَ اِلَّا اللہ پڑھا ہو۔ رب فرمائے گا: میری عزت' میرے جلال' میری کبریائی اور میری عظمت کی قسم! جس شخص نے لَا اِلٰهَ اِلَّا اللہ پڑھا ہو' میں اُسے دوزخ سے نکال لوں گا۔'' (صحیح بخاری' رقم الحدیث: ۷۵۱۰ ؛ صحیح مسلم' رقم الحدیث: ۱۹۳ ؛ السنن الکبریٰ للنسائی' رقم الحدیث: ۱۱۲۴۳؛ سنن ابن ماجہ' رقم الحدیث: ۴۳۱۲) [حدیث کا متن اگلے صفحہ ۲۳۲۱ پر ملاحظہ کیا جا سکتا ہے]

''قیامت کے دن نبی ﷺ کی شفاعت کی اقسام: نقاش نے کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ تین قسم کی شفاعت فرمائیں گے: ایک شفاعتِ کبریٰ ہے' دوسری دخولِ جنت کے لئے شفاعت کریں گے اور تیسری گناہِ کبیرہ کرنے والوں کے لئے شفاعت کریں گے۔ ابن عطیہ نے کہا کہ مشہور صرف دو قسمیں ہیں: شفاعتِ عامّہ اور گنہگاروں کو دوزخ سے نکالنے کے لئے شفاعت اور یہ شفاعت دیگر انبیاء علیہم السلام کے علاوہ علماء بھی کریں گے۔''

''قاضی عیاض نے کہا کہ قیامت کے دن ہمارے نبی ﷺ کی شفاعت پانچ قسم کی ہوگی: (۱) شفاعتِ عامّہ۔ (۲) ایک گروہ کو بغیر حساب کے جنت میں داخل کرنے کے لئے شفاعت۔ (۳) آپ کی امت میں سے جو لوگ اپنے گناہوں کی وجہ سے دوزخ کے مستحق تھے' پھر اُن کے لئے اور جن کے لئے اللہ تعالیٰ چاہے گا' نبی ﷺ شفاعت کریں گے اور وہ جنت میں داخل ہو جائیں گے۔ (۴) جو گنہگار دوزخ میں داخل ہو چکے تھے پھر وہ ہمارے نبی ﷺ اور دیگر انبیاء علیہم السلام' ملائکہ اور بعض نیک مسلمانوں کی شفاعت سے دوزخ سے نکال دیئے جائیں گے۔ (۵) اہلِ جنت کے درجات میں اضافہ کے لئے آپ ﷺ شفاعت فرمائیں گے۔'' (الجامع لاحکام القرآن' جز ۱۰' ص ۲۷۸ مطبوعہ دارالفکر بیروت ۱۴۱۵ھ)

۲۳۱۸ (عقیدۂ شفاعت Intercession)

سیّدنا جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس نے اذان سننے کے بعد یہ دعا کی: ''اس دعوتِ کامل اور اس کے بعد کھڑی ہونے والی نماز کے رب! محمد ﷺ کو جنت میں بلند درجہ اور فضیلت عطا فرما اور اُنہیں اُس مقامِ محمود پر فائز فرما جس کا تو نے اُن سے وعدہ فرمایا ہے۔'' تو اُس کے حق میں میری شفاعت واجب ہو جائے گی۔'' (صحیح بخاری' رقم الحدیث: ۴۷۱۹)

انسائیکلو پیڈیا آف دی قرآن (مطبع امریکہ) میں ''عقیدۂ شفاعت'' کا مضمون نگار Valerie J. Hoffman بروزِ قیامت نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے شفیع ہونے میں متشکک ہے۔ وہ لکھتا ہے:

''اسلام میں یہ مستحکم عقیدہ بن چکا ہے کہ محمد (ﷺ) بروزِ حشر مسلمانوں کی شفاعت کریں گے لیکن اس عقیدے کی قرآن سے کہیں تائید نہیں ملتی۔'' (Encyclopedia of the Quran, Vol. 2, p. 551)

ضدٗ جہالت اور حسد کا کوئی علاج نہیں۔ ہف مین کے جواب میں ہم اتنا ہی کہہ سکتے ہیں:

آنکھ والا تیرے جلوے کا تماشہ دیکھے ۔۔۔ دیدۂ کور کو کیا نظر آئے کیا دیکھے!

کیا محولہ بالا قرآنی بیانات سے روزِ روشن کی طرح یہ واضح نہیں ہو گیا کہ ختمی مرتبت علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذاتِ اقدس کو بروزِ حساب اُن کا محبٗ اللہ شفاعتِ کبریٰ کے عظیم اعزاز سے نوازے گا۔ اور یہ اعزاز اس بات کا غماز ہے کہ محبوب علیہ السلام کا اپنے خالق و مالک کے ہاں کیا مقام ہے اور اس میں قادرِ مطلق کے اُس روز مَــالِكِ يَوْمِ الدِّين ہونے کا صریح اشارہ ہے۔

قرآنِ حکیم شفاعت کے مستحکم عقیدے پر خاموش نہیں رہ سکتا تھا کہ ایک طرف تو وہ پُر اثر اور پُر زور انداز میں نبی ﷺ کے منصبِ جلیلہ کی بات کرتا ہے تو دوسری طرف وہ مایوس مسلمان کو رجائیت (Optimism) کی طرف لاتا ہے جو گناہوں کی ناقابلِ فرار دلدل میں خطرناک حد تک ٹامک ٹوئیاں مار رہا ہے۔ اس لئے سورۃ الزُّخرُف کی آیت ۸۶ میں واضح اور غیر مبہم طور پر نوعِ انسانی کو بتایا گیا ہے کہ اللہ کے حضور اُس روز شفیع المذنبین کون ہو گا:

وَلَا يَمْلِكُونَ الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ الشَّفَاعَةَ إِلَّا مَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ وَهُمْ يَعْلَمُونَ O

''اور جنہیں یہ اللہ کے سوا پکارتے ہیں' اُنہیں تو سفارش تک کا اختیار نہیں' ہاں شفاعت کا حق اُنہیں ہے جو حق کی گواہی دیں اور وہ (اُسے) جانتے بھی ہیں۔'' (۸۶ : ۴۳)

علاوہ ازیں سورۃ الضحیٰ کی آیت پنجم بروزِ قیامت ربّ ذو الجلال والاکرام کے حضور نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے شفیع المذنبین ہونے کے لئے کافی ثبوت ہے جس میں فرمایا گیا:

وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضَى O

''اور عنقریب آپ کا رب آپ کو اتنا عطا کرے گا کہ آپ راضی ہو جائیں گے۔'' (۹۳:۵)

مستند روایات کی رُو سے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی انتہائی خوشی ومسرت اس بات میں ہے کہ آپ بہ اذنِ الٰہی اپنے آخری امتی کو اپنے ساتھ جنت میں لے جائیں اور یہ بات آپ کے گنہگار لیکن نادم وتائب امتیوں کے لئے شفیع ہونے کا پکا اور واضح ثبوت ہے۔ امام غزالی (۴۵۰ تا ۵۰۵ھ/۱۰۵۸ تا ۱۱۱۱) فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا اپنے محبوب علیہ السلام کو خوش کن تحفہ آپ کی اُمّت کے لئے آپ کو شفیع بنانا ہے۔ (اِحیاء علوم الدین)

''علامہ آلوسی نے یہاں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے ایک روایت نقل کی ہے:

''حرب بن شریح کہتے ہیں کہ میں نے امام مذکور سے پوچھا کہ جس شفاعت کا ذکر اہلِ عراق کیا کرتے ہیں، کیا یہ حق ہے؟ آپ نے فرمایا: بخدا یہ حق ہے۔ مجھ سے محمد بن حنفیہ نے حضرت علی کرّم اللہ وجھہ' سے روایت کی: اِنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: أَشْفَعُ لِأُمَّتِيْ حَتّٰى يُنَادِيْ رَبِّيْ أَرَضِيْتَ يَا مُحَمَّدُ! فَأَقُوْلُ: نَعَمْ يَا رَبِّ رَضِيْتُ (نبی علی الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ میں اپنی امت کے لئے شفاعت کرتا رہوں گا یہاں تک کہ میرا رب مجھے ندا کرے گا اور پوچھے گا: اے محمد! کیا آپ راضی ہو گئے ہیں؟ میں عرض کروں گا: ہاں میرے پروردگار! میں راضی ہوگیا۔) (ضیاء القرآن، جلد پنجم، صفحہ ۵۸۷)

''امام مسلم نے اپنی صحیح میں یہ حدیث نقل کی ہے:

''عَنِ ابْنِ عُمَرَ أَنَّهُ صَلَّى اللهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَلَا قَوْلَ اللهِ تَعَالٰى فِي إِبْرٰهِيْمَ عليه السلام: فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَإِنَّهُ مِنِّيْ وَقَوْلَهُ تَعَالٰى فِيْ عِيْسٰى إِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَإِنَّهُمْ عِبَادُكَ الْآيَة فَرَفَعَ عَلَيْهِ السَّلَامُ يَدَيْهِ وَقَالَ: اَللّٰهُمَّ أُمَّتِيْ أُمَّتِيْ وَبَكٰى وَقَالَ اللهُ تَعَالٰى: يَا جِبْرَئِيْلُ! اِذْهَبْ إِلٰى مُحَمَّدٍ صَلَّى اللهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَقُلْ لَهُ: إِنَّا سَنُرْضِيْكَ فِيْ أُمَّتِكَ وَلَا نَسُوْءُكَ

''سیّدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ایک دن حضور ﷺ نے یہ آیت پڑھی جس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے عرض کی فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَإِنَّهُ مِنِّيْ (جس نے میری پیروی کی، وہ میرے گروہ سے ہے۔) پھر آپ نے یہ آیت پڑھی جس میں عیسیٰ علیہ السلام نے عرض کی: إِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَإِنَّهُمْ عِبَادُكَ (اگر تو اُنہیں عذاب دے تو وہ تیرے بندے ہیں) پھر آپ نے اپنے دونوں ہاتھوں کو دعا کے لئے اٹھایا اور عرض کی: الٰہی! میری اُمّت، میری اُمّت۔ پھر آپ زار وقطار رونے لگے۔ اللہ تعالیٰ نے جبریل علیہ السلام کو حکم دیا کہ فوراً میرے حبیب کے پاس جاؤ اور اُنہیں یہ پیغام پہنچا دو کہ ہم آپ کو آپ کی امت کے معاملہ میں راضی کر کے رہیں گے اور کبھی آپ کو پریشان نہیں کریں گے۔''

<u>مقامِ محمود کی وضاحت میں چند احادیثِ مبارکہ</u>: (۱) صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی رُو سے آیت عَسٰى أَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا O کی وضاحت میں نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: وَهٰذَا الْمَقَامُ الْمَحْمُوْدُ الَّذِيْ وَعَدَهُ نَبِيَّكُمْ (یہ وہ مقامِ محمود ہے جس کا تمہارے رب نے اپنے نبی سے وعدہ فرمایا ہے)۔

(۲) مقامِ محمود کی وضاحت میں اسی طرح کی حدیث سیّدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے جسے دارمی اور مشکوٰۃ نے بیان کیا ہے۔

(۳) حضرت عوف بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث ہے جس میں آپ ﷺ نے فرمایا:
فَخَيَّرَنِي رَبِّي أَنْ يُدْخِلَ نِصْفَ أُمَّتِي الْجَنَّةَ وَبَيْنَ الشَّفَاعَةِ فَاخْتَرْتُ الشَّفَاعَةَ (ابن ماجہ، ترمذی)
"جبریل میرے پاس یہ خبر لے کر آئے کہ میرے رب نے مجھے اختیار دیا ہے کہ اپنی آدھی اُمّت کو اُن کے اعمال کا حساب کئے بغیر جنت میں لے جاؤں یا اپنی امت کے لئے شفاعت اختیار کرلوں، تو میں نے شفاعت کو منتخب کیا۔"

(۴) جیسا کہ گزشتہ صفحہ میں بیان ہوا کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے ہاتھ دعا کے لئے کھڑے کئے اور زار وقطار رو دیئے۔ تو ربّ ذوالجلال والاکرام نے جبریل کو یہ پیغام دے کر آپ کی تسلی وتشفی فرمائی:
إِنَّا سَنُرْضِيكَ فِي أُمَّتِكَ وَلَا نَسُوءُكَ
"ہم آپ کو آپ کی امت کے معاملہ میں راضی کر کے رہیں گے اور کبھی آپ کو پریشان نہیں کریں گے۔"

(۵) "سیّدنا اَنس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے نبیِ اکرم ﷺ سے قیامت کے دن اللہ سے اپنی شفاعت کرنے کی درخواست کی جس کا آپ نے وعدہ فرما لیا۔ میں نے پوچھا: اے اللہ کے رسول! اُس دن میں آپ کو کہاں پاؤں؟ آپ نے جواب دیا: پہلے تم مجھے پُل صراط پر پاؤ گے۔ میں نے کہا: اگر میں آپ کو وہاں نہ پاؤں تو پھر کہاں؟ آپ نے فرمایا: پھر تم مجھے مقامِ میزان میں پاؤ گے (جہاں لوگوں کے اعمال کا وزن کیا جائے گا)۔ میں نے پھر سوال کیا: اگر وہاں بھی آپ کو نہ پاؤں تو پھر کہاں؟ آپ نے جواب دیا: پھر تم مجھے حوضِ کوثر پر پاؤ گے کیونکہ میں ان تین جگہوں میں سے کسی کو بھی نہ چھوڑ پاؤں گا۔" (ترمذی)

(۶) ایک حدیث کی رُو سے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام روزِ محشر نوعِ انسان کے قائد ہوں گے (صحیح مسلم: ۳۷۹) اور بابِ جنت کے کھولنے کا اعزاز آپ کو حاصل ہوگا (ایضاً ۱۳۲، ۱۳۳)۔ آپ ہی پہلے شفیع ہوں گے اور تمام انبیاء ومرسلین میں آپ ﷺ کی امت کثیر تعداد میں ہوگی۔

(۷) کچھ مستند احادیثِ نبویہ بھی نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بروزِ قیامت اپنی امت کے شفیع ہونے پر مہر ہیں۔ مثلاً آپ نے فرمایا:

(i) مَنْ زَارَ قَبْرِي وَجَبَتْ لَهُ شَفَاعَتِي
(جس نے میری قبر کی زیارت کی، اُس کے لئے میری شفاعت واجب ہوگئی)۔

(ii) شَفَاعَتِي لِأَهْلِ الْكَبَائِرِ مِنْ أُمَّتِي
"میری شفاعت میری امت کے کبیرہ گناہوں کے مرتکبین کے لئے ہے۔"

(iii) ''ہر نبی اور رسول نے جو بھی دعا کی' قبول ہوئی لیکن ہر نبی نے دعا میں جلدی کی۔ لیکن میں نے اپنی دعا کو بروزِ قیامت اپنی امت کی شفاعت کے لئے محفوظ رکھا ہے جو انشاء اللہ اُس کے حق میں قبول ہوگی جو اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرتا ہو۔'' (تفسیر نعیمی ۔۔ مفتی احمد یار خاں گجراتی)

آپ کی دعا سے آپ کے چچا جنابِ ابوطالب کی سزا میں تخفیف ہوگی جنہوں نے اسلام قبول نہیں کیا تھا اور انہیں جہنم کے بالائی طبقے میں رکھا جائے گا۔ (صحیح مسلم' بحوالہ انسائیکلوپیڈیا آف دی قرآن مطبوعہ لیڈن' جلد ۲' ص ۵۵۳)

قیامت کے دن لوگ دیوانہ وار جنابِ آدم' ابراہیم' موسیٰ اور عیسیٰ علیہم السلام کی سفارش کی التجا کریں گے لیکن وہ سب یہ کہہ کر انکار کر دیں گے: اِذْهَبُوْا اِلٰى غَيْرِىْ (میرے علاوہ کسی اور کے پاس چلے جاؤ) لیکن انجام کار حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اپنی تمام امت کے لئے شفیع بنیں گے جیسا کہ ذیل کی حدیثِ مبارکہ سے ثابت ہے جس میں آپ نے فرمایا:

إِذَا كَانَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مَاجَ النَّاسُ بَعْضُهُمْ فِيْ بَعْضٍ فَيَأْتُوْنَ آدَمَ فَيَقُوْلُوْنَ : اِشْفَعْ لَنَا اِلٰى رَبِّكَ فَيَقُوْلُ : لَسْتُ لَهَا وَ لٰكِنْ عَلَيْكُمْ بِاِبْرٰهِيْمَ فَاِنَّهٗ خَلِيْلُ الرَّحْمٰنِ فَيَأْتُوْنَ اِبْرٰهِيْمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ فَيَقُوْلُ: لَسْتُ لَهَا وَلٰكِنْ عَلَيْكُمْ بِمُوْسٰى فَاِنَّهٗ كَلِيْمُ اللّٰهِ فَيَأْتُوْنَ مُوْسٰى عَلَيْهِ السَّلَامُ فَيَقُوْلُ: لَسْتُ لَهَا وَلٰكِنْ عَلَيْكُمْ بِعِيْسٰى فَاِنَّهٗ رُوْحُ اللّٰهِ وَ كَلِمَتُهٗ فَيَأْتُوْنَ عِيْسٰى عَلَيْهِ السَّلَامُ فَيَقُوْلُ: لَسْتُ لَهَا وَلٰكِنْ عَلَيْكُمْ بِمُحَمَّدٍ ﷺ فَيَأْتُوْنَنِيْ فَاَقُوْلُ: أَنَا لَهَا فَاَسْتَأْذِنُ عَلٰى رَبِّيْ فَيُؤْذَنُ لِيْ وَ يُلْهِمُنِيْ مَحَامِدَ أَحْمَدُهٗ بِهَا لَاتَحْضُرُنِيْ الْاٰنَ فَأَحْمَدُهٗ بِتِلْكَ الْمَحَامِدِ وَأَخِرُّ لَهٗ سَاجِدًا فَيُقَالُ : يَا مُحَمَّدُ! اِرْفَعْ رَأْسَكَ وَسَلْ تُعْطَ وَاشْفَعْ تُشَفَّعْ فَأَقُوْلُ : يَارَبِّ! أُمَّتِيْ أُمَّتِيْ فَيُقَالُ: اِنْطَلِقْ فَاَخْرِجْ مِنْهَا مَنْ كَانَ فِيْ قَلْبِهٖ مِثْقَالُ شَعِيْرَةٍ مِّنْ اِيْمَانٍ فَانْطَلِقُ فَأَفْعَلُ ثُمَّ أَعُوْدُ فَأَحْمَدُهٗ بِتِلْكَ الْمَحَامِدِ وَ أَخِرُّ لَهٗ سَاجِدًا فَيُقَالُ: يَا مُحَمَّدُ! اِرْفَعْ رَأْسَكَ وَ سَلْ تُعْطَ وَاشْفَعْ تُشَفَّعْ فَأَقُوْلُ : يَارَبِّ ! أُمَّتِيْ أُمَّتِيْ فَيُقَالُ: اِنْطَلِقْ فَاَخْرِجْ مِنْهَا مَنْ كَانَ فِيْ قَلْبِهٖ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ أَوْ خَرْدَلَةٍ مِّنْ اِيْمَانٍ فَانْطَلِقُ فَأَفْعَلُ ثُمَّ أَعُوْدُ فَأَحْمَدُهٗ بِتِلْكَ الْمَحَامِدِ وَأَخِرُّ لَهٗ سَاجِدًا فَيُقَالُ: يَا مُحَمَّدُ! اِرْفَعْ رَأْسَكَ وَسَلْ تُعْطَ وَاشْفَعْ تُشَفَّعْ فَأَقُوْلُ: يَا رَبِّ! أُمَّتِيْ أُمَّتِيْ فَيُقَالُ: اِنْطَلِقْ فَاَخْرِجْ مِنْهَا مَنْ كَانَ فِيْ قَلْبِهٖ أَدْنٰى أَدْنٰى مِثْقَالَ حَبَّةِ خَرْدَلَةٍ مِّنْ اِيْمَانٍ فَاَخْرِجْهُ مِنَ النَّارِ ثُمَّ أَعُوْدُ الرَّابِعَةَ فَأَحْمَدُهٗ بِتِلْكَ الْمَحَامِدِ وَأَخِرُّ لَهٗ سَاجِدًا فَيُقَالُ: يَامُحَمَّدُ! اِرْفَعْ رَأْسَكَ وَقُلْ يُسْمَعْ لَكَ وَسَلْ تُعْطَ وَاشْفَعْ تُشَفَّعْ فَأَقُوْلُ: يَارَبِّ! اِئْذَنْ لِيْ فِيْمَنْ قَالَ: لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ فَيَقُوْلُ: وَعِزَّتِيْ وَجَلَالِيْ وَكِبْرِيَائِيْ وَعَظَمَتِيْ لَأُخْرِجَنَّ مِنْهَا مَنْ قَالَ : لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ

نوٹ: اس حدیثِ مبارکہ کا ترجمہ گزشتہ صفحات ۲۳۱۶' ۲۳۱۷ پر موجود ہے۔

(2) ''قیامت کے دن نبی ﷺ کو لواءُ الحمد (حمد کا جھنڈا عطا کیا جانا)'': ''مقامِ محمود''

کا دوسرا معنیٰ یہ ہے کہ آپ کو قیامت کے دن حمد کا جھنڈا عطا کیا جائے گا۔

سیّدنا ابوسعید الخدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میں قیامت کے دن تمام اولادِ آدم کا سردار ہوں گا اور اس میں فخر کی کوئی بات نہیں۔ اور میرے ہی ہاتھ میں حمد کا جھنڈا ہوگا اور اس میں فخر کی کوئی بات نہیں (سنن الترمذی، رقم الحدیث: ۳۱۴۸؛ سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث: ۴۳۰۸؛ سنن ابو داؤد، رقم الحدیث: ۴۶۷۳؛ صحیح ابن حبان، رقم الحدیث: ۴۵؛ المستدرک للحاکم ج ۲، ص ۳۵۹؛ دلائل النبوۃ للبیہقی ج ۲، ص ۳۶۴؛ مسند حمیدی، رقم الحدیث: ۴۴۸؛ مصنف ابن ابی شیبہ ج ۱۱، ص ۴۶۰؛ مسند احمد بن حنبل ج ۵، ص ۳۸۷)

(3) ''نبی اکرم ﷺ کی شفاعت سے دوزخ سے مسلمانوں کا نکالا جانا: یہ مقام محمود کا تیسرا معنیٰ ہے جس کے متعلق گزشتہ صفحات ۲۳۱۵ تا ۲۳۱۷ میں شفاعتِ کبریٰ کے زیرِ عنوان احادیث بیان ہو چکی ہیں۔''

(4) ''نبی ﷺ کو عرش پر اپنے ساتھ بٹھانا: علامہ ابوعبداللہ محمد بن احمد مالکی قرطبی (م ۶۶۸ ھ) لکھتے ہیں:

''مجاہد نے یہ روایت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نبی ﷺ کو اپنے ساتھ عرش پر بٹھائے گا۔ اس کو امام ابن جریر طبری (م ۳۱۰ ھ) نے روایت کیا ہے (جامع البیان جز ۱۵، ص ۱۸۳) اس کی تاویل محال نہیں ہے کیونکہ تمام چیزوں کو پیدا کرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ عرش پر بذاتہٖ قائم تھا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے تمام چیزوں کو پیدا کیا جبکہ اُسے اُنہیں پیدا کرنے کی ضرورت نہیں تھی بلکہ وہ اپنی قدرت کا اظہار کرنا چاہتا تھا اور اس میں حکمت یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کو، اُس کی توحید کو، اُس کی قدرت اور اُس کے کمال کو اور اُس کے تمام افعالِ مُحکمہ کو پہچانا جائے۔ اس نے اپنے لئے عرش کو پیدا کیا اور اس پر مستوی ہوا، بغیر اس کے کہ عرش اُس کا مکان ہو یا وہ عرش کو مَس کر رہا ہو۔ وہ عرش پر اپنی شان کے لائق جلوہ افروز ہوا اور تمام مخلوق میں کوئی چیز اُس کے مماثل نہیں ہے اور اس تقدیر پر برابر ہے کہ اللہ تعالیٰ نبی ﷺ کو زمین پر بٹھائے یا عرش پر! کیونکہ اللہ تعالیٰ کے عرش پر مستوی ہونے کا یہ معنیٰ نہیں ہے کہ وہ ایک حال سے دوسرے حال کی طرف منتقل ہوتا ہے یا کھڑا ہوتا ہے یا بیٹھتا ہے اور نبی ﷺ کو عرش پر بٹھانے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ عبدیت کی صفت سے نکل گئے اور (معاذ اللہ) ربوبیت کی صفت میں داخل ہو گئے بلکہ اس میں نبی ﷺ کی تمام مخلوق پر شرف، عزت اور وجاہت کو ظاہر کرنا ہے۔'' (الجامع لاحکام القرآن، ج ۱۰، ص ۲۸۰، مطبوعہ بیروت ۱۴۱۵)

''یہ صرف مجاہد کا قول ہے۔ اس کے متعلق کوئی صحیح، حسن یا ضعیف حدیث رسول اللہ ﷺ سے مروی نہیں ہے اور نہ اس کی تائید میں صحابہ اور تابعین سے کوئی اثر یا قول مروی ہے۔ امام ابنِ جریر اور علامہ قرطبی نے اس پر زور دیا ہے کہ اس کی مخالفت میں کوئی حدیث یا صحابہ اور تابعین کا کوئی قول نہیں ہے اور نہ یہ محال ہے لیکن صرف اتنی سی بات سے یہ قول ثابت نہیں ہوگا جب تک کہ اس کی تائید میں کوئی حدیث یا اثر نہ ہو۔'' (''تبیان القرآن''۔ علامہ غلام رسول سعیدی، جز ششم، ص ۸۷۷)

نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے علاوہ دیگر منتخب افرادِ امت کی جانب سے شفاعت: متعدد احادیثِ مبارکہ میں اللہ کے کچھ برگزیدہ بندوں کا ذکر اللہ کے ہاں بطور شفیع کے کیا گیا ہے جنہیں اللہ بزرگ و برتر روزِ محشر شفاعت کا اِذن عطا فرمائے گا۔ اس ضمن میں درج ذیل احادیث ملاحظہ ہوں :۔

(۱) عَنْ عُثْمَانَ بْنِ عَفَّانَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَشْفَعُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ثَلَاثَةٌ": اَلْاَنْبِيَاءُ ثُمَّ الْعُلَمَاءُ ثُمَّ الشُّهَدَاءُ (ابن ماجه ؛ مشكوٰة : باب الحوض والشفاعة)

''سیّدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: قیامت کے دن تین طرح کے لوگ شفاعت کریں گے: انبیاء علیہم السلام' پھر علمائے کرام اور پھر شہید۔''

(۲) عَنْ أَبِيْ سَعِيْدٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: اِنَّ مِنْ أُمَّتِيْ مَنْ يَّشْفَعُ لِلْفِئَامِ وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّشْفَعُ لِلْقَبِيْلَةِ وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّشْفَعُ لِلرَّجُلِ حَتّٰى يَدْخُلُوا الْجَنَّةَ (ترمذی)

''حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: میری امت کے کچھ لوگ (یعنی علماء' شہداء اور صالحین) کچھ جماعتوں کی شفاعت کریں گے۔ کچھ لوگ قبیلے کی شفاعت کریں گے جبکہ اُن میں سے کچھ لوگ اکیلے ایک آدمی کی سفارش کریں گے۔ اس طرح میری اُمت جنت میں داخل ہوگی۔''

(۳) عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ أَبِي الْجَدْعَاءِ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ: يَدْخُلُ الْجَنَّةَ بِشَفَاعَةِ رَجُلٍ مِّنْ أُمَّتِيْ أَكْثَرُ مِنْ بَنِيْ تَمِيْمٍ (ترمذی' دارمی' ابن ماجه)

''حضرت عبداللہ بن ابی الجدعاء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے اللہ کے رسول ﷺ کو یہ فرماتے سنا: میری اُمت کے ایک فرد کی شفاعت سے جنت میں اس قدر لوگ داخل ہوں گے جس قدر قبیلہ بنی تمیم کے لوگ ہیں۔''

ایک اور حدیثِ مبارکہ میں سیّدنا اُویس قرنی رضی اللہ عنہ کا حوالہ ہے جس میں نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے سیّدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو یوں فرمایا:

لَوْ أَقْسَمَ بِاللّٰهِ لَاَبَرَّه' فَاِنِ اسْتَطَعْتَ أَنْ يَّسْتَغْفِرَ لَكَ فَافْعَلْ (صحيح مسلم : كتاب فضائل الصحابه) بحوالہ "Islamic Concept of Intermediation", p. 333

''اگر وہ اللہ کی قسم اُٹھا لے اور کسی چیز کی فریاد کرے تو اللہ تعالیٰ ضرور اُس کی فریاد کو پورا کرے گا۔ اگر تم اپنی نجات کی دعا کے لئے اُن تک پہنچ سکو تو یہ کام ضرور کرو۔''

اولیائے کرام اور بزرگانِ دین کی شفاعت: امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ (۴۵۰ تا ۵۰۵ھ/۱۰۵۸ تا ۱۱۱۱ء) ''احیاء علوم الدین'' میں لکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ انبیاء' صدیقین' علماء اور صالحین کی شفاعت قبول فرمائے گا۔

اللہ سے سچی محبت رکھنے والے ہر شخص کو اپنے رشتہ داروں، دوستوں اور لواحقین کی شفاعت کرنے کی اجازت دی جائے گی۔

نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام اور اولیائے کرام کی شفاعت کا مفہوم: عقیدہ شفاعت کو شرک کہنے والے یا تو عدم علم کی وجہ سے یا اللہ کی برگزیدہ، منتخب شدہ ہستیوں سے بغض وعناد کی وجہ سے سخت غلط فہمی کا شکار ہیں۔ عقیدہ شفاعت گھاس کے سبزے کی طرح اور چرخ نیلگوں (آسمان) کی نیلاہٹ کی طرح سچا اور سُچا ہے کہ اللہ حکیم مطلق تمام انعامات ونوازشات کا منبع ہے اور کوئی بھی مخلوق اس لاشریک صفتِ الٰہی کی مدعی نہیں ہوسکتی۔ لیکن چونکہ انبیاء علیہم السلام اور اولیائے کرام اپنے سراپا کو مکمل طور پر اُس مالکِ حقیقی کے سپرد کردینے کی وجہ سے اُس کی برگزیدہ اور منتخب ہستیاں ہیں اور وہ اُن سے راضی ہو چکا ہے، اس لئے اُس نے اُنہیں اپنے حضور شفیع بننے کے اعزاز سے نوازا ہے۔ نبی ﷺ اور اولیائے کرام کے شفیع ہونے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ یہ مقدس ہستیاں آزادانہ طور پر خود مختار ہیں اور اللہ تعالیٰ کے اِذن کے بغیر بھی فریادی کو اُس کی فریاد پوری کردیں۔ ایسا عقیدہ رکھنا تو صریحاً کفر و شرک ہوگا اور کوئی بھی صحیح العقیدہ مسلمان اس کی تائید نہیں کرے گا۔

نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام اور بزرگانِ دین کی شفاعت کا مطلب یہی ہے کہ پیغمبر ﷺ نوازشاتِ الٰہی کو اپنے خالق و مالک کے اِذن کے بغیر دینے میں خود مختار نہیں ہیں اور نہ ہی اس کا یہ مطلب ہے کہ وہ نوازشات آپ ﷺ کا ذاتی کسب ہیں۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ عطیات و انعاماتِ الٰہی موہوبہ ہیں نہ کہ کسبیہ اور آپ اُن عطیاتِ الٰہی کو مرضیِ مولا کے مطابق اُس کی مخلوق میں تقسیم فرماتے ہیں جس سلسلہ میں آپ ﷺ نے فرمایا: "اَللّٰہُ مُعْطِیْ وَاِنَّمَا اَنَا قَاسِم" (عطا کرنے والا تو اللہ تعالیٰ ہے، میں تو تقسیم کرنے والا ہوں)۔ جب ایک مسلمان اپنی کسی ضرورت میں آپ کی سفارش چاہتا ہے تو آپ اُس کے لئے اللہ تعالیٰ سے فریاد کرتے ہیں اور آپ کی دعا کی برکت سے اُس شخص کی ضرورت پوری ہو جاتی ہے۔ آپ ﷺ کی پیدائش سے پہلے، آپ کے حینِ حیات میں اور آپ کی وفات کے بعد آپ کو شفیع بنانا صحابہ اور دیگر مسلمانوں کا ناقابلِ انکار معمول رہا ہے اور سورۃ النّساء کی آیت ۶۴ اس کی واضح شہادت ہے جس کا حوالہ صفحہ ۲۳۱۵ کے نمبر (۲) کے تحت دیا جا چکا ہے۔

تاریخ شاہد ہے کہ ابن تیمیہ پہلا شخص تھا جس نے شفاعت، انبیاء علیہم السلام اور اولیائے کرام کے مقبروں کی زیارت کے خود اختراعی عقیدے کا تعارف کرایا جس کا پہلے کہیں بھی وجود نہیں ملتا۔ وہ اپنی انتہا پسندی میں اس حد تک بڑھ گیا کہ اُس نے ببانگِ دہل یہ "فتویٰ" صادر کیا کہ پیغمبر علیہ السلام کے روضہ انور کی زیارت کے لئے سفر کرنا (معاذ اللہ) معصیت اور گناہ کا سفر ہے اور اس سفر میں "قصر صلاۃ" کی اجازت نہیں ہے بلکہ دورانِ سفر نماز کا اِتمام کیا جائے اور پوری پڑھی جائے۔ بنا بریں زائرین کے علاوہ فرشتے بھی جو ہر روز صبح و شام آسمان سے اتر کر روضہ انور پر حاضر ہوتے اور درود شریف پڑھتے ہیں (معاذ اللہ) اسی معصیت میں مبتلا ہیں۔ یہ حضورِ اکرم ﷺ کی جناب میں کمال درجے کی گستاخی ہے۔ (سیرتِ رسولِ عربی ﷺ۔ نور بخش توکلی، صفحہ ۵۳۱)

''ابن تیمیہ کے اس فتویٰ سے شام ومصر میں بڑا فتنہ برپا ہوا۔ شامیوں نے ابن تیمیہ کے بارے میں استفتاء کیا (فتویٰ طلب کیا)۔ علامہ بُرہان بن کاح فزاری نے قریباً چالیس سطر کا مضمون لکھ کر اُسے کافر بتایا۔ علامہ شہاب بن جہل نے اس سے اتفاق کیا۔ بدر بن جماعہ شافعی نے لکھ دیا کہ مفتی یعنی ابن تیمیہ کو ایسے فتاویٰ باطلہ سے بہ زجر و توبیخ منع کیا جائے۔ اگر باز نہ آئے تو قید کیا جائے۔ محمد بن الجریری انصاری حنفی نے لکھا کہ اسی وقت بلا کسی شرط کے قید کیا جائے۔ محمد بن ابی بکر مالکی نے کہا کہ اُسے اس قسم کی زجر و توبیخ کی جائے کہ ایسے مفاسد سے باز آجائے۔ احمد بن عمر مقدسی حنبلی نے بھی ایسا ہی لکھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ابن تیمیہ شعبان ۷۲۶ھ میں دمشق میں قلعہ میں قید کیا گیا اور قید میں ہی ۲۰ ذیقعدۃ الحرام ۷۲۸ھ کو اس دنیا سے رخصت ہوا۔'' (''وفاء الوفاء' جزء ثانی' ص ۴۲۰ بحوالہ ''سیرت رسول عربی ﷺ''۔ نور بخش توکلی' صفحات ۵۳۱' ۵۳۲)

حدیث لَا تُشَدُّ الرِّحَالُ کی بحث: صحیح بخاری کے باب فضل الصلوٰۃ فی مسجد مکۃ والمدینۃ میں بروایت سیّدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ وارد ہے جس میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

لَا تُشَدُّ الرِّحَالُ اِلَّا اِلٰی ثَلَاثَۃِ مَسَاجِدِ: اَلْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَمَسْجِدِ الرَّسُوْلِ وَالْمَسْجِدِ الْاَقْصٰی

''کجاوے نہ باندھے جائیں (سفر نہ کیا جائے) مگر تین مسجدوں یعنی مسجدِ حرام' مسجدِ نبوی و مسجدِ اقصٰی کی طرف۔''

یہ حدیث مختلف کتبِ حدیث میں بہ کثرت آئی ہے اور متفق علیہ ہے۔ بخاری' مسلم' نسائی' ترمذی' ابوداؤد' ابنِ ماجہ اور دیگر کتب کے مختلف ابواب میں موجود ہے۔

ایک مغالطے کا ازالہ: مذکورہ بالا حدیث پر بعض احباب کو بہت بڑا مغالطہ ہوا اور اس مغالطے کے بانی اور سربراہ علامہ ابن تیمیہ ہیں۔ علامہ ابنِ تیمیہ سے پہلے اسلام کی جتنی بھی صدیاں گزریں' کسی امام نے یہ معنی نہیں لیا تھا جو علامہ ابن تیمیہ نے لیا۔ علامہ ابن تیمیہ نے اس فتویٰ کو لے کر اسے مشتہر کیا اور وہ نظریہ چلتے چلتے محمد بن عبدالوہاب نجدی اور اُس کے پیروکاروں تک پہنچا جنہوں نے اُسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔

''علامہ ابنِ تیمیہ نے اس حدیث سے مراد یہ لی کہ روضہِ رسول ﷺ کی زیارت کی نیت سے بھی معاذ اللہ سفر کرنا حرام ہے اور یہ سفر' سفرِ معصیت ہے اور اسی وجہ سے اس میں نمازِ قصر نہ کی جائے۔ اور اس حدیث سے استدلال یہ کیا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے کہ ''کجاوے نہ باندھے جائیں سوائے ان تین مساجد کی طرف'' یعنی نیت کے ساتھ ان مساجد کے سوا کوئی سفر نہ کیا جائے۔ اس کا معنیٰ غلط سمجھا گیا اور معنیٰ کے غلط سمجھنے پر امام حافظ ابنِ حجر عسقلانی' علامہ بدرالدین عینی' علامہ کرمانی' علامہ امام نووی' قاضی عیاض اور امام قرطبی شاہد ہیں اور یہ تمام علماء اس بات پر متفق ہیں کہ اس حدیث کو یہ معنیٰ اور مفہوم دینا بالکل غلط ہے۔

دراصل حدیث زیرِ بحث میں دیگر مساجد کی نسبت مساجدِ ثلاثہ میں نماز کی فضیلت کا بیان ہے کیونکہ یہ تینوں مساجد اُن فضائل سے مختص ہیں جو دوسری مسجدوں میں نہیں پائے جاتے۔ یہ بات بھی اہم ہے کہ حدیث مذکورہ میں صَـلٰـوٰۃ کا لفظ نہیں ہے کیونکہ مساجدِ ثلاثہ کی طرف رحلت سے مراد اُن میں نماز کا قصد ہے۔ لہٰذا اس حدیث کا زیارتِ مقابر سے کوئی تعلق نہیں۔ اس ضمن میں مندرجہ ذیل احادیثِ مبارکہ کو پیش نظر رکھنے سے معاملہ بالکل صاف اور طشت ازبام ہو جائے گا:

(۱) عَنْ سَعِیْدِ بْنِ الْمُسَیِّبِ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: صَلَاۃٌ فِیْ مَسْجِدِیْ هٰذَا خَیْرٌ مِّنْ اَلْفِ صَلٰوۃٍ فِیْ غَیْرِهٖ مِنَ الْمَسَاجِدِ اِلَّا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ

''میری اِس مسجد میں نماز دوسری مسجدوں میں ہزار نمازوں سے بہتر ہے سوائے مسجدِ حرام کے۔''

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا منشاء اپنے روضہ پاک کی زیارت سے منع کرنے کا کیسے ہوسکتا ہے جبکہ آپ کا اپنا فرمان حدیثِ بالا سے بھی واضح ہو رہا ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ ایک طرف وہ منع کریں اور دوسری طرف وہ حکم فرمائیں۔ یہ امر بھی ذہن میں رہے کہ اِن تین مساجد کو اللہ نے قرآن میں مقرر نہیں کیا بلکہ حضور علیہ السلام نے مقرر کیا ہے۔ معترضین کی عقل پر افسوس کہ جس ذاتِ مقدس نے زیادہ ثواب کا مرکز تین مسجدوں کو ٹھہرایا' اُنہی کے گھر اور قبر کی زیارت کی نیت سے جانے کو حرام قرار دے رہے ہیں۔ ثواب دینے والا بے شک اللہ تعالیٰ ہے مگر یہاں بات زیادہ ثواب کے مقرر کرنے کی ہے۔ حرمِ کعبہ میں ایک نماز کا ثواب ایک لاکھ کے برابر اللہ نے قرآن میں مقرر نہیں کیا بلکہ مصطفیٰ علیہ السلام نے مقرر کیا ہے۔ اس طرح مسجدِ نبوی اور مسجدِ اقصیٰ میں ایک نماز کا ثواب بالترتیب پچاس ہزار اور ایک ہزار نماز کے برابر حضور علیہ السلام نے مقرر کیا ہے' قرآن نے نہیں کیا۔ ارے! جو مقرر کر کے زیادہ ثواب کی خیرات بانٹ رہا ہے' اُسی کی زیارت کو حرام کہتے ہو!! اللہ تعالیٰ عقلِ سلیم اور ہدایت عطا فرمائے!

(۲) حضرت ابوسعید خدری فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

لَا یَنْبَغِیْ لِلْمَطِیِّ اَنْ تُشَدَّ الرِّحَالَةُ اِلٰی مَسْجِدٍ تُبْتَغَاءُ فِیْهِ الصَّلَاۃُ غَیْرَ مَسْجِدِ الْحَرَامِ وَ الْمَسْجِدِ الْاَقْصٰی وَمَسْجِدِیْ هٰذَا (قسطلانی و عمدۃ القاری)

''سواری کرنے والے سوار کے لئے یہ جائز نہیں کہ کسی مسجد کی طرف زیادہ ثواب لینے کے ارادہ اور نیت کے ساتھ سفر کرے' سوائے تین مساجد کے یعنی مسجدِ حرام' مسجدِ اقصیٰ اور مسجدِ نبوی۔''

یہ امر ذہن نشین رہے کہ اِن مقدس اماکن کو حصولِ برکت کے لئے زیارت کی غرض سے جانا جائز ہے۔ زیادہ ثواب کی نیت نہ ہو تو حصولِ برکت کے لئے جانا جائز اور درست بھی ہے اور سنت بھی ہے کیونکہ حضور علیہ السلام بھی ہر سنیچر کے دن مسجدِ قُبا کو تشریف لے جاتے تھے۔

کَانَ یَأْتِیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَسْجِدَ قُبَاءَ کُلَّ سَبْتٍ رَاکِبًا وَّمَاشِیًا وَفِیْ رِوَایَةٍ وَیُصَلِّیْ فِیْهِ رَکْعَتَیْنِ

"حضور ﷺ ہر سنیچر کو مسجدِ قُبا کبھی سوار اور کبھی پیدل جاتے اور وہاں دو رکعتیں ادا فرماتے۔"

(۳) لَا تُشَدُّ رِحَالُ الْمَطِيِّ اِلٰى مَسْجِدٍ يُذْكَرُ فِيْهِ اِلَّا اِلٰى ثَلَاثَةِ مَسَاجِدَ (مسند ابی یعلیٰ' ج ۲' ص ۲۸۹)
"کسی مسجد کی طرف کجاوے نہ باندھے جائیں کہ خاص وہاں جا کر ذکر کروں گا' سوائے تین مساجد کے یعنی مسجدِ حرام' مسجدِ اقصیٰ اور مسجدِ نبوی کے۔"

"ائمہ اور محدثین نے یہاں تک کہا ہے کہ حج کرنے جاؤ تو مسجدِ نبوی کی زیارت کی نیت سے مدینہ نہ جاؤ' اس لئے کہ مسجدِ نبوی کی زیارت کی نیت سے جانے کا کوئی زائد ثواب نہ ہوگا' زائد ثواب وہاں نماز پڑھنے سے ہے۔ زائد ثواب زیارت کرنے کا نہیں بلکہ وہاں نماز پڑھنے کا ہے۔ پس مسجدِ نبوی کا ثواب ہے وہاں نماز پڑھنے سے اور روضہِ رسول ﷺ کا ثواب ہے زیارت کرنے سے۔ زیارت روضہ اطہر کے لئے ہے اور نماز مسجدِ نبوی کے لئے ہے۔ ائمہ نے فرمایا کہ روضہِ رسول علیہ السلام کی زیارت کی نیت سے جاؤ اس لئے کہ مسجدِ نبوی میں نماز کا ثوابِ زائد ملتا ہی ہے' اُس کے لئے نیت کرنے کی شرط نہیں ہے۔ وہ تو مدینہ میں رہنے والے بھی وہاں نماز پڑھتے ہیں تو اُن کے لئے پچاس ہزار نمازوں کا ثواب ہے' خواہ اس نیت سے سفر کریں یا نہ کریں۔ پس سفر کرو تو رسول اللہ ﷺ کے لئے سفر کرو۔" (ماہنامہ "منہاج القرآن" لاہور' اپریل ۲۰۰۷ء' صفحہ ۵۳)

اگر معترضین کے اعتراض کو درست مان بھی لیا جائے یعنی اِن تین مساجد کے علاوہ کسی اور مقام کی طرف سفر کرنا ناجائز ہے تو پھر قرآن مجید میں مختلف سفروں کو جائز کیوں کہا گیا ہے اور کسی نے اُن پر کبھی اعتراض نہیں کیا۔ اِن قرآنی سفروں کا ذکر انشاء اللہ تعالیٰ "توسّل Intermediation" کے عنوان کے تحت آئے گا۔

"خلاصہ مضمون یہ ہوا کہ حدیث لَا تُشَدُّ الرِّحَالُ مساجد کے بارے میں ہے۔ اس کی رُو سے مساجدِ ثلاثہ کی طرف بدیں غرض سفر کرنا کہ اُن میں نماز ادا کرنے سے کئی گنا ثواب حاصل ہو' جائز ہے۔ دنیا کی کسی اور مسجد کی طرف اس غرض کے لئے سفر کرنا نہ چاہئے کیونکہ وہ درجہ میں متساوی ہیں اور کسی کو کسی پر بہ اعتبار کثرتِ ثواب فضیلت نہیں۔ ہاں کسی اور مقصد کے دوسری مساجد کی طرف بھی سفر کرنا جائز ہے۔ مثلاً کسی مسجد میں کوئی بزرگ رہتے ہوں۔ اُن کی زیارت یا اُن سے استفاضہ کے لئے اس مسجد کی طرف سفر کرنا جائز ہے۔ اسی طرح کسی مسجد کے صنائع غریبہ کو دیکھنے کے لئے سفر کرنا بھی ممنوع نہیں ہے۔ مقابر و مشاہد انبیائے کرام و اولیائے عظام کی زیارت کے لئے سفر کرنا حدیث زیرِ بحث کی نہی کے تحت میں داخل نہیں بلکہ جائز و مشروع' مستحب اور موجب خیر و برکت ہے۔ جب حوائج دنیا کے لئے سفر کرنا بالاتفاق جائز ہے تو حوائج آخرت بالخصوص حضور سید الاوّلین والآخرین امام المرسلین خاتم النبیین محمد مصطفیٰ احمدِ مجتبیٰ ﷺ واصحابہ وسلّم کے روضہ منورہ کی زیارت کے لئے سفر کرنا بہ طریق اولیٰ جائز و مستحسن ہے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے عہدِ مبارک سے اس وقت تک مسلمانوں کا اسی پر عمل رہا ہے اور اس کا انکار حرمان و شقاوت کی علامت ہے۔" ("سیرتِ رسولِ عربی ﷺ"۔ نور بخش توکلی' صفحہ ۵۳۴)

(۹۰) سود (Interest)

قرآنِ حکیم میں سُود کے لئے ''ربٰــــو'' کا لفظ آیا ہے جس کا مادہ (ر۔ب۔و) ہے اور جس کا معنیٰ بڑھوتری، اضافہ، ترقی، شمولیت، افزائش، اُبھرنا اور اوپر کو اُٹھنا ہے۔لہٰذا لفظِ ربٰــــو میں افزائش اور اضافہ شامل ہیں۔قرآنِ حکیم میں وارد اس لفظ کے مصدری معنی مندرجہ ذیل آیات کے خط کشیدہ الفاظ میں ملاحظہ ہوں :

(۱) یَمۡحَقُ اللّٰہُ الرِّبٰوا وَیُرۡبِی الصَّدَقٰتِ (البقرۃ : ۲۷۶)
''اللہ تعالیٰ سود کو مٹاتا ہے اور صدقات وخیرات کو بڑھاتا ہے۔'' (۲ : ۲۷۶)

(۲) فَاحۡتَمَلَ السَّیۡلُ زَبَدًا رَّابِیًا (الرّعد : ۱۳)
''پھر وہ سیلاب جھاگ کو اوپر لے آیا۔'' (۱۳ : ۱۳)

(۳) فَاِذَاۤ اَنۡزَلۡنَا عَلَیۡهَا الۡمَآءَ اهۡتَزَّتۡ وَرَبَتۡ وَاَنۡۢبَتَتۡ مِنۡ کُلِّ زَوۡجٍۭ بَهِیۡجٍ O (الحج : ۵)
''پھر جب ہم اِس (زمین) پر پانی برساتے ہیں تو وہ اُبھرتی ہے اور پھولتی ہے اور ہر قسم کی خوشنما نباتات اُگاتی ہے۔''

(۴) وَاٰوَیۡنٰهُمَاۤ اِلٰی رَبۡوَۃٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَّ مَعِیۡنٍ O (المؤمنون : ۵۰)
''اور ہم نے اُن دونوں (عیسیٰ علیہ السلام اور اُن کی والدہ مریم سلام اللہ علیہا) کو بلند زمین پر پناہ دی جو ٹھہرنے کے قابل اور شاداب تھی۔'' (۲۳ : ۵۰)

لہٰذا معلوم ہوا کہ ربٰــو کا اصطلاحی معنیٰ ''دولت میں بڑھوتری'' اور ''اصل زر میں اضافہ'' ہے۔ کچھ اور مقامات پر قرآنِ حکیم اس لفظ کی وضاحت یوں کرتا ہے :

(۱) وَذَرُوۡا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰۤوا اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ O (البقرۃ : ۲۷۸)
''اگر تم ایمان والے ہو تو جو کچھ سود کا بقایا ہے، اُسے چھوڑ دو۔'' (۲ : ۲۷۸)

(۲) وَمَاۤ اٰتَیۡتُمۡ مِّنۡ رِّبًا لِّیَرۡبُوَا۠ فِیۡۤ اَمۡوَالِ النَّاسِ فَلَا یَرۡبُوۡا عِنۡدَ اللّٰہِ (اَلرُّوم : ۳۰)
''اور جو چیز تم اِس غرض سے دو گے کہ وہ لوگوں کے مال میں پہنچ کر زیادہ ہو جائے، تو وہ اللہ کے آگے نہیں بڑھتی۔'' (۳۰ : ۳۹)

چنانچہ آیاتِ بالا سے واضح ہوا کہ اصل زر میں اضافے کا نام ربٰو ہے۔ پھر یہ بھی واضح ہے کہ مال میں ہر قسم کا اضافہ یقیناً ناجائز نہیں ہے جیسا کہ تجارت میں بھی اضافہ حاصل کیا جاتا ہے اور وہ ناجائز نہیں ہے۔ لہٰذا قرآنِ حکیم میں اعلان شدہ اضافۂ مال کی حرمت ایک خاص قسم کا اضافہ ہے جسے رِبٰو کا نام دیا گیا ہے۔

''سود ایک ایسا قرض ہے جسے ایک مقررہ وقت کے لئے دیا جاتا ہے اور جسے مقروض اصل زر پر ایک مقررہ اضافے کے ساتھ ادا کرنے کا پابند ہوتا ہے۔'' (احکام القرآن۔۔ابوبکر جصاص، ج ۱، ص ۶۳۴ طبع بیروت)

ربٰــو کی لغوی تعریف : ''ہر وہ قرض جس کے ذریعے زر کا اضافہ حاصل ہو' ربٰــو ہے۔'' (تاج العروس'' ۔ زجاج ؛ لسان العرب ۔۔ ابن منظور افریقی)

لہٰذا سود اصل زر پر اضافی رقم کا نام ہے جو ایک مقررہ شرح پر اور مقررہ وقت کے بعد حاصل کیا جاتا ہے اور مقررہ شرح اور مقررہ وقت کی دونوں شرطیں پہلے ہی سے طے شدہ ہوتی ہیں۔

اسلام میں تجارت میں اصل زر پر اضافہ سود پر کے اضافہ سے مختلف ہے۔ قرآنِ حکیم کی ذیل کی آیت کے مطابق اوّل الذکر جائز اور حلال جبکہ مؤخر الذکر ناجائز اور حرام ہے:۔

ذٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوْا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا وَأَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا (البقرۃ: ۲۷۵)

''یہ سزا اس لئے ہوگی کہ وہ کہتے ہیں کہ بیع (خرید و فروخت) بھی تو سود ہی کی طرح ہے حالانکہ اللہ نے بیع کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام کیا ہے۔'' (۲ : ۲۷۵)

آج کل کے ''روشن خیالوں'' کی طرح اُس زمانہ کے کوتاہ عقلوں کا بھی یہ کہنا تھا کہ جب ادھار فروخت کرنے کی صورت میں کسی چیز کی قیمت ابتداء ہی سے زیادہ رکھتے ہیں تو اُسے جائز کہا جاتا ہے لیکن جب ہم مدّت کے اختتام پر خریدار کی عدم ادائیگی کی صورت میں واجب الادا رقم میں اضافہ کرنا چاہتے ہیں تو اُسے ''ربا'' کہا جاتا ہے۔ اُن نافہموں نے اِس حقیقت کو بالکل فراموش کر دیا تھا کہ دونوں کی ایک جیسی سطح نہ اَخلاقی حیثیت سے ہے اور نہ معاشی حیثیت سے۔ سود تو ایک متعیّن رقم بے کھٹکے ہر حال میں مہاجن کو ملتی رہتی ہے برخلاف اس کے تجارت میں نفع و نقصان دونوں کے احتمالات ہر وقت لگے رہتے ہیں اور تاجر کو نقصان سے بچنے کے لئے وقت' محنت' ذہانت سب کچھ بروئے کار لانا پڑتا ہے۔ پھر تجارتی معاملت تو ہر وقت ختم ہو جاتی ہے جبکہ مُدّت اور مہلت کے ساتھ سود خور کے مطالبات کی میزان بھی بڑھتی ہی چلی جاتی ہے یہاں تک کہ اکثر اوقات قرضدار کی نوبت بالکل تباہ حالی اور بربادی کو پہنچ جاتی ہے۔ امام رازی علیہ الرحمۃ نے تفسیر کبیر میں حُرمتِ سود کے جو عقلی دلائل لکھے ہیں' وہ طرزِ ادا و تعبیر کی تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ آج بھی پوری طرح پڑھنے کے قابل ہیں۔ اُنہوں نے پہلے نمبر پر یہ بالکل صحیح لکھا ہے کہ سُود کی رقم آخر کس چیز کا معاوضہ ہوتی ہے؟ بجز مفت خوری کی بدترین شکل کے اور یہ ہے کیا؟'' (تفسیر ماجدی)

کفارِ مکہ کا یہ اعتراض خاص طور پر مشہور مفسر ابن ابی حاتم نے سعید بن جُبیر رضی اللہ عنہ کے حوالے سے بھی ذکر کیا ہے:

قَالُوْا سَوَاء'' عَلَيْنَا اِنْ زِدْنَا فِيْ أَوَّلِ الْبَيْعِ أَوْعِنْدَ مَحَلِّ الْمَالِ فَهُمَا سَوَاء'' فَذٰلِكَ قَوْلُه' قَالُوْا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا (تفسیر ابن ابی حاتم ج ۲' ص ۴۵۴ مطبع مکہ مکرمہ ۱۹۹۷)

''وہ یہ کہا کرتے تھے کہ یہ بات برابر ہے کہ خواہ ہم قیمت میں ابتدائے عقد میں اضافہ کریں یا ہم مدت کے اختتام پر اُسے بڑھائیں' دونوں صورتیں یکساں ہیں۔ یہی اعتراض ہے جسے قرآن کریم کی آیت میں یہ کہہ کر ذکر کیا گیا ہے: کفار کہتے ہیں کہ خرید و فروخت تو بالکل رِبا کی مانند ہے۔''

بالکل یہی تشریح ابوحیانؒ نے ''البحرالمحیط'' کی جلد دوم' صفحہ ۳۳۵ میں اور متعدد دوسرے قدیم مفسرین قرآن نے ذکر فرمائی ہے۔

معلوم ہے کہ اللہ وہ ہے جو شرائع واحکام کا مالک ہے اور حکیم بھی اور حاکم بھی۔ جب حکیمِ مطلق نے ایک معاملت کو جائز اور دوسری کو حرام ٹھہرا دیا ہے تو اس کے معنی ہی یہ ہیں کہ جائز کے اندر بے شمار منافع ومصالح اور حرام کے اندر بے شمار مفاسد ونقصانات ہیں اور بالفرض اگر کسی کی سمجھ میں یہ مصالح ومفاسد نہ بھی آئیں جب بھی حاکمِ مطلق کا حکم واجب العمل تو بہر حال ہے۔ اسلام کے جو احسانات ساری دنیا پر اور بہت روشن ونمایاں حیثیت سے ہیں' اُن میں سے ایک حرمتِ سود بھی ہے۔ اس نے عاجز سب ہی آچکے تھے لیکن قطعی اور کُلی صورت میں حرام اسے دنیا کے ضابطوں اور شریعتوں میں صرف اسلام ہی نے قرار دیا۔ سرِ دست اس کے نقصانات کا جائزہ لیتے جائیے:

سود کی ممانعت میں حکمت: علمائے اسلام نے سود کی ممانعت میں حکمت کے ٹھوس دلائل دئے ہیں اور جدید تحقیقات نے کچھ مزید اضافوں اور توسیعات کے ساتھ اُن کی آراء کی توثیق کر دی ہے۔ ہم اپنے بیان کو امام فخر الدین رازی علیہ الرحمۃ کی ''تفسیر کبیر'' تک ہی محدود رکھتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

(۱) سود لینے کا مطلب دوسرے کے مال کو ہتھیانا ہے بغیر اس کے کہ اُسے کوئی چیز بطورِ متبادل دی جائے۔ کیونکہ جو شخص ایک درہم دو درہموں کے بدلے میں ادھار دیتا ہے' تو وہ ایک درہم خواہ مخواہ زائد لیتا ہے۔ ایک آدمی کا مال اور اُس کا اثاثہ اُس کی ضروریات کی تکمیل کے لئے ہوتے ہیں اور بروئے حدیث تقدس کا درجہ رکھتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ آدمی کا مال اتنا ہی محترم ہے جتنا کہ اُس کا خون۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس اثاثے کو بغیر کسی متبادل چیز کے اس سے لینا حرام ہے۔

(۲) سود پر انحصار لوگوں کو کام کاج سے کاہل بنا دیتا ہے کیونکہ مالدار آدمی اپنے مال کو سود پر دے کر مفت میں مزید مال کماتا ہے خواہ یہ کمائی پیشگی ہو یا بعد میں ہو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کے نزدیک محنت اور کام کاج کی منزلت کم ہو جاتی ہے اور وہ اپنے سرمائے کو تجارت یا صنعت میں لگانے کا خطرہ مول نہیں لیتا۔ یہ رجحان لوگوں کو مفاداتِ مختلفہ سے محروم کر دیتا ہے۔ کاروبارِ دنیا صنعتوں' تجارت' سوداگری اور تعمیراتی منصوبوں کے بغیر چل نہیں سکتا اور یہ سب منصوبے مال کو خطرے میں لگانے کے متقاضی ہیں (اقتصادی نقطہ نظر سے یہ دلیل غیر متنازعہ طور پر باوزن ہے)

(۳) اسلامی تقاضے کے برعکس سود لوگوں کی ایک دوسرے سے نیکی اور حسنِ سلوک کرنے کی حوصلہ شکنی کرتا ہے۔ اگر کسی معاشرے سے سود کو ختم کر دیا جائے تو لوگ ضرورت مندوں کو خوش دلی سے اُدھار دیں گے اور اُس دئے ہوئے ادھار پر کسی بڑھوتری کی توقع بھی نہیں رکھیں گے۔ اس کے برعکس سودی معاشرے میں مقروض کو ادھار پر لی گئی رقم پر سود کی شکل میں اضافی رقم دینا پڑتی ہے جس سے قرضخواہ کے بارے میں اُس کے خوش دلی اور بھائی بندی کے جذبات کو ٹھیس پہنچتی ہے (اور یہ سود کی ممانعت کا اخلاقی پہلو ہے)۔

(۴) قرضخواہ زیادہ سے زیادہ امیر اور مقروض زیادہ سے زیادہ غریب ہوتا چلا جاتا ہے۔ سود کے جواز کی صورت میں امیر آدمی غریب شخص کا استحصال کرتا ہے اور یہ چیز رحم اور خیر کی روح سے متصادم ہے (یہ سود کی ممانعت کا سماجی پہلو ہے)۔

''پس جس معاشرے میں سود قانونی طور پر جائز ہو' وہاں طاقتور لوگ کمزور آدمی کی ابتلا اور تنگ دستی سے فائدہ اٹھاتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ امیر' امیر سے امیر تر اور غریب' غریب سے غریب تر ہوتا چلا جاتا ہے جس سے معاشی ناہمواریاں جنم لے کر مسلسل بڑھتی ہی چلی جاتی ہیں۔ قدرتی بات ہے کہ یہ ناہمواری غریب کو امیر سے متنفر کر دیتی ہے اور امیر کو غریب کے بارے میں سنگدل اور بے رحم بنا دیتی ہے۔ جھگڑے اور آویزشیں سر اٹھاتی ہیں۔ سماجی اقتصادی ڈھانچہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جاتا ہے' انقلابات جنم لیتے ہیں اور معاشرتی نظم و ضبط کو دھچکا لگتا ہے۔ جدید تاریخ اُن قوموں کے سکون و استحکام کو درپیش خطرات کو اجاگر کرتی ہے جہاں کی اقتصادیات کی بنیاد سود پر ہو۔'' (''الحلال والحرام فی الاسلام'' ۔۔ یوسف القرضاوی' صفحات ۲۶۵' ۲۶۶ انگریزی ترجمہ)

''اسلام سود کے گناہ کو صرف قرضخواہ پر ہی لاگو نہیں کرتا بلکہ اسلام کی نظر میں مقروض جو اُسے سود ادا کرتا ہے' سودی دستاویز کا لکھنے والا اور اس پر گواہ سب کے سب مجرم ہیں۔ جیسا کہ ایک حدیث میں آیا:

''اللہ تعالیٰ نے سود لینے والے کو' سود دینے والے کو' سودی معاہدہ لکھنے والے کو اور اس معاہدہ کے گواہ کو اپنی رحمت سے دُور کر دیا ہے۔'' (احمد' ابوداؤد' نسائی' ابنِ ماجہ' ترمذی)

<u>سود اور اضطراری کیفیت</u> : تاہم اگر کوئی شخص اضطراری حالات کے تحت کسی مجبوری میں سود پر رقم لینے پر مجبور ہو جائے تو گناہ صرف قرضخواہ پر ہوگا۔ اب اس اضطراری ضرورت کو ثابت کرنے کے لئے کچھ شرائط کا پایا جانا ضروری ہے جو یہ ہیں:۔

(۱) شریعت کی نظر میں ضرورت حقیقی ہو نہ کہ فضول خرچی اور تعیش پرستی۔ وہ ضرورت روٹی' کپڑا اور طبی علاج جیسی بنیادی ضرورتوں پر مبنی ہو جن کے بغیر زندگی ممکن نہیں۔

(۲) یہ رعایت کسی اضافے کے بغیر ٹھیک ٹھیک رقم کے ساتھ مختص ہے مثلاً اگر نو ڈالر ادھار سے کام چل سکتا ہے تو دس ڈالر ادھار لینا جائز نہ ہوگا۔

(۳) مقروض کو اس مشکل وقت سے نکلنے کے لئے جہدِ مسلسل کرتے رہنا چاہئے اور اس کے مسلمان بھائیوں کو اس بارے میں اس کی مدد کرنی چاہئے۔ اگر اُسے اس مشکل سے نکلنے کی کوئی صورت نہیں ملتی تو اُسے سود کراہتاً لینا چاہئے نہ کہ پسندیدگی کی نظر سے اور یہ بھی کہ وہ حدود سے تجاوز نہ کرے اور رب تعالیٰ سے معافی کا خواستگار اور امیدوار رہے

کیونکہ گناہوں کا معاف کرنے والا صرف اور صرف وہی خدائے واحد ہے۔ سود کے خلاف اُس کی نفرت مسلسل ہونی چاہئے یہاں تک کہ اللہ تبارک وتعالیٰ اس کے لئے کوئی سبیل پیدا فرما دے گا۔'' (ایضاً ص ۲۶۷)

''امام فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق کے مطابق جاہلی لوگوں کا یہ معمول تھا کہ وہ ایک آدمی کو کچھ رقم ایک معیّنہ مدّت کے لئے ادھار دیتے تھے اور پھر اُس سے ہر ماہ ایک مقررہ رقم بطورِ سود وصول کرتے تھے۔ وقتِ معیّنہ کے گزرنے پر قرضخواہ اپنے اصل زر کا مطالبہ کرتا تھا۔ اگر مقروض اس کی ادائی میں کوتاہ رہتا تو ایک اور وقت اُسے دیا جاتا اور اس طرح سود کی رقم میں اضافہ ہوتا رہتا۔'' (تفسیر کبیر' ج ۲' ص ۳۵۱ بحوالہ ''اکنامک سسٹم آف اسلام'' از سیّد ابوالاعلیٰ مودودی' صفحات ۱۶۱' ۱۶۲)

ختمی مرتبت علیہ الصلوٰۃ والسلام نے سود اور سودی کاروبار میں ملوّث ہونے والوں کے خلاف اعلانِ جنگ فرمایا۔ سماج کو پہنچنے والے اس کے خطرات کی نشان دہی کرتے ہوئے آپ نے فرمایا:

''جب کسی معاشرے میں سود اور زنا ظاہر (عام) ہو جائیں تو وہاں کے لوگ اپنے آپ کو عذابِ الٰہی کا مستحق بنا لیتے ہیں۔'' (المستدرک للحاکم)

''<u>رِبا کی تعریف میں قرآن خاموش ہے</u>: قرآنِ حکیم نے رِبا کی تعریف اس لئے بیان نہیں فرمائی کیونکہ یہ بات واضح تھی کہ رِبا قرآن کریم کے مخاطبین کے لئے ایک معروف فعل تھا۔ یہ بالکل حرمتِ خمر' قمار اور زنا کی طرح تھا کہ جس کی حرمت بھی بغیر کسی جامع و مانع تعریف کے عمل میں آئی اور اس کی وجہ یہی تھی کہ یہ سب چیزیں اتنی واضح اور غیر مبہم تھیں کہ اُن کی تعریف کی ضرورت نہ تھی۔ بالکل یہی حالت رِبا کی بھی تھی کہ وہ اُن کے لئے اجنبی نہ تھا۔ وہ سب اس اصطلاح کو اپنے روزمرّہ معاملات میں استعمال کیا کرتے تھے اور کسی کو بھی اس کی حقیقی تعریف کی ضرورت نہ تھی۔'' (''سود پر تاریخی فیصلہ''۔ مفتی محمد تقی عثمانی' مترجم: ڈاکٹر مولانا محمد عمران اشرف عثمانی' ص ۳۲)

<u>سود کی تمام صورتیں حرام ہیں</u>: ''قرآن پاک نے تو رِبا کو علی الاطلاق حرام قرار دیا ہے' خواہ رِبا کی کوئی شکل اس کے نزول کے وقت رائج ہو یا نہ ہو۔ جب قرآن پاک کسی چیز کو حرام قرار دیتا ہے تو اُس کی حرمت سے مراد اس معاملے کی کوئی ایک مخصوص شکل نہیں ہوتی بلکہ وہ اس معاملے کا بنیادی تصوّر ہوتا ہے جو اس حکم کے ذریعہ متاثر ہوتا ہے۔ جب شراب حرام کی گئی تھی تو اس سے شراب کی صرف وہ شکلیں مراد نہ تھیں جو عہدِ رسالت مآب ﷺ میں رائج تھیں بلکہ اس شراب کی بنیادی حقیقت کو حرام کیا گیا تھا۔ لہٰذا کوئی بھی معقول شخص یہ بات نہیں کہہ سکتا کہ شراب کی کوئی ایسی شکل جو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ میں مروّج نہ تھی' حرام نہیں ہے۔ جب جوئے کی حرمت کا اعلان کیا گیا تو اُس کی حرمت کا مقصد صرف اُس زمانہ میں رائج قمار کی صورتوں تک محدود نہ تھا بلکہ درحقیقت اُس کی ممانعت اس کی تمام موجودہ اور آئندہ شکلوں پر محیط تھی اور کوئی بھی یہ عقلی توجیہ نہیں کر سکتا کہ جوئے کی جدید صورتیں اس ممانعت کے حکم کے تحت نہیں آتیں۔ ہم پہلے بھی یہ بات ذکر کر چکے ہیں کہ رِبا کے جو معنیٰ اہلِ عرب کی سمجھ میں آئے

اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اور آپ کے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے بھی بیان فرمائے' وہ یہ تھے کہ قرض کے معاملے پر کوئی بھی مقرر کردہ اضافی رقم ربا ہے۔ ربا کا یہ تصوّر حضور ﷺ کے زمانہ میں بہت سی شکلیں رکھتا تھا اور بعد میں آنے والے زمانوں میں اس کی شکلوں میں مزید اضافہ ہوا ہوگا اور مستقبل میں بھی اس کی شکلوں میں اضافہ متوقع ہے لیکن جب تک مذکورہ بالا ربا کا بنیادی عنصر اس معاملے میں موجود رہے گا' ربا کی وہ شکل یقیناً حرام رہے گی۔'' (''سود پر تاریخی فیصلہ''۔۔مفتی محمد تقی عثمانی' مترجم: ڈاکٹر محمد اشرف عثمانی' صفحات ۵۳' ۵۴)

<u>''حرمت ربا سے متعلق قرآنی آیات کا معروضی مطالعہ</u> :حرمتِ ربا سے متعلق چار قسم کی آیات مختلف مواقع پر نازل ہوئیں جو درج ذیل ہیں:۔

(۱) پہلی آیت سورہ رُوم کی ہے جو مکی سورت ہے جس میں ربا کی اصطلاح کا درج ذیل الفاظ میں ذکر ہوا:

وَمَا آتَيْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّيَرْبُوَا فِي أَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا يَرْبُوا عِنْدَاللهِ (اَلرّوم : ۳۹)

"اور جو چیز تم اس غرض سے دو گے کہ وہ لوگوں کے مال میں پہنچ کر زیادہ ہو جائے' تو وہ اللہ کے نزدیک نہیں بڑھتی۔'' (۳۹ : ۳۰)

(۲) دوسری آیت سورہ نساء کی ہے جس میں اصطلاحِ ربا کو یہودیوں کے اعمالِ بد کے سیاق میں ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں :

وَأَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدْ نُهُوْا عَنْهُ (النساء : ۱۶۱)

''نیز ان یہودیوں کی بات کہ سود لینے لگے حالانکہ وہ اس سے روک دیے گئے تھے۔'' (۴:۱۶۱)

(۳) تیسری آیت سورہ آلِ عمران کی ہے جس میں ربا کی حرمت ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے :

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا لَا تَأْكُلُوا الرِّبٰوا أَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً (آلِ عمران : ۱۳۰)

''اے ایمان والو! سود مت کھاؤ دُگنا چوگنا کر کے۔'' (۱۳۰ : ۳)

(۴) آیات کا چوتھا مجموعہ سورۃ البقرۃ میں درج ذیل الفاظ کے ساتھ مذکور ہے :

اَلَّذِيْنَ يَأْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ذٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوْا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا وَ أَحَلَّ اللهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ وَ أَمْرُهٗ اِلَى اللهِ وَ مَنْ عَادَ فَاُولٰٓئِكَ أَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ O يَمْحَقُ اللهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ وَاللهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ أَثِيْمٍ O اِنَّ الَّذِيْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَأَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَآتَوُا الزَّكٰوةَ لَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ O يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا اتَّقُوا اللهَ وَ ذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوا اِنْ كُنْتُمْ

مُّؤْمِنِيْنَ O فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَأْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ لَا تَظْلِمُوْنَ وَ لَا تُظْلَمُوْنَ O وَ اِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ وَ اَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ O وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ O (البقرۃ: ۲۷۵ تا ۲۸۱)

" جولوگ سود کھاتے ہیں اُن کا حال اُس شخص کا سا ہوتا ہے جسے شیطان نے چھوکر باؤلا کر دیا ہو اور اس حالت میں اُن کے مبتلا ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ تجارت بھی تو آخر سود ہی جیسی چیز ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ نے تجارت کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام' لہٰذا جس شخص کو اُس کے رب کی طرف سے یہ نصیحت پہنچے اور آئندہ کے لئے وہ سود خوری سے باز آ جائے تو جو کچھ پہلے کھا چکا سو کھا چکا۔ اُس کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے اور جو اس کے بعد بھی اس حرکت کا اعادہ کرے گا' وہ جہنمی ہے جہاں وہ ہمیشہ رہے گا۔ اللہ سود کو مٹاتا ہے اور خیرات کو بڑھاتا ہے اور اللہ کسی کفر کرنے والے گنہگار کو دوست نہیں رکھتا۔ جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کئے اور نماز کی پابندی کی اور زکوٰۃ دیتے رہے' اُن کے لئے اُن کا اجر اُن کے رب کے ہاں ہے' نہ اُن پر کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ مؤمنو! اگر فی الحقیقت تم اللہ پر ایمان رکھتے ہو تو اُس سے ڈرو اور جس قدر سود مقروضوں کے ذمہ رہ گیا اُسے چھوڑ دو۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو پھر اللہ اور اُس کے رسول سے جنگ کے لئے تیار ہو جاؤ اور اگر (اس باغیانہ روش سے) توبہ کرتے ہو تو پھر تمہارے لئے یہ حکم ہے کہ اپنی اصل رقم لے لو اور سود چھوڑ دو' نہ تم کسی پر ظلم کرو اور نہ تمہارے ساتھ ظلم کیا جائے۔ اور اگر ایسا ہو کہ ایک مقروض تنگ دست ہے (اور فوراً قرض ادا نہیں کر سکتا) تو چاہئے کہ اُسے فراخی حاصل ہونے تک مہلت دی جائے اور اگر تم سمجھ رکھتے ہو تو تمہارے لئے بہتری کی بات تو یہ ہے کہ (ایسے تنگدست بھائی کو) اُس کا قرض بطورِ خیرات بخش دو۔ اور اُس دن کی پُرسش سے ڈرو جب تم سب اللہ کے حضور لوٹائے جاؤ گے۔ پھر ایسا ہوگا کہ ہر جان کو اپنے عمل سے جو کچھ کمایا ہے' اُس کا بدلہ پورا پورا اُسے مل جائے گا۔ یہ نہ ہوگا کہ کسی کی بھی حق تلفی ہو۔'' (۲۷۵ تا ۲۸۱ : ۲)

''آیاتِ رِبا کا تاریخی تجزیہ: اِن آیات کو اُن کی تاریخی ترتیب سے سمجھنے کی کوشش بہتر ہوگی۔

''سورہ روم کی آیت ۳۹: اِن آیات میں سب سے پہلی آیت سورہ روم کی ہے جو باتفاق مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی۔ یہ آیت تحریمی نوعیت کی نہیں ہے۔ یہ صرف سادگی سے اتنا کہتی ہے کہ ''رِبا'' اللہ کے یہاں نہیں بڑھتا یعنی اُسے اللہ کے ہاں سندِ قبول حاصل نہیں اور اس لئے اس کا آخرت میں کوئی ثواب نہیں۔ مشہور مفسرِ قرآن ابنِ جریر طبری (م ۳۱۰ ھ) سیّدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما اور متعدد تابعین مثلاً سعید بن جُبیر' مجاہد' طاؤس' قتادہ' ضحاک اور ابراہیم نخعی (رحمہم اللہ) سے روایت کرتے ہیں کہ اس آیت میں وارد لفظ رِبا کا مطلب ''نیوتا'' ہے۔ ☆

☆ یعنی کسی کو ہدیہ اس غرض سے دینا کہ بعد میں وہ اُسے اِس سے بڑا ہدیہ دے۔'' (تفسیر جامع البیان لابن جریر طبری' ج ۲۱' ص ۴۸۔ دار الفکر بیروت ۱۹۸۴ء۔

''سورۃُ النساء: دوسری آیت سورۃُ النساء کی ہے جس میں یہودیوں کی بداعمالیوں کی فہرست کے ذیل میں یہ بات بھی مذکور ہے کہ وہ سود لیا کرتے تھے باوجودیکہ وہ اُن پر پہلے ہی سے حرام تھا۔ اس آیت کے نزول کے حقیقی وقت کا تعین فی الواقع مشکل ہے اور مفسرین کرام اس نکتے پر زیادہ تر خاموش دکھائی دیتے ہیں۔ تاہم جس سیاق میں یہ آیت نازل ہوئی' اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ آیت ۴ ہجری سے قبل نازل ہوئی ہوگی۔ سورۃ النساء کی آیت ۱۵۳ درج ذیل ہے:

يَسْئَلُكَ أَهْلُ الْكِتٰبِ أَنْ تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتَابًا مِّنَ السَّمَآءِ

''آپ سے اہلِ کتاب (یہود) یہ درخواست کرتے ہیں کہ آپ اُن کے پاس ایک خاص نوشتہ آسمان سے منگوادیں۔'' (۴ : ۱۵۳)

''یہ آیت اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ اگلی چار آیات یہودیوں کے دلائل کے جوابات دینے کے لئے نازل کی گئیں جو حضور ﷺ کے پاس آئے تھے اور آپ سے آسمان سے اس طرح کی کتاب نازل کروانے کی درخواست کی تھی جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کو عطا کی گئی تھی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آیات کا یہ سلسلہ اُس وقت نازل ہوا جب یہودی کافی بڑی تعداد میں مدینہ منوّرہ میں موجود تھے اور اُس وقت وہ اس پوزیشن میں بھی تھے کہ حضور ﷺ سے بحث کرسکیں۔ چونکہ اکثر یہودی ۴ ہجری کے بعد مدینہ چھوڑ چکے تھے' اس لئے یہ آیت اس سے قبل نازل شدہ معلوم ہوتی ہے۔ یہاں پر لفظِ ''رِبا'' بلا شبہ سود کے معنی میں ہے کیونکہ وہ یہودیوں کے لئے واقعتہً ممنوع تھا۔ یہ ممانعت بائبل کے پرانے صحیفوں میں ابھی تک موجود ہے لیکن اسے مسلمانوں کے لئے دوٹوک اور واضح ممانعتِ رِبا کا حکم قرار نہیں دیا جاسکتا۔ یہ آیت صرف اتنی بات واضح کرتی ہے کہ رِبا یہودیوں کے لئے ممنوع تھا لیکن اُنہوں نے اپنی عملی زندگیوں میں اس کی تعمیل نہ کی۔ البتہ اس سے یہ بات ضرور مستنبط ہوتی ہے کہ رِبا مسلمانوں کے لئے بھی یقیناً ایک گناہ کا کام ہے ورنہ یہودیوں کو موردِ الزام ٹھہرانے کا کوئی جواز نہیں تھا۔''

''سورہ آلِ عمران: تیسری آیت سورہ آلِ عمران کی ہے جس کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ یہ ہجرت کے دوسرے سال نازل ہوئی ہوگی کیونکہ اگلی اور پچھلی آیات غزوہ اُحد سے متعلق ہیں جو سن ۲ ہجری میں پیش آیا۔ یہ آیت مسلمانوں کے لئے حرمتِ رِبا کے سلسلے میں بالکل واضح حکم رکھتی ہے۔ لہٰذا یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ یہی وہ پہلی قرآنی آیت ہے جس کے ذریعے سے مسلمانوں کو حرمتِ رِبا کا واضح حکم ملا۔ اسی وجہ سے صحیح البخاری کے معروف شارح علامہ حافظ ابن حجر العسقلانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ممانعت رِبا کا اعلان غزوہ اُحد کے آس پاس زمانے میں کیا گیا (فتح الباری' ج ۸' ص ۲۰۵' مطبوعہ مکہ مکرمہ ۱۹۸۱ء)۔ بعض شارحینِ حدیث اور مفسرین کرام نے اس بات کی وجہ بھی بیان کی ہے کہ ممانعتِ رِبا کا حکم غزوہ اُحد کے قریبی زمانے میں کیوں آیا؟ وہ کہتے ہیں کہ مکہ کے حملہ آوروں نے اپنی فوج کو سودی قرضوں کے ذریعے سرمایہ مہیا کیا تھا۔ اسی طرح اُنہوں نے اچھا خاصا اسلحہ بھی جمع کرلیا تھا۔ یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ یہ بات مسلمانوں کو اسی طریقے پر لوگوں سے سودی قرضے لے کر اسلحہ جمع کرنے پر اُبھار سکتی تھی۔ مسلمانوں کو اس عمل سے روکنے کے لئے یہ واضح طور پر ممانعت کرنے والی آیتِ رِبا نازل ہوئی۔'' (''الفتح الکبیر'' للرازی' ج ۹' ص ۲ مطبوعہ ایران)

''سورۃ البقرۃ کی آیات : حرمتِ رِبا سے متعلق آیات کا چوتھا مجموعہ سورۃ البقرۃ میں مذکور ہے جس میں حرمت رِبا کی شدت تفصیل کے ساتھ بیان ہوئی ہے۔ اِن آیات کے نزول کا پس منظر یہ ہے کہ فتح مکہ کے بعد حضور ﷺ نے تمام واجب الادا سودی رقوم کو منسوخ (Void) کر دیا تھا۔ اس اعلان کا مطلب یہ تھا کہ کوئی شخص بھی اپنے فراہم کردہ قرضے پر سود کا مطالبہ نہیں کر سکتا۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے طائف کا رخ فرمایا جو فتح نہ کیا جا سکا لیکن بعد میں طائف کے باشندے جو زیادہ تر طائف کے قبیلے سے تعلق رکھتے تھے' اسلام لائے اور حضور ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے۔ اُنہوں نے آپ ﷺ کے ساتھ ایک معاہدہ کیا۔ اس مجوزہ معاہدے کی ایک شق یہ بھی تھی کہ بنو ثقیف اپنے مقروضوں کے قرضوں پر سودی رقوم معاف نہیں کریں گے لیکن اُن کے قرض خواہ (Creditors) اُن پر عائد سود کو معاف کر دیں گے۔ حضور ﷺ نے اس معاہدے پر دستخط کرنے کی بجائے اس مسوّدے پر صرف ایک جملہ لکھ کر بھیج دیا کہ بنو ثقیف بھی ویسا ہی حق رکھیں گے جیسا کہ مسلمان رکھتے ہیں (''المحرر الوجیز'' لابن عطیہ' ج ۲' ص ۴۸۹' مطبوعہ دوحہ ۱۹۷۷ء)۔ بنو ثقیف اس تاثر میں تھے کہ حضور ﷺ ان کا معاہدہ قبول کر چکے ہیں اس لئے اُنہوں نے بنو عمرو بن المغیرہ سے اپنی سودی رقم کا مطالبہ کر دیا لیکن بنو عمرو نے اُن کے مطالبے کو سود کے ممنوع ہو جانے کی وجہ سے مسترد کر دیا۔ مقدمہ مکہ مکرمہ کے گورنر عتاب بن اُسید کے پاس پیش ہوا۔ بنو ثقیف کی دلیل یہ تھی کہ معاہدے کی رُو سے وہ سودی رقوم معاف کرنے پر مجبور نہیں ہیں۔ عتاب بن اسید نے معاملہ حضور ﷺ کی خدمت میں رکھا تو اس موقع پر ذیل کی قرآنی آیات نازل ہوئیں:

يَاأَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا اتَّقُوا اللهَ وَ ذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَO فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَأْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ أَمْوَالِكُمْ لَا تَظْلِمُوْنَ وَ لَا تُظْلَمُوْنَO

''مؤمنو! اگر فی الحقیقت تم اللہ پر ایمان رکھتے ہو تو اُس سے ڈرو اور جس قدر سود مقروضوں کے ذمہ رہ گیا اُسے چھوڑ دو۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو پھر اللہ اور اُس کے رسول سے جنگ کے لئے تیار ہو جاؤ اور اگر (اس باغیانہ روش سے) توبہ کرتے ہو تو پھر تمہارے لئے یہ حکم ہے کہ اپنی اصل رقم لے لو اور سود چھوڑ دو' نہ تم کسی پر ظلم کرو اور نہ تمہارے ساتھ ظلم کیا جائے۔'' (۲ : ۲۷۸' ۲۷۹)

''اس موقع پر بنو ثقیف نے سرِ تسلیم خم کر لیا اور کہنے لگے کہ ہمارے اندر اتنی سکت نہیں کہ اللہ اور اُس کے رسول ﷺ سے جنگ چھیڑیں۔'' (جامع البیان لابن جریر الطبری' ج ۳' ص ۱۰۷ : الوسیط للواحدی' ج ۱' ص ۳۹۷ بحوالہ ''سود پر تاریخی فیصلہ'' ۔۔مفتی محمد تقی عثمانی' مترجم: مولانا ڈاکٹر محمد اشرف عثمانی' صفحات ۲۱ تا ۲۶)

''اضافی شرح سود (Excessive Rates of Interest): کچھ حضرات کی طرف سے یہ دلیل دی جاتی ہے کہ رِبا کی حرمت صرف اُن معاملات سے متعلق ہے جن میں سود کی شرح بہت زیادہ یا مرکب ہو۔ اُن کی دلیل کی بنیاد سورہ آلِ عمران کی یہ آیت ہے :

يَاأَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا لَا تَأْكُلُوا الرِّبٰوا أَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً (آلِ عمران : ۱۳۰)

''اے ایمان والو! سود مت کھاؤ دُگنا چوگنا کر کے۔'' (۳ : ۱۳۰)

''دلیل یہ دی جاتی ہے کہ یہ رِبا کو واضح طریقے سے حرام کرنے والی پہلی آیتِ قرآنی ہے لیکن اس میں رِبا کی حرمت کو أَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً (دُگنا چوگنا کر کے) کے ساتھ مقید کیا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ صرف وہ رِبا حرام قرار دیا گیا ہے جس کی شرح اتنی زیادہ ہو کہ وہ اصل سرمایہ سے دگنی ہو جائے تو وہ حرام نہیں ہے اور چونکہ بینکوں کے سود کی شرح اتنی زیادہ نہیں ہوتی کہ وہ اصل سرمایہ کے مقابلہ میں دگنی ہو جائے لہٰذا وہ سود کی حرمت کے زمرہ میں نہیں آئے گا۔''

''لیکن یہ دلیل اس حقیقت کو نظر انداز کر رہی ہے کہ ایک ہی موضوع سے متعلق متعدد قرآنی آیات کو ایک دوسرے کے ساتھ ملا کر پڑھنا چاہئے۔ قرآنِ کریم کی کسی آیت کی تشریح اُسے قرآن ہی میں پائی جانے والے دوسرے مواد سے الگ کر کے نہیں کی جا سکتی۔ جیسا کہ پہلے بیان ہوا کہ قرآنِ کریم نے رِبا کے موضوع کو چار مختلف ابواب میں ذکر کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ کوئی بھی آیت اسی موضوع کی دوسری آیت سے کبھی متضاد نہیں ہو سکتی۔ رِبا کے بارے میں سب سے تفصیلی بیان سورۃ البقرۃ میں موجود ہے۔ یہ آیات درجِ ذیل حکم پر بھی مشتمل ہیں:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ ذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ○

'''مومنو! اگر فی الحقیقت تم اللہ پر ایمان رکھتے ہو تو اُس سے ڈرو اور جس قدر سود مقروضوں کے ذمہ رہ گیا اُسے چھوڑ دو۔''

''اس آیت میں ''جو کچھ سود رہ گیا ہے'' کا جملہ یہ بتا رہا ہے کہ اصل سرمایہ کے اوپر ہر مقدار چھوڑ دینی چاہئے۔ اس نکتے کو درجِ ذیل جملے میں مزید وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے:

وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ

''اور اگر تم (عملِ رِبا) سے توبہ کر لو تو پھر تم صرف اصل سرمایہ کے مستحق ہو گے۔''

''یہ الفاظ اس حقیقت کو پوری طرح واضح کر دیتے ہیں کہ عملِ ربا سے توبہ اُس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک اصل سرمایہ کے اوپر ہر قسم کی رقم چھوڑ نہ دی جائے اور قرض دینے والا صرف اور صرف اصل سرمایہ کا مستحق ہو۔ سورۃ البقرۃ اور سورہ آلِ عمران کی آیات کے مشترکہ مطالعہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ سورہ آلِ عمران میں موجود یہ الفاظ أَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً (دُگنا چوگنا کر کے) قیدِ احترازی نہیں ہیں اور ''دگنا چوگنا'' ہونا حرمتِ رِبا کی لازمی شرط نہیں ہے بلکہ أَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً کے الفاظ درحقیقت رِبا کی اس بدترین صورت کی طرف اشارہ کرنے کے لئے لائے گئے ہیں جو اُس وقت رائج تھی۔''

''اس نکتے کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے ہمیں قرآنِ پاک کی تفسیر کا ایک اہم اور بنیادی اصول سمجھنا ضروری ہوگا اور وہ یہ ہے کہ قرآن پاک دراصل ایسی آئینی یا قانونی کتاب نہیں ہے جسے ایک قانونی متن کے طور پر استعمال کرنا مقصود ہو بلکہ درحقیقت یہ ایک ایسی راہ نما کتاب ہے جو بہت سارے قوانین و احکامات کے ساتھ ایسی باتیں

بیان کرتی ہے جو ترغیبی انداز رکھتی ہیں۔قانون کی کتابوں کے برخلاف قرآن کریم کچھ ایسے الفاظ یا جملے استعمال کرتا ہے جن کا مقصد مزید تاکید یا کسی فعل کی مزید قباحت بیان کرنا ہوتا ہے۔ان کا مقصد کسی امر یا نہی کے لئے قید لگانا نہیں ہوتا۔قرآنِ پاک کے اس انداز کے ثبوت کے لئے خود ان آیات کا مطالعہ کافی ہے:

(۱) لَا تَشْتَرُوْا بِآیٰتِیْ ثَمَنًا قَلِیْلًا (البقرۃ : ۴۱)

''میری آیات کو کم قیمت پر مت بیچو۔'' (۲:۴۱)

''اِس آیت کا کوئی شخص بھی یہ مطلب نہیں سمجھ سکتا کہ قرآنی آیات کو فروخت کرنے کی حرمت کی وجہ اُس کی قیمت کا کم ہونا ہے اور اگر اُسے مہنگے داموں فروخت کیا جائے تو جائز ہوگا۔ذرا سی عقل رکھنے والا شخص بھی اس آیت میں ''کم قیمت پر'' کی قید کو قیدِ احترازی نہیں سمجھے گا بلکہ اس کا مطلب کچھ لوگوں کے عملِ بد کو واضح کرنا مقصود ہے کہ وہ اس قدر عظیم گناہ ذرا سی مالی منفعت کے عوض کر بیٹھتے ہیں۔یہاں اُن پر ملامت کی وجہ سستے داموں بیچنا نہیں بلکہ خود بیچنے پر ملامت مقصود ہے۔''

(۲) اسی طرح دوسری جگہ قرآنِ کریم ارشاد فرماتا ہے:۔

وَلَا تُکْرِھُوْا فَتَیٰتِکُمْ عَلَی الْبِغَآءِ اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا (اَلنُّور : ۳۳)

''اور اپنی لڑکیوں کو طوائف بننے پر مجبور نہ کرو اگر وہ پاک دامنی چاہتی ہوں۔'' (۲۴ : ۳۳)

''ظاہر ہے کہ اس کا یہ مطلب بالکل نہیں ہے کہ اگر کوئی لڑکی پاک دامنی نہ چاہتی ہو تو اس کو کوئی شخص طوائف بننے پر مجبور کر سکتا ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگرچہ عصمت فروشی از خود ایک بڑا گناہ ہے مگر اس کی برائی اُس وقت اور زیادہ شدید ہو جاتی ہے جب کوئی لڑکی پاک دامنی چاہے اور کوئی شخص اُسے عصمت فروشی پر مجبور کرے۔اس آیت میں شرط کا اضافہ صرف اس فعلِ بد کی قباحت وشناعت میں اضافے کے لئے کیا گیا ہے۔بالکل اسی طرح سورہ آلِ عمران کی آیتِ رِبا میں أَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً (دُگنا چوگنا کرکے) کی قید محض عملِ رِبا کی مزید خرابی کو بیان کرنے کے لئے لائی گئی ہے۔اس میں صرف یہ بتلایا گیا ہے کہ رِبا کا گناہ اُس وقت اور زیادہ سخت ہو جاتا ہے جب اُس کی شرح سود اتنی زیادہ یا دگنی ہو جائے۔اس آیت کا یہ مقصد اُس وقت مزید واضح ہو جاتا ہے جب سورہ آلِ عمران کی اس آیت (۱۳۰) کو سورہ بقرۃ کی آیات (۲۷۸، ۲۷۹) کی روشنی میں پڑھا جائے۔''

''دوسرے یہ کہ قرآنِ پاک کی تفسیر ہمیشہ اُس تشریح پر مبنی ہونی چاہئے جو حضور ﷺ کی احادیث اور اُن کے صحابہ کرام کے آثار میں مذکور یا اُن سے ماخوذ ہو کیونکہ وہی دراصل قرآنی آیات کے بلاواسطہ مخاطب اور وصول کنندہ تھے اور وہی قرآنی آیات کے سیاق وسباق اور اُس پسِ منظر کو سمجھتے تھے جس کے تحت وہ آیات نازل ہوئی تھیں۔اس پہلو سے بھی اگر غور کیا جائے تو یہ واضح ہو جاتا ہے کہ رِبا کی حرمت صرف مخصوص شرحِ سود تک محدود نہ تھی بلکہ حرمتِ سود اصل سرمایہ سے زائد ہر رقم پر محیط تھی، خواہ وہ تھوڑی ہو یا زائد۔''

درج ذیل احادیث اس نکتے کے ثبوت کے لئے کافی ہیں:

(۱) ابن ابی حاتم کی روایت کے مطابق خطبہ حجۃ الوداع میں آپ ﷺ نے جو الفاظ استعمال فرمائے، وہ درج ذیل ہیں:

أَلَا إِنَّ كُلَّ رِبًا فِي الْجَاهِلِيَّةِ مَوْضُوعٌ عَنْكُمْ كُلُّهُ، لَكُمْ رُءُوسُ أَمْوَالِكُمْ لَا تَظْلِمُوْنَ وَ لَا تُظْلَمُوْنَ وَأَوَّلُ رِبًا مَوْضُوعٌ رِبَا الْعَبَّاسِ بْنِ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ مَوْضُوعٌ كُلُّهُ (تفسير ابن ابی حاتم، ج ۲، ص ۵۵۱، حدیث: ۲۹۲۵؛ تفسیر ابن کثیر ج ۱، ص ۳۳۱)

''سنو! تمام سود کی رقوم جو دورِ جاہلیت میں واجب الادا تھیں، وہ سب پوری کی پوری ختم کر دی گئیں۔ تم صرف اپنے اصل سرمایہ کے حق دار ہو گے کہ نہ تم کسی پر ظلم کرو اور نہ تم پر ظلم کیا جائے اور سب سے پہلا سود جس کے فسخ کا اعلان کیا جاتا ہے، وہ عباس بن عبدالمطلب کا سود ہے جو مکمل طور پر ختم کر دیا گیا ہے۔''

''یہاں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اصل سرمایہ سے زائد ہر قسم کی رقم کو مکمل طور سے ختم فرما دیا اور اس بات کی صراحت کر کے کسی قسم کا شبہ یا ابہام باقی نہ رہنے دیا کہ قرض دینے والے صرف اپنے راس المال کے حق دار ہوں گے۔ اس کے علاوہ وہ ایک سکے کے بھی حق دار نہ ہوں گے۔''

(۲) حضرت حماد بن ابی سلمہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

إِذَا ارْتَهَنَ شاة شرب الْمُرْتَهِن مِنْ لَبَنِهَا بقَدر عَلفِهَا فَإِنِ اسْتَفْضَلَ مِنَ اللَّبَنِ ثَمَن الْعَلفِ فَهُوَ رِبًا (''نَیل الاوطار'' للشوکانی، ج ۵، ص ۱۹۸)

''اگر قرض دینے والا اپنے مقروض سے رہن (گروی) کے طور پر کوئی بکری وصول کرے تو قرض دینے والا اُس کا صرف اتنا دودھ پی سکتا ہے جتنا اُس نے اُس کے چارے کھلانے پر صَرف کیا۔ تاہم اگر دودھ اُس کے چارہ سے زیادہ مہنگا ہے تو یہ اضافہ بھی ربا ہے۔''

(۳) امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سیّدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا درج ذیل فتویٰ ذکر فرماتے ہیں:

مَنْ أَسْلَفَ سَلَفًا فَلَا يَشْتَرِطُ إِلَّا قَضَاءَهُ (مؤطا امام مالك، ص ۶۱۳، مطبع نور محمد کراچی)

''جو شخص کسی کو قرض دے تو وہ اس کے ساتھ سوائے اس کی واپسی کی شرط کے دوسری کوئی شرط نہیں لگا سکتا۔''

(۴) امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے اسی باب میں یہ ذکر فرمایا ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے:

مَنْ أَسْلَفَ سَلَفًا فَلَا يَشْتَرِطُ أَفْضَلَ مِنْهُ وَإِنْ كَانَ قُبْضَةً مِّنْ عَلَفٍ فَهُوَ رِبًا (ايضًا)

''جو شخص کسی کو قرضہ دے وہ اس سے بہتر واپس دینے کی شرط نہیں لگا سکتا یہاں تک کہ اگر ایک مٹھی بھر چارہ بھی زائد لے لے تو وہ بھی ربا ہے۔''

(۵) امام بیہقی سے منقول ہے کہ ایک شخص نے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے کہا کہ میں نے ایک شخص سے پانچ سو اس شرط پر قرض لئے کہ میں اُسے اپنا گھوڑا سواری کے لئے عاریۃً (مفت) دوں گا۔ عبداللہ بن مسعود نے جواب دیا:

''تمہارا قرض خواہ جو بھی نفع اس گھوڑے سے حاصل کرے گا' وہ رِبا ہے۔'' (السنن الکبریٰ ج ۵' ص ۳۵۰)

''(۶) یہی مصنف حضرت اَنس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ اُن سے ایسے شخص کے بارے میں پوچھا گیا جو کسی کو کوئی قرضہ دے اور پھر مقروض شخص اُسے کوئی تحفہ دے تو کیا اُس کے لئے یہ تحفہ قبول کرنا جائز ہوگا؟ حضرت اَنس بن مالک رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے:

إِذَا أَقْرَضَ أَحَدُكُمْ قَرْضًا فَأُهْدِيَ إِلَيْهِ طَبَقًا فَلَا يَقْبَلْهُ' أَوْحَمَلَهُ' عَلَى دَآبَّةٍ فَلَا يَرْكَبْهَا إِلَّا أَنْ يَّكُوْنَ بَيْنَهُ' وَبَيْنَهُ' قَبْلَ ذٰلِكَ (السنن الكبرىٰ للبيهقي' ج ۵' ص ۳۵۰)

''اگر تم میں سے کسی شخص نے کسی کو کوئی قرضہ دیا اور مقروض قرض خواہ کو کھانے کا ایک طبق پیش کرے تو وہ اُسے قبول نہ کرے' یا مقروض قرض خواہ کو اپنے جانور کی سواری کرائے تو اُسے اُس کی سواری نہیں کرنی چاہئے مگر صرف اس صورت میں جب اس قسم کے تحفوں کے تبادلے کا اُن دونوں کے درمیان قرضے کے معاملے سے پہلے معمول رہا ہو۔''

''اِس حدیثِ مبارکہ کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر مقروض اور قرض خواہ دونوں کے آپس میں قریبی تعلقات ہوں اور اُن کی عادت یہ رہی ہو کہ اُن میں سے ایک دوسرے کو تحفہ دیتا ہو تو اس قسم کا تحفہ قابلِ قبول ہوگا' خواہ اُن دونوں کے درمیان قرض کا معاملہ ہو لیکن اگر اُن دونوں کے درمیان اس قسم کے تعلقات نہ ہوں تو پھر مقروض کو اُس سے کوئی تحفہ قبول نہیں کرنا چاہئے' ورنہ اس میں رِبا کا شائبہ یا رِبا کی بو آئے گی۔''

''(۷) یہی مصنف امام بیہقی' سیّدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا ایک واقعہ نقل فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ اُن سے کسی نے ایک شخص کے بارے میں دریافت کیا کہ اُس نے بیس درہم کسی سے قرض لئے اور اپنے قرضخواہ کو تحفے دینا شروع کئے۔ جب بھی قرض خواہ اُس سے کوئی تحفہ وصول کرتا تو وہ اُسے لے جا کر بازار میں فروخت کر دیتا یہاں تک کہ اُس سے وصول ہونے والے تحفوں میں تقریباً ۱۳ درہم اُسے وصول ہو گئے۔ سیّدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے اُسے کہا کہ تمہیں اب ۷ درہم سے زائد نہیں لینا چاہئے۔''

(۸) سیّدنا علی کرّم اللہ وجہہٗ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

كُلُّ قَرْضٍ جَرَّ مَنْفِعَةً فَهُوَ رِبٰو (الجامع الصغير للسيوطي' ج ۲' ص ۹۴)

''ہر ایسا قرضہ جو نفع کھینچے' وہ رِبا ہے۔''

''<u>رِبا الفضل اور رِبا النسیئہ</u>: رِبا الفضل یہ ہے کہ ایک مخصوص مال کو اُس کی مثل سے نقد زیادتی کے ساتھ

یا ادھار فروخت کیا جائے مثلاً پانچ کلوگرام گندم کو دس کلوگرام گندم کے عوض نقد فروخت کیا جائے یا پانچ کلوگرام کو پانچ کلوگرام گندم کے عوض ایک سال کے ادھار پر فروخت کیا جائے۔ اسے ''ربا الحدیث'' بھی کہتے ہیں۔ کیونکہ امام مسلم نے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ ختمی مرتبت آقا علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: سونا سونے کے عوض، چاندی چاندی کے عوض، گندم گندم کے عوض، جو جو کے عوض، کھجور کھجور کے عوض، نمک نمک کے عوض برابر برابر فروخت کرو اور نقد بہ نقد۔ اور جب یہ اجناس مختلف ہو جائیں تو پھر جس طرح چاہو فروخت کرو بشرطیکہ نقد بہ نقد ہوں۔ ایک روایت میں ہے کہ جس نے زیادہ لیا یا زیادہ دیا تو اُس نے سودی کاروبار کیا۔ دینے والا اور لینے والا دونوں برابر ہیں۔ اور ایک روایت میں ہے کہ ایک دینار کو دو دیناروں کے بدلہ میں اور ایک درہم کو دو درہم کے بدلہ میں فروخت نہ کرو۔'' (صحیح مسلم ج ۲، ص ص ۲۴ تا ۲۶ بحوالہ تبیان القرآن، ج ۱، ص ۹۷۷)

''ربا النسیئہ کو ربا القرآن بھی کہتے ہیں کیونکہ اسے قرآن مجید نے حرام کیا ہے۔ ربا النسیئہ یہ ہے کہ ادھار کی میعاد پر معیّن شرح کے ساتھ اصل رقم سے زیادہ وصول کرنا یا اُس پر نفع وصول کرنا۔ آج کل دنیا میں جو سود رائج ہے، اُس پر بھی یہ تعریف صادق آتی ہے۔'' (تبیان القرآن، ج ۱، ص ۹۷۶) ربا النسیئہ میں ادھار کا ہونا ضروری ہے۔

''ربا الفضل کی حرمت کا سبب: ربا الفضل اُس زیادتی کو کہتے ہیں جو ایک ہی جنس کی دو چیزوں کے دست بدست لین دین میں ہو۔ تاجدارِ انبیاء ﷺ نے ربٰو الفضل کو اس لئے حرام قرار دیا ہے کہ اس سے ربا النسیئہ کا دروازہ کھلتا ہے اور انسان میں وہ ذہنیت پرورش پاتی ہے جس کا آخری ثمرہ سود خوری ہے۔ یہ حکمت خود رسول اللہ ﷺ نے خود بیان فرمائی ہے۔ سیّدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان فرماتے ہیں کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: ایک دینار کو دو دیناروں کے عوض اور ایک درہم کو دو درہموں کے بدلے میں فروخت نہ کرو۔ مجھے خوف ہے کہ کہیں تم سود خوری میں مبتلا نہ ہو جاؤ۔''

''ظاہر ہے کہ ایک جنس کی دو چیزوں کی آپس میں بیع کی ضرورت صرف اُس وقت پیش آتی ہے جب اتحادِ جنس کے باوجود اُن کی نوعیتیں مختلف ہوں مثلاً چاول اور گندم کی ایک قسم کی دوسری قسم کے ساتھ بیع ہو، یا سونے کی ایک قسم کی دوسری قسم کے ساتھ بیع ہو۔ ایک جنس کی مختلف اقسام کی چیزوں کا کمی و بیشی کے ساتھ تبادلہ کرنے سے اُس ذہنیت کے پرورش پانے کا اندیشہ ہے جو بالآخر سود خوری اور ناجائز نفع اندوزی تک جا پہنچتی ہے۔ اس لئے شریعت نے یہ قاعدہ مقرر کر دیا ہے کہ ایک جنس کی مختلف اقسام کے باہمی تبادلہ کی اگر ضرورت ہو تو برابر مبادلہ کیا جائے اور اُن کی قیمتوں میں جو فرق ہو، اُسے نظر انداز کر دیا جائے یا ایک چیز کا دوسری چیز سے براہِ راست تبادلہ کرنے کی بجائے ایک شخص اپنی چیز کو روپوں کے عوض بازار کے بھاؤ پر فروخت کرے اور دوسرے شخص سے اس کی چیز بازار کے بھاؤ پر خریدے۔''

''گندم کی گندم کے بدلے میں بیع کو برابر برابر نقد ہو تو جائز کیا گیا ہے اور ادھار کو حرام کیا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مثلاً زید آج دس کلوگرام گندم فروخت کرتا ہے اور اس کے بدلے میں چھ ماہ بعد عمر سے دس کلوگرام

گندم لیتا ہے تو عین ممکن ہے کہ جس وقت زید گندم فروخت کر رہا ہے' اُس وقت گندم کی قیمت پانچ روپے فی کلو ہو اور جب عمر اس کو اس کے بدلے میں گندم دے گا' اُس وقت گندم کی قیمت آٹھ روپیہ کلو ہو تو زید کو پچاس روپے کے بدلے میں چھ ماہ بعد کی مدت کے عوض اسی روپے حاصل ہو گئے اور یہی سود ہے۔'' (ایضاً' ج ۱' ص ص ۹۸۰' ۹۸۱)

''نفع اور سود میں فرق: اللہ ربُّ العزت نے بیع کو جائز کہا ہے اور سود کو ناجائز اور حرام کہا ہے (سورۃ البقرۃ: ۲۷۵)۔ان دونوں میں فرق بالکل واضح ہے۔ہم دکاندار سے پانچ روپیہ کی چیز چھ روپے میں بہ خوشی خرید لیتے ہیں کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ اگرچہ یہ چیز پانچ روپے کی ہے لیکن اس چیز پر دکاندار کی محنت' ذہانت اور وقت خرچ ہوئے ہیں اور اُس ایک زائد روپے کو ہم اُس کی ذہنی اور جسمانی محنت کا عوض قرار دیتے ہیں لیکن جب ایک شخص پانچ روپے پر ایک روپیہ سود لیتا ہے تو اس ایک روپیہ میں وقت کے سوا اور کوئی چیز نہیں ہوتی جس کو اس ایک روپیہ کا بدل قرار دیا جا سکے۔اس لئے تجارت میں نفع لینا جائز ہے اور روپیہ پر سود لینا جائز نہیں ہے۔'' (ایضاً' ص ۹۸۱)

''بینک کے سود کے حامیوں کے دلائل: معیشت کے بعض جدید مفکرین یہ کہتے ہیں کہ قرآن مجید میں رِبا اُس خاص سود کو کہا گیا ہے جو زمانہ جاہلیت میں رائج تھا۔کوئی غریب شخص شادی' بیماری یا کفن دفن کی کسی نجی ضرورت میں کسی مہاجن سے قرض لیتا تھا اور کسی مصیبت زدہ شخص کی مدد کرنے کی بجائے اُسے قرض پر سود دینا بے شک ظلم اور سنگدلی ہے' اسی وجہ سے قرآن مجید میں اس سود کو حرام کیا گیا ہے۔لیکن آج کا مروّجہ سود اُس سے بالکل مختلف ہے۔ آجکل بینکوں سے غریب اور مصیبت زدہ شخص قرض نہیں لیتے بلکہ متموّل اور سرمایہ دار تاجر اور صنعت کار قرض لیتے ہیں اور قرض کی رقم پر اُن سے بینک جو سود وصول کرتا ہے' وہ اُن پر کوئی ظلم نہیں ہے کیونکہ اگر وہ بینک کو چودہ فیصد سود ادا کرتے ہیں تو خود قرض کی رقم سے وہ ساٹھ ستر فیصد تک کماتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ وہ بینک سے قرض لے کر ایک کارخانہ لگاتے ہیں اور اُس کارخانے سے پھر دوسرا اور تیسرا کارخانہ لگ جاتا ہے۔اس طرح تاجروں کی تجارت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔اس لئے اگر وہ بینک کو چودہ فیصد سود دیتے ہیں تو اُن پر یہ کوئی بوجھ نہیں ہے اور بینک میں روپیہ عام لوگوں کا جمع کیا ہوا ہوتا ہے۔اس لئے اگر بینک عام لوگوں کو سات آٹھ فیصد سود ادا کرے تو بینک پر کوئی بوجھ نہیں پڑتا۔سرمایہ دار اور بینک دونوں خوشی سے سود ادا کرتے ہیں' کسی پر ظلم نہیں ہے اور چونکہ بینکوں میں عموماً غریب اور متوسط لوگ اپنی فاضل بچت کی رقمیں جمع کراتے ہیں تو سود کے ذریعے اُنہیں سات فیصد سالانہ کا فائدہ پہنچتا رہتا ہے۔ غرضیکہ زمانہ جاہلیت کا رِبا غریبوں سے سود لیتا تھا اور اِس زمانہ کی ترقیاتی سکیم بینکوں کے ذریعے غریبوں کو سود دیتی ہے۔وہ رِبا غرباء پر ظلم تھا اور یہ غریبوں کی خوشحالی اور مال کی ترقی کا سبب ہے' اس لئے شخصی اور نجی ضروریات کے قرضوں پر سود ناجائز ہونا چاہئے اور تجارتی قرضوں پر بینک کا سود جائز ہونا چاہئے۔''

''بینک کے سود کے جائز ہونے کی دوسری وجہ وہ یہ بتاتے ہیں کہ افراطِ زر کی وجہ سے روپے کی قدر (Value) دن بدن گرتی جا رہی ہے اور اجناس کی قیمت بڑھتی جا رہی ہے۔اب سے سنتالیس سال پہلے (۱۹۲۶ میں) سونا ایک سو روپے تولہ تھا۔اصلی دیسی گھی پانچ روپے کلو' ڈالڈا دو روپیہ کلو' دیسی انڈا دو آنے کا' تنوری روٹی

ایک آنے کی' دودھ آٹھ آنے سیر اورڈاک کا لفافہ چھ پیسے (ڈیڑھ آنے کا) ملتا تھا اور اب ۲۰۱۳ء میں سونا تقریباً ۵۷۰۰۰ روپے تولہ' دیسی گھی سات سو روپے کلو' ڈالڈا گھی پونے دو سو روپے کلو' دیسی انڈا پندرہ روپے کا' تنوری روٹی چھ روپے کی' دودھ اَسّی روپے کلو اور ڈاک کا لفافہ آٹھ روپے کا ہو گیا۔ اس تجزیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ سنتالیس سال میں روپیہ کی قدر بارہ سے لے کر پچاس گنا (پچیس سو فیصد سے لے کر پانچ ہزار فی صد تک) گر گئی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ جس نے سنتالیس سال پہلے بینک میں سو روپیہ رکھوایا تھا' اب اُس کی قیمت دو چار روپیہ رہ گئی ہے اور اگر سونے کے بھاؤ سے تناسب کیا جائے تو اب تک سو روپیہ تقریباً دو روپے کا رہ گیا ہے۔ اگر اس سو روپیہ پر سال بہ سال بینک کا سود لگتا رہتا ہو تو اُس کی ساکھ کسی حد تک بحال رہتی اور جو لوگ بینک میں اپنی فاضل بچتوں کو جمع کراتے ہیں' اُن کا نقصان نہ ہوتا' اس لئے بینک کا سود جائز ہونا چاہئے۔'' (''تبیان القرآن'' ج ا' ص ص ۹۸۱' ۹۸۲)

''مجوّزین سود کے دلائل کے جوابات: اس سلسلہ میں پہلے یہ بات جان لینی چاہئے کہ قرآن مجید نے مطلقاً سود کو حرام کہا ہے خواہ وہ نجی ضروریات کے قرضوں پر ہو یا تجارتی قرضوں پر سود ہو' خواہ اس سے غریبوں کو نقصان ہو یا فائدہ۔ اللہ تعالیٰ نے امارت اور غربت کا فرق کئے بغیر سود کو علی الاطلاق حرام کیا ہے جیسا کہ فرمایا:

(۱) وَأَحَلَّ اللّٰہُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا (البقرۃ: ۲۷۵)

''اللہ تعالیٰ نے بیع (خرید و فروخت) کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام کیا ہے۔'' (۲ : ۲۷۵)

(۲) یٰٓاَیُّھَاالَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوااللّٰہَ وَ ذَرُوْا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰوا اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ O فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَأْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ (البقرۃ: ۲۷۸' ۲۷۹)

''مومنو! اگر فی الحقیقت تم اللہ پر ایمان رکھتے ہو تو اُس سے ڈرو اور جس قدر سود مقروضوں کے ذمہ رہ گیا اُسے چھوڑ دو۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو پھر اللہ اور اُس کے رسول سے جنگ کے لئے تیار ہو جاؤ۔''

''اِن آیات میں اللہ تعالیٰ نے سود کو مطلقاً حرام کیا ہے۔ اُس نے سود مفرد کو بھی حرام کیا ہے اور لَا تَاْکُلُوا الرِّبٰوا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَۃً (آلِ عمران: ۱۳۰) ''اے ایمان والو! سود مت کھاؤ دُگنا چوگنا کر کے۔'' فرما کر سود مرکب کو بھی حرام کیا ہے اور ہر جگہ مطلقاً سود کو حرام کیا ہے اور نجی اور کاروباری قرضوں کا فرق نہیں کیا۔ علاوہ ازیں تاریخ اور حدیث سے ثابت ہے کہ زمانہ جاہلیت میں کاروباری قرضوں پر سود لینے کا بھی عام رواج تھا۔''

''علامہ ابن جریر وَ ذَرُوْا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰوا (البقرۃ: ۲۷۸) کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ یہ وہ سود تھا جس کے ساتھ زمانہ جاہلیت میں لوگ خرید و فروخت کیا کرتے تھے۔''

علامہ سیوطی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''امام ابن جریر اور امام ابن ابی حاتم نے اپنی اپنی اسانید کے ساتھ سُدی سے روایت بیان کی ہے کہ یہ آیت حضرت عباس بن عبدالمطلب اور بنو مغیرہ کے ایک شخص کے متعلق نازل ہوئی۔ یہ دونوں زمانہ جاہلیت میں

شریک تھے اور انہوں نے ثقیف کے بنوعمرو بن عمیر میں لوگوں کو سودی قرض پر مال دے رکھے تھے۔ جب اسلام آیا تو ان دونوں کا بڑا سرمایہ سود میں لگا ہوا تھا۔'' (دُرِّ منثور' ج ا' ص ۳۶۶' مطبعہ میمنہ' مصر ۱۳۱۴ھ بحوالہ تبیان القرآن)

''اِن روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ زمانہ جاہلیت میں بڑے بڑے تاجر خوردہ فروشوں کے ہاتھ ادھار پر مال فروخت کرتے تھے اور اس پر سود لگاتے تھے جس سے واضح ہو گیا کہ زمانہ جاہلیت میں کاروباری اور تجارتی قرضوں پر سود لگانے کا عام رواج تھا جسے ''الــرِّبٰــو'' کہا جاتا تھا۔ قرآن مجید نے عموم کے صیغہ سے سود کی ممانعت کی ہے' خواہ سود نجی قرضوں پر ہو یا تجارتی قرضوں پر۔''

''رہا دوسرا اعتراض کہ بینک کے سود کے ناجائز قرار دینے کی بناء پر افراطِ زر کی وجہ سے روپیہ کی قدر گر جاتی ہے۔ اگر بینک سے سود نہ لیا جائے تو بیس بائیس سال بینک میں رکھوایا ہوا ایک سو روپیہ سوا تین روپے کا رہ جائے گا اور یہ نقصان بینک سے سود نہ لینے کی وجہ سے ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ مسلمان ہونے کے ناطے سے ہمارا یہ ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم پر عمل کرنے اور اُس کے منع کردہ احکام سے بچنے کی وجہ سے اگر ہمیں کوئی مادّی نقصان ہوتا ہے تو ہمیں اُسے خوشی سے گوارا کر لینا چاہئے۔ مادّی اعتبار سے زکوٰۃ' قربانی اور حج کے لئے زرِ کثیر خرچ کرنا بھی مال کا ضیاع اور نقصان ہے تو کیا اس مادّی نقطہ نظر سے ان تمام مالی عبادات کو خیر باد کہہ دیا جائے گا؟ اور جب مسلمان مالی عبادات کو چھوڑنے پر تیار نہیں ہیں تو سود کھا کر اللہ اور اُس کے رسول ﷺ سے اعلانِ جنگ کے لئے کیسے تیار ہو سکتے ہیں؟ ایک سچے مسلمان کے نزدیک سود چھوڑنے کی وجہ سے روپے کی قدر کا کم ہو جانا خسارہ نہیں ہے بلکہ اصل خسارہ یہ ہے کہ سود لینے کی وجہ سے (العیاذ باللہ) آخرت برباد ہو جائے!''

''اس سوال کا دوسرا جواب یہ ہے کہ یہ نقصان دراصل ہماری ایک اجتماعی تقصیر کی سزا ہے اور وہ یہ کہ ہم نے اسلامی طریقہِ مضاربت کو رواج نہیں دیا۔ کرنا یہ چاہئے کہ لوگ اپنے روپے کو بینک کی معرفت کاروبار میں لگائیں اور بینک اُن کا روپیہ امانت رکھنے کی بجائے اُن سے ایک عام شراکت نامہ طے کرے اور ایسے تمام اموال کو مختلف قسم کے تجارتی' صنعتی اور زراعتی یا دوسرے اُن جائز کاروباروں میں جو بینک کے دائرۂ عمل میں آ سکتے ہوں' لگائے اور اس مجموعی کاروبار سے جو منافع حاصل ہو' اُسے ایک طے شدہ نسبت کے ساتھ اُن لوگوں میں اسی طرح تقسیم کر دے جس طرح خود بینک کے حصہ داروں میں منافع تقسیم ہوتا ہے۔'' (''تبیان القرآن'' ج ا' ص ص ۹۸۲' ۹۸۳)

''افراطِ زر کی صورت میں اصل زر کو بحال رکھنے کا حل: ڈالرز' ین' پونڈ اور ریال وغیرہ مستحکم کرنسی ہیں اور عرف اور تعامل سے یہ مقرر اور ثابت ہے کہ اُن کی قدر برقرار رہتی ہے۔ پاکستان' بھارت' بنگلہ دیش اور دیگر پسماندہ ممالک کی طرح افراطِ زر کے نتیجہ میں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اُن کی قدر میں کمی نہیں ہوتی' سو جو شخص چار پانچ سال یا زائد عرصہ کے لئے بینک میں اپنا پیسہ رکھنا چاہتا ہے' اُسے چاہئے کہ وہ اپنی رقم کو ڈالر یا کسی اور مستحکم کرنسی میں منتقل کر کے ان بینکوں میں اپنی رقوم رکھے جو غیر ملکی کرنسی میں بھی اکاؤنٹ کھولتے ہیں۔ اسی طرح جو

شخص کسی دوسرے شخص کو ملکی کرنسی میں مثلاً ایک ہزار روپے قرض دیتا ہے اور وہ شخص اُسے دس سال بعد ایک ہزار روپے واپس کرتا ہے تو دس سال بعد ایک ہزار روپے کی قدر ایک سو روپے رہ جائے گی۔ اس نقصان سے بچنے کا بھی یہی طریقہ ہے کہ وہ اپنی رقم کو ڈالر میں منتقل کر کے قرض دے اور جتنے ڈالر دئے تھے' اُتنے ہی واپس لے لے۔''

''بعض علماء نے کہا ہے کہ اگر اُس نے ملکی کرنسی میں رقم قرض دی تھی اور مثلاً دس سال بعد اُس کی قدر کم ہو گئی تو وہ اب بھی دس سال پہلے کی ملکی کرنسی جتنے ڈالر کے مساوی تھی' دس سال بعد اتنی ملکی کرنسی واپس لے سکتا ہے مثلاً پہلے ایک ہزار روپے جتنے ڈالر کے مساوی تھے' دس سال بعد اگر اتنے ڈالر کے دس ہزار روپے بنتے ہیں تو وہ دس ہزار روپے لے سکتا ہے لیکن ہمارے نزدیک یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ اس صورت میں وہ بہر حال ایک ہزار روپے دے کر دس ہزار روپے لے رہا ہے اور معنوی طور پر خواہ اُن کی قدر برابر ہو لیکن یہ صورۃً اصل رقم سے زائد لینا ہے اور ظاہری طور پر اس کے سود ہونے میں کوئی شک نہیں ہے۔ نیز چونکہ یہ پہلے سے طے کیا گیا اس لئے یہ موجب نزاع بھی ہے۔ افراطِ زر سے بچنے کے لئے ملکی کرنسی کو سونے چاندی سے بدل کر قرض دینا بھی جائز نہیں ہے کیونکہ سونے چاندی میں اُدھار جائز نہیں ہے۔'' (''تبیان القرآن''۔ علامہ غلام رسول سعیدی' ج ۱' ص ۹۸۳)

''قیامت میں سود خور کے مخبوط الحواس ہو کر اٹھنے سے جن چڑھنے پر استدلال: سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۷۵ میں ارشادِ باری تعالیٰ ہوا:۔

اَلَّذِیۡنَ یَاۡکُلُوۡنَ الرِّبٰوا لَا یَقُوۡمُوۡنَ اِلَّا کَمَا یَقُوۡمُ الَّذِیۡ یَتَخَبَّطُہُ الشَّیۡطٰنُ مِنَ الۡمَسِّ

"جو لوگ سود کھاتے ہیں' وہ کھڑے نہ ہو سکیں گے سوائے اس کے کہ جیسے وہ کھڑا ہوتا ہے جسے شیطان نے جنون سے خبطی بنا دیا ہو۔'' (۲ : ۲۷۵)

مَسّ کا اصل معنیٰ چھونا ہے۔ بعض اوقات اس کا استعمال کسی برائی اور مصیبت سے بچنے کے لئے بھی ہوتا ہے۔ جناب ایوب علیہ السلام نے اپنی دعا میں فرمایا تھا:

اَنِّیۡ مَسَّنِیَ الشَّیۡطٰنُ بِنُصۡبٍ وَّ عَذَابٍ (صٓ : ۴۱)

''کہ شیطان نے مجھے بڑی اذیت اور سخت تکلیف پہنچائی ہے۔'' (۳۸ : ۴۱)

''نیک بندوں پر تو شیطان کا اِس سے زیادہ اثر نہیں ہوتا کہ وہ اُنہیں کسی اذیت اور آزمائش میں مبتلا کر دے لیکن عام لوگ جن کی رگوں میں شیطان سیال خون کی طرح دوڑتا ہے' اُن میں سے جو فاسق و فاجر ہوتے ہیں' کبھی کبھی اُن کی عقل اور دماغ پر بھی شیطان کا تسلط ہو جاتا ہے اور وہ پاگلوں کی طرح کپڑے پھاڑتے ہیں اور منہ سے جھاگ اڑاتے ہوئے' پریشان حال' پراگندہ بال جدھر سینگھ سمائے خاک اُڑاتے پھرتے ہیں۔ اُسے یہ سزا اس لئے دی جائے گی کہ دنیا میں وہ اپنا مال بڑھانے کی حرص میں اس طرح دیوانہ ہو چکا تھا کہ اُسے نہ خوفِ خدا تھا اور نہ کسی ضرورتمند اور مصیبت زدہ پر اُسے ترس آتا تھا۔ سود خوری کی محبت میں وہ

بالکل مجنون ہو چکا تھا' اس لئے قیامت کے دن اُسے پاگلوں کی طرح مخبوط الحواس اٹھایا جائے گا۔ اہلِ عرب پاگل شخص کو مجنون کہتے ہیں یعنی یہ آسیب زدہ شخص ہے یا اس پر جن بھوت کا سایہ ہے یا جن کے چھونے کی وجہ سے وہ پاگلوں کی سی حرکتیں کر رہا ہے اور مخبوط الحواس اٹھے گا۔ عرب کے اسی اسلوب اور محاورہ کے مطابق قرآن مجید نے یہ بیان کیا ہے کہ قیامت کے دن سود خور پاگلوں کی طرح مخبوط الحواس اٹھے گا۔''

''پیداواری یا صَرفی قرضے: پیداواری قرضوں پر ایک دلیل یہ بھی جاتی ہے کہ قرآن کریم نے صرف صَرفی قرضوں پر کسی اضافی رقم کے مطالبے کو منع کیا ہے جس میں مقروض ایسے غریب لوگ ہوتے تھے جو اپنی روزمرّہ کی غذائی یا لباس پوشاک وغیرہ سے متعلق ضروریات کی تکمیل کے لئے قرضے لیا کرتے تھے۔ چونکہ اُس زمانے میں کسی قسم کے پیداواری قرضے نہیں ہوتے تھے' اس لئے قرآن پاک نے پیداواری یا تجارتی قرضوں پر عائد کیا جانے والا اضافہ حرام قرار نہیں دیا۔ اس سلسلے میں یہ دلیل بھی دی جاتی ہے کہ کسی غریب شخص سے کسی قسم کی اضافی رقم وصول کرنا ناانصافی ہے تاہم کسی امیر شخص سے جو اپنی تجارت چمکانے اور نفع کمانے کے لئے قرضہ لیتا ہے' اُس سے اضافی رقم وصول کرنا ناانصافی نہیں ہے۔ لہٰذا صرف پہلی قسم کے قرضے یعنی صَرفی قرضوں پر وصول کیا جانے والا اضافہ ''رِبا'' کہلائے گا۔ اس کے برعکس تجارتی قرضوں پر اضافی رقم ''رِبا'' نہیں ہوگی۔''

''کسی معاملے کی دُرستگی کا معیار کسی فریق کی مالی حیثیت نہیں ہوا کرتی: کسی مالیاتی' تجارتی معاملے کی دُرستگی کی بنیاد کسی بھی فریق کی مالی حیثیت نہیں ہوتی بلکہ درحقیقت اس معاملے کی درستگی کی بنیاد اس عقد کی حقیقی ماہیت ہوتی ہے۔ اگر کوئی عقد اپنی ماہیت کے لحاظ سے درست ہے تو پھر فریقین میں سے کسی کے غریب یا امیر ہونے سے اس میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ خریدار خواہ مالدار ہو یا غریب' وہ درست قرار پائے گا۔ مثلاً بیع ایک جائز معاملہ ہے جس کے ذریعے حلال منافع حاصل کیا جاتا ہے اور یہ معاملہ بہرصورت جائز ہے خواہ خریدار امیر ہو یا غریب۔ کرایہ داری ایک قانونی اور جائز معاملہ ہے خواہ اُس کا کرایہ دار غریب شخص ہو۔ زیادہ سے زیادہ یہ تو کہا جا سکتا ہے کہ غریب خریدار یا غریب کرایہ دار انسانی بنیادوں پر رعایت کا مستحق ہے لیکن یہ کوئی نہیں کہتا کہ اس سے سرے سے نفع لینا ہی ممنوع و حرام ہے۔ اگر کوئی غریب آدمی کسی نانبائی سے روٹی خریدتا ہے تو کوئی شخص یہ تو کہہ سکتا ہے کہ اس سے زیادہ نفع نہ کماؤ لیکن یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ نانبائی کو اسے روٹی صرف لاگت پر فروخت کرنی چاہئے اور اس پر کسی قسم کا نفع کمانا دوزخ میں لے جانے والا گناہ ہے۔ اگر کوئی غریب شخص کوئی ٹیکسی کرایہ پر لیتا ہے تو ایک شخص اس کے مالک سے یہ تو کہہ سکتا ہے کہ تم اس کی غربت کی وجہ سے اس سے کرایہ کم لو لیکن کوئی شخص معقولیت کے ساتھ اس پر یہ اصرار نہیں کر سکتا کہ اس سے بالکل کرایہ نہ لو یا اُس سے اپنی لاگت اور خرچے سے زیادہ وصول نہ کرو ورنہ تمہاری کمائی حرام اور اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول علیہ السلام کے خلاف جنگ کے مترادف ہوگی۔ نانبائی نے اپنی دکان اس لئے کھولی تھی تاکہ وہ اس میں جائز تجارت کے ذریعے اپنی محنت اور سرمایہ داری کی وجہ سے مناسب نفع کا مستحق ہو' خواہ اُس کا خریدار غریب ہو۔ اب اگر اُسے اِس بات پر مجبور کیا جائے کہ تم غریب لوگوں کو روٹیاں لاگت پر فروخت کرو تو وہ نہ تو اپنی دکان چلا سکتا ہے اور نہ ہی وہ اپنے بچوں کے لئے روزینہ کما سکتا ہے۔ اسی طرح ٹیکسی چلانے والا مسافروں کے واسطے اپنی ٹیکسی چلانے کی خدمت کے عوض ان سے مناسب کرایہ بھی وصول کر سکتا ہے۔

لہٰذا اگر اُس سے یہ کہا جائے کہ تم غریب لوگوں کے لئے یہ خدمت مفت فراہم کرو تو وہ یہ کام کر ہی نہیں سکتا۔ لہٰذا کبھی کسی شخص نے بھی یہ مطالبہ نہیں کیا کہ کسی غریب سے کوئی نفع' اجرت یا کرایہ کمانا مکمل طور پر حرام ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی بھی درست معاملے میں جائز نفع کمانا یا ایسے افراد سے جو کسی خدمت کے ذریعہ نفع اُٹھائیں' اُن سے اجرت یا کرایہ وصول کرنا جائز ہے' اگر چہ وہ غریب ہوں۔''

''دوسری طرف ممنوعہ معاملات کے ممنوع ہونے کی وجہ سے اس معاملے کی حقیقی ماہیت ہے نہ کہ کسی فریق کی مالی حیثیت۔ قمار یا جوا دونوں کے لئے حرام ہے۔ رشوت حرام ہے خواہ کسی مالدار سے لی جائے یا غریب سے۔ خلاصہ یہ ہے کہ مال داری یا غربت ایسے وصف نہیں ہیں جو کسی معاملے کی درستگی یا نا دُرستگی کی بنیاد بنیں بلکہ اس معاملے کی بنیادی شرائط اس کی صحت وفساد کا سبب ہوتی ہیں۔''

''کسی مقروض سے سود وصول کرنے کا معاملہ بھی اس سے چنداں مختلف نہیں ہے۔ چنانچہ اگر یہ بنیادی طور پر ایک جائز معاملہ ہے تو خواہ مقروض غریب ہو یا امیر' بہر صورت جائز ہونا چاہئے اور اگر یہ بنیادی طور پر نا جائز ہے تو بھی غربت اور مال داری کے بغیر اُسے نا جائز ہونا چاہئے۔ یہاں پر سود کے عقد اور خرید وفروخت کے عقد میں اس طرح کی تفریق کرنے کی کوئی بنیاد نہیں ہے کہ مذکورۃ الصدر کی درستگی صرف مال دار مقروضوں تک محدود ہو جبکہ خرید و فروخت کے عقد میں غریب اور امیر دونوں سے مساوی طور پر نفع کمانا جائز ہو۔ درحقیقت یہ اندازِ فکر کہ سود صرف اُس صورت میں حرام ہے جب وہ کسی غریب سے وصول کیا جائے' تجارت کے اس مسلّم اصول کے سرے سے خلاف ہے کہ جس میں کسی معاملے کی صحت کو خود اس معاملے کی حقیقت اور پختگی کے پیمانے سے جانچا جاتا ہے نہ کہ اس سے متعلق فریقوں کی مالی حیثیت کے پیمانے سے۔''

''مزید براں غربت ایک اضافی (Relative) اصطلاح ہے جو کہ مختلف مراتب رکھتی ہے۔ اگر ایک مرتبہ یہ تسلیم کر لیا جائے کہ سود صرف غریب سے وصول نہیں کیا جائے گا اور مالدار سے وصول کرنا بالکل حق بجانب ہو گا تو پھر وہ کون سی مجاز اتھارٹی ہوگی جو غربت جانچنے کے لئے ایک ایسا پیمانہ مقرر کرے جس کی وجہ سے کسی غریب کو سود کی ادائی سے مستثنیٰ قرار دیا جا سکے۔ پھر اگر جائز یا نا جائز سود کی بنیاد قرض لینے کے مقاصد کو قرار دیا جائے یعنی ذاتی احتیاج سے متعلق قرضوں پر سود کی ادائیگی کو مستثنیٰ قرار دیا جائے تو پھر احتیاج کے بھی بذاتِ خود کئی مراتب اور حدود ہیں۔ احتیاج کی حد غذائی اجناس سے شروع ہو کر پُر تعیش اشیاء تک جا پہنچتی ہے۔ اگر احتیاج یا صَرف کو کسی کی زندگی کی ضروریات تک ہی محدود کر دیا جائے تب بھی یہ آدمی آدمی میں بدل سکتی ہے۔ ایک شخص یہ دلیل دے سکتا ہے کہ ذاتی ٹرانسپورٹ اب زندگی کی ضرورت بن چکی ہے' لہٰذا کار خریدنے کے لئے بلا سود قرضے جائز ہونے چاہئیں۔ مکان بھی انسان کی زندگی کی بنیادی ضرورت ہے لہٰذا کسی بھی مکان کے لئے لاکھوں روپے کے قرضوں پر بھی سود عائد نہیں کرنا چاہئے کیونکہ یہ تمام ضروریات ''احتیاجی قرضوں'' کی فہرست میں داخل ہیں۔ اس کے برخلاف اگر ایک بیروزگار شخص چند ہزار روپے اس لئے قرض لے تا کہ سڑک پر ایک تھلّہ لگا کر کاروبار شروع کرے تو اس پر سود عائد کرنا اس فلسفے کے تحت جائز ہونا چاہئے کیونکہ یہ تجارتی قرضہ ہے نہ کہ صَرفی قرضہ۔''

''اس تمام بحث سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ سود کا جواز نہ تو مقروض کی مالی حیثیت پر مبنی ہے اور نہ ہی روپیہ قرض لینے کے مقصد پر مبنی ہے۔ لہٰذا اس لحاظ سے صَرفی اور پیداواری قرضوں میں امتیاز یا تفریق کرنا مسلّمہ اصولوں کے خلاف ہے۔''

''قرآنی ممانعت کی حقیقت: دوسری بات جس کی وجہ سے مذکورہ دلیل قابلِ قبول نہیں ہے' یہ ہے کہ نہ تو رِبا کو حرام قرار دینے والی آیات صَرفی اور تجارتی قرضوں کے رِبا میں کوئی تفریق کرتی ہیں اور نہ رِبا سے متعلق احادیث میں اس قسم کا کوئی فرق نظر آتا ہے یہاں تک کہ اگر بالفرض تھوڑی دیر کے لئے یہ بات تسلیم کر بھی لی جائے کہ اُس زمانے میں تجارتی قرضے نہیں پائے جاتے تھے' تب بھی اس بات کا کوئی جواز پیدا نہیں ہوتا کہ رِبا کا جو تصوّر قرآن کریم کے مخاطب حضرات کے ذہن میں بالکل واضح تھا' اس میں کوئی خارجی شرط عائد کی جائے۔ قرآن پاک نے تو رِبا کو علی الاطلاق حرام قرار دیا ہے خواہ رِبا کی کوئی شکل اس کے نزول کے وقت رائج ہو یا نہ ہو۔ جب قرآن پاک کسی چیز کو حرام قرار دیتا ہے تو اُس کی حرمت سے مراد اس معاملے کی کوئی ایک مخصوص شکل نہیں ہوتی بلکہ وہ اس معاملے کا بنیادی تصور ہوتا ہے جو اس حکم کے ذریعے متاثر ہوتا ہے۔ جب شراب حرام کی گئی تھی تو اس سے شراب کی صرف وہ شکلیں مراد نہ تھیں جو عہدِ رسالتماب ﷺ میں رائج تھیں بلکہ اس شراب کی بنیادی حقیقت کو حرام کیا گیا تھا۔ لہٰذا کوئی بھی معقول شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ شراب کی کوئی ایسی شکل جو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ میں مروّج تھی' حرام نہیں ہے۔ جب قمار یا جوئے کی حرمت کا اعلان کیا گیا تو اُس کی حرمت کا مقصد صرف اُس زمانے میں رائج قمار کی صورتوں تک محدود نہ تھا بلکہ درحقیقت اس کی ممانعت اس کی تمام موجودہ اور آئندہ شکلوں پر محیط تھی اور کوئی بھی یہ توجیہ نہیں کرسکتا کہ جوئے کی جدید صورتوں کے جو معنیٰ اہلِ عرب کی سمجھ میں آئے اور حضور ﷺ اور اُن کے صحابہ کرام نے بھی بیان فرمائے' وہ یہ تھے کہ قرض یا دَین کے معاملے پر کوئی بھی مقرر کردہ اضافی رقم رِبا ہے۔ رِبا کا یہ تصوّر حضور ﷺ کے زمانے میں بہت سی شکلیں رکھتا تھا اور بعد کے آنے والے زمانوں میں اس کی شکلوں میں مزید اضافہ ہوا ہوگا اور مستقبل میں بھی اس کی شکلوں میں اضافہ متوقع ہے لیکن جب تک مذکورہ بالا رِبا کا بنیادی عنصر اس معاملے میں موجود رہے گا' رِبا کی وہ شکل یقیناً حرام رہے گی۔'' (''سود پر تاریخی فیصلہ''۔۔ مفتی محمد تقی عثمانی' مترجم: ڈاکٹر مولانا محمد اشرف عثمانی' صفحات ۴۹ تا ۵۴)

''روپے کی ماہیت: ایک غلط تصوّر جس پر تمام سودی نظریات کی بنیاد ہے' یہ ہے کہ نقدی کو سامان (جنس) کا درجہ دے دیا گیا ہے۔ اِسی لئے یہ دلیل پیش کی جاتی ہے کہ جس طرح سامان کو اپنی اصل لاگت سے زائد نفع پر فروخت کیا جاسکتا ہے' اِسی طرح نقدی کو بھی اُس کی قیمتِ اسمیہ سے زائد پر فروخت کیا جانا چاہئے' یا جس طرح کوئی شخص اپنی جائیداد کو کرایہ پر چڑھا سکتا ہے' اسی طرح وہ نقدی کو بھی کرایہ پر دے کر ایک مخصوص اور متعین' سود یا کرایہ کما سکتا ہے۔''

''اسلامی اصول اس نقطہ نظر کی حمایت نہیں کرتا۔ نقدی اور جنس (سامان) میں اپنی خصوصیات کے لحاظ

سے بڑا فرق ہے اس لئے اسلام میں دونوں کے ساتھ معاملہ بھی الگ الگ کیا گیا ہے۔نقدی اور سامان کے درمیان بنیادی فرق کو درج ذیل طریقوں سے واضح کیا جا سکتا ہے:۔''

''(۱) نقدی کا اپنا کوئی ذاتی فائدہ اور استعمال نہیں ہے۔اُسے انسانی ضروریات پورا کرنے کے لئے بلاواسطہ استعمال نہیں کیا جا سکتا۔اُسے صرف کچھ سامان یا خدمات حاصل کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔اس کے برعکس سامان کی اپنی افادیت ہوتی ہے۔اُسے ذریعہ مبادلہ بنائے بغیر بھی استعمال کر کے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔''

''(۲) اشیاء یا سامان مختلف اوصاف کے ہو سکتے ہیں جبکہ نقدی میں اوصاف کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا۔نقدی کے تمام اجزاء برابر مالیت کے سمجھے جاتے ہیں۔مثلاً ایک ہزار روپے کا میلا کچیلا اور پرانا نوٹ وہی مالیت رکھتا ہے جو کہ بالکل نیا نویلا ایک ہزار روپے کا نوٹ رکھتا ہے۔''

''(۳) سامان کی خرید و فروخت کسی متعین اور شناخت شدہ چیز سے متعلق ہوتی ہے مثلاً زید بکر سے ایک کار اشارے کے ذریعے متعین کر کے خریدتا ہے تو اب زید اُسی کار کے لینے کا حق دار ہے جو اشارہ کر کے متعین کی گئی تھی۔بیچنے والا اسے کوئی دوسری کار لینے پر مجبور نہیں کر سکتا' خواہ وہ اُنہی خصوصیات کی حامل ہو۔''

''اس کے برعکس رقم کسی خرید و فروخت کے معاملے میں اشارے کے ذریعے متعین نہیں کی جا سکتی مثلاً زید نے بکر سے ایک چیز ایک ہزار کا مخصوص نوٹ دکھلا کر خریدی۔جب ایک ہزار کی ادائیگی کا وقت آیا تو اُسے اختیار ہے کہ وہ اس کی جگہ کوئی دوسرا ایک ہزار کا نوٹ بکر کو دے دے۔''

''مذکورہ بالا وجوہات کی بناء پر شریعتِ اسلامیہ نے خصوصاً دو باتوں میں نقدی کا حکم سامان سے الگ رکھا ہے: پہلا یہ کہ ایک ہی جنس کی نقدی کو تجارت کا موضوع نہیں بنایا بلکہ اس کے استعمال کو اس کے بنیادی مقصد تک محدود کر دیا گیا ہے اور وہ بنیادی مقصود یہ ہے کہ وہ ذریعہ تبادلہ (Medium of Exchange) یا قدر کی پیائش (Measure of Value) کے طور پر کام کرے۔''

''اگر استثنائی حالات میں نقدی کا تبادلہ نقدی سے کرنا ہی پڑے یا اسے قرض لیا جا رہا ہو تو دونوں طرف کی ادائیگی برابر ہونی چاہئے تا کہ اسے اس کے لئے استعمال نہ کیا جا سکے جس کے واسطے اسے نہیں بنایا گیا یعنی خود نقدی کی تجارت کرنا۔''

''اسلامی تاریخ کے مشہور فقیہ اور فلسفی امام غزالی علیہ الرحمۃ (م ۵۰۵ ھ) نے نقدی کی ماہیت کے بارے میں اُس قدیم زمانے میں تفصیل سے بحث کی جبکہ نقدی کے بارے میں مغربی نظریات وجود میں بھی نہ آئے تھے۔وہ فرماتے ہیں:۔

''درہم اور دینار کی تخلیق خدا تعالیٰ کی طرف سے ایک رحمت ہے۔ یہ ایسے پتھر ہیں جن کی اپنی ذاتی افادیت نہیں ہے لیکن تمام انسان اس کے محتاج ہیں کیونکہ ہر شخص اپنے کھانے پینے اور لباس وغیرہ کے لئے بہت سی اشیاء کا محتاج ہے اور اکثر اوقات انسان کے پاس وہ اشیاء نہیں ہوتیں جن کی اُسے ضرورت ہوتی ہے اور اُس کے پاس وہ اشیاء ہوتی ہیں جن کی اُسے ضرورت نہیں ہوتی۔ اسی لئے تبادلے کے معاملات ضروری ہیں۔ البتہ ایک ایسا آلہِ پیمائش ہونا چاہئے جس کی بنیاد پر قیمت کا تعین کیا جائے کیونکہ اشیاء کا تبادلہ ایک ہی جنس اور قسم میں نہیں ہوتا اور نہ ہی ایک پیمائش سے ہوتا ہے کہ وہ متعین کر سکے کہ کتنی مقدار کی ایک شے دوسری شے کی صحیح قیمت ہے۔ اسی لئے یہ تمام اشیاء اپنی صحیح قدر جانچنے کے لئے کسی درمیانی واسطے کی محتاج ہیں۔۔۔۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اِسی لئے درہم اور دینار کو تمام اشیاء کی قدر جانچنے کے لئے ایک واسطہ بنایا ہے اور اُن کا آلہِ قدر ہونا اس حقیقت پر مبنی ہے کہ وہ بذاتِ خود کوئی سامان نہیں ہیں۔ اگر وہ بذاتِ خود کوئی سامان ہوتے تو کوئی شخص اُنہیں رکھنے کا کوئی مخصوص مقصد رکھتا جو اُنہیں اس کی نیت کی وجہ سے اہمیت دیتا جبکہ کوئی دوسرا ان کا کوئی مخصوص مقصد نہ ہونے کی بناء پر اُنہیں اتنی اہمیت نہ دیتا جس کی وجہ سے پورا نظام خراب ہو جاتا۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اُنہیں پیدا فرمایا تاکہ وہ لوگوں کے درمیان گردش کریں اور مختلف اشیاء کے درمیان منصف کا کام دیں اور وہ دوسری اشیاء کے تبادلے اور حصول کے لئے ایک ذریعے کا کام دیں۔ چنانچہ جو شخص اُن کا مالک ہے گویا وہ ہر چیز کا مالک ہے۔ اس کے برخلاف اگر کوئی شخص ایک کپڑے کا مالک ہے تو وہ صرف ایک کپڑے کا مالک ہے۔ اِسی لئے اُسے اگر غذا کی ضرورت ہے تو اِس بات کا امکان ہے کہ غذا کا مالک اپنی غذا کو اس کے کپڑے سے تبادلہ کرنے میں کوئی دلچسپی نہ رکھتا ہو کیونکہ ہو سکتا ہے کہ مثال کے طور پر اُسے کپڑے کی بجائے جانور کی ضرورت ہو۔ اسی لئے کسی ایسی چیز کی ضرورت تھی جو بظاہر خود کچھ نہ ہو لیکن اپنی روح کے لحاظ سے سب کچھ ہو۔ ایک ایسی شے جو کوئی مخصوص شکل نہیں رکھتی' دوسری اشیاء کی نسبت سے مختلف شکلیں رکھ سکتی ہے' مثلاً آئینہ جس کا اپنا کوئی رنگ نہیں ہوتا لیکن وہ ہر رنگ کی عکاسی کرتا ہے۔ بالکل یہی حال نقدی کا بھی ہے کہ وہ بذاتِ خود کوئی سامان یا شے نہیں ہے لیکن یہ ایک ایسا آلہ ہے جو تمام اشیاء کے حصول کا سبب بنتا ہے۔ چنانچہ اگر کوئی نقدی کو اس طرح استعمال کر رہا ہو جو اُس کے بنیادی مقصد کے خلاف ہو تو وہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کی رحمت کی ناشکری کر رہا ہے۔ نتیجتاً اگر کوئی شخص نقدی کی ذخیرہ اندوزی کر رہا ہے تو وہ اس کے ساتھ ناانصافی اور اس کے بنیادی مقصد کو تلف کر رہا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی حاکم کو قید خانے میں بند کر دے۔ اور جو شخص نقدی پر سُودی معاملت کرتا ہے وہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کی رحمت کو ٹھکرا رہا ہے اور ناانصافی کر رہا ہے کیونکہ نقدی کو دوسری اشیاء کے لئے پیدا کیا گیا ہے نہ کہ خود اپنے لئے۔ چنانچہ جو شخص نقدی کی تجارت کر رہا ہے تو اُس نے اُسے ایک شے یا سامان بنا دیا ہے جو کہ اس کی اصل خِلقت کی حکمت کے خلاف ہے کیونکہ یہ ناانصافی ہے کہ پیسے کو اس مقصد کے علاوہ کسی اور کام میں استعمال کیا جائے کہ جس کے واسطے اُسے پیدا کیا گیا۔ اب اگر اُسے اس بات کی اجازت دے دی جائے کہ وہ پیسے کی تجارت کرے تو پیسہ ہی اُس کا آخری مقصد بن جائے گا اور وہ اس کے پاس ذخیرہ شدہ نقدی کی مانند پڑا رہے گا اور حاکم کو قید کرنا یا ایلچی کو پیغام دینے سے روکنا ظلم کے سوا کچھ نہیں۔'' (''احیاء العلوم''۔۔ امام غزالی' ج ۴' ص ۸۸ طبع قاہرہ ۱۹۳۹' ملخص ترجمہ)

''نقدی کی حقیقت کے بارے میں امام غزالی علیہ الرحمۃ کا یہ مختصر مگر جامع تجزیہ جو نو سو سال پہلے کیا گیا تھا وہ معاشی مفکرین صحیح تسلیم کر رہے ہیں جو اُن کے کئی صدیوں بعد آئے ہیں۔ اس بات پر کہ پیسہ صرف آلہ تبادلہ اور آلہ پیائشِ قدر ہے' پوری دنیا کے تمام معاشی مفکرین کا اجماع نظر آتا ہے۔ لیکن بدقسمتی سے بہت سے معاشی مفکرین اس تصوّر کے اس منطقی نتیجے تک پہنچنے میں ناکام رہے جو امام غزالی نے اتنی وضاحت کے بیان فرمایا ہے یعنی یہ کہ پیسہ کی سامان کی طرح تجارت نہیں کرنی چاہئے' روپے کو جنس (عروض) قرار دے کر موجودہ معیشت دان ان قدر پریشان کن مسائل میں گرفتار ہو چکے ہیں کہ جن سے چھٹکارا پانا ناممکن ہے۔'' (''سود پر تاریخی فیصلہ'' صفحات ۹۸ تا ۱۰۲)

''ربا اور نظریہ ضرورت (Riba & The Doctrine of Necessity): اس ضمن میں دلیل یہ دی جاتی ہے کہ قرآنِ حکیم نے انسان کو اپنی سخت بھوک کی حالت میں زندگی بچانے کے لئے خنزیر کھانے کی بھی اجازت دی ہے۔ سود پر مبنی نظام ایک ایسی عالمگیر ضرورت بن چکا ہے کہ کوئی ملک بھی اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ آج پوری دنیا ایک عالمی بستی کی شکل اختیار کر چکی ہے اور کوئی ملک تنہا نہیں رہ سکتا' بالخصوص ہمارا ملکِ پاکستان جو کہ قرضوں تلے دبا ہوا ہے اور اس کے تمام ترقیاتی منصوبے زیادہ تر غیر ملکی سودی قرضوں پر منحصر ہیں' ایک مرتبہ اگر مکمل طور پر سود کی حرمت نافذ کر دی جائے تو یہ تمام ترقیاتی منصوبے آخری سانس لیں گے اور پوری معیشت اچانک زوال کا شکار ہو جائے گی۔ کوئی شک نہیں کہ سود کو قرآنِ حکیم نے حرام قرار دیا ہے تاہم ملکی سطح پر اس کی حرمت کا نفاذ ایسی خودکشی کے مترادف ہوگا جو تمام ملکی معیشت کو نقصان پہنچائے گا' اس لئے اسے اسلامی احکامات کے خلاف نہیں قرار دینا چاہئے۔''

''اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام ایک حقیقت پسندانہ مذہب ہے۔ وہ کبھی کسی ایسے حکم پر کسی فرد یا حکومت کو مجبور نہیں کرتا جس کی تعمیل اس کے اختیار سے باہر ہو۔ نظریہ ضرورت اُن نظریات میں سے ایک ہے جو قرآن کریم اور سنتِ رسول ﷺ سے مستنبط اور ماخوذ ہیں اور جسے مسلمان فقہائے کرام نے تفصیلاً بیان بھی کیا ہے۔ اسلام میں نظریہِ ضرورت کا تصوّر مجمل اور مبہم نہیں ہے۔ مسلمان فقہائے کرام نے قرآن وسنت سے استنباط کر کے اس کے کچھ ایسے اوصاف بیان فرمائے ہیں جن سے ضرورت کی شدّت اور مقدار کا پتہ چلتا ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ ضرورت کے مواقع پر کس حد تک قرآن وسنت کے احکام کے مطابق گنجائش دی جا سکتی ہے۔ اسی لئے ضرورت کی بنیاد پر کسی بھی مسئلے پر کوئی فیصلہ کرنے سے قبل اس بات کی یقین دہانی ضروری ہوگی کہ ضرورت حقیقی ہے اور خیالی اندیشوں اور ملمع سازی پر مبنی نہیں ہے اور مزید یہ کہ اس کی ضرورت کی تکمیل اس ناجائز کام کے سرانجام دیئے بغیر ناممکن ہے۔ جب ہم مذکورہ بالا اصولوں کی روشنی میں سود کے بارے میں غور کرتے ہیں تو ہمیں یہ نظر آتا ہے کہ اس بارے میں بہت زیادہ مبالغے سے کام لیا جا رہا ہے۔ حقیقت پسندانہ تجزیے کے لئے ہمیں اندرونی اور بیرونی معاملات پر علیحدہ علیحدہ غور کرنا ہوگا۔''

''اندرونی معاملات: اندرونی معاملات میں سود کے خاتمے کے خلاف خدشات اس پر مبنی ہیں کہ سود کے خاتمے کا مقصد بینکوں کو خیراتی اداروں میں تبدیل کر دینا ہے اور بینک اسلامی نظام کے تحت رقمیں کسی نفع کے بغیر تمویل کیا کریں گے' لہٰذا کھاتہ داروں کو بھی بینکوں میں رکھی گئی رقوم کے عوض کچھ حاصل نہ ہوگا۔''

''اسلام میں قرض کا کردار تجارتی معیشت میں بہت محدود ہے۔ بینکوں اور تمویلی اداروں کو اسلامائز کرنے کا مطلب بغیر نفع کے تمویل کرنا نہیں ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ بینک نفع نقصان میں شراکت کی بنیاد اور دوسرے اسلامی طریقہ ہائے تمویل کی بنیاد پر تمویل کریں گے جن میں سے کوئی بھی نفع کے بغیر نہیں ہوگا۔''

یہ بھی کہا جاتا ہے ''کہ اسلامی اصولوں پر مبنی متبادل بینکاری نظام ابھی تک نہ تو تیار کیا گیا ہے اور نہ ہی اس پر عمل کیا گیا ہے' لہٰذا اس کی اچانک تعمیل کرنے سے ہم ایک ایسے تاریک اور مبہم علاقے میں داخل ہو جائیں گے جو ہمیں اَن دیکھے خطرات کی طرف دھکیل دے گا اور جو ہماری معیشت میں مکمل تباہی لا سکتا ہے۔''

''یہ خدشہ درحقیقت موجودہ بینکاری نظام کے بارے میں نئے افکار اور اسلامی بینکاری نظام کے میدان میں گزشتہ تین دہائیوں میں کی گئی مساعی سے بے خبری اور ناآگاہی پر مبنی ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اسلامی بینکنگ کوئی دیومالائی یا افسانوی خواب نہیں ہے۔ مسلمان فقہائے کرام اور معاشی ماہرین اسلامی بینکاری کے مختلف میدانوں میں تقریباً پچاس سال سے کام کر رہے ہیں اور ۱۹۷۰ء سے اسلامی بینکاری کا تصور ایسے حقیقی اداروں کے رُوپ میں تبدیل ہوا جو اسلامی خطوط کے مطابق کام کر رہے ہیں۔ پوری دنیا میں اسلامی بینکوں اور تمویلی اداروں کی تعداد تین دہائیوں سے روز بروز بڑھ رہی ہے۔''

''موجودہ اسلامی ترقیاتی بینک (IDB) جدہ کو آرگنائزیشن آف اسلامی کانفرنس (.O.I.C) نے ۱۹۷۵ء میں اسلامی بینکاری کے موجد کے طور پر قائم کیا تھا۔ اس بینک کا اوّلیں مقصد رکن ممالک کے ترقیاتی منصوبوں کے واسطے بین الحکومتی تمویلی عقود کے ذریعے سرمایہ فراہم کرنا تھا لیکن یہ اب پرائیویٹ سیکٹر (نجی شعبے) میں بھی تجارتی تمویل (ٹریڈ فائنانس) کی سہولت فراہم کر رہا ہے۔ یہ بینک اب اپنا ایک تحقیقی مرکز قائم کئے ہوئے ہے جو اسلامی بینکاری اور معیشت کے مختلف مسائل پر کام کر رہا ہے۔'' (ایضاً صفحات ۱۳۸ تا ۱۴۱)

''اسلامی بینکاری: یہ دو لحاظ سے بڑی قابلِ امتیاز ہے: ایک یہ کہ وہ معیشت کے حقیقی شعبے میں مرتکز ہے' مالیاتی بہاؤ اور اشیاء و خدمات کے درمیان ایک شناخت پیدا کر کے نفع و نقصان میں شرکت کے اعلیٰ نظام کو اپناتے ہوئے یہ معاشی نظام میں زبردست استحکام پیدا کرتی ہے۔ یہ معاشرے کو قرضوں کے بوجھ سے بچاتی ہے' اس وجہ سے کہ اگر کبھی معیشت بحران کا شکار ہو جائے تو نفع نقصان میں شراکت کے اصول' ریاست اور معاشی کارکنان کو اجتماع سود (Accumulation of Interest) کی خرابیوں سے محفوظ رکھتے ہیں اور دیوالیہ پن اور نادہندگیوں (Defaults) کے خطرات کم کرتے ہیں۔''

''چونکہ اسلامی بینکاری کا تجربہ ابھی ابتدائی مرحلے سے گزر رہا ہے' اس لئے اس صنعت کو متعدد مسائل کا سامنا ہے۔ یہ مسائل بہت سے تحقیقی اداروں' تعلیمی حلقوں' تربیتی پروگراموں' ورکشاپوں اور کانفرنسوں میں لائے

گئے ہیں۔ آج بہت بڑی تعداد میں کانفرنسیں، سیمینار اور ورکشاپس پوری دنیا کے مختلف حصوں میں منعقد کئے جاتے رہتے ہیں جن میں مسلمان فقہاء، معیشت دان، بینکار اور کارکنان عملی مشکلات تلاش کر کے اُن کے حل تلاش کرتے ہیں۔''

''اس کا مطلب یہ کبھی نہیں ہے کہ اسلامی بینکاری کی صنعت نے اپنی بلوغت کے انتہائی مقصد کو حاصل کر لیا ہے۔ حقیقتاً اس کی کچھ حدود ہیں۔ یہ بہت ساری کمزوریوں میں مبتلا بھی ہوسکتی ہے، اس کے بہت سے مسائل بھی حل ہونا باقی ہیں لیکن اسلامی بینکوں کی اب تک ترقی کی رفتار اس غلط تصوّر کی نفی کرنے کے لئے کافی ہے کہ اسلامی بینکاری کوئی دیو مالائی تصوّر (Utopian Idea) نہیں اور یہ کہ اس سمت میں پیش قدمی ہلاکت کی طرف ایک قدم ہوگا۔ یہ مختصر جائزہ اتنا ضرور ظاہر کرتا ہے کہ اسلامی بینکاری کے میدان میں کافی حد تک زمینی کام کیا جا چکا ہے اور معیشت سے سود کے خاتمے کے امکانات پر بحث کے وقت یہ پس منظر نظر انداز یا بے قیمت قرار نہیں دیا جا سکتا۔''

''اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ پوری معیشت سے سود کا خاتمہ کسی تنہا ادارے سے سود کے خاتمے کے مقابلے میں کئی لحاظ سے زیادہ پیچیدہ اور مشکل ہوگا لیکن اس کے ساتھ ساتھ کچھ میدان ایسے بھی ہیں جہاں سود سے پاک نظام قائم کرنا پرائیویٹ اسلامی بینکوں میں ایسا کرنے سے بہت زیادہ آسان ہوگا۔ دنیا کے مختلف حصوں میں کام کرنے والے اسلامی بینک اپنے غیر سودی معاملات کی انجام دہی میں اپنی حکومتوں یا مرکزی بینک کی حمایت سے محروم ہوتے ہیں۔ انہیں ان قانونی اور حکومتی پابندیوں کو تسلیم کرنا پڑتا ہے جو بنیادی طور پر غیر سودی بینکاری کی معاونت کے لئے بنائے گئے ہیں اور پھر اسلامی بینکوں پر ان کے اسلامی طریقہ ہائے تمویل کے موافق ذرّہ برابر تبدیلی کئے بغیر ان قوانین کو مسلط کر دیا جاتا ہے۔ اسلامی بینک اس طرح کام کر رہے ہیں کہ ان کے ہاتھ روایتی بینکاری کے اصول وضوابط اور قوانین سے بندھے ہوئے ہیں۔ اگر حکومت بلا سودی نظام کو حکومتی سطح پر نافذ العمل کر دے تو حکومت اپنے قانونی اور اصولی ڈھانچوں کو وضع کرنے میں مکمل آزاد ہوگی اور پرائیویٹ اسلامی بینکوں کو لاحق مشکلات حکومت کے لئے کوئی مسئلہ پیدا نہیں کریں گی۔ مزید برآں اسلامی بینکوں کو روایتی بینکوں کے ساتھ مسابقت اور مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ اگر کوئی صارف اسلامی بینکوں کی پیش کردہ سہولیات سے فائدہ نہیں اٹھانا چاہتا تو وہ آسانی کے ساتھ اس کی متبادل روایتی بینکاری کی موجودہ سہولیات سے فائدہ اٹھا لیتا ہے۔ اگر اسلامی طریقہ ہائے تمویل کو پورے ملک پر نافذ کر دیا جائے اور کوئی بینک بھی غیر اسلامی طریقۂ تمویل پیش نہ کرے تو یہ مسئلہ بھی آسانی سے حل ہوسکتا ہے۔ تو صحیح پوزیشن یہ ہے کہ اسلامی طریقۂ بینکاری کو ملکی سطح پر نافذ کرنا بعض لحاظ سے زیادہ آسان اور دوسری بعض لحاظ سے زیادہ مشکل ہے۔ حقیقت پسندی کے لئے ہمیں ان دونوں پہلوؤں کو عملِ انتقال (Transformation) کے وقت کی تعین کرتے وقت غور کرنا ہوگا۔ آیئے اب ہم اسلامی بینکاری کے مجوزہ نظام کے اہم ارکان پر غور کرتے ہیں:

''نفع ونقصان میں شراکت: اسلامی تمویل کی بنیادی اور سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ یہ ایک متعین شرحِ سود کی بجائے نفع اور نقصان پر مبنی ہوتی ہے۔ قرض پر مبنی سودی معیشت کے تباہ کن نتائج کوئی ڈھکے چھپے

نہیں۔ اس قرض پر مبنی معیشت کی تباہ کاریوں کو محسوس کرتے ہوئے بہت سے معیشت دان یہاں تک کہ مغربی معیشت دان بھی شرکت پر مبنی تمویلی نظام کی حمایت کر رہے ہیں۔'' (ایضاً ص ص ۱۴۶' ۱۴۷)

اس سلسلہ میں جیمز رابرٹسن لکھتے ہیں :

''کیا یہ بات زیادہ پسندیدہ اور ممکن نہیں ہوگی کہ مثال کے طور پر قرضوں کو شراکت داری میں تبدیل کر کے تیزی کے ساتھ سود کا کردار محدود کر دیا جائے؟ یہ اسلامی تعلیمات اور سابقہ عیسائی تعلیمات کے مطابق ہے کہ سود ایک گناہ ہے' اگرچہ عملی پیچیدگیاں اس کام کو طویل المیعاد مقصد کیوں نہ بنائیں لیکن اس کے باوجود مضبوط دلائل کی بنیاد پر اس مقصد کے لئے کوشش کرنی چاہئے یعنی جس حد تک دنیا بھر کی معاشی زندگی روز افزوں قرضوں پر منحصر ہوتی جا رہی ہے' اس میں معاشی تباہی کے جو خطرات مضمر ہیں اور معاشی طاقت کا جو تمام تر فائدہ اس وقت انہی لوگوں کو پہنچ رہا ہے جو مفید منصوبوں میں خطرہ برداشت کرنے کی بجائے روپے سے روپیہ پیدا کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔'' ("Transforming Economic Life : A Millenial Challenge", p. 57, Green Books, Devon, 1998)

''خلاصہ یہ کہ شرکت پر مبنی بینکاری نہ صرف اسلامی حلقوں کی طرف سے تجویز کی گئی ہے بلکہ اسے کچھ غیر مسلم معیشت دانوں نے بھی خالص معاشی اور اقتصادی لحاظ سے تجویز کیا ہے۔ موجودہ قرض پر مبنی معیشت کے ذیلی اثرات اور اثراتِ بد یعنی ظلم' عدمِ استحکام اور تجارتی دھچکوں وغیرہ نے ہی ان کو اس طرف مجبور کیا۔ کہ ایک ایسا انصاف اور حصہ داری پر مبنی نظام لایا جائے جو دولت کی غیر منصفانہ تقسیم اور استحکام کا یقینی سبب ہو۔ شرکت پر مبنی بینکاری میں کھاتہ داروں (Depositors) کو اس سے کہیں زیادہ نفع ملنے کی توقع کی جاتی ہے جتنی کہ وہ آج سود کی صورت میں وصول کرتے ہیں اور پھر وہ سودی رقم بھی قرض پر مبنی زر کے پھیلاؤ کی وجہ سے افراطِ زر کے منفی اثرات کا شکار بن جاتی ہے۔ یہ دولت کے بہاؤ کا رخ عام آدمی کی طرف کر دیتی ہے جس کے نتیجے میں بچت بڑھتی ہے اور آہستہ آہستہ توازن اور خوشحالی لاتی ہے۔'' (''سود پر تاریخی فیصلہ'' صفحات ۱۶۰' ۱۶۱)

''<u>حکومت کے قرضے</u>: سود کے خاتمے کے سلسلے میں ایک بڑی مشکل حکومتی قرضوں کو قرار دیا جاتا ہے۔ موجودہ صورتِ حال یہ ہے کہ حکومتِ پاکستان ملکی اور غیر ملکی قرضوں میں جکڑی ہوئی ہے۔ جہاں تک ملکی قرضوں کا تعلق ہے' اُنہیں اسلامی طریقہ ہائے تمویل میں تبدیل کرنے میں تمام حکومتی اندرونی قرضے پروجیکٹ فائنانس کی بنیاد پر ڈیزائن کرنے چاہئیں۔ یہ طریقہ شریعت کے مطابق ہونے کی وجہ سے قرضوں پر حاصل شدہ رقوم کی خرد برد' خیانت اور غلط استعمال سے روکنے میں مددگار رہوگا۔ اس شعبے میں سود کے غیر معین مدت تک جاری رہنے کی ضرورت نہیں ہے تاہم اس وجہ سے اس شعبے کو اسلامی طریقے سے بدلنے کے لئے بینکاری کے پرائیویٹ معاملات کی بہ نسبت زیادہ مہلت کی ضرورت ہو سکتی ہے۔'' (ایضاً' ص ۱۷۲)

''غیر ملکی قرضے : حکومتی غیر ملکی قرضے یکم مارچ ۱۹۹۹ء کے اعداد و شمار کے مطابق ۳۱،۱۵ بلین ڈالر یا ۱۶۱۰ بلین روپے انٹربینک ریٹ کے مطابق ہیں۔ دلیل یہ دی جا رہی ہے کہ اس قسم کے قرضوں کو غیر سودی قرضوں میں بدلنا تقریباً ناممکن ہے۔''

''اس سے قبل کہ ہم اس مسئلے کے اسلامی حل پر غور کریں' ہمیں اس بات کو مدِّ نظر رکھنا ہوگا کہ غیر ملکی قرضوں کی مقدار میں جس تیز رفتاری سے اضافہ ہو رہا ہے' اُس پر نہایت سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ ابتدا میں ہم نے بین الاقوامی ذرائع سے ترقیاتی منصوبوں کے لئے قرضے لئے' بعد میں غیر ملکی قرضوں کا دائرہ غیر ترقیاتی اخراجات تک بڑھا دیا گیا۔ اس کے بعد بہت بھاری مقدار میں قرضے چکانے (Debt Servicing) کے لئے لئے گئے۔ اب یہ قرضے بین الاقوامی قرض خواہوں کو سود ادا کرنے کے واسطے لئے جا رہے ہیں۔''

''اس بات کا احساس کرنے کے لئے معاشیات کے کسی ماہر کی ضرورت نہیں ہے کہ یہ ایک ایسی خطرہ کی گھنٹی ہے جو ہماری قوم کو ہمارے قرض خواہوں کی غلامی کی طرف لے جا رہی ہے۔ ہم ہر سال بھاری قرضے لے کر اپنی موجودہ اور آئندہ آنے والی نسلوں کو گروی (رہن) رکھ رہے ہیں۔ یہ خیال کہ غیر ملکی قرضے ترقی پذیر ممالک کے ترقی کے منصوبوں میں مددگار ہوتے اور خوشحالی لانے کا سبب بنتے ہیں' تیسری دنیا کے بہت سے ممالک کی حالت کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے جھوٹا اور غلط معلوم ہوتا ہے۔ اس خیال کا بڑھتا ہوا احساس آزاد معیشت دان کر رہے ہیں۔'' (ایضاً' ص ص ۱۷۲ تا ۱۷۴)

''ایک ایسے وقت میں جب ہم اپنی معیشت کو ترقی دینے' اپنی عوام کی حالت سدھارنے' غربت دور کرنے' تعلیم کی شرح بڑھانے اور دیہاتوں میں کم از کم بنیادی صحت فراہم کرنے کے شدید محتاج ہیں اور جب ہمارے ملک میں ہزاروں مزدور' عورتیں اور بچے طبّی امداد کے انتظار میں موت کے کنارے پہنچے ہوئے ہیں' ہم اس پر مجبور ہیں کہ ہم اپنے ٹوٹل بجٹ کا ۴۶ فیصد سودی قرضوض کی ادائیگی پر لگا دیں' اس کے باوجود ہم اور قرضے لئے جا رہے ہیں تاکہ سابقہ قرضوں کو ادا کر دیا جائے۔ جب اِن نئے قرضوں کی میعاد پوری ہوگی تو ہم مزید قرضے لینے پر مجبور ہوں گے تاکہ موجودہ قرضوں کو اتارا جا سکے۔ ہم کب تک اس مصیبت کے گرد چکر کاٹتے رہیں گے؟ ہم قرض در قرض کے چکر میں کب تک گھومتے رہیں گے؟ ہمیں اس قرض پر مبنی معیشت سے چھٹکارا حاصل کرنا ہوگا جس نے ہم سے آزادی غصب کر لی ہے اور ہماری اگلی نسلوں کو قرض خواہوں کے ہاتھوں میں گروی رکھوا دیا ہے۔ یہ ہماری قوم کی زندگی اور موت کا سوال ہے اور ہمیں اسے ہر قیمت پر حل کرنا ہوگا۔''

''ہم اس حقیقت سے بے خبر نہیں ہیں کہ ایک مرتبہ ہم جب موجودہ قرضوں کی تہہ میں پھنس گئے ہیں تو اس سے ایک ہی رات میں نکلنا ناممکن ہے۔ اسے نافذ کرنے کے لئے ایک بہترین سوچے سمجھے پروگرام اور ایک مفید قوتِ ارادی کی ضرورت ہوگی۔ ہم سابقہ قرضوں میں برقرار رہیں گے لیکن اس عبوری دور میں بھی ہمیں اپنے قرض خواہوں کے ساتھ ازسرِ نو طریقہِ تمویل پر غور کرنا ہوگا تاکہ سودی قرضوں کو اسلامی طریقہِ تمویل میں تبدیل کیا جا سکے۔''

''اسلامی بینکوں کی پیدا کردہ فضا کے نتیجے میں اسلامی طریقہ تمویل سے مغرب اب ناواقف نہیں رہا یہاں تک کہ بین الاقوامی تمویلی ادارے بھی انہیں سمجھنے کی کوشش کر چکے ہیں۔ آئی ایف سی جو کہ عالمی بینک کی ذاتی تمویلی شاخ ہے' اس نے پہلے ہی اسلامی طریقہ ہائے تمویل استعمال کرنے کی خواہش کا اظہار کیا ہے۔ اثاثوں سے وابستہ قرضے آسانی کے ساتھ اجارہ کے طریقہ تمویل میں تبدیل کئے جاسکتے ہیں۔ پروجیکٹ سے وابستہ قرضے آسانی سے استصناع کی بنیاد پر تبدیل کئے جاسکتے ہیں۔ قرضہ دینے والوں کی توجہ صرف اپنی تمویل کے اوپر نفع کی طرف ہوتی ہے۔ وہ کسی مخصوص طریقہ تمویل پر اصرار نہیں کرتے' اس لئے موجودہ قرضوں کو اسلامی خطوط پر منتقل کرنے میں کوئی مشکل نہیں ہونی چاہئے۔ نئی تمویلات کے لئے اور بھی زیادہ متنوع قسم کے طریقہ ہائے تمویل موجود ہیں جنہیں اسلامی خطوط پر تبدیل کیا جاسکتا ہے تاہم یہ اسی وقت ممکن ہوسکتا ہے جب حکومت خود اسلامی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کا عزم رکھتی ہو۔ معذرت خواہانہ انداز بھی بھی دوسروں کو اتنے پرانے عرصے سے زیر استعمال طریقوں کو تبدیل کرنے پر راضی نہیں کرسکتا۔'' (ایضاً' ص ص ۱۸۳' ۱۸۴)

خلاصہ کلام یہ ہے کہ'' سود پر مبنی موجودہ تمویلی نظام' قرآن وسنت کے بیان کردہ اسلامی احکامات کے خلاف ہے اور اسے شریعت کے مطابق بنانے کے لئے زبردست تبدیلیاں لانی ہوں گی۔ مذہبی علماء' اقتصادی ماہرین اور بینکاروں نے مختلف قسم کے اسلامی طریقہ ہائے تمویل مرتب کئے ہیں جو کہ سود کے بہتر متبادل بن سکتے ہیں۔ یہ طریقہ ہائے تمویل دنیا کے مختلف حصوں میں تقریباً دوسو اسلامی تمویلی ادارے استعمال کررہے ہیں۔ ان طریقہ ہائے تمویل کی موجودگی میں سود کے معاملات کو نظریہ ضرورت کی بنیاد پر اجازت نہیں دی جاسکتی۔ بہت سارے بینکرز بیرون ممالک سے بہ شمول ڈاکٹر احمد محمد علی (صدر اسلامی ترقیاتی بینک' جدہ)' شیخ عدنان البحر (چیف ایگزیکٹو انٹرنیشنل انویسٹر' کویت)' اقبال احمد خان (ہانگ کانگ شنگھائی بینک کارپوریشن کے اسلامی ادارے کے سربراہ) جبکہ اندرون ملک سے عبدالجبار خان (سابق صدر نیشنل بینک آف پاکستان)' شاہد حسن صدیقی' مقبول احمد خان عدالت کی معاونت کے لئے تشریف لائے۔ یہ حضرات دنیا کے مختلف حصوں میں بینکاری کا طویل تجربہ رکھتے ہیں اور ان کے علاوہ دوسرے ماہرین حضرات بھی عدالت کی معاونت کے لئے عدالت میں تشریف لائے۔ ان میں سے سب لوگ اس بات پر متفق تھے کہ اسلامی طریقہ ہائے تمویل نہ صرف ممکن ہیں بلکہ ایک معتدل اور مضبوط معاشی نظام کے قیام کے سلسلے میں انتہائی مفید بھی ہیں۔ اس سلسلے میں اُنہوں نے حقائق اور اعداد وشمار کے ذریعے بہت سے دلائل اور ثبوت بھی مہیا کئے۔ بعض مشہور اقتصادی ماہرین مثلاً ڈاکٹر محمد عمر چھاپرا (اقتصادی مشیر برائے سعودی مالیاتی ادارے)' ڈاکٹر ارشد زماں (سابق چیف اکانومسٹ حکومتِ پاکستان)' پروفیسر خورشید احمد' ڈاکٹر نواب حیدر نقوی' ڈاکٹر وقار مسعود خان نے اپنے تفصیلی بیانات کے ذریعے اس نقطہ نظر کی حمایت کی۔''

''لہٰذا اب یہ اس بات کو ثابت کرنے کے لئے ایک واضح دلیل اور ثبوت ہے کہ موجودہ عصری تمویلی نظام کو اسلامی نظام میں ڈھالنے کے سلسلے میں کافی ٹھوس کام کیا جاچکا ہے' لہٰذا موجودہ سودی نظام کو نظریہ ضرورت کی بنیاد پر ایک غیر محدود مدت کے لئے مزید جاری نہیں رکھا جاسکتا تاہم اس نظام کی تبدیلی اور انتقال کے لئے اس نظریہ ضرورت کی بنیاد پر کچھ وقت دیا جاسکتا ہے۔'' (ایضاً' صفحات ۱۸۷' ۱۸۸)

''سُود اور امنِ عالم: بنیادی طور پر قرضوں کی ضرورت محروم لوگوں کی ضروریات سے پیدا ہوتی ہے۔ صرف خوشحال لوگ ہی محروم لوگوں کو قرض فراہم کر سکتے ہیں۔ اس لئے قرضوں پر کسی بھی شکل میں سُود لینا بھائی چارے اور امدادِ باہمی کے عالمگیر اصول کے منافی ہے اور بھائیوں کی ضروریات کا یہ کُھلا استحصال ہے۔ سُود انسانیت' امدادِ باہمی اور ہمدردی کی بنیاد ہی کو جڑ سے اُکھاڑ پھینکتا ہے اور آدمی میں خود غرضی کو جنم دیتا ہے۔ آج ہم دیکھتے ہیں کہ ایک قرضخواہ قوم نے مقروض قوم کو سودی قرضوں کے ذریعے کس طرح غلامی کی جکڑ بندیوں میں جکڑ رکھا ہے۔ اس قسم کا استحصال خواہ وہ ملکی سطح پر ہو یا بین الاقوامی سطح پر' لازمی طور پر استحصالیوں کے غلبے کی شکل میں نمودار ہوتا ہے اور امنِ عامّہ کے لئے ایک مستقل اور طاقتور خطرہ بن جاتا ہے۔'' (ایضاً ص ۱۷۴)

''کیا سود سے پاک اقتصادی نظام قابلِ عمل ہے؟ درجِ ذیل وجوہ کے باعث اس سوال کا جواب مثبت میں ہے:

(۱) خالقِ کائنات کے احکامات کی صداقت پر مکمل اور غیر متزلزل ایمان کہ وہ احکامات بنی نوعِ انسان کے عین مفادات میں ہیں' مسئلے کو بہ آسانی سلجھا دے گا۔ صداقتِ ابدی کے ساتھ اپنی وفاداریوں اور اطاعت گزاریوں کو منسلک کرنا اور غیر اسلامی معاندانہ قوّتوں کے خلاف سینہ سپر ہو جانا مسئلے کے حل کے لئے شرطِ اوّل ہے۔

(۲) قبل از اسلام تمام دنیا میں کاروباری معاملات سود کی بنیاد پر ہوتے تھے اور اُس زمانے کے حالات ہمارے دَورِ جدید کے حالات سے کچھ مختلف نہ تھے۔ اسلام نے اُس نظام کی بیخ کُنی کی اور اسے اپنے نظام سے بدلا جو صدیوں تک کامیابی سے نافذ العمل رہا ہے۔ یہ ایسی ناقابلِ تردید تاریخی حقیقت ہے جس سے کوئی ہوشمند انکار نہیں کر سکتا۔

کیا ہم نے کبھی یہ سوچا کہ ''کیا سود سے پاک اقتصادی نظام قابلِ عمل ہے؟'' کا سوال کرنے میں کیا ہم اپنے خالق و مالک کے ناقابلِ تنسیخ فیصلہ کے خلاف ''عدمِ اعتماد'' کا ووٹ تو نہیں پاس کر رہے' وہ خالق و مالک جو اپنی مخلوق پر والدین کی اپنی اولاد پر شفقت و محبت سے بھی زیادہ کریم و شفیق ہے۔ براہِ راست طور پر اس سوال کا منطقی مطلب تو یہ ہے کہ الٰہی قوانین وضوابط (معاذ اللہ) اس قدر غیر فطری اور سیدھی راہ سے ہٹے ہوئے ہیں کہ اُن میں غلط عنصر کارآمد اور اچھا عنصر عملی طور پر بیکار ہے۔ اور میں اپنے قارئین سے یہ سوال کرنے پر مجبور ہوں کہ ''کیا آپ کا ایمان' علم' تجربہ اور اپنے اردگرد قدرت کی پھیلی ہوئی اَن گنت نشانیوں کا مشاہدہ اس بات کی اجازت دیتے ہیں کہ آپ دینِ فطرت کے عطا کردہ فطری قوانین جو یقیناً ہماری فلاح و بہبود کے لئے ہیں' کے خلاف ''عدمِ اعتماد'' کا ووٹ پاس کریں اور غلط تصوّر رکھیں؟ یقیناً اِس سوال کا جواب ایک بھاری بھرکم اور جسیم ''نہیں'' میں ہوگا۔ دراصل انسانی فطرت میں ہر اُس چیز کے قبول کرنے اور اُس کا تتبع کرنے کا رُجحان ہے جو ہر دلعزیز ہو جائے اور سماج میں رواج پا جائے۔ فطرتِ انسانی اُسے کسی اور نظام سے بدلنے میں مشکل محسوس کرتی ہے خواہ وہ نظام کتنا ہی درست اور صحیح کیوں نہ ہو۔ اس تمام کلام کا خلاصہ یہ ہے کہ سود سے پاک معیشت اور اس کا نفاذ آج کے ناموافق حالات میں بھی ممکن اور قابلِ عمل ہے جبکہ غیر اسلامی قوّتیں ہماری اقتصادیات کو اپنی پوری گرفت میں لینے پر تلی ہوئی ہیں اور ہمیں اُس صراطِ مستقیم

سے ہٹانا چاہتی ہیں جو ہمیں ہماری کتابِ مقدس نے دکھایا ہے' بعض اوقات یہ غلط فہمی پیدا کرتے ہوئے کہ اسلام محض مذہب ہے اور (العیاذ باللہ) چودہ صدیاں پرانی کتاب آج کے بدلتے ہوئے حالات کے شانہ بہ شانہ نہیں چل سکتی' علیٰ ہٰذا القیاس کچھ دیگر عجیب وغریب اور کج نہاد طریقوں سے اسلام کے خلاف بدظنیاں پیدا کرنے کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔ دراصل اسلام مذہب نہیں بلکہ قرآنی اصطلاح میں ''دین'' ہے بایں معنی کہ یہ ایک مکمل ضابطہ حیات ہے' ایک سماجی اور اقتصادی نظام ہے' ایک ثقافت اور ایک تہذیب ہے کہ مذہب جس کا ایک جزو ہے۔

اقتصادی تعاون اور ترقی کی مرکزی تنظیم (OECD) ☆ نے قابلِ تعریف انداز میں سود سے پاک بینکاری کے متعلق اپنے تاثرات اس طرح دیئے ہیں :۔

''سود سے پاک بینکاری سرمایہ کاری کی ایک اچھوتی شکل ہے۔ مذہب سے برگشتہ اور متشککین (Sceptics) تک نے اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ اسلامی بینکنگ میں نہ صرف سود کو کوئی اور نام نہ دینے کی کوشش ہے بلکہ شرعی نظام کے اندر رہتے ہوئے اسلامی بینکنگ میں منافع کا جواز نکلتا ہے جو قرآن کے بنیادی ڈھانچے کے عین مطابق ہے۔''

''دنیا کی تقریباً 20% آبادی مسلمانوں پر مشتمل ہے جن میں سے اکثر کٹر مذہبی اور دین دار ہیں۔ وہ اس بات کو یقینی بناتے ہیں کہ اُن کے مالی معاملات اسلامی اصولوں کے مطابق ہوں اور اس لحاظ سے وہ قدرتی طور پر جائز منافع لینے کے حق میں ہیں۔ اس صورت میں گشتی اور مفاداتی خزینوں دونوں میں اسلامی بینکاری کے مواقع موجود ہیں۔''

''تمام اکنافِ عالم میں کئی نئے اسلامی مالیاتی اداروں کے قیام نے اس بات کو ثابت کر دیا ہے کہ شرعی اصولوں کے مطابق بینکاری نہ صرف قابلِ عمل ہے بلکہ نفع بخش بھی ہے۔''
("Arab and Islamic Banks"
... Prof. Trante Wohlus Scharf, OECD, p. 90) Paris, 1983.

اُسی کتاب میں پروفیسر موصوف نے بڑے کھلے دل سے یہ نتیجہ نکالا ہے:

''اسلامی بینکاری ایک طرف تو مال گزاری اور عوام کے درمیان تعلقات کو فروغ دینے کی کوشش کر رہی ہے تو دوسری طرف وہ صنعت اور تجارت کے مابین تعلقات کو بڑھانے کی کوشش کر رہی ہے۔ یہ نئی تعلق داری اسلامی اقتصادی نظام کے قیام کی بنیاد ہے۔ اگرچہ بین الاقوامی مالیات کے مقابلہ جاتی ماحول میں اسلامی اصولوں کی ابھی آزمائش ہونا باقی ہے تاہم یہ حقیقت اپنی جگہ ہے کہ کاروبار کے مندہ پن (کساد بازاری)' جمود اور پیداوار کی کم افزائش کی صورتوں میں اسلامی بینک اقتصادی ترقی میں مفید کردار ادا کر رہے ہیں کیونکہ اُن کے طریقِ عمل کا مرکزی نقطہ ہی پیداواری سرمایہ کاری میں مرکوز ہے۔

☆ Development Centre of the Organisation of Economic Cooperation & Development

شمال اور جنوب دونوں میں تمام ممالک کو داؤ پر لگانے کے سرمایہ (Venture/Risk Capital) کی زیادہ ضرورت ہے۔ بالخصوص صنعتکار ممالک کی جانب سے قرضہ کا سرمایہ موجود تو ہے لیکن سود کی انتہائی اونچی شرح کے ساتھ۔ تاہم متوسط طبقہ کے تاجر اپنے سرمائے کو بڑھانے کے لئے اُسے خطراتی مہمات میں لگانا مشکل سمجھتے ہیں۔ اس چیز نے شمالی ممالک میں پیداواری افزائش اور اقتصادی ترقی میں رکاوٹ پیدا کر دی ہے۔ اس طرح تمام دنیا میں اسلامی بینکوں اور کاروباری مہمات کے مابین عملی اور فوری تعاون کا امکان موجود ہے۔ وسیلے کے اس طریقِ کار کو ابھی ترقی کے مدارج طے کرنا باقی ہیں۔'' (ایضاً)

ایک بین الاقوامی مالیاتی کارپوریشن (IFC) کی جانب سے سود سے پاک مالیاتی نظام پر دی گئی رپورٹ کا مطالعہ کرنے سے ہم شرم کے مارے ڈوب جاتے ہیں کہ ہم نے اپنے مہربان و شفیق خالق پر اعتماد کو ترک کر دیا ہے جبکہ ہمارے مخالف مذہب کے لوگ اپنی روایتی بینکاری کو چھوڑ کر اسلامی اصولوں کے مطابق بینکاری کو اپنانے پر تیار ہیں۔ ہالہ سپننگ ملز میں سرمایہ کاری کی تجویز کی ایک رپورٹ میں آئی۔ ایف۔ سی کے صدر اور عالمی بینک کی ہم یہ عبارت پڑھتے ہیں :

'' آئی۔ ایف۔ سی نے مالیات کے اسلامی طریقِ کار کی طرف تبدیلی پر غور کیا ہے۔ یہ چیز غیر ملکی قرضوں پر حکومتِ پاکستان کے ارادوں کے خلاف ہوگی۔ غیر ملکی قرض دینے والے کے لئے اسلامی اصولوں کو اپنانے کی تعبیر حکومتی پالیسی کو نقصان پہنچا سکتی ہے کہ غیر ملکی قرض دینے والوں کو اس ضرورت سے مستثنیٰ قرار دیا جائے۔'' (Report No. IFC/887, dated Dec. 22, 1957, to the Board of Directors, IFC)

'' اسلامی بینکنگ اور بین الاقوامی تعلقات: کچھ مسلمان جنہیں بین الاقوامی اقتصادیات کی ماہیت کا علم نہیں ہے' کہتے ہیں کہ اسلامی بینکنگ ناقابلِ عمل ہے کیونکہ یہ اسلامی ملک کو باقی دنیا سے علیحدہ اور تنہا کر دے گی جس سے اُس کی بین الاقوامی تجارت کو خاصا نقصان پہنچے گا۔ لیکن اگر مختلف اقوام عالم کا جن کے سیاسی اور اقتصادی اصول ایک دوسرے سے یکسر مختلف ہیں' پہلو بہ پہلو رہنا ممکن ہے اور اگر امریکہ' یوگوسلاویہ یا روس اور عرب ممالک کا آپس میں تجارتی معاہدے کرنا ممکن ہے تو مجھے کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی کہ ایک اسلامی ملک باقی دنیا سے کیوں کٹ کے رہ جائے۔ مثال کے طور پر اگر پاکستان اسلامی بینکاری نظام کے اصولوں کو قبول کر لے تو یہ اُس کی اقتصادیات کی داخلی تنظیمِ نَو کا معاملہ ہوگا بالکل اسی طرح جیسے ایک وفاق میں جزوی یا ترکیبی اکائیوں کو اپنے مسائل حسبِ منشا حل کرنے کے لئے علاقائی خودمختاری دی جاتی ہے بغیر اس کے کہ یہ خودمختاری وفاق کی اُساسی (بنیادی) فطرت پر کسی طرح اثر انداز ہو۔''

'' دوم یہ کہ بین الاقوامی تجارت میں نقصان کا سبب بننا تو دُور کی بات ہے' اسلامی بینکنگ اپنا حجم اور وسعت بڑھائے گی' کیونکہ جدید طرز کے بینک اپنے مؤکلین کی ہنڈیاں اور تمسکات (Bills of Exchange) قبول کر کے اور دوسرے غیر ملکی زرِ مبادلہ کے کاروبار میں اپنی خدمات کا مشاہرہ بہ طور معاوضہ وصول کر کے غیر ملکی تجارت میں سرمایہ کاری کرتے ہیں لیکن اسلامی نظام کے تحت بینک تاجروں کے ساتھ حصہ داری کی وجہ سے

کسی معاوضہ کے بغیر یہ تمام خدمات انجام دیتے ہیں۔ علاوہ ازیں تجارت میں حصّہ دار ہونے کے لحاظ سے بینک تاجروں کی غیر اقتصادی منصوبوں (یا سٹّہ بازی) سے دُور رہنے میں مدد کرتے ہیں تاکہ نہ صرف اپنے ملک میں نہیں' بلکہ بہ حیثیتِ مجموعی پوری دُنیا میں معاشی خوشحالی لانے کے لئے کسی جنس کی طلب اور رسد میں باہم موافقت اور مطابقت پیدا کی جا سکے۔'' ("Islamic Economics --- Theory & Practice" --- M. A. Mannan, pp. 234, 235)

''پرائز بانڈز پر ملنے والے انعام کی شرعی حیثیت: ''پرائز بانڈز کی جمع شدہ رقم لاٹری کے ذریعے پرائز بانڈز کے تمام خریداروں کی بجائے ایک خریدار کوادا کی جاتی ہے۔ بطورِ انعام دی جانے والی یہ رقم یقینی طور پر سود کے ضمن میں آتی ہے اوراس لئے حرام ہے۔ تاہم اصحابِ علم وفضل سے مشاورت کے بعد موجودہ نظام میں سود سے پاک مناسب تبدیلیاں لائی جا سکتی ہیں۔'' ("Our Socio-Economic Order".. Mufti Muhammad Taqi Usmani, pp. 91, 92)

''اشاریہ سازی (Indexation) اورسُود: افراطِ زراوراُس کے نتیجے میں قوّتِ خرید پر مرتب ہونے والے اثرات کا مسئلہ دَورِ حاضر کا ایک اہم مسئلہ ہے جس سے فقہائے اسلام دوچار ہیں۔ افراطِ زرلازمی طور پر قرضخواہ کے مفادات کو دھچکا لگاتا ہے کیونکہ وہ قوّتِ خرید کے حوالے سے رقم کی وصولی کے وقت اُس رقم سے کم وصول کرتا ہے جو اُس نے قرض میں دی تھی۔ فرض کریں کہ ایک شخص ایک سال کے لئے کسی سے ایک ہزارروپے قرض لیتا ہے۔ سال بعد روپے کی قیمت دس فیصد کم ہو جاتی ہے۔ اب اگر مقروض بروئے معاہدہ قرضخواہ کو ایک ہزارروپے ادا کرتا ہے تو دراصل وہ اُسے صرف نوسو روپے ادا کر رہا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوُا کہ رقم کی قوّتِ خرید کے حوالے سے وہ اُسے قرض لی گئی رقم سے کم ادا کر رہا ہے۔''

''اِس مسئلہ کے حل کے لئے کچھ فقہائے کرام کی تجویز ہے کہ مقروض (افراطِ زر کی وجہ سے) کم دی جانے والی رقم کی تلافی کے لئے کچھ مناسب رقم اپنے قرضخواہ کو زائد دے تاکہ اُسے نقصان نہ ہو۔ اس مقصد کے لئے فقہاء نے تجویز کیا ہے کہ افراطِ زر کی شرح سے قرضوں کی اشاریہ سازی (Indexation) کی جائے۔

''علمائے اسلام قرضوں کی اشاریہ سازی کے جواز کی بابت باہم مختلف الآراء ہیں۔ علماء کی ایک جماعت اشاریہ سازی کی حمایت میں ہے اور وہ اس میں کوئی خلافِ شریعت بات نہیں پاتے۔ اس کے برعکس کچھ علماء کا کہنا ہے کہ اشاریہ سازی کا نظریہ اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے۔ اسلامک آئیڈیالوجی آف پاکستان کی مجلس نے بھی اس کی مخالفت کی ہے اور یہی نظریہ فیڈرل شریعت کورٹ آف پاکستان کا ہے۔''

اشاریہ سازی (Indexation) کے حق اوراس کی مخالفت میں دلائل: اِسی انسائیکلوپیڈیا کی جلد دوم کے صفحات ۶۴۸' ۶۴۹ کی طرف رجوع کیا جائے۔

(۹۱) توسّل (INTERMEDIATION)

''مفردات الفاظ القرآن'' کے صفحہ ۵۱۷ پر امام راغب اصفہانی نے ''توسّل'' کی تعریف یوں بیان کی:

اَلْوَسِیْلَةُ: اَلتَّوَصُّلُ اِلَی الشَّیْءِ بِرَغْبَةٍ وَهِیَ أَخَصُّ مِنَ الْوَصِیْلَةِ لِتَضَمُّنِهَا لِمَعْنَی الرَّغْبَةِ

''وسیلہ کا معنیٰ اپنی رغبت و چاہت کے ساتھ کسی چیز تک رسائی پانا ہے اور چونکہ وسیلہ کی بنیا د رغبت و چاہت ہے' لہٰذا اس کا تعلق رسائی کے ساتھ ہے۔''

علامہ زمخشری نے ''الکشاف'' میں اور ابن منظور الافریقی نے ''لسان العرب'' میں ''توسّل'' کی بالترتیب یہ تعریف بیان کی ہے :

(۱) اَلْوَسِیْلَةُ : کُلُّ مَا یُتَوَسَّلُ بِهٖ أَیْ یُتَقَرَّبُ بِهٖ اِلَی اللّٰهِ تَعَالیٰ (الکشّاف)

''وسیلہ نام ہے ہر اُس چیز کا جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کیا جائے۔''

(۲) اَلْوَسِیْلَةُ : هِیَ فِی الْاَصْلِ مَا یُتَوَسَّلُ بِهٖ اِلَی الشَّیْءِ وَیُتَقَرَّبُ بِهٖ (لسان العرب)

''وسیلہ دراصل کسی چیز کا قرب حاصل کرنے کے لئے اُس تک رسائی حاصل کرنا ہے۔''

توسّل کے بغیر اللہ تعالیٰ سے براہِ راست التماس کیوں نہ کیا جائے؟ توسّل کے پسِ پردہ مقصد رب تعالیٰ کی قوتِ مقتدرہ کو خارج کرنا یا اُسے غیر مؤثر کرنا نہیں ہے بلکہ دعا والتجا کے ذریعے انسانی ضروریات کی قبولیت کو آسان بنانا ہے۔اس طرح توسّل کا عمل درجہ بدرجہ اعمال کی تدریجی شرحوں کا پیمانہ ہے جس کی نچلی سطح پر ایک عاجز و بے بس مخلوق ہے جو مثبت و موافق الٰہی قبولیت کی امیدوار ہے۔ درمیان میں ایک ایسی شخصیت ہے جس نے توسّل' دعا والتجا اور خدمتِ خلق کے ذریعے اللہ تعالیٰ کے ساتھ قریبی تعلق پیدا کرلیا ہے اور سب سے بالائی سطح پر خود رب تعالیٰ کی ذات ہے جو دعا کی قبولیت کا بلاشرکتِ غیرے مالک ومختار ہے۔''

''توسّل کے نظریہ کا یہ مطلب نہیں کہ توسّل کرنے والا خود دعا کو قبول کرنے کا مجاز ہے یا یہ کہ وہ کسی شخص کی دعا والتجا کو قبول کرنے یا اُس کے گناہ معاف کرانے کے لئے رب تعالیٰ پر دباؤ ڈالتا ہے۔یہ ایک نہایت قبیح نظریہ ہے جو کچھ لوگوں کے ذہنوں میں سمایا ہوا ہے۔ دراصل دعا کرنے والے کو یہ یقین ہوتا ہے کہ جب وہ اپنی بے بسی کے اظہار اور خدا تعالیٰ کی حمد وثنا کرنے کے بعد اُس کے نیک اور منتخب بندوں کے وسیلہ سے رب تعالیٰ سے درخواست کرتا ہے تو رب تعالیٰ توسّل کی گئی شخصیت کے اعزاز میں ملتجی (التجا کرنے والے) کی درخواست کو قبول فرمالیتا ہے۔ ملتجی کے ذہن میں یہ خیال ہرگز نہیں ہوتا کہ توسّل کی گئی شخصیت کی رب تعالیٰ کی ربوبیت میں (معاذ اللہ) کوئی شراکت یا حصہ داری ہے۔اس لئے یہ انتہائی اہم بات ہے کہ توسّل کو اُس کی اصل حقیقت میں لیا جائے تاکہ ہر قسم کی غلط فہمی کا تدارک ہوجائے بالخصوص اُن کرمافرماؤں کا جو توسّل کی مخصوص انداز میں غیر اسلامی مفہوم میں تاویل کرتے ہیں۔''

۲۳۶۲ (توسّل -- Intermediation)

''یہ بات خوب خوب ذہن نشین رہے کہ توسّل اللہ تعالیٰ سے دعا و درخواست کرنے کا صرف ایک ذریعہ ہے جس کی قبولیت کا صرف وہی مالک ہے۔ ثالث (توسّل کی گئی شخصیت) محض ایک واسطہ ہے جو توسّل کی تکمیل کے عمل کو مائل بہ عمل کرنے میں صرف ذریعہ کا کام کرتا ہے۔''

''یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ توسّل کرنے والے (ثالث) کا انتخاب دو نمایاں عوامل پر ہے: اوّل تو یہ کہ ملتجی (دعا کرنے والا) اُس کا محبّ ہو اور وہ (ثالث) خود بھی اللہ کا محبوب ہو۔ اس لئے کسی سے اس لئے محبت کرنا کہ اللہ اُس سے محبت کرتا ہے' بذاتِ خود کارِ خیر ہے' لہٰذا اُس کا واسطہ اور ذریعہ ہونا غیر متنازعہ ہو جاتا ہے۔ یہ حقیقت کا اصل رُوپ ہے اور اگر کوئی شخص اس کے علاوہ کوئی اور راگ الاپتا ہے' وہ نہ صرف غلط فہمی کا شکار ہے بلکہ وہ ایک ذلّت آمیز عمل کا مرتکب ہو رہا ہے۔۔۔۔ اگر ملتجی کا یہ عقیدہ ہے کہ توسّل کی گئی شخصیت اللہ تعالیٰ کی طرح نفع و نقصان کی مالک ہے تو وہ گناہِ کبیرہ کا مرتکب ہو رہا ہے اور اس غلط عقیدے کی بناء پر اُسے مسلمانوں کی فہرست سے خارج کر دیا جائے گا۔''

''اِس غلط فہمی کو اب دُور ہو جانا چاہئے کہ توسّل جبر و اِکراہ اور زبردستی کی ایک شکل ہے کیونکہ توسّل کرنے والا اللہ تعالیٰ کی مرضی کے خلاف اُسے دعا کے قبول کرنے پر مجبور نہیں کرسکتا۔ کوئی اُس ذاتِ کبریاء کا مشیر نہیں ہے' ہم تو اس کے حضور سرِ نیاز رکھ کر عاجزانہ درخواست ہی کر سکتے ہیں اور یہ اُس کی لامحدود رحمتِ عامّہ کا اظہار ہی ہے کہ اُس نے اپنی کچھ مخلوقات کا درجہ اُن کی حُبّ اللہ اور اطاعتِ الٰہی کی بنیاد پر دوسروں سے بلند کر دیا ہے اور لاکھوں عوام النّاس کے لئے اُنہیں وسیلۂ نجات بنا دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مقاماتِ مقدّسہ اور اشیائے مقدّسہ کو بھی اُسی مفہوم میں لیا جاتا ہے۔''
("Islamic Concept of Intermediation" ... Prof. Dr. Muhammad Tahir-ul-Qadri, pp. 13-15)

''مخالفینِ توسّل کے دلائل اور اُن کا جواب: (۱) توسّل کے انکار اور بھولے بھالے لوگوں کو یہ باور کرانے کے لئے کہ توسّل کا عقیدہ اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے' مخالفینِ توسّل اپنے موقف کی تائید میں سورۃ البقرۃ کی یہ آیت پیش کرتے ہیں جس میں رب تعالیٰ نے فرمایا:

وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِىْ عَنِّىْ فَاِنِّىْ قَرِيْبٌ ؕ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِىْ وَلْيُؤْمِنُوْا بِىْ لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ O (البقرۃ: ۱۸۶)

''اور جب آپ سے میرے بندے میرے بارے میں دریافت کریں تو میں تو قریب ہی ہوں' دعا کرنے والے کی دعا قبول کرتا ہوں جب وہ مجھ سے دعا کرتا ہے' پس لوگوں کو چاہئے کہ میرے احکام قبول کریں اور مجھ پر ایمان لائیں' عجب نہیں کہ ہدایت پا جائیں۔'' (۱۸۶ : ۲)

آیتِ بالا سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ مدد کے لئے کسی غیر اللہ کو پکارنا ناجائز ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ خود پکار کو سنتا ہے

اور اپنی نوازش سے اُسے نوازتا ہے' بذاتِ خود غلط فہمی ہے اور غلط نظریہ ہے۔ کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ ہی وہ واحد ہستی ہے جو ہماری دعاؤں کو سنتا اور اُنہیں قبول فرماتا ہے اور ہماری ضروریات کو پورا کرنے والا بھی صرف اور صرف وہی ہے۔ لیکن اِن دعاؤں کو اُس کے رسولوں اور اولیاء جیسے منتخب بندوں کی وساطت سے اُس تک پہنچانا زیادہ مناسب ہے تاکہ اُن کی قبولیت جلد ہو جیسا کہ آنے والے صفحات میں اس حقیقت کو ثابت کیا جائے گا۔

(۲) توسّل کے خلاف مخالفین کا اعتراض یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے مقرّبین جن پر ہم متوسّلین ہونے کا اعتماد کرتے ہیں' خود ایسے ذریعے کی تلاش میں رہتے ہیں جو اُنہیں قربِ الٰہی عطا کرے۔ چونکہ وہ خود مدد کے محتاج و منتظر ہیں تو دوسروں کی مدد کے لئے کیسے اُن سے توقع کی جا سکتی ہے؟ اپنے نقطہ نظر کی تقویت کے لئے وہ سورہ بنی اسرائیل کی یہ آیت پیش کرتے ہیں:۔

أُولَئِكَ الَّذِينَ يَدْعُونَ يَبْتَغُونَ إِلَى رَبِّهِمُ الْوَسِيلَةَ أَيُّهُمْ أَقْرَبُ (بني اسرائيل : ۵۷)

''یہ لوگ جنہیں یہ (مشرکین) پکار رہے ہیں' (خود ہی) اپنے پروردگار کا قرب ڈھونڈ رہے ہیں کہ (دیکھیں) ان میں کون زیادہ مقرب بنتا ہے۔'' (۱۷ : ۵۷)

''آیتِ بالا توسّل کے حق میں زبردست دلیل ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ پیغمبر اور صالحین خود قربِ الٰہی کے حصول کے لئے وسیلہ کی تلاش میں ہیں اور اس وجہ سے وہ قربِ الٰہی کا ذریعہ نہیں ہو سکتے' غلط ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر وہ خود نیک ہیں اور اپنی نیکی اور پارسائی کی وجہ سے وہ اللہ کے قریب ہیں تو پھر وہ دوسرے کون سے وسیلوں کی تلاش میں ہیں کیونکہ (نیکی کا) وسیلہ خود اُن کے پاس ہے۔ اس کا جواب خود قرآن نے دے دیا ہے۔ أَيُّهُمْ أَقْرَبُ' وہ لوگ ہیں جو اللہ کے قریب ہیں اور صالحین اُن کے وسیلہ ہونے پر اعتماد کرتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ توسّل ایک تدریجی عمل ہے۔ کچھ لوگ ایسے ہیں جو اللہ کے قریب ترین ہیں اور کچھ ایسے ہیں جو کم نزدیک ہیں اور کچھ ایسے بھی ہیں جو اُس سے بہت دُور ہیں۔ اس طرح قربت کے مختلف مدارج ہیں اور قربِ الٰہی کا عمل لامتناہی اور ختم نہ ہونے والا ہے۔ وہ لوگ جو اللہ کے قریب ترین ہیں' اُس سے مزید قریب ہونے کی کوشش میں ہیں۔ وہ لوگ جو اِن ہستیوں کے قریب ہیں' اُن کے قریب ہونے کی کوشش میں ہیں جو اللہ سے زیادہ قریب ہیں۔ اس طرح اگر اللہ تعالیٰ توسّل کو اپنے بندوں کے لئے جائز قرار دیتا ہے تو اسے ناجائز کیوں کر کہا جا سکتا ہے؟'' (ایضاً ص ص ۹۲' ۹۳)

''سیّدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ تبصرہ کرتے ہیں کہ قرآن کی یہ آیت بالخصوص ایک عرب طبقے کے حق میں نازل ہوئی جو جنّات کی ایک مخصوص قسم کے پرستار تھے۔ جب اِن جنّات نے اسلام قبول کر لیا اور اُن کے پرستار اُن کے اسلام قبول کرنے کی حقیقت سے ناآشنا رہے تو اللہ تعالیٰ نے اُنہیں جتلایا کہ جن کی وہ پرستش کرتے رہے ہیں' اب وہ رب تعالیٰ کے حضور سجدہ ریز ہو گئے ہیں اور اُس کا قرب حاصل کرنے کا ذریعہ ڈھونڈ رہے ہیں۔'' (صحیح بخاری: کتاب التفسیر ؛ صحیح مسلم: کتاب التفسیر؛ المستدرک للحاکم ؛ معالم التنزیل للبغوی بحوالہ ڈاکٹر طاہر القادری)

''یہ قرآنی آیت کسی شک و شبہ کے بغیر اس بات میں واضح ہے کہ مشرکین جن دیوتاؤں کی پرستش کرتے تھے

اور جنہیں وہ مصیبت کے وقت پکارتے تھے' دراصل خدا نہیں ہیں کیونکہ وہ خود رضائے الٰہی کی تلاش میں ہیں۔ دراصل وہ خود اپنے پرستاروں کی طرح بے بس اور لاچار ہیں۔ یہ آیت اس نکتے کو بھی واضح کرتی ہے کہ مقربینِ الٰہی تک رسائی پانا ایک جائز عمل ہے کیونکہ اِن مقدّس اور بارگاہِ الٰہی کی منظور ہستیوں کی یہی تعلیم اور یہی عمل رہا ہے۔ یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ جو خود قربِ الٰہی کی تلاش میں ہیں' کیونکر اُس تک پہنچ کا ذریعہ بن سکتے ہیں؟ قرآنِ حکیم کی اس آیت پر تھوڑا سا غور کرنے سے ہمیں اس کا جواب مل جاتا ہے کہ غیر اللہ کی پرستش ممنوع اور حرام ہے لیکن اللہ کے منتخب بندگان پر اعتماد کرنا اور اُن سے اپنی ضروریات کی تکمیل کے لئے اللہ سے دعا کرانا بالکل جائز عمل ہے۔ جبکہ عبادت بلا شرکتِ غیرے صرف اللہ ہی کی ہے تو اس کے قرب پانے کے وسائل کو تلاش کرنا بھی جائز ہے۔ اللہ کے منتخب بندے صرف ذرائع کا کام دیتے ہیں' وہ کسی بھی طرح اللہ کا بدل نہیں ہیں کیونکہ صرف اللہ ہی معبودِ برحق ہے اور اُسی کے قرب کی تلاش میں بندے کو رہنا چاہئے۔'' (ایضاً ص ۴۶)

(۳) مخالفینِ توسّل کا تیسرا اعتراض یہ ہے کہ قربِ الٰہی کو پانے کے لئے ''توسّل'' اسی طرح ناجائز ہے جس طرح اللہ کے سوا کسی اور کی عبادت کرنا ناجائز ہے۔ اُن کی دلیل یہ ہے کہ مشرکین بتوں کی پرستش میں یہ کہا کرتے تھے کہ وہ اُن کی پرستش اللہ کا قرب حاصل کرنے کے لئے کرتے ہیں۔ جس طرح قربِ الٰہی کے حصول کے لئے بتوں کی پرستش ایک ناجائز عمل ہے' اسی طرح اگر کوئی قربِ الٰہی کے حصول کے لئے کسی توسّل پر اعتماد کرتا ہے تو یہ عمل بھی ناجائز ہوگا۔ اپنی دلیل کی تائید میں وہ یہ قرآنی آیت پیش کرتے ہیں :

مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِیُقَرِّبُوْنَا اِلَی اللّٰہِ زُلْفٰی (الزُّمَر : ۳)

''ہم تو اُن کی پرستش بس اس لئے کرتے ہیں کہ وہ ہمیں خدا کا مقرب بنا دیں۔'' (۳ : ۳۹)

''یہ آیتِ قرآنی اس بات کے وضوح میں ہے کہ مشرکین بتوں کی پرستش قربِ الٰہی کے حصول کے لئے کرتے تھے۔ وہ انہیں خالق اور خدا نہیں سمجھتے تھے۔ اُن کا یہ عمل محض قربِ الٰہی کے حصول کا ایک ذریعہ تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے توسّل کی اس قسم کی اجازت نہیں دی۔''

''جواب : یہ قرآنی آیت توسّل کے انکار یا ردّ میں نہیں۔ توسّل کے جواز کے خلاف ایسا استدلال محض جہالت اور ضد و عناد پر مبنی ہے۔ یہ آیت بالخصوص غیر اللہ کی پرستش کے ردّ میں اور محض خدائے واحد لاشریک کی عبادت کے بارے میں نازل ہوئی اور استدلال کا کوئی بھی طریقہ ایسے عمل کی غیر قانونی حیثیت کو قانونی حیثیت میں نہیں بدل سکتا۔ مشرکین بتوں کے پجاری تھے جسے اسلام نے ناجائز اور کفر قرار دیا۔ جب اسلام نے مشرکین کی بت پرستی کو حرام اور ممنوع قرار دیا تو اُن لوگوں نے اپنے اس مشرکانہ عمل کو ناجائز کام تسلیم کرنے کی بجائے اپنی قدیم روایات کی تائید میں معقولیت اور استدلال کا سہارا لیا اور عذر ہائے لنگ تراشنے شروع کئے یعنی اُنہوں نے یہ کہا کہ وہ اُن بتوں کو خالق مان کر اُن کی پوجا نہیں کرتے بلکہ اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کے لئے اُن کی پرستش کرتے ہیں۔ وہ بتوں کو محض وسیلہ کے طور پر استعمال کرتے تھے اور اُن کا ہدف قربِ الٰہی کا حصول تھا۔''

''انسان کی فطرت میں اپنے خالق کی معرفت رکھی گئی ہے اور اس کائنات کے خالق کی عبادت کرنا بھی اُس کی طبیعت کا تقاضا ہے لیکن اس فطری معرفت اور عبادت کا اعتبار نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اُس معرفت اور عبادت کا اعتبار ہے جو بندوں تک نبیوں اور رسولوں کے واسطے سے پہنچی ہے اور رب تعالیٰ نے اپنی کتاب کے ذریعے جو احکام بندوں تک پہنچائے ہیں۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کو وہ اطاعت اور عبادت مطلوب ہے جو شریعت کے موافق ہو خواہ وہ طبیعت کے خلاف ہو۔۔۔۔۔ اللہ تعالیٰ کے قرب کو حاصل کرنے کے حصول کا صحیح ذریعہ وہی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول مکرم ﷺ پر نازل فرمایا اور رسول اللہ ﷺ نے اُسے بیان کیا اور ائمہ اور مجتہدین نے اس سے احکام شرعیہ کو منضبط کیا اور ہر دَور میں اہلِ علم اور اربابِ فتویٰ نے عصری تقاضوں اور نئے پیدا ہونے والے مسائل کا حل بتلایا۔''

یہاں اس بات کا ذکر خالی از مفاد نہیں ہے کہ توسّل کے منکرین اپنے موقف کی تائید میں جو بھی قرآنی آیات پیش کرتے ہیں، وہ سب آیات صرف کفار، بت پرستوں یا یہود سے متعلق ہیں جو اللہ اور اُس کے رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بدترین دشمن ہیں مثلاً سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۲۳، سورۃ الشعراء کی آیت ۸۸، ۸۹، ۱۰۰، ۱۰۱، سورۃ المدثّر کی آیت ۴۸ وغیرہ جن کا ذکر گزشتہ عنوان ''عقیدہ شفاعت'' کے تحت ہو چکا ہے۔

قرآنِ حکیم سے توسّل کی تائید میں دلائل

نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذاتِ اقدس سے توسّل : سورۃ النساء میں مسلمانوں سے کہا جا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے فریاد کرتے ہوئے وہ پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذاتِ اقدس کو وسیلہ بنایا کریں:

وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا ○ (النسآء : ۶۴)

''اور اگر یہ لوگ جس وقت اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں، (اے حبیب!) آپ کے پاس آجائیں اور اللہ سے بخشش مانگیں اور پیغمبر اُن کے لئے بخشش مانگے تو وہ اللہ تعالیٰ کو یقیناً معاف کرنے والا مہربان پائیں گے۔''

اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مغفرت کے حصول کے لئے توبہ کے مختلف طریقوں میں سب سے مؤثر طریقہ رسول اللہ ﷺ کو وسیلہ بنانا ہے۔ آپ ﷺ کا توسّل دعا کی فوری قبولیت کی ضمانت ہے۔

''یہ کہنا کہ اس آیت کا حکم آنحضرت ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے ساتھ مختص ہے، غلط ہے۔ کیونکہ یہ اصولی قاعدہ ہے کہ عموم الفاظ کا اعتبار ہوتا ہے نہ کہ موردِ خاص کا۔ صحابہ کرام اور تابعین عمومِ الفاظِ قرآنی سے حجت پکڑتے رہے باوجودیکہ وہ آیتیں خاص خاص موقعوں پر نازل ہوئیں (اِتقان: للسیوطی)۔ اسی طرح زیرِ نظر آیت اگرچہ ایک خاص قوم کے حق میں نازل ہوئی لیکن جہاں یہ وصف (عاصیانِ اُمّت کا حضور سید الابرار کی بارگاہ میں گناہوں کی معافی کے لئے حاضر ہونا) پایا جائے گا، عمومِ حالت کے موافق اس کا حکم بھی عام اور ہر دو حالتِ حیات و بعد الوفات کو شامل ہوگا۔ چنانچہ علمائے کرام نے عموم سے ہر دو حالتیں سمجھی ہیں اور جو شخص آپ کے مزارِ اقدس پر حاضر ہو، اُس کے لئے

مستحب خیال کیا ہے کہ وہ اس آیت کو پڑھے اور اللہ تعالیٰ سے مغفرت مانگے ۔ مذاہب اربعہ کے علماء نے اسے اپنے مناسک میں نقل کیا ہے اور اسے مستحسن سمجھ کر آدابِ زیارت میں شامل کیا ہے۔''

''صحابہ کرام کے زمانہ سے لے کر آج تک اہلِ اسلام حضورِ اقدس ﷺ کے روضہ شریف کی زیارت اور حضور علیہ السلام سے توسّل و استغفار کرتے رہے ہیں ۔ حافظ ابو عبداللہ محمد بن موسیٰ بن نعمان اپنی کتاب ''مصباح الظلام'' میں لکھتے ہیں کہ حافظ ابو سعید سمعانی نے بروایت علی ابن طالب رضی اللہ عنہ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے دفن شریف کے تین دن بعد ایک بدّو نے اپنے آپ کو مزارِ مبارک پر گرا دیا' اس کی مٹی اپنے سر پر ڈالی اور عرض کیا: یا رسول اللہ! آپ نے جو کچھ فرمایا وہ ہم نے سن لیا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ پر قرآن نازل کیا جس میں ارشاد فرمایا: وَلَوْاَنَّهُمْ اِذْظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ یا رسول اللہ! میں نے ظلم کیا۔ میں آپ کے پاس آیا ہوں تا کہ آپ میرے حق میں طلبِ مغفرت فرمائیں ۔ مزارِ مبارک سے آواز آئی کہ تجھے بخش دیا گیا۔'' (وفاء الوفاء للسمہودی ؛ شفاء السقام للسبکی بحوالہ ''سیرتِ رسولِ عربی ﷺ'' ۔۔ علامہ نور بخش توکلی' ص ص ۵۲۹' ۵۳۰)

''مسند امام ابی حنیفہ رضی اللہ عنہ میں بروایتِ امام منقول ہے کہ حضرت ایوب سختیانی تابعی آئے ۔ جب وہ رسول اللہ ﷺ کے مزارِ انور کے نزدیک پہنچے تو اپنی پیٹھ قبلہ کی طرف اور منہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے چہرہ انور کی طرف کر لیا اور آپ کی ذاتِ اقدس سے توسّل کیا۔'' (وفاء الوفاء ص ۴۱۲ بحوالہ ''سیرتِ رسولِ عربی ﷺ'')

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے بھی عباسی خلیفہ منصور کو اسی بات کی ترغیب دی کہ روضہ رسول علیہ السلام پر درود وسلام پیش کرنے کے بعد کعبہ کی طرف پشت کر کے اور مواجہہ شریف کی طرف رخ کر کے رب تعالیٰ سے دعا کے لئے آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا توسّل کرے۔

بعض صاحبان حصولِ دعا کے لئے اولیائے کرام کی خدمت میں حاضری کو بھی اسی ضمن میں شمار کرتے ہیں اور حاضر ہونے والوں پر بڑی بے رحمی سے شرک کا الزام لگاتے ہیں ۔ وہ خود ہی انصاف فرمادیں کہ جب کوئی مسلمان کسی ولی یا بزرک کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے اور دعا کے لئے عرض کرتا ہے تو کیا (العیاذ باللہ) وہ اُن کی عبادت کر رہا ہوتا ہے؟ اگر صرف طلبِ دعا کے لئے بھی کسی کے پاس جانا عبادت اور شرک ہے تو اِن صاحبان کا صحابہ کرام کے متعلق کیا فتویٰ ہے جو حضور سرورِ عالم' رحمتِ مجسّم ﷺ کی خدمتِ اقدس واطہر میں کبھی بارش کے نزول کے لئے' کبھی بارش کے رکنے کے لئے' کبھی بیماری سے شفایاب ہونے کے لئے اور کبھی دیگر مقاصد کے لئے حاضر ہوتے اور دعا کے لئے عرض کرتے اور آپ ﷺ دعا کے لئے دستِ مبارک بارگاہِ الٰہی میں اٹھاتے تو مشکلیں آسان ہو جاتیں ۔ لا علاج مریض شفایاب ہو جاتے' طویل خشک سالی کے بعد آنِ واحد میں گھنگھور گھٹائیں برسنے لگتیں اور برستے ہی چلی جاتیں ۔ ہر مسلمان پر لازم ہے کہ وہ اس بات پر محکم یقین رکھے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت کفر اور گمراہی ہے اور ابدی عذاب کا موجب ہے اور ان بے رحم مُفتیوں سے بھی مؤدّبانہ التماس ہے کہ وہ شمع

توحید کے پروانوں پر شرک کی جھوٹی تہمت لگانے کا شغل ترک کر دیں اور کوئی مفید مشغلہ اختیار فرمائیں جس سے اُنہیں بھی فائدہ ہو اور اُن کی قوم کا بھی بھلا ہو۔'' (ضیاء القرآن' جلد چہارم' ص ۲۵۹)

آپ کی ولادتِ باسعادت سے قبل توسّل : (۱) جب حضرت آدم علیہ السلام سے (بلا قصد و ارادہ) لغزش سرزد ہوئی تو اُنہوں نے آخر کار یوں دعا کی:

یَارَبِّ اَسْئَلُکَ بِحَقِّ مُحَمَّدٍ لِمَا غَفَرْتَ لِیْ

''اے میرے پروردگار! میں تجھ سے بحقِ محمد سوال کرتا ہوں کہ میری خطا معاف کر دے۔''

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

یَا آدَمُ! وَکَیْفَ عَرَفْتَ مُحَمَّدًا وَلَمْ أَخْلُقْهُ؟ قَالَ: یَا رَبِّ! لِاَنَّکَ لَمَّا خَلَقْتَنِیْ بِیَدِکَ وَنَفَخْتَ فِیَّ مِنْ رُّوْحِکَ رَفَعْتُ رَأْسِیْ فَرَأَیْتُ عَلٰی قَوَائِمِ الْعَرْشِ: لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ فَعَلِمْتُ لَمْ تُضِفْ اِلٰی اِسْمِکَ اِلَّا أَحَبَّ الْخَلْقِ اِلَیْکَ فَقَالَ اللّٰہُ: صَدَقْتَ یَا آدَمُ! اِنَّہٗ لَاَحَبُّ الْخَلْقِ اِلَیَّ اِدَّعُنِیْ بِحَقِّہٖ فَقَدْ غَفَرْتُ لَکَ لَوْلَا مُحَمَّدٌ مَا خَلَقْتُکَ (مستدرک)

''اے آدم! تو نے محمد (علیہ السلام) کو کس طرح پہچانا حالانکہ میں نے اُنہیں پیدا نہیں کیا؟ جنابِ آدم نے عرض کی: اے میرے پالنہار! جب تو نے مجھے اپنے ہاتھ سے پیدا کیا اور مجھ میں اپنی روح پھونکی تو میں نے سر اٹھایا اور عرش کے پایوں پر لکھا ہوا دیکھا: لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ پس میں جان گیا کہ تو نے اپنے نام کے ساتھ اُسی کا ذکر کیا ہے جو تیرے نزدیک محبوب ترین مخلوق ہے۔ رب تعالیٰ نے فرمایا: اے آدم! تو نے سچ کہا: وہ میرے نزدیک اَحبُّ الخلق ہیں۔ چونکہ تم نے اُن کے وسیلہ سے دعا مانگی ہے' میں نے تمہیں معاف کر دیا۔ اگر محمد نہ ہوتے تو میں تمہیں پیدا نہ کرتا۔ (مستدرک' حاکم و طبرانی بحوالہ ''سیرتِ رسول عربی ﷺ'' از علامہ نور بخش توکلی' صفحہ ۵۳۵)

پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری اپنی کتاب "Islamic Concept of Intermediation" کے صفحہ ۱۴۸ پر لکھتے ہیں کہ یہ روایت کئی سلسلوں سے بیان ہوئی ہے اور امام بیہقی نے اسے ''دلائل النبوۃ'' (۵:۴۸۹) میں' طبرانی نے ''معجم الاوسط'' (۷:۲۵۹#۶۴۹۸) میں اور ''معجم الصغیر'' (۲:۸۲-۸۳) میں' ھیثمی نے ''مجمع الزوائد'' (۸:۲۵۳) میں' ابن عساکر نے ''تہذیب تاریخ دمشق الکبیر'' (۲:۳۵۹-۶۰) میں' ابنِ کثیر نے ''البدایۃ والنھایۃ'' (۱:۱۳۱؛ ۲:۲۹۱-۹۲) میں اور ابن حجر ہیثمی نے ''الجواھر المعظم'' میں بیان کیا۔

مولانا اشرف علی تھانوی نے اس روایت کا ذکر اپنی کتاب ''النشر الطیب'' کے صفحہ ۲۱ پر کیا ہے۔

'' آدم علیہ السلام کا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے توسّل پکڑنے کی اِس روایت کو قاضی عیاض نے

''الشفاء'' میں اسے صحیح اور مشہور روایات میں شمار کیا ہے (۲۲۷،۲۲۸:۱) اور لکھا ہے کہ ابو محمد المکی اور ابولیث السمرقندی نے بھی اس روایت کا ذکر کیا ہے۔ امام جلال الدین السیوطی نے اس حدیث کی شرح ''الدرّ المنثور'' (۵۸:۱) میں، ''الخصائص الکبریٰ'' (۶:۱) میں اور ''الریاض الانیقہ فی شرح اسمائے خیر الخلیقۃ'' میں کی ہے جہاں انہوں نے لکھا ہے کہ امام بیہقی نے اسے صحیح حدیث کہا ہے اور امام بیہقی نے ''دلائل النبوۃ'' کے تعارف میں لکھا کہ اُنہوں نے اپنی کتاب میں صرف صحیح احادیث کو درج کیا ہے۔("Islamic Concept of Intermediation" pp. 150, 151)

(۲) آنحضرت ﷺ کی بعثت سے پہلے یہود اپنے دشمنوں پر فتح پانے کے لئے دعا میں حضورِ انور ﷺ ہی کا وسیلہ پکڑا کرتے تھے۔ چنانچہ قرآن کریم میں وارد ہے:

وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا كَفَرُوْا بِهٖ (البقرۃ: ۸۹)

''اور وہ اس سے قبل کافروں پر فتح مانگا کرتے تھے۔ پس جب وہ (رسول) اُن کے پاس آگیا تو اُس کا انکار کر بیٹھے۔'' (۲: ۸۹)

(۳) حافظ ابونعیم نے ''دلائل النبوۃ'' میں عطاء وضحاک کے طریق سے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ حضرت محمد ﷺ کی بعثت سے پہلے یہودِ بنی قریظہ ونضیر کافروں پر فتح کی دعا مانگا کرتے تھے اور دعا میں یوں کہا کرتے تھے:

اَللّٰهُمَّ اِنَّا نَسْتَنْصِرُكَ بِحَقِّ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ اَنْ تَنْصُرَنَا عَلَيْهِمْ

''خدایا! ہم تجھ سے بحقِ نبی اُمّی دعا مانگتے ہیں کہ تو ہمیں اُن پر فتح دے اور فتح پایا کرتے تھے۔''

<u>وفات شریف کے بعد آپ سے توسّل</u>: وفات شریف کے بعد بھی صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین مصائب وحروب وحاجات میں آپ کو پکارا کرتے اور آپ سے استغاثہ کیا کرتے تھے۔ مثالیں ملاحظہ ہوں:

(۱) صاحبِ مَوَاهِبُ اللَّدُنيه بحوالہ ابنِ منیر لکھتے ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ کا وصال شریف ہوا تو اس صدمہ سے آپ کے اصحاب کرام کا عجب حال ہو رہا تھا۔ سیّدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ روتے ہوئے حاضر ہوئے اور حضورِ اقدس ﷺ کے چہرہ انور سے کپڑا اٹھا کر یوں عرض کرنے لگے:

وَلَوْ أَنَّ مَوْتُكَ كَانَ اِخْتِيَارًا لَّجِدْنَا مَوْتَكَ بِالنُّفُوْسِ۔ اُذْكُرْنَا يَا مُحَمَّدُ عِنْدَ رَبِّكَ وَلْنَكُنْ مِّنْ بَالِكَ

''اگر آپ کی موت میں ہمیں اختیار دیا جاتا تو ہم آپ کی موت کے لئے اپنی جانیں قربان کر دیتے۔ اے محمد صلی اللہ علیک وسلّم! اپنے پروردگار کے پاس ہمیں یاد رکھنا اور ضرور ہمارا خیال رکھنا۔''

(۲) وفات شریف کے تین بعد ایک بدّو کا قبرِ انور پر حاضر ہونا اور آپ سے توسّل کرنا بروایت علی بن ابی طالب کرّم اللہ وجہہٗ الکریم کا ذکر قبل ازیں صفحہ ۲۳۶۶ پر ہو چکا ہے۔

(۳) مالک الدار راوی ہیں کہ سیّدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں قحط پڑا۔ ایک صحابی بلال بن حارث نے رسول اللہ ﷺ کی قبرِ انور پر حاضر ہو کر عرض کیا: یارسول اللہ! اپنی اُمّت کے لئے بارش کی دعا فرمائیں کہ وہ ہلاک ہو رہی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے خواب میں اُس سے فرمایا کہ عمر کے پاس جا کر میرا اسلام کہو اور بارش کی بشارت دو اور یہ بھی کہہ دو کہ نرمی اختیار کرے۔ اُس شخص نے حاضر ہو کر خبر دی۔ سیّدنا عمر رضی اللہ عنہ یہ سن کر رو دئے اور کہا: اے رب! میں کوتاہی نہیں کرتا مگر اُس چیز میں کہ جس سے میں عاجز ہوں۔ (وفاء الوفاء بحوالہ بیہقی و ابن ابی شیبہ' مندرج ''سیرتِ رسول عربی ﷺ'' صفحہ ۵۳۹)

(۴) ایک سال مدینہ منوّرہ میں قحط پڑا تو لوگوں نے سیّدہ عائشہ صدّیقہ رضی اللہ عنہا سے فریاد کی۔ سیّدہ نے فرمایا کہ تم رسول اللہ ﷺ کی قبرِ انور پر حاضر ہو کر اس میں ایک روشندان آسمان کی طرف کھول دو تا کہ قبرِ انور اور آسمان کے درمیان چھت حائل نہ رہے۔ اُنہوں نے ایسا ہی کیا۔ خوب بارش ہوئی اور گھاس اور سبزہ اُگے۔ جانور ایسے فربہ ہو گئے کہ چربی سے پھٹنے لگے۔ اس سال کو عام الفتق (پھٹنے کا سال) کہتے تھے۔ (وفاء الوفاء جزء ۲' ص ۴۳۰)

(۵) ابن جریر طبری ۱۸ھ کے واقعات میں بالاسناد نقل کرتے ہیں کہ حضرت عاصم بن عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ایک سال سیّدنا عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ میں امساکِ باراں ہوا' مواشی لاغر ہو گئے۔ اہلِ بادیہ میں سے قبیلہ مزینہ کے ایک اہلِ خانہ نے اپنے صاحب حضرت بلال بن حارث صحابی سے کہا کہ ہمیں غایت درجہ کی تکلیف ہے' آپ ہمارے لئے ایک بکری ذبح کریں۔ اس نے کہا کہ بکریوں میں کچھ رہا نہیں۔ اہلِ خانہ اصرار کرتے رہے یہاں تک کہ اُس نے اُن کے واسطے ایک بکری ذبح کی۔ جب اُس کی کھال اتاری تو سرخ ہڈیاں دکھائی دیں۔ اس پر وہ پکار اُٹھا: یا محمد! (''تاریخ الامم والملوک'' جزء ۴' ص ۲۲۴ ؛ کامل لابن اثیر)

(۶) سیّدنا ابوعبیدہ بن الجراح نے قنسرین سے حضرت کعب بن ضمرہ کو ایک ہزار سوار دے کر فتح حلب کے لئے روانہ کیا اور فرمایا کہ میں تمہارے پیچھے آ رہا ہوں۔ اُدھر یوقنا حاکمِ حلب کو اُس کے جاسوسوں نے خبر دی کہ عرب ایک ہزار کی جمعیت کے ساتھ تمہارے شہر کی فتح کے ارادہ سے آ رہے ہیں اور وہ شہر سے چھ میل کے فاصلہ پر ہیں۔ یوقنا نے لشکر کو تیار کر کے آدھا اپنے ساتھ لیا اور آدھا کمین گاہ میں مقرر کیا۔ مقابلہ ہوا یہاں تک کہ مسلمانوں کو فتح مبین کا یقین ہو گیا مگر اسی اثنا میں کمین گاہ سے یوقنا کا لشکر آ پڑا جس کے سبب سے لشکرِ اسلام کا ایک جتھہ بھاگنے لگا۔ دوسرے جتھہ نے اہلِ کمین کا مقابلہ کیا۔ تیسرا جتھہ حضرت کعب کے ساتھ تھا جو مسلمانوں کے لئے بڑے بے چین تھے اور اُن کے بچانے کی کوشش کر رہے تھے اور داد دیتے ہوئے یوں پکار رہے تھے:

يَا مُحَمَّدُ! يَا مُحَمَّدُ! يَا نَصْرَاللهِ انْزِلْ يَا مَعشَرَالْمُسْلِمِيْنَ اِثْبُتُوْا اِنَّمَا هِيَ سَاعَةٌ'' وَيَاْتِي النَّصْرُوَأَنْتُمُ الْاَعْلَوْن (فتوح الشام' جزو اول' صفحہ ۱۵۱' مطبوعہ مصر)

''یا محمد! یا محمد! اے نصرتِ الٰہی! نزول فرما۔ اے مسلمانوں کے گروہ! ثابت قدم رہو۔ یہی ایک گھڑی ہے۔ مدد آنے والی ہے' غلبہ تم ہی کو حاصل ہوگا۔''

(۷) سیّدنا عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت عبداللہ بن قرط صحابی کے ہاتھ اپنا خط ابوعبیدہ بن الجراح کے نام یرموک بھیجا اور سلامتی کی دعا کی۔ عبداللہ جب مسجد سے نکلے تو خیال آیا کہ مجھ سے خطا ہوئی کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے روضہ شریف پر سلام عرض نہیں کیا۔ چنانچہ وہ روضہ شریف پر حاضر ہوئے۔ وہاں سیّدہ عائشہ صدّیقہ اور حضرات علی بن ابی طالب و عباس حاضر تھے۔ امام حسین جنابِ علی کی گود میں اور امام حسن حضرت عباس کی گود میں تھے۔ حضرت عبداللہ نے حضرت علی و حضرت عباس سے عرض کیا کہ کامیابی کے لئے دعا فرمائیں۔ ہر دو نے روضہ شریف پر ہاتھ اٹھا کر یوں دعا کی:

اَللّٰھُمَّ اِنَّا نَتَوَسَّلُ بِھٰذا النَّبِیِّ الْمُصْطَفٰی وَالرَّسُوْلِ الْمُجْتَبٰی تَوَسَّلَ بِہٖ آدَمُ فَاُجِیْبَتْ دَعْوَتُہٗ وَ غَفَرْتَ خَطِیْئَتَہٗ سَھِّلْ عَلٰی عَبْدِاللّٰہِ طَرِیْقَہٗ وَاطْوِل البعیدوَ اَیِّدْ اَصْحَابَ نَبِیِّکَ بِالنَّصْرِ اِنَّکَ سَمِیْعُ الدُّعَاءِ

''یا اللہ! ہم اِس نبی مصطفیٰ و رسولِ مجتبیٰ کے وسیلہ سے دعا کرتے ہیں کہ جن کے وسیلہ سے حضرت آدم کی دعا قبول ہوئی اور اُن کی خطا معاف ہوئی کہ تو عبداللہ پر اس کا راستہ آسان کر دے اور بعید کو نزدیک کر دے اور اپنے نبی کے اصحاب کی مدد فتح سے کر دے، بے شک تو دعا کا سننے والا ہے۔''

اس کے بعد سیّدنا علی کرّم اللہ وجہہٗ نے حضرت عبداللہ سے فرمایا کہ اب جایئے۔ اللہ تعالیٰ حضرات عمرو عباس و علی و حسن و حسین و ازواج رسول اللہ ﷺ کی دعا کو ردّ نہ کرے گا کیونکہ اُنہوں نے اللہ کی بارگاہ میں اُس نبی کا وسیلہ پکڑا ہے جو اَکرمُ الخَلق ہیں۔ (فتوح الشام' جزءِ اوّل' ص ۱۰۵)

(۸) ابن السنی (م ۳۶۴ھ) کی کتاب میں ہیثم بن حنش سے روایت ہے کہ اُس نے کہا ہم حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے پاس تھے۔ اُن کا پاؤں سو گیا تو ایک شخص نے اُن سے کہا کہ آپ اُسے یاد کیجئے جو آپ کے نزدیک سب لوگوں سے پیارا ہے۔ اس پر حضرت ابنِ عمر نے کہا: یَا مُحَمَّدُ تو ایسا کہنے پر آپ گویا بند سے کھول دیئے گئے اور اُسی کتاب ہی میں مجاہد (تابعی) سے روایت ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے پاس ایک شخص کا پاؤں سو گیا۔ آپ نے اُس سے کہا تو اُس کو یاد کر جو تجھے سب لوگوں سے پیارا ہے۔ یہ سن کر اُس نے کہا: یَا مُحَمَّد یہ کہتے ہی اُس کے پاؤں کی خوابیدگی جاتی رہی۔ (کتاب الاذکار للنووی ص ۱۳۵)

(۹) جب آنحضرت ﷺ بچپن میں جنابِ ابوطالب کی کفالت میں تھے تو ابوطالب کی زوجہ اور آپ ﷺ کی چچی حضرت فاطمہ بنتِ اسد نے کھلانے پلانے میں آپ کا خاص خیال رکھا تھا۔ یہ اِسی احسان کا بدلہ تھا کہ آپ نے فاطمہ کو اپنی چادر میں کفنایا تاکہ وہ آتشِ دوزخ سے محفوظ رہیں اور آپ اُن کی لحد میں لیٹ گئے تاکہ اُنہیں راحت و آرام ملے۔ یہ روایت حیات شریف میں توسّل کی دلیل ہے۔

ہم یہاں علامہ ابن حاج مالکی (م ۷۳۷ھ) کا قول نقل کرتے ہیں جو متشددین میں ہیں۔ وہ اپنی کتاب ''مدخل'' میں تحریر کرتے ہیں:

فَالتَّوَسُّلُ بِهٖ عَلَيْهِ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ هُوَ مَحَلُّ حَطِّ أَحْمَالِ الْأَوْزَارِ وَأَثْقَالِ الذُّنُوْبِ وَالْخَطَايَا لِأَنَّ بَرَكَةَ شَفَاعَتِهٖ عَلَيْهِ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ وَعِظَمُهَا عِنْدَ رَبِّهٖ لَا يَتَعَاظَمُهَا ذَنْبٌ إِنَّهَا أَعْظَمُ مِنَ الْجَمِيْعِ فَلْيَسْتَبْشِرْ مَنْ زَارَهٗ وَيَلْجَأْ إِلَى اللّٰهِ تَعَالٰى بِشَفَاعَةِ نَبِيِّهٖ عَلَيْهِ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ مَنْ لَمْ يَزُرْهُ۔ اَللّٰهُمَّ لَا تَحْرِمْنَا مِنْ شَفَاعَتِهٖ بِحُرْمَتِهٖ عِنْدَكَ آمِيْن يَارَبَّ الْعَالَمِيْنَ وَمَنِ اعْتَقَدَ خِلَافَ هٰذَا فَهُوَ مَحْرُوْمٌ" ("مَدخل" لعلامة ابن حاج مالكی)

"پس حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے توسّل کرنا گناہوں اور خطاؤں کے بوجھوں کے ساقط ہونے کا محل ہے۔ کیونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی شفاعت کی برکت اور اللہ کے نزدیک آپ کی عظمت کے سامنے کوئی گناہ بڑا نہیں۔ پس اُس شخص کو خوش ہونا چاہئے جس نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زیارت کی اور جو شخص زیارت کے لئے حاضر نہ ہوسکا' وہ حضور کو شفیع بنا کر اللہ کی پناہ لے۔ اے اللہ! ہمیں حضور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی شفاعت سے محروم نہ رکھنا۔ جو شخص اس کے خلاف عقیدہ رکھتا ہے' وہ محروم ہے۔"

(۱۰) "ابوالخیر اَقطع ذکر کرتے ہیں کہ میں مدینہ منوّرہ میں داخل ہوا اور فاقہ سے تھا۔ پانچ دن اسی طرح رہا۔ پھر مزارِ مبارک پر حاضر ہوا اور نبی اکرم ﷺ اور حضرات شیخین کو سلام عرض کیا اور یوں گویا ہوا: "یارسول اللہ! میں آپ کا مہمان ہوں۔" یہ عرض کر کے میں قبر شریف کے پیچھے سو گیا۔ میں نے خواب میں رسول اللہ ﷺ کو دیکھا۔ سیّدنا ابوبکر آپ کے دائیں طرف' سیّدنا عمر آپ کے بائیں طرف اور سیّدنا علی سامنے ہیں۔ مجھے حضرت علی نے بلایا اور کہا کہ اُٹھو رسول اللہ ﷺ تشریف لائے ہیں۔ میں نے اُٹھ کر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی پیشانی کو بوسہ دیا۔ آپ ﷺ نے مجھے ایک روٹی عنایت فرمائی۔ آدھی میں نے کھائی۔ آنکھ کھلی تو آدھی میرے ہاتھ میں تھی۔"

(۱۱) "علامہ نبہانی اپنی کتاب "سعادت الدارین" میں خود اپنے استغاثہ کا قصہ یوں تحریر فرماتے ہیں کہ کسی ناخدا ترس دشمن نے میرے اوپر ایسا افترا باندھا کہ سلطان عبدالحمید خان نے حکم دیا کہ مجھے معزول کر کے دُور علاقہ میں بھیج دیا جائے۔ یہ سن کر مجھے بے قراری ہوئی۔ جمعرات کا دن تھا۔ جمعہ کی رات میں نے ایک ہزار دفعہ استغاثہ پڑھا اور تین سو پچاس بار یہ درود شریف پڑھا: اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَعَلٰى آلِ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ قَدْ ضَاقَتْ حِيْلَتِيْ أَدْرِكْنِيْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ پھر مجھے نیند آ گئی۔ آخر رات کو جاگا اور ہزار دفعہ درود شریف پڑھ کر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے استغاثہ کیا۔ جمعہ کی شام ہی کو سلطان کی طرف سے حکم آ گیا کہ مجھے بحال رکھا جائے۔ اللہ تعالیٰ سلطان کو نصرت دے اور مفتری کو رسوا کرے۔ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ"

(۱۲) صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے بعد آج تک یہ توسّل و استغاثہ جاری ہے اور تا قیامت جاری رہے گا۔ حضرت امام الائمہ سیّدنا ابوحنیفہ نعمان بن ثابت تابعی کوفی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنا حال یوں عرض کر رہے ہیں:

يَا سَيِّدَ السَّادَاتِ جِئْتُكَ قَاصِدًا ۔۔۔ أَرْجُوْا رِضَاكَ وَأَحْتَمِيْ بِحِمَاكَ

أَنْتَ الَّذِيْ لَوْلَاكَ مَا خُلِقَ امْرُءٌ ۔۔۔ كَلَّا وَلَا خُلِقَ الْوَرٰى لَوْلَاكَ

أَنَا طَامِعٌ بِالْجُوْدِ مِنْكَ وَلَمْ يَكُنْ ۔۔۔ لِأَبِيْ حَنِيْفَةَ فِي الْأَنَامِ سِوَاكَ (قصیدہ نعمانیہ)

''اے سید السادات ! میں قصد کر کے آپ کے پاس آیا ہوں ۔ میں آپ کی خوشنودی کا امیدوار اور آپ کے سبزہ زار میں پناہ گزیں ہوں ۔ آپ کی وہ مقدس ذات ہے کہ اگر آپ نہ ہوتے تو کبھی کوئی آدمی پیدا نہ ہوتا اور نہ کوئی مخلوق پیدا ہوتی ۔ میں آپ کے جُودوکرم کا امیدوار ہوں ۔ آپ کے سوا پوری خلق میں ابوحنیفہ کا کوئی سہارا نہیں ۔''

(۱۳) حضرت حاجی حافظ شاہ محمد امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ دربارِ نبوی میں یوں عرض کرتے ہیں :

کرم فرماؤ ہم پر اور کرو حق سے شفاعت تم — ہمارے جرم وعصیاں پر نہ جاؤ یا رسول اللہ
پھنسا ہوں بے طرح گرداب غم میں ناخدا ہو کر — میری کشتی کنارے پر لگاؤ یا رسول اللہ
جہازِ امت کا حق نے کر دیا ہے آپ کے ہاتھوں — بس اب چاہو تراؤ یا ڈباؤ یا رسول اللہ

(رسالہ ''دردنامہ غمناک'')

(۱۴) مولانا مولوی محمد قاسم نانوتوی یوں عرض کناں ہیں (بحوالہ قصائد قاسمی) :

مدد کر اے کرم احمدی کہ تیرے سوا — نہیں ہے قاسم بیکس کا کوئی حامی کار
یہ ہے اجابتِ حق کو تری دعا کا لحاظ — قضائے مبرم ومشروط کی نہیں ہے پکار
خدا ترا تو جہاں کا ہے واجب الطاعت — جہاں کو تجھ سے تجھے اپنے حق سے ہے سروکار

(۱۵) مولانا شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے قصیدہ ''أَطْيَبُ النَّغم'' کی تضمین میں یوں فرماتے ہیں :

مَدار'' وَّجُوْدُ الْكَوْنِ فِيْ كُلِّ لَحْظَةٍ — وَمِفْتَاحُ بَابِ الْجُوْدِ فِيْ كُلِّ عُسْرَةٍ
وَمُتَمَسِّكُ الْمَلْهُوْفِ فِيْ كُلِّ شِدَّةٍ — وَمُعْتَصِمُ الْمَكْرُوْبِ فِيْ كُلِّ غَمْرَةٍ
وَ مُنْتَجِعُ الْغُفْرَان مِنْ كُلِّ تَائِبٍ — اِلَيْكَ قد الْعَيْنُ حِيْنَ ضَرَاعَةٍ

'' آپ ہر لحظہ وجودِ عالم کے دارومدار ہیں' اور ہر مشکل میں سخاوت کے دروازے کی کنجی ہیں ۔ آپ ہر شدت میں پریشان حال بے قرار کی پناہ ہیں اور ہر مصیبت میں آفت رسیدہ کا سہارا ہیں ۔ آپ ہر توبہ کرنے والے کے لئے بخشش کا وسیلہ ہیں' خشوع وخضوع کے وقت آپ ہی کی طرف آنکھ اُٹھتی ہے ۔''

<u>حدیث توسّل بالعباس کی بحث</u>: سیّدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں ۱۸ ہجری میں جسے ''عام الرمادۃ'' کہتے ہیں' سخت قحط پڑا ۔ چوپائے اور انسان بھوک کی شدت سے مرنے لگے ۔ لوگوں نے حضرت فاروقِ اعظم سے استسقاء (بارانِ رحمت) کے لئے درخواست کی جسے امام بخاری نے یوں نقل کیا ہے:

عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ أَنَّ عُمَرَبْنَ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ كَانَ إِذَا قَحَطُوْا اِسْتَسْقٰى بِالْعَبَّاسِ بْنِ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ فَقَالَ : اَللّٰهُمَّ نَتَوَسَّلُ اِلَيْكَ بِنَبِيِّنَا ﷺ فَتَسْقِيْنَا وَ اِنَّا نَتَوَسَّلُ اِلَيْكَ بِعَمِّ نَبِيِّنَا فَاسْقِيْنَا قَالَ فَيُسْقَوْنَ (باب سؤال الناس الامامَ الاستسقاء اذا قحطوا)

۲۳۷۳ (توسّل ---Intermediation)

''حضرت اَنس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سیّدنا عمر ابن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جب لوگوں میں قحط پڑا' عباس ابن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ کے وسیلہ سے بارش کی دعا کی اور یوں عرض کیا: یا اللہ! ہم تیری جناب میں اپنے نبی ﷺ کا وسیلہ پکڑا کرتے تھے۔ پس تو ہمیں بارش عطا کر دیتا تھا۔ اب ہم تیری بارگاہ میں اپنے نبی کے چچا کو وسیلہ بناتے ہیں۔ پس ہمیں بارش عطا کر (قولِ راوی) پس بارش ہونے لگی۔''

''ابنِ تیمیہ اور اُن کے مقلدین نجدیہ کہتے ہیں کہ حضرت فاروقِ اعظم نے رسول اللہ ﷺ کو چھوڑ کر حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے توسّل کیا' اس سے ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے بعد وفات شریف توسّل جائز نہیں ورنہ حضرت امیر المؤمنین عمر رضی اللہ عنہ ایسا نہ کرتے۔''

''ابنِ تیمیہ کا یہ اجتہاد ایجادِ بندہ (Self-concocted) ہے۔ علمائے اہلِ سنت میں سے آج تک کسی نے اس حدیث سے یہ نتیجہ اخذ نہیں کیا۔ حضورِ اقدس ﷺ کی شان میں حیات و وفات میں اس طرح فرق کرنا کمال درجہ کی شقاوت ہے۔ مسئلہ زیارت و توسّل کی مخالفت کا خمیازہ جو ابنِ تیمیہ کو بھگتنا پڑا' اس کا ذکر قبل ازیں صفحات ۲۳۲۴' ۲۳۲۵ پر ''عقیدہ شفاعت'' کے ضمن میں کیا جا چکا ہے۔ اب ہم حدیث زیرِ بحث کی مختصر وضاحت بیان کرتے ہیں:

''صحابہ کرام نے اس دعائے باراں میں حضرت عباس کو وسیلہ نہیں بنایا بلکہ یوں عرض کیا کہ اے پروردگار! ہم تیری جناب میں اپنے نبی علیہ السلام کے چچا کا وسیلہ پیش کرتے ہیں۔ اگرچہ نام نامی لے کر وسیلہ پکڑنا بھی جائز تھا مگر اس موقع پر فاروقِ اعظم اور دیگر صحابہ کرام کو حضرت عباس کی قرابتِ نبوی جتلا کر گویا حضور علیہ السلام ہی کا وسیلہ پیش کرنا منظور تھا۔ چنانچہ خود حضرت عباس اپنی زبانِ مبارک سے اقرار کرتے ہیں جیسا کہ عمدۃ القاری (شرح بخاری) میں بدیں الفاظ مذکور ہے:

وَفِي الْحَدِيْثِ أَبِيْ صَالِحٍ فَلَمَّا صَعِدَ عُمَرُ وَ مَعَهُ الْعَبَّاسُ الْمِنْبَرَقَالَ عُمَرُ: اَللّٰهُمَّ اِنَّا تَوَجَّهْنَا اِلَيْكَ بِعَمِّ نَبِيِّكَ وَصِنْوُ اَبِيْهِ فَاسْقِنَا الْغَيْثَ وَلَا تَجْعَلْنَا مِنَ الْقَانِطِيْنَ ثُمَّ قَالَ: قُلْ يَااَبَاالْفَضْلِ فَقَالَ الْعَبَّاسُ: اَللّٰهُمَّ لَمْ يَنْزِلْ بَلَاءٌ'' اِلَّا بِذَنْبٍ وَلَمْ يُكْشَفْ اِلَّا بِتَوْبَةٍ فَقَدْ تَوَجَّهَ بِيَ الْقَوْمُ اِلَيْكَ لِمَكَانِيْ مِنْ نَبِيِّكَ (الحديث)

''اور حدیث ابو صالح میں ہے کہ جب حضرت عمر و حضرت عباس رضی اللہ عنہما منبر پر چڑھے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: اے اللہ! ہم تیری جناب میں تیرے نبی علیہ السلام کے چچا کو جو بجائے والد نبی کے ہیں' پیش کرتے ہیں تو ہمیں بارش عطا فرما اور ہمیں نا امید نہ کر۔ پھر حضرت عمر نے کہا: اے عباس! تم بھی دعا کرو۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے یوں دعا کی: اے اللہ! کوئی بلا نہیں اُتری مگر گناہ کے سبب سے اور نہیں دُور ہوئی مگر توبہ سے اور قوم نے اس لئے میرا وسیلہ پکڑا ہے کہ میرا تعلق تیرے نبی علیہ السلام سے ہے۔''

خود حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے بیان سے بھی صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہاں حقیقت میں آنحضرت ﷺ سے توسّل ہے۔ حافظ ابن عبدالبر الاستیعاب میں حضرت عباس بن عبدالمطلب کے حالات میں لکھتے ہیں:

وَرَوَيْنَا مِنْ وُجُوهٍ عَنْ عُمَرَ أَنَّهُ خَرَجَ يَسْتَسْقِي وَ خَرَجَ بِالْعَبَّاسِ فَقَالَ: اَللّٰهُمَّ إِنَّا نَتَقَرَّبُ إِلَيْكَ بِعَمِّ نَبِيِّكَ ﷺ وَنَتَشَفَّعُ بِهِ فَاحْفَظْ فِيهِ نَبِيَّكَ ﷺ كَمَا حَفِظْتَ الْغُلَامَيْنِ لِصَلَاحِ أَبِيهِمَا (الحدیث)

''حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ہمیں کئی وجوہ سے روایت پہنچی ہے کہ وہ اپنے ساتھ حضرت عباس کو لے کر نکلے اور عرض کیا: اے اللہ! ہم بوسیلہ تیرے نبی علیہ السلام کے چچا کے تیری جناب میں حاضر ہوئے ہیں اور انہیں اپنا شفیع بناتے ہیں۔ پس تو اس میں اپنے نبی ﷺ کی رعایت کر جیسا کہ تو نے ان دو یتیم بچوں کی رعایت ان کے باپ کی نیکی کے سبب کی (کہ ان کی گرتی دیوار کو سیدھا کھڑا کر دیا)۔'' ☆

''حضرت عباس میں آنحضرت ﷺ کی رعایت کا مطلب یہی ہے کہ قرابتِ نبوی کو ملحوظ رکھ کر بارش کی دعا کو شرفِ قبولیت عطا فرما۔ تاریخ کامل ابنِ اثیر میں بھی یہی مضمون تقریباً انہی الفاظ میں مذکور ہے۔''

''عمدۃ القاری میں یہ روایت بھی ہے کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جب مرتدین کے مقابلہ میں لشکرِ اسلام کو روانہ کیا تو آپ حضرت عباس کے ساتھ مشایعت کے واسطے شہر سے باہر نکلے اور کہا:

يَا عَبَّاسُ! اِسْتَنْصِرْ وَأَنَا اُومِنُ فَإِنِّي أَرْجُوا أَنْ لَّا يُخَيَّبَ دَعْوَتُكَ لِمَكَانِكَ مِنْ نَبِيِّ اللهِ ﷺ

''اے عباس! مدد کی دعا کرو اور میں آمین کہتا جاتا ہوں۔ کیونکہ مجھے امید ہے کہ تمہاری دعا بیکار نہ جائے گی بوجہ اس کے کہ تمہارا نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام سے تعلق ہے۔''

''خلاصہ کلام یہ کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو وسیلہ بنانا صرف قرابتِ نبوی کے سبب سے تھا اور یہ توسّل بالنبی ﷺ ہے۔ بایں ہمہ اگر تسلیم کر بھی لیا جائے کہ حدیث زیرِ بحث میں حضرت فاروقِ اعظم نے حضرت عباس کی ذاتِ خاص سے قرابتِ نبوی کے تعلق کے بغیر وسیلہ پکڑا ہے تو اس سے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذاتِ پاک سے وسیلہ پکڑنے کا انکار نہیں ملتا۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے وسیلہ ہونے اور حضور علیہ السلام کے ذریعہ سے دعا مانگنے کا ثبوت اسی حدیث میں موجود ہے۔ اب اس مطلق توسّل کو کہ عام ہے حالتِ حیات اور وفات سے 'مقید بحالتِ حیات کرنا اور حالتِ وفات کی نفی کرنا کس قاعدہ سے ہے اور دلالتِ اربعہ علم اصول (عبارۃ النص' اشارۃ النص' دلالۃ النص واقتضاء النص) میں سے کون سی دلالت اس نفیِ توسّل پر دلالت کرتی ہے؟ ہرگز کوئی دلالت نفیِ توسّل پر دلالت نہیں کرتی۔ یہ اجتہادِ بے بنیاد کسی علمی قاعدے پر مبنی نہیں کیونکہ اگر مثلاً ایک شخص میں ایک وصف پایا جائے تو وہ دوسرے شخص میں اس وصف کے نہ پائے جانے کی دلیل نہیں بن سکتا۔ پس اس صورت میں حدیث زیرِ بحث سے توسّل بالنبی ﷺ کے علاوہ اہل بیت و دیگر صلحائے امت سے توسّل کا جواز ثابت ہوتا ہے اور حضرت فاروقِ اعظم نے مختلف اوقات میں ہر دو طریق پر عمل کیا ہے۔''

☆ اشارہ ہے سورۃ الکہف (۱۸) کی آیت ۸۲ کی طرف۔

''یہاں نجدیہ کی طرف سے یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اس موقع پر صحابہ کرام نے رسول اللہ ﷺ (جو افضل ذریعہ ہیں) کو چھوڑ کر دوسرا وسیلہ کیوں اختیار کیا۔ اس کا جواب کئی طرح سے دیا جاتا ہے۔''

اوّلاً حافظ ابن عبد البر اَلاستیعاب (ترجمہ یعنی سوانح عباس بن عبد المطلب) میں یوں لکھتے ہیں :

قَالَ اَبُوْعُمَرَ وَ کَانَ سَبَبُ ذٰلِكَ أَنَّ الاَرْضَ اجْدِبَتْ اِجْدَابًا شَدِیْدًا عَلٰی عَهْدِ عُمَرَ زَمَنَ الرَّمَادَةِ وَذٰلِكَ سَنَةَ سَبْعَ عَشَرَةَ فَقَالَ کَعْبُ: یَا أَمِیْرَ الْمُؤْمِنِیْنَ! اِنَّ بَنِیْ اِسْرَائِیْلَ کَانُوا اِذَا أَصَابَهُمْ مِثْلَ هٰذا اِسْتَسْقَوْا لِعُصْبَةَ الاَنْبِیَاءِ فَقَالَ عُمَرُ: هٰذا عَمُّ رَسُوْلِ اللهِ ﷺ وَصِنْوُأَبِیْهِ وَ سَیِّدُ بَنِیْ هَاشِمٍ فَمَشٰی اِلَیْهِ عُمَرُ وَشَکَا اِلَیْهِ مَافِیْهِ النَّاسُ مِنَ الْقَحْطِ ثُمَّ صَعِدَالْمِنْبَرَ وَ مَعَه' عَبَّاس۔۔۔۔ الخ

''ابو عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اس کا سبب یہ تھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد میں عام الرمادۃ میں سخت خشک سالی تھی اور یہ سال ۱۷ ہجری کا تھا۔ حضرت کعب نے کہا: اے امیر المؤمنین! بنی اسرائیل میں جب ایسا قحط پڑتا تھا تو وہ پیغمبروں کی ایک جماعت کے وسیلہ سے بارش کی دعا کیا کرتے تھے۔ یہ سن کر حضرت عمر نے فرمایا: یہ رسول اللہ ﷺ کے چچا اور بمنزلہ والدِ نبی اور سید بنی ہاشم ہیں۔ پس حضرت عمر نے حضرت عباس سے قحط کی شکایت کی جس میں لوگ مبتلا تھے۔ پھر آپ منبر پر چڑھے اور آپ کے ساتھ حضرت عباس بھی تھے۔''

''پس یہاں بھی قرابتِ نبوی کی وجہ سے توسّل ہے جو توسّل بالنبی ﷺ ہے۔''

ثانیاً: علامہ ابن حجر ہیثمی مکی ''جوہر معظم'' کے صفحہ ۷۷ میں فرماتے ہیں :

''وَکَانَ حِکْمَةُ تَوَسُّلِهٖ بِهٖ دُوْنَ النَّبِیِّ ﷺ وَقَبْرِهٖ اِظْهَارُ غَایَةِ التَّوَاضُعِ لِنَفْسِهٖ وَالرِّفْعَةِ لِقَرَابَةِ النَّبِیِّ فَفِیْ تَوَسُّلِهٖ بِهٖ تَوَسُّلُ بِالنَّبِیِّ ﷺ وَ زِیَادَةٍ

''نبی ﷺ اور آپ کی قبر شریف کو چھوڑ کر حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے توسّل کرنے میں حکمت اپنی تواضع کا ظاہر کرنا اور قرابتِ نبوی کی رفعت کا اظہار تھا۔ پس حضرت عباس سے توسّل، توسّل بالنبی ﷺ ہے اور زیادت ہے۔''

ثالثاً: علامہ مولانا مشتاق احمد رحمۃ اللہ علیہ اپنے رسالہ ''دفع التامل عن التوسل بسید الرسل'' کے صفحہ ۱۷ میں یوں تحریر فرماتے ہیں :

''یہ علمِ کلام کا مسئلہ مسلّمہ ہے کہ ولی کی کرامت اس نبی کا معجزہ ہے جس کی امت میں وہ ولی ہے۔ یہ جو کرامت حضرت عباس سے اس موقع استسقاء پر ظاہر ہوئی ہے کہ اُن کی دعا سے مینہ برسا، یہ معجزہ رسول اکرم ﷺ کا ہوا۔ یہاں افضل ذریعہ کو صحابہ نے نہیں چھوڑا بلکہ اور زیادہ افضلیت کو جتلا دیا اور بتا دیا کہ

ہمارے پاس ایسا افضل ذریعہ ہے جس کے ادنیٰ غلاموں یا جس کے قرابت داروں کو وسیلہ بنانے سے خدا وند کریم دعا قبول فرما لیتا ہے۔''

اِن معترضین سے ہمارا سوال یہ ہے کہ ''تمہارا دعویٰ توسّل بالحدیث ہے اور حدیث صحیح میں وارد ہے کہ قیامت کے دن سب لوگ بغرضِ شفاعت دیگر انبیائے کرام علیہم السلام کے پاس یکے بعد دیگرے جائیں گے اور پھر آخر میں حضور سیّد المرسلین ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوں گے۔ شفاعتِ عظمیٰ کے بعد جو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے مختص ہے، علماء اور شہدائے امت بھی گنہگاروں کے لئے جو دوزخ میں ہوں گے، شفاعت فرمائیں گے۔ سوال یہ ہے کہ وہاں افضل ذریعہ چھوڑ کر دوسرے وسیلے کیوں اختیار کئے جائیں گے؟ اس حدیث سے تو ظاہر ہے کہ افضل ذریعہ کی موجودگی میں دیگر وسائل اختیار کرنا جائز ہے۔ غرض توسّل بالنبی ﷺ جائز، توسّل باہل البیت والصلحاء جائز۔ ایک وقت میں ہر دو معاً جائز اور مختلف اوقات میں علیحدہ علیحدہ بھی جائز ہیں۔'' (''سیرتِ رسولِ عربی ﷺ''۔ علامہ نور بخش توکلی، صفحات ۵۶۵ تا ۵۶۹)

نبی علیہ السلام کے توسّل سے آپ کی اُمت سے عذاب کا ٹل جانا: سورۃ الانفال کی آیت ۳۳ میں ربِّ ذوالجلال والاکرام نے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام سے یہ وعدہ فرمایا ہے:

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَأَنْتَ فِيهِمْ وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُونَ ○

''اللہ اُنہیں عذاب نہیں دے گا اس حال میں کہ آپ اُن میں موجود ہوں اور نہ اللہ اُن پر عذاب لانے کا ہے اس حال میں کہ وہ استغفار کر رہے ہوں۔'' (۳۳ : ۸)

اِس آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ ربُّ العزت نے اپنے محبوب علیہ الصلوٰۃ والسلام کی عظمت و رفعت کی خاطر اپنے آفاقی نظامِ سزا کو بدل دیا ہے۔ اُممِ سابقہ کی نافرمانیوں اور حد درجہ گناہوں کی وجہ سے اُن پر مختلف قسم کے عذاب بھیجے گئے اور وہ قہرِ الٰہی کے مورد قرار پائے۔ لیکن نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تشریف آوری پر رب تعالیٰ نے اپنے اس قاعدے اور ضابطے کو تبدیل کر دیا اور یہ حقیقت نبی علیہ السلام کے علوِ درجہ اور اُس مقامِ رفیع کی غماز ہے جو اُنہیں رب تعالیٰ کے حضور حاصل ہے۔ یہ آپ علیہ السلام ہی کی بدولت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نہ صرف مسلمانوں سے عذاب سے دست کشی کی بلکہ کافروں، یہودیوں اور عیسائیوں سے بھی درگزر کیا۔ عذاب سے یہ دست کشی کسی خاص وقت کے لئے محدود نہیں بلکہ آپ کی رسالت و نبوّت کا جزوِ لاینفک بن گئی ہے۔ جب تک آپ کی موجودگی بہ حیثیت پیغمبر اور فرستادۂ الٰہی اس خاکدانِ گیتی میں رہے گی، لوگوں پر عذاب نہیں آئے گا اور اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ آپ کی رسالت روزِ قیامت تک باقی رہے گی کیونکہ آپ کی ہم میں موجودگی (وَأَنْتَ فِيهِمْ) رحمتِ خداوندی میں بدل گئی۔ لہٰذا جب تک آپ ہم میں موجود ہیں، اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ ضمانت ہے کہ اُمّتِ مسلمہ ہر قسم کی سزا سے محفوظ رہے گی۔ اس طرح پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذاتِ ستودہ صفات عذابِ الٰہی کے نہ ہونے کا ایک نشان بن گئی ہے۔''
("Islamic Concept of Intermediation", pp. 166-167)

''نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے توسّل سے صحابہ کرام کی معافی : اس معافی کا تعلق جنگِ اُحد (۲ ھ) سے ہے۔ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے کچھ صحابہ کو ایک مخصوص درّے پر اس تاکیدی ہدایت کے ساتھ تعیّنات فرمایا کہ فتح وشکست کسی بھی صورت میں وہ اپنی جگہ نہ چھوڑیں۔ فتح کا نقشہ دیکھ کر اُن میں سے کچھ اپنے فرض کا خیال نہ کرتے ہوئے مالِ غنیمت کی طرف لپکے اور اپنی جگہ چھوڑ دی جس کے نتیجہ میں کفارِ مکّہ پشت کی جانب سے اُن پر جھپٹ پڑے جس سے مسلمان ہراساں ہو گئے اور اُن کی صفوں میں بھگدڑ پڑ گئی۔ دشمن کے غیر متوقع حملے کی وجہ سے کچھ صحابہ نے جامِ شہادت نوش کیا۔ نبی اکرم ﷺ نے منتشر صحابہ کو آواز دی اور اپنے ترغیبانہ خطاب سے اُن میں جذبہ جہاد اُبھارا جس سے وہ دشمن کے ساتھ بے جگری سے لڑے اور اُنہیں رسوا کن شکستِ فاش دی۔ اس سے اگلے دن جنگِ اُحد سے واپسی پر نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اُنہیں کہا کہ وہ ایک اور جنگ کے لئے تیار رہیں۔ اگرچہ صحابہ کرام زخموں سے چُور تھے اور سخت جانکاہیوں کی وجہ سے تھک چکے تھے لیکن وہ ماتھے پر کوئی شکن نہیں لائے اور حکمِ رسول ﷺ کو بہ طیبِ خاطر بجالائے۔ اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول ﷺ نے اُن کے جذبہ قربانی کو سراہا اور رب تعالیٰ نے اُن کی کوتاہیوں کو معاف کر دیا مثلاً (۱) مالِ غنیمت کی خاطر اُن کا درّے کو چھوڑ دینے کی غلطی (۲) اپنے رسول علیہ السلام کو میدانِ کارزار میں تن تنہا اور غیر محفوظ چھوڑ دینے کی کوتاہی جو مسلمان فوج کے بھاری نقصان کا سبب بنی اور جس سے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا چہرہ انور بھی زخمی ہوا۔ بلاشک وشبہ یہ جرمِ عظیم تھا لیکن جنگِ اُحد کے بعد ایک اور جنگ کے لئے اُن کی مستعدی' جذبہِ جہاد سے سرشاری اور جذبہ شہادت وقربانی کے لئے اُن کے شوق نے دریائے رحمتِ الٰہی کو جوش دلایا اور رب تعالیٰ نے اپنے محبوب علیہ السلام کو یوں حکم فرمایا :

فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ (آلِ عمران : ۱۵۹)

''آپ اُن سے درگزر فرمایئے اور اُن کی بخشش کی دعا کیجئے۔'' (۱۵۹ : ۳)

یہ آیت اس بات میں بالکل واضح ہے کہ صحابہ کرام کو معافی کی سند نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے توسّل کے بغیر جاری نہیں کی جاسکتی اور یہاں جس نکتے پر زور دینا مقصود ہے' وہ ''تقلیبِ استحقاق'' (Reversal of Priority) ہے (تقلیب بمعنی پلٹنا)۔ اللہ ربّ العزت اپنی مخلوق کا مالک ومختار ہے اور اِسی مختار ہونے کے ناطے سے وہ معافی اور درگزر کرنے کا بھی بلاشرکتِ غیرے خود مالک ہے جبکہ نبی ﷺ اُس کی مخلوق ہے اور ہر معاملے میں اُسی کی محتاج ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کی محبت اور دلجوئی کی خاطر ''تقلیبِ استحقاق'' کر دیا۔ مالک وآقا بخشنا اور درگزر کرنا چاہتا ہے اور اُس ذات کو کہتا ہے جو اُسی کی محتاج اور اُسی کی دست نگر ہے: ''اے میرے محبوب! میں آپ کے ساتھیوں کو بخشنا چاہتا ہوں لیکن پہلے آپ اُنہیں معاف کیجئے اور پھر مجھ سے اُن کی معافی کی درخواست کیجئے تاکہ آپ کی سفارش میں میں اُنہیں معاف کروں۔ اِس حقیقت کو احمد رضا خاں نے شاعرانہ رنگ دیا ہے اور بیان کیا ہے کہ خالق مالک ومختار ہونے کی حیثیت سے اپنی مخلوق (یعنی نبی) کو کس خصوصی اعزاز سے نواز رہا ہے کہ اُن کی مرضی کو اپنی مرضی پر ترجیح دے رہا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہاں مالک کی مرضی اُس کے بندے کی مرضی پر منحصر ہے جس نے توقع کے عمومی انداز کو تہ وبالا کر کے رکھ دیا ہے جہاں تیرے میرے' محبّ ومحبوب اور آقا اور بندے میں کوئی فرق ہی نہیں رہا۔ اگرچہ مخلوق کے مقام کا موازنہ اُس خالق کے مقام سے کرنا ناممکن ہے جو تمام جہانوں کا مالک ہے' تاہم اس

قرآنی آیت میں خود خدائے قدوس نے موازنہ کے عنصر کو ازادتاً ظاہر کر دیا ہے اور رضا کارانہ دستبرداری کے عمل کے ذریعے وہ اپنی مخلوق (یعنی نبی) کے مقام کو رفعت وعظمت کی غیر معمولی بلندیوں تک لے جا رہا ہے جس میں درجے کی تشریفات (Protocol of Grade) کی بجائے محبت کی تشریفات شامل ہیں۔ اُس نے نہ صرف ''تیرے میرے'' کے فرق کو ختم کر دیا ہے بلکہ وہ اپنی مخلوق کی رضا کو اپنی رضا پر فوقیت دے رہا ہے۔ اگر رب تعالیٰ کو اپنی ذات اور اپنی مخلوق کے درمیان فرق باقی رکھنا ہوتا تو وہ بخشش کو اپنی مخلوق (نبی) کی رضا کے ساتھ مشروط نہ کرتا۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ مخلوق (معاذ اللہ) خالق کے مقام میں بدل گئی ہے یا افضلیت میں اُس سے سبقت لے گئی ہے بلکہ اس سے مخلوق کے اُس استثنائی مقام کا پتہ چلتا ہے جو اُسے اپنے خالق کی جانب سے عطا ہوا ہے۔ یہ حقیقت مخلوق اور خالق کے درمیان ہر قسم کے فرق کو ختم کر دیتی ہے کیونکہ دونوں ہی محبت کے رشتہ میں جُڑے ہوئے ہیں نہ کہ مرتبے اور مقام میں۔'' (ایضاً صفحات ۱۷۳ تا ۱۷۶)

''<u>حینِ حیات میں اور بعد از وفات آپ کے توسّل سے نوازشاتِ الٰہی</u>: سورۃ الاسراء کی آیت ۲۰ میں ارشادِ باری تعالیٰ ہوا:

كُلًّا نُّمِدُّ هٰؤُلَاءِ وَهٰؤُلَاءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا ۝

''آپ کے پروردگار کی بخشش میں سے ہم ہر ایک کی امداد کرتے ہیں، اِن کی بھی اور اُن کی بھی اور آپ کے پروردگار کی بخشش (کسی پر) بند نہیں۔'' (۱۷ : ۲۰)

''اس قرآنی آیت میں کَ کی ضمیر کا انتخاب بالکل نمایاں ہے۔ آیت میں ''اُن کا پروردگار'' نہیں کہا گیا بلکہ اس کے برعکس ''آپ کا پروردگار'' کہا گیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ تمام انعامات ونوازشات اللہ ہی کی جانب سے ہیں لیکن ''آپ کا پروردگار'' کی ترتیب وتنظیم توجہ کو اللہ کی بجائے رسول کی جانب اور خالق کی بجائے مخلوق کی جانب منعطف کرتی ہے یعنی کَ کی ضمیر کے تعین سے اللہ رب العزت نے قصداً اور تاکیداً اپنے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مرتبہ اور مقام کو اپنی تمام مخلوقات سے بلند تر کر دیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو بھی مخلوق اس دنیا میں حاصل کر رہی ہے، وہ نبی اکرم ﷺ کی وساطت سے حاصل کر رہی ہے اور حاصل کرنے کا یہ عمل لامتناہی اور ختم نہ ہونے والا ہے یعنی جب تک آپ ﷺ حیات ہیں، مخلوقات نوازشاتِ الٰہی حاصل کرتی رہیں گی جو نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی وساطت سے اُنہیں ملتی رہیں گی۔''

''یہاں نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مرتبہ اور مقام کو اجاگر کرنا مقصود ہے اور اس حقیقت کو آشکار کرنا ہے کہ اگرچہ تمام نوازشات کا منبع ومصدر رب تعالیٰ کی ذات ہے لیکن یہ نوازشات اُنہیں اُس کے محبوب علیہ السلام کے توسط سے ملتی ہیں۔ لہٰذا یہ آیت نبی علیہ السلام کے استثنائی رفعتِ مقام کی مظہر ہے۔''

''یہی ہمارا عقیدہ ہے جو صداقت ویقین پر مبنی ہے۔ آیت میں رَبِّکَ کا لفظ بھی اس حقیقت کی نقاب کشائی کر

رہا ہے کہ خالق و مالک کا محبوب پیغمبر بھی بے مثل و بے نظیر ہے۔ مخلوقات میں آپ کا مقام نمایاں ہے کیونکہ آپ ﷺ مظہرِ صفاتِ الٰہی ہیں۔ پھر لفظ رَبِّكَ میں یہ لطیف نکتہ بھی ہے کہ اگر چہ میں تمام مخلوقات کا رب ہوں اور سب میرا ہی دیا کھاتے ہیں۔ ابوبکر صدّیق کا بھی اُسی طرح رب ہوں جس طرح ابوجہل کا رب ہوں' بلالِ حبشی کا بھی اُسی طرح رب ہوں جس طرح اُمیہ بن خلف کا رب ہوں' اپنے محبوب علیہ السلام کا بھی رب ہوں لیکن جو مزا اور لطف مجھے اپنے محبوب کے رب ہونے میں ہے' وہ کسی اور کے رب ہونے میں نہیں!'' (ایضاً صفحات ۱۹۷ تا ۲۰۰ ؛ ۲۰۲'۲۰۳)

نبی کے تبرکات سے توسّل : یہ حقیقت ہے کہ نیک و پارسا ہستیوں سے متعلق اشیاء عطیہ وفیاضی کا چھلکتا ہوا سرچشمہ ہوا کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ ﷺ کے تبرکات کو محفوظ رکھنا اور اُن سے فائدہ حاصل کرنا صحابہ کرام کی عام عادت تھی اور یہ حقیقت اس بات کو ثابت کرتی ہے کہ وہ اِن تبرکات کو اللہ کی مدد کی ضرورت کے وقت اللہ کے حضور پیش کیا کرتے تھے۔ قرآن مجید میں خود رب تعالیٰ نے پیغمبروں کے تبرکات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ مثلاً ذیل کی آیت اُس انداز کو ظاہر کرتی ہے جس میں بنی اسرائیل نے حضرات موسیٰ و ہارون علیہما السلام کے تبرکات کو دیکھا:

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ آيَةَ مُلْكِهِ أَنْ يَأْتِيَكُمُ التَّابُوتُ فِيهِ سَكِينَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ مُوسٰى وَآلُ هٰرُوْنَ تَحْمِلُهُ الْمَلَآئِكَةُ إِنَّ فِي ذٰلِكَ لَآيَةً لَّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ O (البقرة:۲۴۸)

''اور اُن کے نبی نے اُن سے کہا کہ اُس کی سرداری کا نشان یہ ہے کہ تمہارے پاس وہ صندوق (از خود) آجائے گا جس میں تمہارے پروردگار کی طرف سے (سامان) تسکین ہے اور کچھ بچی ہوئی چیزیں بھی جنہیں آلِ موسیٰ اور آلِ ہارون چھوڑ گئے ہیں' اس صندوق کو فرشتے لے آئیں گے۔ بے شک اُس واقعہ میں تمہارے لئے ایک نشان ہے اگر تم ایمان والے ہو۔'' (۲۴۸ : ۲)

سورہ یوسف میں رب تعالیٰ نے ایک معجزاتی واقعہ بیان کیا ہے جس میں یعقوب علیہ السلام اپنے لڑکے یوسف علیہ السلام کے پیرہن سے مستفید ہوتے نظر آتے ہیں۔ یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں سے کہا:

اِذْهَبُوْا بِقَمِيْصِيْ هٰذَا فَأَلْقُوْهُ عَلٰى وَجْهِ أَبِيْ يَأْتِ بَصِيْرًا --- فَلَمَّا أَنْ جَآءَ الْبَشِيْرُ أَلْقَاهُ عَلٰى وَجْهِهٖ فَارْتَدَّ بَصِيْرًا (یوسف: ۹۳' ۹۶)

''تم میرے اس پیرہن کو لے جاؤ اور اُسے میرے والد کے چہرے پر ڈال دو' اُن کی آنکھیں روشن ہو جائیں گی۔ --- پھر جب خوشخبری لانے والا آ پہنچا تو اُس نے وہ پیرہن آپ کے چہرہ پر ڈال دیا تو آپ کی آنکھیں روشن ہو گئیں۔'' (۱۲:۹۶'۹۳)

کتبِ حدیث کا مطالعہ کرنے سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کرام نبی علیہ السلام کے تبرکات سے فیض حاصل کیا کرتے تھے۔ صحابہ کرام کے بعد ہر آنے والی نسل بہ شمول خلفاء' بادشاہان اور مذہبی پیشوایان نے آپ ﷺ کی نشانیوں اور تبرکات کو محفوظ رکھا۔ مخصوص دنوں میں مسلمانوں کو اُن کی زیارت کرنے' اُن سے فیض حاصل کرنے اور اُن کے توسّل سے اللہ سے دعا کرنے کی اجازت دی گئی۔ صحابہ کرام کے پاس آپ کے کچھ تبرکات محفوظ تھے جن میں

بعض کا نہ صرف ذکر ذیل میں کیا جاتا ہے بلکہ اس طریق کو بھی مختصراً بیان کیا جاتا ہے جس طرح وہ اُنہیں استعمال میں لاتے تھے:۔

''(۱) نبی علیہ السلام کے قرب میں دفن ہونے کی آرزو: سیّدنا عمر ابن الخطاب رضی اللہ عنہ کی شدید خواہش تھی کہ اُنہیں نبی علیہ السلام کے مزارِ اقدس کے قرب میں دفن کیا جائے۔ وقتِ آخر میں اُنہوں نے اپنے فرزند عبداللہ سے کہا کہ وہ اُمّ المومنین سیّدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے اجازت طلب کریں کیونکہ وہ جگہ اُنہوں نے اپنے لئے مخصوص کی ہوئی تھی۔ جناب عمر کی درخواست پر سیدہ نے فرمایا: اس جگہ کو میں اپنے لئے مخصوص کرنا چاہتی تھی لیکن اب میں عمر کی خواہش کو اپنی خواہش پر ترجیح دیتی ہوں۔ جناب عبداللہ نے واپس آکر یہ خوشخبری اپنے والد کو سنائی جس پر جناب عمر نے فرمایا: الحمد للہ! یہ بات میرے لئے بہت ہی خوش آئند ہے۔'' (صحیح بخاری: کتاب الجنائز و کتاب فضائل الصحابہ)

''سیّدنا عمر و سیّدہ عائشہ رضی اللہ عنہما دونوں کی خواہش کا مقصد یہی تھا کہ وہ دونوں نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے قرب میں دفن ہو کر آپ ﷺ کے توسّل سے فیوض و برکاتِ الٰہی حاصل کرنا چاہتے تھے۔''

''(۲) پانی کی چھوٹی سی چرمی تھیلی -- تبرک کا ذریعہ: عبدالرحمٰن بن ابو عمرہ نے اس روایت کو اپنی دادی کی طرف منسوب کیا ہے جنہوں نے اسے کبشہ انصاریہ سے سنا:

اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ دَخَلَ عَلَیْهَا وَعِنْدَهَا قِرْبَة'' مُّعَلَّقَة ''فَشَرِبَ مِنْهَا وَهُوَقَائِم'' فَقَطَعَتْ فَمَ الْقِرْبَةِ تَبْتَغِی بَرَكَةَ مَوْضِعِ فِیِّ رَسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ (سنن ابن ماجه: كتاب الاشربة ؛ جامع ترمذی: كتاب الاشربة ؛ مسند احمد بن حنبل (۶:۴۳۴) ؛ المعجم الكبير والمعجم الاوسط لطبرانی ؛ صحیح ابن حبان (۱۲:۱۳۸#۵۳۱۸، ۱۳۹)

''اللہ کے رسول ﷺ اُن کے پاس آئے اور وہاں پانی کی ایک چھوٹی سی چرمی تھیلی لٹک رہی تھی۔ آپ نے اُس سے کھڑے ہو کر پانی پیا۔ پھر کبشہ انصاریہ نے اُس تھیلی کا منہ اُس کی برکت کی وجہ سے کاٹ کے اپنے پاس رکھ لیا کیونکہ نبی علیہ السلام کا منہ مبارک اس سے مَس ہوا تھا۔''

اسی طرح کی ایک اور حدیث حضرت اَنس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اُمّ سُلیم رضی اللہ عنہا نے پانی کی اُس تھیلی کا منہ کاٹ کر اپنے پاس رکھ لیا تھا جس سے نبی علیہ السلام نے پانی پیا تھا۔ (مسند احمد بن حنبل ؛ ترمذی: شمائل المحمدیہ؛ مسند ابو داؤد؛ المعجم الکبیر والمعجم الاوسط لطبرانی)

''نبی علیہ السلام کے پیرہن کے توسّل سے شفا: سیّدہ اسماء بنتِ ابی بکر رضی اللہ عنہا کے آزاد کردہ غلام عبداللہ سے مروی ہے:

''اسماء بنتِ ابی بکر نے اُس پیرہن کو اپنے قبضہ میں لے لیا جو قصروانی کا تھا۔ اس کے کالر اور کترنیں ریشمی کپڑے کی تھیں۔ سیّدہ اسماء نے کہا کہ یہ حضرت عائشہ کے قبضہ میں تھا۔ اُن کی وفات پر میں نے اسے لے

لیا اور حضور علیہ السلام اُسے پہنا کرتے تھے۔ مریض کے علاج اور شِفا کے لئے ہم اُس کا دھووَن اُسے پلایا کرتے تھے۔'' (صحیح مسلم: کتاب اللباس والزینۃ؛ سنن ابی داوٗد: کتاب اللباس ؛ سنن ابن ماجہ: کتاب اللباس ؛ مسند احمد بن حنبل؛ الطبقات الکبریٰ لابن سعد)

امام نووی نے اس حدیث پر یوں تبصرہ کیا ہے :

وَفِیْ ھٰذَاالْحَدِیْثِ دَلِیْل'' عَلٰی اسْتِحْبَابِ التَّبَرُّکِ بِآثَارِ الصَّالِحِیْنَ وَثِیَابِھِمْ

''اس حدیث میں صالحین کی باقیات اور اُن کے لباس سے تبرّک حاصل کرنے کے مستحب ہونے کا ثبوت ہے۔''

''نبی علیہ السلام کے نعلین پاک سے حصولِ تبرک : امام قسطلانی نے ابو جعفر بن عبد المجید سے روایت کرتے ہوئے لکھا ہے :

''میں نے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے نعلین پاک کا ایک نمونہ اپنے ایک طالبعلم کو دیا۔ ایک دن وہ میرے پاس آیا اور کہا: کل میں نے نعلین پاک میں ایک عجیب برکت دیکھی۔ میری اہلیہ شدید درد کی وجہ سے مرنے کے قریب تھی۔ میں نے دکھتی جگہ پر نعلین پاک کو رکھا اور کہا: اے اللہ! مجھے ان نعلینِ پاک کے مالک کی جانب سے کوئی معجزہ دکھا دیجئے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رحمت کی برکھا کی اور میری اہلیہ فوراً رُو بہ صحت ہوگئی۔

نوٹ: یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ علمائے دیوبند نے حضور علیہ السلام کے نعلین پاک کی بابت کتابیں لکھی ہیں جن میں سے کچھ کا ذکر ذیل میں کیا جاتا ہے:۔

(۱) مولانا شہاب الدین احمد مقری : فَتْحِ المَوتٰی
(۲) مولانا اشرف علی تھانوی : نَیْلُ الشفاء بِنِعالِ المُصطفٰی۔
(یہ مضمون اُن کی کتاب ''زادالسعید'' کا ایک جزء ہے۔)

مولانا محمد زکریا کاندھلوی اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے نعلین پاک کی خوبیاں اور برکتیں مولانا اشرف علی تھانوی کی کتاب ''زاد السعید'' کے آخر میں دی گئی ہیں۔ تفصیل معلوم کرنے کے لئے اُس کتاب کی طرف رجوع کیا جا سکتا ہے۔ الغرض آپ کے نعلین پاک کی برکتیں لاتناہی ہیں۔ علماء نے بار بار کے متعدد تجربات کئے ہیں۔ اگر آپ اُنہیں اپنے پاس رکھیں تو آپ کو خود نبی علیہ السلام نظر آجائیں گے' ظالموں کے چنگل سے آپ کو نجات مل جائے گی اور ہر دلعزیزی حاصل ہوگی۔ مختصر یہ کہ نعلین پاک کو توسّل کا ذریعہ بنانا کامیابی کی غیر متزلزل ضمانت ہے۔ توسّل کا طریقہ بھی کتاب مذکور میں بیان کیا گیا ہے۔'' (''شمائل ترمذی'' مع اردو تبصرہ بہ عنوان ''خصائلِ نبوی'' بحوالہ پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری' صفحہ ۲۶۹)

اس بحث میں اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ اصل سرمایہِ حیات نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام سے گہری اور اتھاہ محبت اور اُن اشیاء اور تبرکات کا مستقل اور نا قابلِ انقطاع احترام و تعظیم ہے جو آپ ﷺ سے براہِ راست یا بالواسطہ متعلق ہیں۔

''جامِ مقدّس سے تبرک کا حصول: (۱) ابو بُردۃ کا بیان ہے:
قَالَ لِیْ عَبْدُ اللّٰہِ بْنُ سَلَّام: اَلَا أُسْقِیْكَ فِیْ قَدَحٍ شَرِبَ النَّبِیُّ ﷺ فِیْهِ؟
''مجھے عبداللہ بن سلام نے کہا: کیا میں تجھے اُس پیالے میں پانی نہ پلاؤں جس سے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام پیا کرتے تھے؟'' (صحیح بخاری: کتاب الاشربۃ)

(۲) ''حجاج بن حسن روایت کرتے ہیں کہ حضرت اَنس رضی اللہ عنہ کے حکم سے ہمارے لئے ایک برتن میں پانی لایا گیا۔ ہم نے اُس میں سے کچھ پیا اور کچھ اپنے سروں اور چہروں پر مَلا اور نبی اکرم ﷺ پر درود و سلام پڑھا۔'' (مسند احمد بن حنبل ۳:۱۸۷ ؛ البدایۃ والنھایۃ لابن کثیر ۴:۳۷۰ بحوالہ ڈاکٹر طاہر القادری)

(۳) ''جب نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا جام چٹخ گیا تو حضرت اَنس نے کسی عام چیز سے مرمت کرنے کی بجائے چاندی کی ایک تار سے اُس کی مرمت کر دی۔ راوی عاصم کا بیان ہے میں نے اُس جام کو خود دیکھا ہے اور اس میں سے پانی پیا ہے۔'' (صحیح بخاری: کتاب الخمس ؛ البدایۃ والنھایۃ لابن کثیر ۴:۳۶۹ بحوالہ ڈاکٹر طاہر القادری)

آپ کے موئے مبارک سے توسّل: نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے خود اپنے صحابہ کو تعلیم دی کہ وہ آپ کے تبرکات کو محفوظ رکھیں اور اُن میں عملی طور پر اس شعور اور آگاہی کو بیدار کیا کہ وہ آپ ﷺ کے تبرکات کو حاصل کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیں۔

(۱) ''حضرت اَنس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ مناسکِ حج ادا کرنے اور قربانی کرنے کے بعد نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حجام کے آگے اپنے سرِ اقدس کی دائیں جانب کی اور اُس نے آپ کا سر مونڈ دیا۔ آپ نے حضرت طلحہ انصاری رضی اللہ عنہ کو بلایا اور اُنہیں مونڈے ہوئے بال پکڑا دئے۔ پھر آپ نے حجام کے آگے سرِ اقدس کی دوسری (بائیں) جانب کی جس کے بال حجام نے مونڈ دئے۔ آپ نے وہ بال بھی جنابِ طلحہ کے سپرد کر دئے اور اُنہیں فرمایا کہ انہیں لوگوں میں تقسیم کر دو۔'' (صحیح مسلم: کتاب الحج ؛ سنن ابی داوٴد: کتاب المناسک ؛ جامع ترمذی ؛ کتاب الحج ؛ مسند احمد بن حنبل: (۱۱۱، ۲۰۸، ۲۱۴: ۳) ؛ شرح السنہ للبغوی ؛ صحیح ابن خزیمہ ۲۹۲۸# ۴:۲۹۹ مسند حُمیدی ۱۲۲۰# ۲:۵۱۲)

(۲) ابن سیرین حضرت اَنس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہوئے بیان کرتے ہیں:
اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ لَمَّا حَلَقَ رَاْسَہٗ، کَانَ اَبُوْطَلْحَۃَ أَوَّلَ مَنْ أَخَذَ شَعْرَہٗ،

''جب رسول اللہ ﷺ اپنا سرِ اقدس منڈواتے تو جناب ابوطلحہ سب سے پہلے بڑھ کر آپ کے بالوں کو لے لیتے۔'' (صحیح بخاری: کتاب الوضوء)

(۳) اسی طرح کی ایک اور حدیث بھی حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ فرماتے ہیں:
لَقَدْ رَأَیْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ وَالْحَلَّاقُ یَحْلِقُہ' وَأَطَافَ بِہٖ اَصْحَابُہ' فَمَا یُرِیْدُوْنَ أَنْ تَقَعَ شَعْرَۃٌ اِلَّا فِیْ یَدِ رَجُلٍ (صحیح مسلم: کتاب الفضائل ؛الطبقات الکبریٰ لابن سعد ؛ السنن الکبریٰ لبیہقی (۷: ۶۸) ؛ البدایۃ والنہایۃ لابن کثیر (۴:۱۴۰)
''میں نے ایک حجام کو رسول اللہ ﷺ کے موئے مبارک مونڈتے دیکھا اس حال میں کہ آپ کے صحابہ آپ کے گرد دائروی شکل میں کھڑے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ موئے مبارک کا کوئی ریشہ زمین پر نہ گرنے پائے بلکہ اُن میں سے کسی نہ کسی کے ہاتھ میں آجائے۔''

(۴) ''ابن سیرین بیان کرتے ہیں کہ میں نے عابدہ کو بتایا کہ ہمارے پاس رسول اللہ ﷺ کے موئے مبارک ہیں جنہیں میں نے حضرت انس سے یا اُن کے گھر والوں سے حاصل کیا ہے۔ عابدہ نے کہا: اگر میرے پاس آپ کا کوئی موئے مبارک ہوتا تو میں اُسے دنیا و مافیہا کی ہر چیز سے زیادہ پیارا اور عزیز رکھتی۔'' (صحیح بخاری: کتاب الوضوء ۱۶۸#۱:۷۵)

(۵) ثابت البنانی بیان کرتے ہیں کہ حضرت انس نے اُنہیں کہا کہ یہ موئے مبارک رسول اللہ ﷺ کا ہے، تم اُسے میری زبان کے نیچے رکھ دو۔ ثابت کہتے ہیں کہ وہ موئے مبارک جنابِ انس کی زبان کے نیچے رکھ دیا گیا اور آپ کی تدفین کے وقت وہ موئے مبارک آپ کی زبان کے نیچے ہی تھا۔'' (الاصابہ فی تمییز الصحابہ لحافظ ابن حجر عسقلانی ۱:۷۱)

(۶) ''بدرالدین عینی بیان کرتے ہیں کہ اُمّ سلمیٰ نے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے موئے مبارک چاندی کی ایک بوتل میں رکھے ہوئے تھے۔ جب لوگ بیمار ہوتے تو وہ اُن بالوں سے تبرک حاصل کرتے جس کے نتیجے میں وہ بیماری سے شفایاب ہو جاتے۔ اگر کوئی کسی کی نظرِ بد کا شکار ہوتا یا بیمار پڑ جاتا تو وہ اپنی اہلیہ کو پانی سے بھرا ہوا ایک برتن دے کر اُمّ سلمیٰ کے ہاں بھیجتا۔ اُمّ سلمیٰ اُن بالوں کو پانی میں سے گزارتیں اور اُس پانی کے پینے سے مریض تندرست ہو جاتا۔ بعدہ' اُن بالوں کو واپس بوتل میں رکھ دیا جاتا۔'' (''عمدۃ القاری'' لبدرالدین عینی)

<u>نبی ﷺ کے موئے مبارک کے توسّل سے جنگ میں فتح</u>: قاضی عیاض ''الشفاء'' میں لکھتے ہیں:
''خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی ٹوپی میں رسول اللہ ﷺ کے کچھ موئے مبارک تھے۔ ایک جنگ میں آپ کی وہ ٹوپی گر گئی تو آپ اُسے لینے کے لئے لپکے۔ جب اس جنگ میں صحابہ کی ایک کثیر تعداد نے جام شہادت نوش کیا تو

لوگوں نے آپ کو اس (نقصان) کا موردِ الزام ٹھہرایا۔ اس پر آپ نے جواب دیا: میں نے صرف ٹوپی کی خاطر جہاد میں اپنی کوشش کو نہیں چھوڑا کیونکہ ٹوپی میں نبی ﷺ کے کچھ موئے مبارک تھے۔ مجھے خوف ہوا کہ اگر وہ کفار کے ہاتھ لگ گئے تو میں کہیں اُن کی برکت سے محروم نہ ہو جاؤں۔''

''نبی اکرم ﷺ کے لباس سے کفن بنانا: (۱) جب سیّدنا علی کرّم اللہ وجہہ' کی والدہ ماجدہ جناب فاطمہ بنتِ اسد وفات پا گئیں تو اُن کے جنازہ کی رسوم نہایت محتاط طریق سے ادا کی گئیں۔ غسل دینے کے بعد جب اُنہیں قمیص پہنانے کا وقت آیا تو نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنی قمیص مبارک عورتوں کو دی اور انہیں کہا کہ وہ یہ قمیص انہیں پہنائیں اور پھر کفن کو اس کے گرد لپیٹ دیں۔'' (المعجم الکبیر للطبرانی ۸۷۱#۲۔۳۵۱:۲۴ ؛ المعجم الاوسط ؛الاستیعاب فی معرفة الاصحاب لابن عبدالبر (۴:۳۸۲) ؛ حِلیة الاولیاء و طبقات الاصفیاء (۳:۱۲۱) ؛ العِلل المتناهية لابن الجوزی ؛ اسد الغابه لابن اثیر (۷:۲۱۳) ؛ وفاء الوفاء لسمهودی؛ الاصابة فی تمییز الصحابه (۴:۳۸۰) بحوالہ ڈاکٹر طاہر القادری صفحہ ۲۷۷)

(۲) ''جب نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی صاحبزادی زینب یا اُمِّ کلثوم وفات پا گئیں تو آپ نے کفن کو لپیٹنے کے لئے اپنا کمر پٹکا بطورِ تبرک اُنہیں عطا کیا۔'' (صحیح بخاری: کتاب الجنائز ؛ صحیح مسلم: کتاب الجنائز ؛ سنن ابی داؤد: کتاب الجنائز ؛ سنن نسائی: کتاب الجنائز ؛ جامع ترمذی: کتاب الجنائز ؛ سنن ابن ماجہ: کتاب الجنائز ؛ مؤطا امام مالک بن انس: کتاب الجنائز؛ مسند احمد بن حنبل (۵:۸۴،۶:۴۰۷) ؛ مسند حُمیدی ؛ صحیح ابن حبان؛ المعجم الکبیر للطبرانی بحوالہ ڈاکٹر پروفیسر طاہر القادری' صفحہ ۲۷۷)

(۳) ''ایک عورت نے نبی اکرم ﷺ کو ایک شال پیش کی۔ جب آپ نے اُسے زیبِ تن کر لیا تو کسی نے آپ سے کہا: اے اللہ کے رسول! یہ کتنی ہی خوبصورت ہے۔ ازراہِ کرم یہ مجھے عنایت کر دیجئے اور آپ نے وہ اُسے دے دی۔ ناظرین یہ دیکھ کر ناخوش ہوئے اور اُس آدمی کو ملامت کرنے لگے اور کہنے لگے کہ جب تمہیں معلوم ہے کہ آپ ﷺ کسی کی درخواست کو ردّ نہیں کرتے تو تم نے اِس شال کو لینے کی درخواست کیوں کی؟ اُس آدمی نے جواب دیا کہ میں نے اِسے پہننے کے لئے نہیں لیا بلکہ اس لئے لیا ہے کہ اس سے اپنا کفن بناؤں اور اس سے تبرّک پاؤں۔'' (صحیح بخاری: کتاب الادب و کتاب الجنائز و کتاب البیوع و کتاب اللباس ؛ سنن ابن ماجہ: کتاب اللباس؛ مسند احمد بن حنبل (۵:۳۳۴۔۴:۳۳۳) ؛ الطبقات الکبریٰ لابن سعد ۱:۴۵۴ بحوالہ ڈاکٹر طاہر القادری ص ۲۷۰)

(۴) حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

اَتَی النَّبِیُّ ﷺ عَبْدَاللّٰہِ بْنِ اُبَیِّ بَعْدَ مَا دُفِنَ فَأَخْرَجَہ' فَنَفَثَ فِیْہِ مِنْ رِّیْقِہٖ وَاَلْبَسَہ' قَمِیْصَہ'

''عبداللہ بن اُبی (منافق) کی تدفین کے بعد نبی اکرم ﷺ تشریف لائے۔ آپ نے میّت کو باہر نکالا' اپنا لعابِ دہن اُس کے منہ میں ڈالا اور اُسے اپنی قمیص میں کفنایا۔'' (صحیح بخاری: کتاب الجنائز: مسند احمد بن حنبل (۳:۳۷۱)

(۵) ''جب عبداللہ بن سعد بن سفیان رضی اللہ عنہ نے غزوہ تبوک میں جامِ شہادت نوش کیا تو نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اُنہیں اپنی قمیص میں کفنایا۔'' (اسد الغابہ لابن اثیر ۳:۲۶۲؛ الاصابہ فی تمیز الصحابہ لحافظ ابن حجر العسقلانی (۲:۳۳۶) بحوالہ ڈاکٹر پروفیسر طاہر القادری' صفحہ ۲۸۱)

(۶) ''جب عبداللہ بن حارث بن عبدالمطلب وفات پا گئے تو نبی اکرم ﷺ نے اُنہیں اپنی قمیص میں کفنا کر دفن کیا اور فرمایا کہ وہ خوش نصیب ہے کہ اُس نے اس قمیص سے تبرک حاصل کیا ہے۔'' (الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب لابن عبدالبر (۲:۲۷۹)؛ اسد الغابہ لابن الاثیر؛ الاصابہ فی تمیز الصحابہ لابن حجر العسقلانی (۲:۲۹۲)

لعابِ نبوی سے حصولِ تبرک: (۱) صلح حُدیبیہ کے موقع پر جب کفارِ مکہ اور مسلمانوں کے درمیان گفت وشنید ہو رہی تھی' عروہ بن مسعود (جو اُس وقت تک ایمان نہیں لائے تھے) کفار کی نمائندگی کر رہے تھے۔ اس موقع پر عُروہ نے صحابہ کی نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ والہانہ وابستگی اور دل بستگی کا براہِ راست مشاہدہ کیا اور جب وہ اپنے کیمپ کو لوٹا تو اُس نے اپنی کفار برادری سے یوں کہا:

''لوگو! میں شاہی درباروں میں بھی گیا ہوں اور قیصر و کسریٰ اور نجاشی کے درباروں کے جاہ وحشمت کو بھی دیکھا ہے لیکن بخدا! میں نے کبھی کسی ایسے بادشاہ کو نہیں دیکھا جس کی اس طرح تعظیم وتوقیر کی جاتی ہو جیسی کہ محمد (ﷺ) کی اُن کے صحابہ کرتے ہیں۔ بخدا! جب وہ اپنا لعابِ دہن باہر پھینکتے ہیں تو وہ کسی نہ کسی صحابی کی ہتھیلی پر گرتا ہے جو اُسے اپنے چہرے یا جسم پر مَل لیتا ہے۔ جب وہ اپنے صحابہ کو کوئی حکم دیتے ہے تو وہ اُس کی تعمیل کے لئے بہ دل وجان دوڑ پڑتے ہیں۔ جب وہ وضو کرتا ہے تو وہ وضو کے بچے ہوئے پانی کو حاصل کرنے کے لئے ایک دوسرے سے لڑ پڑتے ہیں۔ جب وہ بات کرتا ہے تو صحابہ اُن کی موجودگی میں اپنی آوازیں پست رکھتے ہیں اور ازراہِ تعظیم وہ اُن سے آنکھ نہیں ملاتے۔ اور یقیناً اُس نے ایک اچھی پیشکش کی ہے تو چاہئے کہ اسے قبول کرلو۔'' (صحیح بخاری: کتاب الشروط؛ دلائل النبوۃ للبیہقی (۴:۱۰۴)

(۲) اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

''مکی زندگی میں عبداللہ بن زبیر میرے پیٹ میں تھے۔ زمانہِ حمل مکمل ہونے کو تھا کہ میں مدینہ کو روانہ ہو گئی۔ میں قبا کے مقام پر اتری جہاں اپنے لڑکے عبداللہ بن زبیر کو جنم دیا۔ پھر میں اُسے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پاس لے گئی اور اُسے آپ کی گود میں رکھ دیا۔ آپ نے ایک کھجور منگائی اور اُسے چبایا۔ پھر آپ نے اپنا لعابِ دہن بچے کے منہ میں ڈالا اور بچے کے پیٹ میں جو پہلی چیز داخل ہوئی' وہ آپ ﷺ کا لعاب تھا۔ پھر آپ نے وہ کھجور بچے کے تالو میں لگائی' بچے کے لئے دعا کی اور مبارکباد دی۔'' (صحیح بخاری: کتاب فضائل الصحابہ؛ صحیح مسلم: کتاب الآداب؛ مسند احمد بن حنبل (۶ : ۹۳'۳۴۷) بحوالہ پروفیسر ڈاکٹر طاہر القادری۔

پسینہ رسول سے حصولِ تبرک: (۱) حضرت اَنس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اُمِ سُلیم نبی علیہ السلام

کے لئے ایک چرمی گدا بچھایا کرتی تھیں جس پر آپ (دوپہر کا) قیلولہ فرمایا کرتے تھے۔ جناب اُنس فرماتے ہیں کہ جب پیغمبر علیہ السلام بیدار ہوتے تو میں آپ کے پسینہ اور موئے مبارک کو جمع کر لیتا' اُنہیں ایک بوتل میں ڈال لیتا اور اُن میں عطر ڈال لیتا۔ ثمامہ کہتے ہیں کہ جب حضرت اَنس کا وقت آخر قریب ہوا تو اُنہوں نے چاہا کہ وہ عطر اُن کے کفن پر مَل دیا جائے اور عطر آپ کے کفن پر مَل دیا گیا۔'' (صحیح بخاری: کتاب الاستئذان)

(۲) حضرت اَنس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام ہمارے پاس تشریف لائے اور قیلولہ فرمایا۔ جب آپ کا پسینہ خوب بہہ چکا تو میری والدہ ایک بوتل لائیں۔ اُنہوں نے آپ کا پسینہ پونچھا اور اُسے بوتل میں ڈال دیا۔ جب پیغمبر علیہ السلام بیدار ہوئے تو آپ نے اُنہیں فرمایا: ''اے اُمِّ سُلیم! کیا کر رہی ہو؟'' اُنہوں نے جواب دیا: یہ آپ کا پسینہ ہے جسے ہم اپنے عطر میں ملائیں گے اور یہ تو بہترین عطر ہے۔''
(صحیح مسلم: کتاب الفضائل؛ مسند احمد بن حنبل (۳:۱۳۶))

''حضور علیہ السلام کے عصائے مبارک سے حصولِ تبرک: (۱) عبداللہ بن انیس اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ نبی علیہ السلام نے مجھے اپنا عصا مبارک عطا کیا اور فرمایا: اے عبداللہ بن انیس! اُسے اپنے پاس رکھو۔ جب میں عصا اٹھائے باہر نکلا تو لوگوں نے مجھ سے پوچھا: یہ (عصا) کیا ہے؟ میں نے کہا کہ یہ مجھے رسول اللہ ﷺ نے عطا کیا ہے اور اپنے پاس رکھنے کو کہا ہے۔ لوگوں نے کہا: کیا تم اسے نبی علیہ السلام کو واپس نہیں کرو گے؟ آپ ﷺ سے اس کے متعلق معلوم کر لو۔ عبداللہ بن اَنیس کہتے ہیں کہ خدمتِ نبوی میں حاضر ہوا اور کہا: اے اللہ کے رسول! آپ نے یہ عصا مجھے کیوں عطا فرمایا ہے؟ آپ نے جواب دیا: روزِ قیامت یہ ہمارے تمہارے درمیان پہچان کا کام دے گا جب چند ہی لوگ ایک دوسرے سے تعاون کریں گے۔ عبداللہ بن اَنیس نے عصا کو اپنی تلوار کے ساتھ مضبوطی سے باندھ لیا اور تا دمِ آخر ہمیشہ اپنے پاس رکھا۔ اُنہوں نے وصیت کی تھی کہ عصا کو اُن کے کفن میں رکھ دیا جائے' پس ہم نے عصا کو آپ کے ساتھ ہی دفن کر دیا۔'' (مسند احمد بن حنبل (۳:۴۹۶؛ الطبقات الکبریٰ لابنِ سعد (۲:۵۱'۵۰)

(۲) حضرت اَنس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

اِنَّہٗ کَانَتْ عِنْدَہٗ عَصِیَّۃٌ لِرَسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ فَمَاتَ فَدُفِنَتْ مَعَہٗ بَیْنَ جَنْبِہٖ وَبَیْنَ قَمِیْصِہٖ

''اُن (حضرت اَنس) کے پاس ایک چھوٹی سی چھڑی تھی جو نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اُنہیں عطا کی تھی۔ جب حضرت اَنس نے وفات پائی تو چھڑی اُن کے ساتھ ہی آپ کی قمیص اور آپ کے جسم کے پہلو کے درمیان دفن کر دی گئی۔''

(۳) قاضی عیاض اپنی کتاب ''الشفا'' میں بیان کرتے ہیں:

''جَہجاہ الغفاری نے نبی علیہ السلام کے عصا مبارک کو حضرت عثمان کے ہاتھ سے چھین لیا' اُسے اپنے گھٹنے پر

رکھا اور اُسے توڑنے کی ناپاک کوشش کی۔ اُسے ایسے گستاخانہ عمل کی سزا ایک نامعلوم ہستی نے یہ دی کہ اُس کے گھٹنے پر ایک پھوڑا نکلا جو رِستے ہوئے ناسور میں بدل گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اُس کی ٹانگ کاٹ دی گئی اور وہ اُسی سال مر گیا۔''

''منبرِ رسول ﷺ سے حصولِ تبرک: منبر پر بیٹھ کر نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام صحابہ کرام کو دینِ اسلام کی تعلیم دیتے تھے۔ محبّانِ رسول اس منبر کے بڑے ہی مشتاق تھے اور آپ کے دوسرے تبرّکات کی طرح اس سے تبرک حاصل کرنے کے لئے اس کی بھی اُسی طرح حفاظت کرتے تھے۔ قاضی عیاض بیان کرتے ہیں (۲:۶۲۰) کہ:

رُئِیَ ابْنُ عُمَرَ وَاضِعًا یَدَہٗ عَلٰی مَقْعَدِ النَّبِیِّ ﷺ مِنَ الْمِنْبَرِ ثُمَّ وَضَعَھَا عَلٰی وَجْھِہٖ

"عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کو اکثر منبرِ رسول کے اُس حصے کو اپنے ہاتھ سے چھوتے ہوئے دیکھا گیا جہاں نبی علیہ السلام بیٹھا کرتے تھے۔ منبر کو چھونے کے بعد جناب عبداللہ اپنے ہاتھوں کو اپنے جسم پر مَل لیتے تھے۔''

''نبی علیہ السلام کے ہاتھ اور پاؤں سے حصولِ تبرک: (۱) حضرت اَنس بن مالک بیان کرتے ہیں کہ نمازِ فجر کے بعد مدینہ کے خدّام پانی سے بھرے ہوئے برتن رسول اللہ ﷺ کے پاس لایا کرتے تھے۔ آپ ہر برتن میں اپنی انگلی ڈبوتے اور یہ اکثر صبح کے وقت ہوتا تھا۔'' (صحیح مسلم: کتاب الفضائل)

''(۲) اُمِّ ابان بنت وضیع بن زری نے اپنے دادا' زری سے روایت کی ہے جو وفدِ عبدالقیس کے ایک رکن تھے۔ اُنہوں نے کہا:

لَمَّا قَدِمْنَا الْمَدِیْنَۃَ فَجَعَلْنَا نَتَبَادَرُ مِنْ رَوَاحِلِنَا فَنُقَبِّلُ یَدَ النَّبِیِّ ﷺ وَرِجْلَہٗ' (سنن ابی داؤد: کتاب الآداب؛ السنن الکبریٰ لبیہقی بحوالہ پروفیسر ڈاکٹر طاہر القادری' ص ۲۹۶)

''مدینہ پہنچ کر ہم اپنی سواریوں کو جلدی جلدی چھوڑتے ہوئے دربارِ نبوی میں حاضر ہوئے اور نبی علیہ السلام کے ہاتھ اور پاؤں کو چومنے لگے۔''

امام بخاری علیہ الرحمۃ نے اُمِّ ابان کی مذکورہ روایت میں ذیل کے الفاظ کا اضافہ کیا ہے۔ اُن کے دادا نے کہا:

قَدِمْنَا فَقِیْلَ: ذَاکَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ فَأَخَذْنَا بِیَدَیْہِ وَرِجْلَیْہِ نُقَبِّلُھَا

"(جب ہم مدینہ پہنچے تو) ہمیں بتایا گیا کہ یہ اللہ کے رسول ﷺ ہیں۔ تو ہم نے آپ کے ہاتھوں اور پاؤں کو بوسے دینا شروع کر دئے۔''

''(۳) صفوان بن عَسل روایت کرتے ہیں:

اِنَّ قَوْمًا مِّنَ الْیَھُوْدِ قَبَّلُوْا یَدَ النَّبِیِّ ﷺ وَرِجْلَیْہِ (سنن ابن ماجہ: کتاب الآداب؛ (جامع ترمذی: کتاب الاستیذان؛ مُسنَد احمد بن حنبل (۴:۲۳۹)؛ المصنّف لابن ابی شیبۃ؛ مُسنَد ابو داؤد طیالیسی؛ المستدرک للحاکم؛ المعجم الکبیر

للطبراني ؛ حِلْيَة الاولياء و طبقات الاصفياء لابی نُعَیم (۹۷،۹۸: ۵) ؛ دلائل النبوة لبیهقی (۶ : ۲۶۸)

''یہود کے ایک وفد نے نبی علیہ السلام کے ہاتھوں اور پاؤں کے بوسے لئے۔''

''مندرجہ بالا تمام احادیث محقّق اور صحیح ہیں کیونکہ وہ سب کی سب مستند کتب حدیث سے ماخوذ ہیں۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین جو اُن کی بڑے محتاط طریق سے حفاظت کرتے تھے' اُنہیں لوگوں کو زیارت کرانے یا کسی اور مقصد کے لئے نہیں رکھتے تھے بلکہ وہ مصیبتوں اور آفتوں کو دُور کرنے کے لئے اُن کے توسّل سے رب تعالیٰ سے دعا اور فریاد کرتے تھے۔ مزید برآں اُن سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کرام اُن سے تبرک اور اعلیٰ مقاصد حاصل کرتے تھے۔'' ("Islamic Concept of Intermediation"... Prof. Dr. Muhammad Tahir-ul-Qadri, pp. 293-298)

صالحین اور اولیائے کرام سے توسّل

(۱) صالح والدین سے توسّل :سورۃ الکہف میں ارشادِ باری تعالیٰ ہوا :

وَاَمَّا الْجِدَارُ فَكَانَ لِغُلاَمَيْنِ يَتِيْمَيْنِ فِي الْمَدِيْنَةِ وَكَانَ تَحْتَه' كَنْز'' لَّهُمَا وَكَانَ اَبُوهُمَا صَالِحًا فَاَرَادَ رَبُّكَ اَنْ يَّبْلُغَا اَشُدَّهُمَا وَيَسْتَخْرِجَا كَنْزَهُمَا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ

''اور رہی وہ دیوار' سو وہ شہر کے دو یتیم لڑکوں کی تھی اور اُس (دیوار) کے نیچے اُن کا دفینہ تھا اور اُن کا باپ ایک مردِ صالح تھا۔ سو آپ کے پروردگار نے چاہا کہ وہ دونوں اپنے سنِّ بلوغ کو پہنچ جائیں اور اپنا دفینہ نکال لیں' (یہ سب) آپ کے رب کی مہربانی سے ہوا۔'' (۱۸ : ۸۲)

''اِس آیت میں بیان کردہ واقعہ کا پس منظر یہ ہے کہ موسیٰ اور خضر علیہما السلام کا ایک بستی میں قیام ہوا۔ جب وہ وہاں سے چلے تو اِن بزرگوں نے وہاں دو یتیم بھائیوں کی ایک دیوار کو دیکھا جو گرنے کو تھی اور جس کے نیچے اُن کے والدین کا چھوڑا ہوا دفینہ تھا۔ حضرت خضر علیہ السلام نے بغیر کوئی معاوضہ لئے اُس دیوار کو سیدھا کر دیا۔ سید محمود آلوسی اپنی تفسیر روح المعانی میں بیان کرتے ہیں کہ خضر علیہ السلام نے یہ کام اس لئے کیا کہ اُن کا والد ایک نیک اور پارسا آدمی تھا جس کا ظاہر نتیجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُن لڑکوں کو اُن کے نیک والدین کے توسّل سے ایک بڑے نقصان سے بچا لیا۔''

''ہم اِس آیت سے یہ نتیجہ بھی اخذ کرتے ہیں کہ نیک و صالح لوگوں کے بچوں کی تعظیم و توقیر' اُن کے ذاتی اعمال کی بنیاد پر نہیں' بلکہ اُن کے حسب و نسب کی بنیاد پر کرنا اولیائے کرام اور پیغمبران کا شیوہ رہا ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آج کے اس دَور میں ہم صالحین کی ایسی اولاد کی کیوں تعظیم کریں جو نیکی کی نسبت برائی کی

طرف زیادہ مائل ہیں؟ یہ بات بالکل درست ہے کہ ازروئے قرآن مجید انسانی برتری کا معیار تقویٰ اور پارسائی ہے لیکن اگر ذاتی کارنامے یا انفرادی قدر کی کوئی قیمت ہے تو حسب ونسب یا خاندانی روابط کی بھی کوئی قدر و قیمت ہونی چاہئے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن لڑکوں کو اُن کے والد کی نیکی کی بدولت ایک نقصان سے بچایا جا رہا ہے۔

''(۲) حضرت اُویس قرنی رضی اللہ عنہ کے توسّل کا نبوی حکم: اپنی اُمّت کے عظیم خیرخواہ (سورۃ التوبہ: ۱۲۸) ہونے کے حوالہ سے پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اُمّت کی فلاح و بہبود کے لئے متعدد راستے (خیابان) کھولے ہیں۔ آپ کے مجوّزہ طریقوں میں سے ایک راہ اولیائے کرام اور صالحین سے توسّل کی ہے۔ آپ نے عمر فاروق رضی اللہ عنہ جیسے عظیم صحابی کو اپنے منظورِ نظر حضرت اُویس قرنی رضی اللہ عنہ کا توسّل کرنے کا حکم صادر فرمایا۔ حضرت اُویس یمنی تھے لیکن وہ خدمتِ نبوی میں اس وجہ سے حاضر نہ ہو سکے تھے کہ وہ اپنی بوڑھی' بیمار والدہ کی تیمارداری اور علاج معالجہ سے فارغ نہ ہو پاتے تھے۔ نبی علیہ السلام کو اِن سے بڑی ہی محبت اور چاہت تھی۔ آپ ﷺ نے امت کی نجات کے لئے اُویس قرنی کا توسّل کرنے کا کہا اور جناب عمر کو حکم دیا کہ اگر ممکن ہو تو وہ اُویس قرنی کے پاس جا کر امتِ مسلمہ کی نجات اور بخشش کی دعا کرائیں۔'' (صحیح مسلم: کتاب فضائل الصحابہ؛ المستدرک للحاکم (۳:۴۰۳)؛ تہذیب تاریخ دمشق الکبیر (۳:۱۶۳)؛ حِلیۃ الاولیاء وطبقات الاصفیاء لابی نُعیم (۲:۸۰'۷۹)

''ہمیں معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ ہماری شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے (سورہ قٓ: ۱۶)۔ کوئی شک نہیں کہ وہ ہماری دعاؤں' فریادوں اور التجاؤں کو سنتا بھی ہے (سورۃ البقرۃ: ۱۸۶؛ سورۃ المؤمن: ۶۰) لیکن اِن سب حقائق کے باوجود اُس کا رسول یہ بھی تو فرما رہا ہے کہ اُویس قرنی سے کہو کہ وہ اُمت کی بخشش کے لئے دعا کرے۔ لہٰذا اب یہ بات بالکل واضح اور شفاف ہوگئی کہ صالحین کا توسّل کرنا رب تعالیٰ اور اُس کے رسول ﷺ کو منظور ہے اور دینِ اسلام کا یہی مغز اور خلاصہ ہے۔'' (پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری' ص ص ۳۲۳' ۳۲۴: ۳۳۱' ۳۳۴)

''صالحین کے توسّل سے لوگوں کی ضروریات کی تسکین: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا:

إِنَّ لِلّٰهِ خَلْقًا خَلَقَهُمْ لِحَوَائِجِ النَّاسِ تَفْزَعُ النَّاسُ إِلَيْهِمْ فِيْ حَوَائِجِهِمْ أُولٰئِكَ الْآمِنُوْنَ مِنْ عَذَابِ اللهِ (مجمع الزوائد للهيثمى ۸ : ۱۹۲)

''اللہ کے کچھ بندے ایسے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اُنہیں بالخصوص بندوں کی ضروریات کی تکمیل کے لئے پیدا فرمایا ہے۔ لوگ اپنی پریشانی کے وقت اُن کے پاس جاتے ہیں' اپنی ضروریات اُن کے سامنے رکھتے ہیں۔ یہ اللہ کے خاص بندے ہیں جو رب تعالیٰ کے عذاب سے محفوظ ہیں۔''

''کمزوروں اور خستہ حال لوگوں کی بدولت رزق کا ملنا: مُصعب بن سعد رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

هَلْ تُنصَرُوْنَ وَتُرْزَقُوْنَ اِلَّا بِضُعَفَآئِکُمْ (صحیح بخاری: کتاب الجهاد)
''تمہارے کمزوروں اور خستہ حال لوگوں ہی کی بدولت تمہیں رزق دیا جاتا ہے۔''

صالحین کے تبرّکات سے توسّل

(۱) مقامِ ابراہیم سے توسّل : جس طرح مقبولانِ الٰہی کی ذواتِ قُدسیہ سے توسّل جائز ہے' اسی طرح اُن مقبولان سے متعلق اشیاء سے توسّل بھی جائز ہے۔ مثلاً حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نقوشِ پا سے توسّل کا بالاشارہ ذکر سورۃ البقرۃ میں کیا گیا اور فرمایا گیا:

وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهِیْمَ مُصَلًّی (البقرۃ: ۱۲۵)
''اور مقامِ ابراہیم کو نماز کی جگہ بنالو۔'' (۱۲۵ : ۲)

''اِس قرآنی آیت میں مؤمنوں کو ابراہیم علیہ السلام کے نقش پا کی جگہ کو جائے عبادت بنانے کا حکم دیا گیا کیونکہ یہ جگہ عبادت کے لئے بہت ہی موزوں ہے اور یہ حقیقت توسّل بالانبیاء کے لئے بالکل واضح ہے۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ مقبولانِ الٰہی سے متعلق مقامات کو تعظیم و توقیر کا اعلیٰ مقام عطا کیا جاتا ہے اور اسی تعلق کے باعث لوگ اُن مقامات سے فیض حاصل کرتے ہیں اور اُن کی دعائیں شرفِ قبولیت سے نوازی جاتی ہیں۔''

صالحین کے تبرّکات بطور ذریعہِ حیات : موسیٰ علیہ السلام کے زمانے کے سامری نامی ایک بہت بڑے جادوگر نے سونے کا ایک بچھڑا بنایا اور اُس کے منہ میں جبریل علیہ السلام کے پاؤں کی خاک ڈالی تو وہ بولنے لگا۔ موسیٰ علیہ السلام اس پر غضب ناک ہوئے اور سامری سے حقیقتِ حال پوچھی (سورہ طٰہٰ: ۹۵) تو سامری بولا:

بَصُرْتُ بِمَا لَمْ یَبْصُرُوْا بِهٖ فَقَبَضْتُ قَبْضَةً مِّنْ أَثَرِ الرَّسُوْلِ فَنَبَذْتُهَا (طٰهٰ: ۹۶)
''مجھے ایسی چیز نظر آئی جو اوروں کو نظر نہ آئی تھی' سو میں نے (اس) فرستادہ (خداوندی) کے نقشِ قدم سے ایک مٹھی (خاک) اٹھالی تھی' میں نے وہ مٹھی اِسی قالب کے اندر ڈال دی تھی۔'' (۹۶ : ۲۰)

''کتبِ تفسیر میں بیان ہوا کہ جبریل علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس صحرائے سینا میں گھوڑے پر سوار آئے۔ گھوڑے کے پاؤں جہاں جہاں لگتے' خشک ریتلی زمین پر گھاس اُگ آئی۔ جب سامری نے جبریل امین کو دیکھا تو وہ فوراً سمجھ گیا کہ وہ اللہ کی مقبول مخلوق ہے۔ اس لئے اُس نے اس جگہ کی کچھ خاک محفوظ کی اور بچھڑا بناتے ہوئے اُس نے وہ خاک اُس کے منہ میں ڈال دی تو وہ بولنے لگا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مقبولانِ الٰہی ذریعہِ حیات ہیں۔ وہ خاک بچھڑے کی قوّتِ گویائی کا سبب بن گئی اور وہ بولنے لگا۔''

سورۃ الکہف میں بیان شدہ موسیٰ اور خضر علیہما السلام کے واقعہ میں یہی سبق ملتا ہے کہ ناشتہ دان میں بند'

تلی ہوئی (مُردہ) مچھلی میں جان آ گئی اور وہ ناشتہ دان میں سے پُھدک کر دریا میں جا پڑی کیونکہ وہ اب ایک مقبولِ الٰہی یعنی حضرت خضر علیہ السلام کی جائے سکونت پر پہنچ چکی تھی۔

اولیائے کرام کے روضوں کے قریب مساجد کی تعمیر: سورۃ الکھف میں بیان ہوا:

قَالَ الَّذِيْنَ غَلَبُوْا عَلٰی أَمْرِهِمْ لَنَتَّخِذَنَّ عَلَيْهِمْ مَّسْجِدًاO (الکھف: ۲۱)

''جو لوگ اپنے کام پر قادر تھے' اُنہوں نے کہا کہ ہم تو اُن کے پاس ایک عبادت گاہ بنائیں گے۔'' (۱۸:۲۱)

جب اصحابِ کہف تین سو نو برس کے بعد نیند سے بیدار ہوئے اور بعد میں طبعی طور پر وفات پا گئے تو لوگوں میں اختلافِ رائے ہوا۔ اُن میں سے کچھ کی رائے یہ تھی کہ غار کا داخلہ اُس کے گرد دیوار کھڑی کر کے بند کر دیا جائے اور اُن میں سے بااثر و بارسوخ لوگوں نے کہا کہ اس کے نزدیک ایک مسجد تعمیر کر دی جائے تاکہ موحدین و مسلمین وہاں عبادت کر سکیں اور وہاں کے قرب سے تبرک حاصل کر سکیں۔ اس طرح اصحاب کہف کی یاد بھی تازہ ہوتی رہے گی۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے تفسیر مظہری میں آیت کی تفسیر ان الفاظ میں کی ہے:

هٰذِهِ الْاٰيَةُ تَدُلُّ عَلٰی جَوَازِ بِنَاءِ الْمَسْجِدِ لِيُصَلّٰی فِيْهِ عِنْدَ مَقَابِرِ اَوْلِيَاءِ اللّٰهِ قَصْدًا لِلتَّبَرُّكِ بِهِمْ

''یہ قرآنی آیت اولیاء اللہ کے مقبروں کے نزدیک مسجد بنانے کے جائز ہونے پر دلیل ہے تاکہ اُن سے تبرک اور فیض حاصل کیا جائے۔'' (تفسیر مظہری ۲۳ :۶)

کچھ لوگ اس آیت کی غلط تعبیر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اُن لوگوں نے اپنے پیغمبروں کی قبروں کو عبادت گاہوں میں بدل لیا تھا اور اِن قبروں کی پرستش شروع کر دی تھی اور اِسی قسم کا معنیٰ اُس حدیث کا ہے جس میں حضرت مرثد غنوی رضی اللہ عنہ نے نبی علیہ السلام کی اُس حدیث کا حوالہ دیا ہے جس میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ قبروں پر نہ بیٹھا کرو اور نہ ہی نماز کے وقت اُن کی طرف رخ کیا کرو۔ (صحیح مسلم: کتاب الجنائز)

''اولیائے کرام کے مزارات جہاں دن رات قرآنِ مجید کی تلاوت ہوتی رہتی ہے' جہاں ذکرِ الٰہی کی یاد میں روح پرور آوازیں بلند ہوتی ہیں۔ جب ایک بندۂ خدا نماز میں مست اور دنیا و مافیہا سے بے خبر اپنی حاجت کو ربّ ذوالجلال والاکرام کے حضور اُس کے کسی ولی کے توسّل سے پیش کرتا ہے تو رب تعالیٰ اپنی رحمت کے ساتھ اُس کی دعا و فریاد کو قبول کرتا ہے۔'' (پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری' صفحات ۳۳۹ تا ۳۴۲' ۳۴۶ تا ۳۴۹)

''**قبور پر عمارات کی تعمیر**: ابن تیمیہ اور وہابیہ نے قبور پر عمارات تعمیر کرنے سے منع کیا ہے اور اس ممانعت کی بنیاد وہ احادیث ہیں جن میں نبی علیہ السلام نے مزارات کو پلستر کرنے' اُن پر بیٹھنے اور اُن پر کوئی عمارت کھڑی کرنے سے منع فرمایا ہے (صحیح مسلم: ۴۵۹)۔ لیکن ابن تیمیہ سے سات صدی قبل کے شیخ محمد ذکی کی دلیل اِن کے جواز سے متعلق مسلمانوں کا اجماع ہے۔ بت پرستی کے خاتمہ کی ضرورت کے لئے شروع کی ممانعت کو بعد میں خود

نبی علیہ السلام نے بدل دیا۔ محمد ذکی کا کہنا ہے کہ مقبرہ ایک مضبوط چھت کا نام ہے۔ پیغمبر علیہ السلام اور اُن کے دو اوّل خلفاء سیّدہ عائشہ کے حجرہ میں دفن ہوئے جس کی چھت تھی اور کسی نے اس پر اعتراض نہیں کیا۔'' (انسائیکلو پیڈیا آف دی قرآن' جلد۲' صفحہ ۵۵۴ طبع لیڈن (امریکہ)

''توسّل سے مستفید ہونے کا کون زیادہ حق دار ہے؟ قرآنِ حکیم کے ذریعے ہم یہ ثابت کریں گے کہ توسّل کے عمل سے مستفید ہونے کا کون زیادہ حقدار ہے؟ اس سیاق وسباق میں یہ بات ذہن نشین رہے کہ مؤمن ومسلمان دونوں ہی اپنے اپنے مقام ومرتبہ کے تناسب سے توسّل سے مستفید ہوتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ نہ صرف انسان بلکہ حیوانات بھی اولیائے کرام کے توسّل سے مستفید ہوتے ہیں' جس کا ثبوت یہ ہے کہ اصحابِ کہف کا کتا بھی اُن سے مستفید ہوا۔ رب تعالیٰ نے اس کا ذکر یوں کیا ہے:

وَكَلْبُهُمْ بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ بِالْوَصِيْدِ (الکهف: ۱۸)

''اور اُن کا کتا دہلیز پر اپنے دونوں ہاتھ پھیلائے بیٹھا تھا۔'' (۱۸: ۱۸)

''اصحابِ کہف کو ۳۰۹ برس تک زندہ رکھنے میں حکمتِ الٰہی یہی تھی کہ اُنہیں آنے والی نسلوں کے لئے اللہ کی قدرتِ مطلقہ کا نشان بنا دیا جائے لیکن اس سے زیادہ حیران کن حقیقت یہ ہے کہ اُس لمبے عرصہ کے دوران کتا بھی کچھ کھائے پیئے بغیر اُن کی دہلیز پر زندہ بیٹھا رہا اور یہ اصحابِ کہف کے توسّل ہی کی بدولت تھا۔ اصحابِ کہف کا کتا ہونے کے باعث وہ ۳۰۹ برس تک زندہ رہا۔ اگر وہ کتا کسی اور کا ہوتا تو کھانا پینا نہ ملنے کے باعث وہ تھوڑی سی دیر زندہ رہتا اور مر چکا ہوتا۔ اس واقعہ میں ایک اور قابلِ ذکر نکتہ یہ ہے کہ جب اصحابِ کہف اپنے سفر کو نکلے تو وہ کتا بھی اُن کے ساتھ ہولیا اور کتے کی اِن صالحین کی ثابت قدم ہمراہی پر قرآن مجید نے بالخصوص زور دیا ہے کہ کتے نے ان کی ہمراہی کو نہیں چھوڑا اور دہلیز پر رہتے ہوئے اپنی وفاداری کا مظاہرہ کیا۔ اِن صالحین کی مصاحبت نے اُسے نہ صرف ۳۰۹ برس تک زندہ رکھا بلکہ اُسے دوسرے کتوں سے بھی نمایاں اور متمیّز کر دیا۔ یہ اِنہی نیکو کاران کی بدولت ہی تو ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کے ساتھ اُن کے کتے کا بھی ذکر کر دیا ہے:

سَيَقُوْلُوْنَ ثَلَاثَةٌ رَّابِعُهُمْ كَلْبُهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ خَمْسَةٌ سَادِسُهُمْ كَلْبُهُمْ رَجْمًا بِالْغَيْبِ وَيَقُوْلُوْنَ سَبْعَةٌ وَّثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ (الکهف: ۲۲)

''عنقریب بعض لوگ کہیں گے کہ وہ تین تھے اور چوتھا اُن کا کتا تھا اور بعض کہیں گے کہ وہ پانچ تھے' چھٹا اُن کا کتا تھا' یہ اُن کی اٹکل کے تکّے ہیں اور بعض کہیں گے کہ وہ سات تھے اور آٹھوں اُن کا کتا تھا۔''

اِس آیت میں کتے کا ذکر اصحابِ کہف کے ساتھ کیا گیا ہے۔ کتے نے وفاداری کی اور اُن کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ اُس کا یہ رویّہ رب تعالیٰ کی خوشنودی کا ایسا سبب بن گیا کہ اُس نے اُس کا ذکر اپنے اِن نیکوکار بندوں کے ساتھ کر دیا اور جہاں کہیں اِن صالحین کا ذکر ہے' وہاں وہاں کتے کا بھی ذکر ہے۔

''قرآن مجید میں کتے کے اعضاء کی ظاہری کیفیت (Posture) پر بھی زور دیا گیا ہے۔ اس سے ہمیں یہ سبق ملتا

ہے کہ اگر کتا مقربینِ الٰہی کا ساتھ دینے کی بدولت از روئے قرآن ایک مخصوص وقت سے پہلے نہیں مر سکتا' تو ایک صحیح العقیدہ مسلمان اللہ کی رحمت سے کیسے محروم ہو سکتا ہے اگر وہ اپنی دعا کی فوری قبولیت کے لئے اُس میں کسی پیغمبر یا ولی اللہ یا اُن سے متعلق کسی چیز کا توسّل کرتا ہے' یا وہ کسی مقدّس جگہ پر اللہ سے فریاد کرتا ہے یا وہ صالحین کی صحبت میں رہتا ہے کیونکہ اللہ کے یہ نیک بندے اللہ کی مصدّقہ اَسناد ہیں کہ وہ اُس کے بندوں کو اُس کی رضا اور خوشنودی کی راہ پر چلائیں اور اُن میں معرفتِ الٰہی کا شعور بیدار کریں۔ لہٰذا یہ ایک مستحکم اور غیر متنازعہ حقیقت ہے کہ ایک صحیح العقیدہ مسلمان ہی اللہ کے اُن فیوض و انعامات سے مستفید ہو سکتا ہے جو اولیائے کرام اور صالحین کے توسّل سے اُن تک پہنچتے ہیں۔'' (پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری' صفحات ۳۴۹ تا ۳۵۲)

حدیث لَا تُشَدُّ الرِّحَالُ کی بحث: کچھ لوگ انبیاء علیہم السلام کے روضوں اور اولیائے کرام کے مقبروں کو سفر کرنا ناجائز سمجھتے ہیں۔ اپنے موقف کی تائید میں وہ مندرجہ ذیل حدیث کا حوالہ دیتے ہیں جو صحیح بخاری کے باب فضل الصلوٰة فی مسجد مکة والمدینة میں بروایت سیّدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ وارد ہے جس میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

لَا تُشَدُّ الرِّحَالُ اِلَّا اِلٰی ثَلَاثَةِ مَسَاجِدِ: اَلْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَمَسْجِدِ الرَّسُوْلِ وَالْمَسْجِدِ الْاَقْصٰی

''کجاوے نہ باندھے جائیں (سفر نہ کیا جائے) مگر تین مسجدوں یعنی مسجدِ حرام' مسجدِ نبوی و مسجدِ اقصٰی کی طرف۔''

یہ حدیث مختلف کتبِ حدیث میں بہ کثرت آئی ہے اور متفق علیہ ہے۔ بخاری' مسلم' نسائی' ترمذی' ابوداؤد' ابنِ ماجہ اور دیگر کتب کے مختلف ابواب میں موجود ہے۔

اس حدیث سے وہ یہ استدلال پیش کرتے ہیں کہ چونکہ ان تین مذکورہ مساجد کے علاوہ باقی تمام مقامات کو سفر کرنا جائز نہیں ہے اس لئے روضوں اور مقبروں کی زیارت کے لئے سفر کرنا ناجائز ہے۔

دراصل اس حدیث کا تعلق بحوالہ عبادت' مساجد کی فوقیت کی ترتیب سے ہے اور انبیاء علیہم السلام اور اولیائے کرام کے مقبروں کی زیارت کے لئے سفر کے ساتھ اس حدیث کا کوئی تعلق نہیں۔ حدیث میں مذکورہ تینوں مساجد اُن لوگوں کے لئے ثواب کے لئے مخصوص ہیں جو اُن کی طرف نماز پڑھنے کے مقصد سے سفر کریں جبکہ روئے زمین پر باقی مساجد کو یہ خصوصیت حاصل نہیں۔ شدِّ رِحال سے مراد اُن میں نماز پڑھنے کا مقصد ہے۔ اس حقیقت کی تائید ایک اور حدیث سے ہوتی ہے جو درج ذیل ہے:

عَنْ سَعِیْدِ بْنِ الْمُسَیَّبِ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: صَلٰوةٌ'' فِیْ مَسْجِدِیْ هٰذَا خَیْرٌ'' مِّنْ اَلْفِ صَلٰوةٍ فِیْ غَیْرِهٖ مِنَ الْمَسَاجِدِ اِلَّا الْمَسْجِدَ الْحَرَام

''حضرت سعید بن المسیّب جناب ابو ہریرة رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میری اس مسجد میں نماز پڑھنا دوسری مساجد میں ایک ہزار نماز پڑھنے سے بہتر ہے سوائے مسجدِ حرام کے۔''

لہٰذا یہ نتیجہ نکالنا بجا ہے کہ (۱) حدیث مذکورہ صرف مساجد سے متعلق ہے۔ (۲) مذکورہ تین مساجد کے علاوہ کسی اور مسجد کی طرف وہاں نماز پڑھنے کے مقصد سے سفر کرنا صحیح نہیں ہے کیونکہ مذکورہ تین مساجد کے علاوہ باقی تمام مساجد فوقیت میں برابر ہیں۔ اگر نماز پڑھنے کے علاوہ کوئی اور ارادہ ہے تو اُدھر کا سفر کرنا جائز ہے۔ (۳) حدیث میں مذکور تین مساجد کا بالخصوص ذکر اس لئے ہوا ہے کہ اُن میں نماز پڑھنا کئی گنا ثواب میں اضافہ کا موجب ہے بلکہ اقلیدسی افزائش(Geometrical Progression)☆ سے ثواب ملتا ہے۔

اگر معترضین کے موقف کو درست تسلیم کرلیا جائے کہ مذکورہ تین مساجد کے علاوہ کسی اور مقام کی طرف سفر کرنا ناجائز ہے تو پھر قرآنِ حکیم میں مذکور مختلف سفر جائز کیوں ہیں اور کسی نے اُن پر اعتراض نہیں کیا۔ مثلاً

(۱) ہجرت کی خاطر سفر: جس کا ذکر سورۃ النساء کی آیت ۱۰۰ میں اس طرح آیا ہے:

وَمَنْ يَّخْرُجْ مِنْ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ اِلَى اللّٰهِ

''اور جو کوئی اپنے گھر سے اللہ اور اُس کے رسول کی خاطر ہجرت کرتا ہوا نکلے اور اُسے پھر موت آئے تو اُس کا اجر یقیناً اللہ تعالیٰ کے ذمہ ثابت رہا۔'' (۴ : ۱۰۰)

(۲) تباہ شدہ اُمم ماضیہ سے سبق حاصل کرنے کی خاطر سفر: سورۃ الانعام میں ارشاد ہوا:

قُلْ سِيْرُوْا فِى الْاَرْضِ ثُمَّ انْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ۝ (الانعام: ۱۱)

''فرما دیجئے کہ زمین میں چلو پھرو پھر دیکھو کہ جھٹلانے والوں کا انجام کیسا ہوا۔'' (۶ : ۱۱)

(۳) کسبِ معاش کی خاطر سفر: فرزندانِ یعقوب علیہ السلام نے اپنے والد سے بنیامین کو مصری وزیرِ مالیات (یوسف علیہ السلام) کے دربار میں اپنے ہمراہ لے جانے کی درخواست کی اور کہا:

يٰۤاَبَانَا مُنِعَ مِنَّا الْكَيْلُ فَاَرْسِلْ مَعَنَاۤ اَخَانَا نَكْتَلْ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝ (یوسف: ۶۳)

''اے ہمارے باپ! ہمارے لئے غلّہ بند کر دیا گیا ہے' سو آپ ہمارے ساتھ ہمارے بھائی کو بھیج دیجئے تو ہم غلّہ لاسکیں اور ہم اُن کے پورے محافظ ہیں۔'' (۱۲ : ۶۳)

(۴) اپنے پیاروں کو ڈھونڈ نکالنے کے لئے سفر: حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا:

يٰبَنِىَّ اذْهَبُوْا فَتَحَسَّسُوْا مِنْ يُّوْسُفَ وَاَخِيْهِ وَلَا تَايْئَسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ (یوسف: ۸۷)

''اے میرے بیٹو! جاؤ اور یوسف اور اُس کے بھائی کی تلاش کرو اور اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔''

(۵) بیماری سے شفایابی کے لئے سفر: حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں سے کہا:

☆ یہ بڑھتے ہوئے اعداد کا سلسلہ ہے جس میں ہر اگلا عدد اُسی نسبت سے بڑھتا ہے جس نسبت سے پچھلا عدد تھا جیسے ۱' ۳' ۹' ۲۷' ۸۱' ۲۴۳ وغیرہ۔

اِذۡهَبُوۡا بِقَمِيۡصِىۡ هٰذَا فَاَلۡقُوۡهُ عَلٰى وَجۡهِ اَبِىۡ يَاۡتِ بَصِيۡرًا (یوسف:۹۳)
''میری اس قمیص کو لے جاؤ اور اُسے میرے بابا جان کے چہرہ پر ڈال دو تو اُن کی آنکھیں روشن ہو جائیں گی۔'' (۹۳ : ۱۲)

(۶) <u>عالمِ دین کی زیارت کے لئے سفر</u> : سورۃ الکہف میں موسیٰ علیہ السلام کی بابت ارشاد ہوا:
وَاِذۡ قَالَ مُوۡسٰى لِفَتٰٮهُ لَاۤ اَبۡرَحُ حَتّٰۤى اَبۡلُغَ مَجۡمَعَ الۡبَحۡرَيۡنِ اَوۡ اَمۡضِىَ حُقُبًا O (الکہف:۶۰)
''اور جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنے خادم سے فرمایا کہ میں برابر چلتا رہوں گا تا آنکہ دو دریاؤں کے سنگم پر پہنچ جاؤں یا (یوں ہی) سالہا سال تک چلتا رہوں۔'' (۶۰ : ۱۸)

(۷) <u>تبلیغِ دین اور پیغامِ حق پہنچانے کی خاطر سفر</u> : سورہ طٰہٰ میں موسیٰ علیہ السلام کو یوں حکم ہوا:
اِذۡهَبۡ اِلٰى فِرۡعَوۡنَ اِنَّهٗ طَغٰى O (طٰہٰ: ۲۴)
''تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ، بے شک وہ حد سے تجاوز کر گیا ہے۔'' (۲۴:۲۰)

(۸) <u>تجارت کی خاطر سفر</u> : سورۃ القریش میں ارشادِ باری تعالیٰ ہوا:
لِاِيۡلٰفِ قُرَيۡشٍ O اٖلٰفِهِمۡ رِحۡلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّيۡفِ O فَلۡيَعۡبُدُوۡا رَبَّ هٰذَا الۡبَيۡتِ O (القریش : ۱،۲،۳)
''قریش کو خوگر ہونے کی بناء پر، اپنے جاڑے اور گرمی کے سفر کے خوگر ہونے کی بناء پر چاہئے تھا کہ اس خانہ کعبہ کے مالک کی عبادت کریں۔'' (۱،۲،۳ : ۱۰۶)

(۹) <u>تحصیلِ علم کی خاطر سفر</u> : نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا:
(i) جو کوئی علم حاصل کرنے کی خاطر اپنے گھر کو چھوڑتا ہے، وہ اللہ کی راہ میں ہوتا ہے۔''
(مشکوٰۃ: کتاب العلم)
(ii) علم حاصل کرو اگرچہ تمہیں چین جیسے دور دراز ملک تک جانا پڑے۔

اگر مذکورہ تین مساجد کے علاوہ کسی اور مقام کی طرف سفر کرنا ناجائز ہوتا تو قرآن اور حدیث میں مندرجہ بالا نو (۹) سفروں کا ذکر نہ ہوتا۔ پس ثابت ہوا کہ مساجدِ ثلاثہ مذکورہ کے علاوہ دوسرے مقامات کی طرف سفر کرنا درست اور جائز ہے اور انبیاء علیہم السلام اور اولیائے کرام کے مقبروں کی زیارت اسی زمرے میں آتی ہے۔ ان تین مساجد کے علاوہ کسی اور مسجد کی طرف اس عقیدے سے سفر کرنا کہ وہاں نماز پڑھنے کا ثواب کئی گنا بڑھ جاتا ہے، درست نہیں ہے کیونکہ مساجدِ مذکورہ کے علاوہ باقی تمام مساجد ثواب اور مرتبہ میں برابر ہیں۔

بہ نیتِ حصولِ فیض و تبرّک، اولیائے کرام کے مقبروں کی زیارت سے متعلق ہم فتاویٰ کی مشہور کتاب ''فتاویٰ

شامی'' کی عبارت نقل کرتے ہیں جو حنفی مکتبِ فکر کی ہے:

(۱) وَاَمَّا الْاَوْلِیَاءُ فَاِنَّھُمْ مُتَفَاوِتُوْنَ فِی الْقُرْبِ اِلَی اللّٰہِ وَنَفْعِ الزَّائِرِیْنَ بِحَسْبِ مَعَارِفِھِمْ وَاَسْرَارِھِمْ
(فتاویٰ شامی' جلد اول' ص ۶۶۵' المکتبۃ الماجدیۃ' عیدگاہ طوغی روڈ کوئٹہ ۱۳۹۹ھ)

''اولیائے کرام قربِ الٰہی کے حوالہ سے زائرین کو فائدہ پہنچانے میں اپنے مقام و مرتبہ میں ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔''

(۲) قَالَ الشَّافِعِیُّ : اِنِّیْ لَاَتَبَرَّکُ بِاَبِیْ حَنِیْفَۃَ وَاَجِیْءُ اِلٰی قَبْرِہٖ فَاِذَاعَرَضَتْ لِیْ حَاجَۃٌ'' صَلَّیْتُ رَکْعَتَیْنِ وَسَأَلْتُ اللّٰہَ تَعَالٰی عِنْدَ قَبْرِہٖ فَتُقْضٰی سَرِیْعًا (ایضًا ص ۴۱)

''امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے تبرک حاصل کیا کرتا ہوں' میں آپ کے مزار پر حاضر ہوتا ہوں' جب مجھے کوئی ضرورت پیش آتی ہے تو دو رکعت نماز پڑھتا ہوں اور آپ کے مزار کے پاس اللہ تعالیٰ سے درخواست کرتا ہوں تو جلد ہی (میری) ضرورت پوری ہو جاتی ہے۔''

یہ بات قرآنِ حکیم کے اس اعلان کے مطابق ہے کہ اللہ تعالیٰ سے اُس کے نیکوکار بندوں کے توسّل سے مانگنا اُس کی بے پایاں رحمت کو دعوت دیتا ہے اور قادرِ مطلق ہونے کی حیثیت سے وہ دُعا کو فی الفور قبول کرتا ہے۔ جب حضرت زکریا علیہ السلام نے اُس مقام یا اُس جگہ پر اللہ تعالیٰ سے بیٹا عطا کئے جانے کی درخواست کی جہاں سیّدہ مریم سلام اللہ علیہا کو رب کی جانب سے بے موسمی پھل دئے جاتے تھے' تو آپ کی درخواست (اگرچہ آپ بچہ جننے جنانے کی عمر میں نہیں تھے اور اپنی عمرِ طبعی کو پہنچ چکے تھے) منظور کر لی گئی (سورہ آلِ عمران: ۳۷ تا ۴۱)۔ یہ بات اہم ہے کہ اگرچہ سیّدہ مریم پیغمبر نہیں تھیں بلکہ ولیّہ تھیں لیکن زکریا علیہ السلام نے پیغمبر ہو کر اُن کے سرہانے کھڑے ہو کر دعا کی۔ سورہ آلِ عمران کی آیت ۳۷ میں لفظ ھُنَـــا فکر انگیز اور غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے جس کا معنیٰ ''اُس وقت'' یا ''اُس جگہ'' کا ہے۔ اصل میں یہ لفظ کسی مقام کا متعلق فعل (Adverb) ہوتا ہے اور وقت کے (Adverb) کے طور پر بھی استعمال ہوتا ہے۔ اس طرح لفظ ھُنَا توسّل پر دلالت کر رہا ہے۔

یہاں امام حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے اُس مرتبہ و مقام کا ذکر کرنا بے جا نہ ہوگا جو اُنہیں نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے حضور حاصل ہے۔ اِس سلسلہ میں ہم ''فتاویٰ شامی'' کی جلد اوّل کے صفحہ ۳۹ پر ابنِ عابدین کا یہ ذیلی نوٹ پاتے ہیں:

وَعَنْہُ عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ أَنَّ آدَمَ اِفْتَخَرَبِیْ وَأَنَااَفْتَخِرُ بِرَجُلٍ مِّنْ اُمَّتِیْ اِسْمُہٗ نُعْمَانُ وَکُنْیَتُہٗ أَبُوْحَنِیْفَۃَ وَعَنْہُ عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ أَنَّ سَائِرَ الْاَنْبِیَاءِ یَفْتَخِرُوْنَ بِیْ وَأَنَااَفْتَخِرُبِاَبِیْ حَنِیْفَۃَ مَنْ اَحَبَّہٗ فَقَدْ اَحَبَّنِیْ وَمَنْ اَبْغَضَہٗ فَقَدْاَغْضَبَنِیْ (رُوِیَ بِطُرُقٍ مُّخْتَلِفَۃٍ)

''نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں کہ حضرت آدم مجھ پر فخر کرتے ہیں اور میں اپنی امت میں سے ایسے شخص پر فخر کرتا ہوں جس کا نام نعمان اور کنیت ابوحنیفہ ہے۔ آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ تمام انبیائے کرام

مجھ پر فخر کرتے ہیں اور میں ابو حنیفہ پر فخر کرتا ہوں ۔ جس نے ابو حنیفہ سے محبت کی' اُس نے مجھ سے محبت کی اور جس نے اُس سے بغض رکھا' اُس نے مجھ سے بغض رکھا ۔''

''**اولیائے کرام سے توسّل**: امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ (۴۵۰۔۵۰۵/۱۰۵۸۔۱۱۱۱) ''احیاء علوم الدین'' میں لکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ انبیاء علیہم السلام' صدّیقین' علماء اور نیکو کاروں کی شفاعت کو قبول فرمائے گا ۔ اللہ کی نظر میں ہر مقرب بندے کو اپنے رشتہ داروں' دوستوں اور لواحقین کی شفاعت کرنے کی اجازت دی جائے گی ۔

تمام دنیا کے مسلمان اولیائے کرام کے مقبروں کی زیارت کرتے ہیں اور اُن سے تبرک حاصل کرتے ہیں ۔ مصر کے ایک صوفی محمد ذکی ابراہیم نے اولیائے کرام سے توسّل کرنے کے دفاع سے متعلق بہت کچھ لکھا ہے ۔ اُنہوں نے سورۃ المائدۃ کی آیت ۳۵: اِتَّقُوا اللّٰهَ وَابْتَغُوْا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ (اللہ سے ڈرو اور اُس (کے قرب) کا وسیلہ تلاش کرو) کی تاویل خدا رسیدہ بندوں کے توسّل سے کی ہے خواہ وہ زندہ ہوں یا مُردہ ۔ اُن کا کہنا ہے کہ مسلمان اولیاء سے نہیں مانگتے جیسا کہ معترضین الزام لگاتے ہیں بلکہ وہ اولیاء کے خلوصِ ایمان' راستی' محبت اور نیکو کاری کے ذریعے اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کی راہ نکالتے ہیں ۔ محمد ذکی نے جامع ترمذی کی ایک حدیث کا حوالہ بھی دیا ہے جس میں نبی علیہ السلام نے ایک نابینا شخص کو ہدایت فرمائی کہ وہ یوں کہے:

''یا رسول اللہ! میں رب تعالیٰ سے آپ کا توسّل کرتا ہوں کہ وہ میری بینائی مجھے لوٹا دے ۔''

محمد ذکی ابراہیم کہتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام اور اولیائے کرام سے توسّل کو شرک اور بت پرستی کا نام دینا جہالت ہے جس کا مطلب جمہور مسلمانوں کو دائرہ اسلام سے خارج کرنا ہے ۔ نیکو کار کا وسیلہ پکڑنے کا مطلب توسّل کیے جانے والے کی عبادت کرنا نہیں ہوتا ۔

اولیائے کرام کے مقبروں کے پاس نماز پڑھنا: ایک اسلامی روایت کے مطابق حضرت اسمٰعیل علیہ السلام اور کچھ دیگر متبرک ہستیاں کعبۃ اللہ کی دیواروں کے نیچے دفن ہیں جہاں کا کوئی لمحہ اللہ کی عبادت سے خالی نہیں ہوتا ۔ مزید برآں سیّدہ عائشہ صدّیقہ رضی اللہ عنہا اُسی حجرہ میں رہتی اور نماز پڑھتی تھیں جہاں نبی ﷺ' ابو بکر صدّیق اور عمر رضی اللہ عنہما مدفون ہیں ۔ آخر میں محمد ذکی کہتے ہیں کہ مسجدیں مزارات کے قریب بنائی گئی ہیں تا کہ متوفیان کو وہاں کے تلاوتِ قرآن' نماز اور ذکر و اَذکار کی برکت کا فائدہ پہنچے اور اس طرح نیکو کار متوفیان زندہ لوگوں کے لئے اچھی مثال بنیں ۔

اولیائے کرام کے مزارات کی تاثیر کے متعلق محمد ذکی نے امام شافعی علیہ الرحمۃ کی مثال بھی دی ہے جو امام ابو حنیفہ علیہ الرحمۃ (م ۱۵۰/۷۶۷) کے مزار پر حاضری دیتے اور اُن کی دعائیں قبول ہوتیں ۔ متوفّی کی مدد زندہ لوگوں سے زیادہ کارگر ہوتی ہے اور اولیائے کرام کی وفات سے اللہ کی رحمت ختم نہیں ہو جاتی ۔'' (''قضایائے وسیلہ'' ۔۔ ذکی ابراہیم' صفحہ ۴۷)

(۹۲) بین الاقوامی تعلقات اور خارجہ پالیسی (International Relations & Foreign Policy)

اسلام امن و آشتی کا دین ہے اور ہر شعبہ حیات میں قانون کی بالا دستی کو قائم رکھتا ہے۔ بین الاقوامی تعلقات کے قیام اور دوسری اقوام سے معاہدے کرنے میں اسی اصول کو پوری اسلامی تاریخ میں دیکھا جا سکتا ہے تا کہ دنیا کے لوگ کسی جبر و تشدد' استبداد یا ظلم کے خوف کے بغیر زندگی بسر کریں۔ امنِ عالم کے مقصد کے حصول کے لئے اسلام اُن تمام اقوام اور ممالک کو خوش آمدید کہتا ہے اور اُن سے دستِ تعاون دراز کرتا ہے جو دنیا میں نظم وضبط' قانون اور امن و آشتی کے قیام میں مدد کریں۔ لہٰذا اسلام بڑی خوش دلی سے کسی بھی ملک سے ہر ایسے مخلصانہ معاہدے میں شامل ہونے کو تیار رہتا ہے جو ایسے اعلیٰ مقصد کے حصول میں مستعد ہو۔ اسلام اُس وقت تک معاہدہ شکنی نہیں کرتا جب تک فریقِ ثانی علانیہ طور پر یا رسمی طور اُسے یا اُس کی کسی شرط کو توڑ نہ دے۔ ایسی صورت میں مسلمانوں کو موقع کے مطابق کارروائی کرنے کا حق حاصل ہوتا ہے اور وہ معاہدے کی شرائط کے پابند نہیں ہوتے۔ قرآنِ حکیم کی تعلیمات اس اصول کی راہ نما ہیں۔ آیات ملاحظہ ہوں:۔

(۱) وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَاوَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ (الانفال : ٦١)

''اور اگر وہ (دشمن) صلح کی طرف جھکیں تو آپ بھی اس طرف جھک جائیں اور اللہ پر توکل کریں۔'' (۸:۶۱)

(۲) فَمَااسْتَقَامُوْا لَكُمْ فَاسْتَقِيْمُوْا لَهُمْ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ O (التوبة : ٧)

''جب تک وہ تم سے سیدھے رہیں تم بھی اُن سے سیدھے رہو۔ بے شک اللہ پرہیزگاروں کو دوست رکھتا ہے۔'' (۹:۷)

(۳) وَاِنْ نَّكَثُوْا اَيْمَانَهُمْ مِّنْ بَعْدِ عَهْدِهِمْ وَطَعَنُوْا فِىْ دِيْنِكُمْ فَقَاتِلُوْا اَئِمَّةَ الْكُفْرِ اِنَّهُمْ لَا اَيْمَانَ لَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَنْتَهُوْنَ O (التوبة : ١٢)

''اور اگر وہ اپنی قسموں کو اپنے عہد کے بعد توڑ ڈالیں اور تمہارے دین پر طعن کریں تو تم اِن پیشوایانِ کفر سے جنگ کرو کہ (اس صورت میں) اُن کی قسمیں باقی نہیں رہیں تا کہ وہ باز آجائیں۔'' (۹:۱۲)

خارجہ تعلقات کے بارے میں آنجناب ﷺ کی سنتِ مبارکہ سے حسبِ ذیل درجہ بندی ہمیں معلوم ہوتی ہے:

(الف) مسلم ممالک

(ب) غیر مسلم ممالک جن کے ساتھ معاہدہ ہے (معاہد)۔

(ج) غیر مسلم ممالک جن کے ساتھ کوئی معاہدہ نہیں ہوتا۔

(الف) مسلم ممالک : مسلم ممالک کو ایک دوسرے کے قریب لانے میں خدائے واحد پر ایمان' اُس کے قانون کی اطاعت ایک مضبوط اور اٹوٹ انگ عامل ہے۔ اتحاد کے اس بندھن کو اُس وقت دھچکا لگتا ہے جب کوئی مسلمان ملک اپنے ہی کسی برادر ملک کے خلاف جارحیت کا ارتکاب کرتا ہے۔ ایسی صورت میں دوسرے مسلم ممالک اخلاقی اور قانونی طور پر اُن کے درمیان گفت وشنید کے ذریعے' یا ثالثی کے ذریعے یا کسی اور طریق سے مساویانہ بنیاد پر امن اور دوستانہ تعلقات قائم کرنے کے پابند ہیں۔ قرآنِ حکیم فرماتا ہے :

وَاِنْ طَآئِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا فَاِنْ بَغَتْ اِحْدٰهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِىْ تَبْغِىْ حَتّٰى تَفِىْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَاَقْسِطُوْا اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَO اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَO (الحجرات : ۹' ۱۰)

''اور اگر مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں جنگ کرنے لگیں تو اُن کے درمیان صلح کرادو۔ پھر اگر ان میں کا ایک گروہ دوسرے پر زیادتی کرے تو اُس سے لڑو جو زیادتی کر رہا ہے یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف رجوع کرلے۔ پھر اگر وہ رجوع کرلے تو اُن کے درمیان عدل کے ساتھ صلح کرادو اور انصاف کا خیال رکھو' بے شک اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ بے شک مسلمان (آپس میں) بھائی بھائی ہیں' سو اپنے دو بھائیوں کے درمیان صلح کرادیا کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔'' (۴۹:۱۰'۹)

زبان' رنگ ونسل' قومیت اور جغرافیائی حالات میں تفاوت کے باوجود تمام مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں اور ایک ہی ناقابلِ جدا سماج سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس لئے ایک انفرادی مسلمان کا کیا ہوا معاہدہ تمام مسلم سماج کے نزدیک قابلِ تعظیم وتکریم ہوتا ہے۔ پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایک عورت کی جانب سے کئے ہوئے معاہدہ تحفظ کو اِن الفاظ میں قبول فرمایا:

''اے اُمِّ ہانی! جسے تم نے تحفظ دیا ہے' ہم بھی اُسے تحفظ دیتے ہیں۔''

اس حقیقت کی توثیق اس بات سے بھی ہوتی ہے جب عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ایک غلام کی جانب سے معاہدہ تحفظ کو ان الفاظ میں قبول کیا جو اُس نے عراق کے ایک شہر کے باشندوں کو دیا:

''اللہ تعالیٰ نے وعدوں کی تکمیل کی تاکید کی ہے اور تم وعدوں کے ایفا کرنے والے نہیں ہو جب تک کہ تم اُنہیں پورا نہ کرو لہٰذا اپنے وعدوں کو پورا کرو۔'' ...("The Eternal Message of Muhammad"
Abdur Rahman Azam, p. 132)

(ب) <u>غیر مسلم معاہد ممالک</u> : قانونی طور پر ایک مسلم ریاست اپنے اور دوسری غیر مسلم ریاست کے درمیان طے شدہ معاہدے کی شرائط کی پابند ہوتی ہے اور اُن کے دوطرفہ تعلقات کی نوعیت اُن طے شدہ شرائط کی نوعیت کے مطابق ہوگی۔ مسلمان ریاست غیر مسلموں کے حقوق وفرائض کے معاہدے کی شرائط کے مطابق پوری طرح تعظیم وتوقیر کرے گی۔ بیرونی مداخلت یا حملے سے تحفظ کے معاہدہ کی صورت میں مسلم ریاست اخلاقی طور پر اس معاہدے کی پابند ہے اور بہتر طور پر وہ اُن کے دشمن سے اُن کی حفاظت کرے گی۔ اگر کسی وقت میں مسلم ریاست اُن کی حفاظت نہیں کرسکتی تو وہ غیر مسلموں سے لیا ہوا ڈیفنس ٹیکس (جزیہ) اُنہیں واپس کرے گی جیسا کہ خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے کیا تھا جب وہ امیسا کے عیسائیوں کو بازنطینی حکمران ہیریکلیس کے حملے سے تحفظ نہ دے سکے۔ اُنہیں جزیہ واپس کرتے ہوئے خالد نے کہا:

''ہم نے جزیہ تمہاری سرگرمی کی علامت کے طور پر لیا تھا جس کے بدلے میں ہم تمہاری حفاظت کریں گے لیکن تحفظ دینے میں ہم ناکام ہو گئے ہیں۔''

اسلام نے معاہدہ کے تقدس پر بہت زور دیا ہے۔ یہاں تک کہ معاہدوں کا تقدس مسلم اخوت سے بھی فائق ہے جیسا کہ قرآنِ حکیم میں ہے:

وَاِنِ اسْتَنْصَرُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ اِلَّا عَلٰى قَوْمٍۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ''(الانفال:۷۲)

''اور اگر وہ دین کے کام میں مدد چاہیں تو تم پر مدد کرنا واجب ہے بجز اس کے اُس قوم کے مقابلہ میں ہو جس کے اور تمہارے درمیان معاہدہ ہو۔'' (۷۲ : ۸)

یہ آیت واضح طور پر مسلمانوں کو حکم دیتی ہے کہ وہ اپنے مظلوم مسلمان بھائیوں کی مدد کرنے کے فرض کا احساس کریں اگر اُنہیں مدد کی ضرورت ہو۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اُنہیں یہ بھی جتلا دیا گیا ہے کہ وہ معاہدے کی شرائط اور اعلیٰ اسلامی اخلاقیات کی پابندی کے فرض کے بھی پابند رہیں۔ اس وجہ سے اُنہیں اپنے مظلوم بھائیوں کی مدد اُس ملک کے خلاف نہیں کرنی چاہئے جن سے اُن کا معاہدہ ہے۔ معاہدے کی پابندی اسلامی ریاست اور اس میں رہنے والے مسلمانوں دونوں پر ضروری ہے۔ تاہم اسلامی ریاست کی علاقائی حدود سے باہر رہنے والے مسلمان اس پابندی سے آزاد ہیں۔ پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کو ابو جندل کو قریش کی طرف واپس کرنا پڑا جب وہ صلح حُدیبیہ کے موقع پر بیڑیوں میں جکڑے آپ ﷺ کے پاس مدد کے لئے آئے تھے۔ اس حقیقت کی توثیق ایک اور قرآنی آیت سے بھی ہوتی ہے:

وَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ'' فَدِيَةٌ'' مُّسَلَّمَةٌ''اِلٰٓى اَهْلِهٖ (النّساء : ۹۲)

''اور اگر مقتول ایسی قوم سے ہو کہ تمہارے اور اُن کے درمیان معاہدہ ہے تو خوں بہا واجب ہے جو اُس کے عزیزوں کے حوالے کیا جائے گا۔'' (۹۲ : ۴)

اس آیت نے واضح طور پر اس اصول کو وضع کر دیا ہے کہ خوں بہا کسی غیر مسلم ملک کے باشندے کے قتلِ خطا پر ادا کیا جائے گا اور اُس غیر مسلم ملک کا مسلم ریاست کے ساتھ معاہدہ ہے۔ اس طرح ایسی قرآنی آیات مکمل طور پر اس بات کو واضح کرتی ہیں کہ معاہدے کے واجبات کی اسلامی قانون میں کیا اہمیت ہے۔ کچھ بھی ہو جائے مسلمانوں کو کسی بھی صورت میں دوسرے ملکوں سے کئے گئے اپنے وعدے اور معاہدے توڑنے میں پہل کرنے کی قطعاً اجازت نہیں خواہ وہ دشمن ہوں یا دوست۔

(ج) <u>غیر مسلم ممالک جن کے ساتھ کوئی معاہدہ نہیں</u> : عالمی امن، حق و انصاف اور راستی کو رُو بہ ترقی کرنے میں تمام غیر مسلم ممالک کے ساتھ دوستی اور باہمی تعاون کو بڑا دخل ہے جیسا کہ ذیل کی آیت میں آیا:

تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ (المائدۃ : ۲)

''نیکی اور خدا خوفی کے کاموں میں ایک دوسرے سے تعاون کیا کرو اور گناہ اور ظلم و تعدی کے کاموں میں تعاون نہ کرو۔''

یہ آیت اسلامی ریاست کے دوسری ریاستوں کے ساتھ خارجی تعلقات کی بنیاد فراہم کرتی ہے جس کا جزوِ لاینفک انصاف' مساوات اور درست معاملات ہیں ۔ اُسی سورۃ المائدۃ کی آیت ۸ میں قرآنِ مجید کا یہ حکم ہے:

يَآ يُّهَاالَّذِيْنَ آمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰى اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ O (المائدۃ : ۸)

''اے ایمان والو! اللہ کے لئے پوری پابندی کرنے والے (اور) عدل کے ساتھ شہادت دینے والے ہو جاؤ اور کسی جماعت کی دشمنی تمہیں اس پر آمادہ نہ کرے کہ تم اس کے ساتھ انصاف ہی نہ کرو ۔ انصاف کرتے رہو کہ وہ تقویٰ سے بہت قریب ہے اور اللہ سے ڈرتے رہو ۔ بے شک اللہ کو اس کی پوری خبر ہے کہ تم کیا کرتے رہتے ہو ۔'' (۸ : ۵)

اور سورۃ النّساء میں مسلمانوں کو یوں حکم دیا گیا :

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰى اَهْلِهَا وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ اِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهٖ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِيْعًا بَصِيْرًا O (اَلنِّساء : ۵۸)

''اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں اُن کے اہل کو ادا کر دو اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو انصاف کے ساتھ فیصلہ کرو ۔ بے شک اللہ تمہیں کیا ہی خوب نصیحت کرتا ہے' بے شک اللہ بڑا سننے والا' بڑا دیکھنے والا ہے ۔''

اِس اور اِس قسم کی دوسری آیات میں انسانی تعلقات میں عدل و انصاف پر بہت زیادہ زور دیا گیا ہے ۔ مسلمانوں کو انفرادی اور اجتماعی دونوں سطح پر عدل و انصاف سے کام لینے کا حکم دیا گیا ہے ۔ لہٰذا اسلامی ریاست جو مسلمانوں کا اجتماعی ادارہ ہے' کا فرض ہے کہ وہ جنگ و امن دونوں حالتوں میں تمام معاملات میں انصاف سے کام لے خواہ اُن معاملات کا تعلق اُس کے اپنے باشندوں سے ہو یا دوسری ریاستوں سے ۔

سورۃ المائدۃ میں نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اللہ ربّ العزت نے ہر حالت میں عدل و انصاف کرنے کا حکم دیا:

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ ۔۔۔فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الْحَقِّ (المائدۃ : ۴۸)

''اور ہم نے آپ پر یہ کتاب اتاری ہے ۔۔۔ تو آپ اُن لوگوں کے درمیان اللہ کے اتارے ہوئے احکام کے مطابق فیصلہ کیا کیجئے اور اُن لوگوں کی خواہشوں پر عمل نہ کیجئے اُس سچائی سے الگ ہو کر جو آپ کے پاس آ چکی ہے ۔'' (۵:۴۸)

سورۃ الحدید کی آیت ۲۵ میں اسی ہدایت کو پھر دُہرایا گیا ہے اور فرمایا گیا ہے :

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ

''ہم نے اپنے پیمبروں کو کھلی ہوئی چیزیں دے کر بھیجا اور ہم نے اُن کے ساتھ کتاب کو اور انصاف کرنے کو نازل کیا تا کہ لوگ اعتدال پر قائم رہیں ۔'' (۲۵ : ۵۷)

اِس طرح وہ بنیادی اصول جو اسلام میں خارجی تعلقات کو حاوی ہے وہ یہ کہ ریاستی معاملات میں مسلمان اور غیر مسلم قطعی طور پر باہم مساوی ہیں۔ ''بین الاقوامی قانون کی تاریخ میں جنگ و امن دونوں حالتوں میں مسلمانوں ہی نے بغیر کسی امتیاز یا اختصاص کے غیر ملکیوں کے حقوق کو تسلیم کرنے میں پہل کی ہے۔ چونکہ اسلامی ریاست کا بنیادی مطمحِ نظر (Ideology) اللہ تعالیٰ کی حاکمیت ہے جو تمام جہانوں کا خالق و مالک ہے' اِس لئے مذہبی رواداری اور تمام مخلوق سے انصاف کا رویّہ اختیار کرنا ناگزیر اور لازم ہے۔'' ("Introduction to Islam"
... Dr. Muhammad Hamidullah, p. 105)

تمام بنی نوعِ انسان ایک ہی مشترک سلسلۂ نسب (Common Ancestry) سے ہیں اور اس وجہ سے قطع نظر رنگ و نسل اور قوم کے مشترک اخوّت (بھائی چارے) کی لڑی میں باہم جُڑے ہوئے ہیں۔ قرآن حکیم نے حضرتِ انسان کو اِس آفاقی اخوّت کے تصوّر کی کئی مقامات پر یاددہانی کرائی ہے۔ مثلاً فرمایا:

(۱) یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَۃٍ وَّخَلَقَ مِنْھَا زَوْجَھَا وَبَثَّ مِنْھُمَا رِجَالًا کَثِیْرًا وَّنِسَآءً (النساء : ۱)

''لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تم سب کو ایک ہی جان سے پیدا کیا اور اُسی سے اُس کا جوڑا پیدا کیا اور اُن دونوں سے بہ کثرت مرد اور عورتیں پھیلا دیے۔'' (۱ : ۴)

(۲) وَھُوَالَّذِیْٓ اَنْشَاَکُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَۃٍ فَمُسْتَقَرٌّ'' وَّمُسْتَوْدَعٌ'' (الانعام : ۹۸)

''اور وہ وہی تو ہے جس نے تم (انسانوں) کو ایک ہی جان سے پیدا کیا۔ پھر ایک جگہ ٹھہرنے کی اور ایک جگہ امانت رکھنے کی ہے۔'' ☆ (۹۸ : ۶)

(۳) ھُوَالَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَۃٍ وَّجَعَلَ مِنْھَا زَوْجَھَا لِیَسْکُنَ اِلَیْھَا (الاعراف:۱۸۹)

''وہ وہی (پروردگار) ہے جس نے تمہیں ایک جانِ واحد سے پیدا کیا اور اُسی سے اُس کا جوڑا بنایا تاکہ وہ (جوڑے) سے تسکین حاصل کرے۔'' (۱۸۹ : ۷)

(۴) یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰکُمْ مِّنْ ذَکَرٍ وَّاُنْثٰی وَجَعَلْنٰکُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَاللّٰہِ اَتْقٰکُمْ اِنَّ اللّٰہَ عَلِیْمٌ'' خَبِیْرٌ'' O (اَلْحُجُرات : ۱۳)

''اے لوگو! ہم نے تم (سب) کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے اور تمہیں مختلف قومیں اور خاندان بنایا ہے تاکہ ایک دوسرے کو پہچان سکو' بے شک اللہ کے نزدیک تم میں سے پرہیزگار تر معزز تر ہے۔''

چونکہ تمام بنی نوعِ انسان ایک ہی مشترک سلسلۂ نسب ہونے کے حوالے سے ایک ہی سماج اور ایک معاشرہ ہیں' لہٰذا قطع نظر غربت و اَمارت' رنگ و نسل و قومیت اور جغرافیائی یا دینی اختلافات کے اُن میں سے فرد مساوی حقوق کا حامل ہے۔ اِس اصول کی وضاحت میں متعدد قرآنی اقتباسات پائے جاتے ہیں۔ مثلاً

☆ مُسْتَقَرٌّ سے مراد دنیاوی زندگی اور مُسْتَوْدَعٌ سے مراد عالم برزخ یعنی قبر کی زندگی ہے۔

(۱) كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللهُ النَّبِيِّيْنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ (البقرة : ۲۱۳)
''لوگ ایک ہی اُمّت تھے' پھر اللہ نے خوشخبری دینے والے اور ڈرانے والے انبیاء علیہم السلام بھیجے۔''

(۲) وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّآ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ فِيْمَا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ O (یُونُس : ۱۹)
''اور انسان تو ایک ہی طریقہ پر تھے' پھر اُنہوں نے باہم اختلاف کیا اور اگر آپ کے پروردگار کی طرف سے ایک بات پہلے سے نہ ٹھہر چکی ہوتی تو اُن کے درمیان اس باب میں جس میں وہ اختلاف کر رہے ہیں' فیصلہ کر دیا گیا ہوتا۔'' (۱۹ : ۱۰)

یعنی عذابِ موعود جو عملی فیصلہ ہے' اِسی دنیا میں نازل ہو گیا ہوتا۔ کَلِمَة سے مراد یہ وعدہ یا حکم ہے کہ پورے عذاب کے لئے اُنہیں مہلت آخرت تک کی ملے گی۔

تمام بنی نوعِ انسان کے مشترک سلسلہ نسب اور ایک ہی سماج سے متعلق ہونے کے اصول کو مستحکم کرنے کے بعد قرآنِ حکیم اُنہیں اللہ کے آخری پیغمبر ﷺ کے آفاقی پیغام کی دعوت دیتا ہے جو زبان اور رنگ و نسل کے تمام اختلافات و امتیازات کو مٹا دیتا ہے اور اُنہیں اخوت' پیار و محبت' رواداری اور جذبہ قربانی کی لڑی میں پرو دیتا ہے:۔

(۱) وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ O (الانبياء : ۱۰۷)
"(اے پیغمبر!) اور ہم نے آپ کو تمام جہانوں کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔'' (۲۱:۱۰۷)

(۲) وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ O (سَبا:۲۸)
"(اے پیغمبر!) اور ہم نے آپ کو تمام انسانوں کے لئے بطور خوشخبری سنانے والے کے اور ڈرانے والے کے (پیمبر بنا کر) بھیجا ہے لیکن اکثر لوگ نہیں سمجھتے۔'' (۲۸ : ۳۴)

(۳) اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا O (الفتح : ۸)
''(اے پیغمبر!) ہم نے آپ کو گواہ اور بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔'' (۴۸:۸)

یہ اور اِس قسم کی دیگر قرآنی آیات اِس حقیقت کو مدلّل طور پر ثابت کرتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نوعِ انسانی کے لئے اخوت کی راہ میں کسی قسم کی رکاوٹ کی اجازت نہیں دیتا اور تمام شعبہ ہائے حیات میں اُنہیں مساوی حقوق اور مراعات عطا کرتا ہے۔ یہی اصول اُن کے بین الاقوامی تعلقات اور معاملات میں کارفرما ہے۔ اِسی بنیاد پر نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ رضائے الٰہی کی خاطر بغیر کسی جانبداری' ذاتی مفاد' ڈر اور طرفداری کے تمام لوگوں سے انصاف کا رویّہ اختیار کیا جائے۔ ایک اسلامی ریاست کو غیر ملکی ریاستوں سے نمٹنے میں خواہ وہ دوست ہوں یا نہ ہوں' عملی طور پر اس اصول پر کاربند رہنا چاہیے۔

اسی طرح غیر ملکی ریاستوں سے امن و آشتی اور دوستانہ تعلقات کے قائم کرنے میں ہمیشہ مسلمانوں نے

پیش قدمی کی ہے۔ دشمن اگر چہ غیر معتمد اور فریب کار ہو، تب بھی مسلمانوں کو اُس سے امن و آشتی سے رہنے کا حکم ہوا اگر دشمن ایسا چاہتا ہو اور مسلمانوں کو اللہ پر توکل کرنا چاہئے۔ چنانچہ سورۃ الانفال میں حکم ہوا:

وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَاوَتَوَكَّلْ عَلَى اللهِ (الانفال: ٦١)

"اور اگر وہ (دشمن) صلح کی طرف جھکیں تو آپ بھی اس طرف جھک جائیں اور اللہ پر توکل کریں۔" (٨:٦١)

سنتِ نبوی کی روشنی میں بین الاقوامی تعلقات

پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام ہمسایہ قبیلوں اور ریاستوں سے دوستانہ تعلقات قائم کرنے کے بڑے ہی پُرشوق اور آرزومند تھے۔ آپ اُن کے وفدوں کا بڑے عزت واحترام کے ساتھ استقبال فرماتے تھے اور مدینہ منورہ میں اُن کے قیام کے دوران خود ہی اُن کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ آپ کے صحابہ کرام اِن وفود کی خدمت کرنے میں اکثر آپ کی مدد کرنے کا اِصرار کرتے لیکن آپ اُنہیں اس کی اجازت نہ دیتے۔ آپ نے تمام ہمسایہ قبائل سے نہ صرف دوستانہ تعلقات قائم کئے بلکہ اُن کے تنازعات کو بھی انصاف و معدلت (Equity) کی بنیاد پر چکایا۔ اس تعلق کی فطری خصوصیت کی بنیاد پر ریاستوں یا قبائل کو تین قسموں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

(۱) مسلم قبائل: مدینہ کے اندر اور باہر رہنے والے تمام مسلم قبائل سے تمام معاملات میں اسلامی اخوت کے ارکان ہونے کے طور پر سلوک روا رکھا جاتا تھا۔

"صلح حدیبیہ کے بعد ایک عجیب صورتِ حال پیدا ہوئی جب قبیلہ قریش کے کچھ لوگوں نے اسلام قبول کر لیا اور اپنے شہر مکہ کو چھوڑ دیا۔ معاہدۂ حدیبیہ کی شرائط کی رُو سے مدینہ کے مسلمان اُنہیں قبول نہ کرسکتے تھے ☆۔ جب اُن میں سے ابوجندل نامی ایک مسلمان نبی اکرم ﷺ کے پاس مدد کے لئے آئے تو آپ نے ابوجندل سے فرمایا کہ ہم نے اِن لوگوں (کفار) سے جو معاہدہ کیا ہے، تمہیں معلوم ہے اور یہ بات اچھی نہیں اگر کوئی فریب کاری یا دغا ہمارے دین میں داخل ہو جائے۔ بھگوڑے ابوجندل نے عرض کی کہ کیا آپ مجھے کافروں کی طرف واپس کر دیں گے جو مجھے میرے دینِ اسلام سے پھیر دیں گے؟ پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: "چلے جاؤ، اللہ رب العزت تمہارے اور تمہارے ساتھ کے بیچاروں کے لئے تن آسانی اور حفاظت کی راہ نکال دے گا۔" ("سیرت رسول اللہ ﷺ" لابنِ اسحاق، صفحہ ۵۰۷ بحوالہ انسائیکلوپیڈیا آف سیرۃ از افضال الرحمٰن)

ستر کی تعداد میں اِن لوگوں نے بحرِ احمر کے نزدیک ذوالمروۃ نامی علاقے میں العیس کے نزدیک ایک گروہ بنا لیا

☆ معاہدۂ حدیبیہ کی سات شرطوں میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ اگر کوئی مسلمان مکہ سے بھاگ کر مدینہ آئے گا تو مسلمان اُسے مکہ کو واپس بھیجنے کے پابند ہوں گے لیکن اگر کوئی مسلمان مدینہ سے بھاگ کر مکہ آئے گا تو اُسے واپس نہیں کیا جائے گا۔ نگاہِ نبوت نے اس کے دُور رس نتائج کو بھانپتے ہوئے اس شرط کو خوش دلی سے قبول کر لیا تھا اور دراصل (بہ ظاہر یہی ناگوار) شرط فتح مکہ کا سبب اور پیش خیمہ بنی۔

جو اُس راہ میں تھا جہاں سے قبیلہ قریش کا ملکِ شام کو جاتے ہوئے گزر ہوتا تھا۔ اِن لوگوں نے قریشی لوگوں کو غارت کرنا شروع کر دیا اور جو قریشی بھی اُن کے قابو میں آتا' اُسے قتل کر دیتے۔ اس طرح اُنہوں نے قریش کے تجارتی قافلوں کے لئے بڑی سراسیمگی پیدا کر دی۔ پیغمبر علیہ السلام کے پاس اس کی روک تھام کے لئے کوئی چارۂ کار نہ تھا' لہٰذا بالآخر قریش نے آپ سے معاہدہ کی اس شرط کو منسوخ کرنے اور اُن لوگوں کو مدینہ واپس لے جانے کی درخواست کی۔'' (ایضاً' صفحہ ۵۰۸ بحوالہ انسائیکلو پیڈیا آف سیرۃ از افضال الرحمٰن)

''(۲) غیر مسلم معاہد قبائل : مدینہ منورہ میں نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تشریف آوری پر آپ اپنے اس قدر کثیر دشمنوں سے نمٹنے میں بڑی نازک صورتِ حال سے دوچار تھے۔ حکمت و مصلحت کا تقاضا یہی تھا کہ آپ قریب کے غیر مسلم عرب قبائل بالخصوص بحرِ احمر کے ساحل کے قرب میں سے کچھ کو اپنا دوست بنائیں تاکہ ملکِ شام کو جاتے ہوئے قریش کے تجارتی راستوں کو بند کرنے کے ذریعے اُن پر دباؤ ڈالا جا سکے۔ اس مقصد کی خاطر آپ نے مدینہ کے قرب میں رہنے والے قبائل اشجع' عامر بن عکرمہ' بنوضمرہ' بنوغِفار' بنومدلج' جُہانہ اور مُزینہ سے دوستانہ تعلقات قائم کئے۔ مکہ کے قرب میں رہنے والے معاہد قبائل بنوخزاعہ اور بنوعبد بن عدی تھے۔'' ("Muhammad--- The Educator of Mankind"--- Afzalur Rahman, p. 835)

''آپ نے نجد کے شمال مشرق میں' یمامہ کے مشرقِ اقصٰی میں' عمان' حضر موت اور بحرین میں واقع عرب ممالک سے' یمن کے جنوب میں عیسائیوں سے' اور شمال میں جربہ' عزرہ' عیلہ (عقبہ)' قضاعہ اور دومۃ الجندل کے عیسائیوں اور یہودیوں سے کچھ معاہدے کئے۔ جب خیبر کے یہودیوں کو شکست ہوئی تو اُنہوں نے درخواست کی کہ اُنہیں وہاں اِس شرط پر رہنے کی اجازت دی جائے کہ وہ اپنی زمینوں کی کاشت کریں گے اور مسلمانوں کو زمینی پیداوار کا نصف حصہ دیتے رہیں گے جسے پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام نے منظور کر لیا اور اس معاہدے پر مسلمانوں اور یہود کے دستخط ہو گئے۔ اِسی قسم کے معاہدے فدک' تیما اور وادی القراع کے یہود سے ہوئے۔ اِن تمام معاہدوں میں نبی اکرم ﷺ نے معاہد فریق کو تحفظِ حیات و جائیداد کی ضمانت دی جس کے بدلے میں معاہد فریق جزیہ نامی ٹیکس ادا کرنے کا پابند ہوگا۔ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام اِن تمام قبائل کی ہمیشہ تعظیم و تکریم کرتے تھے اور آپ نے کسی معاہدے کو توڑنے میں کبھی پہل نہیں کی بلکہ دوسرے فریقوں نے مسلمانوں سے کئے ہوئے معاہدے کی شرائط کو توڑنے میں پہل کی۔ قریش نے قبیلہ بنی خزاعہ کے لوگوں کو بے رحمی سے قتل کرنے میں حُدیبیہ کی شرائط کو توڑ دیا جو مسلمانوں کا معاہد قبیلہ تھا۔ اسی طرح بعد میں خیبر' وادی القراع اور فدک کے یہودنے بھی کئے ہوئے معاہدوں کو توڑنے میں پہل کی۔ سن ۹ ہجری کے بعد جزیرہ نمائے عرب کے تمام قبائل' شمال میں ملکِ شام سے یمن تک' مغرب میں بحرِ احمر سے نجد تک' شمال مشرق اور بحرین میں' مشرقِ اقصٰی میں حضر موت اور عمان کے لوگوں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ شام میں رہنے والے بہت سے عیسائیوں اور یہودنے اسلام قبول نہ کیا بلکہ پیغمبر ﷺ سے جزیہ ادا کرنے کی شرط پر معاہدہ کر لیا جس کے بدلہ میں اُنہیں تحفظِ حیات و جائیداد دیا جائے گا۔ اِن قبائل میں شمال میں واقع دومۃ الجندل' عیلہ' جربہ' جرش' مقناع

اور طبالہ کے قبائل شامل تھے۔ بحرین کے آتش پرستوں اور یمن کے عیسائیوں نے بھی پیغمبر علیہ السلام سے اُنہی شرائط پر معاہدے کئے۔'' (سیرۃ ابن اسحاق۔۔ انگریزی ترجمہ از اے گلیوم کراچی ۱۹۷۰ء صفحات ۶۵۳ تا ۶۵۹ از افضل الرحمن)

نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا مندرجہ ذیل فرمان اس حقیقت کا ترجمان ہے کہ کس ایمانداری اور شاندار طریقہ سے آپ نے افراد اور اقوام سے کئے ہوئے اپنے قول و قرار کو نبھایا:۔

''اگر کوئی شخص کسی معاہد سے فریب کاری کرے یا اُس کے کسی حق کو مارے' یا اُس کی استطاعت سے باہر اُس پر بوجھ ڈالے یا اُس سے وہ چیز لے لے جس کا ذکر معاہدے میں نہیں تو میں روزِ قیامت اُس کے خلاف گواہ ہوں گا۔'' (مشکوٰۃ المصابیح)

''سنتِ رسول ﷺ اس قدر مستحکم اور راسخ ہو چکی تھی کہ آپ کے صحابہ کرام غیر مسلم قبائل اور ممالک سے کئے ہوئے معاہدوں کی سختی سے پابندی کرتے تھے اور حتی الوسع اُن کے حقوق کا احترام کرتے تھے۔ جب اُنہیں معلوم ہوتا کہ غیر مسلموں کے حقوق' جائیداد اور زندگیوں کا اُن کے دشمنوں سے تحفظ اُن کے بس میں نہیں تو وہ اُن سے وصول شدہ جزیہ کی رقم واپس کر دیتے۔ یہ اُس وقت کا واقعہ ہے جب مسلمان ملکِ شام میں بازنطینی لشکر سے برسرِ پیکار تھے اور اُنہیں حمص سے پسپا ہونا پڑا تو مسلمان فوج کے کمانڈر ابو عبیدہ الجراح رضی اللہ عنہ نے شہر کے سربراہان کو جزیہ کے طور پر لی ہوئی رقم واپس کر دی اور کہا کہ چونکہ وہ اُن کی حفاظت کی ضمانت نہیں دے سکتے' اس لئے اُنہیں اُس رقم کے رکھنے کا کوئی حق حاصل نہیں۔'' (''سیرت النبی ﷺ'' لابن ہشام' کراچی ۱۹۷۵ء)

''(۳) غیر مسلم قبائل جن کے ساتھ کوئی معاہدہ نہیں: تمام غیر مسلمین لوگوں اور ریاستوں سے نمٹنے میں نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام اسلام کے عمومی اصولوں کی سختی سے پابندی کرتے تھے۔ مسلمانوں اور غیر مسلمین کے مابین تمام معاملات کا فیصلہ خواہ وہ انفرادی سطح پر ہوں یا ریاستی سطح پر' قطعی انصاف کے ساتھ کیا جاتا تھا جس میں ہر فریق کی جانب سے شہادت کی بنیاد پر دوست اور دشمن کے درمیان کوئی فرق روا نہیں رکھا جاتا تھا۔ مسلمان ریاستوں میں آئے ہوئے غیر ملکیوں کی مکمل طور پر تعظیم و توقیر اور حفاظت کی جاتی تھی۔ غیر ملکی حکومتوں کے سفیروں کو بڑے احترام اور پُر وقار طریقے سے سلامی دی جاتی تھی اور اُنہیں وہ تمام تعظیم و توقیر دی جاتی تھی جو ایک غیر ملکی حکومت کے نمائندے کو دی جا سکتی ہے۔ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام خود اُن کی دیکھ بھال کرتے تھے اور اُن کی ضروریات کا خیال رکھتے تھے۔ آپ نے حبشہ' بازنطین (مشرقی رومن سلطنت)' مصر اور دوسری ہمسایہ ریاستوں سے آئے ہوئے سفیروں کا استقبال کیا' اُن سے اُن کی حکومتوں کے سرکاری نمائندوں کے طور پر سلوک کیا اور اُن کی خاطر تواضع اور رویّہ میں اُنہی سفارتی آداب و رسوم اور تشریفات (Protocol) کو ملحوظ رکھا۔ یہ سفیر اپنے بادشاہوں کی جانب سے آپ کے لئے تحفے تحائف لاتے اور آپ بھی اُن کے بادشاہوں کے لئے تحفے تحائف پیش کرتے۔''

''نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سیاسی مصلحت اندیشی: ہجرت کے بعد مدینہ آنے پر مسلمان ہر چہار

جانب سے دشمن سے گھرے ہوئے تھے۔ جنوب میں قریش کی جانب سے دائمی خطرہ تھا' شمال میں خیبر کے یہود اور غطفان کے قبائل مستقل خطرہ تھے جبکہ مدینہ کے یہودی قبائل اور منافقین اندرونِ شہر میں لاتعداد مشکلات پیدا کرنے کا سبب تھے اور یہ ایک ناقابلِ تردید تاریخی حقیقت ہے کہ تمام ملکِ عرب اسلام اور مسلمانوں کا پکا دشمن تھا۔ اِن دشمنوں کی جانب سے کچھ خطرات کو بھانپتے ہوئے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام خداداد سیاسی بصیرت اور مصلحت اندیشی سے کام لیتے ہوئے ان خطرات کو ٹالنے میں قابلِ ستائش حد تک کامیاب ہوئے اور ان دشمن طاقتوں کو اکٹھا ہونے کا ذرّہ بھر موقع نہ دیا جس سے وہ اسلام کو کوئی نقصان پہنچا سکیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ چند سالوں کے قلیل عرصہ میں تمام مخالف طاقتیں خس و خاشاک کی طرح بہہ گئیں جس سے ایک آزاد و مستقل اسلامی ریاست کے استحکام کی راہ ہموار ہو گئی جس کے خود مختار فرمانروا الٰہی احکام کے تحت نبیِ اکرم ﷺ تھے۔ اس طرح خاتم النبیین ﷺ کی ذاتِ اقدس پہلی ہستی ہے جنھوں نے تمام عرب قبائل کو ایک حاکمیت کے تحت متحد کر کے اُنہیں تحفظ اور امن دیا۔ یہ تمام تر سیاسی مہارت' آپ کی مصلحت اندیشانہ حکمتِ عملی' آپ کی عسکری اور جنگی کامیابیاں آپ کی رسالت کے حق ہونے کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ قرآنِ مجید نے آپ کے سچے رسول اللہ ہونے کی حقیقت کو یوں جتلایا ہے:

لَوْ يُطِيْعُكُمْ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنَ الْاَمْرِ لَعَنِتُّمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ (الحُجُرات: ۷)

''بہت سی باتیں ایسی ہیں کہ اُن میں اگر رسول (علیہ السلام) تمہارا کہنا مان لیں تو تمہیں تکلیف پہنچے لیکن اللہ نے تمہیں ایمان کی محبت دی اور اُسے تمہارے دلوں میں مرغوب کر دیا۔'' (۴۹: ۷)

اس طرح سیاسی بصیرت نے نبیِ اکرم ﷺ کو بنی قینقاع' بنی نضیر اور بنی قریظہ کے یہودی قبائل سے معاہدے کرنے کے قابل بنا دیا۔ دراصل یہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حکیمانہ منصوبہ بندی اور حفظِ ماتقدّم کے طور پر سوچے سمجھے اقدامات ہی تھے جنھوں نے مغرور و سرکش' نفس پرست (Egoist) اور مفاد پرست (Egotist) یہود کو باہمی تحفظ کے مسائل اور اُن کی ضرورت پر گفت و شنید کرنے اور افہام و تفہیم کی طرف لانے میں کردار ادا کیا جس سے یہود نہ صرف یہ کہ معاہدے کی شرائط پر رضامند ہوئے بلکہ آپ ﷺ کو مدینہ کا غیر متنازعہ فرمانروا بھی تسلیم کر لیا۔ جبکہ ایک طرف یہ معاہدہ مدینہ کی نوزائیدہ ریاست کی بنیاد بننے کا عملی طور پر ثبوت بنا تو دوسری طرف نبی علیہ السلام کے مقام کو ہر کہ و مہ نے تسلیم کر لیا۔

معاہدہ کی کسی شرط کو توڑنے یا دغا و فریب کی صورت میں یہ معاہدہ فریب کار یہودْ کے اخراجِ مدینہ کی بنیاد بھی بنا۔ اس طرح یہ معاہدہ دودھاری تلوار تھا جس نے ابتداءً یہودِ مدینہ کے سیاسی' روحانی اور تجارتی تفوق اور غلبے کو ملیامیٹ کر دیا اور آخر کار اُنہیں ''دارالسلام'' سے نکال دیا جس سے دارالحکومت کا تحفظ مضبوط ہو گیا۔ بعد ازاں جب فدک' تیما اور وادی القراع کے یہود قبائل عہد شکنی کے مرتکب ہوئے تو اُنہیں بھی سرزمینِ عرب سے نکال باہر کیا گیا اور اس طرح جزیرہ نمائے عرب مکمل طور پر ضرر رساں عناصر سے پاک و صاف کر دیا گیا اور اُس کے ''دارالسلام'' (امن و آشتی کا گھر) ہونے کا اعلان کیا گیا۔ اس طرح نبیِ اکرم ﷺ اپنی خداداد سیاسی حکمت اور

مصلحت اندیشانہ منصوبہ بندی سے ایک بہت ہی مشکل مسئلہ کو حل کرنے میں کامیاب ہوئے اور سرزمینِ عرب کو تمام باغیانہ اور مخالفانہ عناصر سے صاف کرنے کی راہ ہموار کر دی۔

''شاہانِ عالم کو دعوتِ اسلام : ہجرت کے ساتویں سال ماہِ محرم میں مندرجہ ذیل بادشاہوں کی طرف نبی کریم ﷺ نے اپنے گرامی نامے تحریر فرمائے جن میں اُنہیں اسلام قبول کرنے کی دعوت دی گئی۔ یہ گرامی نامے مندرجہ ذیل صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم ان سلاطین کے پاس لے کر گئے:۔

(۱) عمرو بن اُمیہ الضمری کو — حبشہ کے بادشاہ نجاشی کے پاس گرامی نامہ دے کر بھیجا۔

(۲) دِحیہ بن خلیفہ الکلبی کو — ہرقل قیصرِ روم کے پاس گرامی نامہ دے کر روانہ کیا۔

(۳) عبداللہ بن حُذافہ السہمی کو — پرویز بن ہرمز بن نوشیروان کسریٰ ایران کی طرف گرامی نامہ دے کر بھیجا۔

(۴) حاطب بن ابی بلتعہ کو — اسکندریہ بھیجا تاکہ مقوقس شاہِ مصر کو گرامی نامہ پہنچائے۔

(۵) سُلیط بن عمرو العامری کو — ہوذہ بن علی الحنفی کی طرف دعوت نامہ دے کر بھیجا۔

(۶) شجاع بن وہب کو — نصاریٰ عرب کے سردار حارث بن ابی شمر الغسانی کی طرف روانہ فرمایا۔ یہ حارث اُن عیسائیوں کا رئیس تھا جو عربی النسل تھے اور شام کے سرحدی علاقوں میں سکونت پذیر تھے۔

''یہ مکاتیب' سیرت اور حدیث کی جملہ اُمّہات الکتب میں مروی ہیں۔ اُن کے مطالعہ سے قارئینِ کرام کو نبی اُمّی کے اسلوبِ تحریر اور اندازِ دعوت پر آگاہی ہو گی کہ دنیا کے بڑے بڑے شہنشاہوں کو کس سادگی کے ساتھ تکلفات سے بالاتر رہتے ہوئے حضور ﷺ نے پیغامِ ہدایت دیا اور اس سادگی کے باوجود یہ دعوت کتنی دل نشیں اور اثر انگیز ثابت ہوئی کہ اُن میں سے اکثر کے قلوب واذہان کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔''

''حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جب اپنے ہم عصر بادشاہوں کو اپنے مکاتیب کے ذریعے اسلام قبول کرنے کی دعوت دینے کا ارادہ فرمایا تو واقفانِ حال نے عرض کی: یارسول اللہ! سلاطینِ ممالک صرف اُن خطوط کو درخورِ اعتناء سمجھتے ہیں جو سربمہر ہوں۔ جن خطوط پر مُہر نہ لگی ہو' اُنہیں وہ وصول ہی نہیں کرتے۔ چنانچہ ہادیِ برحق ﷺ نے چاندی کی انگوٹھی بنوائی جس کا نگینہ بھی چاندی کا تھا۔ اس میں محمد رسول اللہ کے کلماتِ طیّبات بایں صورت کندہ کرائے:

اللہ

رسول

محمّد

سب سے اوپر ''اَللہ'' جل جلالہٗ کا اسمِ مبارک' درمیان میں کلمہ ''رسول'' اور نیچے نام نامی ''محمّد'' ﷺ۔

''رحمتِ عالمیان ﷺ کا یہ بھی ایک معجزہ تھا کہ آپ نے جس قاصد کو جس ملک کے حکمران کی طرف روانہ

فرمایا اللہ تعالیٰ نے اُسے اُس ملک کی زبان کا ماہر بنا دیا کہ بے تکلفی سے وہ اظہارِ مدّعا کر سکے۔" (الطبقات الکبریٰ لابن سعد (۱۶۹۔۲۳۱ھ) جلد اوّل ص ۲۵۸ بیروت ۱۹۵۷ بحوالہ "ضیاء النبی" از کرم شاہ الازہری جلد چہارم' صفحات ۱۸۰'۱۸۱

"مکتوب گرامی بنام نجاشی بادشاہ حبشہ: سب سے پہلے رحمتِ عالم ﷺ نے اپنے صحابی عمرو بن اُمیہ الضمری کو اپنا مکتوبِ گرامی دے کر نجاشی کی طرف بھیجا۔ اُنہوں نے جب وہ والا نامہ نجاشی کو پیش کیا تو اُس نے بڑے ادب واحترام سے اُسے وصول کیا' اُسے اپنی آنکھوں پر رکھا اور از راہِ ادب و تواضع اپنے تخت سے اتر کر زمین پر بیٹھ گیا اور اس گرامی نامہ کو پڑھا۔ گرامی نامہ کا عربی متن درج ذیل ہے:

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ۔ مِنۡ مُحَمَّدٍ رَّسُوۡلِ اللّٰہِ اِلَی النَّجَاشِیِّ مَلِكِ الۡحَبۡشَۃِ

اَمَّا بَعۡدُ! فَاِنِّیۡ اَحۡمَدُ اِلَیۡكَ اللّٰہَ الَّذِیۡ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ الۡمَلِكُ الۡقُدُّوۡسُ السَّلَامُ الۡمُؤۡمِنُ الۡمُھَیۡمِنُ وَاَشۡھَدُ اَنَّ عِیۡسَی بۡنَ مَرۡیَمَ رُوۡحُ اللّٰہِ وَکَلِمَتُہٗ' اَلۡقٰھَا اِلٰی مَرۡیَمَ الۡبَتُوۡلِ الطَّاھِرَۃِ الۡمُطَھَّرَۃِ الطَّیِّبَۃِ الۡحَصِیۡنَۃِ فَحَمَلَتۡ بِعِیۡسٰی فَخَلَقَہُ اللّٰہُ مِنۡ رُّوۡحِہٖ وَنَفۡخِہٖ' کَمَا خَلَقَ اٰدَمَ بِیَدِہٖ وَاِنِّیۡ اَدۡعُوۡكَ اِلَی اللّٰہِ وَحۡدَہٗ' لَا شَرِیۡكَ لَہٗ' وَالۡمُوَالَاۃِ عَلٰی طَاعَتِہٖ فَاِنۡ تَابَعۡتَنِیۡ وَتُؤۡمِنُ بِالَّذِیۡ جَآءَنِیۡ فَاِنِّیۡ رَسُوۡلُ اللّٰہِ فَاِنِّیۡ اَدۡعُوۡكَ وَجُنُوۡدَكَ اِلَی اللّٰہِ تَعَالٰی وَقَدۡ بَلَّغۡتُ وَنَصَحۡتُ فَاقۡبَلُوۡا نُصۡحِیۡ وَقَدۡ بَعَثۡتُ اِلَیۡكَ ابۡنَ عَمِّیۡ جَعۡفَرًا وَّمَعَہٗ' نَفَرٌ مِّنَ الۡمُسۡلِمِیۡنَ وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنِ اتَّبَعَ الۡھُدٰی ("تاریخ الخمیس" جلد۲' صفحہ۳۰) بحوالہ "ضیاء النبی" ۔۔ از کرم شاہ الازہری' ج۴' ص۱۸۱' ۱۸۲

"محمدؐ رسول اللہ کی جانب سے نجاشی اصحمہ شاہِ حبشہ کے نام: میں تمہارے سامنے اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کرتا ہوں جس کے بغیر اور کوئی معبود نہیں۔ وہ بادشاہ حقیقی ہے' ہر عیب سے پاک ہے' سلامت رکھنے والا ہے' امان دینے والا ہے' نگہبان ہے۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ عیسیٰ بن مریم روح اللہ ہیں اور اُس کا کلمہ ہیں جو اُس نے مریم کو القاء کیا' وہ مریم جو اللہ تعالیٰ سے لو لگائے ہوئے ہے' پاک ہے' مطہر ہے' خوشبودار ہے' پاک دامن ہے۔ اور وہ عیسیٰ علیہ السلام کو پیٹ میں لئے حاملہ ہوگئیں۔ اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کو اپنی روح اور اپنی پھونک سے پیدا کیا جس طرح کہ اُس نے آدم علیہ السلام کو اپنے دستِ قدرت سے تخلیق کیا۔ (اے نجاشی!) میں تمہیں دعوت دیتا ہوں کہ اللہ پر ایمان لاؤ جو وحدہٗ لاشریک ہے اور ہمیشہ اُس کی اطاعت کرو۔ پس اگر تو میری پیروی کرے گا اور اُس پر ایمان لائے گا جو میں لے کر آیا ہوں تو بے شک میں اللہ کا رسول ہوں۔ میں تجھے اور تیرے سارے لشکر کو اللہ پر ایمان لانے کی دعوت دیتا ہوں۔ میں نے تم تک پیغامِ حق پہنچا دیا اور نصیحت کا فرض ادا کر دیا۔ پس میری نصیحت قبول کرلو۔ میں نے تمہاری طرف اپنے چچازاد بھائی جعفر اور اُس کے ساتھ چند مسلمانوں کو بھیجا ہے۔ پس اُس شخص پر سلامتی ہو جو ہدایت کا اتباع کرے۔"

قاصد نے یہ گرامی نامہ نجاشی کو دیا تو اُس نے بصد ادب اُسے وصول کیا اور پڑھ کر کہا:

اَشۡھَدُ بِاللّٰہِ اَنَّہُ النَّبِیُّ الۡاُمِّیُّ الَّذِیۡ یَنۡتَظِرُہٗ' اَھۡلُ الۡکِتٰبِ

"میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ وہ نبیِ اُمّی ہیں جن کا اہلِ کتاب انتظار کر رہے ہیں۔"

اور کہا کہ اگر میرے بس میں ہوتا تو میں خود حاضرِ خدمت ہوتا۔ اُس نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بارگاہ میں ایک عریضہ لکھا جس کا عربی متن درج ذیل ہے:

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم-مِنَ النَّجَاشِیِّ أَصْحَمَۃَ سَلَام" عَلَیْکَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ وَرَحْمَۃُ اللّٰہِ وَ بَرَکَاتُہ، اَللّٰہُ الَّذِیْ لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُوَالَّذِیْ ھَدَانِیْ لِلْاِسْلَام

أَمَّابَعْدُ ! فَقَدْبَلَغَنِیْ کِتَابُکَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ فَمَاذَکَرْتَ مِنْ أَمْرِعِیْسٰی عَلَیْہِ السَّلَامُ فَوَرَبِّ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ أَنَّ عِیْسٰی عَلَیْہِ السَّلَامُ لَایَزِیْدُ عَلٰی مَاذَکَرْتَ ثَفْرُوْقًا أَنَّہ، کَمَاقُلْتَ وَقَدْ عَرَفْنَامَابَعَثْتَ بِہٖ اِلَیْنَا وَقَدِمَ اِبْنُ عَمِّکَ وَأَصْحَابُہ، وَاَشْھَدُ أَنَّکَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَادِقًا مُصَدَّقًا وَقَدْ بَایَعْتُکَ وَبَایَعْتُ اِبْنَ عَمِّکَ وَأَسْلَمْتُ عَلٰی یَدَیْہِ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَقَدْبَعَثْتُ اِلَیْکَ اِبْنِیْ اَرْھَا فَاِنْ شِئْتَ أَنْ آتِیْکَ بِنَفْسِیْ فَعَلْتُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ فَاِنِّیْ اَشْھَدُ أَنَّ مَاتَقُوْلُ حَقٌّ" وَالسَّلَامُ عَلَیْکَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ وَرَحْمَۃُ اللّٰہِ وَبَرَکَاتُہ،" (تاریخ الخمیس جلد ۲، ص ۳۰ ؛ الوثائق السیاسیۃ از ڈاکٹر محمد حمید اللہ صفحہ ۱۰۴، ۱۰۵ طبع اوّل، دار الشائس بیروت ۱۹۸۳)

"یہ عریضہ نجاشی اصحمہ کی طرف سے ہے۔ اے اللہ کے رسول! آپ پر اللہ تعالیٰ کے سلام، رحمتیں اور برکتیں نازل ہوں۔ وہ اللہ جس کے بغیر اور کوئی معبود نہیں جس نے مجھے اسلام قبول کرنے کی ہدایت بخشی۔

أَمَّابَعْدُ ! یا رسول اللہ! جنابِ والا کا گرامی نامہ مجھے موصول ہوا ہے جس میں آپ نے عیسٰی علیہ السلام کے معاملے کا ذکر کیا ہے اور مالکِ ارض وسماء کی قسم! عیسٰی علیہ السلام کی حیثیت اس سے ذرّہ برابر بھی کم و بیش نہیں۔ آپ کے چچازاد بھائی جعفر اور دوسرے مسلمان یہاں پہنچ گئے ہیں۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ اللہ کے سچے رسول ہیں۔ میں نے حضور کی بیعت کی اور حضور کے ابن عم کے ہاتھ پر اللہ ربّ العالمین پر ایمان لے آیا ہوں۔ میں اپنے بیٹے اَرھا کو جناب کی خدمتِ اقدس میں بھیج رہا ہوں۔ اگر حکم ہو تو میں خود بھی حاضر ہونے کے لئے تیار ہوں۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ حضور کا ہر فرمان حق ہے۔ یا رسول اللہ! آپ پر اللہ تعالیٰ کے سلام، رحمتیں اور برکتیں نازل ہوں۔"

اس کے بعد نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے نجاشی کو ایک اور گرامی نامہ تحریر فرمایا جس میں اُمّ حبیبہ کے ساتھ حضور علیہ السلام کے عقدِ نکاح کرنے کا حکم تھا۔ نجاشی نے اِن دونوں گرامی ناموں کو ہاتھی دانت کی ایک ڈبیا میں بڑے اہتمام واحترام سے رکھا اور کہا:

لَنْ تَزَالَ الْحَبَشَۃُ بِخَیْرٍ مَّا کَانَ ھٰذَانِ الْکِتَابَانِ بَیْنَ اَظْھُرِھَا (الطبقات الکبریٰ لابن سعد، جلد ۱، ص ۲۵۹)

"حبشہ میں ہر طرح خیریت رہے گی جب تک یہ دو گرامی نامے اس کے پاس رہیں گے۔"

ایک روز نمازِ فجر کے بعد حضور علیہ السلام نے اُس کی وفات کی خبر دی اور فرمایا: قَدْ تُوُفِّیَ فِیْ ھٰذِہِ السَّاعَۃِ فَاخْرُجُوْا بِنَا اِلَی الْمُصَلّٰی کہ نجاشی نے ابھی ابھی وفات پائی ہے۔ سب مسلمان عید گاہ کو چلیں اور اُس کی نماز

یاد رہے کہ سورۃ المائدۃ کی آیات ۸۳-۸۵ (پارہ ہفتم کی ابتدائی ۳ آیات) انہی خوش نصیبوں کے بارے میں نازل ہوئیں۔

جنازہ میں شریک ہوں ۔ مسلمانوں کا ایک جم غفیر اکٹھا ہو گیا۔ امام الانبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس خوش بخت کی نماز جنازہ خود پڑھائی ۔ اُس کی وفات کے بعد جو نجاشی حبشہ کے تخت پر متمکن ہوا' اُس کے بارے میں معلوم نہیں ہو سکا کہ اُس نے اسلام قبول کیا یا نہیں ۔'' (تاریخ الخمیس' جلد ۲' ص ۱۳۱) بحوالہ ''ضیاء النبی' جلد چہارم' صفحہ ۱۸۵)

مکتوب گرامی بنام قیصر روم : ہادیِ برحق سرورِ انبیاء محمد رسول اللہ ﷺ نے اپنا ایک گرامی نامہ سلطنتِ روما کے مطلق العنان شہنشاہ ہرقل کے نام لکھا۔ یہ گرامی نامہ لے جانے کے لئے آپ کی نظرِ انتخاب حضرت دِحیہ بن خلیفہ الکلبی رضی اللہ عنہ پر پڑی جو اپنے حسن و جمال کے باعث اپنے ہم عصروں میں ایک امتیازی شان کے مالک تھے ۔ شیخ محمد عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس واقعہ کو اپنی کتاب ''مدارج النبوۃ'' میں تفصیلاً بیان کیا ہے۔

ہرقل کے نام آپ کے گرامی نامہ کا عربی متن مع ترجمہ حسبِ ذیل ہے :

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۔ مِنْ مُّحَمَّدٍ عَبْدِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ اِلٰی ھِرَقْلَ عَظِیْمِ الرُّوْمِ ۔ سَلَامٌ عَلٰی مَنِ اتَّبَعَ الْھُدٰی ۔

أَمَّا بَعْدُ ! فَاِنِّیْ أَدْعُوْکَ بِدِعَایَۃِ الْاِسْلَامِ أَسْلِمْ تَسْلَمْ وَ أَسْلِمْ یُعْطِکَ اللّٰہُ أَجْرَکَ مَرَّتَیْنِ فَاِنْ تَوَلَّیْتَ فَعَلَیْکَ اِثْمُ الْعَرِیْسِیِّنَ ۔ وَ یٰٓاَھْلَ الْکِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰی کَلِمَۃٍ سَوَآءٍ بَیْنَنَا وَ بَیْنَکُمْ أَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰہَ وَلَا نُشْرِکَ بِہٖ شَیْئًا وَّلَا یَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْھَدُوْا بِأَنَّا مُسْلِمُوْنَ O

''یہ خط محمد کی طرف سے ہے جو اللہ کے بندے اور اُس کے رسول ہیں ہرقل کی طرف جو روم کا بڑا ہے ۔
سلامتی ہو ہر اُس شخص پر جو ہدایت کا پیروکار ہے ۔
أَمَّا بَعْدُ ! میں تمہیں اسلام قبول کرنے کی دعوت دیتا ہوں ۔ تو اسلام لے آ تو سلامت رہے گا ۔ تو اسلام لے آ' اللہ تعالیٰ تجھے دو چند اجر عطا فرمائے گا اور اگر تو نے اِس دعوت کو قبول کرنے سے روگردانی کی تو تمہارے کسانوں کے انکار کا گناہ بھی تیری گردن پر ہو گا ۔ اے اہلِ کتاب ! اُس کلمہ کی طرف آ جاؤ جو ہمارے اور تمہارے درمیان مشترک ہے' وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کے سوا ہم کسی کی عبادت نہیں کریں گے اور کسی کو اُس کا شریک نہیں بنائیں گے اور ہم اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر ایک دوسرے کو اپنا رب نہیں بنائیں گے ۔ اگر اس دعوت کے باوجود وہ رُوگردانی کریں تو تم یہ کہو کہ اے رُوگردانی کرنے والو! گواہ رہنا ہم مسلمان ہیں ۔''

''ہرقل نے جب اُسے پڑھا تو جلالِ نبوت سے وہ مارے خوف کے پسینہ پسینہ ہو گیا اور اُس کی پیشانی سے پسینے کے قطرے ٹپکنے لگے اور حاضرینِ محفل نے آہ و فغاں شروع کر دی ۔ اُس نے اپنے امراء کو حکم دیا کہ اگر اس علاقہ کے کچھ لوگ ہمارے ملک میں آئے ہوئے ہوں تو اُنہیں تلاش کر کے میرے پاس لے آؤ تا کہ اُن سے حقیقتِ حال دریافت کی جائے ۔''

''صلح حدیبیہ میں فریقین کے درمیان یہ طے پایا تھا کہ دس سال تک جنگ نہیں ہو گی ۔ اس طرح راستے پُر امن

ہو گئے تھے اور تجارتی کاروانوں کی آمد و رفت شروع ہو گئی تھی۔ ابوسفیان بھی اپنے تجارتی قافلہ سمیت غزہ آیا ہوا تھا۔ قیصر کے آدمیوں کا اُن کو علم ہوا تو غزہ پہنچے اور وہاں سے اُنہیں قیصر کے پاس بیت المقدس لا کر دربار میں پیش کیا۔ ابوسفیان کہتے ہیں کہ جب ہم قیصر کے سامنے پیش کیے گئے تو اُس نے سب سے پہلے یہ پوچھا کہ تم میں سے اس شخص کا قریب ترین رشتہ دار کون ہے؟ میں نے کہا کہ ان کا سب سے قریبی رشتہ دار میں ہوں اور وہ میرے چچا کے لڑکے ہیں۔ ہرقل نے مجھے اپنے سامنے سب سے آگے بیٹھنے کا حکم دیا اور میرے دوسرے ساتھیوں کو میرے پیچھے بٹھایا اور ترجمان کے ذریعے میرے ساتھیوں کو کہا کہ میں ابوسفیان سے اُس شخص کے بارے میں چند سوالات پوچھوں گا۔ اگر یہ کوئی غلط جواب دے تو فوراً بتانا کہ یہ جھوٹ بول رہا ہے۔ ابوسفیان کہتے ہیں کہ اگر مجھے یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ لوگوں میں جھوٹا مشہور ہو جاؤں گا تو میں ان جوابات میں جھوٹ کی ملاوٹ ضرور کرتا لیکن اس خوف سے میں اس سے باز رہا۔ پھر قیصر اور ابوسفیان کے درمیان سوال و جواب کا سلسلہ اس طرح شروع ہوا:

قیصر: اُن کا خاندان کیسا ہے؟

ابوسفیان: وہ عرب کے شریف ترین خاندان (بنو ہاشم) کے فرد ہیں۔

قیصر: کیا اُن سے پہلے اُن کے بزرگوں میں سے کسی نے نبوّت کا دعویٰ کیا ہے؟

ابوسفیان: نہیں۔

قیصر: کیا اُن کے اَسلاف میں کوئی بادشاہ ہو گزرا ہے؟

ابوسفیان: نہیں۔

قیصر: اُن کے پیروکار غریب لوگ ہیں یا دولت مند؟

ابوسفیان: وہ غریب وضعیف لوگ ہیں۔

قیصر: اُن کے ماننے والوں کی تعداد آئے دن بڑھ رہی ہے یا گھٹ رہی ہے؟

ابوسفیان: بڑھ رہی ہے۔

قیصر: کیا اُن کا دین قبول کرنے کے بعد کوئی شخص اُن کے دین سے بیزار ہو کر مرتد بھی ہوا ہے؟

ابوسفیان: نہیں۔

قیصر: نبوّت کے دعویٰ سے پہلے کیا لوگ اُن پر جھوٹ بولنے کا الزام بھی لگاتے تھے؟

ابوسفیان: ہرگز نہیں

قیصر: کیا اُنہوں نے کبھی کسی سے عہد شکنی کی ہے؟

ابوسفیان: اب تک نہیں کی۔ البتہ ہمارے ساتھ اُن کا معاہدہ ہوا ہے۔ معلوم نہیں وہ ایفائے عہد کرتے ہیں یا نہیں۔ (ابوسفیان کہا کرتے کہ اپنے جوابات میں اس جملہ کے علاوہ میں کوئی اور لفظ نہ بڑھا سکا لیکن قیصر نے میرے اس جملہ کو ہرگز درخورِ اعتنا نہ سمجھا)۔

قیصر: کیا تمہاری آپس میں کبھی جنگ بھی ہوئی ہے؟

ابوسفیان: ہمارے مابین کئی جنگیں ہوئی ہیں۔

قیصر: اُن کا نتیجہ کیا نکلا؟

ابوسفیان : کبھی وہ غالب آئے اور کبھی ہم؟
قیصر: وہ تمہیں کس چیز کی دعوت دیتے ہیں؟
ابوسفیان : وہ ہمیں حکم دیتے ہیں کہ ہم اللہ تعالٰی کی عبادت کریں' کسی کو اُس کا شریک نہ ٹھہرائیں۔ وہ ہمیں نماز پڑھنے' روزہ رکھنے' صدقہ کرنے' سچ بولنے' عفت اور صلہ رحمی کا حکم دیتے ہیں۔"

''اِن سوالات و جوابات کے بعد ہرقل نے ترجمان کو کہا کہ وہ سامعین کو بتائے کہ میں نے تم سے اُن کا نسب پوچھا۔تم نے کہا: وہ تم میں عالی نسب ہیں۔ اللہ کے رسول ایسے ہی ہوتے ہیں۔ جس قوم میں وہ مبعوث ہوتے ہیں وہ اُس میں افضل اور عالی نسب ہوتے ہیں۔''

''میں نے تم سے پوچھا کہ کیا تم میں سے کسی اور نے نبوّت کا دعویٰ کیا ہے؟ تم نے کہا نہیں۔ میں نے خیال کیا کہ اگر اُن سے پہلے کسی اور نے دعوائے نبوّت کیا ہوتا تو میں سمجھتا کہ یہ شخص اس بات کی پیروی کرتا ہے جو اس سے پہلے کہی گئی ہے۔''

''میں نے تم سے پوچھا کہ اُن کے آباء و اَجداد میں کوئی بادشاہ ہو گزرا ہے؟ تم نے کہا نہیں۔ میں نے خیال کیا کہ اگر اُن کے آباء و اجداد میں کوئی بادشاہ ہوتا تو میں یہ سمجھ سکتا کہ وہ نبوّت کا دعویٰ کر کے اپنے باپ کا ملک طلب کر رہے ہیں۔''

''میں نے تم سے پوچھا کہ دعویٰ نبوّت سے پہلے تم اُس پر جھوٹ کی تہمت لگاتے تھے؟ تم نے کہا نہیں۔ یقیناً میں جانتا ہوں کہ جو شخص لوگوں کے ساتھ جھوٹ نہیں بولتا وہ اللہ تعالٰی کے بارے میں کبھی جھوٹ نہیں بولے گا۔''

''میں نے تم سے پوچھا کہ رئیس لوگ اُن کی پیروی کرتے ہیں یا کمزور لوگ؟ تم نے کہا کہ کمزور لوگ اُن کی پیروی کرتے ہیں۔ رسولوں کے تابعدار لوگ اکثر کمزور ہی ہوا کرتے ہیں۔''

''میں نے تم سے پوچھا کہ کیا وہ بڑھ رہے ہیں یا گھٹ رہے ہیں؟ تم نے کہا بڑھ رہے ہیں۔ ایمان کا یہی حال ہے حتیٰ کہ وہ مکمل ہو جائے۔''

''میں نے تم سے پوچھا کیا اُن کے دین میں داخل ہونے کے بعد کوئی شخص اُن کے دین سے ناراض ہو کر مرتد بھی ہوا ہے؟ تم نے کہا نہیں۔ ایمان کا یہی حال ہے۔ جب اُس کی مٹھاس اور حلاوت دل میں سرایت کر جاتی ہے تو پھر وہ نکلتی نہیں۔''

''میں نے تم سے پوچھا کہ وہ تمہیں کس چیز کی دعوت دیتے ہیں؟ تم نے بتایا کہ وہ حکم دیتے ہیں کہ ہم اللہ کی

عبادت کریں، کسی کو اُس کا شریک نہ بنائیں۔ وہ ہمیں نماز پڑھنے، روزہ رکھنے، صدقہ کرنے، سچ بولنے اور عفت و صلہ رحمی کا حکم دیتے ہیں۔ جو کچھ تم نے بتایا اگر وہ حق ہے تو عنقریب وہ میرے اِن دونوں قدموں کی جگہ کے مالک بن جائیں گے۔ میں یقیناً جانتا تھا کہ وہ ظاہر ہونے والے ہیں مگر میرا یہ گمان نہ تھا کہ وہ تم میں سے ہوں گے۔ اگر مجھے یقین ہوتا کہ اُن تک پہنچ سکوں گا تو اُن کی ملاقات کے سفر کی مشقت اٹھاتا۔ اگر مجھے وہاں حاضری کی سعادت نصیب ہوتی تو میں اُن کے قدموں کو دھوتا۔''

''ابوسفیان نے کہا کہ جو کچھ ہرقل نے کہنا تھا جب وہ کہہ چکا اور حضور علیہ السلام کا گرامی نامہ پڑھنے سے فارغ ہوا تو اُس کے امراء اور مصاحبین نے شور و غل مچانا شروع کر دیا اور اُن کی آوازیں بلند ہونے لگیں تو اُنہوں نے ہمیں باہر چلنے کا حکم دیا۔ شیخ محمد عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ رقم طراز ہیں کہ ہرقل حضرت دحیہ کلبی کو تنہائی میں لے گیا اور اُنہیں کہا کہ بخدا! میں جانتا ہوں کہ حضور علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے سچے رسول ہیں۔ ہماری کتابوں میں اُن کی ساری صفات مذکور ہیں لیکن مجھے ڈر ہے کہ اگر میں ایمان لانے کا اعلان کروں گا تو رومی مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ قیصر نے حضرت دحیہ کو اپنا خط دے کر اپنی مملکت کے ایک عظیم پیشوا کے پاس بھیجا۔ اُس کا نام صغاطر تھا۔ وہ روم میں رہائش پذیر تھا۔ ساری رومی سلطنت میں اُس کے پایہ کا کوئی عالم نہ تھا۔ سب لوگ اُس کی دل سے عزت کرتے تھے۔ حضرت دِحیہ کلبی اُس کے پاس روم گئے، اُسے قیصر کا خط دیا اور سرورِ عالم ﷺ اور دینِ اسلام کے بارے میں اُس سے گفتگو کی۔ وہ بول اٹھا: خدائے بزرگ و برتر کی قسم! محمد ﷺ اللہ تعالیٰ کے سچے رسول ہیں۔ اُن کی جن صفات کا آپ نے ذکر کیا ہے وہ سب ہماری مذہبی کتب میں موجود ہیں۔ مجھے اُن کی نبوت کے بارے میں کوئی شبہ نہیں رہا۔ وہ وہاں سے اٹھ کر کلیسا میں گیا اور سارے عیسائیوں کو مخاطب کر کے اُس نے کہا:

''اے میرے رومی بھائیو! کان کھول کر سنو، میرے پاس احمدِ عربی کے بارے میں خط آیا ہے جس میں انہوں نے ہمیں اسلام قبول کرنے کی دعوت دی ہے۔ اُن کی رسالت آفتاب سے روشن تر ہے۔ اٹھو، سب کہو کہ اللہ ایک ہے اور محمد (ﷺ) اُس کے بندے اور رسول ہیں۔''

''جب اُن عیسائیوں نے اُس کی زبان سے یہ دعوت سنی تو بپھر گئے اور اُس پر حملہ کر دیا۔ اُس پر اتنے تیر چلائے اور اتنے وار کئے کہ وہ جاں بحق ہو گیا۔ حضرت دِحیہ وہاں سے بچ کر ہرقل کے پاس واپس آئے۔ صغاطر پر جو بیتی تھی اُسے آ کر بتائی۔ اُس نے کہا کہ یہ شخص اُن کے نزدیک مجھ سے کہیں زیادہ محترم اور معزز تھا۔ جب اُس کے ساتھ اُنہوں نے یہ سلوک کیا ہے تو معلوم نہیں کہ وہ میرے ساتھ کیا برتاؤ کریں گے؟'' (''مدارج النبوۃ'' از شیخ عبدالحق محدث دہلوی، جلد دوم، صفحات ۲۹۷، ۲۹۸ بحوالہ ''ضیاء النبی'' از کرم شاہ الازہری، جلد ۴، ص ۱۸۷۔۱۹۲)

''اس کے بعد قیصر بیت المقدس سے اپنے پایہ تخت حمص سے واپس چلا آیا جہاں اُس نے دربارِ شاہی منعقد کیا اور تمام اُمرائے سلطنت اور اعیانِ مملکت کو اس میں شرکت کی دعوت دی۔ جب سب مہمان آ گئے تو اُس نے تمام بیرونی دروازوں کو بند کرنے کا حکم دیا۔ خود محل کے شاہ نشین سے نمودار ہوا اور قوم کو یوں خطاب کیا:

''اے مملکت روم کے شہریو! اگر تمہاری یہ خواہش ہے کہ تمہیں فلاح و کامیابی نصیب ہو اور ہمیشہ راہِ راست پر چلتے رہو اور تمہارا ملک اور حکومت ہمیشہ قائم و دائم رہے تو اٹھو' اس نبی کا دامن پکڑ لو جو تمہارے درمیان ظاہر ہوا ہے۔''

''یہ سنتے ہی حاضرین میں بھگدڑ مچ گئی۔ سب جنگلی گدھوں کی طرح دولتیاں جھاڑنے لگے۔ وہ دوڑے کہ محل کے صحن سے باہر نکل جائیں۔ جب آگے بڑھے تو سارے دروازے مقفل تھے اور باہر نکلنے کی کوئی صورت نہ تھی۔ اُس نے اپنے خدام کو حکم دیا کہ وہ اِن بھاگنے والوں کو اُس کے پاس واپس لائیں۔ جب وہ سب اس کے گرد اکٹھے ہو گئے تو اُس نے اُن کا غصہ فرو کرنے کے لئے کہا کہ میں نے یہ بات محض تمہیں آزمانے کے لئے کہی تھی کہ مجھے پتہ چل جائے کہ تم اپنے عقیدے میں کہاں تک پختہ ہو۔ اپنے عقیدہ اور مذہب کے ساتھ تمہاری یہ دل بستگی دیکھ کر مجھے بڑی مسرت ہوئی ہے۔ ہرقل کی یہ بات سن کر وہ بھی خوش ہو گئے اور اُس کے سامنے سجدہ میں گر گئے۔''

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ہرقل کی اسلام کے بارے میں یہ آخری اطلاع ہے۔'' (صحیح بخاری' کتاب کیف کان بدء الوحی)

ڈاکٹر حمید اللہ نے ''الوثائق السیاسیہ'' میں ایک دوسرے خط کا بھی ذکر کیا ہے۔ یہ گرامی نامہ حضور علیہ السلام نے قیصر کی طرف اُس وقت ارسال فرمایا جب آپ ﷺ میدانِ تبوک میں خیمہ زن تھے اور یہ گرامی نامہ لے جانے کے لئے بھی حضرت دِحیہ کو ہی منتخب فرمایا۔'' (''ضیاء النبی''۔۔ کرم شاہ الازہری' جلد چہارم' صفحات ۱۹۲' ۱۹۳)

''مکتوب گرامی بنام مقوقس شاہِ مصر: ہادیِ برحق ﷺ نے ایک والا نامہ مقوقس شاہِ مصر کے نام لکھا' اُسے سربمہر کیا اور حضرت حاطب بن ابی بلتعہ کو حکم دیا کہ وہ اس گرامی نامہ کو مکتوب الیہ تک پہنچائے۔ حضرت حاطب اسکندریہ پہنچے' مقوقس سے ملاقات کرنے کے لئے اُس کے محل میں گئے۔ پہلے اُس کے دربان سے ملاقات ہوئی۔ دربان بڑی عزت و تکریم سے پیش آیا اور فوراً مقوقس کی خدمت میں باریاب کرا دیا حالانکہ کئی لوگ ایک ماہ سے آئے ہوئے تھے لیکن ابھی تک اُن کی ملاقات کی باری نہیں آئی تھی۔ بادشاہ نے بھی آپ کی بڑی عزت کی اور بڑے ادب واحترام سے گرامی نامہ وصول کیا جس کا عربی متن مع اردو ترجمہ درج ذیل ہے:

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ۔ مِنۡ مُحَمَّدٍ عَبۡدِاللّٰہِ وَرَسُوۡلِہٖ اِلٰی مُقَوۡقَسِ عَظِیۡمِ القِبۡطِ۔ سَلَامٌ عَلٰی مَنِ اتَّبَعَ الۡھُدٰی۔

اَمَّابَعۡدُ! فَاِنِّیۡ اَدۡعُوۡکَ بِدِعَایَۃِ الۡاِسۡلَامِ اَسۡلِمۡ تَسۡلَمۡ یُعۡطِکَ اللّٰہُ اَجۡرَکَ مَرَّتَیۡنِ فَاِنۡ تَوَلَّیۡتَ فَعَلَیۡکَ اِثۡمُ الۡقِبۡطِ۔ یٰۤاَھۡلَ الۡکِتٰبِ تَعَالَوۡا اِلٰی کَلِمَۃٍ سَوَآءٍ بَیۡنَنَا وَ بَیۡنَکُمۡ اَلَّا نَعۡبُدَ اِلَّا اللّٰہَ وَلَا نُشۡرِکَ بِہٖ شَیۡئًا وَّ لَا یَتَّخِذَ بَعۡضُنَا بَعۡضًا اَرۡبَابًا مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ فَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَقُوۡلُوا اشۡھَدُوۡا بِاَنَّا مُسۡلِمُوۡنَ O (''الوثائق السیاسیۃ'' ص ۱۳۵؛ ''صبح الاعشیٰ' القلقشندی ج ۶' ص ۳۶۴' تاریخ الخمیس جلد ۲' صفحات ۳۶' ۳۷)

''یہ خط محمد کی طرف سے ہے جو اللہ کے بندے اور اُس کے رسول ہیں' مقوقس کی طرف جو قبطیوں کا سردار ہے۔ سلامتی ہو ہر اُس شخص پر جو ہدایت کا پیرو کار ہے۔''

أَمَّابَعۡدُ ! میں تمہیں اسلام قبول کرنے کی دعوت دیتا ہوں۔ تو اسلام لے آ تو سلامت رہے گا۔ تو اسلام لے آ' اللہ تعالیٰ تجھے دوگنا اجر عطا فرمائے گا اور اگر تو نے اِس دعوت کو قبول کرنے سے روگردانی کی تو سارے قبطیوں کی گمراہی کا گناہ تیری گردن پر ہوگا۔ اے اہلِ کتاب! اُس کلمہ کی طرف آ جاؤ جو ہمارے اور تمہارے درمیان مشترک ہے' وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کے سوا ہم کسی کی عبادت نہیں کریں گے اور کسی کو اُس کا شریک نہیں بنائیں گے اور ہم اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر ایک دوسرے کو اپنا رب نہیں بنائیں گے۔ اگر اس دعوت کے باوجود وہ رُوگردانی کریں تو تم کہہ دو کہ اے منکرو! گواہ رہنا ہم مسلمان ہیں۔''

مقوقس نے ہاتھی دانت کی ایک خوبصورت ڈبیہ منگوائی۔ بڑے ادب و احترام سے یہ گرامی نامہ اُس میں رکھا' اُسے سربمہر کیا اور اپنی خاص کنیز کے حوالے کر دیا اور اُسے یہ حکم دیا کہ وہ اُسے حفاظت سے رکھ لے۔ پھر ایک عربی دان کاتب کو بلایا اور اُسے بارگاہِ رسالت میں پیش کرنے کے لئے ایک عریضہ املاء کرایا:

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡم ۔لِمُحَمَّدِ بۡنِ عَبۡدِاللّٰهِ ۔مِنَ الۡمُقَوۡقِسِ عَظِيۡمِ الۡقِبۡطِ ۔ سَلَامٌ'' عَلَيۡكَ أَمَّابَعۡدُ ! قَدۡ قَرَأۡتُ كِتَابَكَ وَفَهِمۡتُ مَا ذَكَرۡتَ فِيۡهِ وَمَا تَدۡعُوۡا اِلَيۡهِ وَقَدۡعَلِمۡتُ أَنَّ نَبِيًّا بَقِيَ وَ كُنۡتُ اَظُنُّ اَنَّه' يَخۡرُجُ بِالشَّام وَقَدۡاَكۡرَمۡتُ رَسُوۡلَكَ وَ بَعَثۡتُ اِلَيۡكَ بِجَارِيَتَيۡنِ لَهُمَا مَكَان'' فِي الۡقِبۡطِ عَظِيۡم'' وَبِكِسۡوَةٍ وَأَهۡدَيۡتُ اِلَيۡكَ بَغۡلَةً لِتَرۡكَبَهَا وَالسَّلَامُ عَلَيۡكَ (تاريخ الخميس' جلد ۲' صفحه ۳۷)

''بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡم ۔ محمد بن عبداللہ (ﷺ) کی خدمت میں (مقوقس عظیم قبط کی طرف سے)۔ آپ پر سلام أَمَّا بعد! میں نے آپ کا مکتوب گرامی پڑھا۔ اُس کے مندرجات کو اور جس دین کو قبول کرنے کی آپ نے دعوت دی ہے' اُسے سمجھا۔ مجھے اس بات کا علم تھا کہ ایک نبی کی آمد ہوگی لیکن میرا خیال تھا کہ وہ ملکِ شام سے ظاہر ہوگا۔ میں نے آپ کے قاصد کی عزت و تکریم کی ہے۔ میں حضور کی خدمت میں دو کنیزیں بھیج رہا ہوں جن کی اہلِ قبط کی نگاہوں میں بڑی قدر و منزلت ہے۔ ایک خلعت اور ایک خچر حضور کی سواری کے لئے پیش ہے۔ آپ پر سلامتی ہو۔''

''اُس نے اپنے اسلام قبول کرنے کے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔ اُن دو کنیزوں میں سے ایک کا نام ''ماریہ'' تھا جسے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے کاشانۂ نبوّت میں شمولیت کا اعزاز بخشا۔ انہی کے بطنِ پاک سے سرورِ انبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام کے فرزند حضرت ابراہیم تولّد ہوئے جنہوں نے کم سنی میں اٹھارہ ماہ کی عمر میں وفات پائی۔ اس صدمہ سے حضور کی آنکھیں اشکبار ہوئیں۔ صحابہ نے عرض کی: يَا نَبِيَّ اللّٰهِ ! اَنۡتَ اَحَقُّ مَنۡ عَرَفَ اللّٰهَ حَقَّه' فِيۡمَا اَعۡطَاهُ وَاَخَذَ (اے اللہ کے نبی! اللہ تعالیٰ جو عطا فرماتا ہے اور جو واپس لے لیتا ہے' اُسے صحیح طور پر سب سے زیادہ سمجھنے والے حضور ہیں تو پھر یہ گریہ کیسا؟) تو مرشدِ برحق نے فرمایا:

تَدمَعُ العَینُ وَیَحزَنُ القَلبُ وَلاَ نَقُولُ مَا یُسخِطُ الرَّبَّ وَاِنَّا عَلَیکَ یَا اِبرَاھِیمُ لَمَحزُونُونَ
("أنساب الاشراف" لعلامه بلاذری' ص ۴۵۱)
"آنکھیں اشکبار ہیں' دل غمزدہ ہے لیکن ہم اپنی زبان پر کوئی ایسا حرف نہیں لاتے جو اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا باعث ہو۔ اے ابراہیم! ہم تیری جدائی پر غمگین ہیں۔"

جس دن حضرت ابراہیم نے وفات پائی' اُس دن سورج کو گرہن لگا۔ لوگ کہنے لگے کہ سورج بھی اس حادثہ کے باعث گرہن سے دوچار ہوا ہے۔ حضور علیہ السلام نے سنا تو حقیقتِ حال سے پردہ اُٹھاتے ہوئے فرمایا:
اِنَّھَا لَا تَکسِفُ لِمَوتِ اَحَدٍ وَلَا لِحَیَاتِہٖ (شرح المواهب اللدنيه لابن يوسف الزُّرقاني' جزء ۳' صفحه ۲۱۴' المطبعة الازهرية مصر)
"سورج کو کسی کی موت اور کسی کی زندگی سے گرہن نہیں لگا کرتا۔" ☆

دوسری کنیز کا نام "سیرین" تھا جو شاعرِ دربارِ رسالت حضرت حسان بن ثابت انصاری رضی اللہ عنہ کو مرحمت فرمائی گئی۔ اُن کے بطنِ پاک سے حضرت حسان کے فرزند عبدالرحمٰن پیدا ہوئے۔ مقوقس نے جو خچر بھیجا تھا' اُس کا رنگ سفید تھا اور "دُلدُل" کے نام سے مشہور ہوا اور جناب امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانہ تک زندہ رہا۔"

واقدی لکھتے ہیں کہ ایک رات مقوقس نے حضرت حاطب کو تنہائی میں اپنے پاس بلایا اور سرورِ انبیاء ﷺ کے متعلق چند استفسارات کئے۔ کہنے لگا کہ ہم ایک نبی کی آمد کے لئے چشم براہ تھے۔ ہمارا خیال تھا کہ وہ نبی ملکِ شام سے ظاہر ہوگا لیکن اب وہ عرب سے مبعوث ہوئے ہیں۔ عرب ایسا ملک ہے جہاں قحط سالی' تنگ دستی اور اِفلاس ہے چنانچہ میری قوم اس دین کو قبول نہیں کرے گی۔ اگر میں اسلام قبول کرلوں تو مجھے یہاں کے تاج و تخت سے دستبردار ہونا پڑے گا جسے میں پسند نہیں کرتا۔ حضرت حاطب نے سرورِ انبیاء ﷺ کو جب اُس کی یہ باتیں بتائیں تو آپ نے فرمایا:
ضَنَّ الخَبِیثُ بِمُلکِہٖ وَلاَ بَقَاءَ لِمُلکِہٖ (تاريخ الخميس' ج ۲' ص ۳۸'۳۹)
"خبیث نے اپنے ملک کے سلسلہ میں بخیلی کی ہے لیکن اُس کا ملک باقی نہیں رہے گا۔"

"<u>مکتوب بنام حارث بن ابی شمر الغسانی</u>: رحمتِ عالم ﷺ نے شجاع بن وہب رضی اللہ عنہ کو اپنا مکتوب گرامی دے کر حارث کی طرف روانہ کیا۔ حارث کو قیصر نے غسانی ریاست کا حکمران مقرر کیا تھا۔ شجاع کہتے ہیں کہ جب میں حارث کے پاس پہنچا تو دو روز تک میں اُس کے دروازے پر بیٹھا رہا لیکن ملاقات کی کوئی صورت نہ نکلی۔ آخر میں نے اُس کے دربان سے رابطہ قائم کیا اور اُسے بتایا کہ میں رسول اللہ ﷺ کا قاصد ہوں اور حارث کے نام حضور علیہ السلام کا خط لایا ہوں۔ مجھے یہاں آئے دو دن گزر گئے ہیں لیکن ابھی تک میری ملاقات نہیں ہوئی۔ دربان نے بتایا کہ حارث فلاں دن باہر آئے گا۔ اس سے پہلے ملاقات ممکن نہیں۔ چنانچہ مجھے مجبوراً وہاں رکنا پڑا۔

☆ تھامس کارلائل نے اپنی کتاب (Hero and Hero-Worship) میں نبی علیہ السلام کے اِس فرمودہ سے اُن کے کردار کی عظمت و رفعت کو سراہتے ہوئے آپ علیہ السلام کو خوب دادِ تحسین دی ہے۔

اِس اثناء میں وہ دربان میرے پاس آیا کرتا اور نبی کریم ﷺ کے بارے میں سوالات کیا کرتا اور میں اُسے سرکار کے ایمان افروز حالات سناتا۔ سنتے سنتے بسا اوقات اُس کی آنکھیں آنسوؤں سے چھلک پڑتیں اور وہ کہتا کہ انجیل میں آنے والے نبی کی جو علامتیں میں نے پڑھی ہیں' وہ سب اُن میں پائی جاتی ہیں۔ میں اُن پر ایمان لاتا ہوں اور اُن کی تصدیق کرتا ہوں۔ اگر مجھے حارث کا خوف نہ ہوتا تو میں اپنے ایمان لانے کا اعلان کر دیتا۔ وہ دربان میری بڑی عزت کیا کرتا اور میری خاطر مدارات میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ حارث سے اسلام لانے کی امید نہ رکھو کیونکہ وہ قیصر سے ڈرتا ہے۔''

''جس دن حارث باہر نکلا' شجاع رضی اللہ عنہ نے گرامی نامہ اُسے پہنچایا۔ اُس نے اُسے کھول کر پڑھا۔ اُس میں درج تھا:

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْم- مِنْ مُحَمَّدٍ رَّسُوْلِ اللّٰهِ اِلَي الْحَارِثِ بْنِ أَبِيْ شَمَّر-
سَلَامٌ عَلٰي مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى-وَآمَنَ بِهٖ وَصَدَّقَ وَاِنِّيْ اَدْعُوْكَ أَنْ تُؤْمِنَ بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ' يَبْقٰى لَكَ مُلْكُكَ (الوثائق السياسية صفحه ۱۲۶)

''بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم ۔ محمد رسول اللہ کی جانب سے حارث بن ابی شمر کے نام۔
ہر اُس شخص پر سلامتی ہو جو ہدایت کا پیروکار ہے اور اُس پر ایمان لے آیا ہے اور اُس کی تصدیق کی ہے۔
میں تمہیں دعوت دیتا ہوں کہ تم اللہ وحدہ' لاشریک پر ایمان لے آؤ۔ تمہارا ملک باقی رہے گا۔''

ڈاکٹر حمید اللہ لکھتے ہیں :

''خط پڑھ کر وہ غصہ سے بے قابو ہو گیا اور گرامی نامہ کو زمین پر دے مارا اور بڑبڑا کر کہنے لگا: کون ہے جو مجھ سے میری حکومت چھیننا چاہتا ہے؟ میں اُس پر حملہ کروں گا۔ اُس نے گھوڑوں کی نعل بندی کی اور لشکر کو تیاری کا حکم دیا۔ پھر قیصر کو اپنے ارادہ سے مطلع کیا۔ قیصر نے اُسے فوراً جواب لکھا کہ اس خیالِ خام کو دماغ سے نکال دو اور اُن پر حملہ کرنے کا مت ارادہ کرو اور جلدی میرے پاس پہنچو۔'' (تاریخ الخمیس' جلد ۲' ص ۳۹)

''جب حارث کو قیصر کا خط موصول ہوا جس میں اُس نے اُسے تاکید کی تھی کہ اُن پر حملہ کرنے کا ارادہ ترک کر دے اور فوراً اُس کے پاس پہنچے تو اب اُس کا مزاج درست ہو گیا اور اُس کی وہ تندی کافور ہو گئی جس کا مظاہرہ اُس نے حضور علیہ السلام کا گرامی نامہ پڑھ کر کیا تھا۔ شجاع رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ اُس نے مجھے بلایا اور دریافت کیا کہ تمہارا واپسی کا کب ارادہ ہے؟ میں نے بتایا کہ میں کل عازمِ مدینہ ہو جاؤں گا۔ چنانچہ اُس نے ایک سو مثقال سونا مجھے ہدیۃً پیش کیا۔'' (''ضیاء النبی ﷺ'' جلد چہارم' صفحات ۲۰۳' ۲۰۴)

''محبوب ربّ العالمین کا گرامی نامہ شہنشاہِ ایران خسرو پرویز کے نام: اللہ تعالیٰ کے سچے اور پیارے رسول علیہ افضل الصلوٰۃ واَطیب السلام نے اپنے ایک صحابی حضرت عبداللہ بن حذافہ ا سہمی رضی اللہ عنہ کو بھیجا

تا کہ ایران کے فرمانروا خسرو پرویز کو حضور اکرم ﷺ کا گرامی نامہ پہنچائیں۔ یہ خط سربمہر تھا جس کا متن یہ ہے:

بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ- مِنْ مُحَمَّدٍ رَّسُوْلِ اللهِ اِلٰى كِسْرٰى عَظِيْمِ فَارِسَ
سَلَامٌ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى-وَآمَنَ بِاللهِ وَرَسُوْلِهٖ وَشَهِدَ أَنْ لَّااِلٰهَ اِلَّااللهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ وَ أَدْعُوْكَ بِدَاعِيَةِ اللهِ عَزَّ وَجَلَّ- فَاِنِّىْ أَنَا رَسُوْلُ اللهِ عَزَّ وَ جَلَّ اِلَى النَّاسِ كَآفَّةً لِاُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا وَّيَحِقَّ الْقَوْلُ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ- اَسْلِمْ تَسْلَمْ فَاِنْ اَبَيْتَ فَعَلَيْكَ اِثْمُ الْمَجُوْسِ (تاريخ الخميس، جلد ۲، صفحه ۳۴)

''یہ خط محمد رسول اللہ ﷺ کی طرف سے کسریٰ شاہِ ایران کے نام ہے۔
سلامتی ہو ہر اُس شخص پر جس نے ہدایت کی پیروی کی اور اللہ اور اُس کے رسول پر ایمان لے آیا اور یہ گواہی دی کہ اللہ وحدہٗ لاشریک کے سوا کوئی لائقِ عبادت نہیں اور محمد علیہ الصلوٰۃ والسلام اُس کے بندے اور اُس کے رسول ہیں۔ اے کسریٰ! میں تجھے اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کی دعوت دیتا ہوں کیونکہ میں اللہ عزّ وجلّ کا تمام لوگوں کی طرف رسول ہوں تا کہ میں بروقت زندہ لوگوں کو متنبہ کروں اور تا کہ کفار پر حجت قائم کروں۔ اسلام قبول کر لے، سلامت رہے گا اور اگر تو اسلام قبول کرنے سے انکار کرے گا تو تیری گردن پر سارے مجوسیوں (آتش پرستوں) کی گمراہی کا گناہ ہوگا۔''

''جب اُس پیکرِ نخوت وغرور نے یہ ہدایت نامہ پڑھا تو فرطِ غضب سے آپے سے باہر ہو گیا اور اُسے پھاڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور ہرزہ سرائی کرتے ہوئے کہا کہ (معاذ اللہ ثمّ استغفر اللہ) میرا ایک غلام مجھے اِس قسم کا خط لکھنے کی جسارت کرتا ہے۔ اور یمن کے عامل (گورنر) باذان کو لکھ بھیجا کہ وہ حجاز کی طرف طاقتور لوگ بھیجے اور لکھنے والے کو میرے حضور پیش کرے۔ سرکارِ ہر جہاں ﷺ کو جب اُس کی گستاخی کے بارے میں عرض کی گئی تو ارشاد فرمایا: مَزَّقَ كِتَابِىْ مَزَّقَ اللهُ مُلْكَهٗ (اُس نے میرے گرامی نامہ کو پارہ پارہ کر دیا، اللہ تعالیٰ نے اُس کے ملک کو پارہ پارہ کر دیا ہے)۔''

''رات کو جبریلِ امین بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوئے اور عرض کی: یا رسولَ اللہ! اللہ تعالیٰ نے اس مغرور پرویز پر اُس کے بیٹے شیرویہ کو مسلط کر دیا ہے۔ اُس نے اُس کے پیٹ میں چھرا گھونپ کر رات کو فلاں وقت میں اُس کا کام تمام کر دیا ہے۔ جب صبح خسرو کے قاصد دربارِ نبوّت میں حاضر ہوئے تو حضور علیہ السلام نے فرمایا:

أَبْلِغَا صَاحِبَكُمَا اِنَّ رَبِّىْ قَدْ قَتَلَ رَبَّهٗ كِسْرٰى فِىْ هٰذِهِ اللَّيْلَةِ لِسَبْعِ سَاعَاتٍ مَضَتْ مِنْهَا
(الطبقات الكبرىٰ لابن سعد، ج ۱، ص ۲۶۰)

''جاؤ اور اپنے صاحب کو جا کر بتا دو کہ میرے رب نے اُس (ملک) کے رب کسریٰ کو آج رات قتل کر دیا ہے جبکہ رات کے سات پہر گزر چکے تھے۔''

''اُس کے بیٹے شیرویہ نے اُس کی چھاتی پر چڑھ کر اُس کا پیٹ پھاڑ ڈالا ہے۔ جاؤ اور باذان کو جا کر اُس کے شہنشاہ کی ہلاکت کی اطلاع دو۔ وہ کہنے لگے: آپ کو علم ہے آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ اس کے نتائج کتنے خوفناک ہوں گے جو آپ نے کہا ہے۔ ہم اپنے بادشاہ کو لکھ دیں گے اور وہ آپ کو اس کی اذیت ناک سزا دے گا۔''

''(یہ منگل کی رات اور جمادی الاول کی دسویں تاریخ تھی اور ہجرت کا ساتواں سال تھا)''

''حضور انور ﷺ نے فرمایا: بے شک یہ ساری باتیں اُسے جا کر بتا دو اور ساتھ ہی یہ بھی بتانا کہ میرا دین اور میری حکومت کسرٰی کی مملکت کی آخری سرحدوں تک پہنچے گی بلکہ وہاں تک پہنچے گی جہاں تک کوئی کھر والا جانور یا سُم والا جانور موجود ہے۔ اور اُسے میری طرف سے یہ بھی کہہ دینا کہ اگر تم اسلام قبول کرلو گے تو تمہارا ملک اور تمہارا ساز و سامان تمہارے پاس ہی رہنے دیا جائے گا۔''

''جب باذان کے قاصد واپس جانے لگے تو سرکارِ ہر جہاں ﷺ نے ایک کمر بند جو سونے اور چاندی سے مرصع تھا' اُنہیں بطور تحفہ عطا فرما کر رخصت کیا۔ وہاں سے وہ باذان کے پاس پہنچے اور جو واقعات رُونپذیر ہو چکے تھے' وہ اُسے کہہ سنائے۔ باذان نے کہا کہ یہ گفتگو کسی بادشاہ کی نہیں بلکہ نبی کی معلوم ہوتی ہے۔ اگر اُن کی بتائی ہوئی یہ خبر سچی نکلی تو سب بادشاہوں سے پہلے میں اُن پر ایمان لے آؤں گا۔ چند روز ہی گزرے تھے کہ شیرویہ کا خط اُس کے نام موصول ہوا جس میں اُس نے اپنے باپ کو قتل کرنے کی اطلاع دی تھی اور باذان کو لکھا تھا کہ اُسے کسرٰی تسلیم کرلے۔ یہ خط پڑھنے کے بعد اُسے یقین ہو گیا کہ سرورِ کائنات ﷺ اللہ تعالیٰ کے سچے رسول ہیں۔ چنانچہ اُس نے اور کئی فارسی النسل لوگوں نے اسلام قبول کرنے کا اعلان کر دیا اور اپنے ساتھیوں کے مسلمان ہونے کی اطلاع بارگاہِ رسالت میں بھجوا دی۔'' (''مدارج النبوۃ'' الشیخ عبدالحق محدث دہلوی' ج ۲' ص ۲۲۴؛ ''تاریخ الخمیس'' ج ۲' ص ص ۳۶' ۳۷) بحوالہ ''ضیاء النبی ﷺ''۔ کرم شاہ الازہری' ج ۴' ص ص ۲۰۶' ۲۰۷)

اِسی قسم کے دیگر نامہ ہائے مبارک جزیرہ نمائے عرب کے پڑوس میں واقع مختلف سربراہانِ مملکت اور قبائل کو ارسال کئے گئے۔ اُن میں سے کچھ نے جواب لکھ بھیجے اور تحائف کے ساتھ اپنے سفیر آپ کی خدمت میں بھیجے جبکہ اُن میں سے کئی سربراہان نے جواب دینا ضروری نہیں سمجھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ مصر کے قبطی فرمانروا نے پیغمبر علیہ السلام کے اصل خط کو محفوظ کرلیا جو استنبول (ترکی) کے عجائب خانہ میں اب بھی دیکھا جا سکتا ہے۔'' -- "Muhammad The Educator of Mankind" ... Afzalur Rahman, p. 837) London.

نجران کے عیسائیوں نے بھی پیغمبر علیہ السلام کے ساتھ معاہدۂ امن کیا۔ اُنہوں نے مذہبی معاملات پر بحث کے لئے ایک وفد آپ کی خدمت میں بھیجا اور جب اُنہوں نے آپ سے اتفاق نہ کیا تو آپ نے اُنہیں مباہلہ کی دعوت دی (جس کا ذکر سورہ آلِ عمران کی آیت ۶۱ میں ہوا) جس میں جھوٹے فریق پر اللہ کی لعنت کی جاتی ہے۔ نجران کے عیسائی آپ ﷺ کے مشن کی صداقت کے اِس قدر قائل ہوئے کہ اُنہوں نے مباہلہ کے چیلنج کو قبول کرنے کی جرأت نہیں کی۔ تاہم اُنہوں نے مسلم ریاست کے غیر مسلم باشندے ہونے کو بخوشی قبول کرلیا۔ معاہدہ کی اہم شقوں کو ضبطِ تحریر میں لایا گیا اور پیغمبر علیہ السلام سے ایک تحریری فرمان بھی وصول کیا جس میں اُنہیں مذہبی اور انتظامی معاملات میں خود مختاری عطا کی گئی۔'' (''محمد رسول اللہ ﷺ'' از ڈاکٹر حمید اللہ' صفحات ۱۰۳' ۱۰۴)

''**بین الاقوامی قانون کی اساس**: سورۃ النساء کی آیت اوّل اور سورۃ الحجرات کی آیت ۱۳ تمام نوعِ انسانی کو قطع نظر رنگ و نسل اور قومیت کے ایک ہی آفاقی عائلی رشتے میں جُڑنے کی دعوت دے رہی ہیں اور اس میں کوئی شک بھی نہیں کہ تمام نوعِ انسانی مشترک شجرہ نسب (Parentage) اور خونی رشتوں کے مشترک بندھنوں میں بندھے ہوئے ایک ہی سماج اور ایک ہی معاشرہ ہیں۔ لہٰذا کوئی وجہ نہیں کہ وہ کسی قسم کے سیاسی یا کسی دوسرے اتحاد میں شامل نہ ہوں جو اُنہیں ایک ہی پلیٹ فارم پر اکٹھا کر دے۔ نوعِ انسان کے لئے پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اتحاد و اتفاق کے اسی پیغام کے ساتھ مبعوث کیا گیا اور آپ نے اُنہیں دینی بھائی بن جانے کی طرف دعوت دی۔ فرمودہ الٰہی ہوا:

(۱) وَمَا اَرۡسَلۡنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيۡرًا وَّنَذِيۡرًا وَّلٰـكِنَّ اَكۡثَرَ النَّاسِ لَا يَعۡلَمُوۡنَ O (سبا:۲۸)

"(اے پیغمبر!) اور ہم نے آپ کو تمام انسانوں کے لئے بطور خوشخبری سنانے والے کے اور ڈرانے والے کے (پیمبر بنا کر) بھیجا ہے لیکن اکثر لوگ نہیں سمجھتے۔'' (۲۸ : ۳۴)

(۲) اِنۡ هُوَ اِلَّا ذِكۡرٌ لِّلۡعٰلَمِيۡنَ O لِمَنۡ شَآءَ مِنۡكُمۡ اَنۡ يَّسۡتَقِيۡمَ O (التّکویر: ۲۷، ۲۸)

''بس یہ تو ایک نصیحت نامہ ہے اُس کے لئے جو تم میں سے سیدھا چلنا چاہے۔'' (۸۱:۲۸، ۲۷)

''اس طرح اسلام تمام نوعِ انسان کو مشترک اخوت کے رشتے میں جوڑنا چاہتا ہے لیکن قدرتی طور پر لوگ اتحاد و اتفاق کی اس دعوت کو قبول نہیں کرتے اور حسبِ معمول اپنے اختلافات کو قائم کئے رہتے ہیں۔ اس لئے اس کے متبادل کے طور پر اسلام اُنہیں اس بات کی دعوت دیتا ہے کہ وہ انصاف اور معدلت (Equity) کی بنیاد پر کم از کم اپنے اچھے اور دوستانہ تعلقات کو تو قائم رکھیں اور اچھے ہمسایوں کی طرح رہیں۔'' ("Muhammad -- The Educator of Mankind" ... Afzalur Rahman, pp. 837, 838)

''**دیسی زندگی (Domestic Life) میں مسلمانوں کے غیر مسلمین کے ساتھ تعلقات**: سورۃ المُمۡتَحِنه کی مندرجہ ذیل دو آیات مذکورہ بالا مسئلہ میں ہمیں جامع رہنما اصول مہیا کرتی ہیں:

لَا يَنۡهٰٮكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيۡنَ لَمۡ يُقَاتِلُوۡكُمۡ فِى الدِّيۡنِ وَلَمۡ يُخۡرِجُوۡكُمۡ مِّنۡ دِيَارِكُمۡ اَنۡ تَبَرُّوۡهُمۡ وَتُقۡسِطُوۡۤا اِلَيۡهِمۡ‌ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الۡمُقۡسِطِيۡنَ O اِنَّمَا يَنۡهٰٮكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيۡنَ قٰتَلُوۡكُمۡ فِى الدِّيۡنِ وَاَخۡرَجُوۡكُمۡ مِّنۡ دِيَارِكُمۡ وَظٰهَرُوۡا عَلٰٓى اِخۡرَاجِكُمۡ اَنۡ تَوَلَّوۡهُمۡ‌ وَمَنۡ يَّتَوَلَّهُمۡ فَاُولٰٓـئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوۡنَ O (اَلۡمُمۡتَحِنه : ۸، ۹)

''اللہ تمہیں اُن لوگوں کے ساتھ حُسنِ سلوک اور انصاف کرنے سے نہیں روکتا جو تم سے دین کے بارہ میں نہیں لڑے اور تمہیں تمہارے گھروں سے نہیں نکالا' بے شک اللہ انصاف کا برتاؤ کرنے والوں ہی کو دوست رکھتا ہے۔ اللہ تو تمہیں صرف اُن لوگوں سے دوستی کرنے سے منع کرتا ہے جو تم سے دین کے بارہ میں لڑے اور تمہیں تمہارے گھروں سے نکال دیا اور تمہارے نکالنے میں مدد کی اور جو کوئی اُن سے دوستی کرے گا' تو یہی لوگ تو ظالم ہیں۔'' (۹، ۸ : ۶۰)

آیت ۸ بالا میں اُن غیر مسلمین کے ساتھ نہ صرف انصاف اور معدلت کا پیغام ہے جو مسلمانوں سے نہ تو متحارب (لڑنے والے) ہیں اور نہ ہی اُن سے دشمنی ہے بلکہ وہ مسلمانوں کو اُن سے ہمدرد و مہربان رہنے کی تلقین کرتی ہے۔ آیت کا لفظ ''بِرّ'' بڑا جامع ہے جو اُس مہربانی کی طرف اشارہ کر رہا ہے جو انصاف سے بھی فائق اور بڑھ کر ہے۔

''اللہ تمہیں منع نہیں کرتا'' میں معتدل اظہار ہے جو اس غلط فہمی کو دُور کرتا ہے کہ تمام غیر مسلمین ایک ہی چیز ہیں اور اس لحاظ سے اُنہیں مسلمانوں کی طرف سے کسی قسم کی مہربانی اور حُسنِ سلوک ملنے کا کوئی حق نہیں۔ غیر مسلمین سے مہربانی کرنے کی بالعموم ممانعت نہیں بلکہ صرف اُن سے مہربانی اور تلطف کی ممانعت ہے جو مسلمانوں کے پکے دشمن ہیں اور اُن سے مستقل طور پر برسرِ پیکار رہتے ہیں۔ یہ بات صفا اور مروۃ کے متعلق فرمانِ الٰہی کی طرح ہے جب کچھ لوگ اپنے خود اختراعی جاہلیت کے عقیدہ کے مطابق صفا اور مروۃ میں جانے سے گریز کرتے تھے:

فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ أَوِاعْتَمَرَ فَلاَ جُنَاحَ عَلَيْهِ أَنْ يَطَّوَّفَ بِهِمَا (البقرة: ۱۵۸)

''سو جو کوئی بیت اللہ کا حج کرے یا عمرہ کرے' اُس پر ذرا بھی گناہ نہیں کہ وہ اُن دونوں کے درمیان سعی (آمدورفت) کرے۔'' (۱۵۸ : ۲)

چونکہ صفا اور مروۃ کی دو پہاڑیوں کے درمیان ''سعی'' کرنا حج اور عمرہ کا لازمی جزء ہے' تو اُن کی سعی کرنے کا حکم دینے میں زمانہ جاہلیت کی ایک غلط فہمی کو دُور کرنا ہے۔

''اسلامی ریاست کے غیر مسلم باشندے: اسلامی ریاست کی حفاظت میں رہنے والے باشندے اسلامی سیاست کی اصطلاح میں ''ذِمّی'' یا ''اہل الذمہ'' کہلاتے ہیں اور اُنہیں خصوصی حقوق حاصل ہوتے ہیں۔ ''اہل الذمہ'' کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ' اُس کے رسول اور مسلمانوں نے اُن سے اس بات کا معاہدہ کیا ہے کہ وہ اسلامی حکومت کی سرپرستی میں امن و حفاظت میں رہیں گے جہاں اُنہیں اپنے مذہبی فرائض اور عقائد پر عمل پیرا ہونے کی بلا روک ٹوک آزادی حاصل ہوگی۔''

''نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ذمّیوں کے مسلمانوں پر حقوق پر بڑا زور دیا ہے اور اُس شخص کو غضبِ الٰہی اور سزائے الٰہی کی وعید سنائی ہے جو اُن حقوق کو نظر انداز کرتا ہے۔ اس سلسلہ میں آپ ﷺ نے فرمایا:

(۱) ''جو کوئی کسی ذمّی کو تکلیف پہنچاتا ہے' وہ دراصل مجھے تکلیف پہنچاتا ہے اور جو کوئی مجھے تکلیف پہنچاتا ہے وہ (دراصل) اللہ کو تکلیف پہنچاتا ہے۔'' (المعجم الاوسط للطبرانی)

(۲) ''جو کوئی کسی ذمّی کو تکلیف پہنچاتا ہے تو میں اُس (تکلیف پہنچانے والے) کا دشمن ہوں اور میں قیامت کے دن بھی اُس کا مخالف اور دشمن ہی ہوں گا۔''

(۳) ''روزِ محشر میں میں اُس شخص سے جھگڑا کروں گا جو معاہدین میں سے کسی شخص پر ظلم و تشدد کرتا ہے یا اُس کے کسی حق کو تلف کرتا ہے' یا اُس پر ایسی ذمہ داری کا بوجھ ڈالتا ہے جس کا اٹھانا اُس کی طاقت سے باہر ہے یا اُس کی رضامندی کے خلاف اُس کی کوئی چیز لے لیتا ہے۔'' (ابوداؤد)

''خلفائے راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین نے غیر مسلم باشندوں کے حقوق اور تقدس کی ہمیشہ پاسداری اور حفاظت کی اور فقہائے اسلام باوجود اس بات کے کہ بہت سے دیگر معاملات میں وہ باہم مختلف الآراء ہیں' اِن حقوق اور تقدسات پر زور دینے میں باہم متفق ہیں۔ مالکی مکتب فکر کے شہاب الدین القرافی کہتے ہیں:

''معاہدۂ تحفظ ہم پر اہل الذمہ کی طرف سے کچھ ذمہ داریاں عائد کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ' اُس کے رسول ﷺ اور دینِ اسلام کی ضمانت پر ہماری پناہ اور حفاظت کے تحت میں وہ ہمارے ہمسائے ہیں۔ جو کوئی اُن میں سے کسی کے حق کو تلف کرتا ہے' اُسے گالی دینے' اُس کی عزت کو خاک میں ملانے' یا اُسے کوئی زخم پہنچانے یا اس پہنچانے میں مدد کرنے میں اُس (ذمّی) کے حق کو مارتا ہے تو اُس نے اللہ تعالیٰ' اُس کے رسول ﷺ اور دینِ اسلام کی دی ہوئی ضمانت کو توڑ دیا ہے۔'' (''الفروق' للقرافی بحوالہ القرضاوی)

اور ظاہری فرقہ کے فقیہ ابن حزم کہتے ہیں:

''اگر کسی ذمّی کو پکڑنے کے لئے دشمن اپنے لاؤلشکر سمیت آجاتا ہے تو دشمن سے سپاہیوں اور ہتھیاروں کے ذریعے لڑنا اور اُس کی خاطر اپنی جان دے دینا ہمارا فرض بنتا ہے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول ﷺ کی طرف سے دی ہوئی ضمانت کی ہماری جانب سے تعظیم و تکریم ہوگی۔ اُس ذمّی کو دشمن کے حوالے کر دینا اس ضمانت کی رُسوائی ہوگی۔'' (''مراتب الاجماع'' لابن حزم بحوالہ القرضاوی ص ۳۳۹)

''غیر مسلمین سے دوستی کا مفہوم : ایک سوال جو کچھ لوگوں کو پریشان کرتا ہے اور جسے بالعموم زیرِ بحث لایا جاتا ہے یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ خود مسلمانوں کو غیر مسلمین کو دوست' اتحادی اور معاونین بنانے سے منع کرتا ہے تو ہم کیونکر اُن سے مہربانی' تلطف اور حسنِ سلوک کے رویّے کا اظہار کر سکتے ہیں۔ جیسا کہ فرمانِ الٰہی ہوا:

يَآَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰى أَوْلِيَاءَ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَآءُ بَعْضٍ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَإِنَّهٗ مِنْهُمْ إِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ O (المائدۃ : ۵۱)

''مؤمنو! یہود و نصاریٰ کو دوست مت بنانا' وہ ایک دوسرے کے دوست ہیں اور تم میں سے جو کوئی اُن سے دوستی کرے گا' وہ اُنہی میں شمار ہوگا۔ بے شک اللہ ظالموں کو راہ یاب نہیں کرتا۔''

اس کا جواب یہ ہے کہ آیت مذکورہ غیر مشروط نہیں ہے کہ اُس کا اطلاق ہر یہودی' عیسائی یا غیر مسلم پر ہو۔ آیت کی اس طرح تاویل کرنا قرآن کے اُن احکام کی تردید ہے جن میں ہر دین و مذہب کے اچھے اور امن پسند لوگوں سے مہربانی اور تلطف سے پیش آنے کا حکم ہے اور اُن آیاتِ قرآنی کی بھی تردید ہے جن میں اہلِ کتاب کی عورتوں سے نکاح کرنے کی اجازت ہے (بحوالہ سورۃ المائدۃ کی آیت ۸۲)۔

دراصل سورۃ المائدۃ کی آیت مذکورہ (۵۱) اُن لوگوں کے بارہ میں نازل ہوئی جو اسلام کے دشمن تھے اور

مسلمانوں سے برسرِ پیکار رہتے تھے۔ لہٰذا مسلمانوں کو ایسے غیر مسلمین کا اتحادی بننے کی اسلام اجازت نہیں دیتا اور نہ ہی دین اور سماج کی قیمت پر اُنہیں راز دار بنانے کی اجازت دیتا ہے۔ اس نکتے کو اس آیت میں واضح طور پر بیان کیا گیا ہے:

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَتَّخِذُوۡا بِطَانَۃً مِّنۡ دُوۡنِکُمۡ لَا یَاۡلُوۡنَکُمۡ خَبَالًا ؕ وَدُّوۡا مَا عَنِتُّمۡ ۚ قَدۡ بَدَتِ الۡبَغۡضَآءُ مِنۡ اَفۡوَاھِھِمۡ ۚۖ وَمَا تُخۡفِیۡ صُدُوۡرُھُمۡ اَکۡبَرُ ؕ قَدۡ بَیَّنَّا لَکُمُ الۡاٰیٰتِ اِنۡ کُنۡتُمۡ تَعۡقِلُوۡنَ O ھٰۤاَنۡتُمۡ اُولَآءِ تُحِبُّوۡنَھُمۡ وَلَا یُحِبُّوۡنَکُمۡ وَتُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡکِتٰبِ کُلِّہٖ (آلِ عمران : ۱۱۸، ۱۱۹)

''مؤمنو! اپنے سوا کسی کو گہرا دوست نہ بناؤ۔ وہ لوگ تمہارا نقصان کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے، وہ تمہارے دکھ پہنچنے کی آرزو رکھتے ہیں، بغض تو اُن کے مونہوں سے ظاہر ہو پڑتا ہے اور جو کچھ اُن کے دل چھپائے ہوئے ہیں، وہ اور بھی بڑھ کر ہے۔ ہم نے تو تمہارے لئے نشانیاں کھول کر ظاہر کر دی ہیں اگر تم عقل سے کام لینے والے ہو۔ تم تو ایسے ہو کہ اُن سے محبت رکھتے ہو حالانکہ وہ تم سے ذرا محبت نہیں رکھتے حالانکہ تم کتابِ آسمانی پر اُن کے کل کے کل پر ایمان رکھتے ہو۔'' (۱۱۸، ۱۱۹ : ۳)

''یہ آیت ایسے لوگوں کے کردار پر روشنی ڈالتی ہے جو اپنے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف سخت دشمنی اور نفرت چھپائے ہوئے ہیں اور جن کی زبانوں پر ایسی دشمنی کے کچھ اثرات کا اظہار آ ہی جاتا ہے۔ فرمودہ الٰہی ہے:

لَا تَجِدُ قَوۡمًا یُّؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰہِ وَالۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ یُوَآدُّوۡنَ مَنۡ حَآدَّ اللّٰہَ وَرَسُوۡلَہٗ وَلَوۡ کَانُوۡۤا اٰبَآءَھُمۡ اَوۡ اَبۡنَآءَھُمۡ اَوۡ اِخۡوَانَھُمۡ اَوۡ عَشِیۡرَتَھُمۡ ؕ اُولٰٓئِکَ کَتَبَ فِیۡ قُلُوۡبِھِمُ الۡاِیۡمَانَ وَاَیَّدَھُمۡ بِرُوۡحٍ مِّنۡہُ (الحشر : ۲۲)

''جو لوگ اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، آپ اُنہیں نہ پائیں گے کہ وہ ایسوں سے دوستی رکھیں جو اللہ اور اُس کے رسول کے مخالف ہیں خواہ وہ لوگ اُن کے باپ یا اُن کے بیٹے یا اُن کے کنبے والے ہی کیوں نہ ہوں۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ (اللہ نے) اُن کے دلوں میں ایمان ثبت کر دیا ہے اور اُنہیں اپنے فیض سے قوت دی ہے۔'' (۲۲ : ۵۸)

یہاں یہ بتا دیا گیا کہ کامل و مخلص مؤمن کی ایک خاص علامت یہ ہوتی ہے کہ وہ دوست بھی اپنے محبوبِ حقیقی کے دوستوں اور مخلصوں ہی کو رکھتا ہے اور اُس کے باغیوں اور منکروں کو اپنا بھی دشمن سمجھتا ہے یہاں تک کہ اُس کی طبعی محبتوں پر بھی حق تعالیٰ کی عقلی محبت غالب آ جاتی ہے۔

اللہ کی مخالفت نہ صرف بدعقیدگی ہے بلکہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف دشمنی کو بھی شامل ہے۔ چنانچہ فرمایا:

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَتَّخِذُوۡا عَدُوِّیۡ وَعَدُوَّکُمۡ اَوۡلِیَآءَ تُلۡقُوۡنَ اِلَیۡھِمۡ بِالۡمَوَدَّۃِ وَقَدۡ کَفَرُوۡا بِمَا جَآءَکُمۡ مِّنَ الۡحَقِّ ۚ یُخۡرِجُوۡنَ الرَّسُوۡلَ وَاِیَّاکُمۡ اَنۡ تُؤۡمِنُوۡا بِاللّٰہِ رَبِّکُمۡ (المُمتحِنة : ۱)

''مؤمنو! تم میرے دشمن اور اپنے دشمن کو دوست نہ بنالینا کہ اُن سے محبت کا اظہار کرنے لگو درآنحالیکہ تمہارے پاس جو (دینِ حق) آچکا ہے' اُس کے وہ منکر ہیں۔ رسول (علیہ السلام) اور خود تمہیں اس بناء پر شہر بدر کر چکے ہیں کہ تم اپنے پروردگار اللہ پر ایمان لے آئے ہو۔'' (۱ : ٦٠)

''یہ آیت مشرکینِ مکہ کے سلسلہ میں نازل ہوئی جنہوں نے اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کے خلاف محاذِ جنگ بنالیا تھا اور مسلمانوں کو اُن کے گھروں سے محض اس وجہ سے نکال باہر کیا تھا کہ اُنہوں نے اس بات کا اعلان کیا تھا کہ ہمارا رب اللہ تعالیٰ ہے۔ اس قسم کے لوگوں کے ساتھ دوستی اور اتحاد کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ تاہم اس کے باوجود قرآنِ حکیم نے قطعی طور پر مسلمانوں کو نا امید نہیں کیا بلکہ اچھے حالات پیدا ہونے اور بہتر تعلقات کی امید میں اُن کی حوصلہ افزائی کی۔ اُسی سورۃ المُمْتَحِنَة میں رب تعالیٰ فرماتا ہے :

عَسَى اللّٰهُ أَنْ يَّجْعَلَ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَ الَّذِيْنَ عَادَيْتُمْ مِّنْهُمْ مَّوَدَّةً وَاللّٰهُ قَدِيْر'' (المُمْتَحِنَة: ۷)

''عجب نہیں کہ اللہ تمہارے اور اُن لوگوں کے درمیان جن کو تم سے دشمنی ہے' دوستی پیدا کردے۔ اللہ بڑی قدرت والا ہے۔'' (۷ : ٦٠)

حضرت ابوسفیان بن حرب وغیرہ کا اسلام لانا اِسی پیشگوئی کے ظہورِ عملی کی مثال ہے۔ مسلمانوں نے حکمِ الٰہی کی تعمیل میں مشرک رشتہ داروں سے قطع تعلق تو کرلیا تھا لیکن قرابتوں اور رشتہ داریوں کی بناء پر کسی درجہ میں غم محسوس کرنا اُن کے لئے بالکل طبعی امر تھا چنانچہ اُن کی دلجوئی کے لئے ربِّ رحیم نے یہ آیت نازل فرمائی۔

''دشمنانِ اسلام کو دوست بنانے کی ممانعت اور بھی شدید ہو جاتی ہے جب وہ مسلمانوں سے زیادہ طاقتور ہوں اور (اُن کی ہیبت سے) لوگوں کے دلوں سے امیدیں ٹوٹ جائیں اور ڈر اور خوف پیدا ہو جائے۔ ایسی صورتِ حال میں صرف منافقین اور وہ جن کے دلوں میں روگ ہے' اُنہیں دوست بنانے میں جلدی کرتے ہیں۔ وہ آج اُن کی مدد کرتے ہیں تو کل اُن سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اس صورتِ حال کا اللہ تعالیٰ نے سورۃ المائدۃ کی آیت ۵۲ میں یوں اعلان کیا ہے :

فَتَرَى الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَض'' يُّسَارِعُوْنَ فِيْهِمْ يَقُوْلُوْنَ نَخْشٰى أَنْ تُصِيْبَنَا دَآئِرَة'' فَعَسَى اللّٰهُ أَنْ يَّأْتِيَ بِالْفَتْحِ أَوْ أَمْرٍ مِّنْ عِنْدِهٖ فَيُصْبِحُوْا عَلٰى مَآ أَسَرُّوْا فِيْ أَنْفُسِهِمْ نٰدِمِيْنَ O

''(اے مخاطب!) تو ایسے لوگوں کو جن کے دلوں میں روگ ہے اُن کی طرف دوڑتے ہوئے دیکھتا ہے' وہ کہتے ہیں کہ ہمیں تو یہ اندیشہ ہے کہ ہم پر کہیں کوئی وقت نہ پڑ جائے لیکن کیا عجب کہ اللہ (کامل) فتح ہی دے دے یا (اور کوئی) خاص بات اپنی طرف سے (کردے) تو اُس وقت وہ اپنے پوشیدہ دلی خیالات پر شرمندہ ہو کر رہ جائیں۔'' (۵۲ : ۵)

اور سورۃُ النِّساء میں فرمایا :

بَشِّرِ الْمُنٰفِقِيْنَ بِاَنَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمَا۟ۙO اَلَّذِيْنَ يَتَّخِذُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اَيَبْتَغُوْنَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًاO (النساء : ۱۳۸، ۱۳۹)

''آپ منافقین کو سنا دیجئے کہ اُن کے لئے دردناک عذاب ہے (یعنی وہ لوگ) جو مؤمنوں کو چھوڑ کر کافروں کو دوست بنائے ہوئے ہیں۔ کیا وہ اُن کے پاس عزت کی تلاش کر رہے ہیں تو عزت تو ساری اللہ ہی کی ہے۔'' (۴ : ۱۳۸، ۱۳۹)

''فقہاء نے آیت سے یہ نکالا ہے کہ کافروں سے بلاضرورت میل جول، بلاضرورت اُن کی وضع قطع بنانا، اُن کا فیشن اختیار کرنا، اُن کے لباس و تمدن و معاشرت کو فخر و عزت کی چیز سمجھنا یہ سب داخلِ نفاق ہے۔'' (ماجدی)

''غیر مسلمین سے استمداد (مدد مانگنا): اگر مسلمان نجی یا سرکاری سطح پر غیر مسلمین سے اُن تکنیکی معاملات میں جن کا دین سے کوئی تعلق نہیں، مدد مانگیں تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ مثلاً طب، صنعت یا زراعت وغیرہ کے میدان میں۔ لیکن یہ انتہائی ضروری اور پسندیدہ بات ہے کہ مسلمان ایسے میدانوں میں خود کفیل ہو جائیں تاکہ اَغیار سے مدد لینے کی ضرورت پیش نہ آئے۔''

''سرورِ ہر عالم ﷺ نے ہجرتِ مدینہ کے موقع پر ایک مشرک عبداللہ بن اُریقط کو اپنا راہ نما مقرر کیا۔ اس سے علماء نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ آدمی کے کافر اور خالی از ایمان ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ وہ بنیادی طور پر غیر معتمد ہے کیونکہ ایک راہ نما پر انحصار کرنے سے زیادہ خطرناک اور کیا بات ہو سکتی ہے بالخصوص مکہ سے مدینہ کو راہِ فرار اختیار کرنا؟''

''علماء یہ بھی کہتے ہیں کہ مسلمانوں کے قائد کو غیر مسلمین اور بالخصوص اہلِ کتاب سے فوجی معاملات میں مدد لینے اور اُنہیں مسلمانوں کے ساتھ ساتھ مالِ غنیمت میں مساوی حصّہ دینے کی اجازت ہے۔ الزہری کہتے ہیں کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایک جنگ میں کچھ یہود سے مدد مانگی اور اُنہیں مالِ غنیمت میں حصّہ دیا اور یہ کہ صفوان بن اُمیّہ نے مشرک ہونے کی حالت میں نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی جانب سے جنگ لڑی۔ غیر مسلم سے مدد لینے کی شرط یہ ہے کہ مسلمانوں کا اُس پر اعتماد ہو ورنہ اُس سے مدد نہ لی جائے۔ چونکہ افواہیں پھیلانے والوں اور پریشانیاں پیدا کرنے والوں جیسے غیر معتمد مسلمانوں سے مدد لینے کی ممانعت ہے تو یہ بات کفار کے بارے میں اور بھی زیادہ صادق آتی ہے۔''

''مسلمان کو غیر مسلم سے تحفے تحائف لینے دینے کی اجازت ہے۔ جیسا کہ اوپر بیان ہوا نبی علیہ السلام نے غیر مسلم بادشاہوں کی طرف سے بھیجے گئے تحفے قبول فرمائے۔ اُمّ المؤمنین اُمِّ سلمٰی رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی علیہ السلام نے اُنہیں بتایا کہ میں نے نجاشی شاہ حبشہ کو پہننے کا ایک لبادہ اور کچھ دودھ تحفۃً بھیجا ہے۔'' (''الحلال والحرام فی الاسلام'' یوسف القرضاوی، انگریزی ترجمہ صفحات ۳۳۹ تا ۳۴۳)

<u>مُہرِ نبوّت کی حکیمانہ تعبیر</u> : ''نفس کی آلائشوں نے دنیا کو محبت میں گرفتار کر کے انسان کو اُس کا اصل وطن بُھلا دیا ہے اور وہ اس عارضی قیام ہی کو سب کچھ سمجھ کر دائمی زندگی کی فکر کو فراموش کر بیٹھا ہے۔ معاشرہ مادیت کی دَلدل میں دفن ہوتا جا رہا ہے۔ باطن کو پاکیزہ کرنے کی خواہش اور تڑپ معدوم ہوتی جا رہی ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ عشقِ مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی دبی ہوئی چنگاری کو شعلۂ جوّالہ بنا کر ایمان کو گرمایا جائے تاکہ دنیا کی محبت کی دبیز تہہ پگھل کر قلب و باطن کو صاف، مزکّی اور مصفّٰی کر دے۔''

''آقا علیہ الصلوٰۃ والسلام اپنے خطوط پر مُہرِ نبوّت ثبت فرماتے تھے اور عربی زبان کا قاعدہ ہے کہ یہ دائیں سے بائیں عمودی ترتیب سے لکھی جاتی ہے مگر مُہرِ نبوّت میں مُـحَـمَّـد'' رَسُولُ اللّٰہ اُفقی ترتیب سے اس طرح لکھا ہے کہ مُحَمَّد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے بعد رَسُول اور پھر اَللّٰہ آتا ہے (جیسا کہ گزشتہ صفحہ ۲۴۰۸ پر دکھایا گیا ہے)۔ تاجدارِ انبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اِس ترتیب کے ذریعے انسانیت کو یہ پیغام دیا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے قرب کی طرف بڑھنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے میری ذاتِ اقدس کے ساتھ تعلقِ عشقی قائم کیا جائے، پھر رسالت کا فہم و اِدراک اور فیض نصیب ہوگا اور اُس کے بعد اللہ کا قرب ملے گا۔ کیونکہ ذاتِ محمدی اور فیضِ نبوّت کے بغیر اللہ جلّ مجدہٗ تک پہنچنا ناممکن ہے۔ اولیائے کرام نے اِسی ترتیب کو اور وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ میں لفظ لَكَ کی معنویت کو ملحوظ رکھ کر محنت کی اور لاکھوں کروڑوں انسانوں کی زندگیاں بدل کر رکھ دیں۔'' (ماہنامہ ''منہاج القرآن'' لاہور، نومبر ۲۰۰۷ء، ص ۳۶)

(۹۳) <u>عبادات کی ناگزیریت (Inevitability of "Ibadah")</u>

(پروفیسر محمد رفیق)

''یہ دَور تحریکوں اور جماعتوں کا دَور ہے۔ مغربی استعمار کی گرفت ڈھیلی ہوتے ہی اسلامی ملکوں میں آزادی اور اِحیائے اسلام کی تڑپ انگڑائیاں لینے لگی۔ جماعتیں اور تحریکیں بپا ہوئیں اور اسلام پسند لوگ اُن سے وابستہ ہونے لگے۔ پھر جنونی کیفیات بھی دیکھنے کو ملیں لیکن بوجوہ اسلامی نشاۃ ثانیہ کا کام اپنے کمال تک نہ پہنچ سکا۔ جو تھوڑی بہت پیش رفت ہوئی ہے، ساتھ ہی ساتھ غیر مرئی قوتیں اُس کے اثرات کو مٹا دیتی ہیں۔ جادۂ حق کے مسافر کسی بھی موڑ پر جب پیچھے مڑ کر دیکھتے ہیں تو ایسا لگتا ہے کہ سفر کٹا نہیں بلکہ منزل دن بدن دُور ہوتی چلی جا رہی ہے۔''

''پچھلی ایک صدی میں کام اپنے حجم اور مقدار (Quantity) کے اعتبار سے تو بہت پھیلا ہوا نظر آتا ہے لیکن معیار اور کیفیت (Quality) کے اعتبار سے اتنا وقیع نہیں۔ جو کچھ ہو چکا ہے اور جو کچھ ہو رہا ہے غنیمت ہے لیکن ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ تحریکی قیادتوں اور کارکنوں میں خوبیوں کے ساتھ ساتھ بہت سی خامیاں پائی جاتی ہیں جس کے باعث منزلِ مقصود تک رسائی نہیں ہو رہی۔ ان کمزوریوں میں سے سردست صرف ایک گوشے کی جانب توجہ مبذول کرانا مقصود ہے اور وہ نماز ہے جسے اس طرح ادا نہیں کیا جاتا جیسا کہ ادا کرنے کا حق ہے بلکہ بہت سے لوگ تو

اس وعید کا مصداق اور مستحق بن چکے ہیں جو سورۃ الماعون میں ہے :

فَوَیْل" لِّلْمُصَلِّیْنَ O الَّذِیْنَ هُمْ عَنْ صَلاَتِهِمْ سَاهُوْنَ O الَّذِیْنَ هُمْ یُرَآءُ وْنَ وَیَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ O (الماعون : ۴-۷)

''اُن نمازیوں کے لئے بڑی خرابی ہے جو اپنی نماز سے بے خبر ہیں جو دکھاوا کرتے ہیں اور برتنے کی معمولی چیز بھی نہیں دیتے۔'' (۱۰۷ : ۴-۷)

''یہاں یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ نماز نہ پڑھنے کا انکار نہیں کیا جارہا بلکہ اِس بات کی طرف متوجہ کیا جارہا ہے کہ وہ لوگ ہیں تو نمازی لیکن بربادی اُن کا مقدّر بن چکی ہے کیونکہ وہ نماز کے لوازمات سے بے خبر ہیں۔ اسلام کی ترویج و اشاعت اور مصطفوی انقلاب کے نعرے لگانے والوں کے لئے غور کا مقام ہے کہ اللہ کی نگاہ میں جو لوگ برباد ہیں' وہ بھلا ہمہ جہتی تبدیلی کیسے لاسکتے ہیں! انقلاب تو دوسروں کو آباد کرنے کے لئے لایا جاتا ہے اور جو خود برباد ہے' وہ کسی کو بھلا کیا آباد کرے گا!!

''بگاڑ کا سبب : جب کسی خطہ زمین پر اسلامی نظام قائم ہو جاتا ہے تو آسمان سے برکتیں نازل ہوتی ہیں اور زمین اپنے خزانے اُگل دیتی ہے۔ خوشحالی' امن اور سلامتی کا دَوردَورہ ہوتا ہے۔ حکمران عوام پر مہربان ہوتے ہیں اور عوام حکمرانوں کے خیر خواہ۔ اس کے بعد جب زوال آتا ہے تو بگاڑ کا آغاز نمازوں کو ضائع کرنے سے ہوتا ہے۔ اسلام کی شاندار عمارت کی کمزوری کا سبب بننے والی پہلی اینٹ نمازوں سے لاپرواہی کی صورت میں اپنی جگہ سے کھسکتی ہے۔ پھر ایک ایک کر کے دیگر کمزوریوں کا ظہور ہوتا ہے اور دینی عمارت دھڑام سے نیچے آگرتی ہے جس کی طرف درج ذیل آیتِ قرآنی میں اشارہ کیا گیا:

فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْف" اَضَاعُوا الصَّلاَةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهٰوٰتِ فَسَوْفَ یَلْقَوْنَ غَیًّا (مریم:۵۹)

''پھر اُن کے بعد ایسے ناخلف آئے جنہوں نے نماز کو ضائع کیا اور خواہشات کی پیروی میں لگ گئے' وہ (آخرت میں) جلد ہی خرابی و بربادی کو دیکھیں گے۔'' (۱۹ : ۵۹)

''نماز کا ضیاع کئی طرح سے ہو سکتا ہے۔ وجہ کوئی بھی ہو' نمازوں کا یہ ضیاع اسلامی اقدار کی بنیادوں کو کمزور کر دیتا ہے۔ بالآخر ایک دن اقتدار سے ہاتھ دھونے پڑتے ہیں اور مسلمان مغلوب ہو کر ذلیل و خوار ہو جاتے ہیں کیونکہ اقتدار میں آجانے کے بعد پہلا کام نظامِ صلوٰۃ کو قائم کرنا ہوتا ہے۔ جیسا کہ فرمانِ خداوندی ہے:

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْض اَقَامُوا الصَّلٰوةَ (الحج : ۴۱)

''اُنہیں اگر ہم اقتدار دے دیں تو وہ نظامِ صلوٰۃ کو قائم کرتے ہیں۔'' (۲۲ : ۴۱)

''سوچنا چاہئے کہ انقلاب کے بعد انقلابیوں کا پہلا فریضہ نظامِ صلوٰۃ قائم کرنا ہے۔ جو خود ہی دَورِ ماقبلِ انقلاب میں نمازوں کے بارے میں سست ہیں' اُن سے کیا توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ انقلاب کے بعد اسلامی نظام کے لئے کارآمد ثابت ہوں گے!

''اصلاح کیسے ممکن ہے؟ ''قیامِ نماز'' کی اصطلاح اپنے اندر مفاہیم ومطالب کا ایک پورا جہان اور باقاعدہ نظام رکھتی ہے جس سے صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا۔ بعض لوگ نماز پڑھتے ہیں لیکن انہیں نمازی نہیں کہا جا سکتا کیونکہ وہ نماز کے حقوق کی رعایت نہیں کرتے۔ اسی لئے رسولِ معظم ﷺ نے فرمایا کہ کچھ لوگ ایسے ہیں جن کی نمازیں اُن کے منہ پر ماردی جاتی ہیں۔ ویسے بھی کامیابی کی ضمانت وہی نماز فراہم کرتی ہے جو خشوع وخضوع کے ساتھ پڑھی گئی ہو۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ O الَّذِیْنَ هُمْ فِیْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ O (اَلْمُؤْمِنُوْن: ۱، ۲)

''تحقیق (آخرت میں) وہی مؤمن کامیاب ہوں گے جو اپنی نماز میں خشوع وخضوع اختیار کرتے ہیں۔''

''جب نماز اپنے ظاہری اور باطنی آداب کے ساتھ ادا نہ کی جائے بلکہ صرف فریضہ ٹالنے کی حد تک کام کیا جائے تو نماز پڑھنے والا اصل میں نمازی نہ بنا۔ اقبال نے سچ کہا۔

من اپنا پرانا پاپی ہے برسوں میں نمازی بن نہ سکا

روزِ قیامت سب سے پہلے نماز کے بارے میں ہی سوال کیا جائے گا۔ جو ابتدائی ٹیسٹ میں ناکام ہو جائے' اُس کا آگے ٹیسٹ انٹرویو نہیں لیا جاتا۔ دوزخیوں سے جب جہنم میں پھینکے جانے کا سبب پوچھا جائے گا تو اُن کا جواب یہ ہوگا:

قَالُوْا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّیْنَ O (اَلْمُدَّثِّر : ۴۳)

''وہ کہیں گے ہم نمازیوں میں سے نہیں تھے۔'' (۴۳ : ۷۴) ☆

''مسجد سے شغف: تاجدارِ رُسل ﷺ نے مدینہ میں مسلسل دس سال تک جس مسجد میں نماز پڑھائی' اُس کی دیواریں کچی تھیں اور چھت کھجور کے پتوں کی بنی ہوئی تھی۔ بارش ہوتی تو کچے فرش پر کیچڑ ہو جاتی لیکن نمازی پکے تھے اور گھر یا دفتر میں نماز نہیں پڑھا کرتے تھے بلکہ پانچ وقت اُسی مسجدِ نبوی میں آ کر حاضری دیتے۔ آج کل مسجدیں پکی' خوبصورت اور جدید سہولتوں سے آراستہ ہوتی ہیں۔ پنکھوں' قالینوں' ٹھنڈے اور گرم پانی کا انتظام ہوتا ہے حتیٰ کی ایئر کنڈیشنر اور ہیٹنگ سسٹم بھی نصب ہوتے ہیں لیکن عام مسلمان تو کجا' داعیانِ دین کی ''دینی مصروفیات'' مسجد میں نماز باجماعت کی ادائیگی میں مانع ہو جاتی ہیں۔ یہ ستم ظریفی آخر کب تک چلے گی؟ رسول اللہ ﷺ کا مسجد سے شغف کا یہ عالم تھا کہ آپ ﷺ نے ازواجِ مطہرات کے حجرے بھی مسجد سے متصل بنوائے۔ جب سفر سے واپسی ہوتی تو پہلے مسجد میں دو رکعت نماز ادا کرتے اور پھر گھر تشریف لے جاتے۔ ایک نماز پڑھ کر دوسری نماز کے انتظار کے لئے مسجد میں بیٹھے رہنے کی ترغیب دلاتے۔ اس کے برعکس اِلاّ ماشاء اللہ دعوتِ دین کا کام کرنے والوں کا حال بھی ہمارے سامنے ہے۔ اُن کا مسجد کے ساتھ کتنا تعلق ہے اور پانچ وقت مسجد میں حاضر ہونے کا وہ کتنا اہتمام کرتے ہیں۔''

''چند احادیث برائے ترغیب : (۱) بعض مسلمان مسجدوں میں جمے رہتے ہیں اور وہاں سے وہ ہٹتے

☆ سورۃ الرّوم کی آیت ۳۱ میں نماز ادا نہ کرنے کو ''شرک'' کہا گیا ہے۔ اَقِیْمُوا الصَّلَاةَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ O

نہیں۔فرشتے اُن کے ساتھی بن جاتے ہیں۔وہ نہ آئیں تو فرشتے اُنہیں تلاش کرتے ہیں۔ بیماری میں اُن کی عیادت اور کام کاج میں اُن سے تعاون کرتے ہیں۔ مسجد میں بیٹھنے والا اللہ کی رحمت کا امیدوار ہوتا ہے۔

(۲) صبح وشام مسجد کی طرف جانے کا اہتمام کرنے والوں کے لئے اللہ تعالیٰ مہمان نوازی کا سامان تیار کرتا ہے۔(صحیح بخاری وصحیح مسلم)

(۳) صبح سویرے مسجد کی طرف جانے والوں کے ساتھ روزِ قیامت [illegible]

(۴) جو شخص صرف نماز کے ارادے سے مسجد کو جاتا ہے' اللہ تعالیٰ اُس کی آمد پر اس طرح خوش ہوتا ہے جس طرح گھر والے کسی عزیز کی سفر سے واپسی پر خوش ہوتے ہیں۔"(ابن خزیمہ)

"نماز باجماعت میٹنگ سے بہتر ہے: بعض احباب مختلف نوعیت کی میٹنگ منعقد کرتے ہیں یا اُن میں شریک ہوتے ہیں۔ دوران میٹنگ اذان ہوتی ہے' اللہ کی طرف سے مسجد کی طرف لپکنے کی صدا لگائی جاتی ہے لیکن کسی کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی اور میٹنگ جاری رہتی ہے۔ باجماعت نماز کا ثواب مسجد میں حاضری کا اجر اور اللہ کی خوشنودی کا وقت ہاتھ سے نکل جاتا ہے۔ میٹنگ کے اختتام پر کسی کا وضو نہیں ہوتا' کسی کو بھوک لگی ہے' کوئی گھر کی طرف لپکتا ہے' کوئی وضو کے لئے چلا جاتا ہے' کبھی جماعت ہوتی ہے کبھی نہیں ہوتی۔ جماعت ہو بھی جائے تب بھی سارے شرکائے میٹنگ شامل نہیں ہوسکتے۔غور کرنے کا مقام ہے کہ پہلے نماز پڑھنا ضروری ہے یا میٹنگ جاری رکھنا؟ کیا ہماری نظر میں اذان کی پکار کی کوئی اہمیت ہی نہیں رہی؟ مؤذن کہتا ہے نماز کی طرف لپکو۔ ہم کہتے ہیں ہم دعوتی' تنظیمی اور تربیتی میٹنگ میں مصروف ہیں۔ مؤذن کہتا ہے کامیابی کی طرف آؤ۔ ہم کہتے ہیں کامیابی کے امکانات پر ہی تو ہم غور کررہے ہیں۔۔۔ یہ رویہ اللہ تعالیٰ کے احکامات سے کھلا مذاق ہے۔ہم اللہ کے غضب سے پناہ مانگتے ہیں۔

"نبی اکرم ﷺ کا طرزِ عمل: ملاحظہ فرمائیں مختلف نازک حالتوں میں بھی نماز باجماعت کے بارے میں حضور نبی اکرم ﷺ کا کیا معمول رہا اور پھر ذرا موازنہ کرلیا جائے کہ ہم نماز کے ساتھ کیا سلوک روا رکھتے ہیں:

(۱) سرورِ ہر جہاں ﷺ گھر میں تشریف فرما ہیں۔ اہلِ خانہ کے ساتھ خوش طبعی کی باتیں ہو رہی ہیں۔ یکا یک اذان کی آواز بلند ہوتی ہے۔ اَللّٰہُ اَکْبَر اَللّٰہُ اَکْبَر اور سرورِ عالم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا چہرہ انور متغیر ہونے لگتا ہے۔آپ ﷺ کھڑے ہوجاتے ہیں اور مسجد کی طرف چل دیتے ہیں۔ سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب اذان ہوتی تو ایسے لگتا کہ حضور ﷺ ہمارے لئے اجنبی بن گئے ہیں۔ گویا اُنہیں کسی فرد سے کوئی مطلب ہی نہیں۔ ساری توجہ نماز کی تیاری کی طرف ہوجاتی اور سارے کام چھوڑ کر آپ مسجد کی جانب چل دیتے۔

اصل میں نمازوں کے اوقات کا تعین اور درمیان میں وقت کا مناسب وقفہ محاسبہ نفس کے لئے بہت کارآمد

ہے۔کام کاج کو چھوڑ کر بار بار نماز کی طرف آنے سے تربیت مقصود ہے۔ مسجد میں حاضر نہ ہونے سے اور اپنی مرضی سے سہولت کے مطابق نماز پڑھنے سے نفس میں کئی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔

(۲) جنگ اپنے شباب پر ہے۔ ہر طرف تیروں کی برسات اور تلواروں کی چمک ہے۔ کشتوں کے پشتے لگ رہے ہیں لیکن اللہ کے رسول ﷺ ان نازک ترین لمحات میں بھی نماز کے لئے صفیں درست کرنے کا حکم فرماتے ہیں۔ سورۃ النساء کی آیت ۱۰۲ میں وارد حکمِ الٰہی کے مطابق ایک دستہ آپ کے ساتھ آدھی نماز پڑھ کر چلا جاتا ہے اور دوسرا آ کر اس میں شامل ہو کر نماز باجماعت ہی پڑھتا ہے۔

''اب اس کے بعد کسی کے نماز باجماعت چھوڑنے کا کونسا عذر باقی رہ جاتا ہے! ویسے بھی فقہاء نے نماز باجماعت چھوڑ دینے کے جو عذر بیان کئے ہیں' تلاشِ بسیار کے باوجود اُس فہرست میں میٹنگ اور اِس قبیل کی دوسری دینی و مذہبی مصروفیات کا ذکر کسی کتاب میں نہیں ملا۔''

(۳) حضور نبی کریم ﷺ شدید علیل ہیں۔ نقاہت کے باوجود مسجد تک نہیں جا سکتے۔ فرمایا: ابوبکر سے کہو کہ نماز پڑھائے۔ ایک دن تھوڑا سا افاقہ ہوا۔ اذان سن کر آپ بے چین ہو گئے۔ حضرت عباس اور حضرت علی رضی اللہ عنہما سے فرمایا: مجھے مسجد میں لے چلو۔ اُن کے کندھوں پر سہارا لئے آپ ﷺ چلنے لگے۔ ٹانگوں میں سکت نہیں تھی اور آپ کے پاؤں زمین پر گھسٹ رہے تھے اور اسی حالت میں مسجد میں پہنچے۔

(۴) ایک بار نبی اکرم ﷺ نماز پڑھانے کے لئے مصلّٰی پر کھڑے ہوئے۔ نمازیوں کی طرف ایک نگاہ دوڑائی اور فرمایا: میرا جی چاہتا ہے کہ میں ابھی جاؤں اور جا کر اُن مسلمانوں کے گھروں کو آگ لگا دوں جو مسجد میں نماز ادا کرنے کے لئے نہیں آئے۔

اب اس سے بڑھ کر ناراضگی کا کوئی اور کیا انداز ہو سکتا ہے۔ اس کے بعد بھی اگر کسی کی سمجھ میں بات نہ آئے تو سوائے اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن پڑھنے کے اور کیا کیا جا سکتا ہے!!

''ستون کے بغیر چھت'': اُن لوگوں کی عقل پر ماتم کرنے کو جی چاہتا ہے جو بغیر کسی سہارے اور ستون کے عمارت پر چھت ڈالنا چاہتے ہیں۔ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے نماز کو دین کا ستون قرار دیا اور فرمایا:

اَلصَّلٰوۃُ عِمَادُ الدِّیْن (نماز دین کا ستون ہے)

ستون کے بغیر چھت کا تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا اور ستون کمزور ہوں تو بھی چھت زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتی۔ اگر پورے دین کو عمارت سے تشبیہ دی جائے تو اسلامی انقلاب کے ذریعے مصطفوی نظام کا قیام اسلام کی چھت ہے اور نماز ستون ہے۔ عمارت کے دیگر حصوں میں ناقص میٹیریل لگا کر عمارت کی مضبوطی کا سوچنے والے خوابوں اور

سَرابوں کی دنیا میں رہتے ہیں۔ ایمان سے بنیادیں مضبوط کی جائیں' ذکرواذکار کا اُنہیں پانی دیا جائے' دیگر عبادات کا مواد جمع کر کے اخوت ومحبت کے سیمنٹ سے چنائی کی جائے' نمازوں کے ستون فراہم کئے جائیں اوراس کے اوپر انقلاب کے ذریعے مصطفوی نظام کی چھت ڈالی جائے تو دین کی ایک مضبوط اور پائیدار عمارت تعمیر ہوگی لیکن ہم خیالی پلاؤ پکانے اور ہوائی قلعے تعمیر کرنے کے عادی ہو چکے ہیں۔''

''ہمارے شیخ فرمایا کرتے تھے کہ اگر اللہ کی نگاہ میں کسی شخص کی قدر و قیمت اور مرتبہ و مقام دیکھنا ہو تو اتنا دیکھ لینا کافی ہے کہ وہ نماز کے لئے کس اعلیٰ درجے کا اہتمام کرتا ہے اور ایسا کیوں نہ ہو کیونکہ حدیثِ مبارکہ ہے:

اَلصَّلاَۃُ مِعْرَاجُ الْمُؤْمِنِیْنَ

''نماز مؤمنوں کی معراج ہے۔''

''گویا حالتِ نماز میں ایک شخص اللہ کے انتہائی قرب اور حضور میں ہوتا ہے۔ صحابہ کرام کی نماز میں محویت کا یہ عالم ہوتا کہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتے۔ نابینا صحابی اندھیروں میں چل کر پانچ وقت نماز باجماعت نماز ادا کرنے مسجد میں آتے۔ خود نبی اکرم ﷺ پر حملے کا ہر وقت خدشہ رہتا' پہرے دیئے جاتے' احتیاطی تدابیر اپنی جگہ لیکن نماز مسجد میں آ کر پڑھتے بلکہ امامت بھی خود فرماتے۔''

''زیادہ دُور جانے کی ضرورت نہیں۔ ہندوستان میں حضرت خواجہ بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ نے وصال سے قبل وصیت فرمائی کہ میری نماز جنازہ پڑھانے والا چند خوبیوں کا حامل ہونا چاہئے۔ اُن میں سے دو کا تعلق نماز سے ہے کہ اُس نے کبھی تکبیرِ اُولیٰ ضائع نہ کی ہو اور زندگی بھر سنتِ غیر مؤکدہ بھی ترک نہ کی ہو۔ آپ کا جنازہ رکھا ہوا ہے اور مطلوبہ خوبیوں کا حامل شخص نہیں مل رہا۔ آخر ایک نقاب پوش آگے بڑھ کر نمازِ جنازہ پڑھاتا ہے اور اس بات پر لرزاں اور ترساں ہے کہ اُس کی پرہیزگاری کا راز فاش ہو گیا ہے۔ جنازہ سے فارغ ہوئے تو لوگ زیارت کے لئے آگے بڑھے کہ یہ کون ہستی ہے جو ہم سے آج تک پوشیدہ رہی؟ جب نقاب ہٹایا گیا تو وہ ہندوستان کا بادشاہ سلطان شمس الدین التمش تھا۔''

''وہ مصروف ترین حکمران ہو کر بھی نماز کے لوازمات کے بارے میں اتنے محتاط تھے' ہم فرائض کی پروا نہیں کرتے۔ دَورِ انحطاط میں نمازوں کی امامت کو کمتر درجے کا کام سمجھا جانے لگا۔ بڑے بڑے علماء اور مشائخ اول تو نماز باجماعت پڑھتے ہی نہیں۔ کبھی کبھار آ جائیں تو اِکادُکا نمازیں پڑھا دیتے ہیں ورنہ اس مقصد کے لئے تنخواہ دار ملازم امام رکھے ہوئے ہیں۔ بڑے علماء کے لئے اذان دینا تو مزید کسرِ شان کا باعث ہے۔ یہ قیامت کی نشانیاں ہیں۔''

''**مقاصد کا ارتقاء اور عظمت**: زندگی کے عظیم مقاصد انسان کو عظمت کی بلندیوں پر فائز کر دیتے ہیں۔ مقصد جتنا عظیم ہوگا اُس کے لئے محنت بھی اُتنی زیادہ درکار ہوگی۔ انسان جس قدر زیادہ محنت کرے گا' اُتنا ہی عظیم ہوتا چلا جائے گا۔ انسانی بچہ جنم لینے کے ساتھ ہی حرکت کرنے لگتا ہے۔ اُس کے اعضاء کی حرکات وسکنات بلا مقصد

نہیں ہوتیں۔ بچے کو معلوم ہو یا نہ ہو' بہر حال حرکات کے پیچھے کچھ مقاصد کارفرما ہوتے ہیں۔ یہی مقاصد انسان کی بے قراری اور بے چینی کا سبب بنتے ہیں۔ حصولِ مقصد کی تڑپ اُسے متحرک رکھتی ہے۔ یہ جبلّی بے قراری' آرزوؤں' امنگوں اور خواہشوں کا رُوپ دھار لیتی ہے۔

''انسان اشرف المخلوقات ہونے کے ناطے سے زندگی کے عظیم مقاصد کا حامل ہے' اس لئے لامحالہ اُس کی جِدّ وجُہد کا سفر طویل بھی ہے اور کٹھن بھی۔ انسان محض سیاسی یا معاشی حیوان نہیں جیسا کہ بعض مغربی دانشوروں کا خیال ہے بلکہ اُس کے پیشِ نظر زندگی کے کچھ اعلیٰ مقاصد بھی ہوتے ہیں جن کی خاطر وہ نہ صرف اپنی حیوانی ضرورتوں کی قربانی دیتا ہے بلکہ اپنی جان تک کا نذرانہ پیش کرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔''

''**جنبش اور عبادات** : جس طرح مشین کو حرکت میں لانے کے لئے گیس' پٹرول اور بجلی کی قوّت درکار ہوتی ہے اور حیوانی جسم کو متحرک رکھنے کے لئے خوراک کی طاقت چاہئے' اسی طرح اَخلاقی و مذہبی زندگی کا تحرک نظامِ عبادات کا متقاضی ہوتا ہے۔ جس طرح حرکت اور قوّت کے بغیر مشین رک جاتی ہے اور خوراک کی عدم دستیابی انسانی موت کا سبب بنتی ہے' بعینہٖ روحانی غذا کی عدم فراہمی سے روح کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ پھر انسان ایک چلتی پھرتی لاش بن جاتا ہے۔ وہ زندہ تو ہوتا ہے لیکن مُردوں سے بدتر۔ اس کے برعکس کسی اعلیٰ مقصد کے لئے دی ہوئی جان کی قربانی زندگی سے کہیں زیادہ قدر و قیمت کی حامل بن جاتی ہے۔''

''مراسمِ عبودیت (نماز' روزہ' زکوٰۃ' حج وغیرہ) کے پیچھے احساسِ تقویٰ روح کا کام کرتا ہے۔ محنت ومشقت اور جِدّ وجُہد کی رنگا رنگی اور عملی دوڑ دھوپ اسی روح کے دم قدم سے ہے۔ روح نکل جائے تو جسمانی حرکت بند ہو جاتی ہے۔ اب یہ سمجھنے میں کوئی دقت باقی نہیں رہتی کہ اعمال میں سستی اور لاپروائی کیوں پائی جاتی ہے۔ اصل میں احساسِ ایمان وتقویٰ کی قوّتِ متحرکہ (Driving Force) کمزور ہوتی ہے لہٰذا عمل کی حرکت کی رفتار سست ہو جاتی ہے۔ احساس زندہ ہو تو ایک نظامِ صلوٰۃ بھی انسان کو متحرک رکھنے کے لئے کافی ہے۔ دن میں پانچ بار مؤذن کے ذریعے بلایا جاتا ہے۔ انسان بار بار اپنی مصروفیات کو قطع کر کے اللہ کے دربار میں حاضر ہو جاتا ہے۔ اسی لئے فرمایا گیا:

وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخَاشِعِيْنَ O (البقرة : ۴۵)

''اور یہ (نماز) بہت مشکل (بھاری) ہے مگر اللہ سے ڈرنے والوں کے لئے نہیں۔'' (۲ : ۴۵)

''احساسِ بندگی روح کے لئے آکسیجن کا کام کرتا ہے۔ آکسیجن نہ ہو تو خوراک بھی جزوِ بدن بن کر رگوں میں خون نہیں دوڑا سکتی۔ بعض مشینیں آٹومیٹک ہوتی ہیں لیکن ذرا غور کیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ان کے خود حرکت پذیر رہنے کا بھی ایک نظام ہوتا ہے جس کا چالو حالت (Working Order) میں رہنا ضروری ہے۔ وہ نظام درہم برہم ہو جائے تو مشین آٹومیٹک ہونے کے باوجود رک جائے گی اور مکینک کے پاس جانا پڑے گا مثلاً آٹومیٹک گھڑی کی حرکت کا تعلق بازو کی حرکت کے ساتھ ہوتا ہے۔ آپ گھڑی کلائی سے اتار کر ایک طرف رکھ دیں تو وہ کچھ عرصہ

کے بعد رک جائے گی۔ اس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ متحرک سے متحرک کارکن بھی کچھ عرصہ مرکز سے رابطہ نہ رکھے تو اُس کا تحرک جمود میں بدل جائے گا۔ اور اگر کوئی اپنے آپ کو اس اصول سے مستثنیٰ سمجھے تو نادانی کی بات ہوگی۔ رابطہ جس قدر مضبوط اور تیز تر ہوگا' اُسی قدر حرکت پذیری میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔ شاہین فضا میں بلاوجہ نہ قلابازیاں لگاتا ہے اور نہ بے سود محوِ پرواز رہتا ہے بلکہ یہ ساری مشقت حرکت پذیری کی قوت کو بحال رکھنے کے لئے ہوتی ہے۔ ضروریاتِ زندگی کی فراہمی کا تقاضا ایک زبردست محرک ہے جو آدمی کو معاشی تگ و دَو کے لئے متحرک رکھتا ہے۔ بس سمجھ لیجئے کہ نظامِ عبادات اور ذکر و اذکار کا سارا سلسلہ روحانی قوت کے لئے ضروریات کا درجہ رکھتا ہے۔ جب نیکیوں سے محبت اور برائیوں سے نفرت پیدا ہو جائے تو دینی اور روحانی زندگی میں ایک زبردست تحرک پیدا ہوتا ہے۔ آدمی جوں جوں آگے بڑھتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں

''وہ رفتار میں اضافہ کرتا ہے لیکن ہر جہاں کے بعد جہانوں کی ایک دنیا آباد دیکھ کر مزید برق رفتاری کی خواہش پیدا ہوتی ہے حتیٰ کہ نوری سال کی رفتار بھی اُس کی تسکین کا سامان نہیں بن سکتی۔ وہ ھَلْ مِنْ مَّزِیْد کا نعرہ لگاتے ہوئے آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔''

''سیاروں کی تسخیر کے لئے جو تیز رفتار راکٹ بھیجے جاتے ہیں' اُن میں عام تیل استعمال نہیں ہوتا بلکہ انتہائی اعلیٰ اور مہنگا ایندھن استعمال کیا جاتا ہے۔ معلوم ہوا کہ تحرک میں اضافہ کے لئے عملِ تزکیہ کو تیز کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ بلندیوں کو چھونے کا ارادہ رکھنے والے خالص' نفیس اور عمدہ قسم کا پٹرول استعمال کرتے ہیں۔ یہ امر بھی قابلِ توجہ ہے کہ خلانوردوں کا لباس بھی مخصوص ہوتا ہے اور وہ اپنی وضع قطع سے ہی دوسروں سے الگ پہچانے جاتے ہیں۔''

''سردی ہو یا گرمی' کھلاڑیوں کو چاق و چوبند رکھنے کے لئے سخت ترین ریاضتوں کے عمل سے گزارا جاتا ہے۔ فوجی جوانوں سے رات دن جو مشقت کا کام لیا جاتا ہے' پریڈ کروائی جاتی ہے' اِدھر اُدھر دوڑایا اور بھگایا جاتا ہے' بظاہر یہ بے معنی کام لگتے ہیں لیکن اصل میں یہ بھی لہو گرم رکھنے کا ایک بہانہ ہے اور بڑے معرکے کے لئے تیاری کا عمل ہے۔ عبادات کی اُٹھک بیٹھک اور بھاگ دوڑ میں ایک بڑے دن (قیامت) کی تیاری کے مراحل ہیں۔ ان سے روحانی تحرک قائم رہتا ہے۔ انسان کی کہانی خاک کی کہانی نہیں۔ دمِ جستجو جب لہو گرم ہوتا ہے تو خاک کا یہ پُتلا عالم رنگ و بو کی تسخیر پر بھی قانع نہیں رہتا بلکہ اس سے بھی آگے وہ کمندیں ڈالنے کے بارے میں سوچتا ہے۔ بہرحال یہ بات ذہن نشین ہونی چاہئے کہ فکرِ معاش کے ساتھ اگر فکرِ آخرت دامن گیر نہ ہو تو انسان اور حیوان میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔ جسم کے اعضاء و جوارح ہمارے منشا اور مدعا کی تکمیل کے لئے بطور آلات استعمال ہوتے ہیں لیکن آلے کے جائز اور ناجائز استعمال کی تمام تر ذمہ داری انسان پر عائد ہوتی ہے۔ آپ چھری سے پھل کاٹ سکتے ہیں اور ناحق کسی کے گلے پر بھی چلا سکتے ہیں تو کاٹنے کے ایک آلے سے پھل کاٹیں یا کسی کا گلہ' ذمہ دار آپ خود ہوں گے۔ یہی وہ اختیار ہے جس کے باعث ہم جوابدہ ہیں۔ (ماہنامہ ''منہاج القرآن'' لاہور' اکتوبر ۲۰۰۷ء' ص ص ۲۲ تا ۲۸ ملخص)

(۹۴) اسلام

ابن منظور الافریقی لفظ ''اسلام'' کی تعریف کرتے ہوئے جس کا مصدر س۔ل۔م ہے' اپنی شہرہ آفاق لغت ''لسان العرب'' میں یوں لکھتے ہیں:۔

سِلْم : اَلسَّلاَ مُ وَالْعَافِيَةُ۔۔۔ وَقَالَ اَبُوالْهَيْثَمْ : اَلسَّلاَ مُ وَالتَّحِيَّةُ مَعْنَاهَا وَاحِد'' وَ مَعْنَاهَا اَلسَّلاَمَةُ مِنْ جَمِيْعِ الْاٰفَاتِ۔۔۔ وَقَالَ ابْنُ الْاَعْرَابِيُّ : اَلسَّلاَ مُ اَلْعَافِيَةُ۔۔۔ وَالْاِسْلاَمُ وَ الْاِسْتِسْلاَمُ اَلْاِنْقِيَادُ (لسان العرب' ج ۱۲' ص ۲۸۹۔۲۹۰' ۲۹۰ طبع قم ایران)

''سِلْم کا معنی تحفظ اور حفاظت ہے۔ ابوالہیثم کا کہنا ہے کہ اَلسَّلاَ م اور اَلتَّحِيَّة کا ایک ہی معنی ہے یعنی تمام آفات و مصائب سے محفوظ رہنا۔ ابن العربی کے بقول لفظ اَلسَّلاَ مُ کا معنی عافیت اور حفاظت ہے۔ اَلْاِسْلاَم اوراَلْاِسْتِسْلاَم کا معنی اپنے سراپا کورب کی رضا کے آگے جھکا دینا ہے۔

لفظ اَلسَّلاَ م کی تعریف کرتے ہوئے علامہ القرطبی' قتادہ اور حسن رضی اللہ عنہما کے حوالہ سے لکھتے ہیں:۔

اَلسَّلاَ مُ هُوَاللّٰهُ وَدَارُهُ الْجَنَّةُ وَسُمِّيَتِ الْجَنَّةُ دَارُالسَّلاَم لِاَنَّ مَنْ دَخَلَهَا سَلِمَ مِنَ الْاٰفَاتِ

(الجامع لاحکام القرآن المعروف بہ تفسیر قرطبی' ج ۴' ص ۳۲۸' طبع مصر ۱۳۸۰ھ/۱۹۶۰ء)

''اَلسَّلاَ مُ بذاتِ خود اللہ تعالیٰ ہے جس کا مسکن جنت ہے اور جنت کو دارالسلام اس لئے کہا جاتا ہے کہ جو شخص وہاں داخل ہو گیا' وہ آفات سے محفوظ ہو گیا۔''

اس حقیقت کے پیش نظر کہ قرآن کا نازل فرمانے والا خود ''سَلام'' (بمعنی محافظ) ہے' جس ذاتِ اقدس کی طرف اُس نے اپنی آخری کتاب نازل کی وہ رَحْمَة'' لِّلْعٰلَمِيْن ہے (سورۃ الانبیاء: ۱۰۷) اور اُس رات (لیلۃ القدر) میں نازل کی جو تحفظ اور امن کی نقیب اور پیش خیمہ ہے۔ اب یہ بات ایک معقول آدمی کے لئے ناقابلِ فہم ہے کہ ایسی رحیم و کریم ذات کی تعلیمات ظلم و تشدد' خونریزی اور جبر (Oppression) و استیصال (Suppression) پر مبنی ہیں۔ اُس کی نازل شدہ کتاب انتہائی مہربان و مشفق ذات کی طرف سے آئی ہے (حٰمٓ السجدۃ: ۲) جو صراطِ مستقیم کا ہدایت نامہ (Manual) ہے جس کی حیات بخش لہریں جس راہ سے بھی گزرتی ہیں' انسانوں کے لئے فلاح و بہبود کے شگوفے کھلنے لگتے ہیں اور اس کی بلند آہنگ لہروں کے نور سے زندگی کے تمام گوشے منوّر اور روشن ہو جاتے ہیں۔

سورۃ المائدۃ کی آیات ۱۵' ۱۶ کے مطابق رسولوں کو اپنے پیغام کے ساتھ بھیجنے کا الٰہی مقصد نوعِ انسان کو امن و آشتی فراہم کرنا تھا:

قَدْ جَآءَ كُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْر'' وَّكِتَاب'' مُّبِيْن'' O يَهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلاَمِ وَ يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَيَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ O (المائدۃ: ۱۵' ۱۶)

''تمہارے پاس اللہ کی طرف سے ایک روشنی اور واضح کتاب آچکی ہے۔ اُس کے ذریعہ سے اللہ اُنھیں

سلامتی کی راہیں دکھاتا ہے اور اُنہیں اپنی توفیق سے تاریکیوں سے نکال کر نور کی طرف لاتا ہے۔''

یہ آیت اسلام کے اِس دعویٰ کا مکمل جواز فراہم کرتی ہے کہ اللہ اور اُس کی مخلوقات کے مابین تعلق میں بالعموم اور اللہ اور انسانوں کے درمیان تعلق میں بالخصوص امن و آشتی کا عنصر اساس اور بنیاد کی حیثیت کا حامل ہے۔

غیر مسلم قلم کاروں نے لفظِ ''اسلام'' کا یوں تعارف کرایا ہے:

(۱) ''لفظِ ''اسلام'' کا مصدر و ماخذ وہی ہے جو لفظِ اَلسَّلام کا ہے بمعنی خیر و عافیت۔''.. ("Holy War"
Karen Armstrong, p. 25, Macmillan Limited, London, 1988)

(۲) ''اسلام'' جسے محمد (ﷺ) نے اپنے دین کو یہ نام دیا' کا معنیٰ اپنے آپ کو اللہ کی رضا' اُس کی اطاعت اور اُس کے احکامات کے حضور جھکا دینا ہے۔''... ("The Religion of Islam"
Klein, p. 1)

(۳) ''رضائے الٰہی کے حضور قطعی اور حتمی خود حوالگی اُس دین کا مناسب لقب ہے جو حضرت ابراہیم' اسمٰعیل علیہما السلام اور عربوں کی طرف اتارا گیا۔''... ("Jewish Foundation of Islam"
Torrey, p. 104 w.r.t. Tafsir Majidi)

خلاصہ کلام یہ ہے کہ لفظِ ''اسلام'' 'امن و آشتی' تحفظ اور سکون و شانتی کا عکس انداز (Projector) ہے۔ دین کے طور پر اسلام بنی نوعِ انسان کی بہبود و فلاح اور اُنہیں ظلم و استبداد اور استحصال کی زنجیروں سے آزاد کرانے کی خاطر ظاہر ہوا جو انسانی شکنجے میں جکڑے ہوئے کراہ رہے تھے۔ اپنے خالق کا باوفا بندہ ہونے کی حیثیت سے انسان نے اسلام ہی کے ذریعے بالآخر اُس الٰہی مقصد کو حاصل کرنا ہے جو تمام بنی نوعِ انسان کو الٰہی ضابطہ اَخلاق کی طرف بلانا ہے تاکہ امن و آشتی' سکون و شانتی' رواداری' باہمی محبت و ایثار کا دَور دَورہ ہو اور تمام عالم سکھ چین کا گہوارہ بن جائے۔ اس سلسلہ میں قرآن حکیم کا یہ حکم ملاحظہ ہو:۔

یٰٓاَیُّھَاالَّذِیْنَ آمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّةً وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ اِنَّہٗ لَکُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ O (البقرۃ: ۲۰۸)

''مومنو! اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ اور شیطان کے نقشِ قدم پر نہ چلو' بے شک وہ تمہارا کھلم کھلا دشمن ہے۔'' (۲:۲۰۸)

جس کا صاف مطلب یہی ہے کہ تحفظ و حفاظت کی یقینی ضمانت اسلام میں مکمل داخل ہونے کی صورت ہی میں ہو سکتی ہے یعنی وہ قرآنی ضابطہ اَخلاق جو اپنے ماننے والوں پر برائی' فساد اور شر کی روک تھام اور اُنہیں جڑ سے اکھیڑنے اور تمام لوگوں سے مہربانی' انصاف اور قربانی سے پیش آنے کی ذمہ داری ڈالتا ہے خواہ وہ کسی مذہب اور رنگ و نسل سے رکھتے ہوں۔

قرآنی لفظ ''فساد'' (سورۃ المائدۃ: ۶۴) اپنے اندر وسیع معانی کا حامل ہے اور درہمی اور دہشت گردی کی

جن کے تحت انسانی امن وچین اور احساسِ تحفظ وحفاظت تباہ و برباد ہو جاتے ہیں۔ شہرہ آفاق لغت نویس امام راغب اصفہانی ''معجم مفردات القرآن'' میں لفظ 'فساد'' کی یوں وضاحت کرتے ہیں:

''اَفۡسَدَہ' کا معنیٰ کسی چیز کو غیر متوازن بنانا ہے۔ سورۃ الانبیاء کی آیت ۲۲ میں ہے کہ ''اگر زمین و آسمان میں اللہ کے سوا کوئی اور معبود ہوتا تو دونوں (کبھی کے) درہمی برہمی کا شکار ہو گئے ہوتے۔'' اسی طرح سورۃ المؤمنون کی آیت ۷۱ میں فرمایا: ''اگر (دینِ) حق اُن کی خواہشوں کا تابع ہو جاتا تو آسمان و زمین اور جو اُن میں آباد ہیں' (سب) تباہ ہو جاتے۔'' (ان دونوں آیات میں لفظ 'فساد'' استعمال ہوا ہے۔)

مجد الدین فیروز آبادی نے 'فساد'' کا معنیٰ کسی کا مال ناحق طور پر ظلماً ہتھیا لینے کا کیا ہے۔ (''القاموس المحیط'' جلد اوّل' صفحہ ۳۲۳)

قرآنی لفظ 'فِتۡنَۃ'' بھی 'فساد'' کے ہم معنیٰ ہے جیسا کہ اس آیت سے واضح ہے:
وَقَاتِلُوۡهُمۡ حَتّٰى لَا تَكُوۡنَ فِتۡنَةٌ وَّيَكُوۡنَ الدِّيۡنُ لِلّٰهِ (البقرۃ: ۱۹۳)
''اور اُن سے جنگ کرتے رہو یہاں تک کہ فسادِ (عقیدہ) باقی نہ رہ جائے اور دین اللہ ہی کے لئے رہ جائے۔'' (۱۹۳ : ۲)

یعنی مسلمان کا لڑنا ظلم و تعدی کے خلاف ہے اور اُسے حضرتِ انسان کے خلاف کوئی کد اور منافرت نہیں۔

''یہ حقیقت اپنی جگہ مسلّم ہے کہ اسلام کی تلوار نے نوعِ انسان کی اخلاقی اور مادّی ترقی میں خاصا کردار ادا کیا ہے اور مسلمانوں کے لئے یہ مناسب نہیں کہ وہ اپنے آباء و اجداد کی جانب سے معذرت خواہی کریں جنہوں نے تلوار کو خدمتِ انسان کی خاطر اُٹھایا۔'' (اسد کا صحیح بخاری کا انگریزی ترجمہ' جلد اوّل' ص ۷۹ بحوالہ تفسیر ماجدی صفحہ ۳۰۔سی/۲۸۳)

امام راغب اصفہانی کے نزدیک لفظ 'فتنہ'' کا ایک معنیٰ کسی کو اُس کے مذہب سے ہٹا دینا ہے جیسا کہ سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۹۱ میں آیا: وَالۡفِتۡنَةُ اَشَدُّ مِنَ الۡقَتۡلِ یعنی بدمذہبی کی طرف لوٹانا قتلِ انسانی سے شدید تر ہے۔

اگر اسلام شمشیر اُٹھانے اور خونریزی کا اتنا ہی شیدا ہوتا جتنا کہ دشمنِ اسلام نے اُسے بدنام کیا ہے' تو اسلامی حکومت کے تحت اقلیتیں صدیوں تک مکمل امن وسکون و تحفظ کے ساتھ کیوں رہیں؟ مزید برآں اگر اسلامی تعلیمات لڑنے مارنے اور فوجی دہشت گردی پر مبنی ہوتیں تو جھگڑے اور اختلاف کو ختم کرنے میں اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو اپنے دشمنوں کے ساتھ معاہدہ کرنے کی ترغیب نہ دیتا اگر دشمن امن و آشتی اور بامعنیٰ گفت و شنید کی طرف راغب ہو۔ اس سلسلہ میں سورۃ الانفال میں فرمایا:

وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ (الانفال : ۶۱)
''اگر وہ (دشمن) صلح کی طرف جھکیں تو آپ کو اختیار ہے کہ آپ بھی اس طرف جھک جائیں اور اللہ پر بھروسہ رکھیں۔'' (۶۱ : ۸)

اِسی قسم کا حکم سورۃ النِّساء کی آیت ۹۰ میں بہ الفاظِ ذیل آیا :۔
فَاِنِ اعْتَزَلُوْكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ وَاَلْقَوْا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ فَمَا جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيْلًا O
''اگر وہ (دشمن) تمہیں چھوڑے رہیں اور تم سے قتال نہ کریں اور تمہارے ساتھ سلامت روی رکھیں تو اللہ نے اُن کے خلاف تمہارے لئے کوئی راہ نہیں رکھی ہے۔'' (۹۰ : ۴)

اس سے بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ جو لوگ مسلمانوں سے نہ لڑیں اور اُن کے ساتھ صلح و سازگاری سے رہنا چاہیں اگر چہ وہ کافروں کے مقابلہ میں مسلمانوں کا ساتھ نہ بھی دیں تو اُن سے جنگ و قتال جائز نہیں۔

Karen Armstrong لکھتی ہیں :

''مسلّح لڑائی کے لئے عربی زبان میں متعدّد الفاظ ہیں جیسے حرب' سریہ' معرکہ اور قتال۔ اگر دین اسلام کو پھیلانے کی کوشش میں جنگ و قتال مسلمانوں کا بنیادی طریقہ ہوتا تو ان الفاظ کو قرآن بہ آسانی استعمال کر سکتا تھا۔ ان الفاظ کے استعمال کی بجائے قرآن نے ایک گول مول لیکن پُر از معانی لفظ استعمال کیا ہے جس کی وسیع تعبیرات ہیں۔ ''جہاد'' اسلام کے پانچ ستونوں میں سے نہیں اور نہ ہی وہ مذہب کا مرکزی حصّہ ہے جیسا کہ عام مغربی نظریہ ہے بلکہ یہ مسلمانوں کا فرض ہے کہ انصاف پسند اور نفیس سماج پیدا کرنے کے لئے وہ اُخلاقی' روحانی اور سیاسی تمام محاذوں پر اپنے آپ کو اس کوشش کے لئے وقف کر دیں جہاں غریب اور زخم پذیر لوگوں کا استحصال نہ ہو اور اس طور اور نہج پر ہو جس پر اللہ تعالیٰ انسان کو چلانا چاہتا ہے۔''
("Muhammad --- the Biography of the Prophet" p. 168)

''**امن و آشتی بہ مقابلہ جنگ و قتال** : جنگ و امن دو متضاد چیزیں ہیں۔ قدرتی طور پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ ایک طرف تو امن و سکون کے نقیب ہیں تو دوسری طرف آپ جنگ و قتال بھی کرتے ہیں جس میں خونریزی اور انسانی جانوں کا نقصان ناگزیر ہوتا ہے۔ اِس سوال کا جواب یہ ہے کہ پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام اور آپ کے صحابہ کرام ذرّہ بھر جنگ و قتال کے شیدائی نہیں تھے بلکہ دشمنوں نے حالات ایسے پیدا کر دئے تھے جن کے تحت وہ تحفظِ ذات کی خاطر اُن سے نبرد آزما ہونے پر مجبور ہو گئے تھے۔ پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حیاتِ طیّبہ کا ہر صفحہ اِس حقیقت کا کھلا گواہ ہے کہ آپ نے دشمن کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرنے میں کبھی پہل نہیں کی بلکہ اپنے دشمنوں کے بد اور ناپاک عزائم کو خاک میں ملانے اور دینِ حق کی حفاظت کے لئے آپ کو مجبوراً تلوار کا سہارا لینا پڑا۔ مسلمانوں کی غیر متحارب فطرت (Non-militant Nature) پر قرآنِ حکیم گواہ ہے :

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ وَعَسٰى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَعَسٰى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْئًا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ○ (البقرة : ۲۱۶)

''تم پر قتال فرض کر دیا گیا ہے درآنحالیکہ وہ تم پر گراں ہے لیکن کیا عجب کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرتے ہو اور وہ تمہارے حق میں بہتر ہو اور کیا عجب کہ تم کسی چیز کو پسند کرتے ہو اور وہ تمہارے حق میں باعثِ خرابی ہو اور علم تو اللہ ہی رکھتا ہے اور تم علم نہیں رکھتے۔'' (۲ : ۲۱۶)

ایک مستشرق نے بھی اِس حقیقت کی تائید اس طرح کی ہے :

''قبیلہ قریش کی طرف سے طنز وطعن اور ظلم و تعدی کے صابر و حلیم شکار محمد (ﷺ) کو اللہ تعالیٰ نے دشمن سے مدافعتِ نفس کے مشن پر مقرر کیا تھا اور آپ کو تلوار اٹھانے پر مجبور کیا گیا تھا۔'' (مضمون بہ عنوان
"What Made Islam a World-force" by Prof. Veccia Vaglieri,
appearing in the Journal "Light", Lahore of 24th November, 1958)

مدافعتِ نفس ہر فرد کا فطری اور قانونی حق ہے اور دنیا کا کوئی قانون یا کسی مذہب کا ضابطہ اس کے مخالف نہیں۔ رسول اللہ ﷺ کو نہ صرف تبلیغ دین کرنا ہے بلکہ حق و صداقت کو پھیلانا اور سماج میں اس کی بالا دستی کو نافذ کرنا بھی آپ کے ترجیحی فرائض میں شامل ہے۔ آپ عالمی سٹیج پر روشن نمائندے اور لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ☆ کے تابندہ منشور کے طور پر ظاہر ہوتے ہیں۔ ابتداء میں آپ اپنے دشمنوں کی سختیوں اور مظالم کو فیاضانہ طور برداشت کرتے ہیں اور آپ کی نظروں کے سامنے حق و صداقت کو اپنے پورے جوبن میں آشکار کرنا' اس کی صداقت کو ثابت کرنا اور سماج میں اس کی حکمرانی کو نافذ کرنا آپ کا مقصدِ وحید ہے۔ ایسے اعلیٰ مقصد کے حصول کے لئے اس ذاتِ مقدس کو بعض اوقات دارِ ارقم میں محصور ہونا پڑتا ہے' بعض اوقات اُسے سالوں تک شعب ابی طالب کی قیدِ تنہائی میں بھوک و پیاس کی سختیوں اور تکلیفوں کو برداشت کرنا پڑتا ہے' بعض اوقات اُسے طائف کے بے رحم' سنگدل نوجوانوں کے ہاتھوں پتھر کھانے کا بھی شکار ہونا پڑتا ہے۔ لیکن جب آپ اعلیٰ و ارفع حق و صداقت کو اپنی تمام تر رعنائی اور تابندگی کے ساتھ کھلے عام بندوں تبلیغ کرنے کے فریضہ سے عہدہ برآ ہوتے ہیں اور منکرین و کفار کی طرف سے عدمِ تسلیم کا کوئی عذر باقی نہیں رہتا تو آپ کو بدر وحنین' خندق اور خیبر کے معرکوں میں تلوار کو بے نیام بھی کرنا پڑتا ہے تاکہ آپ بد دماغوں کا دماغ اور بدطینت اور بدکردار لوگوں کی کج خیالی کو درست کر دیں۔

مسئلہ کی تائید میں Karen Armstrong کتاب مذکور کے صفحہ ۱۶۸ پر لکھتی ہیں :

''مغرب میں ہم اکثر محمد (ﷺ) کو عسکری قائد (Warlord) سمجھتے ہیں اور اہلِ دنیا کی مرضی کے خلاف اسلام کو اُن پر بزورِ شمشیر ٹھونسنے کے لئے اپنی تلوار کو لہراتا ہوا سمجھتے ہیں۔ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ محمد ﷺ اور ابتدائی مسلمان تحفظ ذات کے لئے لڑ رہے تھے اور اُنہوں نے ایک ایسا منصوبہ اپنے ذمہ لے لیا

☆ ''تاکہ اللہ اُسے سارے بقیہ دینوں پر غالب کر دے'' (سورۃ التوبۃ : ۳۳؛ سورۃ الفتح : ۲۸؛ سورۃ الصف : ۹)

تھا جس میں تشدّد نا گزیر تھا۔ کوئی بھی نتیجہ خیز سماجی اور سیاسی تبدیلی کبھی بھی خونریزی کے بغیر حاصل نہیں ہوئی اور چونکہ محمد (ﷺ) انتشار اور ٹوٹ پھوٹ کے دور میں رہ رہے تھے' امن وسکون کا حصول صرف بہ زورِ شمشیر ہی ممکن تھا۔ اُمّت کو اہلِ عرب کے خطرناک تشدّد کا خاتمہ سخت گیر کوشش کے ذریعے ہی سے کرنا تھا۔''

اور Sir John Glubb رقم طراز ہیں :

''ہم نے دیکھا ہے کہ کتنی ہی بار آپ (ﷺ) نے جنگ وقتال سے گریز کیا ہے اور طاقتور دشمن سے گفت و شنید اور افہام وتفہیم سے معاملے کو سلجھانے کی کوشش کی ہے جو اکثر صلح ومصالحت پر نتیجہ خیز ہوئی۔ یہ آپ کی صرف سیاسی بصیرت ہی تھی جس نے اہلِ مکہ کے دل اپنے حق میں جیت لئے۔'' ("The Life and Times of Muhammad", p. 313, New York, 1970)

یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کو ہمیشہ شیطانی قوّتوں کے خلاف سینہ سپر رہنے کا اور اُن سے خوف نہ کھانے کا حکم دیا گیا کیونکہ شر کو بالآخر ایک نہ ایک دن ختم ہونا ہے جس سے حق وصداقت کو غالب آنے کی راہ مل جائے گی۔ سورۃ النّساء میں مسلمانوں کے جنگ وقتال کے پس پردہ راز کی نقاب کشائی یوں کی گئی ہے:

اَلَّذِيْنَ آمَنُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللهِ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ الطَّاغُوْتِ فَقَاتِلُوْا أَوْلِيَآءَ الشَّيْطٰنِ اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطَانِ كَانَ ضَعِيْفًا O (اَلنّساء : ۷۶)

''ایمان والے تو اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں اور کافر طاغوت کی راہ میں لڑتے ہیں۔ سوتم شیطان کے ساتھیوں سے لڑو۔ بے شک شیطان کی چال تو لچر (بودی) ہی ہوتی ہے۔'' (۴ : ۷۶)

بار بار کی تکرار کے فِيْ سَبِيْلِ الله کے مشروط الفاظ نمایاں اہمیت کے حامل ہیں اور ہماری خصوصی توجہ چاہتے ہیں۔ دراصل یہ آیت ''جہاد'' کے سلسلہ میں دی گئی ہدایتی سلسلوں کی کلیدی روش (Keynote) ہے اور اسلامی ''جہاد'' اور دنیا کی باقی تمام جنگوں کے مابین فرق کی وضاحت کرتی ہے۔ وہ غیر مبہم طور پر اس حقیقت کو واضح کرتی ہے کہ جب ایک سچا مسلمان نوعِ انسان کے خلاف جنگ کا سہارا لیتا ہے تو ایسے عمل میں اس کا مقصد نہ تو اس کی ملکی جغرافیائی حدود کی توسیع ہوتا ہے' نہ ہی اپنی قوم کا غلبہ اور نہ ہی تجارتی منڈیاں قائم کرنا ہوتا ہے۔ اُس کا مقصد اپنی انانیت اور خود پسندی کو دوسروں پر ٹھونسنا نہیں ہوتا بلکہ ایک ایسے اعلیٰ ترین مقصد کا حصول ہوتا ہے جس کا انسانیت نے شاید ہی کبھی تصوّر کیا ہو اور وہ خدائے واحد کا ''کلمہ توحید'' کا بلند کرنا ہوتا ہے اور اگر ضرورت پڑے تو حق وصداقت کی قربان گاہ پر جان کا نذرانہ دینے سے بھی گریز نہ کیا جائے۔ بھلا وہ لوگ جو اپنی جانوں کو اپنے مادرِ وطن' قبیلہ' رنگ ونسل کی عزت کی قربان گاہ پر نچھاور کرتے ہیں' کبھی ایسے شریفانہ عمل کی بلند مقصدیت کو سمجھ سکتے ہیں؟ جب تک اسلامی ''جہاد'' اپنی صحیح روح میں قائم رہا تو کیا سپاہیوں کو ہزاروں ٹن شراب کی ضرورت ہوئی اور کیا آئے دن کے زنا اور زنا بالجبر کے نتیجہ میں جنسی بیماریوں کے شکار سپاہیوں کے علاج کے لئے ہسپتال کبھی قائم کئے گئے؟ مسلمان سپاہی کو

ہمیشہ یہ احساس لاحق ہوتا ہے کہ اُسے اپنے ہر عمل کا جواب اپنے خالق کے حضور دینا ہے تو کیا یہ ممکن ہے کہ وہ اسلام کی قائم کردہ حدود کو پھاند جائے؟

یہودی خاتون Karen Armstrong لکھتی ہیں کہ اگرچہ اسلام جنگ وقتال کے ناگزیر ہونے کو تسلیم کرتا ہے تاہم وہ جارحانہ جنگ کی اجازت نہیں دیتا جس کا انجام انسانی تباہی ہوتا ہے۔ جارحیت اور ظلم واستبداد کی روک تھام کے لئے بعض اوقات جنگ کرنا واجب ہو جاتا ہے۔ قرآن حکیم کی تعلیم یہ ہے کہ اگر جنگ کرنا ضروری ہو تو اخلاقی ضابطوں کے اندر رہتے ہوئے لڑی جائے اور ان ضابطوں کو ممکنہ حد تک مدِّنظر رکھا جائے۔ ("Holy War")

ایک اور مستشرق Raymond Lerouge نے اپنی کتاب Vie de Mahomet میں لکھا ہے:

''محمد (ﷺ) کے لئے ایک عمدہ فوج رکھنا کافی نہیں تھا۔ وہ فوج الٰہی ہونی چاہئے۔ اُسے اپنے مشن کے حسبِ حال بنانے کے لئے پیغمبر (علیہ السلام) نے اُسے اپنے فرائض وواجبات کی تعلیم دی۔ قتالِ مقدس کا مقصد تباہی وبربادی نہیں ہونا چاہئے۔ انصاف ورحمت کے خدا کے نام پر لڑی جانے والی جنگ کو غارت گر، منتقمانہ اور ظالم نہیں بلکہ انسان دوست ہونا چاہئے۔'' (صفحہ ۱۶۴)

اسلامی جنگوں کی تاریخ اس حقیقت کی شاہد ہے کہ مسلمانوں نے ہمیشہ سورۃ التوبہ میں وارد اس فرمانِ الٰہی کی پابندی کی: فَمَا اسۡتَقَامُوۡا لَكُمۡ فَاسۡتَقِيۡمُوۡا لَهُمۡ (التّوبة : ۷)
''سو جب تک وہ تم سے سیدھے رہیں، تم بھی اُن سے سیدھی طرح رہو۔'' (۷ : ۹)

مسلمانوں نے اسبابِ جنگ پیدا کرنے میں کبھی پہل نہیں کی بلکہ ہمیشہ بُردباری اور تحمل سے کام لیا۔ اسبابِ جنگ (مثلاً ظلم، استبداد، جارحیت وغیرہ) کی تمام تر ذمہ داری دشمن (کافر) پر رہی ہے جس کے باعث ردِّعمل کے لئے دنیا کا کوئی اخلاقی ضابطہ مسلمانوں کو نہ روک سکا۔

مندرجہ بالا حقائق اس بات کو ظاہر کرتے ہیں کہ اسلام نے مسلمانوں کے تحفظِ ذات کے لئے جنگ کو قانونی اور جائز قرار دیا ہے۔ اسلام اپنے دائرہ حکومت میں غیر مسلموں کو اُن کی مکمل مذہبی آزادی اور خودمختاری کے ساتھ رہنے کی اجازت دیتا ہے لیکن اسلام کے لئے یہ برداشت کرنا ناممکن ہے اگر وہ غیر مسلمین مسلمانوں کے مال وجائیداد، مذہب یا عزت وآبرو کی طرف اپنا دستِ تظلّم دراز کریں، یا وہ اسلام اور مسلمانوں کو ذلیل کرنا شروع کریں، تب اسلام کی شمشیرِ خاراشگاف نیام میں رہنا نہیں جانتی اور اپنے حقوق وترجیحات کی حفاظت کرنا اور اس طرح بددماغوں کا دماغ ٹھکانے لگانا خوب جانتی ہے۔ محمد بن قاسم علیہ الرحمۃ کے ہاتھوں فتحِ سندھ اور اس قسم کی لاتعداد مثالیں تاریخِ اسلام کے صفحات کی تزئین کا باعث ہیں۔

اسلام اعتدال کا دین ہے۔ اُس کی اُمّت ''اُمّتِ وسط'' (البقرۃ:۱۴۳) ہے جس کا معنیٰ یہی ہے کہ وہ ہر جانب سے بے اعتدالیوں سے گریز کرتی ہے اور کسی بھی انتہا کی طرف مائل نہیں ہے۔ یہ بات دیکھنے میں آئی ہے کہ ظالم سے انتقام لیتے وقت مظلوم اخلاقی ضابطوں کی تمام حدود کو پھاند جاتا ہے اور اب وہ خود ظالم بن جاتا ہے۔ لیکن ایسے اشتعال انگیز موقعوں پر بھی قرآن حکیم مسلمانوں کو اپنے جذبات کو قابو میں رکھنے اور ظالم سے کسی قسم کا زور آوری کا رویّہ اختیار نہ کرنے کی ہدایت کرتا ہے۔ چنانچہ حکم ہوا :

وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ (اَلنّحل : ۱۲۶)

''اور اگر تم لوگ بدلہ لینا چاہو تو اُنہیں اُتنا ہی دکھ پہنچاؤ جتنا دکھ اُنہوں نے تمہیں پہنچایا ہے۔'' (۱۶:۱۲۶)

اس تمام بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلام نے مسلمانوں کو صرف ہنگامی حالات میں تلوار اٹھانے کی اجازت دی ہے اور وہ بھی صرف اللہ کی حاکمیت' انصاف' معدلت اور اللہ کی زمین پر امن کے نفاذ و قیام کے لئے' نہ کہ کسی دنیاوی یا ذاتی مفاد کے حصول کے لئے۔ اس تناظر کے تحت دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام اور آپ کے صحابہ کرام نے جو جنگیں لڑیں' وہ نوعِ انسان کے لئے ناقابلِ تصوّر رحمت اور مژدۂ جانفزا سے کم نہیں تھیں۔

حیاتِ انسانی کا تقدّس : اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے حیاتِ انسانی کو مقدّس اور قابلِ احترام بنیادی اصول بنایا ہے۔ جب تک کوئی آدمی انسانی اقدار کی حدود کو پھاند نہیں جاتا اور اپنے ابنائے جنس کی زندگی کو احترام کی نگاہ سے دیکھتا ہے' اُسے اپنی زندگی کے فطری اور قانونی حق سے محروم نہیں کیا جا سکتا۔ قرآنِ حکیم نے سورۃ الانعام اور سورہ بنی اسرائیل میں یہ حکم دیا ہے :

وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ (الانعام : ۱۵۱؛ بنی اسرائیل :۳۳)

''اور جس جان کو اللہ نے محفوظ کر رکھا ہے' اُسے قتل مت کرو بہ جُز حقِ شرعی کے۔'' (۱۷:۳۳؛۶:۱۵۱)

قرآنِ حکیم اور سنتِ مبارکہ نے کسی اور گناہ کی اتنی شدید و مہیب سزا نہیں سنائی جتنی مؤمن کے ناحق قتل کی سزا سنائی ہے۔ فرمانِ الٰہی ملاحظہ ہو :

وَمَنْ یَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِیْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَیْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِیْمًاO (النّساء : ۹۳)

''اور جو کوئی کسی مؤمن کو عمداً قتل کر دے تو اُس کی سزا جہنم ہے جس میں وہ ہمیشہ پڑا رہے گا اور اللہ اُس پر غضبناک ہوگا اور اُس پر لعنت کرے گا اور اُس کے لئے عذابِ عظیم تیار رکھے گا۔'' (۴ : ۹۳)

ایک اور آیت میں قتلِ ناحق کی ممانعت کی تاکید اس طرح کی گئی :

کَتَبْنَا عَلٰی بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَیْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِی الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِیْعًا وَمَنْ اَحْیَاهَا فَكَاَنَّمَا اَحْیَا النَّاسَ جَمِیْعًا (المائدۃ : ۳۲)

''ہم نے بنی اسرائیل پر یہ مقرر کر دیا کہ جو کوئی کسی کو کسی جان کے (عوض کے) یا زمین پر فساد (کے عوض) کے بغیر مار ڈالے تو گویا اُس نے سارے آدمیوں کو مار ڈالا اور جس نے ایک کو بچا لیا تو گویا اُس نے سارے آدمیوں کو بچا لیا۔'' (۵: ۳۲)

قرآنی لفظ فَکَاَنَّمَا قاتل کی اندرونی خباثتِ نفس اور معصیت کی فطرت کا مظہر ہے بہ ایں معنیٰ کہ اگر قاتل کے بس میں ہو تو وہ تمام نوعِ انسان کو نابود کر دے۔

قتلِ ناحق کے بارہ میں چند احادیث نبوی : آج کے اس پُرفتن اور دہشت گردی کے دَور میں جہاں مسلمان کا قتلِ ناحق بے دریغ کیا جا رہا ہے' ذیل کی احادیث ظالم قاتلوں کی آنکھیں کھولنے کے لئے کافی ہیں:

(۱) لَزَوَالُ الدُّنْیَا اَھْوَنُ عِنْدَاللّٰہِ مِنْ قَتْلِ رَجُلٍ مُّسْلِمٍ (سنن نسائی: کتاب المحاربۃ)
''اللہ کے نزدیک تمام دنیا کی تباہی ایک مسلمان کے قتل سے کم اہم ہے۔''

(۲) مَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا فَاغْتَبَطَ بِقَتْلِہٖ لَمْ یَقْبَلِ اللّٰہُ مِنْہُ صَرفًا وَّلَا عَدلًا (سنن ابی داود: کتاب الفتن)
''جو شخص کسی مؤمن کو قتل کر کے اُس پر خوش ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اُس کی توبہ کو کبھی قبول نہیں کرے گا اور نہ ہی اُس کی طرف سے کسی فدیہ کو قبول کرے گا۔''

(۳) عَنْ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ عُمَرَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمَا قَالَ: رَأَیْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ یَطُوْفُ بِالْکَعْبَۃِ وَیَقُوْلُ: مَا اَطْیَبَکَ وَ اَطْیَبَ رِیْحَکَ! مَا اَعْظَمَکَ وَ اَعْظَمَ حُرْمَتَکَ! وَالَّذِیْ نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِیَدِہٖ لَحُرْمَۃُ الْمُؤْمِنِ اَعْظَمُ عِنْدَاللّٰہِ حُرْمَۃً مِّنْکَ مَالُہٗ' وَ دَمُہٗ' وَ اِنْ نَّظُنَّ بِہٖ اِلَّا خَیْرًا (سنن ابن ماجہ: ابواب الفتن' حدیث: ۳۹۳۲)
''عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے' اُنہوں نے کہا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو کعبہ کا طواف کرتے اور یہ فرماتے دیکھا: ''اے بیت اللہ! تم کس قدر خالص اور عمدہ ہو اور تمہاری بُو کس قدر خوش آئند اور فرحت بخش ہے! تمہاری عظمتوں اور تمہارے تقدّس کا کیا کہنا! لیکن میں اُس ذات کی قسم کھاتے ہوئے کہتا ہوں جس کے قبضہِ قدرت میں میری جان ہے کہ اللہ کے نزدیک مؤمن کی حرمت' اُس کے مال و اسباب کی حرمت اور اُس کے خون کی حرمت تیری حرمت سے کہیں زیادہ ہے۔''

(۴) کُلُّ ذَنْبٍ عَسَی اللّٰہُ اَنْ یَّغْفِرَہٗ' یَوْمَ الْقِیَامَۃِ اِلَّا مَنْ مَّاتَ مُشْرِکًا اَوْقَتَلَ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا (مجمع الزوائد: کتاب الفتن' باب: حرمۃ دماء المسلمین)
''کیا عجب کہ اللہ تعالیٰ روزِ قیامت میں ہر گناہ بخش دے سوائے اُس کے جو مشرک ہو کر مرا یا جس نے کسی مؤمن کا قتل بالعمد (بالارادہ) کیا۔''

(۵) لَوْاَنَّ اَنَّ اَھْلُ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اِجْتَمَعُوْا عَلٰی قَتْلِ مُسْلِمٍ لَعَذَّبَھُمُ اللّٰہُ بِلَا عَدَدٍ وَّلَا حِسَابٍ (مجمع الزوائد: کتاب الفتن' باب: حرمۃ دماء المسلمین)

''اگر آسمان وزمین والے تمام کے تمام مل کر ایک مسلمان کے قتل کرنے پر آمادہ ہو جائیں تو اللہ تعالیٰ اُن سب کو بلا تعداد و شمار سزا دے گا۔''

(۶) لَا یَقْتُلُ الْقَاتِلُ حِیْنَ یَقْتُلُ وَهُوَ مُؤْمِنٌ'' (مجمع الزوائد : کتاب الفتن' باب:حرمة دماء المسلمين)

''قتل کرتے وقت قاتل سے ایمان جاتا رہتا ہے (وہ مؤمن نہیں رہتا)۔''

(۷) مَنْ اَشَارَ اِلٰی اَخِیْهِ بِحَدِیْدَةٍ فَاِنَّ الْمَلَائِکَةَ تَلْعَنُهٗ حَتّٰی یَدَعَهٗ وَاِنْ کَانَ اَخَاهُ لِاَبِیْهِ وَ اُمِّهٖ (صحيح مسلم : كتاب البرّ والصّلة' حديث : ۲۶۱۵)

''جو کوئی اپنے (مسلمان) بھائی کی طرف کسی ہتھیار سے اشارہ کرتا ہے تو فرشتے اُس پر اُس وقت تک لعنت (رب کی رحمت سے دُوری کی بددعا) کرتے رہتے ہیں جب تک وہ اشارہ کرنے سے رک نہیں جاتا اگرچہ وہ اُس کا حقیقی (خونی) بھائی کیوں نہ ہو۔''

(۸) اَوَّلُ مَا یُقْضٰی بَیْنَ النَّاسِ بِالدِّمَاءِ (صحيح بخاری' كتاب الرقاق)

''قیامت کے دن سب سے پہلے نمٹائے جانے والے مقدمے خونریزی کے مقدمے ہوں گے۔''

ایسی امن پسند تعلیمات کے مدِّ نظر جو قطع نظر دین و مذہب کے مکمل طور پر حیاتِ انسانی کے تقدس اور ''جیو اور جینے دو'' کے اصول پر مبنی ہوں' کیا یہ قیاس کرنا ممکن ہے کہ وہ ذاتِ مقدس جس پر قرآن کا نزول ہوا' ان اصولوں سے انحراف کرے اور اپنے پیروکاروں کو ظلم و تشدد' استحصال' انائیت پسندی' لاقانونیت اور اپنے ابنائے جنس کے ذہنی سکون کو غارت کرنے کی تعلیم دے۔ یہ محال بالذات ہے کیونکہ اُن کا ربُّ العُلا خود ہر کہ و مہ کے ساتھ آپ ﷺ کے مسحور کن اخلاقِ عالی کا گواہ ہے اور خالق کی زبان اپنی تخلیق کے شاہکار کی توصیف فرما رہی ہے :

وَاِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ O (القلم : ۴)

''اور بے شک آپ عظیم الشان خُلق کے مالک ہیں۔'' (۴ : ۶۸)

فخر المفسرین امام رازی علیہ الرحمۃ خُلُق کی تشریح کرتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ خُلق نفس کے اُس ملکہ اور استعداد کو کہتے ہیں جس میں وہ پایا جائے اور اس کے لئے افعالِ جمیلہ اور خصالِ حمیدہ پر عمل پیرا ہونا آسان ہو جائے۔ پھر فرماتے ہیں کہ کسی اچھے اور خوبصورت فعل کا کرنا الگ چیز ہے لیکن اُسے سہولت اور آسانی سے کرنا الگ چیز ہے۔ کوئی کام خُلُق اُسی وقت کہلائے گا جس کے کرنے میں تکلف سے کام لینے کی نوبت نہ آئے (تفسیر کبیر)۔ یعنی جس طرح آنکھ بے تکلف دیکھتی ہے' کان بے تکلف سنتے ہیں' زبان بے تکلف بولتی ہے' اُسی طرح سخاوت' شجاعت' حیا' حق گوئی' تقویٰ وغیرہ تجھ سے کسی تردّد اور توقف کے بغیر صدور پذیر ہونے لگیں تو اُس وقت ان امور کو تیرے اخلاق شمار کیا جائے گا۔

آیت میں عَلٰی استعلاء کے لئے ہے یعنی کسی پر حاوی ہونا' چھا جانا اور قابو پا لینے کے معنیٰ میں استعمال ہوتا

ہے۔آیت یوں نہیں ہے وَاِنَّ لَکَ خُلُقًا عَظِیْمًا بلکہ وَاِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْم ہے۔مقصد یہ ہے کہ اَخلاقِ حمیدہ اور افعالِ پسندیدہ پر حضور علیہ السلام کا قبضہ ہے اور وہ سب آپ کے زیرِ فرمان ہیں۔ وہ سب مرکب ہیں اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اُن کے راکب اور شہسوار ہیں۔اس لئے حضور علیہ السلام کو ان امور کے لئے کسی تکلف اور بناوٹ کی ضرورت نہیں۔آفتابِ ذاتِ محمدی سے صفاتِ محمدیہ اور کمالاتِ احمدیہ کی کرنیں خود بخود پھوٹتی رہتی ہیں۔''

وَاِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْم فرما کر بتا دیا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذاتِ بابرکات تمام کمالات کی جامع ہے۔ وہ کمالات جو پہلے نبیوں اور رسولوں میں متفرق طور پر پائے جاتے تھے' وہ مجموعی طور پر اپنی تمام جلوہ سامانیوں اور اپنی جملہ رعنائیوں کے ساتھ اس ذاتِ اقدس واطہر میں موجود ہیں۔شکرِ نوح' خُلّتِ ابراہیم' اخلاصِ موسیٰ' صدقِ اسماعیل' صبرِ یعقوب' تواضعِ سلیمان علیہم الصلوٰۃ والسلام سب یہاں جمع ہیں:

حُسنِ یوسُف' دمِ عیسیٰ' یدِ بیضا داری　　آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

امام شرف الدین بوصیری علیہ الرحمۃ نے اپنے مخصوص انداز میں کیا خوب فرمایا ہے۔

فَاقَ النَّبِیِّیْنَ فِیْ خَلْقٍ وَّفِیْ خُلُقٍ　　وَلَمْ یُدَانُوْہُ فِیْ عِلْمٍ وَّلَا کَرَمٍ
فَاِنَّہٗ شَمْسُ فَضْلٍ ھُمْ کَوَاکِبُھَا　　یُظْھِرْنَ اَنْوَارَھَا لِلنَّاسِ فِیْ ظُلَمٍ

''آپ علیہ السلام اپنی ظاہری شکل وصورت اور سیرت واخلاق کے اعتبار سے تمام انبیاء سے برتر ہیں۔ کوئی نبی آپ کے مقامِ علم اور شانِ کرم کے قریب بھی نہیں پہنچ سکتا۔حضور علیہ السلام کی ذات بزرگی کا آفتاب ہے' سارے انبیاء علیہم السلام آپ کے ستارے ہیں اور وہ ستارے عہدِ جاہلیت کے اندھیروں میں آپ کے انوار اور تابانیوں کو ظاہر کرتے رہے ہیں۔''

شاعرِ دربارِ رسول ﷺ' حضرت حسان بن ثابت انصاری رضی اللہ عنہ نے کیا خوب ترجمانی کی ہے۔

لَہٗ ھِمَمٌ'' لَا مُنْتَھٰی لِکِبَارِھَا　　وَھِمَّتُہُ الصُّغْرٰی اَجَلُّ مِنَ الدَّھْرِ

''آپ ﷺ کی ہمتیں اور حوصلے بے شمار ہیں۔ جو اُن میں سے بڑے حوصلے ہیں' اُن کی تو حد ہی نہیں۔ حضور علیہ السلام کی چھوٹی سے چھوٹی ہمت اور حوصلہ' زمانہ سے بزرگ تر ہے۔'' (ضیاء القرآن' ج ۴)

مزید برآں آپ علیہ السلام کے خالق ومالک نے آپ کو رحمۃ للعالمین کے ابدی اور تابندہ تاج کے ساتھ مزیّن کر کے مبعوث فرمایا اور سیّدہ عائشہ صدّیقہ رضی اللہ عنہا کے بقول کَانَ خُلُقُہُ القرآن (آپ چلتا پھرتا قرآن تھے)۔

جیسا کہ اوپر بیان ہوا کہ انتقام لینا انسانی فطرت میں شامل ہے اور یہ کہ انتقام لیتے وقت مظلوم اکثر اوقات اخلاقی حدود کو پھاند جاتا ہے اور اب وہ خود ظالم بن جاتا ہے۔لیکن ہمارے پیغمبر آخر الزماں علیہ السلام کے ہاں یہ بات ہرگز نہیں ہے۔آپ نے فتحِ مکہ کے دن اپنے اُن خون کے پیاسوں کو جن کی شرانگیزیاں مدینہ کی دیواروں سے

بار بار آ کے ٹکراتی تھیں، غیر مشروط معافی نامہ دے کر اپنے رحمۃ للعالمین ہونے کا عملی ثبوت تاریخ کے صفحات پر رقم کر دیا۔

اس موقع پر انتہائی متعصب اور کینہ پرور مستشرق Stanley Lane-Poole بھی حضور علیہ السلام کو خراجِ تحسین دیئے بغیر نہ رہ سکا۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے :

''محمد (ﷺ) کی اپنے دشمنوں پر عظیم فتح کا دن اُن کی اپنی ذات پر بھی عظیم فتح کا دن تھا۔ آپ نے قریش کی طرف سے دیئے گئے اُن تمام رنج و ملال کے سالوں اور بے رحم نفرت کو فیاضانہ طور پر معاف کر دیا جن میں اُنہوں نے آپ کو اذیّت پہنچائی تھی اور مکّہ کی تمام آبادی کو معافی دے دی۔۔۔ کسی گھر کو لُوٹا نہیں گیا، کسی عورت کی بے حرمتی نہیں کی گئی۔۔۔ اس طرح محمد (ﷺ) ایک بار پھر اپنے پیدائشی شہر میں داخل ہوئے۔ فتح کی تمام روئداد میں اِس فاتحانہ داخلہ کے مقابلہ میں کوئی اور واقعہ نہیں ملتا۔'' ("The Speeches & Table-talk of the Prophet Muhammad", p. 47;London, 1882)

اسلام کی امن پسند فطرت از روئے قرآنِ حکیم

(۱) قرآنِ حکیم کا فرمودہ لَآ اِكْرَاهَ فِی الدِّيْنِ (سورۃ البقرۃ : ۲۵۶) (دین میں کوئی زبردستی نہیں) اسلام کا دیگر مذاہب اور عقائد کے ساتھ امن پسند رویّہ ہونے کا روشن ثبوت ہے۔ اللہ کے ہر نبی اور رسول کا مقصدِ وحید پیغامِ حق کو انتہائی بااخلاق طور پر پُرکشش اور دلجیت انداز میں پہنچانا ہوتا ہے (سورۃ النّحل : ۱۲۵) جس میں ظلم و تشدد اور جبر و اکراہ یا زبردستی کے الفاظ غیر مانوس ہیں اور ان کی اس میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔

قرآنِ حکیم نے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کو یہ بھی بتا دیا کہ لوگوں کو صراطِ مستقیم کی طرف لانا آپ کی ذمّہ داری نہیں بلکہ اللہ کے پیغمبر ہونے کے حوالے سے آپ کا کام فقط پیغامِ حق کا پہنچا دینا ہے۔ ہدایت دینا اللہ کے اختیار میں ہے کہ وہ جسے چاہے ہدایت دے دے (سورۃ البقرۃ: ۲:۲۷۲) جس کا صاف مطلب یہی ہے کہ اس معاملہ میں جبر یا زبردستی کو کوئی دخل نہیں۔ اگر بااخلاق تبلیغ کی اَن تھک کوششوں میں ردِّعمل منفی رہتا ہے تو مسلمانوں کو دوٹوک واضح الفاظ میں کفار کے آگے یہ اعلان کر دینا چاہیئے کہ تمہاری راہ اپنی ہے اور ہماری راہ اپنی ہے (سورۃ الکافرون: ۶)۔ ''نتیجہ کی نفرت میں حق و صداقت کا دامن تھامے رکھنا'' مسلمان کا مقولہ ہوتا ہے۔

R.V.C. Bodley پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کی امن پسند فطرت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے :

''اگر جوابی کارروائی محمد (ﷺ) کی تعلیم کا حصّہ ہوتا تو آپ وقت کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ چلتے، اُس

وقت کے عیسائیت کے ضابطہ اور مابعد کے زمانوں کے ساتھ ساتھ چلتے۔'' ("The Messenger" p. 136)

(۲) سورہ یونس میں قرآنِ حکیم کا بیان

وَلَوْشَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِی الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِیْعًا اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰی یَكُوْنُوْا مُؤْمِنِیْنَ O (یونس : ۱۰۰)

''اور اگر آپ کا پروردگار چاہتا تو روئے زمین میں جتنے بھی لوگ ہیں سب کے سب ایمان لے آتے' تو کیا آپ لوگوں پر جبر کر سکتے ہیں حتی کہ وہ ایمان لے ہی آئیں۔'' (۱۰۰ : ۱۰)

میں واضح طور پر اس بات کا اظہار ہے کہ ایمان والوں کو ناراض یا بے صبر نہیں ہونا چاہئے اگر اُنہیں کفر سے نبرد آزما ہونا پڑے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ایمان وعقیدہ کے معاملہ میں جبر اور زبردستی کو جائز قرار نہیں دیا اور اُس نے کسی کو بھی ایمان لانے پر مجبور و مضطر نہیں کیا بلکہ اُس نے اسے لوگوں کی صوابدید پر چھوڑ دیا ہے۔ جبر وتشدّد کسی چیز کے ظاہر کو تو بدل سکتے ہیں لیکن وہ نہ تو انسان کی اندرونی دنیا کو بدل سکتے ہیں اور نہ ہی اُن کے ذریعے کوئی محسوس انقلاب لایا جا سکتا ہے۔ لہٰذا جبری ایمان کوئی ایمان نہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا کہ تمام لوگ ایمان والے ہو جائیں تو وہ قادرِ مطلق ہونے کے حوالے سے تمام لوگوں کو دولتِ ایمان سے نواز دیتا لیکن بے شمار تکوینی مصلحتوں اور حکمتوں سے مشیّتِ الٰہی نے اس عالم کو عالمِ ابتلاء ہی رکھا ہے اور ''آزادانہ رضامندی'' اور ''خود مختار انتخاب'' کا اصول مقرر کیا جس کی طرف ذیل کی قرآنی آیت اشارہ کر رہی ہے:

وَلَوْشَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ لِّیَبْلُوَكُمْ فِیْ مَآ اٰتَاكُمْ (المائدۃ: ۴۸)

''اور اگر اللہ چاہتا تو تم (سب کو) ایک ہی اُمت بنا دیتا لیکن (اُس نے ایسا نہیں کیا) تاکہ وہ اُس میں تمہیں آزما تا رہے جو وہ تمہیں دیتا رہا ہے۔'' (۴۸ : ۵)

اس لئے مذہب میں جبر وتشدد کوئی معقول بات نہیں کیونکہ اُس صورت میں ''آزمائش و ابتلاء'' کا اعلیٰ اور بنیادی مقصد جس کا اوپر ذکر ہوا' فوت ہو کے رہ جاتا ہے اور ''آزادانہ رضامندی'' اور ''خود مختار انتخاب'' کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ (تفسیر کبیر از امام فخر الدین رازی' جلد ۱۷ صفحہ ۱۸۸ طبع مصر)

(۳) حق وصداقت اور راہ نمائی ظاہر کر دیئے گئے ہیں اور وہ تمام تر الٰہی تابندگی اور درخشندگی کے ساتھ جس میں کوئی ابہام نہیں منصہ شہود پر آ گئے ہیں۔ لہٰذا اب آدمی کی اپنی صوابدید پر ہے کہ وہ یا تو صراطِ مستقیم کو یا راہِ شیطان کو اپنا لے جیسا کہ سورۃ الکہف میں وارد ہوا:

وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ شَآءَ فَلْیُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْیَكْفُرْ (الکہف : ۲۹)

''فرما دیجئے کہ حق تمہارے رب کی طرف سے آ چکا ہے' سو جس کا جی چاہے ایمان لے آئے اور جس کا جی چاہے' کافر رہے۔'' (۲۹ : ۱۸)

اس کا مطلب یہی ہے کہ صراطِ مستقیم پر لانے کے لئے اللہ تعالیٰ کسی پر جبر نہیں کرتا۔

(۴) سورۃ الشُّعَراء میں اپنے پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام سے مخاطِب ہوتے ہوئے رب تعالیٰ فرماتا ہے :
لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ○ اِنْ نَّشَاْ نُنَزِّلْ عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ آيَةً فَظَلَّتْ اَعْنَاقُهُمْ لَهَا خَاضِعِيْنَ ○ (الشعراء : ۳، ۴)
''شاید کہ آپ (اے حبیب!) اُن کے ایمان نہ لانے پر اپنی جان پر کھیل جائیں گے۔ ہم اگر چاہیں تو اُن پر آسمان سے کوئی (ایسا نشان) اتار دیں کہ اُس کے آگے اُن کی گردنیں بالکل جھک جائیں۔''

اوپر کی آیت ۳ میں نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا اپنی اُمّتِ (دعوت) کے لئے کمال شفقت کا اور کفار کے منفی ردِّ عمل پر آپ کے دکھ درد اور شدید رنج والم کا ظہار ہے۔ علّامہ آلوسی بغدادی نے اس آیت ۳ سے دو نکات اخذ کئے ہیں: اوّل یہ کہ نبی علیہ السلام اپنی امت کے لئے بہت ہی مشفق اور مہربان ہیں۔ دوم یہ کہ کفار کو ایمان کی راہ پر لگانے میں آپ کی فکر الٰہی فیصلہ کے خلاف نہیں ہے۔ (روح المعانی' جزء ۹' صفحہ ۵۹ طبع بیروت)

(۵) سورۃ الانبیاء (۲۱:۱۰۷) کی آیت
وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ
''ہم نے آپ کو تمام جہانوں کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے''
میں جو جامعیت ہے اُس نے اِسے دیگر آیات سے ممتاز کر دیا ہے۔ جو کمالات اور صفاتِ عالیہ متفرق اور منتشر تھیں' اُن سب کو یہاں یکجا کر دیا ہے۔ اس قسم کی آیات کو پڑھ کر جہاں ایک طرف عبدِ محبوب کے مرتبہ کمال کا پتہ چلتا ہے تو دوسری طرف ان کمالات کے بخشنے والے کی شانِ کریمی اور ادائے بندہ نوازی دیکھ کر بے ساختہ دل وزبان سے سبحان اللہ! سبحان اللہ! کی صدا بلند ہوتی ہے۔''

''امام راغب اصفہانی کہتے ہیں کہ رحمت دو چیزوں کے مجموعہ کا نام ہے۔ یعنی رحمت اُس رقت کا نام ہے جو اس شخص پر احسان کرنے کا تقاضا کرے جس پر رحمت کی جارہی ہے۔ پھر فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی صفتِ رحمت میں رقت نہیں کیونکہ وہ اس سے پاک ہے بلکہ صرف تعطف اور احسان ہے اور کہیں صرف رقت ہوتی ہے اور یارائے احسان نہیں ہوتا (المفردات امام راغب)۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب کو رحمتِ جامعہ یعنی رحمت کے دونوں مفہوموں سے نوازا ہے۔ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ (جس سے تمہیں تکلیف ہوتی ہے وہ چیز میرے محبوب کو بڑی شاق گزرتی ہے: سورۃ التوبۃ : ۱۲۸) میں رقت کا اظہار ہے اور بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ میں شانِ تعطف واحسان کا۔ یعنی ہر دردمند کے درد کا احساس بھی ہے اور ہر درد کا درماں بھی ہے۔ کسی غم زدہ اور دکھ درد کے مارے کو دیکھ کر غایت رأفت سے آنکھیں اشک بار ہو جاتی ہیں اور نوکِ مژگاں پر دُرِّ یتیم سے ارجمند تر آنسوؤں کے موتی سراپا التجا بن کر بارگاہِ ربُّ العالمین میں گرتے ہیں تو مشکلیں آسان ہو جاتی ہیں اور غم واندوہ کی کالی گھٹائیں کافور ہو جاتی ہیں۔''

''آپ خود غور فرمائیے کہ جن افراد نے یا جن قوموں نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے دامنِ رحمت کو تھاما' آپ کے لائے ہوئے دین کو صدقِ دل سے قبول کیا اور حضور علیہ السلام کے پیش کردہ نظامِ حیات کو اپنی عملی زندگی میں اپنایا' وہ لوگ کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔ گمراہ تھے لیکن اس نورِ مبین سے اکتسابِ نور کرنے کے بعد ظلمت کدہ عالم میں ہدایت کے چراغ روشن کر گئے۔ جاہل تھے لیکن اس چشمہ علم وعرفان سے سیراب ہونے کے بعد دنیا کے جس جس گوشہ میں گئے' علم وحکمت کے چمن کھلاتے گئے۔ گنوار اور اُجڈ تھے لیکن پاکیزہ تہذیب وتمدن کے بانی بن گئے۔ جہانگیری وجہانبانی کا ایک اچھوتا تصوّر دنیا کے سامنے پیش کیا جس میں کسی ایسے بادشاہ کی گنجائش نہیں جو مطلق العنان ہو' جو قانون کی گرفت سے باہر ہو' جو سب کا محاسبہ کر سکے لیکن وہ خود بھی محاسبہ سے آزاد نہ ہو۔''

''لیکن جو لوگ اپنی کج فہمی کے باعث یا بے جا تعصّبات میں مبتلا ہو کر اس چشمہ صافی سے براہِ راست اور بلا واسطہ سیر کام نہ ہوئے' وہ بھی اس فیضان سے دانستہ یا نادانستہ فیضیاب ہوتے رہے۔ آفتاب کی شعاعیں ہر وادی و کوہسار کو روشن کرتی رہیں حتی کہ وہ مذاہب جن کی بنیاد ہی اصنام پرستی اور شرک پر تھی' وہ بھی اپنے مشرکانہ عقائد میں ترمیم کرنے پر مجبور ہو گئے۔ چنانچہ ہندوستان میں آریہ سماج اور عیسائی دنیا میں پروٹسٹنٹ نظریات کا فروغ اس دعویٰ کی صداقت پر شاہدِ عدل ہیں۔ ملوکیت اور ڈکٹیٹر شپ کے نظام ہائے حکومت کی جگہ جمہوری اور شورائی طرزِ حکومت کی مقبولیت اسلام کے پیش کردہ نظریہ سیاست کی فتح نہیں تو اور کیا ہے؟ اور پھر یہ رحمت کیا کم ہے کہ اپنے فسق وفجور اور کفر وشرک کے باوجود پہلی قوموں کی طرح اُن پر فوری عذاب نازل کر کے اُنہیں نیست ونابود نہیں کر دیا گیا۔''

''یہ تو عالمِ ناسوت میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی گوناگوں رحمتوں کا ظہور ہے لیکن صرف یہاں ہی نہیں بلکہ عالمِ ملکوت میں بھی حضور علیہ السلام کی رحمت کا پرچم لہرا رہا ہے اور آپ کا دستِ شفقت گل افشانی کر رہا ہے۔ وہاں رحمتِ محمدی کے ظہور میں جو بانکپن ہے اور بحرِ کرم میں جو مٹھاس اور روانی ہے' اُس کا حال تو فقط وہ نفوسِ قدسیہ ہی جانتے ہیں جنہیں اُس عالم کی سیاحت ارزانی ہوئی ہو۔''

''غرضیکہ یہ وہ آفتاب ہے جس کی تابانیوں سے صرف عالمِ رنگ وبو ہی روشن نہیں بلکہ وہ جہانِ لطیف بھی درخشاں ہے جو رنگ وبو' کم وکیف' بالا وپست کے تعیّنات سے ماوراء ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ وہاں اس آفتاب کی نور افشانی کا رنگ ہی نرالا ہے جو نہ زبان پر لایا جا سکے اور نہ قلم سے لکھا جا سکے۔ اس رحمتِ عامّہ کی برکتوں سے عقل بھی بہرہ ور ہے اور دل کی دنیا بھی شادکام ہے۔ ترجمانِ حقیقت شاعرِ مشرق نے کیا خوب کہا ہے:

تیری نگاہِ ناز سے دونوں مراد پا گئے — عقلِ غیاب وجستجو' عشق حضور واضطراب
شوکتِ سنجر وسلیم تیرے جلال کی نمود — فقرِ جنید وبایزید تیرا جمالِ بے نقاب

''حضور کریم ﷺ نے اپنی شانِ رحمت سے نقاب سرکاتے ہوئے فرمایا: اِنَّمَا اَنَا رَحْمَةٌ مُّهْدَاةٌ یعنی میں وہ رحمت ہوں جو اللہ رب العزت نے اپنی مخلوق کو بطورِ تحفہ عطا فرمائی۔''

''حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا تمام کائنات کے لئے رحمت ہونا اِس اعتبار سے ہے کہ عالمِ امکان کی ہر چیز کو حسب استعداد جو فیضِ الٰہی ملتا ہے وہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے واسطہ ہی سے ملتا ہے۔'' (ضیاء القرآن' ج ۳' ص ۱۹۲)

(۶) سورہ آلِ عمران کی آیت ۱۵۹ میں نبیِ اکرم ﷺ کی انسان دوست اور خلیق فطرت کو یوں بیان کیا گیا:

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللهِ لِنتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ

''پھر یہ اللہ کی رحمت ہی کے سبب سے ہے کہ آپ اُن کے ساتھ نرم رہے اور اگر آپ تند خو' سخت طبع ہوتے تو لوگ آپ کے پاس سے منتشر ہو گئے ہوتے۔'' (۳ : ۱۵۹)

تفسیر قرطبی میں آپ کے انسانیت دوست کردار کی کس خوبصورتی سے نقشہ کشی کی گئی ہے!

فَالرُّسُلُ خُلِقُوْا لِلرَّحْمَةِ وَهُوَ خُلِقَ بِنَفْسِهٖ رَحْمَةً فَلِذٰلِكَ صَارَ اَمَانًا لِلْخَلْقِ قَالَ عَلَيْهِ السَّلَامُ: اِنَّمَا اَنَا رَحْمَةٌ ''مُهْدَاةٌ'' (الجامع لاحکام القرآن المعروف بہ تفسیر قرطبی' ج ۶' ص ۳۵۰' طبع مصر ۱۳۸۰ھ/۱۹۶۰ء)

''تمام انبیاء علیہم السلام کو رحمت کے لئے پیدا کیا گیا لیکن تاجدار انبیاء خود رحمت ہیں' پس اِسی لئے آپ اللہ کی مخلوقات کے لئے جائے امن اور سہارا بن گئے۔ آپ علیہ السلام نے فرمایا کہ میں وہ رحمت ہوں جو اللہ سبحانہ' وتعالیٰ نے اپنی مخلوق کو بطور تحفہ عطا فرمائی۔''

کچھ مستشرقین نے آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو یوں خراجِ تحسین پیش کیا ہے :-

(1) ''پیغمبر (علیہ السلام) کا میلانِ طبع ہمیشہ نرمی ہی کی طرف رہتا۔'' (بحوالہ تفسیر ماجدی انگریزی "Historians' History of the World", Vol. VIII, p. 121)

(2) آپ (علیہ السلام) نے عمر بھر کسی کو اپنے ہاتھ سے نہیں مارا۔۔۔ کوئی مصافحہ کرتا تو نہ وہ اپنا ہاتھ الگ کرنے میں سبقت کرتے اور نہ از خود اُس سے الگ ہوتے۔ گفتگو بہت شیریں کرتے۔ محافظین کے لئے آپ بہت ہی باوفا محافظ تھے۔ آپ کو دیکھنے والوں کے دل عظمت و احترام سے بھر جاتے اور آپ کے قریب آنے والے لوگ آپ سے محبت کرتے۔'' ("Muhammad and Muhammadanism" --- Bosworth Smith, p. 131)

(3) ''ظلم و تشدد محمد (علیہ السلام) کی سرشت ہی میں نہ تھا۔'' ("Selections from the Kuran" --- Lane Poole)

(4) ''اپنے دوستوں کے ساتھ آپ فیاض اور روادار تھے۔ آپ جانتے تھے کہ غیر مطیع اور بد دل کو کیسے فتح کیا جائے اور اُسے اپنا مطیع کیا جائے۔۔۔۔۔ دشمن کی آپ کے لئے بروقت اطاعت تسلیم کر لینے کے بعد آپ نے شاید ہی کبھی اُس کا تعاقب کیا ہو۔ آپ کی تحکمانہ وضع قطع ایک اجنبی میں عجیب اور ناقابلِ بیان ہیبت طاری کر دیتی لیکن نزدیکی یگانگت اور یکدلی پر خدشات اور خوف کی جگہ اعتماد اور اُنس و محبت جگہ بنا لیتے۔'' ("The Life of Mahomet"...Sir W. Muir)

(۷) اسلام کا امن پسند مزاج اس ناقابلِ انکار تاریخی حقیقت سے بھی ظاہر ہے کہ اسلام میں دوسرے مذاہب کی عبادت گاہوں کو ہمیشہ عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا رہا ہے اور مسلمانوں کو اِس الٰہی حکم کی تعمیل میں انسانیت دوست اصول پر ہمیشہ سختی سے کاربند رہنے کی تعلیم دی گئی ہے:

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰہِ النَّاسَ بَعْضَھُمْ بِبَعْضٍ لَّھُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِیَعٌ "وَّصَلَوٰتٌ" وَّمَسٰجِدُ یُذْکَرُ فِیْھَا اسْمُ اللّٰہِ کَثِیْرًا (الحج : ۴۰)

''اور اگر اللہ لوگوں کا زور ایک دوسرے سے نہ گھٹاتا رہتا تو نصاریٰ کی خانقاہیں، عبادت خانے اور یہود کے عبادت خانے اور مسلمانوں کی مسجدیں جن میں اللہ کا نام بہ کثرت لیا جاتا ہے (سب) منہدم ہو گئے ہوتے۔''

اِس حقیقت کا اعتراف کچھ نامور مستشرقین کو بھی ہے۔ مثلاً:

(1) ''ہسپانیہ کی مسلمان حکومتوں کے تحت جب اسلام نے سیاسی برتری حاصل کر لی تھی تو مقامی عیسائیوں کی بڑی وسیع رواداری سے حفاظت کی گئی، سیاسی مصلحت کے تحت نہیں بلکہ اسلامی قوانین کے تحت یہ سب کچھ ہوا۔ عیسائیوں کو اپنے بشپ، گرجا گھر اور عبادت گاہیں قائم رکھنے اور اپنے مقدمات کو اپنے قوانین اور عدالتی فیصلوں کے مطابق نمٹانے کی اجازت دی گئی جب کبھی بھی معاملہ صرف اُنہی سے متعلق ہوتا تھا۔''

("Christianity, Islam and the Negro Race"... E. Blyden, p. 254)

(2) ''ہمارے مطالعہ میں راہبوں اور راہبات کے لئے متعدد دینی عبادت گاہیں آئی ہیں جنہیں مسلمان حکمرانوں نے کامیاب اور بامراد کیا۔ راہب لوگ اپنے طرز کے اونی لباس میں عوام الناس میں ظاہر ہوتے تھے اور پادریوں کو اپنے مقدس منصب کی علامتیں چھپانے کی ضرورت نہیں تھی اور نہ ہی عیسائیوں کو اُن کا مذہب عدالت یا مسلم افواج میں اعلیٰ عہدہ حاصل کرنے میں رکاوٹ تھا۔'' ("The Preaching of Islam".... T.W. Arnold)

(3) '' مشرک اور بت پرست کو مسلمانوں کے علاقے میں رہنے کی اجازت نہ تھی لیکن یہود اور نصاریٰ دونوں اہلِ کتاب کو جزیہ ادا کرنے کے بعد تحفظ کا حق حاصل تھا۔ وہ اپنے مذہب و عقیدے پر آزادانہ عمل پیرا تھے اور سماج کا حصہ سمجھے جاتے تھے۔ محمد (ﷺ) نے فرمایا: جو شخص یہودی یا عیسائی کے ساتھ بدمعاملگی کرے گا، میں اُس کے خلاف گواہ ہوں گا۔ اوّل مسلمان فاتحین نے اس ہدایتِ نبوی پر باوفا طور پر عمل کیا۔ قرآن و حدیث رواداری اور بُردباری کی مثالوں سے بھرے پڑے ہیں۔ جب عمر (رضی اللہ عنہ) یروشلم میں داخل ہوئے تو آپ نے حکم دیا کہ عیسائیوں کو تنگ نہ کیا جائے اور نہ ہی اُن کے گرجوں سے تعرض کیا جائے اور آپ نے اُن کے سردار کے ساتھ عنایات کی حد کر دی۔ جب گرجا کے سردار نے آپ کو گرجا کے اندر نماز پڑھنے کے لئے بلایا تو آپ نے محض اس ڈر سے انکار کر دیا کہ کہیں آپ کا یہ عمل بعد میں گرجا پر قبضہ کرنے کا عذر نہ بن جائے۔ اس کا اُن صلیبیوں کے داخلہ کے ساتھ موازنہ کیجئے جو خونی دریا کے ساتھ اُن تمام مسلمانوں کے گلے کاٹنے کا

فیصلہ کرتے ہوئے آگے بڑھے جو پہلے قتل و غارت سے بچ گئے تھے۔'' ("The Life of Mahomet"--- E. Dermenghem, p. 330) 1930 Edn.

''**محسن انسانیت کا پیغام محبت وامن آج سوالیہ نشان کیوں؟** جس ذاتِ اقدس کی سچائی اور امن پسندی کی گواہی اُس کے جانی دشمن بھی دیتے ہوں' آج چودہ صدیوں بعد اُس کے کلمہ گو افراد آخر کس وجہ سے اس موضوع پر لکھنے' پڑھنے' بولنے اور سننے پر مجبور ہوئے ہیں؟ اگر آپ غور کریں تو ہمیں اس کی دو وجوہات سمجھ میں آتی ہیں: (۱) ہماری داخلی کیفیت (۲) درپیش خارجی صورتِ حال

''داخلی کیفیت سے مراد اہلِ اسلام کی باہمی تفرقہ پروری' ماردھاڑ' قتل و غارت گری اور فساد انگیزی ہے جس میں کم وبیش پورا عالمِ اسلام ہی شامل ہے۔ بین المما لک افتراق ہیں' بین المسا لک اختلاف ہیں اور پھر ہر ملک کے اندر رہنے والے لوگ معمولی معمولی مسائل پر درجنوں گروپوں میں نہ صرف تقسیم ہیں بلکہ باہم دست وگریبان بھی ہیں۔''

''خارجی صورتِ حال سے مراد اسلام مخالف قوّتوں کی دشمنی' مخالفانہ سازشیں اور عالمگیر منفی پروپیگنڈہ ہے۔ آج جب مسلمان ہر طرف سے غیروں کے ظلم وستم کا شکار بھی ہو رہے ہیں اور اُن پر الزام بھی لگ رہا ہے کہ وہ ''دہشت گرد ہیں اور اُن کی تاریخ وحشیانہ مظالم سے بھری پڑی ہے' مسلمان محبت' مروّت اور رواداری کے مفہوم سے آشنا ہی نہیں۔ اسلام جہاں بھی پھیلا' تلوار کے زور پر پھیلا۔'' یورپ اور امریکہ کے دانشور یکے بعد دیگرے کتابیں لکھ رہے ہیں۔ پاپائے روم بینی ڈکٹ کہتا ہے: ''مسلمانوں نے دنیا میں ہمیشہ فتنے برپا کئے ہیں۔'' امریکہ کے پادری اپنے چرچوں کے باہر یہ لکھ کر لگاتے ہیں کہ ''قرآن مسلمانوں کو غیر مسلموں کے قتل پر اکساتا ہے' اس لئے اُسے تلف کر دیا جائے۔'' اُن کی یہ ساری کاوشیں درحقیقت تاریخ کی سب سے بڑی سچائی کو جھٹلانے کے مترادف ہیں۔ بطور امت قومی اور ملی سطح پر اور بطور مسلمان انفرادی اور ذاتی سطح پر ان دونوں محاذوں پر پھیلائی جانے والی غلط فہمیوں اور سازشوں کا توڑ ہر فریق پر واجب ہے۔ یہی وہ بڑا چیلنج ہے جو اس وقت اسلام کو ایک مرتبہ پھر درپیش ہے۔ ''ایک مرتبہ پھر'' اس لئے کہ یہ نیا مسئلہ نہیں۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی

(ماہنامہ منہاج القرآن لاہور' جولائی ۲۰۰۸ء' صفحہ ۲۱)

(۸) اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ O (الانعام:۸۲)

''جو لوگ ایمان لائے اور اُنہوں نے اپنے ایمان کو شرک سے مخلوط نہیں کیا' ایسوں ہی کے لئے تو امن ہے اور وہی ہدایت یاب ہیں۔'' (۶ : ۸۲)

''ظلم'' کا معنیٰ کسی چیز کو اُس کی مناسب جگہ سے ہٹا کر رکھنا ہے (مفردات امام راغب صفحہ ۳۲۶)۔ اس

معنی کی رُو سے ''ظلم'' کا معنی بندگانِ خدا کو اُن کے فطری حقوق سے محروم کرنا' اُن پر جبر و تشدد کرنا' اُن کے ذہنی سکون کو دہشت گردی کے ذریعے غارت کرنا اور پاؤں کے نیچے ننھی' معصوم کونپلوں کو بے رحمی سے اور بے دریغ روند ڈالنا ہے۔ یہ تمام چیزیں غیر فطری ہیں اور انسانوں کی تخلیقی صلاحیتوں کی پُر امن اور خوش آئند و متوازن ترقی کے خلاف ہیں۔ اِن سب بے اعتدالیوں کا رڈ کرتے ہوئے قرآنِ حکیم یہ صاف اعلان کر رہا ہے کہ ''وہ لوگ جو اپنے ایمان کو ''ظلم'' (یعنی دہشت گرد کارروائیوں سے جو انسانی امن و سکون کی دشمن ہیں) سے خلط ملط نہیں کرتے'' بلکہ ''جیو اور جینے دو'' کے اصول کی پابندی کرتے ہیں'' یہی وہ لوگ ہیں جو سراپا امن ہیں اور وہی ہدایت یاب ہیں۔''

(۹) امن پسند پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام اِس الٰہی حکم کی تعمیل میں ہر اُس شخص کو اپنی پناہ اور عافیت میں لے لیتے جو آپ کی حفاظت میں آنا چاہتا:

وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلَامَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ (التوبة:٦)

''اور اگر مشرکین میں سے کوئی آپ سے پناہ کا طالب ہو تو اُسے پناہ دے دیجئے تاکہ وہ کلامِ الٰہی سن سکے پھر اسے اُس کی امن کی جگہ پہنچا دیجئے۔'' (۶ : ۹)

''اُنہیں مکمل طور پر پناہ دی جائے اور کلامِ الٰہی سننے کا پورا موقع مہیا کیا جائے۔ سماع سے یہاں مراد محض سماعِ آواز نہیں بلکہ فہم و تدبر کے ساتھ سوچنا' سمجھنا مراد ہے۔ اگر وہ کلامِ الٰہی کو فہم و تدبر کے ساتھ سوچ اور سمجھ لیں تو وہ مسلمان اور مسلمانوں کے دینی بھائی بن جاتے ہیں اور کوئی دوسرا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اگر وہ اسلام قبول کرنے کی کوئی راہ نہیں پاتے تو اُنہیں دوہری حفاظت حاصل ہوگی: (۱) اسلامی قوّتوں کی جانب سے اُن کے دشمنوں کے خلاف کھلم کھلا جنگ کی صورت میں (۲) اُن کے اپنے لوگوں سے کیونکہ وہ اُن سے الگ تھلگ ہو گئے ہیں۔ اُن کے لئے یہ دونوں قسم کی حفاظتیں یقینی بنائی جائیں اور اُنہیں بہ حفاظت اُس جگہ پر پہنچا دیا جائے جہاں وہ مکمل طور پر محفوظ ہوں۔''

(اے۔ یوسف علی' نوٹ: ۱۲۵۳)

(۱۰) سورۃ الممتحنہ کی ذیل کی آیات اس بات میں راہ نما ہیں کہ ایک مسلمان کا غیر مسلم سے کیسا رویّہ ہونا چاہئے:

لَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْا اِلَيْهِمْ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ○ اِنَّمَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ قٰتَلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَاَخْرَجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ وَظٰهَرُوْا عَلٰى اِخْرَاجِكُمْ اَنْ تَوَلَّوْهُمْ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ○ (اَلْمُمْتَحِنه: ۸' ۹)

''اللہ تمہیں اُن لوگوں کے ساتھ حُسنِ سلوک اور انصاف کرنے سے نہیں روکتا جو تم سے دین کے بارہ میں نہیں لڑے اور تمہیں تمہارے گھروں سے نہیں نکالا' بے شک اللہ انصاف کا برتاؤ کرنے والوں ہی کو دوست رکھتا ہے۔ اللہ تو تمہیں صرف اُن لوگوں سے دوستی کرنے سے منع کرتا ہے جو تم سے دین کے بارہ میں لڑے اور تمہیں تمہارے گھروں سے نکال دیا اور تمہارے نکالنے میں مدد کی اور جو کوئی اُن سے دوستی کرے گا' تو یہی لوگ تو ظالم ہیں۔'' (۸' ۹ : ۶۰)

(۱۱) سورۃ التوبہ میں مشرکینِ عرب کو اُن کے پیہم معاہدوں کی خلاف ورزی پر متنبہ کیا گیا:

فَسِیۡحُوۡا فِی الۡاَرۡضِ اَرۡبَعَۃَ اَشۡہُرٍ وَّ اعۡلَمُوۡۤا اَنَّکُمۡ غَیۡرُ مُعۡجِزِی اللّٰہِ (اَلتّوبۃ:۲)

''سو (اے مشرکو!) زمین میں چار ماہ چل پھر لو اور جانے رہو کہ تم اللہ کو عاجز نہیں کر سکتے۔'' (۹:۲)

اب خطاب براہِ راست کافروں سے شروع ہو گیا۔ یعنی اس چار مہینہ کی مہلت کے اندر یا تو اسلامی برادری میں شامل ہو جاؤ یا اِس جغرافیائی مرکزِ توحید و ایمان کو اپنے وجود سے خالی کر دو۔ عین عتاب کے موقع پر اور اُس موقع پر جبکہ مکہ بھی فتح ہو چکا ہے اور ایک خود مختار اسلامی ریاست قائم ہو چکی ہے' اسلام اپنے مخالفین کی راہ میں کتنی سہولت پیدا کر رہا ہے! جاہ و منصب اور قوت و طاقت کے مالک ہوتے ہوئے اسلام کا اپنے دشمنوں سے ایسا امن پسند رویہ اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ اسلام فی الواقع تمام لوگوں کے لئے رحمت و امن کا دین ہے۔

اُنہیں پورے چار ماہ کی مہلت دی جا رہی ہے۔ یہ چار مہینے کون سے تھے؟ اس کے جوابات مختلف دیئے گئے ہیں۔ عام چار محترم مہینے تو ظاہر ہے کہ رجب' ذی قعدہ' ذی الحجہ اور محرم ہیں لیکن یہاں بعض علماء سے شوال تا محرم منقول ہیں اِس بناء پر کہ آیت کا زمانہِ نزول زمانہِ شوال ہے۔

(۱۲) اسلام نے درندگی' جارحیت' ظلم و تشدد اور ہر قسم کی باغیانہ سرگرمیوں کی بیخ کنی کر دی ہے اور اپنے پیروؤں کو ہدایت کی ہے کہ وہ انتہائی نازک اور ناموافق حالات میں بھی انصاف کے تقاضوں کی بہرصورت پابندی کریں۔ سورۃ المائدۃ میں مسلمانوں کو یہ حکم دیا گیا ہے:

وَلَا یَجۡرِمَنَّکُمۡ شَنَاٰنُ قَوۡمٍ عَلٰۤی اَلَّا تَعۡدِلُوۡا اِعۡدِلُوۡا ہُوَ اَقۡرَبُ لِلتَّقۡوٰی وَاتَّقُوا اللّٰہَ (المائدۃ: ۸)

''اور (اے مسلمانو!) کسی جماعت کی دشمنی تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم اُس کے ساتھ انصاف ہی نہ کرو۔ انصاف کرتے رہو کہ وہ تقویٰ سے بہت قریب ہے اور اللہ سے ڈرتے رہو۔'' (۸ : ۵)

پس ایک ایسے مذہب سے جس نے خون کے پیاسے دشمن سے بھی انصاف اور معدلت سے پیش آنے کی تاکیدی نصیحت کی ہو اور دشمنی اور عداوت کو اس راہ میں رکاوٹ بننے سے روکا ہو' تو اُس سے ناحق خونریزی' درندگی اور غیر انسانی سرگرمیوں کی کیسے توقع کی جا سکتی ہے!!

''**اسلام اور پیغمبر علیہ السلام کے خلاف اہلِ مغرب کا شرمناک پرچار**: دنیائے عیسائیت میں اُن کے بحث مباحثوں' تحقیقات اور تحریروں کا لبِّ لباب اسلام اور پیغمبر علیہ السلام کے خلاف زہر آلود تیر برسانے کا لامتناہی سلسلہ ہے۔ اِس زہر آلود مہم میں گرجا کی مذہبی شخصیتیں اور غیر مذہبی افراد اور جماعتیں برابر کی شریک رہی ہیں۔ بغض و عناد کا ہمیشہ بھڑکتا ہوا یہ شعلہ تاہنوز مائل بہ ترقی ہے اور اپنی جھلسا دینے والی حرارت و تمازت مسلسل دے رہا ہے۔

اس حقیقت کے باوجود کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اپنے خون کے پیاسے اور جانی دشمنوں تک کو معاف کر دینے کے غیر معمولی اور مثالی کردار سے نوازا گیا تھا' پھر بھی آپ کی ذاتِ اقدس اُن متعصب یورپی ناقدین کے بے بنیاد الزامات کا شکار رہی ہے جن کا یہ دعویٰ ہے کہ لوگوں نے اسلام کو اس کی خوبیوں اور پیغمبر علیہ السلام کے ذاتی کردار کی خوبیوں کی وجہ سے قبول نہیں کیا بلکہ وہ کہتے ہیں کہ اسلام بہ زورِ قوت لوگوں پر ٹھونسا گیا اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ جبر اُن کی آمادگی (Goodwill) میں تبدیل ہو گیا۔ اس موقف کو اپنے ناپاک پروپیگنڈا کی بنیاد بناتے ہوئے اُنہیں نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام پر ظلم وتشدّد' فوجی قائدیت' خونریزی اور اسلام کے بزورِ شمشیر پھیلنے کے الزامات لگانے میں ذرا بھی شرم نہ آئی اور اس شرمناک مہم میں اُنہوں نے جنگِ مقدّس یعنی ''جہاد'' کو لوٹ مار' خون کی پیاس بجھانے کا ذریعہ' دہشت گردی اور کیا کچھ نام نہیں دیئے۔ اس ناپاک مہم کے مدارالمہام قائدین کے نام یہ ہیں:

(۱) سر ولیم میور (۱۸۱۹ـ۱۹۰۵ء) (۲) گولڈزیہر (۱۸۵۰ـ۱۹۲۱ء)
(۳) سٹینلے لین پول (۱۸۵۴ـ۱۹۳۱ء) (۴) ڈی ایس مارگولیتھ (۱۸۵۵ـ۱۹۴۰ء)
(۵) ولیم منٹگمری واٹ (۱۹۰۹ـ۱۹۷۹ء)

یہ بات حیران کن ہے کہ نام نہاد ''تہذیب یافتہ'' ریاستہائے متحدہ امریکہ جو امنِ عالم کا دعویدار ہے' کی سپریم کورٹ میں انتہائی معزز قانون ساز شخصیتوں کو ایک حجری تصویر نامے میں دکھایا گیا ہے جس میں ہمارے پیارے پیغمبر ﷺ کی تصویر کشی ایک ہاتھ میں قرآن تھامے اور دوسرے ہاتھ میں تلوار اٹھائے کی گئی ہے۔ یہ خود اختراعی تصویر بہ شمول موسیٰ وسلیمان علیہما السلام' کنفیوشس اور شارلی مین جیسی قانون ساز شخصیتوں کے 1933ء سے اب تک عدالت مذکور کی اندرونی دیوار میں نصب ہے۔ (روزنامہ ''ڈان'' کراچی ۳ مارچ ۱۹۷۷ء؛ ماہنامہ ''عالمِ اسلام اور عیسائیت'' مئی ۱۹۷۷ء بحوالہ ''رسولِ اکرم ﷺ اور رواداری'' از ڈاکٹر حافظ محمد ثانی' صفحہ ۲۱۰ مطبوعہ فضلی سنز پرائیویٹ لمیٹڈ' اردو بازار کراچی' مارچ ۱۹۸۸ء)

یہ حوالہ جات جہاں ایک طرف دنیائے عیسائیت کی علمی بددیانتی اور تاریخ کو مسخ کرنے کی غماز ہیں تو دوسری طرف وہ اسلام اور پیغمبر علیہ السلام کے خلاف اُن کے معاندانہ رویّہ اور پکی دشمنی کو بھی ظاہر کرتے ہیں۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ ثُمَّ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ! پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذاتِ اقدس کے خلاف جھوٹے' بے بنیاد' دُور از کار اور بعید از فہم الزامات کی تردید میں اس سنگدل گروہ کے مغرور ناقدین میں سے کچھ شہرہ آفاق' مستند اکابرین نے با ثمر طور پر اس خشونت آمیز تصویر کی خشونت کو اپنے زہر آلود قلم کے ذریعے معدوم اور نیست و نابود کرنے کی کوشش کی ہے جن میں سے کچھ حوالہ جات درج ذیل ہیں:۔

(۱) ''ظلم وتشدّد کے الزام کے خلاف جواب آسان ہے۔ ایک ریاست کے سربراہ محمد (ﷺ) اپنے لوگوں کی جان و مال اور آزادی کے محافظ انصاف کرنے میں مجرموں کو کڑی سزا دیتے تھے اور آپ کے اس رویّہ کو

اُس جنگلی درندگی کے سماج کی روشنی میں دیکھنا چاہئے جس میں آپ رہ رہے تھے۔ الٰہی مذہب کے مبلغ ہونے کی حیثیت سے محمد (ﷺ) اپنے ذاتی دشمنوں پر بھی مہربان اور شفیق تھے۔ آپ کی ذات میں انصاف اور رحم جوڑ دیئے گئے تھے اور یہ دو کریمانہ خصوصیات ایسی ہیں جن کا انسانی ذہن کبھی تصور بھی کر سکتا ہے! آپ کی سوانح حیات میں پھیلی ہوئی مثالوں سے اِس حقیقت کی تائید کرنا کچھ مشکل نہیں۔ آپ علیہ السلام کا ایک سوانح نگار لکھتا ہے :

''حیاتِ انسانی کی جنگ جیسی مہیب ضرورت عملی طور پر آپ کے ہاتھوں کم ظالمانہ کی گئی۔ ایک اور بیان میں یہ کہا گیا ہے کہ آپ اپنے سپاہیوں کو یہ حکم دیا کرتے تھے: ''عمر رسیدہ لوگوں' خواتین اور بچوں سے گریز کرو' اُن لوگوں کے گھروں کو منہدم کرنے سے بچو جو تمہاری مزاحمت نہیں کرتے' اُن کی روزی کے ذرائع کو تباہ نہ کرو' باثمر درختوں کو برباد نہ کرو اور کھجور کے درختوں کو نقصان نہ پہنچاؤ۔'' ("An Interpretation of Islam"... Prof. Laura Vaglieri, p. 28)

(۲) ''ایک اور الزام جو آپ (ﷺ) پر اکثر لگایا جاتا ہے' وہ ظلم و تشدد کا ہے۔ لیکن یہ تشدد دشمنوں پر نہیں بلکہ غداروں پر کیا جاتا تھا جو بذاتِ خود خدائے قدوس کی جانب سے ہوتا تھا اور انصاف کا تقاضا بھی یہی تھا جو ظلم کو پنپنے نہیں دیتا۔ محمد (ﷺ) کو انتقامی فطرت کا الزام دینا نہ صرف آپ کی روحانی حیثیت سے سنجیدہ بے انصافی اور حقائق کو توڑنا موڑنا ہے بلکہ اکثر اسرائیلی پیغمبروں اور خود بائبل کی بھی مذمت ہے۔ مکّہ پر قبضہ کرتے وقت اللہ کے رسول ﷺ نے اپنی فاتح فوج میں فوق البشر (Superhuman) شرافت کا مظاہرہ کیا جبکہ دشمن اس کے برعکس احساسات کا حامل تھا۔'' ("Understanding Islam"... Frithjof Scheuon, p. 89) Translated by Dr. Matheson, 1965.

(۳) ''مغرب کی عیسائی اقوام میں یہ عام تاثر پایا جاتا ہے کہ اسلام بزورِ شمشیر پھیلا ہے۔ شام' مصر اور فلسطین کی سبک رُو فتوحات کا انتہائی دلچسپ پہلو یہ ہے کہ اُن میں مفتوح لوگوں پر اسلام جبراً نہیں ٹھونسا گیا۔ جیسا کہ ہم نے قبل ازیں دیکھا کہ رسول اللہ (ﷺ) نے یہود و نصاریٰ کے جبری اسلام لانے کی وکالت نہیں کی۔ یہودِ مدینہ کے قتل یا مدینہ سے اخراج کی وجہ یہی تھی کہ اُنہوں نے قبائل کو متحد کر کے پیغمبر علیہ السلام کے مشن کی مخالفت کی تھی۔ بالفاظِ دیگر اُن کی مخالفت مذہبی نہیں بلکہ سیاسی تھی۔ اُن کے مکمل نیست و نابود ہونے کے بعد کچھ افرادِ یہود کو مدینہ میں تجارت کرنے پر رہنے دیا گیا۔ جب اُنہوں نے پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سرگرمیوں کی مخالفت کرنا چھوڑ دی تو اُن پر مذہب بدلنے کا کوئی جبر و تشدد نہیں کیا گیا۔ قرآنِ حکیم میں بہت سی آیات میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ پیغمبر کا فرض پہنچا دینا اور تنبیہ کر دینا ہے نہ کہ جبر و تشدد کرنا۔'' ("The Life and Times of Muhammad"... Sir John Glubb, p. 385)

(۴) ''یہ کہ محمد (ﷺ) کا جنگیں لڑنا یقینی بات ہے لیکن یہ جنگیں لازمی طور پر دوسری طرح کی جنگوں سے مختلف تھیں۔ یہ جنگیں استیصال اور قلع قمع کرنے کے لئے نہیں بلکہ مسلمانوں کو تہس نہس کرنے کے خلاف اُن کی حفاظت کے

لئے قابلِ تحسین مقصد سے لڑی گئیں۔ ان جنگوں کا مقصد ملک میں سرکشی، بدنظمی، دغا اور دھوکہ بازی کی روک تھام اور آپس میں دست بہ گریباں عرب قبائل کو ایک قوم میں متحد کر دینا، اُنہیں بت پرستی سے ہٹانا اور رب العالمین خدائے واحد کی عبادت کرنا تھا۔"

"یقین ہے کہ مندرجہ بالا حقائق و دلائل ہر انصاف پسند اور غیر متعصب ذہن کو قائل کرنے کے لئے کافی ہیں کہ محمد (ﷺ) کے خلاف خونریزی کا یہ الزام قطعاً بے بنیاد، جھوٹا اور رُسوا کن ہے۔" ("The Message of the Qur'an" ... John Davenport, Chapter III).

(۵) "یہ کہ محمڈنزم ظالم فرقہ ہے، کے تعصب کا علاج کرنا مبنی بر مصلحت ہے جس کی تشہیریوں کی گئی کہ لوگ یا تو مرنا قبول کرلیں یا عیسائیت سے دستبردار ہو جائیں۔ یہ الزام کسی بھی طرح درست نہیں ہے اور مسلمانوں کا رویّہ اُس پاپائیت کے مقابلہ میں انجیلی طور پر فروتنی اور منکسر المزاجی کا تھا جو آدم خوروں کے ظلم و تشدد سے بھی بڑھ گئی تھی۔" ("Apology for Muhammad and the Koran"... John Davenport, p. 47)

(۶) "ابتدا کے مسلمانوں کی مذہبی طور پر تشددیت اور عصبیّت پر مبنی تصویر کشی کرنے سے زیادہ لغو اور پوچ بات کوئی نہیں ہوسکتی جو ملک عرب سے مفتوح لوگوں کو یا تو قرآن دینے یا اُنہیں تلوار کی نوک پر چڑھانے کے لئے باہر نکلے۔ عیسائیوں کو اپنے مذہب سے دستبردار ہونے پر مجبور نہیں کیا گیا۔ گیارھویں اور بارھویں صدی عیسوی میں صلیبی جنگوں کے وقت تک مسلمان عربوں کی حکمرانی کے تحت شام اور مصر میں عیسائی آباد تھے۔" ("Religion in the Middle East"... A. J. Arberry)

(۷) "تمام دیگر مذاہب کو بزورِ شمشیر قلع قمع کرنے کے فریضے کا ایک خبیث عقیدہ مسلمانوں کی طرف منسوب کر دیا گیا ہے۔ جہالت اور تعصب کے الزام کو قرآن نے، مسلمان فاتحین کی تاریخ نے اور عیسائیت کی کھلے عام عبادت کرنے کی رواداری نے ردّ کر دیا ہے۔" ("The Decline and Fall of the Roman Empire"... Edward Gibbon, Vol. IV, p. 193).

(۸) "اسلام کو بزورِ شمشیر پھیلنے کی طرف منسوب کرنا ایک عام غلطی ہے۔۔۔۔ لیکن صرف قوّت اور طاقت اُن ہنگامہ خیز وحشی درندوں کے غول کو جو کسی متفقہ عمل سے غیر مانوس تھے، اور فوجی نظم وضبط کی پابندیوں سے نفور تھے، ایک صدی سے کم عرصہ میں تین عظیم سلطنتوں پر غالب آنے کے قابل نہیں بنا سکتی تھی۔ پہلے تو اسلام کی حکمت عملی بلائے جان ہونے کی بجائے مصالحانہ تھی۔ اسلام نے اپنے اصولوں کو دشنام طرازی اور لعن طعن کے ذریعے مخالفت کو بھڑکانے کی بجائے استدلال کی بنیاد پر رکھا۔" ("History of the Moorish Empire in Europe" ... S.P. Scott, Vol. 1, pp. 120-121) 1904 Edition.

(۹) ''جن ممالک کو فتح کر کے عربوں نے اپنے قبضہ میں لیا' وہاں کے لوگوں پر مذہب اسلام جبراً ٹھونسنے کی ہمیں کوئی مثال نہیں ملتی۔ یہ صحیح ہے کہ تمام لوگوں کو کچھ حقوق سے فائدہ اٹھانے کے ساتھ ساتھ اسلام قبول کرنے کی طرف بلایا ضرور گیا لیکن قوت کا سہارا نہیں لیا گیا۔ ایک مقرر شدہ ''جزیہ'' ادا کرنے کے بعد عیسائیوں' یہودیوں اور زرتشتیوں (مجوسیوں) کو اپنے اپنے مذہب پر عمل پیرا ہونے کی کھلی آزادی حاصل تھی۔'' .. "The Persians")
Sir E. D. Ross, p. 54)

(۱۰) ''تاہم تاریخ اس بات کو واضح کرتی ہے کہ مسلمانوں کے تشدد پسند ہونے کا روایتی قصہ جسے دنیا بھر میں ہوا دی گئی ہے اور مفتوحہ اقوام پر اسلام کو بزورِ شمشیر ٹھونسنے کی فرضی روایت انتہا کی اُن لغویات میں سے ہے جس کا مؤرخین نے بار بار ذکر کیا ہے۔'' ("Islam at the Crossroads"... De Lacy O'Leary, p. 8)

(۱۱) ''سرِ راہے یہ خوب تصدیق شدہ حقائق اس خیال کو غلط ثابت کرتے ہیں (اور جسے عیسائی تحریروں میں جگہ جگہ پروان چڑھایا گیا ہے) کہ مسلمانوں نے جہاں کہیں بھی وہ گئے' لوگوں کو تلوار کی نوک پر اسلام قبول کرنے کے لئے مجبور کیا۔'' ("The Prospects of Islam" ... Lawrence E. Browne, p. 14) 1944.

(۱۲) ''مسلمانوں کی تصویر کہ وہ ایک ہاتھ میں تلوار اور دوسرے ہاتھ میں قرآن لئے ہوئے پیش قدمی کر رہے ہیں' بالکل جھوٹی اور بے بنیاد ہے۔'' ("Islam"... A.S.Tritton, p. 21) London, 1951.

(۱۳) ''اپنے مذہب سے دستبردار ہونے کی مجبوری کے بغیر عیسائی لوگ وزارت جیسے اعلیٰ کلیدی عہدوں تک رسائی پانے کے قابل تھے۔ گیارھویں صدی عیسوی تک عیسائی جنازوں کے جلوس عیسائیت کے تمام مظاہر کے ساتھ بغداد کی شاہراہوں سے گزرتے تھے اور وقائع نگاروں نے چند استثنائی صورتوں میں خلل اندازی کو قلمبند کیا ہے۔ عیسائی تہواروں کو مصر کی مسلم آبادی کسی حد تک تعطیل کے دن سمجھتی تھی۔ تاہم یہ نظریہ کہ مسلمان فاتحین اور اُن کے جانشین عیسائیت سے متعصبانہ طور پر نفرت کرتے تھے عیسائیوں کا خود اختراعی افسانہ ہے۔'' ("Christianity
and Islam"... C. H. Becker, p. 32) London, 1909.

(۱۴) ''عرب لوگ خونخوار درندے نہیں تھے جو تمام تر لوٹ مار اور تباہی و بربادی کی طرف مائل ہوں۔ اس کے برعکس وہ اندرونی طور پر طباع نسل (Gifted Race) تھے' کچھ سیکھنے کے شیدا تھے اور اُن ثقافتی عطیات کے مدح سرا تھے جو قدیمی تہذیبوں نے اُنہیں بخشے تھے۔'' ("The New World of Islam"... A. M.
Lothrop Stoddard, p. 2)

(۱۵) ''اسلام سے متعلق مغرب میں بالکل غلط بیانات بعض اوقات جہالت کا اور بعض اوقات باضابطہ بدنام کرنے کا نتیجہ ہیں۔ حیرت کی بات ہے کہ اعلیٰ تعلیمی صلاحیتوں کے مالک مصنفین کی تحریریں صریح' شرمناک

جھوٹ کا پلندہ ہیں جنہیں پڑھ کر آدمی پریشان ہو جاتا ہے۔'' ("The Bible, the Kor'an and Science"... Dr. Maurice Bucaille, pp. 110-111) Lahore.

(۱۶) ''ہائے افسوس محمد (ﷺ) کی وفات پر'' محمد (ﷺ) کی وفات پر ایک عرب قبیلے کا واویلا تھا۔ ''جب تک آپ زندہ رہے' میں اپنے دشمنوں سے مامون ومحفوظ رہا۔'' اور اس واویلے کی صدائے بازگشت ملکِ عرب کے دُور دراز علاقوں میں سنی گئی۔'' ("The Preaching of Islam"... T. W. Arnold, p. 41)

(۱۷) ''عرب فتوحات کے ابتدائی ایام میں جبری اسلام یا ظلم و تشدد جیسی کوئی چیز ہم نے نہیں سنی۔ دراصل اسلام کا مذہب عیسائیت سے رواداری رویّہ بڑی اہمیت کا حامل ہے جس نے عربوں کے لئے ملک کا حصول آسان بنادیا۔'' (ایضاً صفحہ ۱۳۴)

(۱۸) ''کفار کے ساتھ اسلام کے رویّہ میں تاریخی ارتقاء کو سمجھنے کے لئے یہ بات ذہن نشین ہونی چاہئے کہ ابتدائی صدیوں میں کفار کے ساتھ رواداری مذہبی حالات پر نہیں بلکہ سیاسی حالات پر استوار تھی۔ صلیبی جنگوں کے وقت تک بھی کفار کے ساتھ رواداری کا ایسا رویّہ برابر چلا آیا ہے جس کا تصوّر اُس وقت کی عیسائی دنیا میں کرنا ناممکن سا ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ اِس وقت اعلیٰ ترین مناصب کے حصول میں عیسائیوں کے ساتھ مذہبی رواداری کا رویّہ اختیار کیا گیا۔'' (Shorter Encyclopaedia of Islam" ... H.A.R. Gibb & J.H. Kramers, p. 206)

(۱۹) ''مغرب کے مسئلہ کا ایک جزء یہ بھی ہے کہ محمد (ﷺ) کو صدیوں تک مذہبی روح کا نقیض (ضد) اور نفیس ولطیف تہذیب کا دشمن سمجھا جاتا رہا ہے۔ اس کی بجائے ہمیں شاید آپ کو جذبے اور ولولے کا انسان سمجھنا چاہئے جنہوں نے اپنے لوگوں کے لئے امن و آشتی اور تہذیب لانے کا انتظام کیا۔'' ("Muhammad --- A Biography of the Prophet"... Karen Armstrong, p. 44)

(۲۰) ''حضرت محمد (ﷺ) کی تلوار کے ذریعے اسلام پھیلانے پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ عیسائیت کے پیروکاروں کے لئے یہ امر باعثِ فخر ہے کہ اُن کا مذہب امن وسکون اور تعلیم وتلقین کے ذریعے پھیلا تھا لیکن اگر ہم کسی مذہب کی صداقت یا عدم صداقت کا معیار اسی کو بنالیں تو یہ ایک سنگین غلطی ہوگی۔ اسلام کے لئے تلوار بے شک استعمال ہوئی تھی مگر سوال یہ ہے کہ یہ تلوار آئی کہاں سے تھی؟ ایک لحاظ سے تو ہمیں اپنے مذہب عیسوی کا دامن بھی خون کے دھبوں سے پاک نظر نہیں آتا۔ جب اُس کے ہاتھ میں تلوار آئی تو استعمال بھی ہوئی۔ شہنشاہِ فرانس شارلیمان (Charlemangne 742-814) کے دَور میں سکسیوں (Saxions) کے مذہب کی تبدیلی' تبلیغ کا نتیجہ نہیں تھی جہاں جرمن باشندوں کا تین سال خون بہایا جاتا رہا تھا۔ اس لئے زورِ شمشیر والا اعتراض میری رائے میں وقعت نہیں رکھتا۔'' ("Hero and Hero-Worship" ... Thomas Carlyle)

امنِ عالم کے متولّیوں سے ایک حیات آفریں سوال: ہم ریاستہائے متحدہ امریکہ کے سابق صدر بُش سے جو ''امنِ عالم کے عظیم متولّی'' اور ''حقوقِ انسانی کے عظیم محافظ'' ہونے کے دعویدار ہیں' یہ سوال کرنے میں حق بجانب ہیں کہ آپ کے اُس دعویٰ کا کیا ہوا جس میں آپ نے کہا تھا کہ اسلام امن ہے نہ کہ دہشت گردی اور یہ کہ اسلام اور دہشت گردی دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ دنیا کی سپر پاور کے قائد کے اِس بامعنی اعلان نے دنیا کے مختلف جریدوں' رسالوں اور اخبارات میں خاصی کھلی جگہ پائی۔ تصویری خاکہ ملاحظہ ہو:

TIME, OCT, 1, 2001

LET US MOURN An interreligious ceremony at Bremen's Faith Mosque brings together leaders and adherents from Islam and Christianity to remember the victims of U.S. terror

PLANET EASTON, NOV, 2001

TERRORISM AND ISLAM ARE NOT THE SAME

Extremists representing a tiny fraction ... inevitable clash of civilisations [...]

Q-NEWS, OCT, 2001

Bush and Blair:

Islam is peace, not terror

American people were appalled and outraged at last Tuesday's attacks. And so were Muslims all across the world. Both Americans and Muslim friends and citizens, tax-paying citizens, and Muslims in nations were just appalled and could not believe what we saw on our TV screens.

These acts of violence against innocents violate the fundamental tenets of the Islamic faith. And it's important for my fellow Americans to understand that.

The English translation is not as eloquent as the original Arabic, but let me quote from the Koran, itself: "In the long run, evil in the extreme will be the end of those who do evil. For that they rejected the signs of Allah and held them up to ridicule."

The face of terror is not the true faith of Islam. That's not what Islam is all about. Islam is peace. These terrorists don't represent peace. They represent evil and war.

TIME, OCT, 1, 2001

Muslims in London's Hyde Park pray for victims of the attacks
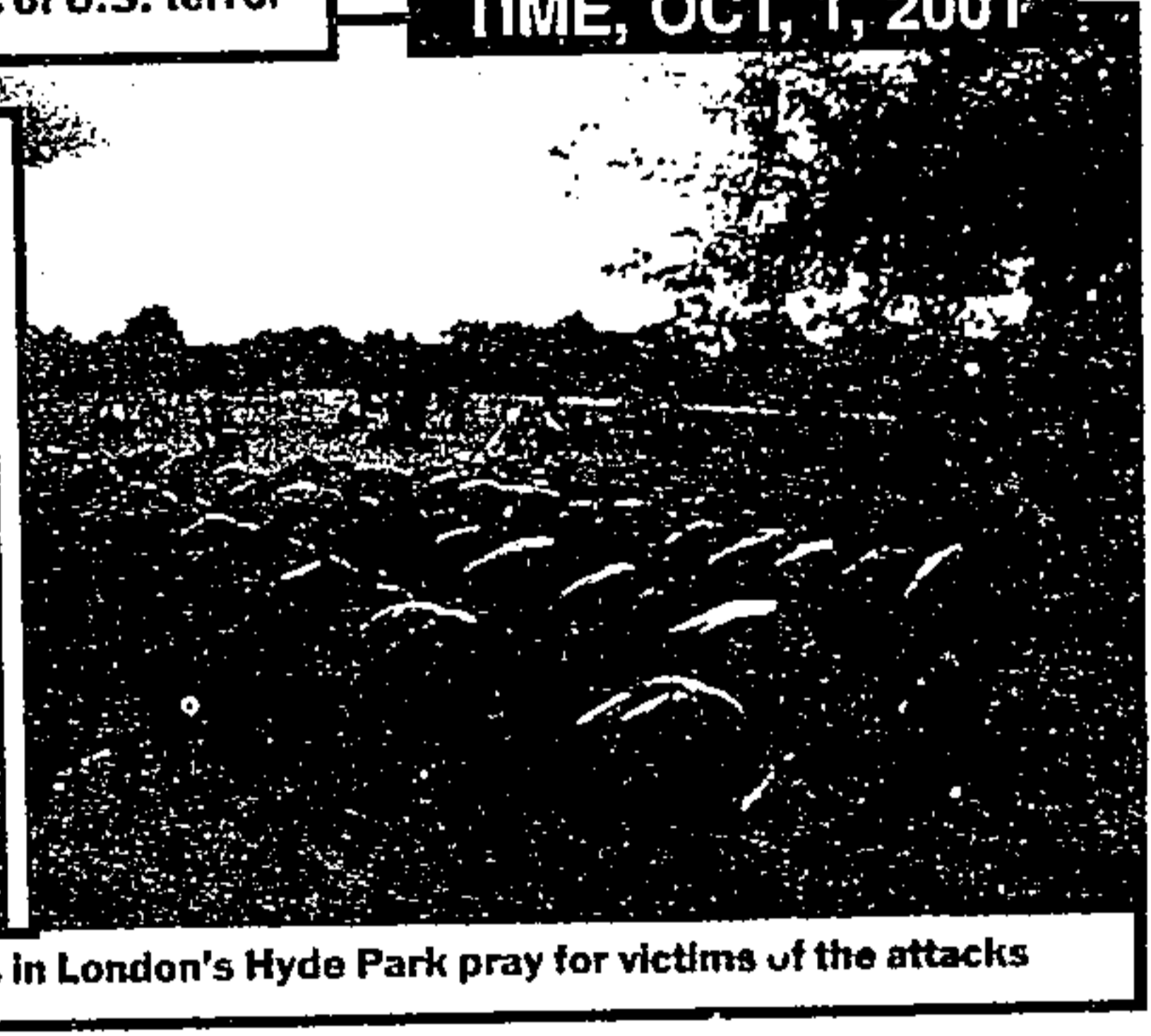
TIME, OCT, 1, 2001

Karen Armstrong

The True, Peaceful Face of Islam

E ARE 1.2 BILLION MUSLIMS IN THE WORLD, AND ISLAM | an end as quickly as possible and must cease the min

Taken from : "Islam Denounces Terrorism" ... Harun Yahya, p. 101)

(۲۱) ''محمد (ﷺ) کو بدنام کرنے کی جتنی کوششیں کی گئی ہیں' اتنی کوششیں تاریخ انسانی کی کسی دوسری عظیم شخصیت کو بدنام کرنے کے لئے نہیں کی گئیں۔ صدیوں اسلام کو عیسائیت کا سب سے بڑا دشمن تصوّر کیا جاتا رہا۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ عیسائیت کو اسلام کے علاوہ کسی منظم طاقت سے واسطہ نہ پڑا تھا جو اتنی طاقتور ہو جتنے مسلمان تھے۔ بارہویں صدی عیسوی میں صلیبی فوجوں کے اذہان میں اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں جو تصوّرات تھے وہ بڑے مضحکہ خیز تھے اور اُنہوں نے اخلاق پر منفی اثرات مرتب کئے۔'' ("Muhammad : Prophet and Statesman"... Montgomery Watt)

(۴۲) ''مغربی قصہ گوؤں نے Maumet کو جو لفظ محمد کی بگڑی ہوئی اُن چالیس شکلوں میں سے ایک ہے جن کا ذکر آکسفورڈ ڈکشنری میں ہوا ہے' بت بنا کر پیش کیا۔ شیکسپیر نے Romeo and Juliet میں اس لفظ کو اسی مفہوم میں استعمال کیا۔ محمد کے نام کی ایک اور بگڑی ہوئی شکل Mahoun قرونِ وسطی کے ایک ڈرامے میں ایک ایسی چیز کے طور پر پیش کیا گیا جس کی عبادت کی جاتی تھی۔ یہ حقیقت کے ساتھ کتنا بڑا مذاق ہے کہ ایک بت شکن اور تاریخ انسانی میں توحید خداوندی کے سب سے بڑے چیمپین کو بت بنا کر پیش کیا گیا۔'' ("Islam : A Way of Life"... Philip K. Hitti)

اسلام اور دیگر مذاہبِ عالم

مذاہب کی یکسانیت اور ہم جنسیت کا تصوّر: آج کل مذہب کی دنیا میں مذاہب کی یکسانیت اور ہم جنسیت کے تصوّر کو خاصی ہر دلعزیزی حاصل ہے۔ اس تصوّر کی رُو سے تمام مذاہب سچے ہیں اور وہ سب کے سب اللہ خالق و مالک تک پہنچ کا ذریعہ ہیں۔ جب اللہ پر ایمان ہو تو عبادت کا جو بھی ظاہری انداز ہو تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ مقصدِ عبادت ہی اصل چیز ہے نہ کہ اُس کا طریقہ اور انداز۔ لہٰذا تمام مذاہب کے پیروکاروں کا مقصد (خواہ وہ یہودی ہوں' یا عیسائی' یا پارسی' یا ہندو یا مسلمان) اللہ کے سوا کوئی اور نہیں۔ اپنی عبادات اور مناجات میں وہ سب کے سب اللہ کے متلاشی ہیں اور اس وجہ سے وہ سب کے سب صراطِ مستقیم پر ہیں۔

''مذاہب کی یکسانیت'' کے حامیوں کے دعویٰ کی بنیاد یہ ہے کہ ہر سماج اور قوم میں اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر اور رسول بھیجے جیسا کہ قرآنِ حکیم میں آیا :

وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ''O (فاطر : ۲۴)

''اور کوئی اُمّت ایسی نہیں ہوئی جس میں ڈرانے والا نہ گزرا ہو۔'' (۳۵ : ۲۴)

اس لئے تمام مذاہب اور رسول اللہ کی طرف سے بھیجے گئے اور وہ تمام مذاہب اپنی اصل اور روح میں اسلام ہی تھے۔ اس منطق کے تحت جس مذہب اور جس بھی پیغمبر کی پیروی کی جائے' اُسے ردّ نہ کیا جائے کیونکہ عبادت اللہ کی ہے جو اُخروی نجات کے لئے کافی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اِسی لئے قرآن اور صاحبِ قرآن ﷺ کا اتباع اور پیروی ہر شخص کے لئے ضروری نہیں ہے۔

اگر اس تصوّر کو تمام مذاہبِ عالم بہ شمول اسلام کے سچا مان لیا جائے تو اس کا قرآنی تعلیمات کے تحت اور تحقیق کی نظر سے تجزیہ کیا جانا اور اس کا جواب دیا جانا ضروری ہے:۔

''محمد ﷺ کی رسالت کی افضلیت : یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ محمد ﷺ کی رسالت کی افضلیت درحقیقت مسئلہِ رسالت کا ایک جزء ہے۔ صحیح فیصلہ پر پہنچنے کے لئے ہمیں سب سے پہلے اسلام کی حیثیت اور مقام کو معلوم کرنا چاہئے۔ سوال یہ ہے کہ ہمارے پیغمبر خاتم الانبیاء حضرت محمدؐ رسول اللہ ﷺ کا لایا ہوا اسلام آیا دوسرے مذاہب جیسا ہے یا اُن سے مختلف ہے؟ قرآنِ حکیم اور حدیث لٹریچر سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ دوسرے مذاہب کی طرح نہیں ہے۔ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نبوت ورسالت کئی حیثیتوں سے ممتاز ہے۔ مثلاً :

(1) اسلام ایک آفاقی دین ہے۔ خاتم الانبیاء ﷺ کو کسی خاص ملک یا سماج کی طرف نہیں بلکہ تمام عالم اور تمام نوعِ انسانی کی طرف بھیجا گیا۔ وہ ذات جس نے تمام رسولوں اور پیغمبروں کو بہ طفیل محمد ﷺ کے مبعوث کیا، یوں اعلان کرتا ہے :

(۱) قُلْ یٰاَیُّهَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ جَمِیْعًا (الاعراف : ۱۵۸)

''(اے حبیب!) فرمادیجئے کہ بے شک میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں۔'' (۷:۱۵۸)

(۲) تَبٰرَكَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِهٖ لِیَكُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرًا ۝ (الفرقان:۱)

''وہ بڑی عالی ذات ہے جس نے یہ فیصلہ (کی کتاب) اپنے بندہ (خاص) پر اتاری تاکہ وہ (بندہ) سارے جہان والوں کے لئے (عذابِ الٰہی سے) ڈرانے والا ہو۔'' (۲۵:۱)

(۳) وَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ۝ (سبا:۲۸)

''اور ہم نے تو آپ کو سارے ہی انسانوں کے لئے (پیغمبر بنا کر) بھیجا ہے بطور خوشخبری سنانے والے اور ڈرانے والے کے لیکن اکثر لوگ نہیں سمجھتے۔'' (۲۸ : ۳۴)

اسلام کے دو دعوے ایسے ہیں جن میں دنیا کا کوئی دوسرا دین اس کا شریک نہیں۔ یہ دونوں دعوے اسلام کے امتیازاتِ خصوصی میں سے ہیں: ایک یہ کہ بار بار تصریح و وضاحت کے ساتھ کہنا کہ میری تعلیم ساری دنیا کے لئے ہے اور دوسرے یہ کہ پیغمبر اسلام ﷺ کو سلسلہِ انبیاء کا خاتم قرار دینا (بحوالہ سورۃ الاحزاب : ۴۰)۔ یہ امتیازِ خاص صرف نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام ہی کو حاصل ہے اور کوئی بھی نبی یا رسول اس امتیاز میں شامل نہیں کیونکہ ہر رسول اور نبی کو ایک خاص علاقہ کے لئے مبعوث کیا گیا تھا۔

(2) ''حضرت محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی رسالت اُسی طرح دائمی اور ہمیشہ رہنے والی ہے جس طرح وہ آفاقی ہے۔ آپ کے ساتھ سلسلہِ وحی و رسالت ختم ہو گیا ہے اور آپ کے بعد تا قیامت کوئی اور رسول یا نبی نہیں آئے گا۔ اس حقیقت کا غیر مبہم، صاف اور واضح الفاظ میں سورۃ الاحزاب میں یوں اعلان کیا گیا :

وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِیّٖنَ (الاحزاب : ۴۰)

''البتہ آپ اللہ کے رسول ہیں اور (سب) نبیوں کے ختم پر ہیں۔'' (۴۰ : ۳۳)

خَاتَمْ اور خَاتِم دونوں کے معنیٰ لغت میں آخر کے ہیں (لسان العرب) اور آپ کا لقب خَاتَمُ النَّبِیّٖن

ہے اسی لئے کہ نبوت آپ پر ختم ہوگئی اور آپ کی آمد سے نبوت کی تکمیل ہوگئی (''مفردات الفاظ القرآن'' لامام راغب اصفہانی) اور حضور علیہ السلام کے اسماء میں سے اَلعاقِب بھی ہے جس کا معنیٰ آخرالانبیاء ہے۔ اس معنیٰ کی تائید کے لئے اہلِ لغت نے سورۃ المُطفّفِین کی آیت ۲۶ سے بھی استدلال کیا ہے: خِتَامُه' مِسكٌ اَیْ آخِرُه' مِسكٌ یعنی اہلِ جنت کو جو مشروب پلایا جائے گا اُس کے آخر میں اُنہیں کستوری کی خوشبو آئے گی۔ (ضیاء القرآن)

لفظِ خاتَم کا ایک معنیٰ مُہر کا بھی ہے۔ جب کسی دستاویز پر مہر لگا دی جائے تو وہ مکمل ہو جاتی ہے اور اس میں مزید کوئی اضافہ نہیں ہوسکتا۔ تعلیم الٰہی دائمی ہے اور دائمی رہے گی اور محمد ﷺ کے بعد کسی بھی نبی یا رسول نے نہیں آنا۔ بعد کے زمانوں میں مفکرین اور مصلحین کی ضرورت تو ہوگی لیکن رسولوں اور پیغمبروں کی نہیں۔ آپ کے آخرالانبیاء ہونے کا علم آپؐ کی متعدد احادیثِ مبارکہ سے بھی صاف اور واضح الفاظ میں ہوا ہے۔ مثلاً فرمایا:

''نبوت کی عمارت کی تکمیل میرے آنے سے ہوگئی اور میرے آنے سے سلسلہِ رسالت ختم ہوگیا۔''
(صحیح بخاری، صحیح مسلم)

(3) نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام اپنے خالق کی طرف سے جو دین اور قانون لائے وہ ہر لحاظ سے مکمل ہے۔ یہ آپ کی رسالت کی ایک اور بلا شرکتِ غیرے (Exclusive) امتیازی خصوصیت ہے۔ کوئی شک نہیں کہ ہر دینِ الٰہی کو اللہ ہی نے بھیجا لیکن وہ خود سورۃ المائدۃ میں یہ اعلان فرماتا ہے:

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا (المائدۃ:۳)

''آج میں نے تمہارے لئے دین کو کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی ☆ اور تمہارے لئے اسلام کو بہ طورِ دین کے پسند کر لیا۔'' (۳ : ۵)

''یہ امتیاز صرف اسلام کے لئے مخصوص ہے۔ تاہم اس کا یہ مطلب نہیں کہ دوسرے الہامی مذاہب کو نامکمل سمجھا جائے یا یہ سمجھا جائے کہ وہ لوگوں کو مناسب راہ نمائی مہیا کرنے کے قابل نہ تھے۔ بلکہ وہ تمام مذاہب اُس سماج' وقت اور ملک کی بہبود و فلاح اور راہ نمائی کے لئے کافی تھے جن کی طرف وہ بھیجے گئے۔ کیونکہ ہر مذہب ایک خاص

☆ اِکمال کا معنیٰ اس طرح پورا کرنا کہ اب اُس میں نہ زیادتی ہو سکے اور نہ کمی۔ اکمال کے ساتھ دین کا ذکر ہوا اور اکمالِ دین سے مراد یہی ہے کہ اسلام کے اصول و قوانین میں زیادتی یا کمی ناممکن ہے۔ نمازیں نہ چھ ہوسکیں گی اور نہ چار۔ روزے نہ ڈیڑھ ماہ کے فرض ہوں گے نہ پون مہینہ کے۔

اِتمام کا معنیٰ کسی چیز کو اس طرح پورا کرنا کہ اس میں زیادتی تو ہو سکے لیکن کمی نہ ہو سکے۔ اِتمام کے ساتھ نعمت کا ذکر ہوا اور اتمام نعمت سے مراد دین کے فروعی مسائل ہیں جن کی کوئی حد نہیں۔ وہ ہمیشہ بڑھتے رہیں گے' نئی نئی ضرورتیں پیش آتی رہیں گی اور مسائل کا استنباط ہوتا رہے گا۔ ریڈیو' لاؤڈ سپیکر سے آیت سجدہ سنی جائے تو سننے والے پر سجدہِ تلاوت واجب ہے کہ نہیں۔ یہ وہ مسئلہ ہے جو اِن سائنسی آلات کی ایجاد سے پہلے پیش نہیں آیا تھا مگر شرعی قاعدے ایسے مقرر ہیں کہ یہ احکام اُن سے نکل سکتے ہیں۔ اسی طرح ہوائی سفر میں' چلتی ریل گاڑی میں نماز کا حکم شرعی قواعد سے نکالا جاتا ہے۔

سماج، ملک اور وقت کے لئے بھیجا گیا نہ کہ تمام لوگوں اور تمام زمانوں کے لئے۔ اُن میں کسی مذہب میں بھی دنیاوی معاملات کے متعلق ہدایات نہیں تھیں اور نہ ہی اُن میں کوئی آفاقی پہلو تھا۔ اُن میں سے کسی بھی مذہب نے مستقبل کے مسائل کو نہیں چھیڑا۔ چونکہ اُن مذاہب کا مشن ایک خاص سماج تک محدود تھا' اس لئے اُن کا ضابطہ تعلیم بھی مختصر اور محدود تھا۔ جب حکمِ الٰہی یہ ہوا کہ دنیا کی طرف ایسا پیغمبر بھیجا جائے جو تمام نوعِ انسانی کے لئے اور دائمی ہو تو یہ فیصلہ کرنا قدرتی امر تھا کہ ایسے پیغمبر کا دین بھی آفاقی کردار کا ہو اور اُس کی تعلیمات بھی تمام زمانوں' تمام ملکوں اور تمام قسم کے انسانی مسائل کو محیط ہوں۔ سورۃ المائدۃ کی مذکورہ بالا آیت (۳) اسی حقیقت کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ اس اعلان کا مقصد یہی تھا کہ وہ الٰہی راہ نمائی جس کا آغاز سیدنا آدم علیہ السلام کے زمانہ سے ہوا اور جو انسانیت کی ذہنی اور ثقافتی ترقی کے ساتھ ساتھ تفصیل اور گہرائی کے حصول میں جاری رہی' اُس دن مکمل ہو گئی۔''

(4) ''نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی رسالت کی چوتھی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ آپ کو دی گئی کتاب یعنی قرآنِ حکیم کا ہر لفظ ہر قسم کی دستبرد سے محفوظ ہے اور ابدالآباد تک محفوظ رہے گا۔ لفظ تو دور کی بات ہے' اُس میں ایک زبر یا زیر یا ایک پیش تک کی تبدیلی نہیں ہوئی اس لئے کہ ربِّ ہر جہاں کا وعدہ ہے:

(۱) اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّكۡرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوۡنَ O (الحجر: ۹)

''بے شک ہم نے ہی اس ذکرِ حکیم کو اتارا اور یقیناً ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔'' (۱۵:۹)

(۲) وَاِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِيۡزٌ O لَّا يَاۡتِيۡهِ الۡبَاطِلُ مِنۡۢ بَيۡنِ يَدَيۡهِ وَلَا مِنۡ خَلۡفِهٖ (حٰمٓ السجدۃ: ۴۱'۴۲)

''سو وہ بڑی معزز کتاب ہے' اُس میں نہ باطل آگے سے آ سکتا ہے اور نہ پیچھے سے۔'' (۴۱'۴۲:۴۱)

''بعض علمائے راسخین نے یہیں سے یہ نکتہ بھی نکالا ہے کہ اس طرح قرآن سے تمسک کرنے والے بھی باطل سے محفوظ و مامون رہتے ہیں۔'' (تفسیر ماجدی اردو' صفحہ ۹۶۱' نوٹ: ۴۱)

''یہ دعویٰ کہ قرآنِ حکیم ہر قسم کی تحریف اور تغیر و تبدل سے محفوظ ہے' محض اندھے عقیدے کی عجیب الخلقت پیداوار نہیں بلکہ اُسے تاریخ کی تائید حاصل ہے۔ قرآنِ حکیم کے مقابلے میں دنیا کی کوئی اور ایسی کتاب نہیں جسے یہ اختصاص حاصل ہو اور جو من و عن اُسی زبان اور الفاظ میں موجود ہو جس میں وہ ابتداءً وقت کے پیغمبر کے پاس آئی اور جس کی زبان آج کے اس ترقی یافتہ دور میں بھی حیات آفریں اور جاں بخش ہو۔ اُن تمام الہامی کتابوں کی صورت یہ ہے کہ آج اُن کا کوئی ایک حصہ بھی اپنی اصل حالت میں موجود نہیں اور اگر کوئی کتاب موجود ہے تو اُس میں تغیر و تبدل ہو چکا ہے۔ اُس کے پیروکاروں نے اُس کی زبان بدل دی ہے اور اُس کی تعلیمات کا بڑا حصہ نسیاً منسیا ہو چکا ہے۔ اِس صورتِ حال کے متعلق قرآنِ حکیم فرماتا ہے:

يُحَرِّفُوۡنَ الۡـكَلِمَ عَنۡ مَّوَاضِعِهٖ ۙ وَنَسُوۡا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوۡا بِهٖ (المائدۃ: ۱۳)

''وہ کلام کو اُس کے موقع و محل سے بدل دیتے ہیں اور جو کچھ اُنہیں نصیحت کی گئی تھی'
اُس کا ایک (بڑا) حصہ وہ بھلا بیٹھے ہیں۔'' (۵ : ۱۳)

("Islam at a Glance"... S.D. Islahi, pp. 166-178)

ان مذکورہ بالا حقائق پر مبنی واضح بیانات کے مدِ نظر صحیح فہم اور معقولیت کا تقاضا ہے کہ صرف اسلام ہی اتباع اور پیروی کئے جانے کے قابل ہے اور اس سلسلہ میں درج ذیل خدائی فیصلہ واضح اور غیر متنازعہ ہے:

وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ O (آلِ عمران:۸۵)

"اور جو کوئی دینِ اسلام کے سوا کسی اور دین کو تلاش کرے، تو وہ اُس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا اور وہ شخص آخرت میں تباہ کاروں میں سے ہوگا۔" (۸۵ : ۳)

مسلمانوں اور عیسائیوں میں فرق: مسلمانوں اور عیسائیوں میں دو بڑے فرق موجود ہیں اور دونوں کا تعلق ایمان وعقیدے سے ہے۔ مسلمانوں اور عیسائیوں میں بنیادی فرق "تثلیث کے اندر وحدت" کا عقیدہ ہے۔ مسلمانوں کا عقیدہ یہ ہے کہ تمام مخلوقات کا خالق یعنی اللہ تعالیٰ لازمی طور پر ایک اور صرف ایک ہے اور اُس کا کوئی شریک ومشیر نہیں۔ وہ قادرِ مطلق، قائم ودائم، حی وقیوم اور کائنات کا محافظ ہے جبکہ عیسائی عقیدے کے مطابق الٰہ (خدا) تین ہیں یعنی ایک تو بذاتِ خود اللہ جو قادرِ مطلق اور بڑا زبردست ہے۔ دوم اُس اللہ کا بیٹا یعنی عیسیٰ ابن مریم علیہما السلام اور تیسرا اسقف اعظم (Holy Ghost)۔ اُن کا یہ عقیدہ ہے کہ اِن تین خداؤں کو اکٹھا جوڑنے سے وہ ایک بن جاتے ہیں یعنی ایک میں تین اور تین میں ایک، جو ایک عام شخص کے لئے بھی پہیلی دار اور ناقابلِ فہم ہے۔ اُن کا یہ بھی کہنا ہے کہ یہودیوں نے تین میں سے دوسرے خدا یعنی عیسیٰ ابن مریم کو سولی پر چڑھا دیا اور اُنہیں ذلت آمیز طریق سے قتل کر دیا۔ سورۃ النساء میں اُن کے اس بے بنیاد عقیدے کی پُر زور طور پر تغلیط کی گئی اور فرمایا گیا:

وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا O بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا O

(النساء:۱۵۷ تا ۱۵۸)

"نہ اُنہوں نے آپ کو قتل کیا اور نہ آپ کو سولی پر چڑھا پائے بلکہ اُن پر شبہ ڈال دیا گیا اور یہ لوگ آپ کے بارہ میں اختلاف کر رہے ہیں، وہ آپ کی طرف سے شک میں پڑے ہوئے ہیں۔ اُن کے پاس کوئی علم (صحیح) تو ہے نہیں، ہاں بس گمان کی پیروی ہے اور یقینی بات ہے کہ اُنہوں نے آپ کو قتل نہیں کیا بلکہ آپ کو اللہ نے اپنی طرف اٹھا لیا اور اللہ بڑی قوت والا، بڑی حکمت والا ہے۔" (۱۵۷، ۱۵۸:۴)

عیسائی عقیدے کے مطابق اللہ (معاذ اللہ) نہ تو قادرِ مطلق ہے اور نہ ہی حی وقیوم (خود زندہ اور دوسروں کو زندگی دینے والا) ہے۔ اتنا بے بس اور مجبور ہوتے ہوئے وہ اپنے آپ کو بھی اپنی مخلوقات یعنی دشمن یہود سے نہ بچا سکا اور اس طرح اُس نے اپنی جان اُن کے ہاتھوں میں دے دی۔ لہٰذا جو خود دائم نہ ہو، وہ دوسروں کو مستقل وجود اور رزق بہم پہنچانے کے قابل نہیں ہوتا۔

مسلمانوں اور عیسائیوں کے مابین دوسرا فرق حضرت محمد ﷺ کے منصب رسالت کا ہے۔ مسلمانوں کے عقیدے کے مطابق محمد ﷺ بن عبداللہ بن عبدالمطلب اللہ کے سچے رسول اور پیغمبر ہیں جو قیامت تک کے تمام

انسانوں کی راہ نمائی اور بہتری کے لئے مبعوث کئے گئے اور آپ کا مشن دائم اور ہمیشہ باقی رہنے والا ہے۔ آپ اللہ کے آخری رسول (خاتم النبیّین) ہیں جن کے بعد کوئی نبی یا رسول نہیں آئے گا اور اس طرح آپ کی رسالت فیصلہ کن طور پر آخری اور حتمی ہے۔

بہت سے یہودی اور عیسائی نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اللہ کا رسول نہیں مانتے اور اگر وہ آپ کو پیغمبر مانتے بھی ہیں تو آپ کی رسالت کو صرف ملکِ عرب تک محدود مانتے ہیں نہ کہ تمام دنیا کے لئے۔ لیکن اُن کا یہ اِصرار غیر معقول، بے وزن اور پھس پھسا (Untenable) ہے۔'' کیونکہ جب یہ لوگ آپ علیہ السلام کو پیغمبر مانتے ہیں خواہ اہلِ عرب کے لئے سہی' تو ظاہر ہے کہ یہ لوگ آپ کے آفاقی رسالت کے دعویٰ کو بھی اور آپ کے آخری پیغمبر ہونے میں بھی اپنے آپ کی تردید کررہے ہیں کیونکہ ایک سچا پیغمبر کسی چیز کے بارے میں اور بالخصوص اپنے الٰہی مشن کے بارے میں جھوٹ نہیں بول سکتا کہ جھوٹ بولنا پیغمبر کی شان اور منصب کے خلاف ہے۔ ان حقائق سے ثابت ہوا کہ آخرالانبیاء ﷺ کو تمام مخلوقات کے لئے بھیجا گیا☆۔''

جیسا کہ قبل ازیں بیان ہوا' نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایوان ہائے خسرو' قیصر اور دیگر غیر عرب ممالک کے حکمرانوں کو اسلام کی دعوت دیتے ہوئے اپنے قاصد مقرر کئے۔ اگر آپ کی رسالت کا مشن صرف ملکِ عرب تک محدود ہوتا تو آپ کبھی بھی اِن غیر ممالک کے سربراہوں کو اسلام کی دعوت دینے کے لئے نامہ ہائے مبارک نہ بھیجتے۔ اُن کے انکار کا نتیجہ ''جنگِ مقدس'' یعنی اُن سے جہاد پر ہوا' آپ نے میدانِ کارزار میں اُن پر فتح پائی اور اُنہیں بطور غلام اپنا اسیر بنا لیا اور ماتحتی میں آجانے کے بعد اُن پر ''جزیہ'' نامی ٹیکس لگا دیا۔ کیا یہ بات عجیب نہیں کہ ایک آدمی آپ کو رسول بھی مانے اور پھر آپ کے دعوائے رسالتِ آفاقی کا انکار بھی کرے۔ تصدیق اور انکار کا یکجا کرنا گویا دو متضاد چیزوں کا اکٹھا کرنا ہوتا ہے۔''

''بہت سے عیسائی فرقے محمد ﷺ کے دعوائے رسالت کو بالکل نہیں مانتے۔ مسلمانوں نے اہلِ کتاب یعنی یہود و نصاریٰ سے یہ مناسب سوال کیا کہ تم لوگ ابراہیم' اسحاق' یعقوب' یوسف' داؤد' موسیٰ اور عیسیٰ علیہم السلام کو

☆ وَهٰذَا كِتٰبٌ'' اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ'' مُّصَدِّقُ الَّذِیْ بَیْنَ یَدَیْهِ وَلِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰی وَمَنْ حَوْلَهَا (الانعام: ۹۲) ''اور یہی کتاب ہے کہ ہم نے اُسے نازل کیا ہے' اُس کی تصدیق کرنے والی ہے جو پہلے آچکی ہیں تاکہ آپ مکہ کے لوگوں کو اور اُس کے گردوالوں کو ڈرائیں۔'' (۹۲ : ۶) اُمَّ الْقُرٰی (جس کے لفظی معنی بستیوں کے مرکز کے ہیں) کا یہ نام کیوں پڑا؟ بعض نے کہا اس لئے کہ ساری اقلیموں کی پرورش کا سامان یہیں سے ہوتا ہے۔ بعض نے کہا کہ قدیم جغرافیہ کے لحاظ سے یہ زمین کے عین وسط میں واقع تھا۔ کسی نے کہا کہ اُس وقت حجاز خصوصاً اُس کا یہ شہر دنیا کی تہذیبوں کا سنگم تھا یعنی اُس کے ایک بازو میں مصری' رومی' یونانی تہذیب تھی اور دوسرے بازو میں کلدانی' ایرانی اور ہندی تمدّن۔ کسی نے کہا اس لئے کہ آج بھی دنیا کے تین بڑے بڑے اعظموں ایشیا' افریقہ' یورپ کا سرِ راہ عین ساحلِ حجاز ہے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ سب اسباب صحیح ہوں۔ وَمَنْ حَوْلَهَا جب مکہ معظمہ نافِ زمین یا مرکزِ بلاد قرار پایا تو اُس کے ہر طرف آبادی جہاں تک بھی پھیلی ہوگی' سب مَنْ حَوْلَهَا ہی کے تحت میں آئے گی یعنی جمیع الآفاق اس میں شامل ہیں (مدارک و بیضاوی)۔

اللہ کے رسول اور اُس کے معتبر پیغام مانتے ہو تو اُن کے رسول یا پیغمبر ہونے کی تائید میں تمہارے پاس کیا ثبوت ہے؟ کسی بھی پیغمبر کی رسالت کے لئے تم کوئی بھی معیار مقرر کرو تو اُسی معیار اور اصول کا اطلاق برابر طور پر محمد ﷺ کی رسالت پر بھی ہوگا۔ اگر وہ لوگ مذکورہ بالا کسی بھی پیغمبر کی نبوت کے لئے کوئی دلیل لائیں تو ہم اپنے پیغمبر علیہ السلام کی رسالت پر کم از کم دس ایسے دلائل لا سکتے ہیں۔ مثلاً :

(i) ''اگر تورات کے نزول کو موسیٰ علیہ السلام' زبور کو داؤد علیہ السلام اور انجیل کو عیسیٰ علیہ السلام کی رسالت کے ثبوت کے لئے بطور ثبوت پیش کیا جائے تو ہم یہ کہیں گے کہ قرآن کے نزول کو جو ہر لحاظ سے اپنی عمدگی میں تورات اور انجیل پر فائق ہے اور جو ہر طرح مکمل' فصیح اور ہر چیز کو محیط اپنی اصلی شکل میں موجود ہے اور جس میں کوئی بھی خارجی چیز شامل نہیں ہوئی' محمد ﷺ کی رسالت و نبوت کے ثبوت کے لئے ایک مُسکت دلیل کیوں نہ مانا جائے؟''

(ii) ''اگر انبیائے سابقہ کے معجزات اُن کے منصبِ نبوّت کا ثبوت تھے تو ہمارے نبیِ اکرم ﷺ کے معجزات بہ حیثیتِ مجموعی بہ لحاظ مقدار اور خصوصیت دیگر انبیاء علیہم السلام کے معجزات سے کہیں بڑھ کر ہیں۔ یہود اور نصاریٰ کے پاس کسی بھی ایسے معجزے کا ثبوت نہیں جس کا وہ ذکر کرتے ہیں۔ اس کے برعکس کوئی بھی شخص ہمارے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے فرمودات کتبِ حدیث اور وقائع نگاروں کی روئدادوں میں مستند راویوں سے تصدیق شدہ حالت میں پاتا ہے۔ علاوہ ازیں یہود و نصاریٰ کو اپنے متعلقہ رسول کا کوئی ایک ایسا فرمان مہیا کرنے کی دعوت دی جاتی ہے جسے مستند راویوں نے روایت کیا ہو۔''

(iii) ''کتبِ حدیث کی طرف ذرا دیکھئے' نبی علیہ السلام کی کتابِ زندگی کے ہر صفحے کا ہر لمحہ اور ثانیہ بڑے واضح اور نمایاں طور پر محفوظ کرلیا گیا ہے جسے سینکڑوں سلسلہ ہائے شہادت کی تائید حاصل ہے۔ احادیثِ نبویہ کے ایسے مستند ثبوت دوسرے مذاہب بہ شمول یہودیت اور عیسائیت میں نہیں پائے جاتے۔ یہ روایتی بیان اور استناد صرف قرآنِ حکیم' ہمارے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام اور آپ کے پیروکاروں کے ساتھ خاص ہے۔''

(iv) ''اگر کوئی شخص موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام کے قانونِ شریعت کا مقابلہ و موازنہ ہمارے نبی علیہ السلام کی شریعت سے کرنا چاہے تو وہ مؤخر الذکر کو اول الذکر سے کہیں زیادہ جامع اور فائق تر پائے گا کیونکہ آپ کی شریعت انفرادی اخلاقیات' دعا و مناجات' حیات بعد الممات' سماجی اخلاقیات' سیاسیات' اقتصادیات' تہذیب و ثقافت غرضیکہ ہر چیز کو شامل ہے۔''

(v) ''ہمارے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے کسی استاد سے نہیں پڑھا یا سیکھا' نہ ہی کتب آپ کے زیرِ مطالعہ رہیں' نہ ہی آپ نے حصولِ علم کے لئے کسی غیر ملک کا سفر کیا' پھر بھی آپ نے دنیا کو جامع اور مکمل قانون عطا کیا جس کی باریکیوں کو سمجھنے کے لئے بڑے بڑے علماء و فضلاء نے اپنی زندگیاں وقف کر دیں۔ اور یہ حقیقت اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ یہ معجزانہ علم سب من جانب اللہ تھا۔''

(vi) ''اور اگر کوئی شخص ہمارے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے صحابہ کرام کا موازنہ دوسرے پیغمبروں کے اصحاب سے کرنا چاہے تو یہ کام بھی بڑی کامیابی کے ساتھ ہمارے نبی کے صحابہ کے حق میں ہوسکتا ہے۔ جب موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل سے جہاد کی تیاری کے لئے کہا تو اُنہوں نے بہ بانگ دہل اس کا انکار کرتے ہوئے کہا:

فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا اِنَّا هٰهُنَا قَاعِدُوْنَ O (المائدة : ۲۴)

''سو آپ خود اور آپ کا خداوند چلے جائیں اور آپ دونوں لڑ بھڑ لیں، ہم تو یہیں بیٹھے رہیں گے۔'' (۵ : ۲۴)

''اور عیسائی روایات کے مطابق یہودیوں نے عیسیٰ علیہ السلام کو گرفتار کیا تو آپ کے تمام حواری بھاگ گئے اور کوئی بھی آپ کے ساتھ نہ رہا اور عیسائی عقیدے کے مطابق یہودا نے اپنے آقا سے تیس حقیر سکّوں کے عوض بے وفائی کی اور اپنے آقا کو گرفتار کرا لیا۔''

''اس کے برعکس ہمارے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے صحابہ کرام کی غیر متزلزل وفاداری اور بہادری چار دانگ عالم میں مشہور ہے۔ اِن صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اپنے پیغمبر کی خاطر ایسی مالی اور جسمانی قربانیاں دیں جس کی مثال انبیائے سابقہ کی کسی بھی قوم میں نہیں ملتی۔ پھر آپ کے خلفائے راشدین کی طرف نظر پھیریئے جنہوں نے مختصر سے عرصہ میں دنیا میں اسلامی قانون کا نفاذ و استحکام کر دیا۔''

''ہمارے پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نبوت و رسالت کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ تمام انبیائے سابقہ آپ ﷺ کی آمد کا مژدہ اپنی اپنی قوم کو سناتے آئے ہیں، ایسی اعلیٰ وارفع عظمت و توقیر والا پیغمبر جواز روئے قرآن ذیل کی خوبیوں کا حامل ہوگا:

(i) اَلرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰةِ وَالْاِنْجِيْلِ (الاعراف:۱۵۷)

''وہ نبی اُمّی جسے وہ اپنے ہاں لکھا ہوا پاتے ہیں تورات اور انجیل میں۔'' (۷ : ۱۵۷)

(ii) اَوَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ اٰيَةً اَنْ يَّعْلَمَهٗ عُلَمٰٓؤُا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ O (الشُّعراء : ۱۹۷)

''کیا ان لوگوں کے لئے یہ (کافی) دلیل نہیں کہ اُسے علمائے بنی اسرائیل جانتے ہیں؟'' (۲۶:۱۹۷)

قرآنِ حکیم میں بہت سی آیات ایسی ہیں جو یہ بتاتی ہیں کہ سابقہ انبیاء علیہم السلام نے نبی علیہ السلام کی آمد کی پیش گوئی کر دی تھی۔ اہلِ کتاب یعنی یہود و نصاریٰ بھی اس بات کو جانتے تھے لیکن اس کے باوجود وہ آپ کی حیات ہی میں آپ کے دشمن ہو گئے جبکہ آپ کی آمد سے پہلے وہ ایسی باتوں کا ذکر کیا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ اہلِ مکّہ میں سے آخرالانبیاء ﷺ کی آمد کا وقت آ پہنچا ہے۔''

''علمائے یہود و نصاریٰ نبی اکرم ﷺ کی آمد کے منتظر تھے۔ اُن میں پڑھے لکھے اور معقول لوگ جو مخلص،

سلیم الفطرت اور حسن نیت کے مالک تھے' فوراً آپ کی رسالت پر ایمان لے آئے جیسے یہود کے بہت بڑے عالم عبداللہ بن سلام اور ان جیسے دیگر لوگ۔ جبکہ دوسرے لوگوں نے یہ اچھی طرح جانتے ہوئے کہ آپ ﷺ اللہ کے سچے رسول ہیں' از راہِ حسد و عناد آپ کو جھٹلانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی جیسا کہ قرآن فرماتا ہے:

(i) وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ○ بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖ اَنْفُسَهُمْ اَنْ يَّكْفُرُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بَغْيًا اَنْ يُّنَزِّلَ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ○ (البقرۃ: ۸۹' ۹۰)

"اور جب اُن کے پاس ایک کتاب اللہ کے پاس سے پہنچ گئی تصدیق کرنے والی اُس کی جو اُن کے پاس (پہلے سے) موجود ہے اور اس سے قبل وہ (خود ہی) کافروں سے بیان کیا کرتے تھے۔ پھر جب وہ اُن کے پاس آ گیا جسے وہ (خوب) پہچانتے تھے تو اسی سے کفر کر بیٹھے' سو کافروں پر اللہ کی لعنت ہو۔ بُری ہے وہ چیز جس کے عوض میں اُنہوں نے اپنی جانوں کو بیچ ڈالا ہے کہ اس (کلام) کا انکار کرتے ہیں جو اللہ نے اپنے بندے پر نازل کیا ہے (محض) اِس ضد پر کہ اللہ نے اپنے بندوں میں سے جس پر چاہا اپنا فضل (خاص) نازل کیا' سو وہ غضب بالائے غضب کے مستحق ہو گئے اور کافروں کے لئے ذلّت والا عذاب ہے۔" (۲ : ۸۹'۹۰)

(ii) اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ○ (البقرۃ: ۱۴۶)

"جن لوگوں کو ہم کتاب دے چکے ہیں' وہ آپ کو اس طرح پہچانتے ہیں جیسا کہ اپنی نسل والوں کو پہچانتے ہیں اور بے شک اُن میں سے کچھ لوگ حق کو جانتے بوجھتے ہوئے خوب چھپاتے ہیں۔" (۲:۱۴۶)

"تورات اور انجیل ہمارے پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کی آمد سے متعلق واضح پیش گوئیوں سے پُر تھیں لیکن یہود و نصاریٰ نے تقریباً اُن سب میں تحریف کر کے اُن کی اصلیت کو مسخ کر دیا اور جن میں وہ تغیر و تبدل نہ کر سکے' اُس کی تعبیر و تاویل اُنہوں نے غلط رنگ میں کی۔ جس طرح بے قدرے یہودیوں نے عیسیٰ علیہ السلام سے متعلق پیش گوئیوں کو بگاڑا اور اُن کی غلط تاویل کی' اسی طرح دنیائے عیسائیت نے ہمارے محمد ﷺ کی آمد سے متعلق پیش گوئیوں کے ساتھ کیا۔"

"اس طرح دنیائے عیسائیت کا یہ انکار کہ انجیل میں نبی آخر الزماں ﷺ کی آمد یا پیش گوئی کا کوئی ذکر نہیں' معقولیت اور اعتدال سے متجاوز اور اصل حقائق سے اُسی طرح بے جوڑ ہے جس طرح یہود کا رویہ عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ہے۔ جہاں دنیائے عیسائیت کے علماء و فضلاء کی طرف سے یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ انبیائے سابقہ نے عیسیٰ علیہ السلام کی آمد سے متعلق بہت سی پیش گوئیاں کی ہیں تو ہم کہتے ہیں کہ تورات و انجیل (Gospel) ☆ دونوں میں ہمارے

☆ (Gospel) کا معنیٰ خوشخبری کا ہے اور یہ نام اس لئے ہے کہ اس میں آخر الانبیاء ﷺ کی آمد کی خوشخبری ہے۔ ایسی خوشخبریاں عیسیٰ علیہ السلام کی تمثیلی زبان میں متعدد ہیں۔

محمد ﷺ کی آمد کی نہایت واضح الفاظ میں پیش گوئیاں ہیں۔'' (''بشائر النبیہ'' از مولانا محمد ادریس کاندھلوی انگریزی ترجمہ' صفحات iv تا ix)

سورۃ الصّف کی آیت ۵ میں بھی عیسیٰ علیہ السلام کی زبانی آخرالانبیاء احمد ﷺ نامی رسول کی آمد کی پیش گوئی کی گئی ہے۔

ورقہ بن نوفل ☆ وہ شخص تھے جو قبل از اسلام کے عرب دَور میں بت پرستی سے دستبردار ہو گئے تھے۔ وہ ابراہیم علیہ السلام کے دینِ حنیف کی تلاش میں تھے اور اُنہیں کتب وصحائفِ آسمانی کا مطالعہ حاصل تھا۔ بعد میں اُنہوں نے عیسائیت قبول کر لی اور اُنہوں نے اپنے ذاتی استعمال کے لئے بائبل کے کچھ اجزاء کو نقل کر کے اُن کا ترجمہ کیا۔ حضرت محمد ﷺ کی بعثت کے آغاز میں ورقہ عمر رسیدہ اور نابینا ہو گئے تھے۔ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام پر پہلی نزولِ وحی کے وقت سیّدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا نے اپنے چچازاد بھائی ورقہ بن نوفل سے اس کا ذکر کیا جنہوں نے محمد ﷺ کی ذاتِ اقدس میں رسولِ موعود کو پہچان لیا۔'' (سیرت ابن ہشام طبع مصر ۱۳۵۵/۱۹۳۷؛ صحیح بخاری: باب التعبیر؛ الاصابہ لابن حجر عسقلانی' جلد ششم (طبع قاہرہ ۱۳۲۵)؛ طبقات ابن سعد' جلد اوّل (طبع لیڈن ۱۹۰۵)؛ کتاب الاغانی لابی الفرج اصفہانی' جلد سوم ؛ اسد الغابہ لابن الاثیر' جلد پنجم بحوالہ ''محمد دی اُمّی نبی'' از ڈاکٹر یوسف عباس ہاشمی' صفحہ ۱۶۲)

''جب مغرب کے مسلمانوں نے احادیث اور سیرت لٹریچر میں ان حقائق کا مطالعہ کیا تو اُنہیں ایک انتہائی الجھے ہوئے مسئلہ کا سامنا کرنا پڑا۔ اگر تو وہ احادیث اور سیرت کے بیانات کو خود اختراعی نہ سمجھتے تو یہ بات محمد ﷺ کے مشن کی صداقت کی دلیل تھی اور اگر وہ اُنہیں خود اختراعی سمجھتے تو یہ بات بیچارے ورقہ کو ''مذہبی مفکر''۔ ''حق کا متلاشی'' اور ''محمد ﷺ کا محسن'' ہونے کے کے اعزاز سے محروم کر دیتی اور وہ ایسے خطرے کو مول لینے کے لئے تیار نہ تھے۔''

''اُن کی پریشانی قابلِ فہم ہے۔ ورقہ جیسے حنیف اور حقیقت پسند شخص کی طرف سے محمد ﷺ کو رسول اللہ تسلیم کرنا اُن کے لئے موجبِ پریشانی تھا کیونکہ ایسی صورت میں ورقہ کی گواہی کی روشنی میں مسلمانوں کو رسالت کے ثبوت کی تائید حاصل ہو گئی۔ اس کے برعکس اگر انہوں نے ورقہ کے واقعہ کو خالصتاً افسانہ اور من گھڑت قصہ قرار دیا (جیسا کہ سپرینگر نے اپنی کتاب کی پہلی جلد میں ۱۸ صفحات پر مشتمل بیان میں کیا ہے) تو یہ اُن کی طرف سے اپنے ہم مذہب بھائی کو رسوا کرنا تھا۔ ورقہ بن نوفل کی وفات اسلام پر ہوئی۔'' ("Muhammad the Ummi Nabi"
... Prof. Dr. Yusuf Abbas Hashmi, pp. 155-156)

☆ سر ولیم میور ورقہ بن نوفل کے بارے میں رقمطراز ہے: ''معلوم ہوتا ہے کہ اس شخص کا محمد (ﷺ) کی ذہنی تسلی وتشفی کرانے میں بڑا حصّہ تھا کہ اُن کا مشن منجانب اللہ ہے۔'' (لائف آف محمد' صفحہ ۳۶) اور ''جس نے (یعنی ورقہ بن نوفل نے) اُن کی تعلیمات کو اپنے خیالات کے مثیل اور جزو لازم (Counterpart) پایا۔''

''ہمارے نبی ﷺ کی پیش گوئی کئی طریق سے کی گئی۔ اپنی آمد پر آپ نے اپنی رسالت کے متعدد واضح نشانات دکھائے کیونکہ آپ کی حیاتِ طیبہ اوّل سے آخر تک تمام کی تمام ایک کھلا معجزہ ہے۔ آپ باطل کے خلاف برسرِ پیکار ہوئے اور مشکلات پر فتح پائی۔ باوجود اس کے کہ آپ اُمّی تھے اور کسی کے آگے زانوئے تلمذ تہ نہیں کیا' آپ نے انتہائی اعلیٰ وارفع حکمت کی تعلیم دی۔ آپ نے پتھر دلوں کو موم کر دیا اور نرم دلوں کو جنہیں نصرت وامداد کی ضرورت تھی' قوّت بخشی۔ آپ کے تمام اقوال وافعال میں اصحابِ بصیرت دستِ الٰہی کی کارفرمائی کو دیکھ سکتے ہیں۔ اس کے باوجود جاہل ونادان کافروں نے اسے جادوگری کہا اور اُس حقیقت کو غیر حقیقت کا نام دیا جو تاریخِ انسانی کا ایک ٹھوس حقیقت بن گئی۔'' (عبداللہ یوسف علی' نوٹ: ۵۴۳۹)

دینِ اسلام کی دنیاوی برکتیں

''مادّی خوشحالی اور رسالت کا مشن: قرآن کی تعلیمات سے واضح ہے کہ اسلام صرف اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر جینے اور مرنے کا نام ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہوا:

قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ O (الانعام: ۱۶۲)

''(اے رسولِ مکرّم!) فرما دیجئے کہ بے شک میری نماز' میری (ساری) عبادتیں' میری زندگی اور میری موت (سب) جہانوں کے پروردگار اللہ ہی کے لئے ہیں۔'' (۶: ۱۶۲)

''سچے اللہ کے حضور یہ مکمل خود سپردگی اسلام کا مغز اور خلاصہ ہے اور حتمی اور غیر مشروط توحید قرآنِ حکیم کا مرکزی اور سب سے اہم اصول ہے۔ یہ اصول اس بات پر زور دیتا ہے کہ مسلمان تو وہ ہے جو اپنی نگاہیں آخرت کی زندگی پر رکھتا ہے اور کسی بھی قیمت پر دنیاوی مفادات کو آخرت پر ترجیح نہیں دیتا۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب ایک مسلمان اپنے سراپا کو مکمل طور پر اپنے خالق کے سپرد کر چکا ہے تو کیا وہ انفرادی طور پر خوشحال ہوگا اور سماج کے طور پر اُسے عزت وقوّت حاصل ہوگی؟ یہ ایک عام سا سوال ہے اور اسے اسلام کی صورت میں اٹھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس سوال کا اطلاق دیگر الٰہی مذاہب پر بھی ہوتا ہے کیونکہ حقیقتاً اسلام اور دیگر الہامی مذاہب کے مابین کوئی فرق نہیں۔ اسلام کی طرح ہر مذہب نے اس بات کا پرچار کیا کہ مذہبی زندگی کا مغز اور عباداتِ الٰہی کی صحیح روح اللہ کے حضور خود سپردگی اور آخرت کی زندگی کو دنیاوی زندگی پر ترجیح دینے کا نام ہے۔ اس لئے بہتر یہی ہے کہ قرآنی دعوت کی طرف رجوع کرنے سے پیشتر ہم اس سوال کا جواب دیگر مذاہب سے معلوم کریں۔''

''ہم دیکھتے ہیں کہ الٰہی مذہب کی طرف بلانے والے تمام رسولوں نے لوگوں کو یہ یقین دلایا کہ اُن کی اتباع اور پیروی کرنے سے وہ نہ صرف اُخروی مفادات حاصل کریں گے بلکہ اِس دنیا کی خیر وفلاح بھی اُنہیں حاصل ہوگی۔ نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو بتایا:

اِسْتَغْفِرُوْا رَبَّکُمْ اِنَّہٗ کَانَ غَفَّارًاO یُّرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَیْکُمْ مِّدْرَارًاO وَّیُمْدِدْکُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِیْنَ وَیَجْعَلْ لَّکُمْ جَنّٰتٍ وَّیَجْعَلْ لَّکُمْ اَنْھٰرًاO (نوح: ۱۰-۱۲)

''اپنے پروردگار سے مغفرت چاہو' بے شک وہ بڑا بخشنے والا ہے۔ وہ تم پر کثرت سے بارش بھیجے گا' اور تمہارے مال واولاد میں ترقی دے گا اور تمہارے لئے باغ لگا دے گا اور تمہارے لئے دریا بہا دے گا۔'' (۱۰۔۱۲ : ۷۱)

اور پیغمبر ہود علیہ السلام کی دعوت کا انداز اس طرح تھا:

وَيٰقَوۡمِ اسۡتَغۡفِرُوۡا رَبَّكُمۡ ثُمَّ تُوۡبُوۡۤا اِلَيۡهِ يُرۡسِلِ السَّمَآءَ عَلَيۡكُمۡ مِّدۡرَارًا وَّيَزِدۡكُمۡ قُوَّةً اِلٰى قُوَّتِكُمۡ وَلَا تَتَوَلَّوۡا مُجۡرِمِيۡنَ ○ (ھود : ۵۲)

''اور اے میری قوم! اپنے پروردگار سے اپنے گناہ معاف کراؤ پھر اُس کی طرف متوجہ رہو' وہ تم پر خوب بارشیں برسائے گا اور تمہیں (اور) قوت دے کر تمہاری قوت میں ترقی کر دے گا اور مجرم ہو کر روگردانی مت کرتے رہو۔'' (۵۲ : ۱۱)

''اس الٰہی وعدے کی تفصیل اور اس کی پوری شہادت اسرائیلی تاریخ میں دیکھی جا سکتی ہے جو موسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے کچھ پہلے شروع ہوتی ہے۔ اُس وقت سے لے کر ہمارے پیغمبر ﷺ کی آمد تک اُن کی زندگی انتہائی طور پر فلاکت زدہ اور نحوست زدہ تھی۔ لیکن یہ ابتری اُس وقت خوشتری میں بدل گئی جب وہ اپنے خالق کی طرف مائل ہوئے اور اُس کے بھیجے ہوئے دین میں مستقل مزاجی دکھائی۔ قرآنِ حکیم نقاب کشائی کرتا ہے:

وَتَمَّتۡ كَلِمَتُ رَبِّكَ الۡحُسۡنٰى عَلٰى بَنِىۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ بِمَا صَبَرُوۡا (الاعراف : ۱۳۷)

''اور آپ کے رب کا نیک وعدہ بنی اسرائیل کے حق میں اُن کے صبر کی بناء پر پورا ہو کر رہا۔'' (۷:۱۳۷)

''اللہ تعالیٰ کی طرف مائل ہونے اور صراطِ مستقیم پر مستقل مزاجی کے باعث نہ صرف اُن کی مفلوک الحالی خوشحالی میں تبدیل ہو گئی بلکہ اُنہیں یہ یقین دلایا گیا کہ وہ اللہ کا جتنا زیادہ شکر ادا کریں گے اور اُس کے احکام کی جتنی زیادہ پابندی کریں گے' اُنہیں الٰہی نوازشات سے اُتنا ہی نوازا جائے گا جیسا کہ ارشادِ پاک ہوا:

وَاِذۡ تَاَذَّنَ رَبُّكُمۡ لَئِنۡ شَكَرۡتُمۡ لَاَزِيۡدَنَّكُمۡ وَلَئِنۡ كَفَرۡتُمۡ اِنَّ عَذَابِىۡ لَشَدِيۡدٌ'' ○ (ابراھیم : ۷)

''اور (وہ وقت یاد کرو) جب تمہارے رب نے تمہیں اطلاع دے دی تھی کہ اگر تم شکر کرو گے تو تمہیں ضرور بالضرور زیادہ دوں گا اور اگر تم ناشکری کرو گے تو بے شک میرا عذاب بڑا سخت ہے۔'' (۷ : ۱۴)

شکر کی حقیقت یہ ہے کہ اپنے منعم کے انعام کا اعتراف کیا جائے اور پھر اُس انعام کو اپنے منعم کی نافرمانی میں صَرف نہ کیا جائے۔ عارفوں کا قول ہے کہ اَلشُّکۡرُ قَیۡد'' لِلۡمَوۡجُوۡدِ وَصَیۡد'' لِلۡمَفۡقُوۡدِ یعنی شکر سابقہ انعامات کی زنجیر ہے اور مزید انعامات کا صیّاد ہے۔ جناب داؤد علیہ السلام نے عرض کی: یا اللہ! میں تیرا شکر کیسے ادا کر سکتا ہوں کیونکہ توفیقِ شکر بھی تیری ایک نعمت ہے۔ رب تعالیٰ نے اس کے جواب میں فرمایا: اے داؤد! جب تو نے اس حقیقت کو پالیا تو اَب تو نے میرا شکر ادا کر لیا۔

''جب تک بنی اسرائیل اللہ تعالیٰ کے شکر گزار بندے رہے تو دنیا شاہد ہے کہ وعدہ الٰہی اُن کے حق میں اس شاندار طریق سے پورا ہوتا رہا کہ اُنہوں نے قومی شان و شوکت کی اعلیٰ بلندیوں کو چھولیا اور دنیا کی کوئی اور قوم عزت و شان میں اُن کے مقابل نہ آسکی۔ اُن کی تاریخ کے اس سنہری باب کا حوالہ دیتے ہوئے سورۃ البقرۃ کی آیت ۴۷، ۱۲۲ میں ارشاد ہوا :

یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِیَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتُ عَلَیْكُمْ وَاَنِّیْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَی الْعٰلَمِیْنَO

''اے بنی اسرائیل! میرا وہ انعام یاد کرو جو میں نے تم پر کیا اور یہ کہ میں نے تمہیں دنیا جہان والوں پر فضیلت بخشی۔'' (۲ : ۴۷، ۱۲۲)

لیکن جب اُنہوں نے شکر گزاری، اطاعتِ الٰہی اور مذہب کی پابندی سے رُوگردانی کی تو اُنہیں اُن اعزازات سے محروم کر دیا گیا۔ اس لئے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اس دنیا میں تشریف آوری کے وقت اُنہیں بدحالی میں چھوڑ دیا گیا جس کی بابت قرآنِ حکیم نے یوں کہا ہے :

وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِیْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَیْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ (المائدۃ : ٦٦)

''اور اگر وہ تورات اور انجیل کی پابندی کرتے اور اُس کی جو اُن کے پروردگار کی طرف سے نازل ہوا ہے تو وہ لوگ اپنے اوپر سے (بھی) اور اپنے پیروں کے نیچے سے (بھی) ضرور کھاتے پیتے رہتے۔''

اس آیت سے یہ استنباط بھی کیا گیا ہے کہ اطاعت و عملِ صالح خوشحالی اور وسعتِ رزق کے موجبات میں سے ہیں۔

جو کچھ اوپر بیان ہوا، وہ کسی خاص قوم کی بابت تھا۔ اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ تمام اقوام کی بابت اعلانِ الٰہی کیا ہے۔ اس ضمن میں فرمایا گیا :

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓی اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَیْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنْ كَذَّبُوْا فَاَخَذْنٰهُمْ بِمَا كَانُوْا یَكْسِبُوْنَO (الاعراف : ۹٦)

''اور اگر بستیوں والے ایمان لے آئے ہوتے اور پرہیزگاری اختیار کی ہوتی تو ہم اُن پر آسمان اور زمین کی برکتیں ضرور کھول دیتے لیکن اُنہوں نے تو جھٹلایا، سو ہم نے اُن کے کرتوتوں کی پاداش میں اُنہیں پکڑ لیا۔'' (۷ : ۹٦)

''یہ اعلان اُن لوگوں کے لئے ہے جو ایمان کی راہ اور عبادتِ الٰہی سے منحرف ہو گئے تھے جس کی وجہ سے وہ اُس انعام کے مستحق نہ رہے جو اللہ نے اُن سے وعدہ کیا تھا لیکن جو لوگ نیکی کی راہ پر مستقل مزاجی سے گامزن رہے، اُن کے بارے میں خدائی فیصلہ اس آیت میں بیان ہوا ہے :

فَاٰتٰىهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنْیَا وَحُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ وَاللّٰهُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَO (آلِ عمران : ۱۴۸)

''سو اللہ نے اُنہیں دنیا کا عوض بھی دیا اور آخرت کا بھی عمدہ عوض دیا اور اللہ نیکوکاروں سے محبت رکھتا ہے۔''

''نبی اکرم ﷺ کے مشن کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ وہ اس غیر متبدّل اصول اور الٰہی فیصلہ کی مظہر ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت وفرمانبرداری کے عوض وہ نہ صرف آخرت میں خوشحالی عطا فرمائے گا بلکہ اِس دنیا میں بھی اُن پر کثرتِ رزق، عزت اور قوت کی فراوانی کرے گا۔ یہ توضیحات اس بات کا بھی مظہر ہیں کہ جب بھی کسی قوم نے اطاعت وانقیادِ الٰہی کی راہ اپنائی تو الٰہی وعدہ پورا ہو کے رہا۔ نہ صرف اُن کی آخرت کی فلاح و بہبود کی یقین دہانی کرائی گئی بلکہ وہ اِس دنیا میں بھی خوب پھلے پھولے۔''

''اسلام دنیاوی زندگی کی فلاح و بہبود کی ضمانت دیتا ہے : اسلام اور اس کے پیروکاروں کی صورت میں خدائی فیصلہ میں تبدیلی نہیں آئی۔ دوسری امتوں کے ساتھ مادّی خوشحالی کا جو وعدہ کیا گیا تھا، وہی وعدہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی امت سے بھی کیا گیا۔ یہ وعدہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی مکی زندگی کی حوصلہ شکن حالت میں اور آپ کی مدنی زندگی میں پُر خطر حالات میں کیا گیا۔ یہ وعدہ اسلام قبول کرنے والوں اور قبول نہ کرنے والوں دونوں سے کیا گیا۔ جب اہلِ مکّہ کو اسلام کی دعوت دی گئی تو اُنہیں صاف الفاظ میں بتا دیا گیا:

وَأَنِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْا اِلَيْهِ يُمَتِّعْكُمْ مَّتَاعًا حَسَنًا اِلٰى اَجَلٍ مُّسَمًّى وَّيُؤْتِ كُلَّ ذِىْ فَضْلٍ فَضْلَه، وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنِّىْ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ كَبِيْرٍ ○ (ھود : ۳)

''اور یہ کہ تم اپنے پروردگار سے بخشش چاہو، پھر اُس کی طرف رُجوع کیے رہو، وہ تمہیں ایک وقتِ مقررہ تک خوش عیشی دے گا اور ہر زیادہ عمل کرنے والے کو اُس کا زیادہ (اجر) دے گا اور اگر تم روگردانی کرتے رہے تو مجھے تمہارے لئے ایک بڑے دن کے عذاب کا اندیشہ ہے۔'' (۱۱ : ۳)

نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اُنہیں اس طرح یقین دلایا :

''اگر تم نے میرے لائے ہوئے پیغام کو قبول کر لیا تو وہ تمہارے لئے اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی خوش نصیبی کا موجب ہوگا۔'' (سیرۃ ابن ہشام، جلد اوّل)

ایک اور موقع پر آپ ﷺ نے خوش نصیبی کے اس تصوّر کو اپنے چچا جنابِ ابو طالب کے آگے اس طرح تقویّت پہنچائی:

''میں قبیلہ قریش کو صرف ایک بات کی نصیحت کرتا ہوں۔ وہ ایسی چیز ہے جس سے تمام اہلِ عرب اُن کے مطیع ہو جائیں گے اور تمام غیر عرب اُنہیں خراجِ تحسین پیش کریں گے۔'' (مسند احمد، جلد اوّل)

اور قرآنِ حکیم نے اس طرح ضمانت دی ہے:

(i) وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ○ (آلِ عمران : ۱۳۹)

''اور ہمت نہ ہارو اور نہ غم کرو، تم ہی غالب رہو گے اگر تم مومن رہے۔'' (۳ :۱۳۹)

(ii) وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِى الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ

الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَ لَیُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِیْنَهُمُ الَّذِی ارْتَضٰی لَهُمْ وَ لَیُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا یَعْبُدُوْنَنِیْ لَا یُشْرِكُوْنَ بِیْ شَیْئًا (النور : ۵۵)

''تم میں سے جولوگ ایمان لائیں اور نیک عمل کریں' اُن سے اللہ وعدہ کرتا ہے کہ اُنہیں زمین میں حکومت عطا کرے گا جیسا کہ اُن سے پہلے لوگوں کو حکومت دے چکا ہے اور جس دین کو اُن کے لئے پسند کیا ہے اُسے اُن کے واسطہ سے قوّت دے گا اور اُن کے خوف کے بعد اُسے امن میں تبدیل کر دے گا (بشرطیکہ) میری عبادت کرتے رہیں اور کسی کو میرا شریک نہ بنائیں۔'' (۵۵ : ۲۴)

''ایمان اور اعمالِ صالحہ کی ان شرائط کی تکمیل پر یہ وعدہ ہائے الٰہی کیسے پورے ہوئے' ایک ایسی حقیقت ہے جسے دنیا اچھی طرح جانتی ہے۔ تاریخ کی یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اسلام نے مسلمانوں کو ہر وہ چیز عطا کی جس کی اُنہیں ضرورت تھی۔'' ("Islam at a Glance"... S.D. Islahi, pp. 217-220)

''**مذہب کی بجا آوری اور خوشحالی کے مابین تعلق**: مندرجہ بالا توضیحات اس بات کو ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں کہ اسلام اپنے پیروکاروں کو مادّی خوشحالی بھی عطا کرتا ہے۔ لیکن ہمیں یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ یہ مادّی خوشحالی آئی کیسے؟ جب مذہب کسی شخص کو آخرت کی زندگی پر تمام تر توجہ مرکوز کرنے کو کہتا ہے اور یہ کہ وہ اس دنیا سے بے اعتنا اور بے غرض رہے تو وہ مذہب پر پختہ گرفت رکھنے کے ساتھ ساتھ کیا اس زندگی کی عمدہ اور لطیف چیزوں سے بھی مستفید ہوتا ہے؟ اس سوال کا جواب پانے اور اس مسئلہ کی پیچیدگی کو سمجھنے کے لئے ہمیں مذہب کے لوازم اور مبادیات کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔

اوّل یہ کہ دولت' عزت' قوّت و منصب اور اس قسم کی دوسری چیزیں جو اس دنیا کی خوشحالی کا سنگِ بنیاد سمجھی جاتی ہیں' بذاتِ خود قابلِ نفرت نہیں ہیں۔ دراصل قرآنِ حکیم کے مطابق وہ خالقِ لم یزل کے عطیات ہیں۔ قرآنِ حکیم فرماتا ہے :

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِیْنَةَ اللّٰهِ الَّتِیْ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّیِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ (الاعراف : ۳۲)

''فرما دیجئے اللہ کی زینت کو جو اُس نے اپنے بندوں کے لئے بنائی ہے کس نے حرام کر دیا ہے اور کھانے کی پاکیزہ چیزوں کو؟ (۳۲ : ۷)

سورۃ المائدۃ میں بنی اسرائیل پر ماضی میں کئے گئے انعامات کو اللہ تعالیٰ کے عطیات کے طور پر بیان کیا گیا ہے اور فرمایا:

اُذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ اِذْ جَعَلَ فِیْكُمْ اَنْۢبِیَآءَ وَجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا (المائدۃ : ۲۰)

''اللہ کا وہ احسان تم اپنے اوپر یاد کرو جب اُس نے تمہارے اندر نبی پیدا کئے اور تمہیں خود مختار کیا۔'' (۲۰ : ۵)

اسی طرح سورۃ النحل کی آیت ۱۱۲ میں آسائشاتِ زندگی اور فراوانیٔ رزق کو عطیات ونوازشاتِ الٰہی کہا گیا جن کے کفران (ناقدری) کی پاداش میں دستِ غیب کی جانب سے سزا بھی سنادی گئی:

وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ آمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً يَّأْتِيهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ فَكَفَرَتْ بِأَنْعُمِ اللّٰهِ فَأَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ O (اَلنَّحْل : ۱۱۲)

''اور اللہ ایک بستی والوں کی مثال بیان کرتا ہے کہ وہ امن واطمینان میں رہتے تھے' اُن کے کھانے کا سامان بہ فراغت اُن کے پاس ہر طرف سے آتا رہتا لیکن اُنہوں نے اللہ کی نعمتوں کی ناشکری کی' اس پر اللہ نے اُنہیں اُن کے کرتوتوں کے سبب ایک محیط قحط اور خوف کا مزہ چکھایا۔'' (۱۶ : ۱۱۲)

آیت سے ظاہر ہوگیا کہ دنیا میں امن وفراغت سے رہنا سہنا اور کافی سامانِ معیشت بہم پہنچتے رہنا حق تعالیٰ کی بڑی نعمتوں میں سے ہے اور اُن پر بندے کی طرف سے شکر ادا کیا جانا چاہئے۔ آیت سے یہ بھی ظاہر ہورہا ہے کہ دنیوی نعمتوں کی ناشکری بھی عذاب کا مستحق بنادیتی ہے۔ فَأَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ کی بات اہلِ مکّہ کے حق میں اُن کے انکارِ رسول کی پاداش میں پوری ہو کے رہی۔ مکّہ میں شدید قحط پڑا' جانور مرنے لگے اور آدمی جان سے گزرنے لگے۔ مکّہ بالآخر مسلمانوں ہی کے ہاتھ پر فتح ہوا اور قریش کے بڑے بڑے سرداروں کا سرنگوں ہوا۔

''دوم یہ کہ انسان کو اللہ کا خلیفہ اور اُس کا نائب بنایا گیا ہے اور اس منصب کا یہ تقاضا ہے کہ وہ اس دنیا کے انتظام کو اپنے ہاتھ میں رکھے اور اُسے اپنے خالق ومالک کے احکامات اور اُس کی رضا کے مطابق چلائے۔ اگر یہ دو اصولی شرائط مدِّنظر رہیں تو سوال کا حل اس حد تک نکل آتا ہے کہ عزت' دولت اور قوّت ایسی چیزیں نہیں ہیں جو مذہب اور عقیدے کے خلاف ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتیں اور نوازشات اللہ کے نیک بندوں کے لئے ممنوع نہیں ہیں۔ دراصل ایسی چیزوں کے بارے میں الٰہی فیصلہ آیت کے اس حصّہ میں بیان ہوا ہے:

قُلْ هِيَ لِلَّذِيْنَ آمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ (الاعراف : ۳۲)

''فرمادیجئے کہ یہ اشیاء ایمان والوں کے لئے دنیا کی زندگی میں ہیں (اور) قیامت کے دن تو خاص اُنہی کے لئے ہوں گی۔'' (۷ : ۳۲)

''اس کا مطلب یہی ہے کہ دراصل ان چیزوں کے مستحق اللہ کے فرمانبردار بندے ہیں۔ زمخشری نے کہا کہ صرف هِيَ لِلَّذِيْنَ آمَنُوْا اور لِغَيْرِهِمْ کی تصریح نہ کرنے میں نکتہ بلاغت یہ ہے کہ اصالۃً تو اُن نعمتوں کے حقدار مومنین ہی ہیں۔ کافروں کو بھی یہ نعمتیں اگر دنیا میں مل رہی ہیں تو محض تبعاً مل رہی ہیں (تفسیر الکشاف)۔''

''اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنا خلیفہ اور خودمختار بنایا ہے اور وہ چاہتا ہے کہ انسان رضائے الٰہی کے حصول کے لئے اپنے اختیار کو احکاماتِ الٰہی کے مطابق استعمال کرے۔ جب تک اس حقیقت کی پابندی کرنے والے لوگ اس دنیا میں ہیں تو الٰہی حکمت کے تحت جاہ ومنصب اور طاقت انہی لوگوں کو تفویض کی جائیں گی۔ یہ ایک واضح حقیقت ہے جسے قرآنِ حکیم میں مزید وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے:۔

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُوْنَ O (الانبیاء:۱۰۵)
''اور ہم نے لوحِ محفوظ (میں لکھنے) کے بعد کتبِ آسمانی میں لکھ رکھا ہے کہ زمین (جنت) کے وارث میرے نیک بندے ہی ہوں گے۔'' (۱۰۵ : ۲۱) (بحوالہ ایس ڈی اصلاحی)

''جس زمین کی وراثت کا وعدہ صالحین کے ساتھ کیا گیا ہے' اس سے مراد جنت کی سرزمین ہے جس طرح دوسری آیت میں اسے واضح الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ صَدَقَنَا وَعْدَهٗ وَاَوْرَثَنَا الْاَرْضَ نَتَبَوَّاُ مِنَ الْجَنَّةِ حَيْثُ نَشَآءُ فَنِعْمَ اَجْرُ الْعَامِلِيْنَ (اَلزُّمَر : ۷۴) ''اور وہ کہیں گے اللہ کا (لاکھ لاکھ) شکر ہے جس نے ہم سے اپنا وعدہ سچا کیا اور ہمیں (اس) زمین کا مالک کر دیا کہ ہم جنت میں جہاں چاہیں قیام کریں۔ پس نیک کام کرنے والوں کے لئے بہترین اجر ہے۔'' (۷۴ : ۳۹)

''باقی رہی دنیوی بادشاہی وحکومت تو وہ کبھی صالحین اور کبھی فاسقین کو دے دی جاتی ہے جس کا ذکر اس آیت میں ہوا: اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ (الاعراف : ۱۲۸) ''زمین اللہ ہی کی ہے' وہ جسے چاہے اپنے بندوں میں سے اُس کا مالک بنا دے۔'' (۱۲۸ : ۷)۔ زیرِ بحث آیت ۱۰۵ : ۲۱ کو سامنے رکھ کر بعض لوگوں کا یہ کہنا کہ فلاح وتقویٰ کا قرآنی معیار حکومت کا ہونا اور نہ ہونا ہے۔ اُن کا یہ قول قرآنِ کریم کی صدہا تصریحات کے خلاف ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ بڑے بڑے ظالم' خونخوار اور نااہل لوگ تختِ شاہی پر متمکن رہے جن کے مظالم اور نااہلی سے اُن کی اپنی قوم نالاں رہی۔ حصولِ حکومت کو صلاحیت کا معیار قرار دینے والے کیا ایسے فرمانرواؤں کو بھی صالح ہونے کی سند دیں گے؟ کیا ہٹلر کا نام اُس کے اپنے ہم وطنوں میں آج ایک گالی بن کر نہیں رہ گیا؟ زندگی میں سٹالن کی پوجا کرنے والوں نے اُس کے مرنے کے بعد کیا اپنے ہاتھوں سے اُس کی ہڈیاں کریملن کے مقبرہ سے نکال کر باہر نہیں پھینک دیں؟ اگر دنیوی حکمرانی اور مادّی ترقی کو ہی آپ صالحیت کا معیار قرار دیں گے تو قرآنِ کریم کی بے شمار آیات کی تحریف کے مرتکب ہونے کے ساتھ ساتھ آپ تاریخ کی عدالت میں بھی ایک مجرم قرار دئے جائیں گے۔ آپ نے ہر اُس شخص کو قرآنی اصطلاح میں ''صالح'' کہہ دیا جس نے کسی طرح زمامِ اقتدار اپنے ہاتھ میں لے لی' خواہ اُس نے تمدن وحضارۃ کے سب روشن چراغ بجھا دئے ہوں' خواہ اُس کی فتوحات سے کاروانِ انسانیت کی ترقی رک گئی ہو' خواہ اُس کی خونخواریوں اور سفاکیوں کی وجہ سے عالمِ انسانیت پر بربریّت' وحشت اور جہالت کی شبِ دیجور چھا گئی ہو۔'' (ضیاء القرآن' جلد سوم' صفحہ ۱۸۹)

''اس کے برعکس اللہ کے فرمانبردار اور اطاعت گزار بندوں کے لئے طاقت کے حصول کو نظر انداز کرنا مناسب نہ ہوگا جس کے بغیر وہ خلافت ونیابت کے فرائض انجام نہیں دے سکتے۔ اِن تمام حقائق کو پیشِ نظر رکھنے سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ مسلمان صرف اُخروی دنیا کی فلاح وبہبود ہی نہیں چاہتا بلکہ وہ اس دنیا کی خوشحالی بھی چاہتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہر سچا اور ذی ہوش مسلمان اپنے رب سے یہ دعا کرتا ہے:

رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ O (البقرۃ : ۲۰۱)

''اے ہمارے پالنہار! ہمیں اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی بھلائی عطا فرما اور ہمیں عذابِ جہنم سے بچا لے۔''

''اب سوال کا ایک پہلو باقی رہ جاتا ہے جس کی وضاحت ضروری ہے۔ وہ یہ کہ اگر ایک مسلمان اخروی اور اِس دنیا دونوں کی فلاح و بہبود چاہتا ہے اور وہ یقیناً اُنہیں چاہتا ہے' تو قرآنِ کریم اور احادیثِ مبارکہ دنیاوی دلچسپیوں میں ملوّث ہونے کی اکثر مذمت کیوں کرتی ہیں؟ اس صورت میں اس اِصرار کا کیا مطلب ہوگا کہ مسلمان کی نگاہ اُخروی زندگی پر ہونی چاہئے اور اُخروی زندگی پر وہ کسی دنیاوی مفاد کو ترجیح نہ دے۔''

''پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ جس دنیا کی مذمت کی گئی ہے اور جس کا مطالبہ قابلِ نفریں ہے' وہ اُس دنیا سے مختلف ہے جس کی بہتری کا مسلمان مستحق ہے اور اُس کا مطالبہ کرتا ہے۔ اسلام اُن چیزوں سے نفرت کرتا ہے اور روکتا ہے جو اُسے اللہ سے اور اپنے مذہبی فرائض سے غافل کردیں۔ قرآنِ حکیم اور احادیثِ مبارکہ میں ایسی ہی دنیا کی طلبی کی مذمّت کی گئی ہے۔ وہ چیزیں جو انسان کو اپنے خالق و مالک اور اپنے دینی فرائض سے غافل نہیں کرتیں بلکہ اُن کی تکمیل میں اُس کی ممد و معاون ہیں' ہرگز قابلِ مذمّت نہیں ہیں اور نہ ہی اسلام نے اُن سے روکا ہے بلکہ اُن کی طلبی کو بہ نظرِ تحسین دیکھا ہے۔ الغرض دولت' عزت اور قوّت بنیادی طور پر بُری نہیں ہیں اور اُنہیں من مانے طور پر ترک کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ چونکہ اسلام یہ چاہتا ہے کہ مسلمان ان الٰہی نعمتوں کا غلط استعمال نہ کرے بلکہ اُنہیں دینے والے اللہ کی رضا اور حکم کے مطابق استعمال کرے' لہٰذا یہ چیزیں اُس دنیا سے متعلق نہیں ہیں جس کی مذمت کی گئی ہے بلکہ وہ تو ایک عمدہ اور منظور شدہ دنیا کی تشکیل کرتی ہیں۔''

''دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ اُخروی زندگی کو اس دنیاوی زندگی پر ترجیح دینے کا یہ مطلب نہیں کہ دنیاوی زندگی کو خیرباد کہہ دیا جائے بلکہ دراصل اس کا مطلب یہ ہے کہ مادّی مفادات کے تعاقب میں اور اُن کے حصول کے بعد آدمی کو الٰہی احکامات سے ایسا غافل نہیں ہونا چاہئے جس سے اُخروی زندگی کے مفادات کو دھچکا لگے۔ اب جہاں تک ایمان اور حیاتِ اُخروی کے مفادات کا تعلق ہے تو وہ انسانی خواہشات کی راہ میں سنگِ گراں ہیں' وہ اُسے دنیاوی مفادات کو اخروی مفادات پر قربان کرنے کا حکم دیتے ہیں۔ بالیقین وہ ایسے نہیں جو ہر قسم کی دنیاوی چیزوں کو ممنوع قرار دیں۔ کچھ احادیثِ مبارکہ میں مسلمان کو ایسے گھوڑے سے تشبیہ دی گئی ہے جسے ایک کھونٹی سے ایک محدود لمبائی کی رسی کے ساتھ باندھ دیا گیا ہو۔ ظاہر ہے کہ ایسے گھوڑے کی حالت اُس گھوڑے کی سی نہیں ہوتی جس کی ٹانگیں ایسی مضبوطی سے باندھی گئی ہوں کہ وہ حرکت کرنے کے قابل نہ ہو۔ جبکہ اول الذکر گھوڑے کو حرکت کی اور اپنی پہنچ میں گھاس چرنے کی محدود آزادی حاصل ہے تو مؤخرالذکر گھوڑا ایسی آزادی سے کلی طور پر محروم ہے۔ یہ مثال اس حقیقت کو مکمل طور پر واضح کرتی ہے کہ اگرچہ ایک مسلمان کو اخروی زندگی کو اس دنیا پر ترجیح دینے کا حکم ہے' تو اُس کے لئے دنیاوی بہتری کی راہ بہت حد تک کھُلی ہے یعنی جبکہ اخروی زندگی کی فلاح و بہبود مسلمان کی زندگی کا منتہائے مقصد ہے تو اس کے حصول کے لئے اسلام نے جو طریقہ مقرر کیا ہے وہ اس دنیا کی بہتری کو نظر انداز نہیں کرتا بلکہ اس میں گہری طور پر دلچسپی لیتا ہے۔ یہ حقیقت کہ اللہ کا عبادت گزار بندہ جو اخروی زندگی کو اس دنیا کی زندگی پر ترجیح دیتا ہے' اُسے اس زندگی میں اجر دیا جاتا ہے اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اس دنیا کی بہتری اُس موعودہ اجر کو شامل ہے۔ اس طرح اخروی ترجیح بذاتِ خود اس دنیا کی بہتری پر نتیجہ خیز ہوتی ہے اور اُسے دنیاوی بہتری سے جدا نہیں کرتی۔'' (ایس ڈی اصلاحی' صفحات ۲۲۱ تا ۲۲۵)

''**ایک غلط فہمی اور اُس کا ازالہ** : جو کچھ دنیاوی خوشحالی کے بارے میں کہا گیا ہے' اُسے اُن لوگوں کی جانب سے شک اور تردّد کی نگاہ سے دیکھا جا سکتا ہے جو چیزوں کو سطحی طور پر دیکھنے کے عادی ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ وہ اس بات پر بہ ضد ہوں کہ ایسا دعویٰ تجربہ شدہ یا تحقیق پر مبنی نہیں ہے۔ ایسے لوگوں کی متعدد مثالیں دی جا سکتی ہیں جو اچھے مسلمان ہونے کے باوجود اُن کی زندگیاں پست معیار کی ہیں اور وہ بڑی مشکلات کا شکار ہیں۔ ان کے برعکس کچھ مسلمان ایسے بھی ہیں جنہیں اسلام کے ساتھ دُور کی دلچسپی ہے لیکن وہ دولتمند اور بڑی شہرت کے مالک ہیں۔ اسی طرح کچھ مسلمان ممالک جو اپنے آپ کو مسلمان تک نہیں کہلوانا چاہتے' خودمختار اور طاقتور ہیں جبکہ وہ مسلمان ممالک جہاں اسلامی قانون کا نفاذ ہے' اُن کا انحصار دوسروں پر ہے۔ ایسی صورتوں میں الٰہی وعدے اور خوشحالی اور مرفہ الحالی کے اصول ناقابلِ فہم ہیں تو ایسی صورتوں میں پیدا ہونے والی غلط فہمیوں کا ازالہ ازبس ضروری ہے۔''

''جہاں تک افراد کی فلاح و بہبود کا تعلق ہے' تو یہ مسئلہ اُن لوگوں کو پریشان کرتا ہے جو اسلام کی ''مادّی خوشحالی کے اسلامی تصوّر'' سے ناآشنا ہیں۔ درحقیقت یہ تصوّرِ خوشحالی کے عام تصوّر سے بہت مختلف ہے۔ مسئلہ کے حل تک صحیح رسائی کے لئے ہمیں سب سے پہلے اس تصوّر سے واقفیت پیدا کرنا ہوگی۔ اس کی تفصیل ہمیں اُن قرآنی آیات میں ملے گی جن میں ایک سچے مسلمان کے لئے خوشحالی کا وعدہ کیا گیا ہے۔ مثلاً

(i) مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ "فَلَنُحْيِيَنَّه" حَيٰوةً طَيِّبَةً وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ O (اَلنَّحل : ۹۷)

''نیک عمل جو بھی کرے گا مرد ہو یا عورت' بشرطیکہ صاحبِ ایمان ہو تو ہم اُسے ضرور ایک پاکیزہ زندگی عطا کریں گے اور ہم اُنہیں اُن کے اچھے کاموں کے عوض میں ضرور اجر دیں گے۔'' (۱۶:۹۷)

''مرد ہو یا عورت' اس تصریح نے اس حقیقت کو ایک بار پھر روشن کر دیا کہ اجرِ اعمال کے لحاظ سے عورت اسلام کی نظر میں مرد سے کم نہیں بلکہ اُس کے مساوی ہے اور مشرک قوموں نے عورت کو حق تعالیٰ کی نظر میں جو ایک پست و حقیر مخلوق ٹھہرایا ہے' اُس کی پوری تردید ہوگئی۔ آیت میں وارد بشارت سے یہ مراد نہیں کہ مؤمن صالح کو کبھی فقر یا مرض طاری نہ ہوگا بلکہ مطلب یہ ہے کہ اطاعت کی برکت سے اُس کے قلب میں ایسا نور پیدا ہوگا جس سے وہ ہر حال میں صابر و شاکر اور تسلیم و رضا سے رہے گا اور سکون و جمعیتِ خاطر کی اصل یہی رضا ہے۔'' (تفسیر ماجدی اردو' صفحہ ۵۷۰' نوٹ:۱۵۶)

(ii) فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰى O وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَه' مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُه' يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى O (طٰهٰ : ۱۲۳' ۱۲۴)

''پھر اگر تم کو میری طرف سے کوئی ہدایت پہنچے تو جو کوئی میری ہدایت کی پیروی کرے گا' وہ نہ تو بھٹکے گا اور نہ ہی محروم رہے گا۔ اور جو کوئی میرے ذکر سے روگردانی کرے گا تو اُس کے لئے تنگی کا جینا ہوگا اور قیامت کے دن ہم اُسے اندھا اُٹھائیں گے۔'' (۱۲۳' ۱۲۴ : ۲۰)

یہ جسمانی بے بصری اُس کی روحانی بے بصری کا عکس ہوگی جو دنیا میں اُس نے اپنے اوپر طاری کر رکھی تھی۔

اِن آیاتِ قرآنی سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دنیا کی فلاح و بہبود جو ایک آدمی اپنے ایمان اور حسنِ رویّہ کی بدولت حاصل کرتا ہے، وہ ''حیاتِ طیّبہ'' ہے جو ذہنی تناؤ اور فکر و تفکر سے آزاد ہے۔ یہ الفاظِ دیگر حیاتِ طیّبہ مادّی دولت کے انباروں، شاندار اور پُرشکوہ گھروں، موٹر کاروں کے جلوس، خُدّام کی کثرت، امیرانہ خوراک اور قیمتی لباس میں نہیں رکھی بلکہ ضروریاتِ زندگی کی تکمیل اور طمانیتِ قلبی میں رکھی ہے۔ وہ دولت جو آدمی کو خواب آور گولیوں کا محتاج کر دے، جو انسانی ذہن کو تفکرات کا مال خانہ (گودام) بنا دے اور جو دل کو خوف اور لالچ کی آگ کی لپیٹ کی بھینٹ چڑھا دے، کسی بھی دامانِ خیال کی رُو سے اصل دولت نہیں ہوسکتی بلکہ ایسی دولت تو دراصل بدترین اور شدید ترین باعثِ آزار ہوتی ہے۔ ایسی دولت خوشحالی کا ذریعہ نہیں ہوتی بلکہ آدمی کو بدحالی کی طرف لے جاتی ہے۔ یہ دولت ایسے آدمی کو ملتی ہے جس کا دل اللہ کی محبت سے خالی ہو اور جو اُخروی زندگی کی بہتری کی کوشش کرنا چھوڑ دے۔ اُس کی بدعہدی کے نتیجہ میں وہ بہ ظاہر تو مادّی دولت کو حاصل کر لیتا ہے جبکہ وہ درحقیقت ایک مفلس و بے بس مخلوق سے زیادہ کنگال ہے اور نامراد و بدبخت روح سے زیادہ بدتر ہے۔ اس کے برعکس وہ آدمی جس کا دل اللہ کی محبت سے لبریز ہے اور جو اُخروی زندگی کی فلاح و بہبود کی کوشش میں خوشی محسوس کرتا ہے، ایسا اچھا اور بابرکت ہے جیسا کہ اُسے سلیمان علیہ السلام کا خزانہ مل گیا ہو اگرچہ اُس کا گزر دو وقت کی روٹی پر ہی کیوں نہ ہو۔ وہ بابرکت ہے کیونکہ وہ دولت جسے ہم ذہنی سکون کا نام دیتے ہیں، ذکرِ الٰہی اور یادِ خداوندی سے پھوٹتی ہے جیسا کہ قرآن نے فرمایا:

اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ O (اَلرَّعْد : ۲۸)

''خوب سن لو کہ اللہ کے ذکر سے دلوں کو اطمینان ہو ہی جاتا ہے۔'' (۲۸ : ۱۳)

اس اطمینان کے بھی مختلف درجے اور مرتبے ہوتے ہیں۔ جس درجہ کا ذکرِ الٰہی ہوتا ہے، اُسی نسبت سے اطمینانِ قلب بھی حاصل ہوتا ہے۔ ذکرِ الٰہی کے آثار میں سے ایک اثر خوف و خشیت کا ہے۔ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ (الانفال : ۲) یعنی ''جب مؤمنوں کے سامنے اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو اُن کے دل سہم جاتے ہیں۔''

''اگر کسی شخص کا دل یادِ الٰہی سے غافل نہیں ہے تو اُسے بالیقین پرہیزگاری اور پارسائی مل جائے گی اور جو شخص پارسائی کی دولت سے نوازا گیا تو اُس کے لئے یہ الٰہی وعدہ یقینی ہے کہ وہ روٹی کپڑے کا محتاج نہیں ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ یقین دلایا ہے کہ ایسے شخص کی جملہ ضروریات کی فراہمی اللہ تعالیٰ کی ذمّہ داری ہے:

وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا O وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ (الطلاق : ۲، ۳)

''اور جو شخص اللہ سے ڈرتا ہے، اللہ اُس کے لئے کشائش پیدا کر دیتا ہے اور اُسے ایسی جگہ سے رزق پہنچاتا ہے جہاں سے اُسے گمان بھی نہیں ہوتا۔'' (۲، ۳ : ۶۵)

وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ قرآن مجید کی جن چند آیتوں کی صداقت و حقانیت پر اپنے ذاتی تجربہ و

مشاہدہ کی بناء پر بے اختیار وجد کرنے کو جی چاہتا ہے' اُن میں ایک آیت یہ بھی ہے۔ واقعہ یہی ہے کہ حق تعالیٰ اپنے بندوں کو ایسے ایسے راستوں اور وسیلوں سے کھلاتا' پلاتا اور آمدنیاں دلاتا ہے کہ اُدھر اُن کا وہم و گمان بھی نہیں جا سکتا۔

''جہاں تک ایک سماج کی مجموعی فلاح و بہبود کا تعلق ہے تو یہ تو اس قدر عام سی بات ہے کہ اس کے ذکر کی ضرورت ہی نہیں۔ ایسے مسلم ممالک جو اسلام سے محبت کا اظہار نہیں کرتے اور خود مختار اور طاقتور ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں' وہ خود انحصاری اور طاقت کا صرف لبادہ اوڑھے ہوئے ہیں۔ حقیقت میں وہ نہ تو خود مختار اور نہ ہی طاقتور ہیں۔ اُن میں سے کچھ کا انحصار امریکہ پر ہے جبکہ کچھ دیگر ممالک کو روس کی حمایت حاصل ہے۔ اگر خود انحصاری اور طاقت اِسی کا نام ہے تو اسلام آزادی اور طاقت کے ایسے تصوّر سے بیزار ہے۔''

''اسی طرح وہ مسلم ریاستیں جن میں اسلامی قانون کی حکمرانی ہے لیکن وہ کمزور ہیں اور دوسری طاقتوں پر اُن کا انحصار ہے' وہ صحیح معنوں میں اسلامی ریاستیں نہیں ہیں اور اُن میں سے کسی کو بھی صحیح طور پر اسلامی ریاست نہیں کہا جا سکتا۔ اُن میں سے کسی کو بھی زندگی کے حیات آفریں سماجی معاملات میں اسلامی قوانین کو اختیار کرنے کی جرأت نہیں۔ ہمیں عملی طور پر جو بات معلوم ہوتی ہے' وہ یہ ہے کہ وہ اسلامی قوانین کا اطلاق صرف چند سماجی اور مذہبی معاملات پر کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اسلامی قوانین کا ایسا جزوی اطلاق پختگیِ ایمان اور پورے یقین کی علامت نہیں ہو سکتا بلکہ یہ عدمِ اعتماد اور نامکمل ایمان کی علامت ہے۔ ایسی کمزوری پر اللہ تعالیٰ نے ذلّت مقرر کی ہے اور اُن لوگوں کے لئے طاقت کا کوئی وعدہ نہیں کیا جو اسلامی نظام کو جزوی طور پر مانتے ہیں۔ وہ اپنے بندوں سے اسلامی قوانین کو ہر چھوٹے بڑے معاملے میں قبول کرنے اور اُن پر عمل پیرا ہونے کی توقع رکھتا ہے کیونکہ اسلام زندگی کے ہر شعبے کو محیط ہے۔ وہ اس دنیا اور اُخروی دنیا' روح اور جسم' فرد اور سماج کو برابر اکٹھا لے کر چلتا ہے اور درجِ ذیل آیت کا یہی مطلب ہے:

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ (البقرة: ۲۰۸)

''مؤمنو! اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ اور شیطان کے قدموں پر مت چلو۔'' (۲:۲۰۸)

''اگر ایسے مسلم ممالک بڑی طاقتوں کے کٹھ پتلی بن جائیں تو اُن پر مذکورہ صورتِ حال کا اطلاق ہوتا ہے۔ اسلامی نظام کا بے دلی سے اور جزوی نفاذ بھی اُنہیں حقیقی آزادی اور طاقت مہیا نہیں کر سکتا۔ یہ تو ایسا الٰہی انعام ہے جو اُس وقت دیا جاتا ہے جب اسلامی نظام کو مکمل طور پر اختیار اور نافذ کیا جاتا ہے کیونکہ وعدۂ الٰہی اسی شرط کے ساتھ مشروط ہے۔ اپنے وعدوں کو جتلاتے ہوئے اُس نے مؤمنوں کو یہ نصیحت کی ہے:

أَوْفُوْا بِعَهْدِيْ أُوْفِ بِعَهْدِكُمْ (البقرة: ۴۰)

''تم مجھ سے کئے ہوئے وعدے کو پورا کرو' میں تم سے کئے ہوئے وعدے کو پورا کروں گا۔'' (۲:۴۰)

عَهْدِيْ سے مراد طاعتِ الٰہی و اطاعتِ انبیاء کا تمہارا عہد۔ عَهْدِكُمْ سے مراد جو عہد میں نے تم سے تمہارے ایمان و اطاعت پر بہ طورِ انعام کر رکھا ہے۔

''**اسلام ہی غالب آئے گا:** مقداد رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ انہوں نے حضور نبی کریم ﷺ سے سنا:
لَا یَبْقٰی عَلٰی ظَھْرِ الْاَرْضِ بَیْتُ مَدَرٍ وَّلَا وَبَرٍ اِلَّا اَدْخَلَهُ اللّٰهُ كَلِمَةَ الْاِسْلَامِ بِعِزِّ عَزِیْزٍ وَ ذُلِّ ذَلِیْلٍ اِمَّا یُعِزُّهُمُ اللّٰهُ فَیَجْعَلُهُمْ مِّنْ اَهْلِهَا اَوْیُذِلُّهُمْ فَیَدِیْنُوْنَ لَهَا قُلْتُ فَیَكُوْنَ الدِّیْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ
(مسند امام احمد)

''سرزمینِ عرب پر کوئی گھر یا رہائشی خیمہ ایسا نہیں ملے گا جہاں اسلام کا پیغام نہ پہنچ جائے۔ اس سے عزت والے کو مزید عزت اور ذلیل کو مزید ذلت نصیب ہوگی۔ یا تو اللہ اُنہیں عزت دے گا اور اہلِ کلمہ میں سے ہونے کا شرف عطا کرے گا یا اُنہیں ذلیل کرے گا۔ پس اُنہیں اس کے آگے جھکنا پڑے گا (میں نے دل میں سوچا کہ اُس روز تو اللہ کے دین کی ہی حکومت ہوگی)۔''

مَدَر: کچی اینٹ کو کہتے ہیں۔ بَیْتُ مَدَر اُس گھر کو کہتے ہیں جو کچی اینٹ، روڑے اور گارے سے بنایا گیا ہو جیسا کہ دیہاتیوں میں رواج ہے۔ وَبَر اُون کو کہتے ہیں۔ سرزمینِ عرب میں اُون کے خیمے بنائے جاتے تھے جنہیں رہائشی مقاصد کے لئے بھی استعمال کیا جاتا تھا۔ ایسے خیمے کو بَیْتُ وَبَر کہتے تھے۔''

''زیرِ نظر حدیثِ پاک میں حضور ﷺ نے اسلام کو غلبہ و اقتدار حاصل ہونے سے کافی عرصہ پہلے مسلمانوں کے اطمینان کے لئے یہ پیش گوئی فرمادی تھی کہ حالات یکساں نہیں رہیں گے بلکہ اُن میں تنوع پیدا ہوگا اور مسلمان مغلوبیت کی زنجیروں سے نکل کر بالادستی کی پوزیشن میں آجائیں گے اور اسلام کا پیغام گھر گھر پہنچ جائے گا یہاں تک کہ جو دیہاتی اور صحرائی خیمہ نشین ہیں وہ بھی اس کے بارے میں جان لیں گے۔''

''اس کے بعد یہاں کے لوگ دو حصّوں میں بٹ جائیں گے:''

''(۱) کچھ لوگ برضا و رغبت اسلام قبول کرلیں گے اور اُس کی محبت دل کی اتھاہ گہرائیوں میں اتار کر اُس کے فرمانبردار بن جائیں گے۔ اُنہیں اللہ تعالیٰ عزت عطا فرمائے گا اور وہ اسلام کے حلقہ بگوش بن کر دنیاوی، اُخروی اور جسم و جاں کی راحتیں حاصل کریں گے۔''

''(۲) کچھ لوگوں کو یہ فضا اور اسلام کی بالادستی اور آقائی پسند نہیں آئے گی۔ وہ اس کی عظمت اور شان و شوکت دیکھ کر کڑھیں گے مگر دین کو ایسا غلبہ حاصل ہوگا کہ اُنہیں دم مارنے کی جرأت نہیں ہوگی۔ لہٰذا وہ مجبوراً اس کے مطیع اور باج گزار بن جائیں گے۔ اس طرح دل سے اسلام قبول نہ کرنے کی وجہ سے اُنہیں ذلت برداشت کرنا پڑے گی اور وہ پہلے ہی سے زیادہ ذلیل ہوجائیں گے۔''

''حضرت مقداد رضی اللہ عنہ اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ میں نے سوچا کہ اُس روز تو دین کی شان و شوکت دیکھنے والی ہوگی۔ ہر طرف اس کی عظمت کا چرچا ہوگا اور کسی کو جرأت نہیں ہوگی کہ اُس کے ظاہری

وباطنی اقتدار کے آگے دَم مار سکے۔''

''**اسلام کے عالمگیر غلبہ کی پیشین گوئی پر مستشرقین کے اعتراضات**: اس حدیثِ پاک میں صرف سرزمینِ عرب کے طول وعرض میں اسلام کے ہمہ پہلو غلبہ واقتدار کی پیشین گوئی کی گئی ہے کہ یہ وسیع وعریض زمین جو کلمہ گو مسلمانوں کے لئے اپنی وسعت کے باوجود تنگ ہو چکی ہے اور اہلِ حق کے لئے اس پر سانس لینا دشوار ہو رہا ہے اور اُن کا ناطقہ بند کر دیا گیا ہے' ایک وقت ایسا آئے گا کہ یہ زمین ایمان داروں کے لئے اپنے بازو پھیلا دے گی اور اس سے تمام علاقے بلاشرکتِ غیرے اُن کے قبضہ وتصرف میں آ جائیں گے اور خوف ودہشت کی وہ فضا ختم ہو جائے گی جو اَب قائم ہے۔ لوگ علانیہ اپنے مالک کے احکام کی پیروی کرنے لگیں گے اور شعائرِ دین پر عمل پیرا ہوں گے' کسی کو جرأت نہیں ہوگی کہ اُن کی طرف میلی آنکھ اٹھا کر بھی دیکھ سکے۔ جو لوگ دل سے دین کا یہ غلبہ برداشت نہیں کر سکیں گے' وہ اس کی قلمرو میں ذلیل اور باجگذار بن جائیں گے' مقتدر حکمران بن کر نہیں۔''

''مستشرقین اور مسلمانوں کے دلوں میں دانستہ شکوک وشبہات پیدا کرنے کے شوقین اور اُن کے ہم خیال و دَمساز لوگ اس حدیثِ پاک کے مضمون کے ساتھ ساتھ کچھ اور قرآنی آیات کا ذکر کر کے جن میں اسلام کے غلبہ واقتدار کی پیشین گوئی کی گئی ہے' یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ اسلام اپنے دعووں میں (معاذ اللہ) سچا نہیں کیونکہ جن آیات و احادیث میں عالمگیر غلبہ واقتدار کا ذکر کیا گیا ہے' وہ مسلمانوں کو کبھی بھی حاصل نہیں ہوا۔ مسلمانوں کی موجودہ سیاسی ابتری' معاشی زبوں حالی' اخلاقی گراوٹ' اتحاد ویقین اور عزم واستقلال کی کمی اور اُن کی صفوں میں پائی جانے والی عبرتناک افراتفری اس کی واضح دلیل ہے۔ آج جتنے یہ لوگ بے یقین' شکستہ صف اور سیاسی یتیم ہیں' اس حد تک کسی اور دین کے لوگ دکھائی نہیں دیتے۔ جن آیات کو وہ اپنے مضمون کے ساتھ ملاتے ہیں' وہ یہ ہیں :

(i) يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّطْفِئُوْا نُوْرَاللهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَيَاْبَى اللهُ اِلَّا اَنْ يُّتِمَّ نُوْرَهٗ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ○ هُوَالَّذِىْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ○ (التوبة:

''وہ چاہتے ہیں کہ اللہ کا نور منہ کے ساتھ پھونکیں مار کر بجھا دیں لیکن اللہ تعالیٰ اُسے مکمل کر کے ہی رہے گا اگرچہ کافر ناپسند کرتے رہیں۔ اللہ نے اپنے رسول کو دینِ حق اور ہدایت دے کر یہاں بھیجا ہے تاکہ اُسے تمام دینوں پر غلبہ عطا کرے اگرچہ مشرک لوگ ناپسند کرتے رہیں۔'' (۳۲'۳۳ : ۹)

(ii) وَعَدَاللهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِى الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِى ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا يَعْبُدُوْنَنِىْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِىْ شَيْئًا (النّور : ۵۵)

''تم میں سے جو لوگ ایمان لائیں اور نیک عمل کریں' اُن سے اللہ وعدہ کرتا ہے کہ اُنہیں زمین میں حکومت عطا کرے گا جیسا کہ اُن سے پہلے لوگوں کو حکومت دے چکا ہے اور جس دین کو اُن کے لئے پسند کیا ہے اُسے اُن کے واسطہ سے قوّت دے گا اور اُن کے خوف کے بعد اُسے امن میں تبدیل کر دے گا (بشرطیکہ میری عبادت کرتے رہیں اور کسی کو میرا شریک نہ بنائیں۔'' (۵۵ : ۲۴)

''دراصل بات یہ ہے کہ یہ اسلام کے دشمنوں کی وسوسہ اندازی اور پروپیگنڈا اہم ہے جو وہ اِس انداز سے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف چلاتے ہیں اور قرآن و اسلام کو جھوٹا ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اُن کی اس وسوسہ اندازی اور پیدا کردہ بدگمانی کا جواب یہ ہے کہ مسلمانوں کی صفوں میں حالیہ ابتری، دلوں کی بے یقینی، قومی سطح پر ضعف و ناتوانی، سیاسی بدحالی، منظم منصوبہ بندی اور یکجہتی کی کمی، اُن کی اپنی بدعملی، اسلامی تعلیمات سے دُوری، اللہ اور رسول ﷺ سے بے تعلقی، احکامِ شریعت سے رُوگردانی، دنیا سے بے پناہ محبت اور عیش و عشرت سے غیر معمولی شغف کا نتیجہ ہے۔ اگر اُن کی اجتماعی حالت قابلِ رحم ہوگئی ہے اور وہ اقوامِ عالم کی نظروں میں گر گئے ہیں یا بین الاقوامی صفوں میں اپنا مقام کھو بیٹھے ہیں تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ شروع ہی سے ایسے تھے اور کسی زمانے میں بھی آسمان کی آنکھ کا تارا اور دلوں کا سہارا نہیں تھے۔۔۔ یا یہ کہ اُن کے قوی ہیکل گھوڑوں نے صحراؤں کے سینے نہیں روندے تھے۔۔۔ یا اُن کے سامنے دریا پایاب نہیں ہوئے تھے۔۔۔ یا اُنہوں نے یورپ کے کلیساؤں میں اذانیں نہیں دی تھیں۔۔۔ یا افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں اپنے پرچم نہیں لہرائے تھے۔۔۔ یا قیصر و کسریٰ اُن کے ناموں کی عظمت سے نہیں تھر تھرائے تھے۔۔۔ یا اُن کے بحری بیڑوں نے سمندروں کے سینوں کو چیرا نہیں تھا۔۔۔ یا اُن کی عظمت کے آگے افلاک سرنگوں نہیں ہوئے تھے۔۔۔ یا روحِ محمد ﷺ سے وفا کے صلہ میں وہ لوح و قلم پر اپنی تقدیر خود نہیں لکھا کرتے تھے۔۔۔ اِن میں سے کون سی شان تھی جو اُنہیں حاصل نہیں تھی اور کون سی آقائی تھی جو اُن کے در کی باندی نہیں تھی، مگر افسوس کہ وہ اسلام کے چاہنے والے نہ رہے، موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرانے والے نہ رہے، دین کی سربلندی اور اللہ کی رضا کے لئے سمندروں اور طوفانوں سے لڑنے والے نہ رہے۔ وہ ساری عظمتیں سمیٹ کر اپنے ساتھ لے گئے کیونکہ۔۔۔ وہ معزز تھے زمانے میں مسلماں ہو کر۔۔۔ اور ہم نے چونکہ اُن کی روشِ صالح ترک کر دی اس لئے۔۔۔ ہم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر۔ تو مسلمانوں کی موجودہ زبوں حالی، دگرگوں حالت، پستی اور گراوٹ کی ذمہ داری، اُن کی اپنی بدعملی پر عائد ہوتی ہے۔ یہ کہنا کہ اُنہوں نے جاہ و جلال اور قوّت و اقتدار کا کبھی منہ دیکھا ہی نہیں، یا وہ ایسے ہی تھے اور ایسے ہی رہے ہیں، یہ تاریخی حقائق کا منہ چڑانے اور اُسے مسخ کرنے کے مترادف ہے۔ جہاں تک مسلمانوں کی موجودہ حالت کا تعلق ہے، وہ اُن کے اپنے گناہوں کی شامت اور برے اعمال کا نتیجہ ہے کیونکہ قرآنِ پاک نے غلبہ و اقتدار کا مشروط وعدہ کیا ہے۔۔ وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (آل عمران: ۱۳۹ کہ غلبہ و اقتدار اور علو تمہیں اُس صورت میں نصیب ہوگا جب تم ایمان کی قندیل سینے میں فروزاں کر کے آگے بڑھو گے اور مسلمان بن کر جیو گے۔ یہ نہیں کہ اعمال سے تو شیطان کو بھی شرماؤ گے مگر اقتدار تمہارے گلے کا ہار بنا رہے گا۔''

''ہاں، یہ بات ضرور ہے کہ اگر آج مسلمان اپنی حالت پر نظرِ ثانی کر لیں اور نافرمانی و بے عملی کی روش ترک کر کے صحیح معنوں میں مسلمان بن جائیں تو وہی شوکتِ رفتہ پھر بحال ہو سکتی ہے اور اُن کے مردہ جسم میں زندگی کی نئی لہر دوڑ سکتی ہے اور بجھی ہوئی چنگاری سے پھر ایک نیا جہاں تعمیر ہو سکتا ہے۔

آج بھی ہو جو براہیم کا ایماں پیدا　　آگ کر سکتی ہے اندازِ گلستاں پیدا

(ماہنامہ منہاج القرآن لاہور، مارچ ۲۰۰۷، صفحات ۱۴۔۱۶ مضمون نگار: علامہ محمد معراج الاسلام)

''**اسلام کا تصوّرِ امن**: عرب معاشرہ ظلم و تشدد، وحشت و بربریت اور سفاکی سے بھرپور معاشرہ تھا لیکن حضور نبی اکرم ﷺ نے لوگوں کو امن و سلامتی عام کرنے پر زور دیا اور فرمایا:

(i) وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ لَاتَدْخُلُوا الْجَنَّۃَ حَتّٰی تُؤْمِنُوْا وَلَا تُؤْمِنُوْا حَتّٰی تَحَابُّوْا أَفَلَا أَدُلُّکُمْ عَلٰی أَمْرٍ إِذَا فَعَلْتُمُوْہُ تَحَابَبْتُمْ؟ أَفْشُوا السَّلَامَ بَیْنَکُمْ (سنن ابی داؤد: کتاب الادب)

''قسم ہے اُس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے، تم جنت میں داخل نہ ہو گے جب تک ایمان نہ لاؤ گے اور تمہارا ایمان کامل نہیں ہوگا جب تک ایک دوسرے سے محبت نہ کرو۔ کیا میں تمہیں ایسا کام نہ بتاؤں کہ اُسے کرو تو ایک دوسرے سے محبت کرنے لگو گے؟ آپس میں سلام کو پھیلاؤ۔''

(ii) لَاتَدْخُلُوا الْجَنَّۃَ حَتّٰی تُسْلِمُوْا وَلَا تُسْلِمُوْا حَتّٰی تَحَابُّوْا وَ أَفْشُوا السَّلَامَ تَحَابُّوْا وَ إِیَّاکُمْ وَ الْبُغْضَۃَ فَإِنَّھَا ھِیَ الْحَالِقَۃُ لَا أَقُوْلُ لَکُمْ تَحْلِقُ الشَّعْرَ وَلٰکِنْ تَحْلِقُ الدِّیْنَ

''تم اُس وقت تک جنت میں داخل نہ ہو گے جب تک اسلام نہ لاؤ اور تم اُس وقت تک ایمان نہ لاؤ گے جب تک آپس میں ایک دوسرے سے محبت نہ کرو۔ (لوگو!) سلام کو عام کرو تم باہم محبت کرنے لگو گے اور بغض سے بچو کیونکہ یہ کاٹنے والا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ یہ تمہاری گردنیں کاٹے گا بلکہ یہ تمہارا دین کاٹے گا۔'' (الادب المفرد)

اِن احادیث میں اور دیگر کئی مواقع پر آپ ﷺ نے اُس معاشرے کو امن و سلامتی عام کرنے کا حکم فرمایا جہاں جنگ و جدل انسانی گھٹی میں رچی بسی تھی۔ آپ نے اُنہیں یہ نوید دی کہ اس طرح تم دائرۂ امن میں آ جاؤ گے۔ گویا آپ کلی طور پر ایک پُرامن اور محفوظ معاشرے کا قیام چاہتے تھے جہاں کسی کی جان، مال، آبرو غیر محفوظ نہ ہو۔

جب آپ ﷺ مدینہ منورہ ہجرت فرما گئے تو اہلِ مدینہ کے دلوں میں آپ کے لئے محبت کا سمندر موجزن تھا کیونکہ آپ نے اُنہیں اُن برائیوں سے نجات دلائی جو صدیوں سے اُن کے اندر موجود تھیں۔ یہاں آپ ﷺ نے جن نکات پر مشتمل پہلا خطبہ دیا، اُس کی شقیں ☆ واضح کرتی ہیں کہ آپ ﷺ ایک فلاحی معاشرے کا قیام چاہتے تھے جس کی بنیاد غریب پروری اور احسان پر ہو جہاں لوگ امن و آشتی اور صلح پسندی کے ساتھ رہیں، جہاں ہر ایک کے حقوق محفوظ ہوں اور کسی کی حق تلفی نہ ہو۔ یہ نکات آج کے اُن راہ نماؤں سے سوال کر رہے ہیں جو جہاد کے نام پر امت کے نوجوانوں اور پوری دنیا کو گمراہ کر رہے ہیں۔ نیز یہ نکات مغربی دنیا کے حکمرانوں کے منہ پر طمانچہ ہیں جو اسلام کو تشدد، دہشت گردی اور انتہا پسندی سے تعبیر کرتے ہیں۔

☆ (۱) اے لوگو! اللہ سے ڈرو اور تقویٰ اختیار کرو تا کہ تمہارے اعمال کی اصلاح ہو سکے۔

(۲) ہمیشہ ذہن نشین رکھو کہ تمہیں روزِ محشر اُس خدائے وحدہٗ لاشریک لہٗ کے حضور اپنے ہر عمل کا جوابدہ ہونا ہے۔

(۳) صدقہ و خیرات کی کثرت کرو۔

(۴) اپنے رویّہ اور باتوں میں ہمیشہ نرمی اور رحم دلی اختیار کرو اور اپنے دل کو سخت اور ظالم نہ ہونے دو۔

(۵) نفرت کی بجائے ایک دوسرے سے محبت کرو۔ (۶) ہمیشہ اپنے وعدوں کی پاسداری کرو۔

BIBLIOGRAPHY (مصادر ومراجع)

1. Afzal ur Rahman — Muhammad ﷺ: the Educator of Mankind.
2. Anderson — Law Reforms in the Muslim World.
3. Arberry A. J. — Religion in the Middle East.
4. Armstrong, Karen — Holy War.
5. Armstrong, Karen — Muhammad – the Biography of the Prophet.
6. Arnold. T.W. — The Preaching of Islam.
7. Ashraf Usmani, Mufti — Amusement and Play.
8. Azam, Abdur Rahman — The Eternal Message of Muhammad ﷺ
9. Becker, C. H. — Christianity and Islam.
10. Blyden, E. — Christianity, Islam and the Negro Race.
11. Bodley, R. V. C. — The Messenger.
12. Bosworth, Smith — Muhammad and Muhammadanism.
13. Bucaille, Maurice, Dr. — The Bible, the Qur'an and Science.
14. Burt, A. Edwin — Philosophy of Religion.
15. Carlyle, Thomas — Hero and Hero-Worship.
16. Coulson, N. J. — Succession in the Muslim Family.
17. Davenport, John — Apology for the Qur'an.
18. Davenport, John — The Message of the Qur'an.
19. Dermenghem, E. — The Life of Mahomet.
20. Doughty — Arabia -- Deserta.
21. Dustur — Alcohol : Its Use and Misuse.
22. Gibbon, Edward — The Decline and Fall of the Roman Empire.
23. Glubb, John, Sir — The Life and Times of Muhammad (PBUH).
24. Hamidullah, Dr. — Introduction to Islam.
25. Harun Yahya — Islam Denounces Terrorism.
26. Hitti, Philip. K. — Islam : A Way of Life.
27. Imran Ahsan Khan Nyazee — Islamic Jurisprudence.
28. Islahi, S. D. — Islam at a Glance.
29. James — Principles of Psychology.
30. Kisch — Sexual Life of Woman.
31. Klein — The Religion of Islam.
32. Lane Poole, Stanley — Selections from the Kuran.
33. Lane Poole, Stanley — The Speeches and Table-talk of Muhammad.
34. Lawrence, Browne — The Prospects of Islam.
35. Lerouge, Raymond — Vie de Mahomet.
36. Liaqat Ali Khan Niazi — Islamic Law of Contract.
37. Macdonald — Religious Life and Attitude in Islam.
38. Mannan, M. A. — Islamic Economics : Theory and Practice.
39. Margoliouth — Muhammad.
40. Marston, Charles, Sir — The Bible is True.
41. Maudoodi, Abul A'la — Economic System of Islam.
42. Muir, William, Sir — The Life of Mahomet.
43. Nurbaki, Haluk, Dr. — The Holy Qur'an and the Facts of Science.

44. O'Leary De Lacy — Islam at the Crossroads.
45. Parkington and Anthony — Insurance Law.
46. Rashid Ahmad Jallundhri — Islam and Current Affairs.
47. Rashid A. Seyal, Dr. — Divine Philosophy and Modern Day Science.
48. Robertson, James — Transforming Economic Life : A Millenial Challenge.
49. Ross, E. D. Sir — The Persians.
50. Rumsey — The Muhammadan Law of Inheritance.
51. Scheuon, Frithjof — Understanding Islam.
52. Scott, S. P. — History of the Moorish Empire in Europe.
53. Shakespeare, William — Macbeth (A Play).
54. Shoaib Umar, M. — Principles and Precedents of Muhammadan Law.
55. Stanley, Dean — Sinai and Palestine.
56. Stoddard, Lothrop A.M. — The New World of Islam.
57. Tahir Mansuri, Dr. — Islamic Law of Contracts and Business Transactions.
58. Tahir-ul-Qadri, Prof. Dr. — Islam in Various Perspectives.
59. Tahir-ul-Qadri, Prof. Dr. — Islamic Concept of Intercession.
60. Tahir-ul-Qadri, Prof. Dr. — Islamic Concept of Intermediation.
61. Taqi Usmani, Mufti — Our Socio-Economic Order.
62. Torrey — Jewish Foundation of Islam.
63. Trante, Wholus Scharf — Arab and Islamic Banks.
64. Tritton, A. S. — Islam.
65. Vaglieri, Laura, Prof. — An Interpretation of Islam.
66. Vaglieri, Veccia, Prof. — What made Islam a World-force?
67. Watt, Montgomery — Muhammad : Prophet and Statesman.
68. Yusuf Abbas Hashmi — Muhammad ﷺ – the Ummi Nabi.

ENCYCLOPAEDIAS

1. Encyclopedia Americana.
2. Encyclopaedia Britannica.
3. Encyclopedia of Islamic Spirituality.
4. Encyclopedia of the Qur'an – Leiden (America)
5. Encyclopedia of Seerah – Afzal ur Rahman.
6. Encyclopedia of Religion and Ethics.
7. Funk and Wagnalls New Encyclopedia of Science.
8. Hammertson's Encyclopedia of Modern Knowledge.
9. Hastings' Encyclopedia of Religion and Ethics.
10. Historians' History of the World.
11. Micropedia Britannica.
12. Shorter Encyclopedia of Islam : H.A.R. Gibb & J.H. Kramers.
13. The Encyclopedia of Religion.
14. The Jewish Encyclopedia.
15. Universalis Encyclopedia.
(16) دائرۃ المعارف للبستانی

Journals/Periodicals/Monthlies/Newspapers

1. "Light" Lahore, 24th November, 1958.
2. The Daily "Dawn" Karachi, March 3, 1977.
3. The American Journal of Islamic Social Sciences – Summer 1993 Islamabad.
4. Q News October, 2001.
5. "Time" October, 2001.
6. Planet Easton, November 2001.

(۷) ''صدائے صحت'' راولپنڈی (سن نا معلوم)

(۸) رسالہ ''دردناک غمناک'' از حاجی امداد اللہ

(۹) اَلرّائیے النَّجیح فیِ مَن هُوَ الذَّبِیح از مولانا عبدالمجید فراہی۔

(۱۰) دَفعُ التامّل عن التوسُّل بسَیِّدَ الرُّسُل ﷺ: مولانا مشتاق احمد رحمۃ اللہ علیہ۔

(۱۱) دانیال ہومیو پیتھک گائیڈ اینڈ نوٹس۔

(۱۲) ماہنامہ ''عالمِ اسلام اور عیسائیت' مئی ۱۹۷۷ء۔

(۱۳) ماہنامہ ''مؤمن'' لاہور' جون ۲۰۰۳ء۔

(۱۴) ماہنامہ ''پہچان'' لاہور' مئی ۲۰۰۵ء۔

(۱۵) ماہنامہ ''منہاج القرآن'' لاہور' مارچ ۲۰۰۷ء

(۱۶) ماہنامہ ''منہاج القرآن'' لاہور' جولائی ۲۰۰۸ء۔

کتبِ تفسیر

(۱) جامع البیان: امام ابوجعفر محمد بن جریر الطبری متوفّٰی ۳۱۱ھ' مطبوعہ دارالمعرفۃ' بیروت ۱۴۰۹ھ۔

(۲) تفسیر القرآن العزیز: امام عبدالرحمن بن محمد ادریس بن ابی حاتم رازی' متوفی ۳۲۷ھ' مکہ مکرمہ ۱۴۱۷ھ

(۳) معالم التنزیل: امام ابوالحسین بن مسعود الفراء البغوی متوفی ۵۱۶ھ۔ دارالکتب العلمیہ' بیروت۔

(۴) الکشّاف: علاّمہ جاراللہ محمود بن عمر زمخشری متوفّٰی ۵۳۸ھ' مطبوعہ مطبعہ بہیہ' مصر ۱۳۴۳ھ۔

(۵) مجمع البیان: شیخ ابوعلی فضل بن حسن طبرسی متوفّٰی ۵۴۸ھ' مطبوعہ انتشارات ناصر خسرو' ایران ۱۴۰۶ھ۔

(۶) زادالمسیر: علاّمہ ابوالفرج عبدالرحمان بن علی بن محمد جوزی حنبلی متوفی ۵۹۷ھ' مکتبہ اسلامی بیروت۔

(۷) تفسیر کبیر: امام فخر الدین محمد بن ضیاء الدین عمر رازی متوفی ۶۰۶ھ' مطبوعہ دارالفکر بیروت' ۱۳۹۸ھ۔

(۸) الجامع لاحکام القرآن: علاّمہ ابوعبداللہ محمد بن احمد مالکی قرطبی متوفی ۶۶۸ھ' مطبوعہ ایران' ۱۳۸۷

(۹) انوارالتنزیل: قاضی ابوالخیر عبداللہ بن عمر بیضاوی شیرازی شافعی متوفی ۶۸۵ھ' مطبوعہ مصر۔

(۱۰) مدارک التنزیل: علاّمہ ابوالبرکات احمد بن محمد نسفی متوفی ۷۱۰ھ' مطبوعہ دارالکتب العربیہ' پشاور۔

(۱۱) تفسیر القرآن: حافظ عماد الدین اسماعیل بن عمر ابن کثیر شافعی متوفی ۷۷۴ھ، مطبوعہ ادارہ اندلس، بیروت
(۱۲) تفسیر الثعالبی: علامہ عبدالرحمان بن محمد بن مخلوف ثعالبی متوفی ۸۷۵ھ، مطبوعہ بیروت۔
(۱۳) الدرّ المنثور: حافظ جلال الدین السیوطی متوفی ۹۱۱ھ، مطبوعہ آیۃ اللہ العظمیٰ، ایران۔
(۱۴) منہج الصادقین: شیخ فتح اللہ کاشانی، متوفی ۹۷۷ھ، مطبوعہ خیابان ناصر خسرو، ایران۔
(۱۵) تفسیرات الاحمدیۃ: علامہ احمد جیون جونپوری متوفی ۱۱۳۰ھ۔ مطبع کریمی بمبئی۔
(۱۶) تفسیر مظہری: قاضی ثناء اللہ پانی پتی متوفی ۱۲۲۵ھ، مطبوعہ بلوچستان بک ڈپو، کوئٹہ۔
(۱۷) فتح القدیر: شیخ محمد بن علی شوکانی متوفی ۱۲۵۰ھ، مطبوعہ دار المعرفۃ، بیروت۔
(۱۸) روح المعانی: علامہ ابوالفضل سید محمود آلوسی حنفی متوفی ۱۲۷۰ھ، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت
(۱۹) خزائن العرفان: سید محمد نعیم الدین مراد آبادی متوفی ۱۳۶۷ھ، مطبوعہ تاج کمپنی لمیٹڈ، لاہور۔
(۲۰) تفسیر نعیمی: مفتی احمد یار خان گجراتی، مفتی اقتدار احمد خان گجراتی۔
(۲۱) ترجمان القرآن: ابوالکلام آزاد۔
(۲۲) تفسیر ماجدی (اردو)۔
(۲۳) عبداللہ یوسف علی
(۲۴) ضیاء القرآن: جسٹس پیر محمد کرم شاہ الازہری متوفی ۱۴۱۸ھ، مطبوعہ ضیاء القرآن پبلیکیشنز، لاہور۔
(۲۵) تبیان القرآن: علامہ غلام رسول سعیدی، مطبوعہ فرید بک سٹال لاہور، ۱۴۳۰ھ/۲۰۰۹ء۔

کتب حدیث

(۱) مؤطا امام مالک: امام مالک بن انس اصبحی (م ۱۷۹ھ) مطبوعہ مکتبہ مجتبائی، لاہور۔
(۲) مسند طیالسی: امام سلیمان بن داؤد بن جارود طیالسی (م ۲۰۴ھ)، مطبوعہ ادارۃ القرآن کراچی، ۱۳۹۱
(۳) مسند حُمیدی: امام عبداللہ بن الزبیر حُمیدی (م ۲۱۹ھ)، مطبوعہ عالم الکتب، بیروت۔
(۴) المصنف لابن ابی شیبہ: امام ابوبکر عبداللہ بن محمد بن ابی شیبہ (م ۲۳۵ھ)، ادارۃ القرآن کراچی۔
(۵) مسند احمد بن حنبل: امام احمد بن حنبل (م ۲۴۱ھ) مطبوعہ مکتب اسلامی بیروت، ۱۳۹۸ھ۔
(۶) صحیح بخاری: امام ابوعبداللہ محمد بن اسماعیل بخاری (م ۲۵۶ھ)، مطبوعہ نور محمد اصح المطابع کراچی، ۱۳۸۱ھ
(۷) الادب المفرد: امام ابوعبداللہ محمد بن اسماعیل بخاری (م ۲۵۶ھ)، مطبوعہ مطبعہ اثریہ، سانگلہ ہل۔
(۸) صحیح مسلم: امام ابوالحسین مسلم بن حجاج قشیری (م ۲۶۱ھ)، مطبوعہ نور محمد اصح المطابع کراچی، ۱۳۷۵ھ
(۹) سنن ابن ماجہ: امام ابوعبداللہ محمد بن یزید ابن ماجہ (م ۲۷۳ھ)، مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب کراچی
(۱۰) سنن ابوداؤد: امام ابوداؤد سلیمان بن اشعث سجستانی (م ۲۷۵ھ)، مطبوعہ مطبع مجتبائی، لاہور ۱۴۰۵ھ۔
(۱۱) جامع ترمذی: امام ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذی (م ۲۷۹ھ) مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب کراچی۔
(۱۲) سنن نسائی: امام ابوعبدالرحمان احمد بن شعیب نسائی (م ۳۰۳ھ)، نور محمد کارخانہ تجارت کتب کراچی۔

(۱۳) مسند البزار: امام احمد بن عمرو بن عبدالخالق بزار (م ۲۹۲ھ)' مؤسسۃ القرآن بیروت' ۱۴۰۹ھ۔
(۱۴) السنن الکبریٰ: امام ابوعبدالرحمان احمد بن شعیب نسائی (م ۳۰۳ھ)' دارالکتب العلمیہ بیروت ۱۴۱۱ھ۔
(۱۵) مسند ابی یعلیٰ: امام احمد بن محمد بن علی المثنی التمیمی (م ۳۰۷ھ)' مطبوعہ دارالمامون تراث بیروت۔
(۱۶) صحیح ابن حبان: امام ابوحاتم محمد بن حبان البستی (م ۳۵۴ھ)' مطبوعہ دارالکتب العلمیہ بیروت ۱۴۰۷ھ۔
(۱۷) المعجم الاوسط: امام ابوالقاسم سلیمان بن احمد الطبرانی (م ۳۶۰ھ)' مطبوعہ مکتبۃ المعارف' ریاض' ۱۴۰۵ھ۔
(۱۸) المعجم الکبیر: امام ابوالقاسم سلیمان بن احمد الطبرانی (م ۳۶۰ھ)' مطبوعہ داراحیاء التراث العربی' بیروت۔
(۱۹) المستدرک: امام ابوعبداللہ محمد بن عبداللہ حاکم نیشاپوری (م ۴۰۵ھ)' مطبوعہ دارالباز مکہ مکرمہ۔
(۲۰) حِلیۃ الاولیاء وطبقات الاصفیاء: امام ابونعیم احمد بن عبداللہ اصبہانی (م ۴۳۰ھ)' دارالکتاب العربی بیروت۔
(۲۱) دلائل النبوۃ: امام ابونعیم احمد بن عبداللہ اصبہانی (م ۴۳۰ھ)' مطبوعہ دارالنفائس' بیروت۔
(۲۲) السنن الکبریٰ: امام ابوبکر احمد بن حسین بیہقی (م ۴۵۸ھ)' مطبوعہ نشر السنۃ' ملتان (پاکستان)۔
(۲۳) شعب الایمان: امام ابوبکر احمد بن حسین بیہقی (م ۴۵۸ھ)' مطبوعہ دارالکتب العلمیہ بیروت' ۱۴۰۱ھ۔
(۲۴) دلائل النبوۃ: امام ابوبکر احمد بن حسین بیہقی (م ۴۵۸ھ)' مطبوعہ دارالکتب العلمیہ' بیروت۔
(۲۵) الترغیب والترہیب: امام زکی الدین عبدالعظیم بن عبدالقوی المنذری (۶۵۶ھ)' مطبوعہ دارالحدیث قاہرہ۔
(۲۶) مشکوٰۃ: امام ولی الدین تبریزی (م ۷۴۲ھ)' مطبوعہ اصح المطابع دہلی۔
(۲۷) مجمع الزوائد: حافظ نورالدین علی بن ابی بکر الہیثمی (م ۸۰۷ھ)' مطبوعہ دارالکتاب العربی بیروت' ۱۴۰۲ھ۔
(۲۸) موردالظمآن: حافظ نورالدین علی بن ابی بکر الہیثمی (م ۸۰۷ھ)' مطبوعہ دارالکتب العلمیہ' بیروت ۱۴۰۴ھ۔
(۲۹) لسان المیزان: حافظ شہاب الدین محمد بن احمد علی بن حجر عسقلانی (م ۸۵۲ھ)' مطبوعہ مکتبہ دارالباز' مکہ مکرمہ۔
(۳۰) الاصابہ فی تمییز الصحابہ: حافظ شہاب الدین محمد بن احمد علی بن حجر عسقلانی (م ۸۵۲ھ)۔
(۳۱) الجامع الصغیر: حافظ جلال الدین السیوطی (م ۹۱۱ھ)' مطبوعہ دارالمعرفۃ بیروت' ۱۳۹۱ھ۔
(۳۲) کنزالعمال: علامہ علی متقی بن حسام الدین ہندی برہان پوری (م ۹۷۵ھ)' مؤسسۃ الرسالۃ بیروت' ۱۴۰۵ھ۔

کتب شروح حدیث

(۱) عمدۃ القاری: حافظ بدرالدین محمود بن احمد عینی حنفی (م ۸۵۵ھ)' مطبوعہ ادارۃ الطباعۃ المنیریۃ' مصر ۱۳۴۸ھ
(۲) مرقات: علامہ علی بن سلطان محمد القاری (م ۱۰۱۴ھ)' مطبوعہ مکتبہ امدادیہ' ملتان ۱۳۹۰ھ۔
(۳) اَشعۃ اللّمعات: شیخ عبدالحق محدث دہلوی (م ۱۰۵۲ھ)' مطبعہ مطبع تیج کمار' لکھنؤ۔

کتب لغت

(۱) المفردات القرآن: علامہ حسین بن محمد راغب اصفہانی (م ۵۰۲ھ)' مطبوعہ المکتبۃ المرتضویہ ایران۔
(۲) لسان العرب: علامہ جمال الدین محمد بن مکرم بن منظور افریقی (م ۷۱۱ھ)' مطبوعہ قم' ایران' ۱۴۰۵ھ

(۳) القاموس المحیط: علامہ مجد الدین محمد بن یعقوب فیروز آبادی (م ۸۱۷ھ)، مطبوعہ دار المامون، مصر۔
(۴) تاج العروس: علامہ سید محمد مرتضیٰ زبیدی حنفی (م ۱۲۰۵ھ)، مطبوعہ المطبعۃ الخیریۃ، مصر۔
(۵) آکسفورڈ اردو انگلش ڈکشنری: شان الحق حقی۔
(۶) Oxford Advanced Learner's Dictionary, 1996 Edn.

کتب تاریخ، سیرت وفضائل

(۱) قصیدہ نعمانیہ: امام ابوحنیفہ نعمان بن ثابت (م ۱۵۰ھ)۔
(۲) کتاب السیر والمغازی: امام محمد بن اسحاق (م ۱۵۱ھ)، مطبوعہ دار الفکر بیروت ۱۳۹۸ھ۔
(۳) السیرۃ النبویۃ: امام عبد الملک بن ہشام (م ۲۱۳ھ)، دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۱۵ھ۔
(۴) الطبقات الکبریٰ: امام محمد بن سعد (م ۲۳۰ھ) مطبوعہ دار صادر بیروت، ۱۳۸۸ھ۔
(۵) تاریخ الامم والملوک: امام ابوجعفر محمد بن جریر طبری (م ۳۱۰ھ) مطبوعہ دار القلم، بیروت۔
(۶) تاریخ بغداد: الخطیب بغدادی
(۷) الاستیعاب: حافظ ابوعمر ویوسف بن عبداللہ بن عمر بن عبد البر (م ۴۶۳ھ)، مطبوعہ دار الفکر، بیروت۔
(۸) الشفاء: قاضی عیاض بن موسیٰ مالکی (م ۵۴۴ھ)، مطبوعہ عبد التواب اکیڈمی، ملتان (پاکستان)
(۹) اسد الغابہ: علامہ ابوالحسن علی بن ابی الکرم الشیبانی المعروف بابن الاثیر (م ۶۳۰ھ)، مطبوعہ دار الفکر، بیروت۔
(۱۰) قصیدہ بردہ شریف: امام شرف الدین بوصیری (۱۲۱۳-۱۲۹۵ء)
(۱۱) البدایۃ والنہایۃ: حافظ عماد الدین اسماعیل بن عمر بن کثیر الشافعی (م ۷۷۴ھ)، مطبوعہ دار الفکر، بیروت۔
(۱۲) وفاء الوفاء: علامہ نور الدین علی بن احمد سمہودی (م ۹۱۱ھ)، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت ۱۴۰۱ھ۔
(۱۳) مدارج النبوت: شیخ عبد الحق محدث دہلوی (م ۱۰۵۲ھ)، مطبوعہ مکتبہ نوریہ رضویہ، سکھر (پاکستان)۔
(۱۴) نشر الطیب: شیخ اشرف علی تھانوی (م ۱۳۶۲ھ)، مطبوعہ تاج کمپنی لمیٹڈ، کراچی۔
(۱۵) ضیاء النبی ﷺ: جسٹس پیر کرم شاہ الازہری (م ۱۴۱۸ھ)، مطبوعہ ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور۔
(۱۶) محمد رسول اللہ ﷺ ۔۔۔ ڈاکٹر حمید اللہ
(۱۷) سیرتِ رسولِ عربی ﷺ ۔۔۔ علامہ نور بخش توکلی، اسلامی کتب خانہ، چوک اردو بازار، لاہور۔
(۱۸) زاد السّعید: شہاب الدین احمد مقری۔
(۱۹) تاریخ الخمیس: ڈاکٹر حمید اللہ۔

کتب فقہ

(۱) الحاوی للفتاویٰ: حافظ جلال الدین السیوطی (م ۹۱۱ھ)۔

(۲) احیاء علوم الدین: امام محمد بن غزالی (م ۵۰۵ھ)، مطبوعہ دار الخیر بیروت ۱۴۱۳ھ۔
(۳) فتاویٰ عالم گیری: مُلّا نظام الدین (م ۱۱۶۱ھ)، مطبوعہ مطبع کبریٰ امیریہ بولاق مصر ۱۳۱۰ھ۔
(۴) ردّ المختار: علامہ سید محمد امین ابن عابدین (م ۱۲۵۲ھ)، مطبوعہ دار إحیاء التراث العربی بیروت، ۱۴۰۷ھ۔
(۵) فتاویٰ شامی: علامہ سید محمد امین ابن عابدین (م ۱۲۵۲ھ)، مطبوعہ دار إحیاء التراث العربی بیروت، ۱۴۰۷ھ۔
(۶) فقہ الاسلامی و اَدِلّتُہ': محمد علی صابونی۔
(۷) کتاب الفقہ (اردو ترجمہ): عبد الرحمن الجزیری۔
(۸) فقہ القرآن: نصاب برائے ایم اے علوم اسلامیہ۔ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد۔ کوڈ: ۴۵۵۳۔

کتب اسماء الرجال

(۱) کشف الخفاء و مزیل الالباس: علامہ اسماعیل بن محمد العجلونی (م ۱۱۶۴ھ)، مکتبہ الغزالی، دمشق۔

کتب متفرقہ

(۱) کتاب الاغانی: ابو الفرج اصفہانی۔
(۲) اَلعِلَلُ المُتناھِیة: علامہ عبد الرحمن بن علی جوزی (م ۵۹۷ھ)۔
(۳) کتاب الاذکار: علامہ یحیٰی بن شرف نووی (م ۶۷۶ھ)۔
(۴) مختصر المعانی: علامہ سعد الدین مسعود بن عمر تفتازانی (م ۷۹۱ھ)۔
(۵) حُجَّةُ اللهِ البالِغہ: شاہ ولی اللہ محدّث دہلوی۔
(۶) نَیلُ الاوطار: شیخ محمد بن علی بن محمد شوکانی (م ۱۲۵۰ھ)۔
(۷) مراتب الاجماع: ابنِ حزم
(۸) الفروق: شہاب الدین القرافی۔
(۹) مَدخَل: علامہ ابن حاج مالکی۔
(۱۰) قصص القرآن: حفظ الرحمن سیوہاروی
(۱۱) الحلال و الحرام فی الاسلام (انگریزی ترجمہ): یوسف القرضاوی۔
(۱۲) اَلتَّعلیق الصَّبیح: شیخ محمد ادریس کاندھلوی۔
(۱۳) جوہر منظّم: علامہ ابن حجر ہیثمی۔
(۱۴) اسلام اور جدید ذہن کے شبہات ۔۔ محمد قطب۔
(۱۵) خطرات جمال الدین افغانی ۔۔ محمد باشا المخزومی۔
(۱۶) منافقت اور اُس کی علامات ۔۔ پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری۔
(۱۷) سود پر تاریخی فیصلہ ۔۔۔ جسٹس محمد تقی عثمانی۔
(۱۸) منہاج المسلم (اردو ترجمہ) ۔۔۔ ابو بکر جابر الجزائری۔
(۱۹) رسولِ اکرم ﷺ اور رواداری ۔۔۔ ڈاکٹر حافظ محمد ثانی۔

اشاریہ قرآنی جلد پنجم INDEX (Qur'anic V)

(قوسین کے اندر کے اعداد سورہ نمبر رصفحہ نمبر کو' قوسین کے باہر کے اور : سے پہلے کے عدد آیت نمبر کو ظاہر کرتے ہیں)

اشاریہ عمومی (INDEDX GENERAL)

اشاریہ احادیث مبارکہ

(۳۸) إذَا مَاتَ الْإِنْسَانُ اِنْقَطَعَ عَمَلُه' إِلَّا (۲۳۱۴) (۳۹) إِذَا سَمِعْتُمُ الْمُؤَذِّنَ فَقُوْلُوا مِثْلَ مَا (۲۳۱۴)
(۴۰) اَشْفَعُ لِاُمَّتِیْ حَتّٰی یُنَادِی رَبِّیْ اَرَضِیْتَ یَا مُحَمَّدُ فَاَقُوْلُ: نَعَمْ یَارَبِّ رَضِیْتُ (۲۳۱۹)
(۴۱) تَلَا رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ قَوْلَ اللّٰہِ تَعَالٰی فِیْ إِبْرٰهِیْمَ عَلَیْهِ السَّلَامُ: فَمَنْ تَبِعَنِیْ فَإِنَّه' مِنِّیْ۔۔ (۲۳۱۹)
(۴۲) مَنْ زَارَ قَبْرِیْ وَجَبَتْ لَه' شَفَاعَتِیْ (۲۳۲۰) (۴۳) شَفَاعَتِیْ لِاَهْلِ الْکَبَائِرِ مِنْ اُمَّتِیْ (۲۳۲۰)
(۴۴) إِذَا کَانَ یَوْمُ الْقِیَامَةِ مَاجَ النَّاسُ بَعْضُهُمْ فِیْ بَعْضٍ فَیَاْتُوْنَ آدَمَ فَیَقُوْلُوْنَ: اِشْفَعْ لَنَا اِلٰی۔۔ (۲۳۲۱)
(۴۵) یَشْفَعُ یَوْمَ الْقِیَامَةِ ثَلَاثَةٌ'': اَلْاَنْبِیَاءُ ثُمَّ الْعُلَمَاءُ ثُمَّ الشُّهَدَاءُ (۲۳۲۳)
(۴۶) اِنَّ مِنْ اُمَّتِیْ مَنْ یَّشْفَعُ لِلْغَنَائِمِ وَمِنْهُمْ مَنْ یَّشْفَعُ لِلْقَبِیْلَةِ مَنْ یَّشْفَعُ لِلرَّجُلِ حَتّٰی۔۔ (۲۳۲۳)
(۴۷) یَدْخُلُ الْجَنَّةَ بِشَفَاعَةِ رَجُلٍ مِّنْ اُمَّتِیْ اَکْثَرُ مِنْ بَنِیْ تَمِیْمٍ (۲۳۲۳)
(۴۸) لَوْاَقْسَمَ بِاللّٰہِ لَاَبَرَّه' فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ یَّسْتَغْفِرَ لَکَ فَافْعَلْ (۲۳۲۳)
(۴۹) لَا تُشَدُّ الرِّحَالُ اِلَّا اِلٰی ثَلَاثَةِ مَسَاجِدَ: اَلْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَمَسْجِدِ الرَّسُوْلِ۔۔ (۲۳۲۵)
(۵۰) صَلَاةٌ'' فِیْ مَسْجِدِیْ هٰذَا خَیْرٌ'' مِّنْ اَلْفِ صَلَاةٍ فِیْ غَیْرِهٖ مِنَ الْمَسَاجِدِ (۲۳۲۶)
(۵۱) لَا یَنْبَغِیْ لِلْمَطِیِّ اَنْ تُشَدَّ الرِّحَالَةُ اِلٰی مَسْجِدٍ تُبْتَغَاءُ فِیْهِ الصَّلَاةُ غَیْرَ مَسْجِدِ الْحَرَامِ۔۔ (۲۳۲۶)
(۵۲) کَانَ یَاْتِیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ مَسْجِدَ قُبَاءَ کُلَّ سَبْتٍ رَاکِبًا وَّمَاشِیًا وَفِیْ رِوَایَةٍ۔۔۔ (۲۳۲۶)
(۵۳) لَا تُشَدُّ رِحَالُ الْمَطِیِّ اِلٰی مَسْجِدٍ یُذْکَرُ فِیْهِ اِلَّا اِلٰی ثَلَاثَةِ مَسَاجِدَ (۲۳۲۷، ۲۳۹۳)
(۵۴) اَلَا اِنَّ کُلَّ رِبًا فِی الْجَاهِلِیَّةِ مَوْضُوْعٌ'' (۲۳۳۹) (۵۵) إِذَا ارْتَهَنَ شَاةً شَرِبَ الْمُرْتَهِنُ (۲۳۳۹)
(۵۶) إِذَا اَقْرَضَ اَحَدُکُمْ قَرْضًا فَاَهْدٰی۔۔ (۲۳۴۰) (۵۷) کُلُّ قَرْضٍ جَرَّ مَنْفَعَةً فَهُوَ رِبًا (۲۳۴۰)
(۵۸) یَا آدَمُ وَکَیْفَ عَرَفْتَ مُحَمَّدًا۔۔ (۲۳۶۷) (۵۹) اُذْکُرْنَا یَا مُحَمَّدُ عِنْدَ رَبِّکَ وَلٰکِنْ۔۔ (۲۳۶۸)
(۶۰) کَانَ إِذَا قَحَطُوْا اِسْتَسْقٰی بِالْعَبَّاسِ (۲۳۷۲) (۶۱) اَلْحَلَّاقُ یَحْلِقُه' وَاَطَافَ بِه' اَصْحَابُه' (۲۳۸۳)
(۶۲) اِنَّ لِلّٰہِ خَلْقًا خَلَقَهُمْ لِحَوَائِجِ النَّاسِ (۲۳۸۹) (۶۳) اِنَّ آدَمَ اِفْتَخَرَ بِیْ وَاَنَا اَفْتَخِرُ بِرَجُلٍ (۲۳۹۶)
(۶۴) ضَنَّ الْخَبِیْثُ بِمُلْکِهٖ وَلَابَقَاءَ لِمُلْکِهٖ (۲۴۱۷) (۶۵) مَزَّقَ کِتَابِیْ مَزَّقَ اللّٰہُ مُلْکَه' (۲۴۱۹)
(۶۶) اَبْلِغَا صَاحِبَکُمَا اِنَّ رَبِّیْ قَدْ قَتَلَ۔۔ (۲۴۱۹) (۶۷) لَزَوَالُ الدُّنْیَا اَهْوَنُ عِنْدَ اللّٰہِ مِنْ (۲۴۴۳)
(۶۸) مَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا فَاغْتَبَطَ بِقَتْلِهٖ۔۔ (۲۴۴۳) (۶۹) مَا اَطْیَبَکِ وَاَطْیَبُ رِیْحُکِ اَمَا اَعْظَمَکِ (۲۴۴۳)
(۷۰) کُلُّ ذَنْبٍ عَسَی اللّٰہُ اَنْ یَّغْفِرَه' (۲۴۴۳) (۷۱) لَوْ اَنَّ اَهْلَ السَّمَاءِ وَالْاَرْضِ اِجْتَمَعُوْا (۲۴۴۳)
(۷۲) لَایُقْتَلُ الْقَاتِلُ حِیْنَ یَقْتُلُ وَهُوَ۔۔ (۲۴۴۴) (۷۳) مَنْ اَشَارَ اِلٰی اَخِیْهِ بِحَدِیْدَةٍ۔۔۔ (۲۴۴۴)
(۷۴) اَوَّلُ مَا یُقْضٰی بَیْنَ النَّاسِ بِالدِّمَاءِ (۲۴۴۴) (۷۵) لَا یَبْقٰی عَلٰی ظَهْرِ الْاَرْضِ بَیْتُ مَدَرٍ (۲۴۸۲)
(۷۶) وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِهٖ لَاتَدْخُلُوا الْجَنَّةَ حَتّٰی تُؤْمِنُوْا وَلَا تُؤْمِنُوْا حَتّٰی تَحَابُّوْا اَفَلَا اَدُلُّکُمْ عَلٰی اَمْرٍ اِذَا فَعَلْتُمُوْهُ تَحَابَبْتُمْ؟ اَفْشُوا السَّلَامَ بَیْنَکُمْ (۲۴۸۵)
(۷۷) لَاتَدْخُلُوا الْجَنَّةَ حَتّٰی تُسْلِمُوْا وَلَا تُسْلِمُوْا حَتّٰی تَحَابُّوْا وَاَفْشُوا السَّلَامَ تَحَابُّوْا وَاِیَّاکُمْ وَالْبُغْضَةَ فَاِنَّهَا هِیَ الْحَالِقَةُ لَا اَقُوْلُ لَکُمْ تَحْلِقُ الشَّعْرَ وَلٰکِنْ تَحْلِقُ الدِّیْنَ (۲۴۸۵)

قرآنک انسائیکلوپیڈیا

اُردو ترجمہ

جلد پنجم

مؤلف

پروفیسر اشفاق احمد خان